فون : ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۳ | جنوری ۱۹۸۰ | صفر المظفر ۱۴۰۰ھ | شمارہ ۱

ترتیب

تاثرات

ربیع الاوّل کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں صبحِ نور طلوع ہوئی اور آفتابِ نبوت کی ضیا پاش کرنوں نے مطلعِ عالم کو منور کیا۔ اس مبارک مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور ظلمت کی دبیز چادر جو ہر سُو بچھی ہوئی تھی، تار تار ہوئی۔ آپ کی تاریخِ ولادت طبری اور ابن خلدون نے ۱۲ ربیع الاوّل اور ابن کثیر نے ۱۰ ربیع الاوّل تحریر کی ہے۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آپ پیر کے روز پیدا ہوئے۔ مورخین کی تحقیق کے مطابق پیر کا دن ۹ ربیع الاول سے مطابقت کرتا ہے۔ لہٰذا حضور کی صحیح تاریخِ ولادت ۹ ربیع الاوّل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں پیر کے دن کو بڑی خصوصیت حاصل ہے۔ آپ کی ولادت بھی اسی دن ہوئی، نبوت سے بھی اسی دن سرفراز فرمائے گئے، ہجرت بھی اسی دن کی اور دنیا سے بھی اسی دن تشریف لے گئے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ اس سے آپ کے بارے میں مختلف تاریخوں کی صحت تک پہنچنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اس عالمِ آب و گِل میں عظیم الشان انقلاب اور بہت بڑے ذہنی تغیر اور فکری تحول کا باعث بنی۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے یہ دنیا بے شمار برائیوں کا گہوارہ بنی ہوئی تھی، خود ملک عرب جس میں آپ پیدا ہوئے شرک کا بہت بڑا مرکز تھا اور وہاں کے لوگ کئی قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے۔ وہ بتوں کو پوجتے اور اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے ان کے آگے سربسجود ہوتے تھے۔ ان کی بہت بڑی اکثریت توحید کے تصور اور اللہ کی عبادت سے نا آشنا تھی۔ لڑنا جھگڑنا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر میدانِ جنگ میں اُتر آنا، شراب پینا، جوا کھیلنا، چوری کرنا، ڈاکے ڈالنا اور قتل و خوں ریزی کرنا ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا۔ وہ نیکی سے دور رہتے اور برائی کے ارتکاب سے خوش ہوتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ان کے لیے اللہ کی بے پایاں رحمت ثابت ہوئی اور آپ

کی پاکیزہ تعلیمات سے ان کے ظاہر اور باطن کی کیفیتیں بالکل بدل گئیں۔ آپ کی صحبت و رفاقت سے اُن کے دلوں کی غلاظت ختم ہو گئی اور روح کی تمام کثافتیں ایک ایک کرکے دور ہو گئیں۔ ان کا ایسا باطنی تزکیہ ہوا اور قلب کی وہ تطہیر ہوئی کہ بُرائی کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔

إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (آل عمران : ۱۶۴)

یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے انہی میں سے ان میں ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتا، ان کا تزکیۂ نفس کرتا اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ یقیناً وہ اس کی آمد سے قبل کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔

نیز فرمایا :

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران ، ۱۰۳)

تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمھارے دلوں میں محبت و الفت کے جذبات بھر دیے اور تم اللہ کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے لیے بشیر و نذیر اور ہادی و رہنما بن کر آئے۔ آپ کی تعلیمات نے سرکش سے سرکش لوگوں کو بھی بے حد متاثر کیا، جو لوگ آپ کی اطاعت و فرماں برداری سے بہرہ ور ہوئے، ان کی زندگیوں کی کایا پلٹ گئی اور انھوں نے علمی، روحانی اور جنگی لحاظ سے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو تاریخ کا زریں باب بن گئے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ کے بے شمار پہلو ہیں اور ہر پہلو اپنے اندر درس و موعظت کا ایک مہتم بالشان سلسلہ لیے ہوئے ہے۔ آئیے، ماہِ ربیع الاوّل کی مناسبت سے ہم یہ عہد کریں کہ آنحضرتؐ کی پاکیزہ تعلیمات کو مشعلِ راہ ٹھہرائیں گے، آپ کے ارشادات پر عمل کریں گے اور جن امور سے آپ نے منع فرمایا ہے ان سے باز رہیں گے ــــ نیز آپ کی حیاتِ مقدسہ کے مختلف گوشوں سے خود بھی آشنا ہوں گے اور دوسروں کو بھی ان سے آشنا کرانے کے لیے جد و جہد کریں گے۔

راسخ عرفانی

نعت

ابرِ گلبار جو گزرا تھا ہما کی صورت — کاش پھر برسے مرے سر پہ گھٹا کی صورت

چاندنی رات میں طیبہ کی مسافت کا سماں — خاک بھی پاؤں میں جچتی ہے ضیا کی صورت

آج بھی یاد ہے فردوسِ حرم کا منظر — میں بھی گزرا تھا کبھی اُس سے صبا کی صورت

فقر جو آپؐ کے کوچے سے ملا تھا مجھکو — میں نے آنکھوں میں سجایا ہے حیا کی صورت

شہریاروں سے اچھوتا ہے غنا کا عالم — کوئی دیکھے تو ذرا اُن کے گدا کی صورت

اے شہِ خلد کی گلیوں کے غبارِ اطہر — ڈھانپ لے حشر کے دن مجھکو ردا کی صورت

مدحتِ ختمِ رسلؐ کا ہے تقدس راسخ
لفظ آتے ہیں مرے لب پہ دعا کی صورت

جناب نصرت علی اثیر

سلیمان بن مہران الاعمش

نام و نسب

سلیمان نام تھا اور مہران کے بیٹے تھے۔ مہران ایرانی تھے۔ اصل وطن طبرستان تھا، جہاں وہ بنی اسعد کے غلام تھے۔ وہاں رے کی بستی دنباوند سے جب کوفہ میں بنی اسعد کے ہاں آئے تو بنی کاہل کے ایک شخص نے انھیں خرید کر آزاد کر دیا[1] اس لیے سلیمان بن مہران کو اسعدی اور کاہلی کی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے۔ آنکھوں کی بینائی چونکہ کمزور تھی، اس لیے الاعمش سے مشہور ہوئے[2] علاوہ ازیں الکوفی نسبت اور ابومحمد کنیت سے بھی تذکروں میں آپ کو پکارا گیا ہے[3]

آپ کی والدہ بنی اسعد سے تھیں اور ان کا نام خزیمہ تھا[4] آپ کے والد مہران حضرت حسین کی شہادت کے عینی گواہ تھے[5]

ولادت

سلیمان اعمش کی تاریخ ولادت اور مقام ولادت میں اکثر تذکرہ نگاروں کا اختلاف ہے۔ ایک روایت کی رو سے آپ رے کی سرزمین میں ۶۰ھ کو پیدا ہوئے[6] امام بخاری نے اپنی کتاب التاریخ الکبیر میں ابن نمیر سے ایک روایت نقل کی ہے، جس میں یحییٰ بن عیسیٰ نے انھیں بتایا کہ میں نے خود اعمش سے سنا کہ وہ

---

[1] خطیب بغدادی، تاریخ بغداد : ۹ : ۵ ، مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ بجوار محافظہ مصر ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء

[2] ابن خلکان : وفیات الاعیان : ۲ : ۱۳۶ ، مطبوعہ قاہرہ

[3] ابن حجر : تہذیب التہذیب : ۴ : ۲۲۲ ، مطبوعہ دائرہ معارف نظامیہ حیدر آباد دکن ۱۳۲۵ھ

[4] تبریزی : الاکمال فی اسماء الرجال : ۳ : ۶۰۸ ، مطبوعہ منشورات المکتبۃ الاسلامی بدمشق ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء

[5] ابن سعد : طبقات الکبریٰ : ۶ : ۳۴۲ ، مطبوعہ بیروت ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء

[6] تبریزی : الاکمال : ۳ : ۶۰۸۔

حضرت حسینؓ کی شہادت سے دو سال قبل پیدا ہوئے[6] اس کے علاوہ ایک اور روایت میں ۶۱ھ میں ۱۰ محرم کو جس دن حضرت حسینؓ شہید کیے گئے کوفہ میں پیدا ہوئے[7] امام بخاری نے خود ۶۰ھ کو آپ کی ولادت کا سال لکھا ہے[8] ابن سعد نے فضل بن دکین اور وکیع دونوں سے روایت کیا ہے کہ اعمش یوم عاشورا کو ۶۰ھ میں پیدا ہوئے[9] خطیب بغدادی نے بھی یوم عاشورا ۶۰ھ لکھا ہے[10] لیکن سانحہ کربلا یوم ۶۱ھ کو ہوا۔ اس تضاد سے روایت کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے۔ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ سلیمان بن مہران کے والدین جب کوفہ آئے تو ان کی والدہ حاملہ تھیں اور سات ماہ بعد کوفے میں ۶۰ھ کو یہ بچہ پیدا ہوا[11] روایات کے اس اختلاف کے بعد خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی ولادت کوفے کی بجائے رے کی بستی دنباوند میں ۱۰ محرم ۶۰ھ کو ہوئی۔ جب آپ کے والدین کوفے آئے تو وہ اس بچے کو اٹھائے ہوئے تھے۔

خطیب بغدادی نے جریر بن عبدالحمید کے حوالے سے کہا ہے کہ آپ دنباوند کی بستی میں پیدا ہوئے جو کہ پہاڑوں کے درمیان رے کے دیہاتوں میں سے ایک چھوٹی سی آبادی ہے[12]۔ یاد رہے کہ جریر بن عبدالحمید آپ کے شاگرد خاص تھے۔ ابو حاتم رازی متوفی ۳۲۷ھ سے بھی یہی مروی ہے[13] حسین بن حریث سے امام اعمش کے ایک دوسرے شاگرد ابو نعیم کا قول مروی ہے کہ اعمش ۶۰ھ میں پیدا ہوئے[14]۔ جزری نے طبقات القراء میں، تبریزی نے اکمال میں، امام بخاری نے کتاب التاریخ الکبیر میں اور ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اسی سال کو اعمش کا سالِ ولادت قرار دیا ہے۔

---

۷ امام بخاری: کتاب التاریخ الکبیر، ج ۲، ق ۲، مطبوعہ دائرہ معارف عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۳۶۴ھ۔

۸ ابن قتیبہ: کتاب المعارف: ۲۱۴، مطبوعہ اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی۔

۹ ابن سعد: طبقات الکبریٰ: ۶ : ۳۴۲، مطبوعہ بیروت ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء

۱۰ خطیب بغدادی: تاریخ بغداد: ۹ : ۱۳ ۱۱ ابن خلکان: وفیات الاعیان: ۲ : ۱۳۶

۱۲ خطیب بغدادی: تاریخ بغداد: ۹ : ۳، مطبوعہ مطبعۃ السعادہ مصر ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۱ء

۱۳ محمد بن ادریس الرازی: کتاب الجرح والتعدیل، ج ۲، ق ۱ : ۱۴۶، مطبوعہ دائرہ معارف عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۳۷۲ھ

۱۴ خطیب بغدادی: تاریخ بغداد: ۹ : ۱۲ - ایضاً

تعلیم و تدریس

اُس دور میں قرآن اور حدیث کی تعلیم کے جگہ جگہ حلقے قائم تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست فیض یاب ہونے والے اصحاب کی ایک کثیر تعداد بقیدِ حیات تھی۔ اس لیے لوگ ان سے ملنے کے لیے بے تاب رہتے۔ جہاں کسی صحابی کا پتا معلوم ہوتا وہاں پہنچ جاتے، اس طرح چراغ سے چراغ جلتا گیا اور قرآن و حدیث کے علم کی روشنی دنیائے عالم میں چہار سو پھیل گئی۔

سلیمان بن مہران کی خوش قسمتی کہ انھیں چند جید صحابہ کرام کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ وہ کوفے میں آ گئے جہاں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی جیسے صحابہ تشریف فرما تھے۔ آپ کو علم کے اس بحرِ بیکراں کی شناوری کا خوب موقع ملا۔ جہاں کسی صحابی یا تابعی کی علمی مجلس دیکھی ضرور فیض یاب ہوئے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی[۱۵] اور انھیں جی بھر کر دیکھا۔ قرأتِ قرآن آپ نے ابراہیم النخعی، زر بن حبش، زید بن وہب، عاصم بن ابی النجود، ابوحصین، یحییٰ بن وثاب، مجاہد بن جبر اور ابوالعالیہ الریاحی سے سیکھی۔ حدیثِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت آپ نے زید بن وہب، ابو وائل، ابو عمرو الشیبانی، قیس بن ابی حازم، اسمٰعیل بن ابی رجا، ابو صخرہ جامع ابن شداد، ابوظبیان ابن جندب، خثیمہ بن عبدالرحمٰن الجعفی، سعد بن عبیدہ، ابوحازم الاشجعی، سلیمان بن مسہر، طلحہ بن مصرف، ابوسفیان طلحہ بن نافع، عامر الشعبی، ابراہیم النخعی، عبداللہ بن مرہ، عبدالعزیز بن رفیع، عبدالملک بن عمیر، عدی بن ثابت، عمارہ بن عمیر، عمارہ بن القعقاع، مجاہد بن جبیر، ابوالضحیٰ، منذر الثوری اور ہلال بن یساف جیسے نامور محدثین سے کی۔ آپ حفظ و ثقاہت اور تقویٰ میں بہت مشہور تھے۔ بہت سے علاقے اس زمانے میں قرآن و حدیث کی تحصیل کا مرکز تھے۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے درس جاری تھے۔ تعلیم کے بعد خود آپ نے بھی حلقۂ حدیث جاری کیا۔ حضرت امام ابوحنیفہ نے آپ ہی سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ اس کے علاوہ ابواسحٰق السبیعی، سلیمان التیمی، حکم بن عتابہ، زبید الیامی، سہیل بن ابی صالح، سفیان بن عیینہ، زفر بن الہذیل، علی بن مسہر، ابومعاویہ، حفص بن غیاث، وکیع بن الجراح، جریر بن عبدالحمید، عبداللہ بن ادریس، عیسٰی بن یونس، عبدالرحمٰن المحاربی، عبدہ بن

---

۱۵ خطیب بغدادی: تاریخ بغداد : ۹ : ۱۲، ص ۴

سلیمان، یحییٰ بن سعید القطان، عمرو و یعلی و محمد، بنو عابید الطنافسی، ابو اسامہ، عبداللہ بن نمیر ابراہیم بن طہمان، جریر بن حازم، ابو اسحاق الفزاری، اسرائیل، زائدہ بن قدامہ، ابو بکر بن عیاش، شیبان النحوی، عبداللہ بن مبارک، الخریبی، فضیل بن عیاض، محمد بن عبدالرحمٰن الطفاوی، ہشیم، ابو شہاب الحناط، حمزہ الزیات، محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، ابان بن تغلب، طلحہ بن مصرف، ابراہیم التیمی، منصور بن المعتمر، ابو عبیدہ بن معن الہذلی، محمد بن عبداللہ المعروف بزاہر اور محمد بن میمون جیسے جلیل القدر محدثین، فقہا اور قرا نے آپ کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیا۔

اعمش بحیثیت محدث

امام سلیمان بن مہران الاعمشؒ ثقہ محدث تھے۔ صحیحین اور دیگر مستند کتب حدیث میں آپ سے احادیث کا ایک معتدبہ حصہ مروی ہے۔ آپ محدثین کے نزدیک بلند مقام پر فائز تھے۔ سفیان بن عیینہ جو خود ایک عظیم المرتبت محدث ہیں۔ فرماتے ہیں۔

عن سهل بن حليمه ابو السرى سمعت سفيان بن عيينة يقول سبق الاعمش اصحابه باربع كان اقرأهم للقرآن واحفظهم للحديث واعلمهم بالفرائض ونسيت انا واحدة۔ [۱۶]

ابو السری فرماتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ اعمش اپنے ساتھیوں سے چار چیزوں میں سبقت لے گئے۔ دوسروں کے مقابلہ میں قرآن کے بہترین قاری، حدیث کے بہترین حافظ اور فرائض کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ ایک آخری بات (جو انھوں نے کہی) مجھے بھول گئی ہے۔

یحییٰ بن معین جو کہ رجال کے چوٹی کے ناقد ہیں، آپ کو ثقہ قرار دیتے ہیں:

قال ابو داؤد سمعت یحیی بن معین قال کان الاعمش جلیلاً جداً۔ [۱۷]

ابو داؤد کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اعمش بہت بڑے پایہ کے آدمی ہیں۔
ابو مسلم صالح بن عبداللہ عجلی کے ہاں آپ کو ایک اعلیٰ درجے کے ثقہ محدث کہتے ہیں خطیب بغدادی نقل کرتے ہیں:

---

[۱۶] خطیب بغدادی: تاریخ بغداد: ۹: ۹، مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء [۱۷] ایضاً

کان ثقة ثبتا فی الحدیث وکان محدث اھل الکوفة فی زمانه ولم یکن له کتاب وکان رأسا فی القرآن۔[18]

وہ حدیث میں اعلیٰ درجہ کے ثقہ تھے اور اپنے دور میں اہل کوفہ کے محدث تھے۔ ان کی کوئی کتاب نہیں اور وہ قرآنی علوم میں ممتاز تھے۔

تبریزی اپنی کتاب "الاکمال فی اسماء الرجال" میں لکھتے ہیں :

وھو احد الاعلام المشھورین بعلم الحدیث والقرأة علیه مدار اکثر الکوفیین روی عنه خلق کثیر۔[19]

یعنی آپ حدیث و قرأت کا علم رکھنے والی شہرت یافتہ شخصیتوں میں سے ہیں۔ اکثر کوفیوں کا مرکز تھے۔ ان سے کثیر تعداد نے روایت کی۔

شعبہ کہتے ہیں :

ما شفانی احد فی الحدیث ما شفانی الاعمش۔[20]

یعنی حدیث میں جس قدر اعمش نے مجھے فائدہ بخشا ہے کسی نے نہیں بخشا۔

عبداللہ بن داؤد الخریبی شعبہ کی ایک اور خوبی کا حال بیان کرتے ہیں جس سے ان کی وابستگی اور عیاں ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں :

کان شعبة اذا ذکر الاعمش قال المصحف المصحف وقال عمرو بن علی کان الاعمش یسمی المصحف لصدقه۔[21]

یعنی شعبہ جب کبھی اعمش کا ذکر کرتے تو کہتے "المصحف المصحف" عمرو بن علی بتاتے ہیں کہ اعمش کو المصحف ان کی صداقت کی وجہ سے کہا جاتا تھا۔

ابن عمار فرماتے ہیں :

لیس فی المحدثین اثبت من الاعمش۔[22]

---

[18] ابن حجر، تہذیب التہذیب : ۴ : ۲۲۳، مطبوعہ دائرہ معارف النظامیہ حیدرآباد دکن ۱۳۲۵ھ

[19] تبریزی: الاکمال فی اسماء الرجال، ۳ : ۴۸ ، مطبوعہ منشورات المکتبۃ الاسلامی بدمشق ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء

[20] ابن حجر، تہذیب التہذیب، ۴ : ۲۲۲ [21] ایضاً، ص ۲۲۳ [22] ایضاً

یعنی محدثین میں کوئی اعمش سے زیادہ قابلِ اعتماد اور ثقہ محدث نہیں ہے۔

امام زہری کے پاس جب اہلِ عراق کا تذکرہ ہوتا تو وہ انھیں ضعیف قرار دیتے۔ اسحاق بن راشد کہتے ہیں کہ میں نے انھیں کہا کہ کوفے میں بنی اسد کے ایک آزاد کردہ غلام سے چار ہزار احادیث مروی ہیں۔ امام زہری نے حیرت سے کہا، چار ہزار؟ تو اسحاق کہنے لگے کہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اگر آپ کہیں تو اس علم سے کچھ آپ کو سنا دیتا ہوں۔ امام زہری نے بیان کرنے کو کہا۔ اسحاق کہتے ہیں کہ میں نے بیان کرنا شروع کیا۔ جوں جوں میں پڑھ رہا تھا۔ امام زہری کی بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔ آخر امام زہری کہنے لگے کہ خدا کی قسم یہ واقعی علم ہے جس کو میں اور کسی کے ہاں نہیں پاتا تھا[۲۳]

یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں:

کان من النساک وکان محافظا علی الصلوٰۃ والجماعۃ وعلی الصف الاول وقال یحیی وھو علامۃ الاسلام۔[۲۴]

یعنی وہ عبادت گزار اور اہلِ زہد لوگوں میں سے ایک تھے۔ نماز اور جماعت کا خاص خیال رکھتے اور پہلی صف میں پڑھتے۔ اور یحییٰ کہتے ہیں کہ وہ اسلام کو بہت زیادہ جانتے تھے۔

جریر بن عبد الحمید کے بارے میں یحییٰ بن معین سے مروی ہے کہ وہ جب بھی حدیث کو اعمش سے روایت کرتے تو کہتے کہ "ھذا الدیباج الخسروانی" یعنی شاہی ریشمی کپڑے کی طرح یہ سب سے اعلیٰ درجے کی روایت ہے[۲۵]

نسائی اور ابو عوانہ نے بھی آپ کو ثقہ مانا ہے۔ اسی طرح ابن حبان نے بھی آپ کو ثقہ تابعین میں شمار کیا ہے۔[۲۶]

امام اعمش اور تدلیس حدیث

اعمش ثقہ، عادل اور ثابت حافظِ حدیث تھے۔ لیکن بعض اکابرِ حدیث نے ان مرویات پر جن میں آپ

---

[۲۳] ابن سعد: طبقات الکبریٰ: ۶: ۳۴۲، مطبوعہ بیروت ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۷ء

[۲۴] خطیب بغدادی: تاریخ بغداد: ۹: ۸، مطبوعہ مطبعۃ السعادہ مصر ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء

[۲۵] ابن حجر: تہذیب التہذیب: ۴: ۲۲۳، مطبوعہ دائرہ معارف نظامیہ حیدرآباد دکن، ۱۳۲۵ھ

[۲۶] ایضاً، ص ۲۲۴

نے صحابہ کا براہِ راست نام لے کر حدیث بیان کی جب کہ ان سے آپ کی ملاقات اس طور سے ثابت نہیں، تدلیس سے معیوب قرار دیا ہے۔ اسی طرح وہ احادیث جو آپ نے بعض احباب سے حسنِ ظن رکھتے ہوئے روایت کیں، وہ بھی اسی حکم میں شامل سمجھی جاتی ہیں۔ جن اکابر نے اس تنقید میں اعمش کی روایات کو جانچا ہے۔ ان میں بعض نے تو مبالغہ آمیز باتیں کہی ہیں اور بعض نے حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے انصاف کا حق ادا کیا ہے۔ عبداللہ بن المبارک نے جن کو حافظ ابن حجر نے حضرت اعمش کے شاگردوں میں شامل کیا ہے[۲۷] آپ کی روایات پر کڑی تنقید کی ہے۔

جوزجانی وہب بن زمعہ المروزی سے عبداللہ بن مبارک کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

سمعت ابن المبارک یقول انما افسد حدیث اھل الکوفۃ ابو اسحاق والاعمش۔[۲۸]

میں نے ابن مبارک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اہل کوفہ کی احادیث میں سب سے زیادہ فاسد مرویات ابو اسحاق اور اعمش کی ہیں۔

دوسرے مغیرہ ہیں جنھوں نے سخت تنقید کی ہے۔ جریر بن عبدالحمید ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

سمعت المغیرۃ یقول اھلک اھل الکوفۃ ابو اسحاق واعمشکم ھذا۔

یہ اقوال نقل کرنے کے بعد علامہ ذہبی جو کہ خود رجالِ حدیث اور علمِ حدیث پر گہری نظر رکھتے ہیں، بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والا فاعمش مدلس، صادق، ثبت، صاحبِ سنۃ وقرآن یحسن الظن بمن یحدثہ ویروی عنہ۔

یعنی یہ تنقید بجا لیکن اعمش عادل، صادق، ثابت اور قرآن و سنت کے حامل ہیں جو حسنِ ظن سے کام لیتے ہیں، چنانچہ جو بھی بیان کر دیتا یہ اس سے روایت کر دیتے۔ اس لیے آگے لکھتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم لاتعلق ہو جائیں، اس لیے کہ یہ ضعیف علم ہے جس سے تدلیس پیدا ہوئی اور تدلیس حرام ہے۔

---

[۲۷] ابن حجر: تہذیب التہذیب، ۴: ۲۲۲، مطبوعہ دائرہ معارف نظامیہ حیدرآباد دکن ۱۳۲۵ھ

[۲۸] علامہ ذہبی: میزان الاعتدال: ۲: ۲۲۴

ابو الفلاح عبد الحی بن العماد الحنبلی انہی اعتراضات بالا پر تبصرہ کرتے ہوئے شذرات الذہب میں لکھتے ہیں کہ ہر تدلیس قابلِ مذمت نہیں ہوتی[۱] پھر تدلیس کے لغوی اور اصول حدیث کی رو سے معانی بیان کر کے لکھتے ہیں کہ متن حدیث کے اول و آخر کے کسی اضافے کی تدلیس اگر کوئی عمداً کرے تو وہ مجروح ہو گی اور اس کا کرنے والا مرام حرام کا مرتکب ہو گا لیکن اگر وہ اضافہ کسی نے بغیر کسی قصد کے کیا، وہم ڈالنے کے لیے نہیں کیا، تو یہ حرام نہ ہو گا۔ اس کی مثال دیتے ہوئے کثیر روایات میں سے جنھیں خطیب بغدادی نے تصنیف کی صورت میں جمع کیا ہے، ایک مثال عبد اللہ بن مسعود کے بیان کردہ تشہد کے آخری وہ جملے ہیں کہ "فان شئت ان تقوم و ان شئت ان تقعد فاقعد" حدیثِ مرفوع کا حصہ نہیں بلکہ ان کا اپنا کلام ہے، نووی اور بیہقی نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔ دوسری وہ قسم جو مکروہ ضرور ہے لیکن نقصان نہیں دیتی۔ یہ تدلیس ہے کہ کوئی اپنے شیخ کے کسی نام یا غیر معروف نام یا ایسے لقب کا جس سے کسی دوسرے کا گمان پیدا ہو، سلسلۂ سند میں ذکر کرے، مطلق مکروہ ہے۔ اس کے بعد تدلیس سند جہاں کوئی اس معاصر یا ملاقی کا ذکر کر دیا جائے جس سے سننا ثابت نہ ہو یہ بھی ترمذی کی اکثر روایات میں تدلیس پائی جاتی ہے جیسا کہ ابن شہاب زہری نے ابو سلمہ سے نہیں سنا لیکن اس حدیث کی سند عن ابن الشہاب عن ابی سلمہ عن عائشہ مرفوع ہے۔

"لا نذر فی معصیۃ وکفارتہ کفارۃ یمین" یہاں سلیمان بن ارقم عن یحییٰ بن ابی کثیر غائب ہے۔ چونکہ زہری کی شخصیت قابلِ اعتماد ہے، اس لیے اس روایت کو مذموم نہیں کہا گیا۔ یہی حال سلیمان بن مہران کا ہے۔ ان کا تقویٰ، ثبت، حفظ اور عدل اس وجہ کا ہے کہ وہ کوئی پیشہ ور مدلس نہیں بلکہ بے ارادہ اور سہواً احتیاط کا دامن چھوڑ بیٹھے۔ راوی کی عظمت کا بہرحال خیال رکھا جائے گا۔ اسے اس عیب کا سزاوار نہیں کہا جائے گا جو شعبہ نے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں:

تدلیس کی مبالغہ آمیز مذمومیت بہرحال محل نظر ہے۔ وہ روایات جہاں تدلیس کا امر سہواً یا غیر ارادتاً اعمش سے ہو گیا ہے، اعمش کی عظمت کے پیشِ نظر ان کے تقویٰ، زہد اور حفظ و ثقاہت پر حملہ آور ہونے کا سامان کبھی نہیں بن سکتیں۔

---

[۱] ابو الفلاح عبد الحی بن العماد، شذرات الذہب: ۱: ۱۴۰

قرأتِ قرآن

امام اعمش جہاں ایک ثقہ محدث تھے وہاں ایک جید قاری بھی تھے۔ آپ کو قرآنِ کریم سے حد درجہ وابستگی تھی۔ اس وابستگی پر آپ کو ناز تھا۔ فرماتے تھے:

ان اللہ زین بالقرآن اقواماً وانی ممن زینہ اللہ بالقرآن ولولا ذلک کان علی عنقی دن الطوف بہ فی سکک الکوفۃ [۱۳۰]

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس قرآن سے کئی قوموں کو زینت بخشی، اور میں بھی انہی میں سے ہوں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اس قرآن سے زینت عطا فرمائی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں غبار آلود گردن لیے کوفے کی گلیوں کا طواف کیا کرتا۔

سرزمین کوفہ میں جہاں آپ کی روایت حدیث کا چرچا تھا وہاں آپ کی قرأت کا شہرہ بھی زبان زد خاص و عام تھا۔ آپ نے قرأت ابراہیم النخعی، زر بن جبش، زید بن وہب، مجاہد بن جبر، ابو العالیہ الریاحی، یحییٰ بن وثاب اور عاصم الاحول جیسے مشہور قرا سے سیکھی۔ آپ کی حضرت عبد اللہ بن مسعود سے مروی قرأت کا سلسلہ سندیہ تھا:

کان الاعمش قرأ علی یحییٰ بن وثاب وقرأ یحییٰ بن وثاب علی عبید ابن فضیلہ الخزاعی وقرأ عبید ابن فضیلہ علی علقمہ وقرا علقمہ علی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم۔ [۱۳۱]

یعنی اعمش نے یحییٰ بن وثاب سے اور یحییٰ بن وثاب نے عبید ابن فضیلہ الخزاعی سے اور عبید ابن فضیلہ نے علقمہ سے اور علقمہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے قرأت سیکھی۔

آپ سے خلق کثیر نے قرأت سیکھی جن میں حمزہ الزیات، محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ، جریر بن عبد الحمید، زائدہ بن قدامہ، ابان بن تغلب، طلحہ بن مصرف، ابراہیم التیمی، منصور بن المعتمر، عبد اللہ بن ادریس اور ابو عبید بن معن الہذلی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ سے محمد بن عبد اللہ المعروف بہ زاہر اور محمد بن میمون نے حروف کی روایت کی۔

امام اعمش مرویاتِ عبد اللہ بن مسعودؓ میں سند مانے جاتے تھے۔ ابو اسحاق کا قول ہے:

---

[۱۳۰] شمس الدین محمد بن محمد ابن الجزری: طبقات القرا، ۱: ۳۱۵، مطبوعہ مطبعۃ السعادہ مصر ۱۹۳۳ء

[۱۳۱] ابن سعد: طبقات الکبریٰ، ۶: ۳۴۲: مطبوعہ بیروت ۱۹۵۷ء/۱۳۷۷ھ

ما بالکوفۃ منذ کذا و کذا سنۃ اقرأ من رجلین فی بنی اسد عاصم و الاعمش احدھما لقرأۃ زید والاخری لقرأۃ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم۔[۳۲]

یعنی فلاں فلاں سال سے کوفے میں ان دو آدمیوں سے بڑھ کر کوئی قاری نہیں ہوا جن میں ایک حضرت زید کی اور دوسرے حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرآت کی روایت کرتے ہیں۔

اسی طرح عاصم الاحول سے روایت ہے کہ اعمش کا ایک دفعہ قاسم بن عبدالرحمٰن کے ہاں سے گزر ہوا تو وہ کہنے لگے: "

ھٰذا الشیخ یعنی الاعمش اعلم الناس بقول عبداللہ بن مسعود۔[۳۳]

یہ شیخ یعنی اعمش تمام لوگوں سے حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایات کو زیادہ جانتے ہیں۔

انہی کا ایک قول ہے کہ:

لم یبق بالکوفۃ احد اعلم بحدیث عبداللہ من سلیمان الاعمش۔[۳۴]

کوفے میں عبداللہ بن مسعودؓ کی مرویات کا سلیمان بن مہران الاعمش سے زیادہ کوئی جاننے والا باقی نہیں رہا۔

ہشام فرماتے ہیں:

ما رأیت بالکوفۃ احدا اقرأ لکتاب اللہ عزوجل من الاعمش۔[۳۵]

میں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کا اعمش سے بڑھ کر کوفے میں کوئی قاری نہیں دیکھا۔

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ آپ چار چیزوں میں اپنے معاصرین پر فضیلت رکھتے ہیں، ان میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آپ سب سے بڑھ کر قرآن کے قاری ہیں۔[۳۶]

ابن سعد لکھتے ہیں:

کان الاعمش صاحب قرآن وفرائض وعلم بالحدیث۔[۳۷]

اعمش قرآن، فرائض اور علم حدیث کے ماہر تھے۔

---

[۳۲] ابوبکر احمد بن علی الخطیب البغدادی، تاریخ بغداد [illegible] مطبوعہ ۱۳۴۹ھ
[۳۳] ایضاً، ص ۱۰
[۳۴] خطیب بغدادی: تاریخ بغداد، ۹: ۱۰
[۳۵] جزری: طبقات القرا: ۱: ۳۱۵
[۳۶] ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب، ۱: ۲۲۰
[۳۷] ابن سعد: طبقات الکبریٰ، ۶: ۳۴۲

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں :

سلیمان بن مہران الاسدی الکاہلی ابو محمد الکوفی الاعمش ثقۃ، حافظ، عارف بالقراءۃ [۵۳۸]

سلیمان بن مہران اسدی الکاہلی ابو محمد کوفی الاعمش، ثقہ، حافظ حدیث اور قرأتِ قرآن کے ماہر ہیں۔

خطیب بغدادی اپنی کتاب "تاریخ بغداد" میں رقم کرتے ہیں :

کان من اقرأ الناس للقرآن واعرفهم بالفرائض واحفظهم للحدیث [۵۳۹]

آپ لوگوں میں قرآن کے عظیم القدر قاری، فرائض کے بہت بڑے عالم اور حدیث کے جید حافظ تھے۔

ہشیم کا قول ہے :

ما رأیت بالکوفۃ احداً اقرأ لکتاب اللہ عنہ [۵۴۰]

میں نے کتاب اللہ کا اعمش سے بڑھ کر کوفے میں کوئی بہتر قاری نہیں دیکھا۔

عجلی کہا کرتے تھے :

کان راساً فی القرآن [۵۴۱]

یعنی آپ قرآنی علوم کے سرتاج تھے۔

محمد بن عبد الرحیم اپنے شیخ علی سے یحییٰ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اعمش عابد و زاہد، صاحب کمال اور عالمِ قرآن تھے [۵۴۲]۔

طلحہ بن مصرف سے مروی ہے :

کنا نختلف الی یحیی بن وثاب نقرأ علیہ، والاعمش ساکت ما یقرأ۔ فلما مات یحیی بن وثاب فتشنا اصحابنا فاذ الاعمش اقرأنا [۵۴۳]

ہم یحییٰ بن وثاب کے ہاں جاکر ان سے قرأت سیکھا کرتے تھے۔ جو کچھ وہ قرأت کرتے، اعمش اسے خاموشی سے سنتے رہتے۔ آخر جب یحییٰ بن وثاب فوت ہو گئے تو ہم دوستوں نے باہم جائزہ لیا۔ اعمش ہم سب سے بڑھ کر قاری نکلے۔

---

[۵۳۸] ابن حجر، تقریب التہذیب : ۱۳۶

[۵۳۹] خطیب بغدادی : تاریخ بغداد : ۹ : ۳

[۵۴۰] ابن حجر، تہذیب التہذیب : ۴ : ۲۲۳

[۵۴۱] ایضاً

[۵۴۲] خطیب بغدادی : تاریخ بغداد : ۹ : ۸

[۵۴۳] ایضاً : ۹ : ۶

حجاج بن شعبہ کے بارے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :

سلیمان الاعمش احب الی من عاصم [۴۴]

یعنی سلیمان الاعمش مجھے عاصم سے زیادہ محبوب ہیں۔

فلاس کہتے ہیں :

کان الاعمش یسمی المصحف من صدقہ۔ [۴۵]

یعنی اعمش اپنے صدق کی وجہ سے "المصحف" مشہور تھے۔

ابن قتیبہ لکھتے ہیں کہ آپ پر قرأت کی نسبت حدیث کا زیادہ گہرا اثر تھا [۴۶]

عیسٰی بن موسٰی کی دعوت پر جب قرأ کی مجلس ہوئی۔ اس مجلس میں ابن ابی لیلیٰ اور شبرمہ جیسے صاحبِ کمال علماء و فضلاء جمع تھے۔ اعمش بھی تشریف لائے۔ عیسٰی بن موسٰی نے کہا کہ آج اعمش کے سوا قرآن کا کوئی قاری نہیں ملا [۴۷] اس کے علاوہ بھی انہی کا ایک قول ہے :

لم نر ولا القرن الذی کانوا قبلنا مثل الاعمش [۴۸]

یعنی ہم نے اور ہم سے ایک قرن پہلے کے لوگوں نے اعمش کی مثل کسی کو نہیں پایا۔

امام اعمش کی عمر کا اکثر حصہ تعلیم و تعلم میں گزرا۔ قرآن مجید کافی عرصے تک لوگوں کو پڑھاتے رہے۔ آخر عمر میں جب زیادہ کمزور ہوگئے تو یہ سلسلہ چھوڑنا پڑا لیکن شعبان کا مہینہ آتا تو قرآن باقاعدگی سے روزانہ پڑھانا شروع کر دیتے۔ یہ شعبان میں پڑھانے کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔

صحابہ کرام سے روایت

امام اعمش کا شمار صغار تابعین میں ہوتا ہے۔ [۴۹] آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے براہ راست فیض یافتہ اصحاب میں سے حضرت انس بن مالکؓ، سعید بن جبیرؒ، ابو وائلؒ، زید بن وہبؒ اور ابراہیمؒ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ [۵۰]

---

[۴۴] خطیب بغدادی : تاریخِ بغداد ، ۹ : ۷

[۴۵] ذہبی : تذکرۃ الحفاظ ، ۱ : ۱۳۴

[۴۶] ابن قتیبہ ، المعارف : ۲۱۴

[۴۷] خطیب بغدادی : تاریخ بغداد : ۹ : ۸

[۴۸] ایضاً

[۴۹] ذہبی : میزان الاعتدال ، ۲ : ۲۲۴

[۵۰] بخاری : تاریخ کبیر ، ج ۲ ، ق ۱ : ۱۳۶ ، مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۶۲ھ

رازی (متوفی ۳۲۷ھ) فرماتے ہیں:

رأی انس بن مالک ولم یسمع منہ۔[۵۱]

یعنی آپ نے حضرت انس بن مالکؓ کو دیکھا لیکن ان سے سماع نہیں کیا۔

ابن خلکان لکھتے ہیں:

رأی انس بن مالکؓ کلمہ لکنہ لم یرزق السماع علیہ ومایرویہ عن انس فھو ارسال اخذہ عن اصحاب انس وروی عن عبداللہ بن ابی اوفی حدیثاً واحداً۔[۵۲]

آپ نے انس بن مالک کو دیکھا، ان سے باتیں بھی کیں، لیکن حدیث کا سماع نہ ہوا۔ جو کچھ آپ نے ان سے روایت کیا ہے وہ مرسل ہے جو آپ نے حضرت انس کے شاگردوں سے حاصل کیا۔ آپ نے عبداللہ بن اوفی سے صرف ایک حدیث روایت کی۔

ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں:

رأی انس بن مالک وحفظ عنہ[۵۳]

یعنی آپ نے حضرت انس کو دیکھا اور حدیث حفظ کی۔

احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

منصور اثبت اھل الکوفہ ففی حدیث الاعمش اضطراب کثیر وروایۃ الاعمش عن انس منقطعۃ، ما یسمع عن انس بل صلی خلفہ۔[۵۴]

منصور اہل کوفہ میں سب سے زیادہ ثقہ حافظ حدیث ہیں۔ لیکن اعمش کی احادیث میں بہت اضطراب ہے۔ اعمش کی روایت حضرت انس سے منقطع ہے، اس لیے کہ آپ نے حضرت انس سے حدیث کا سماع نہیں کیا بلکہ صرف ان کے پیچھے نماز پڑھی۔

حافظ ابونعیم فرماتے ہیں:

رأی انساً وابن ابی اوفی وسمع منھما۔[۵۵]

آپ نے انس اور ابن ابی اوفی دونوں کو دیکھا اور دونوں سے حدیث کا سماع کیا۔

---

[۵۱] الرازی: کتاب الجرح والتعدیل: ۲ج، ۱ق، ۱۴۶، مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۰۲ھ

[۵۲] ابن خلکان: وفیات الاعیان، ۲: ۱۳۶، مطبوعہ قاہرہ

[۵۳] ذہبی: تذکرۃ الحفاظ: ۱: ۱۴۴

[۵۴] ذہبی: میزان الاعتدال، ۲: ۲۲۴، مطبوعہ داراحیاء الکتب العربیہ عیسٰی البابی الحلبی وشرکاہ ۱۳۸۲ھ۔ [۵۵] ایضاً

بزار بھی حضرت انس سے آپ کی سماعِ حدیث کے معترف تھے۔ آپ نے وہ حدیث بھی بیان کی، جس سے آپ کے سماع کا پتا چلتا ہے[۵۶]

حضرت وکیع اعمش کا ایک قول نقل کرتے ہیں:

رأیت انس بن مالک وما منعنی ان اسمع منه الا استغنائی باصحابی[۵۷]

میں نے حضرت انس بن مالک کو دیکھا، لیکن مجھے ان سے سماعِ حدیث نے صرف اس بات نے روکے رکھا کہ میں اساتذہ سے مستغنی ہو گیا تھا۔

ابن المدینی فرماتے ہیں:

لم یحمل عن انس، انما رآہ یخضب ورآہ یصلی[۵۸]

آپ نے انس بن مالک سے کچھ اور تو نہ لیا بلکہ انھیں خضاب لگاتے اور نماز پڑھتے ہوئے دیکھا

انھی سے ایک اور روایت ہے:

قال ابن المدینی الاعمش کان کثیر الوھم فی احادیث ھؤلاء الضعفاء[۵۹]

یعنی ان تمام ضعفا سے مروی احادیث میں اعمش کی حیثیت شدید توہم کا شکار ہو گئی

اسی طرح ابن معین حضرت انس سے آپ کی مرویات کو مرسل قرار دیتے ہیں[۶۰] ابو حاتم فرماتے ہیں کہ اعمش نے ابن ابی اوفی اور عکرمہ سے کچھ نہیں سنا[۶۱] ابن المناوی سے مروی ہے کہ آپ نے انس بن مالک کو دیکھا لیکن سماع نہ کیا[۶۲] ابن حجر فرماتے ہیں، ابوبکر ثقفی کے پیچھے آپ کو سواری کرنے اور ان کا آپ کو یہ کہنا کہ بیٹے اللہ نے تجھے فضیلت دی ہے، والی روایت محلِ نظر ہے۔ اس لیے کہ ابوبکر ثقفی تو ۹۵ھ میں انتقال کر گئے، حالانکہ اس وقت تک جناب اعمش پیدا بھی نہیں ہوئے تھے[۶۳] ابن حبان فرماتے ہیں کہ آپ نے حضرت انس کو واسط اور مکہ مکرمہ میں دیکھا۔ پچاس کے قریب روایات بھی انھوں نے نقل کی ہیں۔

---

۵۶ ذہبی: میزان الاعتدال: ۲: ۲۲۴ — ۵۷ بغدادی، تاریخ بغداد: ۹: ۳۰۹

۵۸ ایضاً — ۵۹ ذہبی، میزان الاعتدال: ۲: ۲۲۴

۶۰ ابن حجر: تہذیب التہذیب: ۴: ۲۲۳ — ۶۱ ابو حاتم الرازی: کتاب الجرح والتعدیل۔ ج ۲، ق ۱، ۱۴۶

۶۲ ابن حجر: تہذیب التہذیب: ۴: ۲۲۳ — ۶۳ ایضاً: ۲۲۵

جو حضرت انس سے انھوں نے روایت کی ہیں[۶۴] عبید اللہ بن موسیٰ حضرت اعمش کا ایک قول نقل کرتے ہیں جس سے ان پچاس روایات کی نفی ہو جاتی ہے۔ روایت ہے:

ما سمعت عن انس الا حدیثا واحداً یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم۔[۶۵]

یعنی آپ نے حضرت انس سے سوائے ایک حدیث کے اور کچھ نہیں سنا۔ وہ حدیث یہ ہے کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

رأی انس بن مالک و لم یسمع منہ شیئاً مرفوعاً و روی عن عبد اللہ بن ابی اوفی مرسلاً۔[۶۶]

یعنی آپ نے حضرت انس بن مالک کو دیکھا لیکن ان سے کوئی مرفوع حدیث روایت نہیں کی۔ عبد اللہ بن ابی اوفی سے آپ نے مرسل روایت کیا۔

مذکورہ بالا مختلف اقوال اور روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اعمش نے حضرت انس بن مالک کو دیکھا، ان کے پیچھے نماز پڑھی، چند آیات اور احادیث کو بھی سنا۔ اس کے علاوہ عبد اللہ بن ابی اوفی سے جو کچھ روایت ہے وہ مرسل ہے۔ باقی صحابہ کرام سے ملاقات ثابت ہے، لیکن کوئی روایت منقول نہیں۔ ابو بکر ثقفی سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے، اس لیے کسی روایت کے ان سے مرفوع انتساب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امام اعمش کی علم سے وابستگی

جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے امام اعمش کو قرآن و حدیث کے علوم پر عبور حاصل تھا۔ علم کی وجہ سے آپ اپنے معاصرین کے ہاں بلند درجے پر فائز تھے۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے جب ابن ابی لیلیٰ کو جو خود ایک بلند پایہ عالم تھے، فقہا کو دعوت دینے کے لیے کہا، اس دعوت میں جب اعمش کو عیسیٰ بن موسیٰ نے سادہ حالت میں دیکھا تو کہنے لگے کہ اے ابن ابی لیلیٰ میں نے تجھے فقہا کو دعوت دینے کے لیے کہا تھا۔ ابن ابی لیلیٰ فرمانے لگے کہ یہ شخص تو ہم سب فقہا کے سرتاج ہیں۔[۶۷]

---

[۶۴] ابن حجر: تہذیب التہذیب: ۴ : ۲۲۵ [۶۵] ایضاً

[۶۶] بغدادی: تاریخ بغداد: ۹ : ۴ [۶۷] ایضاً

سفیان بن عیینہ فرمایا کرتے تھے کہ آپ اپنے معاصرین کے مقابلے میں قرآن کے سب سے بڑھ کر قاری، فرائض کے بہتر طور پر جاننے والے اور حدیث میں ثقہ حافظ ہیں۔ اعمش اس قدر زیرک تھے کہ زہیر بن معاویہ فرماتے ہیں:

ما ادرکت احدا اعقل من الاعمش والمغیرۃ [۷۸]

یعنی میں نے اعمش اور مغیرہ سے بڑھ کر کسی کو صاحب عقل نہیں پایا۔

آپ کو اپنے زیورِ علم پر ناز تھا اور فرمایا کرتے۔

ارأیتم لولا انی تعلمت العلم من کان یاتینی لو کنت بقالا کان یقذرنی الناس ان یشتروا منی۔ [۷۹]

یعنی اگر میں علم نہ سیکھتا تو میرے پاس کون آتا؟ اگر میں سبزی فروش ہوتا تو لوگ مجھ سے خریدنے میں کراہت محسوس کرتے۔

ابن المدینی فرماتے ہیں کہ علوم امتِ محمدیہ کے حافظ صرف چھ ہیں۔

اہلِ مکہ میں عمرو بن دینار، اہلِ مدینہ میں محمد بن مسلم (ابن شہاب زہری)، اہلِ کوفہ میں ابو اسحٰق السبیعی اور سلیمان بن مہران الاعمش۔ اہلِ بصرہ میں یحیٰی بن کثیر ناقلہ اور قتادہ۔ [۸۰]

امام اعمش کی عبادت گزاری

حضرت اعمش علم و عمل کا مرقع تھے۔ قرآن و حدیث کا نور جہاں ان کی زبان سے پھیلا، وہاں ان کے عمل کی جاذبیت نے تشنگانِ علم و عرفان کے ذوق کو بالیدگی دی۔ آپ کا کردار قرآن و حدیث کے احکام کی تفسیر تھا اور آپ کا زہد و تقویٰ، کردار کی جاذبیت میں اضافے کا موجب تھا۔ عبادت گزار اتنے کہ نماز با جماعت میں صفِ اول کا حد درجہ اہتمام کرتے اور تکبیرِ اولیٰ فوت نہ ہونے دیتے۔ وکیع ابن الجراح سے مروی ہے:

بقی الاعمش قریباً من سبعین سنۃ لم تفتہ التکبیرۃ الاولیٰ۔ [۸۱]

یعنی اعمش نے ستر سال زندگی گزاری لیکن کبھی تکبیر اولیٰ تک فوت نہ ہونے دی۔

---

۷۸ بغدادی: تاریخ بغداد: ۹: ۹   ۷۹ ایضاً: ص ۶

۸۰ ایضاً: ۹: ۱۵   ۸۱ ذہبی: تذکرۃ الحفاظ: ۱: ۱۴۴

خریبی فرماتے ہیں :

مات یوم مات وما خلف احد من الناس عبد منه وکان صاحب سنة [۵۲]

یعنی اعمش انتقال کر گئے ، لیکن لوگوں میں اپنے آپ سے زیادہ کسی کو عبادت گزار نہ چھوڑا۔ آپ سنتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی پابند تھے۔

ابراہیم بن عرعرہ سے روایت ہے :

قال سمعت یحیٰی القطان اذ ذکر الاعمش قال کان من النساك وکان محافظا علی الصلوٰة فی جماعة وعلی الصف الاول [۵۳]

فرماتے ہیں میں نے یحیی قطان کو سنا کہ وہ جب کبھی بھی اعمش کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ وہ عبادت گزار لوگوں میں سے تھے۔ نماز باجماعت اور پہلی صف میں کھڑے ہونے کا حد درجہ اہتمام کرتے۔

ذہبی لکھتے ہیں :

کان رأساً فی العلم النافع والعمل الصالح [۵۴]

آپ علم نافع اور عمل صالح سے سرفراز تھے۔

وکیع بن الجراح سے روایت ہے :

اختلفت الیه قریباً من ستین سنة فما رایته یقضی رکعة [۵۵]

یعنی میں ان کے ہاں قریباً ساٹھ سال تک آنا جانا رہا ، لیکن انھیں میں نے کبھی ایک رکعت بھی قضا کرتے نہیں دیکھا۔

سیرت اعمش کے چند آثار

امام اعمش کی شخصیت قرآن و حدیث کے نور سے منور اور علم و عمل کی تصویر تھی۔ دنیا پرستی ، جاہ پسندی اور حرص و ہوا کا کوئی شائبہ ان میں نہ تھا۔ خدا خوفی اور احتساب آخرت نے ان کی زندگی کو سراپا عجز و انکسار اور زہد و تقویٰ بنا دیا تھا۔ لباس کی سادگی اور طبیعت کی نرمی آپ کی ہنستی مسکراتی شخصیت کا زیور تھی ۔ اگر کبھی کسی کو آپ سے رنجش ہو جاتی تو آپ پریشان ہو جاتے۔ صلح جوئی کے لیے

---

۵۲ ابن حجر : تہذیب التہذیب : ۴ : ۲۲۴ ۵۳ خطیب بغدادی : تاریخ بغداد ۹ : ۸

۵۴ ذہبی : تذکرۃ الحفاظ : ۱ : ۱۴۴ ۵۵ بغدادی : تاریخ بغداد : ۹ : ۹

طرح طرح کے طریقے اختیار کرتے۔ علاوہ ازیں یہ بات آپ کی سیرت میں ہمیشہ نمایاں رہی کہ ہر بات کو شدت سے محسوس کرتے اور اس احساس کا فوراً اظہار بھی کر دیتے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ اپنی بیوی سے تنازع ہو گیا تو ایک آدمی کو صلح کرانے کے لیے بلا لائے۔

آپ خوش طبعی سے بھی کبھی کبھی کام لے لیتے تھے۔ ایک دفعہ اپنے شاگردوں کے پاس آئے تو فرمانے لگے اگر گھر میں تمہاری نسبت زیادہ مجھ پر غضب ناک فرد نہ ہوتا تو میں تمہارے پاس نہ آتا[٥٦] اسی طرح ایک دفعہ آپ کے پاس ایک حدیث کا ذکر کیا گیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی تہجد کی نماز کے وقت سویا رہتا ہے اس کے کانوں میں شیطان پیشاب کر دیتا ہے۔

آپ کی سیرت میں استغنا کا وصف بڑا نمایاں تھا۔ معاشی طور پر اگرچہ تنگ دست رہے لیکن کبھی کسی سے مرعوب نہ ہوتے اور نہ کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز کیا۔ آپ کی مجالس میں آپ کا رعب، دبدبہ اور شخصی وقار چھایا رہتا جس کی وجہ سے امرا و سلاطین بھی ان مجالس میں اپنے آپ کو حقیر سمجھتے۔ عیسی بن یونس سے مروی ہے:

ما رأیت الاغنیاء والسلاطین عند احد احقر منهم عند الاعمش مع فقره وحاجته[٥٨]

یعنی فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی کے ہاں امرا و سلاطین کو ایسی عاجزانہ حالت میں نہیں دیکھا جس قدر اعمش جیسے تنگ دست اور محتاج کی مجالس میں دیکھا۔

امام اعمش پر فکر آخرت کا بڑا غلبہ تھا۔ فرمایا کرتے کہ لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے وقت اس بات سے نہیں ڈرتے کہ ان کی سیاہ کاریوں کا دھواں کہیں ان کے چہرے کو سیاہ نہ کر ڈالے۔ فرمایا کرتے کہ جب

---

٥٦ بطرس البستانی . دائرۃ المعارف : ۳ : ۷۰۰ مطبوعہ تہران ۱۳۹۵ھ

٥٧ الجزری : طبقات القرا : ۱ : ۳۱۵ ٥٨ خطیب بغدادی: تاریخ بغداد : ۹ ، ۸

فساد لوگوں کا شعار ہو جاتا ہے تو ان پر ان کے ظالم اور بدکار لوگ مسلط کر دیے جاتے ہیں۔ نیز فرماتے کہ مجھے اس بات کا خوف پریشان کیے رکھتا ہے کہ کہیں وضو کے بغیر خداوند کے حضور نہ جا پہنچوں، چنانچہ جونہی نیند سے بیدار ہوتے، جب تک پانی نہ ملتا، تیمم کر لیتے۔ فرمایا کرتے کہ موت کا بلاوا کسی وقت کا پابند نہیں۔ آپ لوگوں کو اس بات کی ہدایت کرتے کہ جب میں مر جاؤں تو میری موت کی کسی کو خبر تک نہ ہونے دیں، کیونکہ میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ لوگ میرے جنازے میں شریک ہوں[۷۹] آپ یہ بھی کہا کرتے کہ اگر یہ میری جان میری طاقت میں ہوتی تو اُسے میں ماں کے پیٹ کے اندر ہی ختم کر دیتا[۸۰]

زائدہ بن قدامہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اعمش کے پیچھے پیچھے چلتا گیا یہاں تک کہ آپ قبرستان میں پہنچ گئے۔ وہاں آپ ایک کھدی ہوئی قبر میں داخل ہو کر لیٹ گئے۔ پھر نکلے اور اپنے سر میں مٹی اڑاتے ہوئے زبان سے کہنے لگے کہ کیسی تنگ جگہ ہے![۸۱]

تصنیف و تالیف

آپ کی کوئی تصنیف و تالیف تذکروں میں نہیں ملتی۔ آپ کی روایات حدیث و قرآن مختلف کتابوں میں منتشر حالت میں پائی جاتی ہیں۔ ویسے یہ بات ثابت ہے کہ آپ اپنے شاگردوں کو لکھوایا کرتے تھے، لیکن انھوں نے آگے اسے مکمل کتابی شکل میں منتقل نہ کیا، بلکہ منتشر آرا کی صورت میں روایت کرتے رہے۔ محمد بن یزید سے روایت ہے کہ میں نے حفص بن غیاث کو کہتے سنا کہ ہماری تو حالت اعمش جیسی ہو گئی ہے کہ ہم کسی چیز پر اس وقت تک کلام نہیں کرتے جب تک کہ اسے لکھ نہ لیں[۸۲]۔ اسی طرح ایک اور روایت ہے جس سے آپ کی قرأت کی کتاب کا حوالہ ملتا ہے۔ اس روایت کو مروزی نے عمار بن الحسن سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

كان جرير اذا اراد ان يأخذ فى قراءة كتاب الاعمش قال انى اريد ان اخذ لكم فى ديباج الخسروانى[۸۳]

یعنی جب بھی جریر اعمش کی کتاب کی قرأت پر بات کرنے کا ارادہ کرتے تو کہنے لگتے کہ میں تمھارے لیے اب

---

۷۹ شعرانی : طبقات الکبریٰ، ۱ : ۳۹، مطبوعہ ۱۲۸۶ھ ۸۰ ایضاً

۸۱ ابن خلکان : وفیات الاعیان : ۲ : ۱۳۶ ۸۲ وکیع : اخبار القضاۃ، ۳ : ۱۸۴، مطبوعہ مصر ۱۳۶۹ھ

۸۳ بغدادی : تاریخ بغداد : ۹ : ۱۰

یہاں خسروانی کی صورت میں علم نہ لاؤں

ویسے عجلی کی وہ روایت جس میں بتایا گیا ہے کہ آپ کی کوئی کتاب نہیں تھی،[۵۸۴] اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی لکھائی گئی کتب اپنی اصلی حالت کے ساتھ آگے منتقل نہ ہوسکیں اور ضائع ہوگئیں۔

وفات

امام اعمش کے سن وفات میں تذکرہ نگاروں کا اختلاف ہے۔ محمد بن یحییٰ فرماتے ہیں کہ آپ نے ستاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ ابوعوانہ کا بھی یہی خیال ہے جس کے مطابق آپ ۱۴۷ھ میں فوت ہوئے۔ حضرمی سے روایت ہے کہ ابن نمیر نے ہمیں بتایا کہ آپ کی وفات اسی سن میں ہوئی۔ حسین بن حریث سے مروی ہے:

مات الاعمش وھو ابن ثمان وثمانین سنۃ وولد سنۃ ستین ومات سنۃ ثمان واربعین ومائۃ فی شھر ربیع الاول ومات الاعمش بعد منصور بست عشرۃ سنۃ۔[۵۸۵]

یعنی امام اعمش نے اٹھاسی[۸۸] سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ ۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ربیع الاول ۱۴۸ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کا انتقال منصور کی وفات سے سولہ[۱۶] سال بعد ہوا۔

بغدادی تمام مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد فیصلہ کرتے ہوئے یہی لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ آپ نے ۱۴۸ھ میں وفات پائی۔ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں، امام بخاری نے تاریخ کبیر اور صغیر دونوں میں اور تبریزی نے اکمال میں یہی سالِ وفات مذکور ہے۔

ہشام رازی فرماتے ہیں کہ میں نے جریر سے سنا کہ انھوں نے خواب میں اعمش کو دیکھا تو پوچھا کہ آپ کے کیسے حال ہیں؟ فرمانے لگے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور مغفرت کی وجہ سے نجات پا گئے ہیں۔ سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کی ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔[۵۸۶]

---

۵۸۴ ابن حجر: تہذیب التہذیب: ۴: ۲۲۳، مطبوعہ ۱۳۲۵ھ

۵۸۵ خطیب بغدادی: تاریخ بغداد: ۹: ۱۲ ۵۸۶ ایضاً، ص ۴

جناب غلام محمد کمبھی

اسلامی درس گاہیں

اسلام میں مدارس کا آغاز مساجد سے ہوا ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملحق وہ مشہور چبوترہ تھا جو تاریخ میں "صفہ" کے نام سے موسوم ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے یہاں جو حضرات فروکش ہوتے تھے وہ اصحاب صفہ کہلاتے تھے۔ ان کی تعلیم کے لیے معلم مقرر تھے۔ اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے جب کہیں مبلغ بھیجنا ہوتا تو یہی لوگ بھیجے جاتے۔[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تعلیم و تدریس کی جو اہمیت تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ مسجد نبوی میں تشریف لائے تو آپ نے وہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دو حلقے دیکھے۔ ایک حلقے میں لوگ تلاوت و دعا میں مشغول تھے اور دوسرے حلقے میں قرآن مجید کے درس کا سلسلہ جاری تھا۔ آپ نے فرمایا، انّما بعثت معلّماً۔[2] (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) ۔ یہ فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے حلقہ درس میں تشریف فرما ہو گئے۔

چوتھی صدی ہجری تک تعلیم و تدریس کا کام اسی طرح مساجد سے لیا جاتا رہا۔ اس زمانے میں مساجد کے پہلو بہ پہلو مدارس و مکاتب کے قیام کا مذاق عام تھا۔ اس نے ایسا قبول عام حاصل کیا کہ اب تک کم و بیش یہ سلسلہ ہر اسلامی ملک کی مسجدوں میں جاری ہے۔

موجودہ شکل کے باقاعدہ مدارس کا آغاز اسلام کی تاریخ میں پانچویں صدی ہجری سے ہوتا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ دنیائے اسلام میں پہلا مدرسہ نظام الملک طوسی (وفات ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ کے نام سے قائم کیا تھا، یہ صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت قدرت کی جانب سے اس اولیت کا شرف افغانستان کے نامور فرماں روا سلطان محمود غزنوی (وفات ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) کے لیے مقدر تھا۔[3] چنانچہ

---

[1] شبلی نعمانی: "سیرۃ النبی" جلد ۱، ص ۵۰۲، طبع اوّل۔ نامی پریس کانپور [2] سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء

[3] البدایہ والنہایہ، جلد ۱۲، ص ۳۳۲۔ مطبعۃ السعادۃ (راوی ابن کثیر)

۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء میں سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایۂ تخت غزنی میں ایک جامع مسجد تعمیر کی جو اپنی نفاست اور خوب صورتی کے لحاظ سے "عروسِ فلک" کے نام سے مشہور ہوئی۔ مسجد کے ساتھ سلطان نے مدرسے کی عمارت بھی تعمیر کرائی تھی۔ مدرسے کے ساتھ کتب خانہ بھی تھا جو نادر الوجود کتابوں سے معمور تھا۔ مسجد اور اخراجات کے لیے سلطان نے بہت سے دیہات وقف کر دیے تھے۔ ابو القاسم کا بیان ہے:

در جوارِ مسجد مدرسہ بنا نہادہ و بنفائس کتب و غرائب نسخ موشح گردانیدہ۔ دیہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف فرمود[۵۴]

مسجد کے قریب مدرسہ قائم کیا، مدرسے کے کتب خانے میں عمدہ اور کم یاب کتابیں جمع کیں، مسجد اور مدرسے کے اخراجات کے لیے بہت سے دیہات وقف کر دیے۔

سلطان کی اس مثال سے امرا اور ارکانِ دولت میں بھی مدارس قائم کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور تھوڑے ہی عرصے میں غزنی کے اطراف و جوانب میں بے شمار مدرسے قائم ہو گئے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ:

بمقتضائے الناس علیٰ دین ملوکہم ہر یکے از امرا و اعیان دولت بر بنائے مسجد و مدارس و رباطات و خوانق مبادرت نمودند[۵۵]

بادشاہ کی تقلید میں بمصداق "الناس علیٰ دین ملوکہم" امرائے سلطنت مسجدیں، مدرسے، رباطیں اور خانقاہیں تعمیر کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے لگے۔

غزنی اس زمانے میں اپنی آبادی کی کثرت اور تمدنی ترقی میں عالمِ اسلام کے سب سے بڑے مرکز اور خلافتِ عباسیہ کے پایۂ تخت بغداد کا مقابلہ کرتا تھا۔ پوری دنیا سے اہل فضل و کمال، متبحر علما اور باکمال شعرا اس کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔

سلطان محمود غزنوی کے فرزند سلطان مسعود (۴۲۲ھ/۱۰۳۰ء - ۴۳۲ھ/۱۰۴۰ء) نے بھی اپنے نامور باپ کی روایات کو برقرار رکھا۔ چنانچہ اس نے اپنی حدودِ مملکت میں بکثرت مدارس قائم کیے۔ فرشتہ کا بیان ہے:

در اوائل سلطنت او در ممالک محروسہ چنداں مدارس و مساجد بنیاد نہاد کہ زبانِ بیان از تعداد آں عاجز و قاصر است[۵۶]

---

[۵۴] تاریخ فرشتہ جلد اوّل، ص۳۰، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ   [۵۵] ایضاً   [۵۶] ایضاً

اپنے عہد حکومت کے شروع میں اس نے ممالک محروسہ میں اس قدر مدرسے اور مسجدیں بنوائیں کہ ان کی تعداد بیان کرنے سے زبان عاجز و قاصر ہے۔

اسلام، ہند میں

اسلام کی کرنیں اگرچہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں اور پہاڑوں کے دامنوں پر پہلی صدی ہجری ہی میں پڑنے لگی تھیں۔ ہندوستان کے شمال مغرب میں سندھ اور پنجاب تک مسلمان فاتحانہ انداز سے داخل ہو چکے تھے۔ ہندوستان کے جنوبی علاقے مالابار وغیرہ میں عرب تاجر چھا گئے تھے۔ عرب و ہند قدیم ترین زمانے سے ایک دوسرے سے تجارتی اور تہذیبی روابط سے منسلک رہے ہیں۔ ابن حوقل جو چوتھی صدی ہجری کا مشہور سیاح ہے، اپنے چشم دید حالات بیان کرتا ہے کہ بالعموم مسجدوں میں علما اور فقہا کا ایک بڑا گروہ مقیم رہتا ہے۔ ان علما و فقہا سے استفادہ کرنے والوں کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ جس مسجد میں بھی چلے جائیں، کھوے سے کھوا چھلتا نظر آئے گا۔[۵۷]

عرب تاجر بالعموم اہل علم اور اہل تصوف ہوتے تھے، بازاروں میں کاروبار کرتے، عوام سے ملتے، اپنی نیک اور سادہ زندگی کا عملی نمونہ پیش کرتے۔ لوگوں کی زندگی اور فکر و نظر بدل دیتے تھے۔ مشہور انگریز مصنف پروفیسر ڈبلیو آرنلڈ نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

ہندوستان کے مسلمانوں میں نو مسلموں اور ان کی اولاد کی تعداد زیادہ ہے جن کے تبدیلی مذہب میں جبر و تشدد کا ذرا بھی شائبہ نہیں ہے۔ اس تبلیغ میں صوفیا کی ترغیب کا اثر ہی کارفرما رہا ہے۔[۵۸]

ہند میں دینی درس گاہیں

وسط ہند میں مسلمانوں کی مستقل حکومت کا قیام ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں قطب الدین ایبک کے عہد (۶۰۲ھ/۱۲۰۵ء ـ ۶۰۶ھ/۱۲۰۹ء) سے شروع ہوتا ہے۔ ملتان میں ناصر الدین قباچہ نے جو وہاں کا حکمران تھا، ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ مشہور عالم و مصنف قاضی منہاج سراج (وفات ۶۵۰ھ/۱۲۵۹ء) کا بیان ہے کہ اس مدرسے کا انتظام و انصرام ان کے سپرد تھا۔ فرماتے ہیں:

---

۵۷ سفر نامہ ابن حوقل، ص ۳۲۵۔ مطبوعہ لائیڈن

۵۸ پریچنگ آف اسلام، ص ۲۵۴۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۶ء

دریں سال یعنی اربع وعشرین وستمائۃ در ماہ ذی الحجہ مدرسہ فیروزی اچھ حوالہ این داعی شد[۹]

ذی الحجہ ۶۲۴ھ میں "اُچ" کا مدرسہ "فیروزی" میرے سپرد کر دیا گیا۔

شیخ بہاء الدین زکریا (۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء — ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء) کا یہ ابتدائی زمانہ تھا۔ وہ روزانہ فجر کی نماز اس مدرسے میں پڑھتے تھے۔ اس دور کی دو اور درس گاہوں کا ذکر ملتا ہے، جن کے نام "مدرسہ مغربیہ" اور "مدرسہ ناصریہ" تھے۔

قباچہ نے مولانا قطب الدین کاشانی کے ماوراء النہر سے ملتان آنے کے موقع پر ایک اور درس گاہ قائم کی تھی، جس میں مولانا کاشانی مدتوں تعلیم و تدریس میں مشغول رہے[۱۰]

ہند میں دینی مدارس کا نقطۂ عروج

آٹھویں صدی ہجری تک ہندوستان میں اسلامی مدارس قائم کرنے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ چنانچہ مقریزی کی روایت کے مطابق سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء — ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) کے عہد میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے قائم تھے۔ مدرسین کے لیے خزانۂ شاہی سے تنخواہیں مقرر تھیں۔ تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک قرآن مجید کی حافظ اور عالم ہوتی تھیں۔ مدارس میں علومِ دینیہ کے ساتھ معقولات اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ خود محمد تغلق بہت بڑا فاضل اور علم دوست بادشاہ تھا۔ ہدایہ کی چاروں جلدیں سلطان کے برنوک زبان تھیں[۱۱]

محمد تغلق کے جانشین فیروز تغلق (۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء — ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) نے جس شان کے مدارس تعمیر کرائے اس کا اندازہ ضیا برنی کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ دہلی کا مدرسہ فیروز شاہی اپنی شوکت، خوبی، محل وقوع، حسن انتظام اور تعلیم کی عمدگی کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ مصارف کے لیے شاہی وظائف مقرر ہیں۔ مدرسے کی عمارت بہت وسیع ہے۔ ہر وقت سیکڑوں طلبا اور علما و فضلا یہاں موجود رہتے ہیں۔ باغات ہیں، فرش سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں۔[۱۲]

فیروز شاہ نے نہ صرف نئے مدارس قائم کرائے بلکہ پرانے مدارس کی بھی تجدید کی اور ان کے لیے بڑی

---

۹ طبقاتِ ناصری، ص ۱۲۴، مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۰ تاریخ فرشتہ، جلد دوم، ص ۴۰۸

۱۱ علامہ مقریزی: کتاب الخطط، جلد دوم، ص ۱۳۴ ۱۲ تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۵۹

بڑی جاگیریں وقف کر دیں۔[۱۳] اس نیک دل بادشاہ نے غلاموں اور ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ دی۔ غلاموں کو حفظِ قرآنِ مجید کے علاوہ دینی علوم کی تحصیل کا بھی موقع فراہم کیا جاتا تھا۔ ان کو صنعت و حرفت بھی سکھائی جاتی۔ شمس سراج عفیف کے بیان کے مطابق عہدِ فیروزی میں ۱۸۰۰۰ غلاموں نے علوم و فنون اور صنائع کی تعلیم حاصل کی۔[۱۴] فیروز شاہ نے لڑکیوں کی تعلیم کے بھی جداگانہ مدارس قائم کیے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے جنوبی ہند کے ایک مقام "ہنور" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہاں عورتیں حافظِ قرآن مجید ہوتی ہیں۔ میں نے اس شہر میں لڑکیوں کے تیرہ مکاتب دیکھے"[۱۵]

گجرات کے فرماں روا سلطان محمد عادل شاہ (۸۹۵ھ/۱۴۸۹ء — ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء) نے اپنی حدودِ سلطنت میں مدارس قائم کیے اور حکومت نے ان کی سرپرستی کی۔ بستان السلاطین کے مصنف نے گجرات کے ایک مدرسے کے بارے لکھا ہے:

"شاگردان راسفرۂ آثار آش و نان بوقت بریانی و مزعفر و بوقت شام نان گندم و کھچڑی و فی اہم یک ہون و بدون این کتاب ہائے فارسی و عربی مدد نمائند"[۱۶]

طلبا کو آثار کے دسترخوان سے صبح کے وقت آش و نان اور بریانی و مزعفر اور شام کے وقت گیہوں کی روٹی اور کھچڑی دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہر طالب کو ایک "ہون" دیا جاتا تھا اور فارسی اور عربی کی کتب بھی دی جاتی تھیں۔

سلاطین شرقیہ جون پور کے حکمران تھے، انھوں نے صدہا مدرسے تعمیر کرائے اور دنیا بھر سے علما و فضلا کو جمع کرکے ان کی عزت افزائی کی، ان کو گراں قدر جاگیریں دیں۔ جون پور میں اٹالہ مسجد کے ساتھ جو مدرسہ قائم ہوا تھا، اس کی عمارت اب تک موجود ہے۔ پاک و ہند کے مشہور اور بیدار مغز بادشاہ شیر شاہ سوری نے اس مسجد کے دار العلوم میں زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔[۱۷]

اٹھارویں صدی کے اواخر میں جون پور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل ہو گیا تھا۔ اس زمانے کے سرکاری کاغذات میں اس کی عظمت کے بارے میں لکھا ہوا ہے کہ "جون پور مسلمانوں کے علوم و

---

[۱۳] تاریخ فرشتہ، جلد اوّل، ص ۱۵۱
[۱۴] شمس سراج عفیف: تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۹۱، ۱۹۲۔
[۱۵] ترجمہ اردو سفرنامہ ابن بطوطہ، ص ۲۰۲۔ مطبوعہ نفیس اکیڈمی، کراچی۔
[۱۶] بستان السلاطین، ص ۴۱۹ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی
[۱۷] جون پور نامہ، ص ۴۴ و سیر المتاخرین، ص ۱۴

فنون کا مرکز اور علما کا مرجع تھا، جس کو "شیراز ہند" کہا جاتا تھا۔ وہاں بہت سے مدرسے قائم تھے ۔ ۔ ۔ محمد شاہ کے زمانے تک بیس مشہور مدرسے جون پور میں موجود تھے[۱۸]

سلطان سکندر لودھی نے اپنے عہد حکومت میں بکثرت سرائیں، مدرسے اور مسجدیں بنوائیں۔ ہندوؤں نے فارسی کی تعلیم اس کے عہد میں شروع کی[۱۹]

لکھنؤ میں شاہ پیر محمد نے مدتوں تک بزم تعلیم گرم رکھی۔ ان کے بعد اُن کے شاگرد ملا غلام محمد نقشبند نے اس مجلس کو اور زیادہ رونق دی ۔ شاہ پیر محمد کا مدرسہ اور خانقاہ لکھنؤ میں دریائے گومتی کے کنارے "ٹیلہ پیر محمد" کے نام سے مشہور ہے[۲۰]

مغلیہ دور کی اسلامی درس گاہیں

بادشاہ ہمایوں اور اکبر کے عہد میں بھی مدارس کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ دہلی میں اکبر کی رضاعی ماں ماہم بیگم نے ایک مدرسہ جاری کیا۔ اس کا تاریخی نام "خیر المنازل" تھا۔ اس کے کھنڈر نئی دہلی میں پرانے قلعے کے نزدیک موجود ہیں۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے "اخبار الاخیار" میں اپنی تحصیلِ علم کے سلسلے میں لکھا ہے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک دوسرے مدرسے کا رُخ کیا، جس کا نام انھوں نے "مدرسہ دہلی" لکھا ہے۔ آگے چل کر خود شیخ محدث کی مسندِ درس بھی اسی جگہ بچھی تھی[۲۱]

میر سید غلام علی آزاد رقم طراز ہیں کہ صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد کا علاقہ پانچ پانچ ، دس دس کوس کے فاصلے پر الگ الگ آبادی پر مشتمل ہے، یہ لوگ حکومت کے جاگیر دار ہیں۔ اس علاقے میں مدرسوں اور خانقاہوں کی کثرت ہے ۔ مدرسین و معلمین اور طالبانِ علم کے لیے دروازے کھلے ہیں ۔ اہلِ ثروت طالب علموں کی خدمت کو سعادت عظمی سمجھتے ہیں ۔ اسی لیے بادشاہ شاہ جہان کہا کرتے تھے "پورب شیراز ماست"[۲۲]

شاہ جہان کے عہد میں دہلی، لاہور، سیالکوٹ، احمد آباد اور جون پور علم و فن کے لحاظ سے ایسے مقامات تھے، جہاں ہندوستان کے علاوہ ہرات اور بدخشاں تک سے طالبان علم آتے تھے ۔ سیالکوٹ میں ملا کمال کشمیری

---

۱۸ مسلمانوں کی قدیم اسلامی درس گاہیں، ص ۴۲ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹ تاریخ فرشتہ جلد اول، ص ۱۸۷

۲۰ حیاتِ شبلی، ص ۱۰ ۲۱ اخبار الاخیار، ص ۲۹۲ ۲۲ ماثر الکرام، جلد اول، ص ۲۲۰-۲۲۱

کی مسندِ درس قائم تھی۔ اسی بادشاہ کے دور میں مسجد فتح پوری اور مسجد اکبر آبادی تعمیر ہوئیں۔ مسجد فتح پوری کا مدرسہ اسی دور کے "باقیات الصالحات" میں سے ہے۔ بد قسمتی سے مسجد اکبر آبادی حوادثِ روزگار کی نذر ہو چکی ہے۔ یہی وہ مسجد تھی جس میں شاہ عبد القادر دہلوی کا قیام رہا۔ مولانا محمد اسماعیل شہید اور مولانا فضل حق خیر آبادی نے اسی مسجد میں تحصیل علم کی تھی۔

۱۰۶۰ھ/۱۶۴۹ء میں شاہ جہان نے جامع مسجد کے قریب ایک عظیم الشان مدرسہ "دار البقا" تعمیر کرایا تھا۔ یہ مدرسہ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں ختم ہو گیا تھا۔ مفتی صدر الدین آزردہ نے اپنے زمانے میں اسے دوبارہ زندہ کیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی اس مدرسہ میں مقیم رہے ہیں[۲۳]۔ ۱۸۵۷ء میں جب جنگِ آزادی دم توڑ گئی تو انگریزی حکومت نے انتقاماً مفتی صاحب کی جائیداد ضبط کر لی اور مدرسہ دار البقا ختم ہو گیا۔

مغلوں کے دورِ حکومت میں اورنگ زیب عالم گیر (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء — ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء) کے عہد کی تعلیمی ترقیاں عام شہرت رکھتی ہیں۔ اورنگ زیب نے بڑے بڑے شہروں کے علاوہ دیہات و قصبات میں بھی مدارس جاری کیے۔ مدرسین کو جاگیریں دیں اور طلبا کے لیے وظائف مقرر کیے۔ لکھنؤ میں فرنگی محل کا دار العلوم مدرسہ نظامیہ اسی عہد کی یادگار ہے۔ ملا نظام الدین کو ۱۱۰۵ھ میں اورنگ زیب نے ایک عظیم الشان مکان دیا تھا۔ یہ "فرنگی محل" کے نام سے مشہور تھا۔ اسی مدرسے کا دیا ہوا نصابِ تعلیم تین صدیوں سے پاک و ہند کے مدارسِ عربیہ میں پڑھایا جا رہا ہے اور اس نصاب کو "درس نظامی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے[۲۴]۔

دہلی میں غازی الدین خان فیروز جنگ اول نے ایک مدرسہ اجمیری دروازے کے قریب قائم کیا تھا۔ یہی مدرسہ بعد میں "دہلی کالج" کے نام سے مشہور ہوا۔ مولانا رشید الدین خان دہلوی اور مولانا مملوک علی نانوتوی اس کالج کے صدر المدرسین رہے ہیں[۲۵]۔

رام پور میں مدرسہ عالیہ قائم تھا جو اب تک موجود ہے۔ والیٔ رام پور نواب فیض اللہ خان نے بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی کو بلا کر مدرس مقرر کیا تھا[۲۶]۔ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں ہمارے قدیم فارسی مورخین

---

[۲۳] سوانح قاسمی، ص ۲۹۔ اور واقعات دار الحکومت دہلی، جلد دوم، ص ۱۴۲ [۲۴] مولانا عنایت اللہ فرنگی: تذکرہ علمائے فرنگی محل

[۲۵] یہ مدرسہ ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء میں دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا [۲۶] ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، ص ۳۳

نے زیادہ تر بادشاہوں کی جنگوں اور سیاسی کارناموں کو بیان کیا ہے اور مسلمانوں کے تعلیمی کارناموں کا بہت کم ذکر ملتا ہے۔ سلاطین اور بزرگان کرام کی قبروں پر جو مقبرے تعمیر ہوتے تھے، ان کے ساتھ اردگرد بہت سے حجرے اور کمرے اس غرض کے لیے بنائے جاتے تھے کہ وہ مدرسوں کے کام آئیں۔ چنانچہ مقبرہ علاء الدین خلجی اور مقبرۂ ہمایوں وغیرہ اس وقت بھی دہلی، آگرہ، احمد آباد اور بیجاپور وغیرہ میں قائم ہیں۔ ان کی ہیئت خود ان کی تاریخ کو بتا رہی ہے[۲۷]

حکومتوں کی سرپرستی کے علاوہ خود مسلمانوں کا ذوقِ علم جو انھیں آبا و اجداد سے وراثت میں ملا تھا حکومتوں کے خزانے کا رہینِ منت نہیں رہا ہے۔ ہماری قدیم تعلیمی درس گاہیں اپنے لیے مستقل عمارتوں کی محتاج نہ تھیں۔ مسجدوں، خانقاہوں اور علما و امرا کے مکانات سے لے کر میدانوں تک تعلیم و تعلم کی بزم آراستہ رہتی تھی۔ عام طور پر نامور علما اپنے گھروں اور مسجدوں میں تعلیم دیتے تھے۔ علم کی اشاعت، تعلیم و تعلم، طلبا کی امداد و اعانت، کتابیں اور دوسری ضروریاتِ درس و تدریس کی فراہمی، مدارس کی تاسیس اور ان کے مصارف کے لیے جائیدادوں کا وقف کرنا، موجبِ خیر و برکت اور فلاحِ دارین کا باعث سمجھا جاتا تھا۔

عہدِ زوال میں درس گاہوں کی حالت

ہندوستان میں بارھویں صدی ہجری کا زمانہ بڑا پُر آشوب ہے۔ اسلامی سطوت و عظمت کو زوال آ رہا تھا، تعلیمی سرگرمیاں بھی سرد پڑ رہی تھیں۔ تختِ دہلی پر محمد شاہ متمکن تھا، جو اپنے لاابالی پن اور کثرتِ مے نوشی کے سبب "رنگیلا بادشاہ" مشہور تھا۔ مگر بایں ہمہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا مدرسہ اس دور میں روشنی کا مینار تھا۔ واقعاتِ دار الحکومت دہلی کے مصنف کا بیان ہے کہ "یہ مدرسہ کسی زمانے میں نہایت عالی شان اور خوب صورت تھا اور بڑا دار العلوم سمجھا جاتا تھا"[۲۸]

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبد الرحیم کے زمانے میں یہ مدرسہ اسی جگہ پر تھا، جہاں اب ان حضرات کے مزارات ہیں یہ جگہ "مہندیان" کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانے میں جب طلبا کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی اور یہ جگہ ناکافی ہو گئی تو محمد شاہ نے مدرسے کے لیے ایک بڑی حویلی عنایت کی۔ یہ جگہ کوچہ چیلان میں تھی۔ "واقعات دار الحکومت دہلی" کے مصنف لکھتے ہیں: "غدر کے ہنگامے میں مدرسہ برباد ہو گیا۔ اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں مگر محلہ شاہ عبد العزیز صاحب کے مدرسے کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے"[۲۹] بہرحال اسلامی مدارس کے قیام کا سلسلہ آغازِ اسلام ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

۲۷۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، ص ۱۰۰-۱۰۱
۲۸۔ واقعات دار الحکومت دہلی، جلد دوم، ص ۱۴۳
۲۹۔ ایضاً

ڈاکٹر سید مہدی غروی
ترجمہ: ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی

مِلّی حیاتِ نو اور ترقی میں اقبال کا کردار

ای خوشا قومی کہ جانِ او تپید   از گلِ خود خویش را باز آفرید[1]

سرزمینِ مشرق بڑی مدت سے ایک دوراہے پر کھڑی ہے، جس کا سبب یہاں کی اقوام کی یہ سوچ ہے کہ زندگی کو اپنی قدیم اور روایتی ڈگر پر ہی چلایا اور گزارا جائے یا مغربی تہذیب و تمدن اور فرنگ مآبی کو اپنا لیا جائے۔ کچھ سو سال پہلے ایران میں "فرنگستان" کے نام سے ایک رسالہ شائع ہوا کرتا تھا جس کے عنوان اور مندرجات کا سارا لبِ لباب اس جملے میں سمٹ آیا تھا:

ایران کے لیے ضروری ہے کہ وہ روحانی و جسمانی طور پر اور ظاہری و باطنی طور پر، ہر طرح سے فرنگ مآب (مغرب زدہ) بن جائے[2]

مغربی ایشیا کے کئی ممالک میں مختلف قسم کی تحریکیں اٹھیں، جن سب کا بنیادی مقصد اپنی مشرقی روایات اور تہذیب و تمدن سے دامن چھڑا کر مغربی تہذیب و تمدن کا دامن تھامنا تھا۔ ان تمام تبدیلیوں میں سب سے

---

[1] خوش بخت ہے وہ قوم جس کی روح میں تڑپ پیدا ہوئی اور اس نے اپنی مٹی سے خود کو دوبارہ پیدا کیا (حیاتِ نو حاصل کی)۔

[2] یہ جملہ درج ذیل عبارات کے آخر میں مذکور ہے:

دیا، ٹھہری، دو روس اور حیران کن تبدیلی ترکی میں حروفِ ہجا کے تغیر کی صورت میں رونما ہوئی۔ خود
ایران میں بھی اس قسم کی زبردست کوشش بروئے کار لائی گئی کہ کسی طرح حروفِ ہجا کی بجائے لاطینی حروف
کو رائج کر دیا جائے، لیکن چند دانشوروں کی ثابت قدمی کے نتیجے میں ایران اس انقلاب و تغیر سے محفوظ رہا
اصلاح و تغیر کا یہ مسئلہ روز بروز بڑھتا اور پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا۔ اگر ہم ان ادوار کی تاریخ کو ذرا کھنگالیں
تو پتا چلے گا کہ اس قسم کے پرجوش بلکہ ہزاروں حامیوں کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کا عقیدہ
ان سے ہٹ کر تھا۔ ان کے مطابق تمدن کی ظاہری شکل و صورت میں تبدیلی پیدا کر کے مغربی تمدن کے
جوہر اور اصل بنیاد تک رسائی ممکن نہیں۔ ان کے بقول روس کے شہنشاہ پیٹر اعظم نے یورپ سے رائج

جاپانی قوم
اپنی ظاہری زندگی میں نمایاں تبادیلی کیے بغیر مغرب کے علمی و صنعتی تمدن کے جوہر کے حصول میں کامیاب و
بامراد ٹھہری
حضرت علامہ اقبال نے اسی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اہلِ مشرق کو مشرقی ہی رہنا چاہیے
اور جدید تمدن کے ظواہر سے خاص احتیاط اور ضرورت کے تحت بہرہ ور ہونا چاہیے۔
ایران کے مرحوم دانشور علی شریعتی[۵۲] نے، جو مکتبِ اقبال کے پیروکار تھے، اس بات کو خوب صورت
جملوں میں بکمال احسن مجسم کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:
ہرچند جاپان کا تجربہ، اقبال کے مطمحِ نظر کے ضمن میں مثالِ کامل قرار نہیں دیا جا سکتا، پھر بھی روشن فکر
اربابِ فکر و دانش کے اس استدلال کو رد کرنے کے لیے کافی ہے کہ "یہ ممکن نہیں کہ صرف مغربی علم و صنعت

---

[۵۲] علی شریعتی مرحوم، ایران کے مشہور مفکر، دانش ور، اسلام پسندی اور تجدید بنائے اسلام کی تحریک کے بانیوں میں
اور ایران میں صحیح مشرقی تمدن کے پرزور حامی تھے۔ اگرچہ انھیں وفات پائے چند سال ہو چکے ہیں، لیکن ان کے شاگرد اور پیروکار
کبھی بھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ ایران کے اسلامی انقلاب کے دوران و قوع ان کے افکار ان کی تصویر کی طرح ان کی ان
کوششوں کی یاد دلاتے رہے جو انھوں نے ایرانی تحریکِ اسلامی کے پروان چڑھانے اور اسے عظمت بخشنے میں کیں۔ ہم نے
جو کچھ نقل کیا ہے وہ ان کی مختصر لیکن مشہور اور پُراثر کتاب "اقبال معمارِ تجدید بنای اسلامی" سے ماخوذ ہے۔

ہی حاصل کر لیا جائے اور اس کے ساتھ اپنے قومی تشخص، تہذیب و تمدن اور اخلاق کو بھی برقرار رکھا جائے۔"

جاپانی قوم جو ربع صدی کی قلیل مدت میں صنعت کے معاملے میں یورپ کے جدید ترین صنعتی ممالک سے بھی بازی لے گئی ہے مغرب پرستی اور جدت پرستی میں آئندہ ہزار برس تک بھی تہرانیوں اور ہمارے دوسرے روشن خیال اور تجدد پسند شہریوں کی گرد تک نہ پہنچ سکے گی۔ ذرا جاپانی عورت کو دیکھو کہ ایک طرف تو وہ اپنے ملک کی بنی ہوتی شاندار کار اور آج کی دنیا کے دیگر جدید ترین وسائل زندگی سے بہرہ ور ہے لیکن دوسری طرف اس کا لباس اور اس کی زینت و آرائش قدیم ہی کی طرح ہے اور اس کا خُلق اور اس کی مذہبی خو بو بھی وہی قدیم جاپانی خواتین کی سی ہے۔

جاپانی خاتون مغرب کے جدید لباس سے آشنا ہی نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایرانی یا افریقہ کی حبشی عورت پر نگاہ ڈالو آج کی اس پوری ماڈرن دنیا اور جدید تمدن میں سے اگر اس کے پاس کچھ ہے تو وہ صرف مجلہ " بوردا " کا ایک شمارہ ہے، اور اس پر بھی وہ اس قدر آزاد اور ماڈرن بنی ہوئی ہے کہ سوئٹزرلینڈ کی عورتوں کی پس ماندگی پر اس کا دل کڑھتا ہے۔

یہ تو واضح ہے کہ کوئی بھی صاحبِ دانش و بینش اور انصاف پرست اس بات کا حامی و قائل نہیں ہو سکتا کہ سرزمینِ مشرق آج جہاں کھڑی ہے وہیں کھڑی رہے اور ترقی و پیش رفت سے بہرہ مند نہ ہو اور عظیم اور باقوت جدید تمدن کے مقابل ڈٹی رہے اور مغربی علوم و فنون اور صنعت سے بے نیاز ہو جائے نہ تو علامہ اقبال اس سوچ کے طرف دار ہیں اور نہ سید جمال الدین ہی جو بلاشبہ سرزمینِ مشرق میں اتحاد اسلامی کے پہلے داعی تھے، اور نہ وہ اصحاب جو اقبال اور علی شریعتی کے مکتبِ خیال کے پیرو کار ہیں۔ ان تمام اربابِ فکر و رائے اور رہبرانِ اجتماعی کا یہ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کو حرکت میں آنا چاہیے تاکہ اس حرکت و عمل کی بدولت وہ اپنی ضروریات میں خود کفیل ہو سکیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے،

مردِ حق سرمایۂ روز و شب است　　زانکہ او تقدیر خود را کوکب است

(مردِ حق روز و شب کا سرمایہ ہے کیونکہ وہ اپنے مقدر کا ستارہ آپ ہے)۔

اور مولانائے روم نے صدیوں پہلے اسی مضمون کو اس انداز میں پیش کیا تھا:

آب کم جو تشنگی آور بدست　　تا بجوشد آبت از بالا و پست

(پانی کی تلاش میں نہ رہ تشنگی حاصل کر تاکہ تیرا پانی بالا و پست سے جوش مارے)۔

اور اقبال کے شاگردِ باوفا علی شریعتی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں :

"اسلام اپنے اس دورِ جمود و درماندگی میں قومیت کے تنگ چوکھٹے اور اپنے علاقائی ڈھانچوں میں محبوس و منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔ جب میں کہتا ہوں 'اسلام' تو اس سے میری مراد مسلمان اور اسلامی معاشرہ ہے اور اسلام کی بینشِ جہانی (عالمی بصیرت) اور جہان بینی (عقیدہ) فراموش ہو چکی ہے۔ وہ وحدت جس کی بنیاد اسلام نے ایک عالمی طرزِ فکر پر، کہ جو کسی خاص قومیت یا خاص سرزمین میں محدود نہیں ہے، ڈالی تھی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے، اور بد قسمتی سے مسلمان پھر گوشہ گیری اور خود میں کھوئے رہنے کے دور میں لوٹ آئے اور روایت، تاریخ، مختلف قسم کے جاہلی مذاہب کے مخلوط عناصر، غیر اسلامی افکار اور اسلام کے مسخ شدہ عقائد کے محدود چوکھٹوں میں محصور و محبوس ہو چکے ہیں۔ بہرحال آج اس قسم کے لائحہ عمل سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ اسلامی معاشرے کے روشن خیال، کہ ان میں ایرانی بھی شامل ہیں، ایک ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں وہ ان محدود چوکھٹوں یعنی قومیت پرستی وغیرہ کو توڑ سکیں جو زمانے نے ان کے عظیم انسانی و فکری پیکر کے گرد کھینچ رکھے تھے۔ اور یہ ایک دندان شکن جواب ہے ان لوگوں کے لیے جو یہ کہتے ہیں کہ رہبرانِ اسلام جمود اور سکون کے قائل و حامی اور ترقی و کمال کے مخالف ہیں ... اقبال کے پیغام کا نچوڑ کیا ہے ؟ میرا خیال ہے کہ اقبال کے یہ دو شعر اس کے پیغام کو کم از کم ہمارے اس زیرِ بحث موضوع کے بارے میں، بخوبی واضح کر دیتے ہیں :

علم تا سوزی نگیرد از حیات   دل نگیرد لذتی از واردات

علم اگر کج فطرت و بدگوہر است   پیشِ چشمِ ما حجاب اکبر است   (جاوید نامہ)

پیامِ اقبال اپنے من میں ڈوب کر اپنے وجود، تمدن، اپنے آئین و کیش اور اجتماعِ ملت کا سراغ پانا ہے۔ اپنی ذات سے شروع کریں اور خودی کے مواد یا مسالے کے ساتھ اپنی تعمیر بنیاد سے اٹھائیں۔ اس کے بعد تعمیرِ نو اور تزئین کے لیے دوسرے درجے کے مصالح و لوازم کی طرف متوجہ ہوں۔ سید جمال الدین کی طرح اقبال کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآنِ پاک کو پہچانیں اور بہتر زندگی کے لیے قرآن کریم سے کسبِ فیض کریں اور از آں پس دیگر اہم آثار، قوانین اور غیر اسلامی اسالیب کی تلاش و جستجو میں مصروف ہوں۔ اب جبکہ قرآن شناسی کی بات چل نکلی ہے تو اس ضمن میں اسلام کی ایک عظیم شخصیت شیخ محمد عبدہٗ کا ذکر بھی ضروری ہے جنھوں نے مسلمانوں کے رجوع الی القرآن اور قرآن کریم سے براہِ راست استفادہ

وبہرہ مندی کے سلسلے میں بڑا اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ شیخ مرحوم اس فکر کے مبدع تھے اور انھوں نے مصر میں کہ فکر و فلسفۂ اسلامی کے ایک بہت بڑے مرکز الازہر کا مستقر تھا، اپنی تحریک کی ابتدا کی تھی۔ محمد عبدہ نے اس حالت میں کہ تمام علمائے اسلام ان کے مخالف تھے، یہ اعلان کیا کہ فی الحال قدیم علوم کی تمام شاخوں کو چھوڑ دیا جائے اور صرف اور صرف قرآن کی واضح تفسیر اور لوگوں کو قرآن کی پہچان کرانے کی طرف توجہ دی جائے۔

ڈاکٹر شریعتی، شیخ کی اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"... ورنہ قرآن، جیسا کہ آج تک ہمارے یہاں معمول ہے، پڑھنے یا سمجھنے کے لیے نہیں ہے۔ اس کے معنی ہم پہ پوشیدہ ہیں۔"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کیا صرف استخارہ کرنے، نظر بد سے خود کو بچانے اور اسی قسم کے دوسرے کاموں اور توہمات کے لیے تعویذ وغیرہ کے کام آنے کے لیے ہے؟ یا علمی حلقوں میں مختلف بحثوں، مثلاً کسی فقہی فیصلے کی تلاش و توجیہہ یا روایت اختلافی کی جستجو یا درس معانی و بیان و بدیع کی خاطر صنائع بدیعی اور مثال وغیرہ ڈھونڈنے کے لیے؟

حقیقت یہ ہے کہ ادھر قرآن کریم کھلا اور ادھر (اس کی بدولت) حامل جمود معاشرے اور مدارس اور قدیم مکاتب کے زنگ و غبار آلود دروازے کھل گئے، اور ان میں اجتماعی اور سیاسی رجحان، غور و فکر، ذمہ داری اور آگاہی اور انسانی خود آگاہی، تعیین راہ اور راہ یابی کا شعور پیدا ہوا۔

رجوع الی القرآن کی تحریک کے فوراً بعد سید جمال الدین افغانی کی فکری تحریک کے ایک بیدار مغز مفکر محمد عبدہ کے ہاتھوں "جامعہ علمائے اسلامی" کے جدید مقولات اور نعرے تشکیل پذیر ہوئے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان اقوام کی بیداری زیادہ اسی قرآن شناسی اور ملی و دینی خود پسندی کی طرف توجہ کی مرہون منت ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں، یعنی اس دور میں کہ جب محمد عبدہ نے مصر میں قرآن شناسی کی تحریک (ایک ایسی تحریک جو شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کی مسلم اقوام کی بیداری کا سبب بنی) کا آغاز کیا، ایران میں بھی ایک اہم قدم اٹھایا گیا، ایک ایسا قدم جو مشرق کی مسلم اور غیر مسلم اقوام کی آزادی کی راہ میں بڑا اہم اور سندی حیثیت تھا... میرزا حسن شیرازی نے تمباکو کو حرام قرار دینے کا جو فتویٰ جاری کیا اس نے

جہاں مشرقی اقوام کو اپنے باہمی اتباط کی اہمیت کا احساس دلادیا وہاں اہلِ عالم کے دل پر مسلمان پیشواؤں کی طاقت کا بھی سکہ بٹھا دیا۔ آیت اللہ شیرازی کے فتوے کا متن یہ تھا:

(آج سے تنباکو کا استعمال، خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو، امام زماں سے جدال کے مترادف ہوگا)۔

یہ فتوی کچھ اس قدر موثر ثابت ہوا کہ لوگوں نے تنباکو اور حقے سے متعلق ہر قسم کے کاموں کو ہاتھ تک لگانا چھوڑ دیا، حتیٰ کہ شاہ کے محل میں بھی خود شاہ اور نائب شاہ وغیرہ کے لیے کوئی بھی حقہ تازہ کرکے نہ دیتا . . .

اقبال کہتے ہیں :

فارغ از خوف و غم و وسواس شو پختہ مثل سنگ شو الماس باش

حتیٰ کہ انھوں نے حرکت و افتخار سے عاری زندگی کے مقابلے میں موت کو بہتر قرار دیا ہے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں:

در جہان نتوان اگر مردانہ زیست ہمچو مردان جان سپردن زندگیست

آج نہ تو محمد اقبال ہمارے درمیان ہیں اور نہ علی شریعتی، دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے۔ لیکن ان دونوں حضرات کے، جنھوں نے حقیقت کے ساتھ زندگی بسر کی اور حقیقت پسندی میں اپنی جان دی، عالمانہ افکار آج بھی ایشیا کے اسلامی ممالک کے پورے معنوی ماحول پر چھائے ہوئے ہیں۔ اور ہم ایرانی تو حصولِ آزادی کی راہ میں خاص طور پر اقبال کے افکار کے بے حد مرہون ہیں۔ مرحوم شریعتی، علامہ اقبال کے بارے میں، جنھوں نے فارسی میں شاعری کی، جن کی سوچ اسلامی تھی اور طرزِ زندگی مشرقی تھا لیکن مغربی تمدن کے مظاہر سے بھی جنھیں کوئی پرخاش نہ تھی، اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

وہ ایک ایسا انسان تھا جس نے سیاسی بیداری کو انتہا تک پہنچا دیا کچھ اس طرح کہ بعض لوگوں نے اسے بیسویں صدی کی فقط ایک سیاسی شخصیت، ملی آزادی کا ایک راہنما اور استعماریت کا دشمن جانا) اور علمی و فلسفیانہ افکار میں بھی وہ اس مرتبہ و پایہ کا تھا کہ آج مغرب والے اُسے برگسان کی طرح کا معاصر مفکر اور فلسفی گردانتے ہیں جبکہ اسلامی تاریخ میں اسے غزالی کا ہم پلہ کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسی شخصیت تھا جسے ہم اسلامی معاشرے کے ایک مصلح کے طور پر جانتے ہیں جو انسانی اور اسلامی معاشرے اور ایسے معاشرے کی حالت پر غور و فکر کرتا ہے جس میں وہ خود زندگی بسر کر رہا ہے، اور جس کی نجات، بیداری اور آزادی کے لیے جہاد و سعی کرتا ہے، اور وہ نہ صرف علمی و فنی صورت میں . . . بلکہ ایک ذمہ دار

[illegible]
[illegible]

نامہ بر کبوتر

ڈاک جسے نظام برید بھی کہتے ہیں، حکومتوں اور رعایا کے قیام و بقا کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ سلسلہ دور قدیم سے کسی نہ کسی شکل میں ضرور قائم رہا ہے اور اس میں ہر زمانے کے حالات کے مطابق رد و بدل ہوتا رہا ہے اور اسے مفید و موثر بنانے کے لیے نئی نئی اختراعات عمل میں آتی رہیں۔

کبوتروں سے بڑے بڑے کام لیے جاتے تھے۔ یہ نامہ بری کے کام بھی آتے تھے لیکن یہ کام اس طرح کثرت سے نہیں لیا گیا جیسا کہ دوسرے ذریعوں سے۔ پھر بھی آڑے وقتوں میں جب خبر رسانی کے دوسرے طریقوں سے افشائے راز کا اندیشہ ہو تو ان پرندوں کو اس کام کے لیے موزوں سمجھ کر قاصد کا کام لیا جاتا رہا اور ان وفادار پرندوں نے بھی ان پرآشوب اوقات میں اس نازک کام کو اس ہمت اور رازداری سے انجام دیا کہ جیسی ضرورت تھی۔

ظہور اسلام کے بعد اہل عرب اس کی طاقت پرواز وغیرہ سے بخوبی واقف تھے۔ تاریخ سے ایسی کئی مثالیں دستیاب ہیں۔ ۶۴ھ میں مروان بن حکم نے دمشق سے عبیداللہ بن زیاد کو یہ حکم لکھا:

"مرگ یزید کے سبب فوج میں گھبراہٹ ہے۔ جس وقت تمھارے پاس یہ حکم پہنچے خزانہ لے کر فوراً چلے آؤ اور کوفے کو چھوڑ دو تاکہ سلطنت کے معاملے میں کوئی تدبیر کی جائے۔ خبردار یزید کی موت سے کوئی شخص آگاہ نہ ہو۔"

عبیداللہ نے اپنے بیٹے عمر کو شہر کوفے میں چھوڑ رکھا تھا اور خود بصرے میں تھا۔ اس واسطے یہ خط اس کے بیٹے کو ملا، جس نے باپ کو لکھا۔

"یزید کے مر جانے سے ملک شام میں پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ عراق میں اس واقعہ کی خبر نہیں۔ غور کریں اس موقع پر کیا کرنا چاہیے۔ آپ میرے پاس پہنچیں گے یا میں آپ کے پاس آؤں۔ جو کچھ کرنا ہو اہل عراق کو یزید کی وفات کی خبر ملنے سے پہلے کر لینا چاہیے۔"[1]

---

[1] کتاب "مختار نامہ" ص ۶۶۸

یہ خط کبوتر کے گلے میں باندھا۔ اس کے پاؤں میں سونے کی پنجنیاں ڈالی گئیں تاکہ جس وقت یہ کبوتر ان کے مکان پر جا کر بیٹھے، اس کے پکڑنے کی ضرور کوشش کی جائے۔ اس کبوتر کو اڑا دیا گیا۔ جب کبوتر شہر بصرے پہنچا تو خط کو کبوتر کے گلے سے کھولا اور پڑھا گیا۔

جن ایام میں مشرق و مغرب باہم متصادم تھے اور صلیبی جنگیں جاری تھیں۔ اس وقت قدم قدم پر اس امر کی ضرورت بڑی شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی کہ ڈاک کے نظام کو زیادہ سے زیادہ موثر بنایا جائے تاکہ یورپ سے آنے والے صلیبی لشکروں کی نقل و حرکت، ان کی جنگی تیاریوں اور منصوبہ بندی کی اطلاعات بروقت مسلمان کیمپ میں پہنچتی رہیں۔ نور الدین زنگی نے معمولی ڈاک (بریہ) کے علاوہ کبوتروں کی ڈاک بھی جاری کی۔ عربی میں انھیں "الحمام الرسائلی" کہتے ہیں۔ اس نظام کو تھوڑے ہی عرصے میں عراق اور مصر میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہو گئی اور حکومت اس پر خاص توجہ مرکوز کرنے لگی اور اس سلسلے میں پورے اہتمام ہونے لگے۔ چنانچہ ڈاک کے کبوتروں کے لیے چوکیوں اور بام خانوں کے علاوہ یکساں فاصلے پر برجیاں بنائی جانے لگیں۔ یہ انتظام اتنا باقاعدہ تھا کہ اس پر خورده گیری نہیں ہو سکتی تھی۔ ان برجیوں کو عربی کتب میں برج الحمام اور کبوتروں کے لیے ترتیب منازل کا کام "تدریج الحمام" کہلاتا تھا۔ نامہ بر کبوتروں کی نسل خاص تھی۔

نور الدین زنگی کے زمانے کے بعد نامہ بر کبوتروں کو پالنے اور رکھنے کا شوق امرا اور بادشاہوں میں عام ہو گیا تھا۔ ان کبوتروں کی مانگ اتنی بڑھ گئی تھی کہ ایک ایک کبوتر کی قیمت سات سات سو اور آٹھ آٹھ سو دینار ہو گئی۔ علامہ قلقشندی کہتے ہیں کہ ایک کبوتر جو قسطنطنیہ سے بصرے خط لے کر آیا تھا، ایک ہزار دینار پر فروخت ہوا۔ ایک انڈے کی قیمت بیس دینار ہو گئی۔ عمدہ نسل کے کبوتروں کے نسب نامے سرکاری دفتروں میں محفوظ رکھے جاتے تھے اور انھیں "انساب الحمام" کہتے تھے۔ ان پر کتابیں لکھی گئیں، چنانچہ قاضی محی الدین بن عبد الظاہر کی کتاب "تمائم الحمائم" کا ذکر اکثر مورخوں نے کیا ہے۔ شاعر مشہور کبوتروں کی مدح میں قصائد بھی لکھتے تھے۔

جب تیمور نے شام فتح کیا اور ارد گرد کے علاقوں کا امن و امان خس و خاشاک کی طرح بہ گیا اور نظم و نسق درہم برہم ہو گیا تو یہ سلسلہ بھی درہم برہم ہو گیا۔ علامہ قلقشندی کہتے ہیں کہ میرے زمانے (یعنی نویں صدی ہجری) میں کبوتروں کی ڈاک کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ لیکن اس سے پہلے مصر و شام میں علاوہ سرکاری

کاموں کے کبوتروں کے ذریعے عوام کو ضروری واقعات کی اطلاعات بھی بہم پہنچائی جاتی تھیں۔

فخرالدین عراقی (جو بڑے معروف شاعر تھے) نے جب قاہرہ سے دمشق کا سفر کیا تو ملوک سلطان بیبرس اوّل نے راستے کے سب شہروں کو کبوتروں کے ذریعے سے اس کی آمد کی اطلاع بھجوادی تاکہ لوگ ان کے استقبال کی تیاری کر سکیں۔

فاطمی خلفا نے ڈاک رساں کبوتروں کی پرورش کے لیے نہایت اعلیٰ انتظامات کیے تھے۔ علامہ قلقشندی کہتے ہیں کہ ایک مستقل دفتر ان کبوتروں کے نسب نامے محفوظ رکھنے کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں قلقشندی ایک عجیب واقعہ بیان کرتے ہیں :

" ایک دفعہ خلیفہ العزیز اپنے وزیر یعقوب کلسی سے کہنے لگا کہ میں نے القراصیہ (سیاہ انگور جیسا پھل) کے دانے ایک مدت سے نہیں دیکھے۔ وزیر نے اسی وقت دمشق کے گورنر کو کبوتر کے ذریعے چٹھی بھیجی کہ جتنے حمام زاجل (ڈاک رساں کبوتر) وہاں ہیں، سب کے پروں میں تھوڑے تھوڑے قراصیہ کے دانے باندھ کر مصر کی جانب اڑا دو۔ چنانچہ دن ختم نہ ہوا تھا کہ یہ دانے جمع کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیے گئے۔"

خلفائے فاطمیہ شمالی افریقہ کے صوبیداروں سے کبوتروں کے ذریعے ہی خط و کتابت کرتے تھے۔ دورانِ جنگ میں یہ کبوتر محصورین کے لیے نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوتے تھے۔ ایسے حالات میں تمام نامہ و پیام انہی کے ذریعے ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ طریق کار خطرے سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ اگر کسی طرح کبوتر دشمن کے ہاتھ آجاتا تو تمام راز افشا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ۳۲۸ھ کا واقعہ ہے کہ خلیفہ حکم کے ایک کاتب نے دشمنوں سے سازباز کر رکھی تھی۔ حکم کے آدمیوں نے کاتب کے چھوڑے ہوئے کبوتروں میں سے ایک کبوتر کو گرا کر خط پڑھ لیا، اور پھر یہ خط حکم کے سامنے پیش کر دیا۔ کاتب سے باز پرس کی گئی وہ انکار نہ کر سکا۔ لہٰذا قتل کر دیا گیا۔

مغلیہ دَور

ابوالفضل لکھتا ہے کہ "رتھہ کبوتر نامہ آوری میں مشہور ہے اور ہر حسین ان کو یہ کام سکھاتے ہیں کہ وہ دور دراز کے مقام سے خط لے آتا ہے"[۱۲]

---

[۱۲] آئینِ اکبری جلد اول۔ ص ۱۵۶

باوجودیکہ سرکار اکبری میں اس وقت بیس ہزار سے زیادہ قسم کے کبوتر موجود ہیں مگر پھر بھی اس جانور کی قسموں کی انتہا معلوم نہ ہوئی۔[۵]

شہنشاہ جہانگیر ۱۲ سن جلوس کے واقعات بیان کرتے ہوئے اپنی توزک میں لکھتا ہے کہ: "میں نے نامہ بر کبوتروں کے متعلق بہت سی باتیں سنی تھیں کہ خلفائے بنی عباس کے زمانے میں بغدادی کبوتروں کو جنھیں نامہ بر کہتے تھے، اور بلاشبہ جنگلی کبوتروں سے ان کے دس پندرہ پر بڑے ہوتے تھے، نامہ بری سکھائی جاتی تھی۔ میں نے کبوتر بازوں سے کہا کہ ان صحرائی کبوتروں کو بھی نامہ بری کے لیے سدھائیں۔ چنانچہ انھوں نے کبوتروں کے چند جوڑوں کو اس طرح سدھایا کہ دن کے اوّل حصے میں ہم ان کو مانڈو سے اڑاتے تھے اگر کثرت سے بارش ہوتی تھی تب بھی وہ زیادہ سے زیادہ ڈھائی پہر میں ورنہ ڈیڑھ پہر میں برہان پور پہنچ جاتے تھے۔ اگر ہوا صاف ہوتی تھی اور بارش وغیرہ نہیں ہوتی تھی تو ان میں سے اکثر ایک پہر میں برہان پور پہنچتے تھے اور بعض کبوتر چار گھڑی میں بھی پہنچتے تھے۔"

ان کبوتروں کی یادداشت بہت ہی حیرت انگیز ہے۔ وہ اپنے گھر کو خوب پہچانتے ہیں اور برسوں بعد بھی نہیں بھولتے۔ جن لوگوں کو سفر میں بڑے اہم کام پڑتے ہیں وہ ایسے بھروسے کے کبوتر پال لیتے ہیں اور جب کہیں سفر پر جاتے ہیں تو ان میں سے ایک دو کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر مطلب کی بات لکھ کر کاغذ ایک کبوتر کے گلے میں باندھ دیتے ہیں جسے لے کر وہ سیدھا گھر پہنچ جاتا ہے۔

کبوتر سات سو میل تک اڑ سکتے ہیں۔ ان کی پرواز بہت تیز ہوتی ہے۔ عام طور پر کبوتر ۷۵ میل فی گھنٹہ کے حساب سے اُڑتا ہے۔ وہ اس سے بھی زیادہ تیز اُڑ سکتا ہے۔ کبوتر فضا میں سیدھا پرواز نہیں کرتا۔ لمبی پرواز میں کبوتر اکثر راستہ کھو دیتے ہیں یا تھک کر ہمت ار دیتے ہیں۔ وہ دھند اور کہر میں اکثر اپنا راستہ بھول جاتے ہیں۔

ماضی قریب کے چند واقعات

۱۸۱۵ء میں مدراس کی جرنیلی قواعد میں کرنل انڈروڈ نے مصنوعی جنگ میں کبوتروں کے ذریعے

---

[۵] آئین اکبری، ج ۱، ص ۱۵۵

خبر پہنچانے کا تجربہ کیا۔ کہتے ہیں جب جنگ ختم ہوئی۔ سینچر کا دن تھا۔ کرنل موصوف نے مقام بالاویرم سے ایک کبوتر کے گلے میں (جو نظام الدین بہادر کا تھا) خط باندھ کر سینٹ تھرمی کی طرف جہاں کا یہ کبوتر تھا، سوا آٹھ بجے صبح اُڑایا۔ ساڑھے آٹھ بجے یعنی صرف پندرہ منٹ کے عرصے میں یہ کبوتر اپنے مکان پر جا پہنچا۔

" ماہ جولائی ۱۸۸۸ء میں اسی طرح کا ایک اور تجربہ ہوا، جس میں ایک کبوتر اڑھائی گھنٹے میں ایک سو ستر میل اُڑا۔"[۵۴]

ایک اخبار لکھتا ہے: "چند سال سے یورپ میں عقلمندوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ حتی الامکان جنگ کے وقت نامہ بر کبوتروں سے کام لیا جائے۔ اس ضمن میں بہت سی آزمائشیں جرمنی، فرانس اور اٹلی میں ہوئی ہیں، جن سے دریافت ہوا کہ ان پرندوں پر کہاں تک اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ ان تجربات سے ایسا حوصلہ پیدا ہوا کہ اٹلی میں ہر صدر مقام پر غول کے غول کبوتروں کے ایک افسر کی نگرانی میں پرورش پا رہے ہیں۔ یہ کارروائی انگلستان میں بھی شروع ہوئی ہے۔ کبوتروں سے جنگی نامہ بری کا کام لینے میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ جس مقام سے یہ چھوڑے جائیں وہاں پر پھر واپس آئیں، اس مقام کو ان کا واپس آنا آسان ہے، جبکہ وہ اپنا گھر پہچانتے ہیں۔ ان کو دوہرا سفر سکھانا چاہیے۔ اسی وجہ سے اٹلی کے ایک باشندے نے مقام منتقل کرنے کی (واپس لوٹ آنے کی) آزمائش کی ہے لیکن یہ بہت دقت طلب کارروائی ہے۔"[۵۵]

نامہ بر کبوتروں کی ٹریننگ

کبوتر جب دو یا تین ماہ کا ہو جاتا ہے تو اس کی ٹریننگ شروع ہوتی ہے۔ پہلے اسے گھر سے ایک میل کے فاصلے پر لے جا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ فاصلہ بڑھاتے جاتے ہیں۔ کبوتر کے اندر یہ جذبہ فطری طور پر موجود ہوتا ہے کہ وہ اپنا گھر نہیں بھولتا اور لوٹ لوٹ کر وہاں آتا ہے۔ جب اسے اتنی مہارت ہو جاتی ہے کہ وہ سو سوا سو میل کے فاصلے سے گھر لوٹنے لگتا ہے تو پھر اُسے دوسرے

---

۵۴ اخبار امپیریل پیپر لاہور۔ اشاعت ۲۷ فروری ۱۸۹۲ء

۵۵ "پٹیالہ" اخبار۔ اشاعت ۱۱ مارچ ۱۸۹۲ء

کبوتروں کے مقابلے میں اُڑاتے ہیں

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھیں راستہ کیسے معلوم ہوتا ہے؟ چھوٹے کبوتر اپنی اُڑان کی ابتدا میں اپنی ملکی سرحدوں کے امتیازی نشانات سے خوب اچھی طرح واقف ہوجاتے ہیں۔ جب کبوتروں کو کسی نامعلوم مقام پر لے جاکر چھوڑتے ہیں تو وہ اُڑ کر پہلے فضا میں چکر کاٹتے ہیں اور پھر اپنا راستہ اختیار کرلیتے ہیں۔ آخر وہ کون سی شے ہے جو پرندوں کو گھر کا راستہ دکھاتی ہے؟ نئے پرندوں کو شروع شروع میں ایک خاص سمت سے اُڑ کر گھر پہنچنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے، مثلاً شمال سے جنوب کی طرف اڑان۔ ان کے مقابلے کے وقت میں بھی انھیں اسی سمت میں اڑایا جاتا ہے۔ ممکن ہے اپنی ملکی سرحدوں کے امتیازی نشانات کے ساتھ ساتھ ان پرندوں کو یہ بھی معلوم ہوجاتا ہو کہ ان کا گھر کس طرف ہے۔ لیکن آخر ان پرندوں کو اس بات کا کیسے علم ہوجاتا ہے کہ شمال یا جنوب کس جانب ہے؟ شاید سورج کی مدد سے وہ سمت کا اندازہ کرلیتے ہوں۔ کیونکہ رات کے وقت وہ عموماً راستہ بھول جاتے ہیں۔ اگر اسے درست تسلیم کرلیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کبوتروں کو دن کے اوقات کا علم ضرور ہوگا، مگر یہ کوئی ایسی ناممکن بات نہیں۔ کیونکہ اکثر حیوانات میں وقت کی حس ضرور موجود ہوتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اکثر کبوتر کو شمال سے جنوب کی طرف پرواز سکھانے کے بعد اسے مخالف سمت میں چھوڑ دیا جائے تو وہ آسانی سے لوٹ آتا ہے۔

فارسی شاعری میں کبوتروں کے ذریعے عشاق کی نامہ بری کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ چنانچہ چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ یارب چہ گل شگفت زمکتوب ما کہ باز — بادِ صبا ملول و کبوتر گرفتہ است

۲۔ اے کبوتر گر پری برگردِ بام آں پری — نامہ ات برگردنت بندم گر آنجا بگذری

۳۔ نافہ می زیبد بخاک از سایہ مرغِ نامہ بر — تا زوصفِ کاکل او شد معنبر نامہ ام

۴۔ قلم زنشارِ نامش زدست ما افتند — بجائے نامہ برد ہوشِ ما کبوتر ما

۵۔ احوالِ ما زحوصلۂ نامہ پیش بود — برخی ازاں ببالِ کبوتر نوشتہ ایم

۶۔ عقدۂ مکتوب ما را از کشادن بہرہ نیست — ایں گرہ بیہودہ بر بالِ کبوتر می زنیم

۷۔ شب کہ شوقِ رقم نامۂ دلبر می شد — دیدہ ہر قطرہ کہ می ریخت کبوتر می شد

۸۔ چو بستم نامہ بر بال کبوتر بستہ شد پایش — تو گوئی حلقۂ دام است نقش مہر مکتوبم

۹۔ زہے بشوق تو پرواز مرغ نامہ ما — صدائے بال کبوتر صریر خامہ ما

۱۰۔ نامہ شوق ترا در خواب اگر افشا کنم — چوں کبوتر زیر سر پر می زند بالین ما

۱۱۔ اضطراب دل نمی دانم و لیکن نامہ ام — ہم چو نبض خستہ بر بال کبوتر می تپد

۱۲۔ می گریزی اے کبوتر چند از مکتوب من — نامہ ام آخر بیاض سینۂ شہباز نیست

۱۳۔ یاد آں شوقی کہ مکتوبم بغیر از دل نبود — استخوان سینہ چون بال کبوتر داشتم

۱۴۔ تا برد سویش کبوتر نامہ چندان سودہ ام — دیدہ بر پایش کہ پائش را بخون آلودہ ام

۱۵۔ سرخی چشم کبوتر ہیچ می دانی کہ چیست — نامہ ام می برد و بر درد دلم خون می گریست

۱۶۔ چون چراغ زیر دامن از حدیث آتشین — می درخشد از تہ بال کبوتر نامہ ام

۱۷۔ تا چہ آرد بر سر بال کبوتر نامہ ام — خامہ ام بردم ز بار درد دل خم می شود

۱۸ جواب نامۂ ما غیر نا امیدی نیست — ز دست سودن بال کبوترم پیداست

۱۹۔ بسکہ دارد اشتیاق دیدن مطلوب ما — بال بر بال کبوتر می پرد مکتوب ما

آخر میں اس سلسلے میں اردو کے دو شعر پیش کیے جاتے ہیں:

جہاں جاتے ہوئے پلک صبا کے ہوش اڑتے ہیں — عریضہ لے چلا ہے حوصلہ دیکھو کبوتر کا

قدرت خدا کی دیکھو کبوتر کا گر گیا — وہ پر کہ جس میں تھا مرا نامہ بندھا ہوا

(بقیہ از صفحہ ۵)

مختصراً قلعۂ لاہور کی تعمیر کئی مراحل میں انجام پائی۔ پہلے مرحلے میں قبل از عہد سلاطین تا اکبر کچی اینٹوں اور گارے سے قلعے کی تعمیر ہوتی رہی۔ اکبر کے عہد میں پہلی مرتبہ پکی اینٹوں سے بنایا گیا اور ایک سو چودہ کمروں کی تعمیر ہوئی۔ جہانگیری عہد میں دولت خانہ اور اس سے ملحق مسجد کا اضافہ ہوا شاہ جہان کے دور میں بہت سی عمارتوں کا اضافہ ہوا۔ انگریزوں اور سکھوں کے دور میں قلعے کے اندر متعدد عمارات کو گرا دیا گیا۔ موتی مسجد میں رنجیت سنگھ کا خزانہ رکھا گیا اور انگریزوں نے ایک حصے میں شراب کا ذخیرہ کیا۔

محمد اشرف چوہدری

لاہور کا شاہی قلعہ

لاہور کا شاہی قلعہ مغل طرزِ تعمیر کا بہترین شاہ کار ہے۔ تین صدیوں سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود اس کے جاہ و جلال اور شان و شوکت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ مغل حکمرانوں کو تعمیرات سے بہت شغف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغلیہ دور میں بالعموم اور شاہ جہان کے عہد میں بالخصوص فن تعمیر اپنے عروج کو پہنچا۔ ان کی بنائی ہوئی عمارات میں قلعے، مساجد، مقبرے اور باغات شامل ہیں جو مغلیہ فنِ تعمیر کی عظمت کا آئینہ ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں ان کا عہدِ حکومت دراصل اسلامی فنونِ لطیفہ کا سنہری دور تھا۔ قلعہ لاہور، قلعہ دہلی، قلعہ آگرہ، جامع مسجد دہلی، شاہی مسجد لاہور اور تاج محل آگرہ ایسی عظیم الشان عمارتیں مغل دور کی عمدہ ترین یادگاریں ہیں۔

فنِ تعمیر کو کسی قوم کے تہذیبی، ثقافتی اور سماجی مزاج کے مظہر کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر آپ کو کسی قوم کی ثقافت کے متعلق پتا لگانا مقصود ہو تو اس قوم کی چھوڑی ہوئی عمارتوں پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ان عمارتوں میں اس کی ثقافت کی اصل تصویر سامنے آجائے گی۔ ان کی اقتصادی اور معاشی حالت کا پتا چلے گا۔ مغل حکمران وسعتِ سلطنت کے دلدادہ تھے۔ اس لیے وہ ملک کی حفاظت اور انتظام کے لیے قلعے تعمیر کراتے اور ان میں مسلح افواج رکھتے تھے۔

قلعہ لاہور مغل بادشاہ شاہ جہان کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ اس کے عہدِ حکومت میں فنِ تعمیر اپنے انتہائی عروج کو پہنچا۔ یہ قلعہ شیش محل، دیوان عام، دیوان خاص اور دیگر عمارات پر مشتمل ہے۔ اس قلعے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔

اینٹوں، پتھروں اور چونے سے تعمیر شدہ قلعے کی موجودہ عمارت جو آج ہماری نظروں کے سامنے ہے، مغلوں سے پہلے ایسی نہ تھی۔ اس وقت یہ قلعہ مٹی اور کچی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ یہ ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ اس نے زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ محکمہ آثارِ قدیمہ نے ۱۹۵۹ء میں قلعے کے ارد گرد کھدوائی کروائی۔ کھدوائی کے دوران جو آثار ظاہر ہوئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور بہت

قدیم شہر ہے اور قلعۂ لاہور کی تاریخ بڑی پرانی ہے ۔ مزید یہ کہ لاہور قدیم تہذیب کا مدفن ہے اور محمود غزنوی کے عہد سے پہلے قلعۂ لاہور موجود تھا۔[۵۱]

قلعہ لاہور کی تاریخ تعمیر کا تعین کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ لاہور کی تاریخ کا مختصر سا تعارف کروا دیا جائے ۔ اس سے قلعے کی تاریخ معلوم کرنے میں مدد ملے گی ۔ راجہ رام چندر کے دو لڑکے "لوہ" اور "قصو" تھے۔ لوہ کے نام پر "لاہور" اور قصو کے نام پر "قصور" شہر آباد ہوئے ۔ اس وقت لاہور ملتان کے زیر اثر تھا۔ اس میں بازار اور بت خانے تھے، ہندوؤں کی اکثریت تھی، مسلمان برائے نام بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ اسی بنا پر ہندو رسم و رواج زوروں پر تھے۔[۵۲]

سلطان محمود غزنوی نے برصغیر پاک و ہند پر سترہ حملے کیے اور متعدد فتوحات حاصل کیں ۔ ان فتوحات میں لاہور کا ذکر بھی ہے ۔ آخری حملہ ۳۹۵ھ یعنی ۱۰۰۴ء میں ہوا ۔ محمود غزنوی نے لاہور پر ۴۱۳ھ میں قبضہ کیا تھا اور یہاں قلعے اور قصر تعمیر کروائے۔[۵۳] سلطان محمود غزنوی نے لاہور کو فتح کرنے کے بعد اس کو از سر نو آباد کیا اور فتح کی یاد میں ایک طلائی سکہ بھی جاری کیا۔ اس سکے کے ایک طرف سنسکرت عبارت تھی اور دوسری جانب عربی عبارت میں اس کے نام کی مناسبت سے شہر کا نام محمود پور کندہ تھا۔ یہ طلائی سکہ ۱۹۵۹ء میں قلعۂ لاہور کے گرد و پیش کی کھدائی سے دستیاب ہوا۔[۵۴] محمود غزنوی کا آباد کردہ لاہور شہر "محمود پورہ" قدیم لاہور سے مختلف تھا اور وہی چار دیواری والا شہر لاہور تھا جس کا قلعہ آج بھی شمال مغرب کی طرف واقع ہے۔ شالامار کے قریب گاؤں محمود بوٹی سے متعلق یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی کہ یہ گاؤں غزنوی کا آباد کردہ شہر "محمود پورہ" ہے ۔ نیز کسی بھی مورخ نے اس روایت کی تصدیق نہیں کی ہے۔[۵۵]

مغل حکمرانوں کے نزدیک قلعوں کی تعمیر میں ہمیشہ دو مقاصد کارفرما تھے ۔ ایک تو یہ کہ قلعے امیر سلطنت

۵۱؎ نقوش، لاہور نمبر، ص ۶۳۷ ۵۲؎ ایضاً

۵۳؎ تاریخ شہر لاہور، کرنل بھولا ناتھ، لاہور، ص ۱۹

۵۴؎ نقوش، لاہور نمبر، ص ۶۳۸

۵۵؎ جرنل ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، شمارہ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶۰

کی رہائش گاہ بنتے اور دوسرے افواج کی قیام گاہ کے ساتھ شہر کو بیرونی حملہ آوروں سے بچاؤ کے لیے استعمال ہوتے تھے ۔ قلعۂ لاہور کی تعمیر میں بھی یہی مقصد پیش نظر تھا ۔

درج بالا بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ موجودہ قلعۂ لاہور سے پہلے اگر کوئی قلعہ تھا، جس کے آثار اب ناپید ہیں تو وہ اسی جگہ پر واقع تھا جہاں موجودہ قلعہ واقع ہے۔ مورخین اس امر پر بھی متفق ہیں کہ مختلف ادوار میں لاہور میں تعمیر ہونے والے تمام قلعے لاہور کے شاہی قلعے سے متصل تھے اور شمال جنوب میں واقع تھے ۔ یہ قلعے بیرونی حملہ آوروں سے مدافعت کا باعث تھے [۵۶] علاوہ ازیں دریائے راوی موجودہ قلعہ لاہور کے ساتھ بہتا تھا، جس کو اب بڈھا دریا کہتے ہیں ۔ البیرونی سے لے کر ابوالفضل تک جن مورخین نے قلعہ لاہور کا ذکر کیا ہے، ان کی نظر میں مختلف قلعے ہوں گے جو مختلف زمانوں میں تعمیر ہوئے ہوں گے [۵۷]

قلعہ لاہور کی تاریخ تعمیر کا تعین کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے ۔ البتہ اس کی موجودگی سلاطین ہند کے عہد سے بہت پہلے تھی۔ سلطان معزالدین محمد بن سام نے ۱۱۸۰ء میں لاہور پر قبضہ کیا اور لاہور کی بجائے دہلی کو اپنا پایہ تخت قرار دیا ۔ اس وقت قلعہ لاہور موجود تھا [۵۸] لاہور کی فتح کے بعد محمد بن سام عازم غزنی ہوا ۔ راستے میں جہلم کے قریب ایک گاؤں دمیک میں ملاحدہ نے اسے شہید کر دیا تھا [۵۹]۔ عہد سلاطین میں یہ قلعہ کچی اینٹوں سے بنا ہوا تھا، اکبر کے عہد میں پختہ اینٹوں سے تعمیر ہوا۔

محمد بن سام کی شہادت کے بعد قطب الدین ایبک کی حکومت کا زمانہ آیا ۔ اس کی رسم تاج پوشی "قصر ہمایونی" میں ہوئی، اس وقت قلعۂ لاہور موجود تھا اور اس میں شاہی محلات کی تعمیر ہو چکی تھی [۶۰] سلطان قطب الدین ایبک ۶۰۸ھ تک لاہور میں مقیم رہا اور چوگان کھیلتے ہوئے جاں بحق ہو گیا ۔ اس کا مرقد انارکلی بازار سے ملحق ایبک روڈ پر ہے ۔ منگول حملہ آوروں نے ۱۲۴۱ء میں اس قلعے کو مسمار کر دیا اور لاہور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی [۶۱] سلطان غیاث الدین بلبن نے ۶۶۶ھ (۱۲۶۷ء) میں پھر اسے

---

[۵۶] نقوش، لاہور نمبر، ص ۱۳۸
[۵۷] ایضاً
[۵۸] تاریخ فرشتہ، ص ۴۰
[۵۹] طبقات ناصری، ص ۲۴۷
[۶۰] تاریخ فخرالدین مبارک شاہ، ص ۷۲
[۶۱] نقوش، لاہور نمبر، ص ۱۳۸

بنایا۔ ۸۲۵ھ تک یہ قلعہ خام یعنی کچا قلعہ شمار ہوتا تھا[۱۱۵]

خاندان سادات کے بعد لودھی حکمران برسر اقتدار آئے۔ دولت خاں لودھی کے عہد حکومت میں بابر نے دریائے جہلم کو عبور کرکے ملازم شد کو لودھی دربار میں بھیجا کہ یہ ملک اس کے حوالے کر دیا جائے۔ دولت خاں نے اُسے قلعہ لاہور میں روک لیا۔ اس وقت بھی قلعہ لاہور موجود تھا۔ حسب ضرورت اس میں کئی عمارتوں کا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔ بعد میں دولت خاں نے لاہور مغلوں کے حوالے کر دیا۔ بابر نے لاہور پر متعدد حملے کیے اور آخر ۹۳۲ھ میں ہندوستان کو فتح کیا اور لاہور آیا۔ اس وقت قلعہ لاہور میں سکندر لودھی کے بنائے محلات موجود تھے۔ بابر نے ضرورت کے تحت نئی عمارتیں بنوائیں اور محلات کو خود آراستہ کرکے ان میں سکونت اختیار کی۔

اکبر کے دور سے لے کر شاہ جہان تک قلعہ لاہور میں تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔ اندرون قلعہ حسب ضرورت عمارات کی توسیع ہوتی رہی اور نئی عمارات بنتی رہیں۔ یہ صورت سکھ دور اور انگریزی راج تک جاری رہی۔ اکبر کے عہد میں قلعے میں ایک سو چودہ کمرے تھے جن کے آگے نہایت اعلیٰ نفیس پردے تھے، جو نہایت خوب صورتی سے آراستہ کیے گئے تھے۔

حکیم علی گیلانی نے ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء) میں اکبر کی ہدایت پر لاہور کے قلعے میں ایک خوب صورت حوض تعمیر کرایا، جس کے نیچے ایک طرف سیڑھیاں اور راستہ تھا۔ اکبر بادشاہ نے صحن خانہ میں چبوترہ مسجد بھی تعمیر کی۔ قلعے میں اکبر کے عہد کی تعمیر کردہ عمارتیں بالکل ناپید ہیں۔ یہاں تک کہ ان عمارتوں کے کھنڈر تک بھی نہیں ملتے۔ اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اس نے قلعہ لاہور میں اکثر قیام کیا، لیکن کوئی نئی عمارت نہیں بنوائی۔ صرف عمارت دولت خانہ کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۰۲۸ھ میں جہانگیر شاہجہاں کو ساتھ لے کر اس نئی تعمیر شدہ عمارات کو دیکھنے گیا۔ آج بھی جہانگیر کے اس دولت خانہ لاہور کی عمارت کی ڈیوڑھی موجود ہے۔ دولت خانہ کے ساتھ مسجد بنائی گئی۔ دولت خانہ کی تعمیر پر سات لاکھ روپے صرف ہوئے[۱۱۶]۔ شاہ جہانی دور میں قلعہ لاہور میں نئی عمارتوں کا بہت اضافہ ہوا۔ اس کے عہد کی درج ذیل

۱۱۵ھ تاریخ مبارک شاہی، ص ۱۹۷ - ۱۹۸

۱۱۶ھ نقوش، لاہور نمبر، ص ۶۴۰

عمارتیں قابلِ ذکر ہیں:

عمارت جھروکہ درشن: اکبر کے عہد سے مغل دربار میں جھروکہ درشن کا نظام رائج تھا۔ شاہ جہان کے عہد میں بصورت عمارت رونما ہوا اور اس میں مزید اختراع اور ترمیم ہوئی۔ معماروں اور کاریگروں کو حکم ہوا کہ جھروکے کی نئی عمارت مہیا کردہ نقشہ کے مطابق تعمیر کی جائے۔

شاہ بُرج: یہ عمارت آج شیش محل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تعمیر شاہ جہان کے حکم پر معمور خان کی نگرانی میں ۱۰۴۱ھ (۳۲-۱۶۳۱) میں ہوئی۔ شاہ جہانی دروازے کی تعمیر ۱۰۴۱ھ میں ہوئی تھی۔ یہ مستورات کی باپردہ رہائش گاہ تھی۔ اس میں تمام ضروری لوازمات موجود تھے۔

موتی مسجد: اس کی تعمیر ۱۶۴۵ء میں شاہ جہان کے حکم سے ہوئی۔

شاہی حمام و دیگر عمارتیں: شاہی حمام شاہ جہان کے عہد میں ۱۰۴۲ھ میں تعمیر ہوا۔ یہ خوابگاہ کے متصل ہے۔ اب یہ عمارت شکستہ ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ غسل خانہ جسے خلوت خانہ کہہ کر پکارا جاتا ہے، ابھی تعمیر کروایا۔ لال بُرج ۱۶۳۱ میں مکمل ہوا۔ کالا بُرج کی تعمیر ۱۶۱۷ سے ۱۶۳۱ء رفتہ رفتہ عمل میں آئی۔ یہ برج بھی لال بُرج سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ خلوت خانہ کے شمال مغرب کی جانب واقع ہے۔[۱۱۵]

انگریزی راج اور سکھوں کے دور میں قلعہ کی اندرونی عمارتوں میں ردوبدل ہوا۔ بہت سی عمارتوں کو گرا دیا گیا۔ کنہیا لال تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں:

"... سرکار انگریزی نے بے شمار شاہی عمارتیں جو قلعہ کے اندر تھیں، گرا کر ان کے رہنے کے لیے بارکیں بنائی ہیں، تخت شاہی معہ دالان محاذ تخت و خوابگاہ کلاں و خورد مکانات مثمن بُرج وغیرہ چند مکانات باقی ہیں۔ ایک سنگِ مرمر کی زنانہ مسجد جو اس قلعے میں گنبد دار بنی ہوئی موجود ہے، اس کو موتی مسجد کہتے ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کا نام بدل کر موتی مندر رکھ دیا تھا اور سلطنت کا خزانہ بھی اس میں رکھا جاتا تھا۔ مثمن برج کے مکان کے نیچے بڑا تہ خانہ ہے جہاں ذخیرہ سرکاری شراب کا بڑے بڑے پیپوں میں بھرا رہتا ہے..."[۱۱۶]

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

---

[۱۱۵] نقوش لاہور نمبر، ص ۲۳۳-۲۳۴

[۱۱۶] کنہیا لال: تاریخ لاہور، ص ۳۳۶-۳۳۷

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ سَاقِی الْقَوْمِ اٰخِرُھُمْ شُرْبًا۔

(جامع ترمذی ۔ ابواب الاشربہ ۔ باب ماجاء ان ساقی القوم آخرھم شربا)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لوگوں کو پلانے والا خود آخر میں پیا کرتا ہے۔

یہ حدیث نہایت مختصر ہے اور صرف ایک جملے پر مشتمل ہے، لیکن کھانے پینے کے آداب میں اس کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں یہ تلقین فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ بیاہ شادی کے موقع پر یا دیگر تقریبات پر کھانے پینے کی چیزیں تقسیم کر رہے ہوں اور مہمانوں کی خدمت و تواضع پر مامور ہوں، وہ خود آخر میں اس وقت کھائیں اور پئیں، جب تمام لوگ اس سے فارغ ہو جائیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ سب سے پہلے اپنے کام و دہن کی تواضع شروع کر دیں۔ بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ مہمانوں کو سامانِ اکل و شرب دینے سے قبل اپنے پیٹ کی تسکین میں مصروف ہو جاتے ہیں اور ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے خود فارغ ہو جائیں، مہمانوں کو بعد میں کھلا دیا جائے گا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ساتھ ساتھ خود بھی کھاتے پیتے جاتے ہیں، اور مہمانوں کو بھی کھلاتے پلاتے رہتے ہیں۔ یہ دونوں عادتیں اسلامی آداب خورد و نوش کے منافی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرما کر دونوں چیزوں سے منع فرما دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مہمان کا حق مقدم ہے، پہلے اسی کی خدمت کرنی چاہیے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کھانا ختم ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے، ایسا نہ ہو کہ خود تو کھا چکے اور مہمانوں کی باری آئے تو کھانا ختم ہو جائے اور مہمان اور میزبان دونوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ لہٰذا کھانے پینے کا اصل ادب یہ ہے کہ پہلے مہمانوں کو کھلاؤ، بعد میں جو بچ جائے وہ خود کھاؤ۔

احادیث میں بہت سے مواقع پر اس کا ثبوت ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کے گھر تشریف لے گئے۔ اصحابِ خانہ نے پہلے حضور کی خدمت میں دودھ یا کھانا پیش کیا، اور بعد میں جو بچا وہ خود

کھایا اور پیا۔

البتہ اگر کھانے پینے کا سامان وافر ہو اور اس کے ختم یا کم ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اصحابِ خانہ مہمان کے ساتھ بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ یہ بھی مہمان کی تکریم اور آدابِ خورد و نوش کا ضروری حصہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر ایسے تمام امور کی وضاحت فرما دی ہے جو انسان کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیش آتے ہیں اور ان امور کو اسلامی معاشرے میں اساسی اور اصولی اہمیت حاصل ہے ۔ درج بالا ارشادِ گرامی بھی انہی میں سے ایک ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے ۔ اس سے یہ ثابت کرنا بھی مقصود ہے کہ انسان اپنے آپ ہی کو سامنے نہ رکھے بلکہ دوسرے کی خدمت کو باعثِ سعادت قرار دے اور یہ معمول ٹھہرائے رکھے کہ اپنی ذات اور اپنے مفاد کے مقابلے میں دوسرے کی ذات اور مفاد کو پیشِ نگاہ رکھے گا۔ اس سے خود اپنی عزت بھی قائم رہتی ہے اور دوسرے کے وقار میں بھی اضافہ ہوتا ہے ۔

نقد و نظر

مکاشفۃ القلوب

مصنف : امام غزالی

مترجم : مولانا قاری محمد عطاء اللہ

ناشر : مکتبہ اسلامیات، کوچہ بڈھے شاہ، چوک وزیر خاں، اندرون دہلی دروازہ، لاہور۔

صفحات ۷۲۸ ۔ جلد، کتابت، طباعت، کاغذ، عمدہ ۔ قیمت ۴۸ روپے

حجۃ الاسلام حضرت امام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۴۵۰ھ ۔ وفات ۵۰۵ھ) دنیائے اسلام کی عظیم شخصیت تھے۔ انھوں نے صرف پچپن سال عمر پائی، لیکن اس مختصر عرصے میں رفیع الشان علمی و تصنیفی خدمات انجام دیں۔ سیر و سیاحت، درس و تدریس، فلسفہ و منطق، نقادی نویسی، تصوف و معرفت اور تحریر و کتابت میں اس مرد جلیل نے بڑا نام پیدا کیا اور اپنے پیچھے وہ علمی ذخیرہ چھوڑا جو اہلِ علم اور اصحابِ فضل کے لیے حوصلے کا کام دیتا ہے اور دیتا رہے گا۔

امام کی بھرپور تحقیقی زندگی کے مختلف گوشوں پر عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی میں بے شمار حضرات نے بے حد کام کیا ہے، لیکن اس کے باوجود تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی کتابوں کو متعدد اربابِ کمال نے اردو اور بعض دیگر زبانوں میں منتقل کرنے کا فرض انجام دیا اور دے رہے ہیں۔

حال ہی میں حضرت امام کی ایک اہم تصنیف مکاشفۃ القلوب کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ معروف عالم و خطیب مولانا قاری محمد عطاء اللہ (خطیب مسجد حضرت شاہ محمد غوث لاہور) نے کیا ہے۔ کتاب مواعظ و نصائح کے انداز کی ہے اور امام رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں جا بجا قرآن مجید اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے دیے ہیں، اس کے علاوہ صحابہ کرامؓ کے واقعات درج کیے اور بزرگانِ دین کی حکایات بیان کی ہیں۔ کتاب نہایت دلچسپ ہے اور امام کا انداز بیان اپنے اندر انتہائی جاذبیت لیے ہوئے ہے۔

اب مرحوم مولانا قادری محمد اشرف نے کتاب کو اردو کا جامہ پہنا کر ایک علمی اور اصلاحی خدمت انجام دی ہے۔ ترجمہ کی زبان رواں دواں، شگفتہ اور عام فہم ہے۔

اس کتاب کا یوں تو سب کو مطالعہ کرنا چاہیے، لیکن خطیب و واعظ اور مقررین حضرات کے لیے یہ بالخصوص مفید رہے گی۔ مترجم نے قرآنِ مجید کی آیات کا اردو ترجمہ بھی دیا ہے اور باقاعدہ حوالے بھی درج کیے ہیں۔ نیز عربی اشعار پر اعراب بھی لگا دیے ہیں اور ترجمہ بھی دیا ہے۔

ذکر خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم

از : راسخ عرفانی

ملنے کا پتا : مکتبہ نورادب، چوک نیائیں، گوجرانوالہ

بہترین کتابت، اچھی طباعت، عمدہ کاغذ، دیدہ زیب جلد۔ صفحات ۱۱۲۔ قیمت ۳۰ ...

جناب راسخ عرفانی صاحب، گوجرانوالہ کے مردم خیز شہر سے تعلق رکھتے ہیں اور وہاں کے ایک علمی اور دینی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔ شعر و شاعری میں ان کا مقام بڑا بلند ہے۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو کر اہلِ ذوق سے داد حاصل کر چکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ مجموعہ کلام "خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم" کچھ چند ماہ پیشتر اشاعت پذیر ہوا ہے۔ یہ مجموعہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت پر مشتمل ہے۔ ہر مصرعہ اور ہر شعر حضور سرورِ کائنات کی عقیدت و محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکل کر شعر کے حسین قالب میں ڈھل رہے ہیں۔ یہ مقام اسی خوش نصیب کو حاصل ہو سکتا ہے، جس کی اپنی زندگی عمل و کردار کے خوب صورت معیار پر پورا اترتی ہو۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

مہرِ عرب ہے جلوہ گر صلِّ علیٰ محمدؐ — کھل گئے رحمتوں کے در صلِّ علیٰ محمدؐ

گونجی صدائے مرحبا آئے حبیبِ کبریاؐ — جشن ہوئے نگر نگر صلِّ علیٰ محمدؐ

کرم گستر ہیں یکساں گلستان و شہر و صحرا پر — نسیم خلد ہیں، موجِ صبا ہیں سیدِ عالمؐ

اے خود شناسِ تصور کی کرم فرمائیاں — اشک بھی آنکھوں میں بن بن کر گلاب آتے ہیں

یعنی گریہ جوش پہ تھا بابِ اقدس پر مگر — پُرسکون تھا دل سمندر کے کناروں کی طرح

... کا یہ نعتیہ مجموعۂ کلام نہایت عمدہ ہے۔

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

فون : ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۳ | فروری ۱۹۸۰ء ربیع الاول ۱۴۰۰ھ | شمارہ ۲

ترتیب

تاثرات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس مسلمانوں کی متاعِ حیات اور حاصلِ زندگانی ہے۔ آپؐ پیکرِ رحمت اور مجسمۂ رافت تھے۔ خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمت للعالمین کے پُرعظمت لقب سے ملقب فرمایا ہے۔ وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ - اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو پوری کائنات کے لیے باعثِ رحمت بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔

آپؐ کا وجودِ اطہر، کائناتِ انسانی کے لیے معدنِ فضل و کمال اور مخزنِ علم و حکمت تھا۔ عدل و انصاف، اخوت و مروّت، نرمی و لینت، صداقت و دیانت، حسنِ اخلاق، بلندیٔ کردار، پابندیٔ عہد، ہمدردیٔ خلائق، محبت و مودت، انکسار و تواضع، آپؐ کے عظیم الشان اوصاف ہیں اور ان اوصاف کو قرآن نے آپ کی سیرتِ مقدسہ کا نمونہ قرار دیا ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ کا قول و عمل تمھارے لیے ایک عمدہ ترین نمونہ اور کاملِ ترین اسوہ ہے۔ تم اس کو اپنے لیے حرزِ جاں بنائے رکھو۔

آپ یتیموں کے معاون، غریبوں کے ساتھی، مسکینوں کے مددگار، بیواؤں کے حامی، مظلوموں کے دوست اور کمزوروں کے رفیق تھے۔ اپنے ان تمام اوصاف کو آپ نے ایک چھوٹے سے جملے میں نہایت بلاغت کے ساتھ سمو دیا ہے۔ الفقر فخری، کہ فقر میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ نیز ارشاد فرمایا، الفقر ردائی، فقر میری چادر ہے۔

آپ کی ذاتِ ستودہ صفات، خود اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس درجے لائقِ اکرام ہے کہ اپنی اطاعت کے ساتھ اللہ، حضور کی اطاعت کا بھی حکم جاری فرماتا ہے۔ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔ یعنی لوگو! اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو۔

نیز فرمایا:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ۔ جس نے اللہ کے برگزیدہ رسول کی اطاعت کی، اس نے

اللہ کی اطاعت کی۔

حضور کے اوصاف و مناقب کی کوئی انتہا نہیں۔ جو ذاتِ گرامی اپنے فضائل و کمالات اور اخلاق و اعمال کی رو سے قرآن کے قالب میں ڈھلی ہو، اس کی تعریف کا حق کون ادا کر سکتا ہے۔ کان خلقہ القرآن۔
مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مطہر سے ہمیشہ قلبی وابستگی رہی ہے اور رہے گی۔ بے شک مسلمانوں میں بعض عملی کوتاہیاں بھی پائی جاتی ہیں اور وہ کچھ لغزشوں اور کمزوریوں کا بھی شکار ہیں لیکن حضور سے بے پناہ جذباتی لگاؤ اور تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ بے پایاں اور رحیمیتِ کاملہ سے یقین ہے کہ وہ انھیں اپنے رسولِ محبوب سے محبت و تعلق کی بنا پر ضرور معاف فرما دے گا۔
پاکستان میں حکومت کے زیرِ اہتمام سیرت کانفرنس کا انعقاد آنحضرت سے بدرجۂ غایت تعلق کا ایک عملی اور علمی اظہار ہے اور اس میں خیر و برکت کے بے شمار پہلو پنہاں ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اُسے مسلمانانِ پاکستان کے حسنات میں اضافے کا موجب بنائے اور انھیں آپ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کی توفیق سے نوازے۔

اس مبارک موقع پر ہم حکومت سے عرض کریں گے کہ سیرت کانفرنس کو ایک مستقل ادارے کی حیثیت دی جائے اور ایک شاندار سیرت مرکز قائم کیا جائے — سیرت مرکز میں وہ تمام کتابیں جمع کی جائیں جو مختلف زبانوں اور زمانوں میں اس موضوع سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ اس سلسلۂ طیبہ کی بہترین کتابوں کو اچھے انداز میں خود شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے، جو کتابیں عربی، انگریزی اور فارسی وغیرہ زبانوں میں ہیں، ان کا اردو ترجمہ کرانے کی کوشش کی جائے۔ حضور کی زندگی کے جن جن پہلوؤں کو بعض لوگوں نے کسی وجہ سے ہدفِ اعتراض و تنقید ٹھہرایا ہے، سیرت مرکز کی طرف سے ان کا مناسب جواب دیا جائے۔ پھر جن حضرات نے سیرت پر کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، ان کے سوانحِ حیات کو بھی منظرِ عام پر لانے کی سعی کی جائے۔

جنابِ راسخ عرفانی

نعت

نورِ محمدی ہیں مہرِ درخشاں حضورؐ ہیں
وجہِ فروغِ محفلِ امکاں حضورؐ ہیں

پایا بشر نے اشرفِ مخلوق کا لقب
اس عظمت و عروج کا عنواں حضورؐ ہیں

گلزارِ رنگ و بُو کی لطافت ہے آپؐ سے
باغِ جناں کی صبحِ بہاراں حضورؐ ہیں

خوشنودیٔ خدا بھی رضائے نبیؐ میں ہے
سچ پوچھیے تو حاصلِ ایماں حضورؐ ہیں

سارے نبی ہیں اپنی نشستوں پہ جلوہ گر
اس انجمن میں سب سے نمایاں حضورؐ ہیں

خلقِ عظیم کی یہ بلندی کہ بعدِ جنگ
دشمن ہیں قید میں تو پریشاں حضورؐ ہیں

راسخ شمیمِ خلد سے مہکے ہیں جان و دل
تخییل کے چمن میں خراماں حضورؐ ہیں

پروفیسر علم الدین سالک
مرتب: پروفیسر احسان الٰہی سالک

فتح مکہ : عہدِ رسالتؐ کا ایک بے مثال واقعہ

شعبان ۸ھ کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے تاریخ اسلامی نے ایک نیا دور شروع کیا اور واقعات نے ایک نئی صورت اختیار کی۔ معاہدہ صلح حدیبیہ کی وجہ سے مسلمانوں اور اہلِ مکہ کے درمیان دس برس کے لیے صلح ہو گئی تھی مگر اہلِ مکہ نے دوسرے ہی سال اس کو توڑ دیا تھا۔ اس صلح نامے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ مسلمان قریش کے حلیفوں اور قریش مسلمانوں کے حلیفوں سے برسرِ پیکار نہ ہوں گے۔ یہ شرط بے حد اہم تھی۔ اس کی بنا پر بعض قبائل جو اس وقت تک محض قریش کے دباؤ کی وجہ سے مسلمانوں کے مخالف تھے، اب کھلم کھلا مسلمانوں کے حلیف بن گئے۔ ان قبائل میں ایک قبیلہ بنی خزاعہ تھا۔ یہ لوگ اسلام کے سائے میں آ گئے تھے۔

بنی بکر، بنی خزاعہ کے حریف اور دشمن تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پیشتر ان میں جنگ و جدل کا سلسلہ جاری تھا اور اکثر تصادم ہوتے رہتے تھے مگر اسلام کی وجہ سے یہ سلسلہ یکسر تھم گیا۔ گزشتہ تمام دشمنیاں اور عداوتیں معطل ہو گئیں، کیوں کہ قریش نے دیگر قبائل کی مدد سے اپنی تمام قوت اسلام کے خلاف صرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بہ ایسی صورت ممکن تھا کہ تمام قبائل متفق و متحد ہو کر قریش کے ہم نوا ہو جائیں اور سب جمع ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ نبرد آزما ہو جائیں۔ بنو بکر اور بنو خزاعہ نے بھی اپنی قدیم عداوت کو بالائے طاق رکھ کر قریش کا ساتھ دیا۔ مگر جب معاہدۂ حدیبیہ مکمل ہوا اور امن و آشتی کی فضا پیدا ہوئی تو عداوت کی دبی ہوئی آگ ایک مرتبہ پھر بھڑک اٹھی۔

بنی خزاعہ کا رجحان اسلام کی جانب تھا اس لیے وہ مسلمانوں کے حلیف بن گئے۔ بنو بکر کفارِ مکہ کے ساتھ بن گئے۔ معاہدے کی رو سے ان میں صلح و صفائی کا ہونا لازمی تھا اور وہ ایک دوسرے پر حملہ آور نہیں ہو سکتے تھے۔ ایسا کرنا معاہدۂ حدیبیہ کی خلاف ورزی تھی۔ بنو بکر طاقت ور اور صاحبِ ثروت تھے۔ ان کی نیت میں فساد پیدا ہوا اور انھوں نے اپنی طاقت کے گھمنڈ اور قریش کے بھروسے پر چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ قریش نے معاہدۂ حدیبیہ کا احترام نہ کرتے ہوئے علانیہ اپنے حلیفوں بنو بکر کا ساتھ دیا اور نہ صرف

وغیرہ سے ان کی مدد کی بلکہ ایک رات کی تاریکی میں بنوبکر نے بنوخزاعہ پر شب خون مارا۔ رؤسائے قریش سے صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل اور سہیل بن عمرو وغیرہ بھی بھیس بدل کر ان کے شریک تھے۔ بنوخزاعہ بے خبر پڑے ہوئے تھے، ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے، وہ مقابلہ کیا کرتے۔ انھوں نے اپنی جانیں بچانے کے لیے حرم میں پناہ لی، مگر بنوبکر کے لوگوں نے پیچھا نہ چھوڑا اور حرم میں گھس کر بنوخزاعہ کو قتل کیا۔ بدیل بن ورقا کے گھر کو لوٹ لیا، اس طرح بنوخزاعہ کے بیس آدمی مارے گئے۔ اس حادثے کے بعد بدیل بن ورقا اور عمرو بن سالم اور چند اور بااثر لوگ وفد کی صورت میں آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نقضِ عہد کی شکایت کی۔

جس رات یہ خونچکاں غارت گری مکہ مکرمہ میں ہو رہی تھی، بنوخزاعہ کے چند آدمیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر فریاد کی کہ اے خاتم النبیین ہماری مدد کیجیے اور ہماری فریاد سنیے۔ ہم پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں! اس وقت آں حضرت، ام المومنین حضرت میمونہؓ کے حجرے میں وضو کر رہے تھے۔ آپ نے بنوخزاعہ کی فریاد سنی اور فوراً "لبیک لبیک" فرمایا۔ حضرت میمونہؓ نے عرض کیا کہ آپ نے کس کے جواب میں لبیک فرمایا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ بنوخزاعہ کی فریاد میرے کانوں میں پہنچی ہے میں نے اس کا جواب دیا ہے۔ عجیب تر یہ ہے کہ بنوخزاعہ نے بھی آنحضرتؐ کی آواز کو اسی وقت مکہ مکرمہ میں سنا۔ صبح کو آپ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو فرمایا کہ رات کو مکے میں بنوبکر اور قریش نے مل کر بنوخزاعہ کو قتل کیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا "یارسول اللہؐ کیا آپؐ کا گمان ہے کہ قریش بدعہدی کریں گے؟" آپ نے فرمایا کہ انھوں نے ضرور بدعہدی کی ہے۔ عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے حق میں فیصلہ صادر کرے گا۔

اس ظالمانہ کارروائی کے کئی روز بعد بدیل بن ورقا اور عمرو بن سالم خزاعی چالیس شتر سوار جماعت کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچے۔ قریش کے مظالم اور ان کی بدعہدی کی شکایت کی۔ عمرو بن سالم نے آپ نہایت پُردرد نظم میں اپنی مظلومی کی داستان سنائی۔

آپ نے واقعات سنے تو سخت رنج ہوا۔ آپؐ نے قریش کے پاس قاصد روانہ کیا اور قریش کے سامنے تین مطالبات رکھے کہ ان میں سے کسی ایک پر عمل کیا جائے۔ (۱) مقتولوں کا خون بہا ادا کیا جائے۔ (۲) قریش بنوبکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔ (۳) اعلان کیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ فسخ ہو چکا۔ قریش کو ابھی تک اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا۔ انھوں نے ان شرائط پر غور کرنے کی بجائے قرطہ بن عمر کی

سے اعلان کرایا کہ ہمیں تیسری شرط منظور ہے، ہم اعلان کرتے ہیں کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔ چنانچہ قاصد یہ جواب لے کر رخصت ہوا۔ اب قریش نے ٹھنڈے دل سے معاملے کے نشیب و فراز پر غور کیا تو انھیں اپنی جلد بازی پر ندامت ہوئی، اس لیے انھوں نے اس کے ازالے کے لیے فوری قدم اٹھایا کہ اپنے رئیس اعظم ابوسفیان کو آمادہ کیا کہ وہ مدینہ منورہ جائے اور معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید کرے۔ وہ مدینہ منورہ آیا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صدیق اکبر، فاروق اعظم اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے الگ الگ بات چیت کرنی چاہی۔ مگر کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چاروں طرف سے مایوس ہوکر خاتونِ جنت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر حاضر ہوا۔ حضرت حسنؓ پانچ برس کے تھے۔ ابوسفیان نے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ اگر یہ بچہ اپنی زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرادیا ہے تو آج سے سردارِ عرب پکارا جائے گا۔ جناب سیدہؓ نے فرمایا کہ بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل۔ آخر کار ابوسفیان نے حضرت علی کے ایما پر مسجد نبوی میں جاکر اپنی طرف سے اعلان کیا کہ میں نے معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید کردی اور فوراً مدینہ سے رخصت ہوگیا۔ مکّہ والوں نے جب تمام کاروائی سنی تو کہا تمھارے ساتھ مذاق ہوا ہے۔ کیا معاہدے اسی طرح ہوا کرتے ہیں۔ اس سے نہ تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ باہمی صلح ہوگئی کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاہدہ کالعدم ہوگیا کہ ہم جنگی تیاریوں میں مشغول ہوجائیں۔

ابوسفیان کے رخصت ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو تیاری کا حکم دیا۔ حلیف قبائل کے پاس قاصد روانہ کیے کہ وہ بھی تیار ہوکر شریک ہوں۔ اس کاروائی میں یہ احتیاط رکھی گئی کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ آنحضرت کا ارادہ کیا ہے اور کہاں کا قصد ہے۔ اس سے غرض یہ تھی کہ قریش کو علم نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو زبردست جنگ ہوگی اور خوں ریزی کے امکانات بڑھ جائیں گے اور آپؐ اُسے روکنا چاہتے تھے۔

ایک صحابی حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش کو مسلمانوں کی تیاریوں اور حملہ آور ہونے کی اطلاع دینے کے لیے ایک خط لکھا اور ایک عورت کے ذریعے روانہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو اس واقعہ کی اطلاع کردی۔ آپؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت زبیر بن العوامؓ کو روانہ کیا کہ فلاں عورت قریش مکہ کے نام خط لیے جارہی ہے، اسے گرفتار کرلاؤ۔ انھوں نے روضہ خاخ کے مقام پر اُسے گرفتار کرلیا۔ اس کی تلاشی لی، مگر کچھ برآمد نہ ہوا۔ حضرت علیؓ نے کہا یہ نہیں ہوسکتا کہ آنحضرتؐ نے غلط خبر دی ہو۔ خط ضرور اس کے پاس ہے۔

چنانچہ عورت کو ڈرایا دھمکایا تو اس نے اپنے سر کے بالوں سے خط نکال کر دیا۔ یہ وہی خط تھا جو حاطبؓ نے اسے دیا تھا۔ عورت اور خط دونوں بارگاہِ نبوی میں پیش کیے گئے۔ حاطبؓ کو طلب کیا گیا۔ انھوں نے عرض کیا چونکہ میرے خویش و اقارب مکہ میں ہیں اس لیے میں نے چاہا کہ اہلِ مکہ پر احسان کر دوں اور ان کو حملے کی اطلاع دے دوں تاکہ وہ ممنون ہو کر میرے اقربا کو اذیت نہ پہنچائیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ بہت برافروختہ ہوئے اور عرض کیا "یارسول اللہ! حکم دیجیے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں"۔ آپؐ نے فرمایا اے عمرؓ! حاطب اہلِ بدر میں سے ہے وہ منافق نہیں۔ یہ جو کچھ کہتا ہے درست ہے۔ الب[illegible] ا[illegible] ی کی غلطی ہے جو معاف ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آپ نے ان کی یہ خطا فرما دی۔

۱۱ رمضان ۸ھ کو آپ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ دس ہزار قدوسیوں کی جماعت آپؐ کے ہمرکاب تھی۔ راستے میں حلیف قبائل آپؐ کے ہم رکاب ہوتے جاتے تھے۔ آپؐ تیزی سے مکہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مقام جحفہ پر حضرت عباسؓ مع اہل و عیال کے آپؐ سے آ کر ملے۔ وہ مکے سے مدینے کی جانب ہجرت کر کے جا رہے تھے۔ آپؐ نے انھیں بھی ساتھ لے لیا۔ اسلامی لشکر آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ وادیٔ مرالظہران میں جا پہنچا۔ شام ہو چکی تھی۔ آپؐ نے حکم دیا کہ یہاں ڈیرے ڈال دیے جائیں اور فوج کا ہر دستہ الگ الگ آگ روشن کرے۔ مرالظہران مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلے پر تھا۔ صحرا وادیٔ ایمن بن گیا۔ اہلِ مکہ کو چرواہوں کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ مکے کے پاس ایک عظیم الشان لشکر اُترا ہوا ہے۔ اب قریش کو فکر لاحق ہوئی۔ انھوں نے اس خبر کی تحقیق کے لیے حکیم بن حزام (حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بھتیجے) ابوسفیان اور بدیل بن ورقا کو روانہ کیا۔

آنحضرتؐ نے اس خیال سے کہ قریش شب خون نہ ماریں، فوج کے ایک دستے کو حضرت عمرؓ کی سرکردگی میں پہرے پر مقرر کیا۔ وہ پہرے پر مامور لشکر کی حفاظت میں مشغول تھے۔ ادھر حضرت عباسؓ اپنی قوم کے لیے بے قرار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اب قریش کا کیا انجام ہوگا۔ اگر صبح لشکرِ اسلام مکے پر حملہ آور ہوا تو قریش کا نام و نشان تک مٹ جائے گا، اس لیے ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ اہلِ مکہ مسلمان ہو جائیں۔ چنانچہ وہ رات کے وقت آنحضرتؐ کے خچر دُلدل پر سوار ہوئے۔ لشکر گاہ سے نکلے اور مکے کی جانب روانہ ہوئے۔ ادھر ابوسفیان اپنے ساتھیوں سمیت لشکر گاہ کی جانب آ رہا تھا۔ اس نے آگ روشن دیکھی اور دل ہی دل میں حیران ہو کر کہنے لگا، اتنا بڑا لشکر کہاں سے آیا ہے۔ بدیل نے کہا شاید یہ خزاعہ کا لشکر ہے۔ ابوسفیان نے حقارت سے کہا کہ خزاعہ

کی کیا مجال ہے کہ اتنا بڑا لشکر لاسکیں۔ وہ ایک ذلیل قوم ہے۔"

حضرت عباسؓ بھی انہیں قریب تھے۔ انھوں نے رات کی تاریکی میں ابوسفیان کی آواز کو پہچان لیا۔ وہ اس خیال سے نکلے تھے کہ قریش کا اگر کوئی با اثر سردار مل جائے تو اسے خطرات سے آگاہ کرکے ترغیب دلائیں کہ وہ کل کی فکر کریں۔ انھوں نے فوراً ابوسفیان کو آواز دی کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر ہے اور صبح مکے پر حملہ آور ہوگا۔ یہ سن کر ابوسفیان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ابوسفیان قریب آیا اور کہا کہ اب کیا کیا جائے، اس سے بچنے کی کیا تدبیر ہو۔ حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ تم میرے پیچھے خچر پر سوار ہوجاؤ۔ میں تمھیں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلتا ہوں، وہی تمھیں امان دے سکتے ہیں۔ ابوسفیان بلا تامل خچر پر سوار ہوگیا اور اس کے دونوں ہمراہی مکے کی جانب واپس چلے گئے۔

ابوسفیان حضرت عباسؓ کے ساتھ اسلامی لشکرگاہ میں داخل ہوا۔ حضرت عمرؓ انھیں راستہ میں ملے۔ انھوں نے ابوسفیان کو پہچان لیا اور اسے قتل کرنا چاہا۔ مگر حضرت عباسؓ نے خچر کو تیز کردیا اور آگے نکل گئے۔ حضرت عمرؓ پیدل تھے، وہ پیچھے پیچھے تلوار لیے ہوئے آئے، لیکن حضرت عباسؓ ان سے پیشتر دربارِ نبوت میں پہنچ گئے تھے۔ ان کے فوراً ہی بعد حضرت عمرؓ بھی پہنچ گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ کافر ہمارے قبضے میں از خود آگیا ہے۔ حکم دیجیے کہ اس کی گردن مار دوں۔ حضرت عباسؓ نے عرض کیا کہ میں ابوسفیان کو امان دے چکا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے پھر اپنی درخواست دہرائی۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ عمرؓ اگر یہ شخص تمھارے قبیلے کا ہوتا تو تم اس قدر بے صبری سے اصرار نہ کرتے۔ حضرت عمرؓ نے کہا آپ یہ نہ فرمائیں۔ اے حضرت عباسؓ، تمھارے مسلمان ہونے کی مجھے اس قدر خوشی ہوئی ہے کہ مجھے اپنے باپ کے مسلمان ہونے کی بھی اس قدر خوشی نہ ہوتی۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آنحضرت تمھارے مسلمان ہونے کے خواہاں تھے۔ ان دونوں بزرگوں میں اس قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔

اللہ اکبر! کیا مقام ہے، ایک جانب ابوسفیان ہے، اس کی تمام بدعہدیاں ہیں، اسلام سے عداوت اور آنحضرت سے دشمنی، اس کے وہ کارنامے ہیں جو گزشتہ آٹھ برس میں اسلام کو مٹانے، قبائل کو اکسانے، مدینہ منورہ پر بار بار حملہ آور ہونے کے سلسلے میں رو پذیر ہوئے۔ ان میں ہر ایک کی کم از کم سزا قتل تھی، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسولِ رحمت تھے۔ مادی اور روحانی دنیا کا ایک ایک ذرہ ان سے مستفیض ہو رہا تھا پھر ابوسفیان اس سے بہرہ مند کیوں نہ ہوتا۔ اس لیے آپ نے حکم دیا کہ ابوسفیان کو رات کی مہلت دی جائے

ہے۔ چنانچہ ابوسفیان کو ساتھ لے کر حضرت عباس اپنے خیمے میں آ گئے۔

بخاری شریف میں ہے کہ ابوسفیان نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔ طبری نے اس سلسلے میں ذیل کا مکالمہ درج کیا ہے:

رسول اللہ : "کیوں ابوسفیان۔ کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

ابوسفیان : "کوئی اور خدا ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔"

رسول اللہ : "کیا اس میں کچھ شک ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں"

ابوسفیان : "اس میں ذرا شبہ نہیں ہے"

بہرحال صبح کے وقت اس نے دربارِ نبوتؐ میں حاضر ہو کر اسلام کا اظہار کیا۔

لشکر کی روانگی سے پیشتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ جو شخص خانہ کعبہ میں پناہ لے گا اُسے امان ملے گی۔ جو ابوسفیان کی ڈیوڑھی میں پناہ لے گا اسے امان ہوگی۔ جو اپنے گھر کے دروازے بند کر لے گا، جو بغیر ہتھیار لگائے راہ میں ملے گا، اس سے تعرض نہ ہوگا۔ بوڑھے، بچے، عورتیں، مریض محفوظ ہوں گے ابوسفیان اس امتیاز سے بہت خوش ہوا۔

اب لشکرِ اسلام مکے کی جانب بڑھا۔ آنحضرتؐ نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کرو تاکہ وہ اسلامی لشکر کا جلال اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس کے بعد لشکرِ اسلام اپنے مقام سے روانہ ہوا۔ اس وقت الگ الگ قبیلوں کے الگ الگ نشان تھے۔ ابوسفیان ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ سب سے اوّل بنو غفار کا پرچم نظر آیا۔ پھر جہنیہ، ہذیم، سلیم آہن میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے آتے اور گزر گئے۔ ابوسفیان اس نظارے سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ اسلامی فوج کی اس کثرت اور سروسامان سے مرعوب ہو رہا تھا۔ آخر میں انصار کی آمد شروع ہوئی۔ وہ اس سروسامان سے آئے کہ ابوسفیان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ابوسفیان نے پوچھا یہ کون ہیں۔ حضرت عباسؓ نے کہا، انصار! اسی اثنا میں فوج کے سردار حضرت سعدؓ بن عبادہ ہاتھ میں علم لیے ہوئے برابر سے گزرے۔ وہ ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اُٹھے کہ "الیوم یوم الملحمہ ۔الیوم تستحل الکعبہ" آج گھمسان کا دن ہے۔ آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔ سب سے آخر میں جلالِ نبویؐ نمودار ہوا۔ حضرت زبیر ابن عوام عَلَم اُٹھائے ہوئے تھے، حضور ناقہ پر سوار تھے۔ آپؐ کے ردیف حضرت اسامہؓ بن زیدؓ تھے۔ پیشانی مبارک

سے لگی ہوئی تھی۔ زبان پر تسبیح و تہلیل تھی۔ عاجزی و انکسار ہر حالت سے ہویدا تھی۔ جب آپؐ وہاں سے گزرے تو ابوسفیان نے عرض کیا کہ حضورؐ نے سنا سعدؓ نے کیا کہا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ اس نے غلط کہا ہے۔ آج کعبے کی عظمت کا دن ہے۔ اس ارشاد کے بعد عَلَم سعد سے لے کر اس کے بیٹے کے حوالے کر دیا گیا۔ جب جلال نبویؐ مکے پہنچا تو حکم ہوا کہ علم نبویؐ مقام حجون پر نصب کیا جائے۔ حضرت خالدؓ کو حکم ہوا کہ وہ شہر کے بالائی حصے کی طرف سے آئیں۔

آپؐ کسی قسم کی خوں ریزی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے دوبارہ اعلان ہوا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے ہاں پناہ لے گا یا اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا، اسے پناہ ہوگی۔ اسی قسم کا اعلان ابوسفیان بھی کر چکے تھے۔ اس احتیاط کے باوجود قریش میں ایک گروہ جدال و قتال کے لیے آمادہ تھا۔ اس نے مقابلہ کیا۔ خالدؓ کی فوج پر تیر برسائے۔ چنانچہ کرز بن جابر فہری اور حبیش بن اشعر شہید ہو گئے۔ حضرت خالدؓ نے ہر چند صبر کیا، مگر مجبور ہو کر حملہ کرنا پڑا۔ وہ لوگ ۱۳ لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ آنحضرتؐ نے تلواروں کی چمک دیکھی تو فرمایا خالد سے دریافت کرو کہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ جب معلوم ہوا کہ غلطی مخالفین کی تھی اور ان ہی نے ابتدا کی تھی تو ارشاد فرمایا کہ قضائے الٰہی یہی تھی۔

اب اسلامی فوج نے مکے پر قبضہ کر لیا تھا۔ شہر میں امن و امان تھا، خوں ریزی، قتل و غارت بالکل نہ تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر مطمئن بیٹھا ہوا تھا۔ آنحضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ کیا اپنے قدیم مکان میں ٹھہریں گے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ عقیل نے گھر کہاں چھوڑا ہے کہ میں اس میں اتروں، اس لیے مقام خیف[1] میں ٹھہروں گا۔

کعبہ خدائے واحد کی اوّلین عبادت گاہ، توحید کے سب سے پہلے مرکز اور خلیلؑ بت شکن کی یادگار میں اس وقت ۳۶۰ بت تھے۔ آنحضرتؐ نے اسے بت پرستی کی آلائش اور شرک کی لعنت سے پاک صاف کرنے کے لیے ایک لکڑی ہاتھ میں لی۔ اس سے چھوتے جاتے اور زبان مبارک سے فرماتے تھے: جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً۔ حق آگیا، باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے والی شے ہے۔

کعبے میں اور بھی بہت سے بت تھے، جن کے روبرو قریش جبین نیاز جھکاتے تھے۔ اپنا

---

[1] خیف وہ مقام ہے جہاں قریش نے آنحضرتؐ اور خاندان بنو ہاشم کو محصور کیا تھا۔ یہ شعب ابی طالب میں تھا۔

معبود بناکر پوجتے تھے۔ آنحضرت نے کعبے میں داخل ہونے سے پہلے انھیں اٹھا پھینکنے کا حکم دیا۔ حضرت عمرؓ نے
تعمیلِ ارشاد میں نہ صرف ان بتوں کو ختم کر دیا بلکہ دیواروں پر جس قدر تصاویر تھیں انھیں بھی مٹا دیا۔
آپ نے سات بار سواری پر ہی طواف کیا۔ پھر عثمان بن طلحہ کلید بردارِ کعبہ سے کنجی لے کر بیت اللہ
کا دروازہ کھلوایا، نمازِ چاشت ادا کی، اس وقت حضرت بلالؓ اور حضرت طلحہؓ آپ کے ساتھ تھے۔ پھر
خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ اہلِ مکہ وہاں پر موجود تھے۔ ندامت اور شرم
کے مارے ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ مجرمانہ انداز میں کھڑے تھے۔ آپؐ نے فرمایا:

اللہ ایک ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا،
اپنے بندے کی مدد کی اور سارے گروہوں کو شکست دی۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے
ہیں ان کے لیے جائز نہیں کہ وہ مکے کی سرزمین میں خوں ریزی کریں۔ کسی سرسبز درخت کو کاٹیں۔ میں نے
ایامِ جاہلیت کے تمام رسم و رواج کو قدموں تلے مسل دیا ہے۔ البتہ کعبے کی مجاورت اور حاجیوں کو آبِ زمزم پلانے
کا انتظام بحال رہے گا۔ دورِ جاہلیت کے تمام مفاخر اور قدیم قتل و خون کے تمام انتقامات آج سے ختم ہیں۔
اے گروہِ قریش! جاہلیت کا تکبر اور غرور، نسب کا فخر و رعونت اللہ تعالیٰ نے مٹا دیا ہے۔
سب لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، لوگو میں نے
تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا، تمھارے قبیلے اور خاندان محض اس لیے بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے
پہچان لیے جاؤ، لیکن خدا کے نزدیک معزز و مکرم وہ ہے جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو۔ خدا دانا و خبیر ہے۔ خدا
نے شراب کی خرید و فروخت حرام کر دی ہے۔

اس اہم خطبے کے بعد جس میں اللہ کی توحید، مساوات کی تعلیم، نسل و خاندان کے تفاخر کی مذمت اور
رسومِ جاہلیت کا انسداد مقصود تھا، آنحضرت نے مجمع پر نظر دوڑائی تو ان میں قریش کے بڑے بڑے سرکش
اور جابر سردار اور وہ بہادر لوگ جنھوں نے اپنی پوری طاقت اور ہمت اسلام کے مٹانے میں صرف کی تھی،
موجود تھے۔ وہ زبانیں بھی تھیں جو آنحضرت کی شان میں گستاخیاں کر چکی تھیں، وہ بازو بھی تھے جو تیغ آزما بھی تھے
جو آپؐ کے پیکرِ قدسی کے ساتھ لڑائیاں کر چکے تھے، وہ افراد بھی تھے جو آپ کے رستے میں گڑھے کھود کر
اور کانٹے بچھا کر خبثِ باطن کا ثبوت دے چکے تھے، وہ بھی تھے جن کے ہاتھ آپ پر پتھر برسا چکے تھے
وہ بھی تھے جو بار بار بدعہدی کر چکے تھے، وہ بھی تھے جو بے کس مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ چکے تھے، وہ بھی

تھے جو بار بار مدینہ منورہ پر لشکر کشی کر چکے تھے، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو مبتلائے آلام میں شامل کیے تھے، وہ بھی تھے جن کے ہاتھ بے گناہ مسلمانوں کے خون سے رنگین تھے، غرضیکہ بڑے بڑے مجرم، بڑے بڑے گنہگار اس مجمع میں موجود تھے۔ آپ نے ان کی جانب دیکھا اور فرمایا اے گروہِ قریش! تم کو معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں۔ قریش بڑے ادا شناس تھے، وہ رحمتِ عالم کے حسنِ سلوک سے بخوبی واقف تھے، پکار اٹھے کہ ہم آپ سے بھلائی کی توقع رکھتے ہیں، کیوں کہ آپ ہمارے شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ میں بھی تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: "لا تثریب علیکم الیوم" — اذھبوا فانتم الطلقاء۔ آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔ اس کے علاوہ آنحضرت نے مہاجرین کی املاک کے بارے میں بھی حکم دیا کہ وہ ان سے متعلق اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائیں، کیوں کہ ان کی ہجرت کے بعد کفارِ مکہ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ کو حکم ہوا کہ وہ بامِ کعبہ پر چڑھ کر اذان دیں۔ انھوں نے تعمیلِ ارشاد کی۔ اس سے ایک مرتبہ پھر قریش کا جاہلانہ غرور اور سرکشی کا جوش بھڑک اٹھا۔ چنانچہ عتاب بن اسید نے کہا خدا نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے سننے سے پہلے اس کو دنیا سے اٹھا لیا۔ قریش کے ایک اور سردار نے کہا کہ اب جینے کا کیا لطف باقی رہ گیا ہے۔

آنحضرت کوہِ صفا کے ایک بلند مقام پر تشریف فرما تھے۔ لوگ آتے، اسلام قبول کرتے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ مردوں کی باری ختم ہوئی اور ان کا سلسلہ بند ہوا تو مستورات بیعت کے لیے حاضر ہوئیں۔ ان سے بیعت کا یہ طریقہ تھا کہ ارکانِ اسلام اور محاسنِ اخلاق کا اقرار لیا جاتا۔ پھر پانی سے ایک لبریز پیالے میں آنحضرت دستِ مبارک ڈبو کر نکال لیتے۔ پھر مستورات اپنے ہاتھ ڈبوتی تھیں، اس طرح معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔

مستورات میں ہند بھی حاضر ہوئی۔ وہ رئیسِ عرب عتبہ کی بیٹی، امیر معاویہ کی ماں اور ابوسفیان کی بیوی تھی۔ اس نے جنگِ احد کے موقع پر سید الشہداء حضرت حمزہؓ کے قتل کی تحریک کی تھی اور ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبایا تھا۔ وہ نقاب پہن کر حاضرِ خدمت ہوئی۔ اس وقت عورتوں میں نقاب کا رواج نہ تھا۔ مگر اس نے منہ کو چھپا رکھا تھا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔ بیعت کے وقت اس نے جو باتیں کیں وہ یہ ہیں:

ہند : یا رسول اللہ! آپ ہم سے کن باتوں کا اقرار لیتے ہیں۔
رسول اللہ : خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔
ہند : یہ اقرار آپؐ نے مردوں سے تو نہیں لیا۔ بہرحال ہم کو منظور ہے۔
رسول اللہ : چوری نہ کرنا۔
ہند : میں اپنے شوہر کے مال سے کبھی کبھی کچھ چوری کر لیا کرتی ہوں۔ معلوم نہیں یہ جائز ہے یا نہیں۔
رسول اللہ : اولاد کو قتل نہ کرنا۔
ہند : ہم نے اپنے بچوں کو پالا تھا۔ بڑے ہوئے تو جنگ (بدر) میں آپؐ نے ان کو مار ڈالا۔ اب آپ اور وہ آپس میں سمجھ لیں۔

عرب اور مکے کے بعض بڑے بڑے رئیس اور سردار، جان کے خوف سے روپوش ہو گئے تھے۔ صفوان بن امیہ جدہ بھاگ گیا تھا، عمیر بن وہب نے آنحضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ رئیس عرب مکے سے جلاوطن ہوا جاتا ہے۔ آپ اُسے امان دیں۔ آنحضرت نے اس کی درخواست قبول کی۔ اپنا عمامہ امان کی علامت کے طور پر عنایت کیا۔ عمیر جدہ پہنچا اور اُسے واپس لایا۔ وہ حنین کے معرکے کے بعد مسلمان ہوا۔

ابوجہل کا بیٹا عکرمہ یمن بھاگ گیا تھا۔ اس کی بیوی ام حکیم نے آنحضرت سے اس کے لیے امان طلب کی اور اسے جا کر یمن سے لائیں۔ وہ بھی مسلمان ہوا۔ آنحضرتؐ نے جب اُسے دیکھا تو فرطِ مسرت سے فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے اس کی جانب بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی۔ پھر اس سے بیعت لی۔

حرم میں نذر و نیاز اور ہدایا کا ایک زبردست خزانہ جمع ہوتا چلا آیا تھا، اسے محفوظ کر لیا گیا۔ البتہ جس قدر سونے چاندی کے مجسمے یا تصویریں تھیں، انھیں برباد کر دیا گیا۔

فتح مکہ سے فارغ ہو کر آپؐ نے یہ منادی کرا دی کہ جو لوگ مسلمان ہو گئے ہیں، وہ اپنے گھروں میں کوئی بت باقی نہ رہنے دیں۔ پھر آپؐ نے نواح مکہ کے مشہور بتوں کو توڑنے اور بت خانوں کو منہدم کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دستے روانہ کیے۔ حضرت خالد بن ولید کو روانہ کیا کہ بنو کنانہ کے بت عزیٰ کو توڑ دیں۔ چنانچہ انھوں نے اسے پاش پاش کر دیا۔ اس کا مندر مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا۔ حضرت عمروؓ بن العاص کو بنی ہذیل کے بت سواع کے توڑنے اور مسمار کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ حضرت عمروؓ بن العاص جب مندر کے

قریب پہنچے تو پجاری نے کہا کہ تم اس پر کیسے قادر ہو سکو گے۔ حضرت عمروؓ نے کہا تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ میں کیسے قادر ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر مندر میں داخل ہوئے اور بت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہ دیکھ کر وہ فوراً مسلمان ہو گیا۔ حضرت سعدؓ بن زید کو منات کا بُت توڑنے کے لیے قدید کے مقام کی جانب روانہ کیا گیا۔ وہاں کا پجاری بھی اسی وہم میں مبتلا تھا کہ مسلمان ہرگز بت نہ توڑ سکیں گے۔ مگر اس نے دیکھ لیا کہ مسلمانوں نے جاتے ہی مندر کو توڑ پھوڑ کر مسمار کر دیا۔ اس طرح مکہ مکرمہ اور اس کے گرد و نواح کو بت خانوں اور بتوں کی آلائش سے پاک کر دیا گیا۔

مکہ مکرمہ میں آپؐ کا قیام ۱۵ یوم تک رہا۔ جب آپؐ یہاں سے رخصت ہوئے تو حضرت معاذ بن جبل کو اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ لوگوں کو اسلام اور احکامِ دین سکھائیں۔

کعبۃ اللہ میں سینکڑوں بُت تھے جن میں سب سے بڑا بُت ہبل تھا۔ اسے تمام بُت پرست خدائے اعظم سمجھتے تھے۔ اس کی شکل انسانی تھی اور یاقوتِ احمر سے بنا ہوا تھا۔ خزیمہ بن مدرکہ نے جو عدنان کا پرپوتا تھا، سب سے پہلے اسے لاکر رکھا تھا۔ فال کے لیے سات تیر اس کے سامنے پڑے رہتے تھے۔ ان پر "لا" اور "نعم" لکھا ہوا تھا۔ عرب جب کوئی کام شروع کرتے تو ان سے فال لیتے تھے اور قرعہ ڈالتے تھے جو نکل آتا اس پر عمل کرتے تھے۔

مکے کے اطراف و اکناف میں بھی بڑے بڑے بُت تھے، جن کے لیے حج کی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور لات، مناۃ اور عزیٰ تھے۔ لات اہلِ طائف کا اور عزیٰ قریش کا معبود تھا۔ عزیٰ نخلہ نامی ایک مقام پر نصب تھا۔ یہ مکے سے ایک منزل پر ہے۔ بنو شیبان اس کے متولی تھے۔ اہلِ عرب کا عقیدہ تھا کہ خدا جاڑوں میں لات کے ہاں رہتا اور گرمیاں عزیٰ کے ہاں بسر کرتا ہے۔ عزیٰ کے سامنے وہ تمام مناسک اور رسوم بجالاتے تھے جو کعبے کے لیے لازمی تھے۔ اس کا طواف کرتے اور اس پر قربانیاں کرتے تھے۔

مناۃ کا تخت گاہ مشلل تھا جو قدید کے پاس مدینہ منورہ سے سات میل ادھر واقع ہے۔ وہ ایک بن گھڑا پتھر تھا۔ ازد، غسان، اوس اور خزرج اس کا حج کرتے۔ اوس اور خزرج کعبے کا حج کرتے تو احرام اُتارنے کی رسم اس کے پاس آکر ادا کرتے۔

قبیلہ ہذیل کا بت سواع تھا۔ جو ینبوع کے اطراف رہاط میں تھا۔ یہ ایک پتھر تھا، اس کے متولی بنو لحیان تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ثابت کیا کہ :

۱۔ معاہدہ ایک مقدس فرض ہے، اس کی پاسداری مسلمان پر فرض اور مدتِ معینہ کے لیے پابندی لازمی ہے۔ نقضِ عہد کا تصور تک بھی اس کے دماغ میں نہ آنا چاہیے۔

البتہ اگر فریقِ ثانی کی جانب سے خلاف ورزی ہو تو پھر مسلمان بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض حالات میں بدعہدی کرنے والی طاقت کا استیصال ضروری ہوتا ہے، فتح مکہ اس کی مثال ہے۔

۲۔ فتح مکہ کی یہ خصوصیت ہے کہ زور اور طاقت ہونے کے باوجود اس میں خون ریزی قطعاً نہ ہوئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم کعبہ کے احترام و عظمت کے پیشِ نظر خالد بن ولید کو ہدایات دیتے ہوئے ابتدا ہی میں ارشاد فرما دیا تھا کہ داخلہ حرم کے وقت ہرگز کسی پر تلوار نہ اٹھائی جائے۔ اِلّا یہ کہ مشرکین میں سے کوئی از خود اقدام کرے، اسی لیے حضرت سعدؓ بن عبادہ کے ذریعے رجز کے خلاف الیوم یوم الرحمۃ فرما کر اس حقیقتِ حال کو خوب روشن کر دیا۔

۳۔ دنیاوی شہنشاہ اور نبی الرحمۃ کے درمیان اگر فرق و امتیاز معلوم کرنا ہو تو فتح مکہ اس کے لیے روشن مثال ہے۔ تاریخ سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ جب کوئی بادشاہ یا شہنشاہ کسی ملک کو فتح کرتا تو اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا تھا۔ یہی کہ مفتوح اقوام پر مظالم کرے، قتل و غارت کر کے ان کو غلام بناتے یا تلوار کے گھاٹ اتار دے۔ لیکن جب نبیؐ رحمت کو اقتدارِ اعلیٰ نصیب ہوا اور فتح مکہ کی صورت میں مشرکین و کفار پر قدرت حاصل ہوا تو اس مقدس ہستی نے کیا کیا۔ صرف یہ کہ ان کو جمع کیا اور اعلان کر دیا لا تثریب علیکم الیوم — اذھبوا انتم الطلقاء۔ آج تم پر گزشتہ بداعمالیوں اور سفاکیوں کی وجہ سے کوئی ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

ایک شخص عمر بھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود جب فتح مکہ کے وقت کانپتا خوف کھاتا اور لرزتا ہوا حاضرِ خدمت ہوتا ہے تو اس وقت بھی نبیِ رحمت کی زبانِ اقدس اس حقیقت کا اعلان کرتی ہے، جس سے آپ کی شانِ پیغمبری نمایاں نظر آتی ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں: خوف نہ کھا، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ بلکہ تمہاری طرح خشک گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔

۴۔ کافر اور مشرک گروہ اگر اسلامی طاقت کا حلیف بننا چاہے تو بتقاضائے مفادِ مسلم اس کو حلیف بنایا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض حالات میں حلیف بنانا از بس ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ حلیف کے مال اور اس کی جان و آبرو سب کو اپنے مال و جان اور آبرو کی طرح سمجھے اور اس کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کرے جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ملک ذوالفقار علی

علمِ طبیعات کی ترقی میں مسلمانوں کا حصّہ

انسانی دین کی ترقی میں عربوں نے کئی ایسے محیر العقول کارنامے سرانجام دیے ہیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ یہ سلسلہ ظہورِ اسلام کے بعد شروع ہوا۔ وہ لوگ روحِ اسلامی سے سرشار تھے۔ انھوں نے قرآنی احکام و تعلیمات کے تحت اقوام و مللِ عالم کے علوم کی تحصیل و ترویج کو اپنا شعار بنالیا اور تھوڑے ہی عرصے میں مللِ قدیمہ کے علوم و معارف کا ذخیرہ عربی زبان میں منتقل ہو گیا۔ مسلمانوں نے اس پر بس نہیں کی بلکہ ان علوم کی ترقی میں سرگرمِ عمل رہے۔ قانونِ عروج و زوالِ امم کے تحت جب مسلمانوں کا زوال ہوا تو انھوں نے علوم و معارف کا ایک بے مثل خزانہ تمدنِ جدید کے بانیوں کے سپرد کیا۔ علوم و فنون کے میدان میں مسلمانوں نے زیادہ تر ان علوم کو ترویج دی جو عملی نقطۂ نظر سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ چنانچہ علم طب، علم طبیعات اور علم کیمیا میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے۔ خصوصاً علمِ طبیعات میں جو کہ روزمرہ کی زندگی میں سب سے کارآمد سائنس ہے، مسلمانوں کے اکتشافات نہایت قابلِ قدر ہیں، اسلامی دور میں علمِ طبیعات کے بے شمار ماہر پیدا ہوئے، ان میں سب سے نمایاں شخصیت ابن الہیثم کی ہے۔ یہ جلیل القدر حکیم اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی زندگی کے کارنامے کچھ تفصیل کے ساتھ بیان کیے جائیں۔

ابن الہیثم

پورا نام ابو علی الحسین بن الحسن ابن الہیثم ہے۔ لاطینی میں بگڑ کر الہیزن ہو گیا، انگریزی میں یہی نام رائج ہے۔ ۹۶۵ء میں پیدا ہوا۔ بچپن سے ہی ذہین و طباع تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے زمانے کے دستور کے مطابق عقلی و نقلی علوم سے فراغت حاصل کی۔ اس کی وسعتِ علمی کا چرچا دور دور تک پھیلا اور وہ ترقی کر کے وزارت کے عہدے تک پہنچا۔ مصر میں اس زمانے میں فاطمی خلیفہ الحاکم کی حکومت تھی۔ اس نے سنا کہ ابن الہیثم نے دریائے نیل کے بہاؤ سے متعلق ایک ایسی تجویز نکالی ہے کہ جس سے ہر سال آب پاشی کے لیے پانی میسر آسکے گا۔ اس نے ابن الہیثم کو مصر آنے کی دعوت دی۔ اس دعوت پر ابن الہیثم مصر پہنچا۔ اس کے ذمے یہ خدمت سپرد ہوئی کہ نیل کی طغیانی پر قابو پانے کے لیے

ذرائع اختیار کیے جائیں جو بارش کی احتیاج سے بے نیاز کر دیں۔ چنانچہ اس نے اس کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا، لیکن جب وہ مقامِ بائن کے قریب آبشارِ نیل پر پہنچا تو اُسے اپنی تجویز کے عملی نقطۂ نظر سے لاحاصل ہونے کا علم ہوا۔ اس ناکامی نے اس کی شہرت پر پانی پھیر دیا۔ خلیفہ الحاکم کے عتاب سے بچنے کے لیے اُسے پاگل کا روپ دھارنا پڑا، پھر وہ مصر سے اندلس چلا گیا اور باقی عمر وہیں گزاری لیکن اس کا انتقال قاہرہ میں ہوا۔

ابن الہیثم کے علمی کارنامے

ابن ابی اصیبعہ کا قول ہے کہ علومِ ریاضی اور طبیعات میں ابن الہیثم کا کوئی ہم سر نہیں ہوا۔ چاسر کہتا ہے کہ ہمیں ابن الہیثم کو علمِ مناظر کا سرچشمہ سمجھنا چاہیے۔ جارج سارٹن اپنی تاریخِ سائنس جلد اول میں لکھتا ہے کہ "مسلمانوں میں ابن الہیثم سب سے بڑا ماہرِ طبیعات تھا اور وہ ہر زمانے کے بڑے بڑے علمائے مناظر میں شمار کیے جانے کے قابل ہے"۔ طبیعات کے علاوہ اس کو علمِ ریاضی، علمِ طب اور علمِ ہیئت میں بھی پوری پوری دست گاہ تھی۔ اس نے ارسطو اور جالینوس پر شرحیں لکھیں۔ مصر کے دورانِ قیام میں ہی اس کی تصنیفات کا بہت بڑا ذخیرہ تیار ہو گیا تھا، لیکن اس کی سب کتابیں ہم تک نہیں پہنچیں۔ طبیعات میں اس کی کتاب "المناظر" بڑے پایہ کی ہے۔ اس کا لاطینی ترجمہ ۱۵۷۲ء میں شائع ہوا۔ صرف یہی ایک کتاب ابن الہیثم کے تبحرِ علمی کے اندازے کے لیے کافی ہے۔

علمِ مناظر طبیعات کی ایک اہم اور مفید شاخ ہے، جس نے اس زمانے میں بہت ترقی کی ہے۔ اس علم کی ترقی، نئے حقائق کی دریافت، قوانین کی تشریح اور مناظرِ قدرت کی توجیہ میں جو کام ابن الہیثم نے سرانجام دیا ہے، وہ فیثاغورث، کپلر، نیوٹن اور گلیلو کے کاموں سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر فیثاغورث کو اس بات کا فخر ہے کہ اس نے بطلیموس کی غلطیوں کو بے نقاب کر کے جدید طبیعات کا سنگِ بنیاد رکھا تو ابن الہیثم کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے علمِ مناظر کے تخیل پسند یونانیوں کی غلط فہمیوں کی تردید تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر کی اور ایسے ایسے اکتشافات کیے جو بعد میں مزید ترقیوں کا باعث ہوئے۔ ذیل میں ابن الہیثم کے دریافت کردہ چند مسائل بیان کیے جاتے ہیں جس سے ہمارے دعوے کی تائید ہوتی ہے۔

رویتِ اشیا

یونانیوں میں رویتِ اشیا کے متعلق دو نظریات ہیں۔ افلاطون اور اقلیدس وغیرہ کا نظریہ ہے کہ

نور کی شعاعیں آنکھ سے نکل کر شے مرئی پر پڑتی ہیں اور یہی رویت کا باعث ہیں۔ اس کے برعکس ارسطو کا نظریہ یہ تھا کہ رویت کا باعث وہ شعاعیں ہیں جو شے سے نکل کر آنکھ کے پردے پر پڑتی ہیں اپنے قیاس کی تائید میں دونوں ریاضی اور ہندسے سے کام لیتے تھے۔ لیکن جہاں تک آنکھ کی اندرونی ساخت کا تعلق ہے انھیں کچھ علم نہیں تھا۔ ابن الہیثم پہلا شخص ہے جس نے سب سے پہلے آنکھ کا مطالعہ کیا اور اپنی تحقیق کی بنا پر رویتِ اشیا کا سبب ان شعاعوں کو ٹھہرایا جو شے مرئی سے نکل کر آنکھ پر پڑتی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جو شعاعیں شے مرئی سے نکلتی ہیں، آنکھ کے پہلے پردہ پر پڑتی ہیں جہاں پر شے مرئی کا تصور بنتا ہے۔ یہ خیال عصبِ بصری کے ذریعے تک پہنچتا ہے اور دماغ شے کو محسوس کرتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم دونوں آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور دونوں آنکھوں سے دو خیال پیدا ہوتے ہیں تو پھر ایک ہی چیز کیوں دکھائی دیتی ہے۔ اس کا جواب بھی ابن الہیثم نے دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی دونوں آنکھوں کے پردے ایک ہی تناسب میں واقع ہوئے ہیں، ان پردوں کے ایک جیسے مقامات پر ایک سی ہی تشبیہ بنتی ہے۔ چنانچہ دماغ میں ایک ہی وقت ایک جیسے دو خیال پیدا ہوتے ہیں جو منطبق ہو جاتے ہیں۔ یعنی آنکھوں سے خیال تو دو پیدا ہوتے ہیں لیکن دماغ ایک تصور قائم کرتا ہے۔ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ جب آنکھ کے بیرونی پٹھوں کا توازن بگڑ جاتا ہے تو انسان کو ایک کی بجائے دو دو چیزیں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ بھینگا پن کی ابتدا میں ایسی ہی حالت پیش آتی ہے۔ اسے دوہری بصارت کہتے ہیں۔ جدید سائنس ابن الہیثم کے ان نظریات کی تائید کرتی ہے۔

روشنی کا انعکاس

روشنی کے انعکاس کے اصولوں میں ابن الہیثم نے ایک نہایت مفید اضافہ کیا جو اصولی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یونانیوں کو اس بات کا علم تھا کہ زاویۂ وقوع اور زاویۂ انعکاس ایک دوسرے کے برابر ہوتے ہیں۔ ابن الہیثم نے یہ اضافہ کیا کہ دونوں زاویے ایک ہی مستوی میں ہوتے ہیں۔ آج طبیعات کا ہر طالب علم اس بات سے واقف ہے، لیکن اس انکشاف کی اہمیت وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو علوم کی ارتقائی ترقی اور تاریخ سے واقف ہوں۔ ابن الہیثم نے کروی اور شلجمی آئینوں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور ان سے متعلق حسبِ ذیل امور دریافت کیے:

۱۔ کسی نقطے سے گزرنے والی شعاعوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ حرارت نقطے پر پیدا

ہوتی ہے۔

۲۔ جو شعاعیں کسی کروی آئینے کے صدر محور کے متوازی ہو کر آئینے پر پڑتی ہیں، وہ منعکس ہو کر محور کی طرف لوٹتی ہیں۔

۳۔ اگر کسی کروی آئینے پر ایک ایسا دائرہ فرض کیا جائے، جس کا محیط آئینے کے صدر محور پر عمود ہوا ہو تو اس محیط کے تمام نقطوں سے منعکس ہونے والی شعاعیں صدر محور کے ایک اور ایک ہی نقطے سے گزریں گی۔ اس نقطے کو آئینے کا ماسکہ کہتے ہیں۔

انعطافِ نور

ابن الہیثم نے زاویۂ وقوع اور زاویۂ انعطاف کی پیمائش نہایت احتیاط سے کی اور بطلیموس کے اصول غلط ٹھہرائے۔ انعطاف کو واضح کرنے کے لیے ابن الہیثم نے ایک آلہ ایجاد کیا، جس میں ایک درجے دار کروی حلقہ تانبے کا بنا ہوا تھا۔ اس کو انتصابی وضع میں رکھا گیا تھا اور آدھا پانی کے اندر اُتار دیا گیا تھا۔ حلقے کے کنارے میں ایک سوراخ تھا جس میں سے شعاع واقع گزار دی گئی تھی۔ پھر وہ مرکز تک پہنچتی، جہاں ایک سوراخ دار قرص میں سے گزرتی۔ یہ آلہ اس قدر سادہ اور اعلیٰ ہے کہ آج بھی قدرے ترمیم کے بعد انعطاف کی توضیح کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

اسی اصول سے کام لے کر ابن الہیثم نے ہوائی انعطاف کی توجیہ کی۔ اس نے بتایا کہ ہمارے کرۂ ارض کے گرد جو ہوا ہے، وہ زمین سے قریب تر ہو تو کثیف ہوتی ہے۔ اس سے اس نے یہ استدلال کیا کہ سورج چاند اور ستاروں سے آنے والی شعاعیں زمین سے قریب آنے پر خمیدہ ہو جاتی ہیں، کیونکہ وہ کثیف تر ہوا میں سے ہو کر گزرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غروب کے وقت آفتاب افق سے نیچے ہونے کے بعد بھی دکھائی دیتا ہے، یعنی غروبِ مرئی غروبِ اصلی کے بعد ہوتا ہے۔

ابن الہیثم ہی پہلا شخص ہے جس نے یہ بتایا کہ محدب عدسہ کو جب آنکھ اور کسی چیز کے درمیان فاصلے پر رکھا جائے تو وہ شے کو بڑا کر کے دکھلاتا ہے۔ محدب عدسہ سے مراد شیشے کا ایک جسم ہے جو دو کروی سطحوں سے گھرا ہو۔ یہ دونوں سطحیں کنارے تک پہنچتے پہنچتے ایک دوسرے پر مائل ہوتی ہیں۔ یہ دونوں سطحیں شعاعوں کو اتنی خمیدہ کر دیتی ہیں کہ وہ آنکھ کے اندر ایک ماسکہ پر مل جاتی ہیں۔ ابن الہیثم کے اسی انکشاف نے عینکوں کی صنعت ممکن کر دی اور آگے چل کر یہی انکشاف دوربین اور خردبین کی ایجاد کا باعث ہوا۔

ابن الہیثم نے متحرک اجسام کے اصولوں پر بحث کی، جسے جدید سائنس کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ اس نے چیزوں کے فضا کے وزن اور کثافت کے باہمی تعلق کو بیان کیا اور اس بات کو واضح کیا کہ لطیف اور کثیف فضا میں تولنے سے چیزوں کے اوزان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ بعض چیزیں پانی میں ڈوبتی ہیں اور بعض تیرتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، چیزوں کے پانی میں ڈوبنے سے ان کا وزن ہو جاتا ہے وغیرہ۔ ابن الہیثم کششِ زمین کے اصولوں سے بخوبی واقف تھا، وہ متحرک اجسام کی رفتار، فاصلے اور وقت کے تعین میں بھی ماہر تھا۔

ابن الہیثم کی تصانیف

ابن الہیثم نے بے شمار کتب تصنیف کیں، لیکن زمانے کی دست برد سے وہ ضائع ہو چکی ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں ابن الہیثم کی مندرجہ ذیل کتب مذکور ہیں:

۱۔ کیفیۃ الظلال : اس کا ترجمہ ۱۹۰۷ء میں جرمنی میں شائع ہوا۔

۲۔ فی المرایۃ المحرقۃ بالقطوع : اس کا ترجمہ ۱۹۱۰ میں جرمنی میں شائع ہوا۔

۳۔ فی المساحۃ الجسم المکانی : ۱۹۱۲ میں ترجمہ اور تشریح کے ساتھ سوٹر نے شائع کیا۔

۴۔ کتاب المناظر

علاوہ ازیں ابن الہیثم کے مندرجہ ذیل رسائل بھی جرمنی سے شائع کیے گئے ہیں: (۱) فی مسئلۃ عددیہ۔ (۲) فی اصول ساحہ۔ (۳) فی شلث بنی موسیٰ۔

ابو ریحان البیرونی

البیرونی ایک جامع شخصیت کا مالک تھا۔ اسے اپنے زمانے کے مروجہ علوم پر عبور تھا۔ اس کا اصل کام ہیئت پر ہے۔ چنانچہ اسی کی قانون مسعودی اس فن کی اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ البیرونی کی سو سے زائد تصانیف ہیں، جن میں سے کتاب الہند اور آثار الباقیہ زیادہ مشہور ہیں۔ البیرونی ۲ ذی الحجہ ۳۶۲ھ کو خوارزم میں پیدا ہوا۔ اس طرح سے وہ ابن الہیثم کا ہم عصر تھا۔ ابن الہیثم کی طرح اس جلیل القدر حکیم نے بھی علمِ طبیعات میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

البیرونی نے کثافتِ اضافی کے مفہوم کو واضح کیا اور اس کی دریافت کے لیے بہت سے تجربات کیے۔ البیرونی نے اس مقصد کے لیے ایک ایسا برتن استعمال کیا جس میں نیچے کی طرف جھکی ہوئی ایک ٹونٹی لگی ہوئی

تھی ۔ اس کو ٹونٹی تک پانی سے بھر لیا ۔ پھر اس میں ٹھوس چیز ڈالی ، جو پانی بہہ نکلا اس کا وزن کر لیا ۔ پھر ہوا میں ٹھوس چیز کے وزن سے کثافتِ اضافی معلوم کر لی ۔ البیرونی نے اس طریقے سے کوئی اٹھارہ قیمتی جواہر اور دھاتوں کی کثافتِ اضافی صحیح صحیح معلوم کی تھی ۔ البیرونی نے قدرتی چشموں اور کنوؤں کی توجیہہ ماسکونی اصولوں سے کی ۔

الکندی

یعقوب ابن اسحاق الکندی جسے لاطینی میں الکندس کہتے ہیں ، نویں صدی کے اوائل میں بصرہ میں پیدا ہوا ۔ یونانی علوم و فنون میں ماہر تھا ، اس کا اصل موضوع فلسفہ تھا ، لیکن اسے دوسرے علوم و فنون میں بھی کامل دست گاہ تھی ۔ علم موسیقی پر مسلمانوں میں سب سے پہلے الکندی نے ہی کتابیں لکھیں ۔ اس کی کتابوں کی تعداد دو سو تک پہنچتی ہے ، جو ریاضی ، نجوم ، موسیقی ، طبیعات ، طب اور جغرافیہ وغیرہ موضوعات پر حاوی ہیں ۔ اس کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ لاطینی میں ہو چکا ہے ۔

الرازی

ابو بکر محمد بن زکریا رازی ، عہدِ اسلامی کا مشہور طبیب تھا ۔ علمِ طب کے میدان میں اس کا کوئی ہم سر نہ تھا ۔ طبیعات اور کیمیا میں بھی اسے مہارت حاصل تھی ۔ اس نے مختلف چیزوں کی کثافت اضافی معلوم کرنے کی کامیاب کوششیں کیں ، اس کے لیے اس نے ماسکونی ترازو استعمال کیا ، جسے وہ المیزان الطبیعی کے نام سے موسوم کرتا ہے ۔

الفارابی

ابو نصر محمد بن طرخان الفارابی ، فاراب کے قریب وسیج میں پیدا ہوا ۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ حلب میں گزارا ۔ اس نے یونانی فلسفے کو اسلامی عقائد کے ساتھ تطبیق دینے کے عمل کو ، جس کی ابتدا یعقوب ابن اسحاق الکندی نے کی تھی جاری رکھا ۔ فارابی نے ارسطو کی مختلف فنون پر کتابوں مثلاً طبیعیات جویات اور مابعد الطبیعات پر شرحیں لکھیں ۔ فارابی نے کتاب الموسیقی کے نام سے فنِ موسیقی پر ایک کتاب تحریر کی جو موسیقی کے نظریے پر سب سے اہم کتاب مانی گئی ہے ۔ فارابی نے دو لکڑیوں کو ترتیب دے کر ایک باجہ بھی بنایا تھا جس سے مختلف طریقوں سے مختلف سُر پیدا ہوتے تھے ۔

ابنِ سینا

۱۰۲۱ - ۱۱۰۰ ... [illegible] ... تھا ۔ جارج سارٹن اپنی کتاب تاریخ سائنس

تا ہے کہ ابن سینا، فلسفہ، طب، ریاضی، طبیعات اور ہیئت میں کمال رکھتا تھا اور جامع العلوم تھا۔ وہ شیخ کو اسلامی دور کا مشہور ترین سائنس دان قرار دیتا ہے۔ علم طب اور علم فلسفہ پر شیخ کی بے شمار کتابیں ہیں جن میں سے کتاب الشفا، کتاب الاشارات و تنبیہات، کتاب الحمیات اور القانون مشہور ہیں۔

شیخ نے ایک رسالے میں رعد کے اسباب پر بحث کی ہے، یہ رسالہ حیدر آباد (دکن) کی مجلس دائرۃ المعارف نے طبع کیا۔

عمر خیام

عمر خیام ایک بہت بڑا فلسفی، ریاضی دان، ماہر طبیعات اور ہیئت دان تھا، مگر اس کی شہرت اس کی رباعیات تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ عمر خیام نے کثافت اضافی کی دریافت کے بعض طریقے ایجاد کیے۔

الجزری

بدیع الزمان الجزری مشہور مسلم ماہر مکینک تھا۔ اس نے سلطان نصیر الدین محمود کے لیے ہندسی آلات پر ایک کتاب موسومہ کتاب فی معرفۃ العلل الھندسیہ لکھی۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر لاجواب ہے۔

قیشار ابن ابی القاسم

قیشار ابن ابی القاسم مصر میں افسون نامی مقام پر پیدا ہوا۔ عرصے تک سلطان المظفر الثانی کی ملازمت میں رہا۔ ۱۲۵۱ء میں دمشق میں وفات پائی۔ اس نے سلطان المظفر کے لیے پن چکیاں بنائیں اور قلعہ بندیاں تعمیر کیں۔ ۱۲۲۵ء میں اس نے اجرام سماوی ایک گلوب تیار کیا جو آج کل مصر کے نیشنل میوزیم میں موجود ہے۔

نصیر الدین طوسی

نصیر الدین طوسی نے اقلیدس کی کتاب المناظر کی تلخیص کی اور علم المناظر سے متعلق بہت سے مسائل پر بحث کی۔ مثلاً گرمی اور سردی کے رنگوں پر کیا اثرات ہوتے ہیں۔ خشکی اور تری ان میں کیا تغیر پیدا کرتی ہے، روشنی کی شعاعیں کیسے پیدا ہوتی ہیں، موسم کے تغیر و تبدل کے کیا اسباب ہیں۔ نصیر الدین کے شاگرد قطب الدین نے اس کے بعد اس کے تجربات کو جاری رکھا۔ قطب الدین نے قوس قزح

کے اسباب کی تشریح کی جو دورِ حاضر کی سائنسی تشریح سے ملتی جلتی ہے۔ یہ تشریح اس کی کتاب نهایة الادراک میں موجود ہے۔

عہد اسلامی کا ایک اہم کارنامہ گھڑیوں کی تیاری ہے۔ ہارون الرشید نے شارلیمان شاہِ فرانس کو تحفے کے طور پر ایک گھڑی بھیجی، جسے دیکھ کر اس کے تمام درباری حیران رہ گئے۔ محمد بن علی بن رستم الساعتی نے ایک بے نظیر گھڑی تیار کی، جسے دمشق کے باب جیرون پر لگایا گیا۔ وہ اپنی وفات تک اس گھڑی کا انچارج رہا۔ بہت سے سیاحوں نے اس کلاک کا مشاہدہ کیا اور اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا۔

محمد بن علی کے لڑکے رضوان نے اس کلاک کی مرمت کی اور اس میں کئی تبدیلیاں کیں۔ ۱۲۰۳ء میں اس نے کلاکوں کی بناوٹ کے بارے میں ایک کتاب تحریر کی جو اس فن پر پہلی کتاب ہے۔

عربی طبیعات پر ایک نظر

یہ ایک حقیقت ہے کہ علوم و فنون کی ترقی میں جو حصہ عربی دل و دماغ نے لیا اس کا بیسواں حصہ بھی آج دنیا کے سامنے موجود نہیں۔ اس کا بہت بڑا حصہ تو انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں برباد ہو گیا اور کچھ تعصبِ علمی کی وجہ سے ارادتاً دبا دیا گیا، جس قدر باقی بچا ہے وہ یونانی علوم کے ساتھ اس قدر ملا دیا گیا ہے کہ تفریق کرنا محال ہے۔ اس اختلاطِ علم کی بہت سی وجوہات ہیں، لیکن سب سے بڑا سبب قومِ عرب کی علمی بے تعصبی، احسان نوازی اور انصاف پسندی ہے۔

یونانیوں سے انھوں نے علم فلسفہ اور علمِ طب سیکھی اور ہندوؤں سے نجوم، ہیئت اور طب کے چند اسباق لیے، باوجودیکہ وہ ان علوم میں اپنے استادوں سے کوسوں آگے نکل گئے، لیکن آخر تک ان کی شاگردی کا دم بھرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ میں یہ خیال عام ہے کہ مختلف علوم و فنون کی ترقی میں عربوں کا حصہ صرف اس قدر ہے کہ انھوں نے یونانی علوم کے مخفی خزانوں کو زمانے کی دست برد سے بچا لیا اور انھیں جوں کا توں یورپ کے حوالے کر دیا۔ حالاں کہ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اگر عرب ہیئت، علم الافلاک، علم طبیعات، علم طب اور علم ریاضی کو علمی حیثیت سے ترقی نہ دیتے تو آج دنیا میں سائنس کی جلوہ افروزیاں نظر نہ آتیں۔

ڈاکٹر محمد ریاض

فارسی نثر کی اقسام اور ادوار

فارسی ادبیات کے ناقدوں نے شعر کی مانند فارسی نثر کی اقسام اور اس کے ادوار سے بحث کی ہے۔ فارسی شعر کے قدیم ترین دست یاب نمونے تیسری صدی ہجری سے مربوط ہیں لیکن نثر کے نمونے کوئی سو سال موخر تر ہیں۔ شاہ نامہ ابو منصوری کے مقدمے کو فارسی نثر کا قدیم ترین نمونہ مانا جاتا رہا ہے۔ وہ سب سے قدیم ترین نمونہ نہ ہو تو بھی قدیم ترین فارسی متون میں سے ضرور ہے۔ اسے ابو منصور عبدالرزاق طوسی نے لکھا تھا اور اس کا انتقال ۳۵۱ھ میں ہوا۔

سہ گانہ اقسام نثر

فارسی نثر کی تین اقسام ہیں، مگر ان سہ گانہ اقسام کی پھر مزید جزو بندی کی جاتی رہی ہے۔ (۱) سادہ یا مرسل (۲) مصنوع، مسجع اور متکلف (فنی) نثر اس کے ذیل میں آتی ہے۔ (۳) شکستہ نثر

سادہ یا مرسل فارسی نثر کی اصطلاح واضح ہے۔ یہ نثر کی وہ قسم ہے جس میں مطلب کو سادہ پیرایۂ بیان میں ادا کیا جاتا ہے اور موزوں و مسجع کلمات، مشکل لغات، محاورات اور تراکیب یا لفظی اور معنوی صنائع کو استعمال کرنے پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ شاہ نامہ ابو منصوری کے مقدمے کے ابتدائی دو جملے ملاحظہ ہوں:

"سپاس و آفرین خدائے را کہ این جہان و آن جہان را آفرید و ما بندگان را اندر جہان پدیدار کرد و نیک اندیشان و بد اندیشان را و بدکرداران را پاداش و باد افراہ برابر داشت" اس زمانے میں مترادف کلمات لانے کا رواج تھا مگر مجموعی طور پر یہ جملے سادہ یا مرسل نثر کے نمونے ہی قرار پائیں گے۔

مصنوع نثر

مصنوع نثر کو مسجع، متکلف یا فنی کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں مگر فارسی کتابوں میں بیشتر "نثر فنی" کی اصطلاح رائج ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی نثر کے آغاز کی پہلی صدیوں یعنی چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں بالعموم سادہ و مرسل نثر کا رواج رہا، مگر بعد کی دو صدیوں میں مصنوع یا فنی نثر کا خاصا متداول رہا۔ ڈاکٹر حسین خطیبی نے اپنی تالیف "تاریخ تطور نثر فنی" (تہران ۱۳۶۶ھ) میں چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کی فارسی

مصنوع نثر کے تنوع سے بحث کی ہے۔

مصنوع نثر کے ذیل میں ایک مسجع نثر آتی ہے۔ یہ نثر کی وہ قسم ہے جس میں سجع کی کوئی صورت استعمال کی گئی ہو۔ "سجع"، علم بدیع کی اصطلاح میں ہم وزن یا ہم آہنگ کلمات کو کہتے ہیں۔ شعر میں یہ کلمات قافیہ کہلاتے ہیں۔ سجع تین طرح کا ہوتا ہے۔

پہلا سجع متوازن ہے جس میں حروف اور ان کے اوزان یکساں نوعیت کے ہوتے ہیں جیسے مواج اور نقاد۔ فرہنگِ معین جلد دوم میں اس کی یہ مثال نقل ہوئی ہے۔ "بحرے است مواج و شخصے است نقاد"۔ سجع متوازن میں "حرف روی" کی یکسانیت کا لحاظ نہیں ہوتا۔ دوسرا سجع متوازی کہلاتا ہے، جس میں وزن کی یکسانیت کے علاوہ "حرف روی" کی مطابقت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً خلف، سلف اور علف کی طرح کے کلمات "سجع متوازی" کہلائیں گے۔ تیسری صورت سجع مطرف کی ہے جس میں مختلف اوزان مگر یکساں حرف روی والے کلمات لاتے ہیں جیسے مال اور آمال، آل اور مآل۔

نثر مصنوع کی تیسری قسم کو متکلف یا فنی مطلق کہتے ہیں۔ اس میں سجع کے علاوہ بعض لفظی صنائع کا استعمال ہوتا ہے مثلاً جناس یا ترصیع کا۔ جناس یا تجنیس اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں متشابہ صورت مگر مختلف معانی کے حامل الفاظ استعمال کیے جائیں۔ "ترصیع" الفاظ کو مسجع بنانے اور حروف و الفاظ کے اوزان کا متساویاً لحاظ رکھنے کا نام ہے۔ ذیل کے تین جملے ملاحظہ ہوں:

"عشق گفت، دیوانہ جرعۂ ذوقم، برآرندۂ شوقم، زلفِ محبت را فشانہ ام و زرع محبت را دانہ ام" (کنز السالکین مؤلفہ پیر ہرات خواجہ عبداللہ انصاری)

"اگر شبہا ہمہ قدر بودے شب قدر بے قدر بودی" (گلستانِ سعدی)

"دو کس دشمن ملک و دین اند۔ پادشاہِ بے حلم و زاہد بے علم" (ایضاً)

جملہ اول میں ذوقم، شوقم اور فشانہ ام و دانہ ام کے کلمات میں سجع ہے۔ دوسرے جملے میں لفظ قدر میں جناس ہے۔ (قدر، شبِ قدر، بے قدر) اور تیسرے میں 'بہ کمال' اور 'بہ جمال' میں ترصیع دیکھی جا سکتی ہے۔

البتہ یہ بات یاد رہے کہ جناس کی سات عام صورتیں ہوتی ہیں:

۱۔ جناسِ تام جس میں ہم صورت مگر مختلف معانی والے کلمات استعمال ہوتے ہیں۔ اوپر کی مثل

جناس تام ہی کی تھی۔

۲۔ جناسِ ناقص، جس میں یکساں نوعیت کے حروف استعمال ہوتے ہیں مگر ان کی حرکات متفاوت ہوتی ہیں جیسے عطاء اللہ جوینی کی "تاریخ جہانگشا" (جلد اوّل) میں ہے: "دور از خوشی در رشد و قصور بر خرابی مقصور گشت۔"

۳۔ جناس زائد، ایک جیسے کلمات کے اوّل یا آخر میں کچھ اضافہ مقصود ہے جیسے "چون اجل حال گردد گزارش آن محال باشد" (مرزبان نامہ)۔ اُسے جناس مذیل بھی کہتے ہیں۔ حافظ کے شعر ذیل میں باد اور بادہ بھی جناس زائد کی صورت ہے:

بیا کہ قصرِ امل سخت سست بنیاد است   بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد است

۴۔ جناسِ مرکب: اس میں دو ہم جنس لفظ لائے جاتے ہیں جن میں ایک مرکب ہوتا ہے اور دوسرا مفرد و بسیط، مثلاً "راحة الصدور" میں حضرت علیؓ کے بارے میں ایک جملہ ہے: "آن شیر شریعت، سرورِ جہان طریقت، حیدر حیدر بابای شبیر و شبر۔"

۵۔ جناس مکرر: ایک جیسے الفاظ لاتے ہیں مگر بعض پر کچھ حروف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، جیسے ذیل کے شعر میں زار اور نزار:

بے سرود و رود تو بہ ہم و غم   بہ ندیم و یار من نزار و زار

۶۔ جناس مطرف: اس میں یہ التزام ہوتا ہے کہ ایک آخری حرف کے سوا باقی دو یا زیادہ کلمات جملے میں یکساں نوعیت کے استعمال کیے جاتے ہیں، مثلاً "مرزبان نامہ" کے مندرجہ ذیل جملے میں "معاش" اور "معاد":

"کہ در معاش دنیا و معاد آخرت آن را دستور حال خویش داریم۔"

۷۔ جناس خط: اس میں حروف کے نقطے متفاوت ہوتے ہیں مگر کلمات کی ظاہری حالت ایک طرح کی ہوتی ہے۔ مثلاً "دایہ ابر بہاری را فرمودہ تا نبات بنات را در مہد زمین بپرورانَد۔" (مقدمہ گلستان سعدی)

جناس کی دیگر اقسام میں مضارع (لاحق) مقلوب اور لفظی صورتیں ہیں جو اشتقاق کے ذیل میں آتی ہیں، مگر فنی نثر میں صرف ترصیع یا جناس سے کام نہیں لیا جاتا، کئی قسم کے کنایوں اور استعاروں سے بھی کام لیا جاتا ہے اور دیگر صنائع بھی استعمال ہوتے رہے ہیں۔

شکستہ نثر: قدیم فارسی نثر کی منقولہ بالا دو ہی قسمیں ہیں مگر عصرِ حاضر کی فارسی کے اسلوب، خصوصاً مختصر

کہانیوں، ناولوں اور صحافتی ادب کو شکستہ نثر کہتے ہیں۔ مقصد یہ کہ اس اسلوب میں محاورے اور تخاطب میں تناظر اور ابلاغ کو پیش نظر رکھا جاتا ہے

فارسی نثر کے ادوار

فارسی ادب کے آغاز کو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس وقت دنیا کے مختلف علاقوں میں فارسی نویسوں کی موجودگی سے قطع نظر فارسی ایران، افغانستان اور روس کی بعض ریاستوں کے کروڑوں لوگوں کی قومی زبان ہے اور اس میں نثر و نظم کے سرمائے کا اضافہ ہو رہا ہے۔ مختلف علاقوں کے مکینوں کے انداز نگارش میں ایک حد تک تنوع نظر آنا ایک بدیہی بات ہے مگر کسی خاص دور کے مجموعی اسلوب میں معمولی اختلافات چنداں اہم نہیں ہوتے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی سات آٹھ سو سال تک فارسی ادب پروان چڑھتا رہا مگر موجودہ ایران کے نقاد فارسی نثر کے حسب ذیل پانچ ادوار کی تعیین کرتے ہیں:

۱۔ فارسی نثر کے آغاز سے پانچویں صدی ہجری کے اواخر تک کوئی ڈیڑھ سو سالہ دور۔

۲۔ پانچویں صدی ہجری کے اواخر سے آٹھویں صدی کے اختتام تک کا عہد۔

۳۔ نویں صدی سے بارھویں صدی ہجری کے اواخر تک کا چار سو سالہ دور۔

۴۔ نثر جو تیرھویں صدی ہجری سے ایک سو سال تک متداول رہی ہے۔

۵۔ نثر جدید۔

ان پانچ ادوار کے ذیلی عہد مقرر کیے جا سکتے ہیں، تاہم یہاں مختصراً ان بڑے ادوار پر ہی بحث کی جاتی ہے۔

دورِ اوّل

یہ فارسی نثر کا وہ دور ہے جس میں ابھی عربی ادب فارسی میں زیادہ دخیل نہ ہوا تھا، اس زمانے میں لکھی جانے والی کتابوں میں نمائندہ ادب مندرجہ ذیل تصانیف ہیں:۔

ابو منصور عبدالرزاق کا "مقدمہ شاہنامہ" (مولفہ ۳۴۶ھ)

ابو علی محمد بلعمی مروزی کی "تاریخ بلعمی" (تاریخ طبری)، تالیف ۳۵۲ھ

ابو علی ابن سینا کا "دانش نامہ علائی" (۲ جلد)

ناصر خسرو کا "سفرنامہ" (۴۳۷ تا ۴۴۴ھ)

ابوالفضل بیہقی کی "تاریخ بیہقی"

حضرت سید علی جلابی ہجویری کی "کشف المحجوب"
خواجہ نظام الملک طوسی کا "سیاست نامہ" (سیر الملوک)
امیر عنصر المعالی کیکاؤس کا "قابوس نامہ"

دورِ دوم

اس دور میں بالعموم عربی زبان اور اسلامی ادب فارسی پر خاصا اثر انداز ہو چکا تھا۔ قرآنِ مجید کی آیات، احادیثِ رسول اور عربی اشعار اور امثال فارسی مصنفین کے ہاں اکثر منقول نظر آتے ہیں۔ اس طویل دور میں سادہ و فنی دونوں قسم کی نثر دیکھی جاسکتی ہے اور نمائندہ ادب کتب کئی ہیں۔ اس دور کی مندرجہ ذیل تصانیف ہیں:

کیمیائے سعادت، "مولفہ امام محمد غزالی"
اسرار التوحید، مولفہ محمد بن منور۔ (آواخر قرن ۶۰۰ ہجری)
کلیلہ و دمنہ، مولفہ ابوالمعالی نصر اللہ منشی (ایضاً)
تذکرۃ الاولیا، عطار (م ۶۱۸ھ)
رسائل خواجہ عبداللہ انصاری (م ۴۸۱ھ)
مقاماتِ حمیدی، مولفہ قاضی حمید الدین بلخی (م ۵۵۹ھ)
التوسل الی الترسّل، بہاء الدین بغدادی
راحۃ الصدور، مولفہ نجم الدین محمد راوندی (مولفہ ۵۹۹ھ)
تاریخ وصاف، مولفہ وصاف الحضرۃ شرف الدین عبداللہ (قرن ۷۰۰ و ۸۰۰ھ)
اخلاقِ ناصری، مولفہ خواجہ نصیر الدین طوسی (م ۶۷۲ھ)
گلستان، مولفہ شیخ سعدی (م ۶۹۱ھ)
ذخیرۃ الملوک، شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ)
چہار مقالہ، مولفہ نظامی عروضی سمرقندی (آواخر قرن ششم ہجری)
مرزبان نامہ، مولفہ سعد الدین وراوینی (قرن ہفتم ہجری)

پیر ہروی شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری کے اکثر رسائل میں مصنوع اور فنی نثر کے نمونے ملتے ہیں، وہ

غالباً قدیم ترین فنی نثر لکھنے والے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ اسی قسم کے جملے بولا اور لکھا کرتے تھے:

"نماز نافلہ گزاردن کار پیرزنان است، روزہ تطوع صرفۂ نان است، حج گزاردن گشت جہان است، دلے بدست آرکہ کار آن است۔"

"اگر بر ہوا روی، مگسے باشی، و اگر در آب روی، خسے باشی، دلے بدست آر تا کسے باشی۔"

امام ابو حامد غزالی کی "کیمیائے سعادت" کا اسلوب سادہ ہے۔ دیگر سادہ اسلوب والی کتابوں میں اسرار التوحید فی مقامات ابوسعید ابوالخیر، تذکرۃ الاولیا، چہار مقالہ، گلستان اور ذخیرۃ الملوک کے نام لیے جا سکتے ہیں مگر یہ کتابیں بھی تماماً آسان اور مرسل نہیں ہیں۔ مثلاً چہار مقالہ اور گلستان کے دیباچے خاصے متکلف ہیں، مگر بقیہ حصے نسبتاً سادہ ہیں۔ ذخیرۃ الملوک بھی پیرایۂ بیان کے لحاظ سے سادہ ہے مگر اس میں لغات کافی مشکل ہے۔ دیگر کتابیں مشکل ہیں یا مصنوع، مگر تاریخ وصاف میں تصنع و تکلف آخری درجے میں پہنچا ہوا ہے۔ یہ کتاب صنائع و بدائع اور مشکل لغات نیز غیر معمولی عربیت کے علاوہ اسلوبِ بیان کے لحاظ سے بھی پیچیدہ و مغلق ہے۔ اس کا مولف "شرف" کے تخلص کے ساتھ شعر بھی کہتا تھا۔ اس تاریخ کا نام "تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار" ہے اور یہ پانچ جلدوں میں ہے۔ یہ تاریخ جہانکشائے جوینی کا تکملہ ہے اور مولف نے اسے رشید الدین فضل اللہ ہمدانی (صاحبِ تاریخِ رشیدی) کی فرمائش پر لکھا تھا۔ اس کا مقدمہ اصل کتاب سے آسان تر ہے اور وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

"حمد و ستایشے کہ انوار اخلاصش آفاق و انفس را چون فاتحہ صبح صادق متلالی سازد و شکر و سپاسی کہ در موقع ستایستگی خلعت "لئن شکرتم لا زیدنکم" (آیہ، سورہ ابراہیم) در جید وجود جان اندازد، جناب قدس مالک الملک بحق واجب الوجود ذی را تعالیٰ عن درک الفہم والقیاس کمال ذاتہ وجل عن مسابقۃ الظنون جلال صفاتہ کہ جوہر بسیط معلول اول را از خزانہ خانہ "کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف" بیرون آورد و "اول ما خلق اللہ العقل"، و باز از شاخ نو بر عقل فیاض گل نفس کل را بہ صبا صنع صمدیت بشگفتانید و بہ وساطت آن دو جوہر جواہر مجردات و نفوس مفارقات سلسلہ امکان کمنت تعدد یافت و اجرام علویات در میدان شوق انوار جمال و مطالعہ جلایائے اسرار اوگوئے صفت در خم چوگان تقدیر گردان شد۔۔۔"

دورِ سوم

(۳۱) دورِ سوم بھی نثر فارسی کا رطب و یابس موجود ہے۔ بیشتر کتابیں فنی اسلوب میں لکھی گئیں

بعض میں سادگی اور جدالت کے بھی اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اہم تر فارسی کتابوں میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں۔

بہارستان از مولانا عبدالرحمٰن جامی (م ۸۹۸ھ)

اخلاقِ جلالی از علامہ جلال الدین دوانی شیرازی (م ۹۰۸ھ)

اخلاقِ محسنی از ملا حسین واعظ کاشفی سبزواری (م ۹۱۰ھ)

تاریخ حبیب السیر از خواندمیر (م ۹۴۲ھ)

درہ نادرہ جہانگشائے نادری از میرزا مہدی خان (م تقریباً ۱۱۸۰ھ)

آئینِ اکبری۔ عیارِ دانش از ابوالفضل علامی اکبرآبادی (م ۱۰۱۱ھ)

منشآت از قائم مقام فراہانی (م ۱۲۵۱ھ)

پریشان از میرزا قاآنی شیرازی (م ۱۲۷۰ھ)

اس فہرست میں شامل دو کتابیں بہارستان اور پریشان گلستانِ سعدی کی پیروی میں ہیں۔ بہارستان کے آٹھ روضے ہیں اور اس میں دل پذیر اور اخلاق آموز حکایات ملتی ہیں۔ اس کتاب اور قاآنی کی پریشان میں نثر کے ساتھ نظم بھی ہے۔ اخلاقِ جلالی، اخلاقِ ناصری کے اسلوب میں ہے مگر اس سے مشکل تر۔ ان دونوں کتابوں میں حکمائے یونان اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اخلاق کے رذائل اور فضائل سے بحث کی گئی ہے مگر اخلاقِ محسنی پر دینی رنگ زیادہ غالب ہے۔ مصنف نے اس کتاب کے علاوہ انوارِ سہیلی اور فتوت نامہ سلطانی کے ذریعے دین و اخلاق کی تعلیمات عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ انوارِ سہیلی کو کلیلہ و دمنہ کا ایک دوسرا نقش جاننا چاہیے۔

انشا کے اعتبار سے میرزا قائم مقام فراہانی کے منشآت اور مکتوبات بے حد اہم ہیں۔ وہ شیوۂ سعدی کا شیدا تھا مگر اس کی تحریر گلستان سے آسان تر ہے۔ اس کے خطوط فارسی میں ایسے ہی بے نظیر ہیں جیسے اردو میں میرزا غالب کے مکاتیب بے بدل مانے گئے ہیں۔

دورِ چہارم

اس دور کو "دورۂ بازگشت ادبی" کہتے ہیں اور اس کا آغاز میرزا قائم مقام فراہانی سے جاننا چاہیے۔ تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں ایران میں بڑے نامور پیدا ہوئے اور انھوں نے دورِ دوم اور سوم کے نامور ادیبوں کی تقلید میں شاہکار تخلیق کیے اور تکلف و تصنع سے بالعموم دور رہے

ہیں۔ ان میں ملک الشعرا بہار، علامہ میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی، علامہ علی اکبر دہخدا، عباس اقبال آشتیانی، عبدالرحیم طالب، یوسف اعتصامی (اعتصام الملک)، محمد علی فروغی اور سید محمد علی جمال زادہ کے نام سرِفہرست رکھے جانے کے قابل ہیں

دورِ پنجم

اس دور میں گزشتہ پون یا نصف صدی کے ادبا کو شامل کرتے ہیں۔ یہ جدید فارسی کا دور ہے۔ بلکہ جدید تر نثر و نظم دونوں کا۔ اس عصر میں ہیئت، معنی آفرینی اور اسلوب کے نئے نئے تجربے ہوئے اور قابلِ تحسین سرمایۂ ادب تیار ہوگیا اور ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے مصنفوں میں علی دشتی، سعید نفیسی، مجتبیٰ مینوی، مطیع الدولہ، محمد حجازی، حبیب یغمائی، صادق ہدایت، بزرگ علوی، ڈاکٹر عبدالحسین زرکوب، بدیع الزمان فروز انفر، ڈاکٹر محمد جعفر محجوب، ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری، صادق چوبک، نصراللہ فلسفی، ڈاکٹر محمد علی اسلامی ندوشن، جواد فاضل، شجاع الدین شفا، مسعود فرزاد، ڈاکٹر محمود صناعی، رسول پرویزی، ڈاکٹر احسان یار شاطر اور جلال آل احمد کے نام اس وقت یاد آ رہے ہیں۔ ان لوگوں کی تحریروں کے ذریعے ایرانی قوم اور وہاں کے ادب کی تہذیبِ نو ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

مسلمان حکمرانوں کے خطابات

زمانہ قدیم سے حکمرانوں میں یہ رواج تھا کہ وہ تخت نشین ہونے کے بعد شان دار اور پُروقار خطابات اختیار کرتے تھے تاکہ اُن کی شان و شوکت اور عظمت کا اظہار ہو۔ ان خطابات کے اختیار کرنے میں یہ بات بھی تھی کہ اپنے اصلی نام کو پوشیدہ رکھا جائے کیوں کہ نام انسان کی روح اور جسم کا ایک جزو ہے۔ اس لیے اگر اس کا اظہار کیا جائے گا تو دشمن اس پر سحر اور جادو کر سکتا ہے، اس لیے دشمنوں کے سحر سے بچنے کے لیے اصل نام کو چھپا یا جائے اور اس کی جگہ دوسرا نام اختیار کر لیا جائے۔ بادشاہ کی ذات چوں کہ معاشرے میں انتہائی اہم ہوتی تھی اس لیے اس کو جادو ٹونے سے بچانے کے لیے ضروری ٹھہرا کہ اسے اصل نام کے بجائے خطابات سے پکارا جائے۔[1]

حکمران کی ذات اور شخصیت کو معاشرے میں اہم بنانے کے لیے اس کے اور اس کے خاندان کے گرد تقدس کا ہالہ کھینچا گیا۔ اس تقدس نے اسے الوہی حیثیت کا حامل بنایا اور بادشاہت کا الٰہی تصور آفاق پذیر ہوا۔ اس تصور کے ارتقا میں اور اس کے استحکام میں بادشاہوں کے خطابات نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے، کیوں کہ اس الوہی حیثیت کے اظہار کے لیے حکمرانوں نے ایسے خطاب اور لقب اختیار کیے جو عوام کے ذہنوں میں ان کے تقدس، رعب داب اور عظمت کو جاگزیں کریں۔ خطابات کی اہمیت تصورِ بادشاہت میں انتہائی اہم رہی ہے، جس طرح دربار کی رسومات کے ذریعے بادشاہ کی شخصیت کو ابھارا جاتا تھا اور اسے معاشرے میں محترم و پُروقار بنایا جاتا تھا، اسی طرح خطابات کے ذریعے عوام کے ذہنوں میں اس کی برتری کا احساس پیدا کیا جاتا تھا۔ مثلاً چینی حکمران کے لیے T'ien-Tze (آسمان کا بیٹا)، مصر کے فرعونوں کے لیے Si-Re (سورج کا بیٹا)، جاپان کے بادشاہوں کے لیے Tenshi (آسمان کا بیٹا) یا Tenno (آسمانی بادشاہ) کے خطابات تھے جو ان کی الوہی حیثیت کو ظاہر کرتے تھے۔ اسی طرح ہندوستانی حکمران ملجا، دافتر اور

---

[1] جیمس فریزر: شاخ زریں، حصہ اوّل، اردو ترجمہ، لاہور ۱۹۶۵ء۔ ص ۵۰۹ - ۵۱۰

کشترا کے خطابات اختیار کرتے تھے۔ دیوا اور دیوی وہ خطابات تھے جن سے انھیں مخاطب کیا جاتا تھا۔ کشن بادشاہوں نے خود کے لیے مہاراجا راجہ (Raja Thiraja) اور دیو پترا (Devapatra) کے خطابات پسند کیے۔ ایران کے شہنشاہ کے لیے خسرو اور رومی شہنشاہ کے لیے قیصر (Kaiser) کے خطابات تھے۔

ان خطابات سے جہاں حکمران کی مذہبی حیثیت ظاہر ہوتی تھی کہ اس کا تعلق خدا سے ہے۔ یا تو وہ خود دیوتا کی شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے اور یا وہ دیوتاؤں کا اس سرزمین پر نمائندہ ہے، وہاں اس کے ساتھ اس کی سیاسی اہمیت بھی اجاگر ہوتی تھی۔ ان روایات کی روشنی میں اس کی سلطنت کی وسعت اور اس کی سیاسی قوت و طاقت کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ چونکہ یہ اپنے خطابات کو صرف اپنے تک محدود رکھنا چاہتے تھے، ان کے ماتحت حکمرانوں کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے لیے عظیم فرماں روائی کے خطابات اختیار کریں۔

مسلمانوں نے جب روم و ایران فتح کیے، تو ان فتوحات کے نتیجے میں ان پر جہاں سیاسی اثر پڑے وہاں تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی روایات نے بھی انھیں متاثر کیا۔ خلفائے راشدین اور خلفائے بنو امیہ نے عربی روح اور سادگی کو برقرار رکھا۔ لیکن عہدِ عباسیہ میں ایرانی تہذیب و تمدن نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں رواج پایا۔ خصوصیت سے ایرانی تصور بادشاہت نے عباسی دربار میں اپنے لیے جگہ پیدا کی اور ایرانی دربار کی رسومات کی ابتدا ہوئی۔ اس کے ساتھ خطابات میں بھی تبدیلی آئی اور عباسی خلفاء نے ایسے خطابات اختیار کرنا شروع کر دیے جن سے ان کی مذہبی و سیاسی عظمت ظاہر ہو۔

مسلمان حکمرانوں نے خطابات اختیار کرنے میں سب سے زیادہ توجہ مذہبی پہلو پر دی، اس لیے انھوں نے ایسے خطابات اختیار کیے جن سے ان کا دین و مذہب سے لگاؤ اور تعلق ظاہر ہو اور ان کی ذات سے یہ بات نمایاں ہو کہ یہ لوگ دین کی حمایت کرنے والے، اس کی خاطر لڑنے والے، اس کی اشاعت کرنے والے اور اس کی ترقی و ترویج کرنے والے ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان کی مسلمان رعایا انھیں دین کا محافظ سمجھ کر ان کی اطاعت و فرماں برداری کرے اور ان کے ساتھ تعاون کرے۔

مذہبی پہلو کے بعد ان کے خطابات سے ان کی سیاسی قوت و طاقت کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ ان خطابات کے ذریعے عوام سے اور صوبائی گورنروں سے اپنی برتری اور عظمت کو تسلیم کراتا تھا۔

ان دو پہلوؤں کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایسے خطابات بھی اختیار کیے جن سے ان کی شخصیت

نویں در کارنامے ظاہر ہوں تاکہ ان کے ذریعے رعیت میں اپنے لیے احترام و تعظیم کے جذبات پیدا کر سکیں۔

ابتدا میں جو اسلامی حکومت قائم ہوئی وہ ایک ہی خاندان کے ماتحت تھی جیسے بنو امیہ اور بنو عباس۔ صوبوں کے گورنر یا عامل ان کی جانب سے مقرر ہوتے تھے، اس لیے ان کی حیثیت ان کے ماتحت عہدے دار کی تھی اور انھیں اجازت نہیں تھی کہ وہ حکمران کے مخصوص خطابات سے خود کو مخاطب کرائیں۔ جب تک عباسی خلافت سیاسی لحاظ سے طاقت ور رہی ان کے خطابات ان ہی کے ساتھ مخصوص رہے لیکن عباسی خلافت کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ صوبوں کے گورنر طاقت ور ہوئے اور انھوں نے آہستہ آہستہ ایسے خطابات اختیار کرنا شروع کیے جن سے ان کا تعلق تو خلیفہ سے ظاہر ہوتا تھا لیکن ساتھ ہی ان کی سیاسی خود مختاری کا بھی اظہار ہوتا تھا، لیکن جب مشرق و مغرب میں خود مختار اسلامی حکومتوں کا وجود قائم ہوا تو ان کے حکمرانوں نے ایسے خطابات اختیار کیے جو انھیں دین کا محافظ اور حامی و ناصر بھی بتاتے تھے اور ان کی سیاسی قوت کا بھی اظہار کرتے تھے۔

مسلمان حکمرانوں کے خطابات کی تاریخ سے سیاسی تاریخ کے نشیب و فراز کا بھی پتا چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عباسی خاندان کی مضبوط خلافت کس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوئی اور کس طرح خود مختار سلطنتوں کا ارتقا ہوا۔ ان کی مدد سے مسلمان سلطنتوں کے آئینِ جہاں بانی و جہاں داری کی تبدیلیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

خلیفہ، امیر المومنین، امام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت ابو بکر خلیفہ منتخب ہوئے تو انھوں نے خلیفہ رسول اللہ کا خطاب اختیار کیا یعنی انھوں نے خود کو رسول اللہؐ کا جانشین اور نائب کہلوانا پسند کیا۔ اس خطاب سے ابتدائی اسلامی معاشرے کی سادگی کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے لیے رسولؐ کی ذات ہدایت کا سرچشمہ اور ان کا حکمران رسول کا نمائندہ اور نائب بن کر ان کی خدمت کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے "خلیفہ خلیفہ رسول اللہ" کا خطاب اختیار کیا، لیکن اس کی ادائیگی میں بڑی مشکل ہوتی تھی اور پھر اگر ہر نیا خلیفہ، اسی طرح اپنے خطاب میں اضافہ کرتا رہتا تو یہ ایک پیچیدہ خطاب بن جاتا، اس لیے آپ نے صرف "خلیفہ" کے خطاب کو باقی رکھا اور اس کے ساتھ دوسری اضافتوں کو ختم کر دیا۔ لفظِ خلیفہ سے اس وقت "جانشین رسول اللہ" کا مطلب نکلتا تھا۔

بعد میں جب آپ کو "امیر المومنین" کے خطاب سے پکارا گیا تو آپ نے اور دوسرے مسلمانوں نے اُسے پسند کیا۔ امیر المومنین کا خطاب کوئی نیا نہیں تھا، اس سے پہلے سعد بن ابی وقاصؓ کو فوج کے کمانڈر ہونے کی حیثیت سے امیر المومنین کہا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے بعد سے یہ خطاب مسلمان خلفا میں رائج ہوا اور انھیں خلیفہ کے ساتھ ساتھ امیر المومنین بھی کہا جاتا تھا۔

عباسی عہدِ حکومت میں جب ایرانی سیاسی تصورات و خیالات اور روایات کا فروغ ہوا تو حکمران کی ذات کو خدا کا نمائندہ بنانے کی کوشش کی گئی کہ بہ حیثیت حکمران کے وہ خدا کا نائب ہے اور اسی کے سامنے جواب دہ ہے، اس لیے عباسی خلفا نے کوشش کی کہ "خلیفۃ اللہ" کا خطاب اختیار کریں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو کسی نے اس خطاب سے پکارا تو آپ نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور خود کو خلیفۃ رسول اللہ کہلوانا پسند کیا۔ لیکن عباسی دَور میں جب یہ سوال اُٹھا تو کچھ علما و فقہا نے اسے جائز قرار دیا اور کہا کہ اس خطاب سے پکارنا جائز ہے، کیوں کہ بہ حیثیت حکمران کے وہ مخلوق کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے، لیکن علما کی اکثریت نے اس کی مخالفت کی۔ ان کا استدلال تھا کہ خلیفہ اس کا ہوتا ہے جو غائب ہو یا جسے موت آجائے، چوں کہ خدا نہ تو غیب ہوتا ہے اور نہ اس کو موت آتی ہے، اس لیے اسے "خلیفۃ اللہ" کہنا جائز نہیں۔[۵۵] لیکن اس کے باوجود عباسی خلفا نے اس خطاب کو باقی رکھا۔ ان دو خطابوں کے علاوہ اسے "امام" کے خطاب سے بھی پکارا جاتا تھا، اگرچہ بعد میں شیعہ تصور میں امام کا مطلب بالکل بدل گیا۔ ابتدا میں مسلمان حکمران کے یہ تین خطاب یعنی خلیفہ، امیر المومنین اور امام، تین تصورات کی نمائندگی کرتے تھے۔ خلیفہ کے خطاب سے اس کا تعلق رسول اللہؐ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان کا جانشین اور نائب ہے۔ امیر المومنین کا خطاب اس کی جنگی اور انتظامی معاملات میں سربراہی کو ظاہر کرتا تھا جب کہ امام مذہبی و دینی معاملات میں اس کی سربراہی کی نشان دہی کرتا تھا۔[۵۶]

لیکن ان تینوں خطابوں کے ابتدائی تصور میں سیاسی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انقلابی تبدیلی آئی، مثلاً ابتدا میں صرف ایک حکمران یہ خطابات اختیار کرتا تھا، اس کے بعد نئی حکومتوں کے قیام کے بعد اور خصوصیت سے اندلس

---

۵۵ ابوالحسن علی، الماوردی: احکام السلطانیہ۔ اردو ترجمہ، کراچی ۱۹۶۵ء۔ ص ۳۱-۴۰

۵۶ آرنلڈ۔ ٹی۔ ڈبلیو۔ The Caliphate - Oxford, 1924, P. 39, 40 -

میں بنو امیہ اور مصر میں فاطمی خلافت کے قیام کے نتیجے میں ان حکمرانوں نے خود کو ان تینوں خطابوں سے مخاطب کرایا۔ عباسی خلافت کے خاتمے کے بعد یہ تصور پیدا ہوا کہ ہر مسلمان حکمران اپنی سلطنت میں آزاد و خود مختار ہے اور رعیت کا محافظ و حامی بھی ہے، اس لیے کچھ مسلمان حکمرانوں نے خلیفہ اور امیرالمومنین کے خطابات اختیار کیے، لیکن ان میں سے اکثریت نے خلیفہ کا خطاب تو اختیار کیا مگر امیرالمومنین کے خطاب کو اختیار کرنے سے احتراز کیا، اس کی توضیح سترھویں صدی کے ایک عالم "المرادی" نے جو دمشق میں حنفی فقہ کے مفتی تھے، اس طرح سے کی ہے کہ اب خلافت کا تصور بدل چکا ہے۔ اب خلیفے تو کئی ہو سکتے ہیں مگر امیرالمومنین صرف وہی ہو سکتا ہے جو مذہب کی حفاظت کرے، کافروں پر غلبہ حاصل کرے اور دینِ اسلام کی شان و شوکت میں اضافہ کرے۔ اس لیے انھوں نے اورنگ زیب عالم گیر (۱۶۵۹-۱۷۰۷) کو امیرالمومنین کے خطاب سے مخاطب کیا، عثمانی سلطان کو نہیں۔[۵۴]

عباسی خلفا کے خطابات

ان تین خطابوں کے ساتھ ساتھ عباسی خلفا نے دوسرے خطاب بھی اختیار کیے، ان خطابات سے ریاست کے تصور (STATE THEORY) کے ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے ابتدائی زمانے میں یہ خطابات سادہ اور آسان ہوتے تھے اور ان کی شخصیت و کردار کے کسی ایک پہلو کی عکاسی کرتے تھے جیسے سفاح، منصور، مہدی، ہادی اور رشید،[۵۵] لیکن معتصم کے زمانے سے عباسی خلفا نے جو خطاب اختیار کیے وہ "باللہ" اور "علی اللہ" پر ختم ہوتے تھے، جیسے واثق باللہ، مستنصر باللہ، متوکل علی اللہ، معتمد علی اللہ اور قائم بامراللہ وغیرہ۔ یہ خطابات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ خلیفہ خدا کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کی قوت و طاقت کا مرکز خدا کی ذات ہے، اس لیے وہ خدا ہی کے سامنے جواب دہ ہے، عوام کو اس سے بازپرس کرنے کی اجازت نہیں۔ جب مصر میں فاطمی خلافت قائم ہوئی تو انھوں نے بھی ایسے ہی خطابات اختیار کیے۔ جب بغداد کی عباسی خلافت ختم ہوئی تو مصر کے عباسی خلفا نے انھی خطابات کو باقی رکھا۔ ابتدا میں یہ دستور تھا کہ ناصر، منصور، معتمد اور مظفر کے خطابات صرف خلفا تک مخصوص رہیں اور کوئی دوسرا حکمران انھیں

---

۵۴ گب، ایچ۔ اے۔ آر۔ ISLAMIC SOCIETY AND THE WEST OXFORD, 1957. P 35

۵۵ ابن خلدون۔ مقدمہ۔ انگریزی ترجمہ حصہ اول۔ نیویارک ۱۹۶۸ء۔ ص ۴۶۷-۴۶۸

اختیار نہیں کر سکتا، کیوں کہ ان خطابات سے حکمران کی خود مختاری، آزادی اور برتری کا اظہار ہوتا تھا۔

مسلمان حکمرانوں کے خطابات

عباسی خلافت و حکومت کی کمزوری کے زمانے میں جو خطابات ابتدا میں صوبائی گورنروں نے اختیار کیے، بعد میں یہی خطابات خود مختار حکمرانوں کے لیے مقرر ہوئے، ان خطابات میں سب سے پہلا خطاب امیر کا تھا

امیر

یہ خطاب صوبائی گورنروں اور بعد میں خود مختار حکمرانوں کا بھی ہوا، اس خطاب میں اس بات کی صاف وضاحت ہے کہ امیر کی سیاسی طاقت و قوت، خلیفے کے مقابلے میں محدود ہے اور اپنی سیاسی آزادی کے باوجود ان کا تعلق خلافت سے قائم ہے۔ ابتدائی خود مختار حکمران مثلاً طاہری، صفاری، سامانی اور ابتدائی غزنوی حکمرانوں نے اس خطاب کو اختیار کیا۔ اس خطاب کو مزید پُرعظمت بنانے کے لیے اس میں اضافتوں کا اضافہ ضرور ہوا، جیسے امیر الامرا، جو عباسی دور میں کمانڈر ان چیف کا خطاب تھا۔ الامیر المعظم اور امیر السید وہ خطابات تھے جو حکمرانوں نے اختیار کر کے اپنی برتری کو دوسرے "امیر" حکمرانوں پر ظاہر کیا[۵۶] کچھ حکمرانوں نے "امیر عادل" کا خطاب اختیار کیا، جو ایرانی اثرات کی نشان دہی کرتا ہے، کیوں کہ ریاست میں بادشاہ کی سب سے بڑی صفت عدل ہے[۵۷] امیر کے خطابوں میں سے ایک اہم خطاب "امیر المسلمین" تھا جو مغرب کے حکمران خاندان لمتونہ کے بادشاہ "یوسف بن تاشفین" کو ملا۔ یہ حکمران مذہبی آدمی تھا اور اپنی سیاسی آزادی و خود مختاری کے باوجود نہ تو خلیفہ کا خطاب اختیار کرنا چاہتا تھا اور نہ امیر المومنین کا، اس لیے خلیفہ المستنظہر (۱۰۷۵ - ۱۰۹۴) نے اسے امیر المسلمین کا خطاب دیا۔ بعد میں یہ خطاب ترنانہ کے حکمرانوں نے بھی اختیار کیا لیکن جب ان کی سیاسی حیثیت مستحکم ہو گئی تو انھوں نے اسے چھوڑ کر امیر المومنین کا خطاب اختیار کر لیا۔[۵۸]

ملک

ملک کا خطاب ابتدا میں اس لیے اختیار نہیں کیا گیا کہ یہ قرآن میں بادشاہ کے معنوں میں آیا ہے جو اسلامی

---

۵۶ بوسے ایچ۔ CHALIF UND GROSSKOING. DIE BUIDEN IM IRAQ (945-1055) WIESBADEN, 1969- P 161

۵۷ اشپولر۔ بی INAN IN FRTIH — ISLAMISCHER ZUIT. WEISBADEN. 1952, P 350.

۵۸ ابن خلدون؛ حصہ اول۔ ۴۷۰ - ۴۷۲ -

تصور کے خلاف تھا، لیکن بعد میں ملک فارس کے "شاہ" کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے اور اُسے سامانی، آل بویہ اور ایوبی سلاطین نے اختیار کیا، بلکہ اس میں بھی اضافتوں کے ذریعے اسے شان دار بنایا گیا، جیسے ملک الملوک اور الملک المظفر وغیرہ۔ ایوبی سلاطین کے خطابات یہ تھے: الملک الناصر، الملک العزیز، الملک المنصور اور الملک المعظم وغیرہ۔

دولہ

دولہ کا خطاب ابتدا میں عباسی وزیر کو ملتا تھا، چوں کہ وزیر نے خلیفے کی سیاسی کمزوری کے بعد اہمیت حاصل کر لی تھی اور مال و فوج کے شعبوں پر اس کا قبضہ تھا اس لیے "دولہ" کے خطابات سے اس کی طاقت کا اندازہ ہوتا تھا، اس کے بعد یہ خطاب خلیفے کی جانب سے خود حکمرانوں کو ملا، جس میں اوّلیت ہمدانی حکمرانوں کی ہے۔ جب ۳۳۴ھ میں آل بویہ حکمران نے بغداد پر قبضہ کر لیا اور خلیفے کی پوری طاقت خود اختیار کر لی تو انھوں نے کوشش کی کہ خلیفے کو تمام شاہی علامتوں اور نشانیوں سے محروم کر کے اُسے خود اختیار کر لیں۔ ان علامتوں میں خطاب بھی اہمیت کا حامل تھا، اس لیے انھیں خلیفے کی جانب سے "دولہ" پر ختم ہونے والے خطابات ملے۔ "دولہ" کے خطابات میں بھی دو قسمیں نظر آتی ہیں۔ ایک وہ خطاب جن سے ان کی حیثیت خلیفے کے ماتحت کی نظر آتی ہے اور وہ ریاست کے خادم اور حامی نظر آتے ہیں، جیسے عضد الدولہ، عماد الدولہ اور رکن الدولہ وغیرہ۔ لیکن دوسری قسم کے خطابوں میں وہ خود مختار نظر آتے ہیں مثلاً "ناصر الدولہ" کا خطاب حاصل کرنے والا شخص وہی ہو سکتا تھا، جس نے خلیفے کے دشمنوں سے جنگ کی ہو، یہی حال "سیف الدولہ" کے خطاب کا تھا۔[۹] بعد میں مجد الدولہ، شرف الدولہ اور معز الدولہ کے خطابات سے ان کی سیاسی برتری کا اظہار ہوتا تھا۔

محمود غزنوی کو خلیفے کی جانب سے "یمین الدولہ" کا خطاب ملا، جس سے خلیفے کی برتری اور محمود کی ماتحت پوزیشن ظاہر ہوتی ہے۔

فاطمی خلفا نے بھی اپنے ماتحت حکمرانوں کو دولہ کے خطابات دیے، مثلاً صنہاجہ حکمرانوں کے خطابات نصیر الدولہ، سیف الدولہ اور معز الدولہ ہوا کرتے تھے۔ جب انھوں نے فاطمی خلافت سے قطع تعلق کر کے عباسی خلافت سے رابطہ پیدا کیا، تب بھی انھوں نے "دولہ" کے خطاب کو برقرار رکھا۔[۱۰]

[۹] بوسے: ۱۶۱، ۱۶۲
[۱۰] ابن خلدون: حصہ اوّل، ۴۷۰

امۃ و ملۃ

دولہ کے خطاب میں ریاست کا سیکولر تصور ہے، جب کہ امۃ اور ملہ کے خطابات میں مذہبی تصور ہے، اس لیے خلیفے نے خود مختار حکمرانوں کو دولہ کے ساتھ ساتھ ایسے خطاب بھی دیے جن سے ان کی مذہبی حیثیت اجاگر ہو، اس میں امۃ اور ملہ کے خطاب اہمیت کے حامل ہیں۔ آلِ بویہ کے حکمرانوں نے " امۃ " پر ختم ہونے والے خطابات کو بھی اختیار کیا جیسے فلک الامۃ، غیاث الامۃ، تاج الامۃ اور مغیث الامۃ وغیرہ۔ ملۃ پر ختم ہونے والے خطابات جو آل بویہ کے حکمرانوں نے اختیار کیے یہ تھے: تاج الملۃ، شمس الملۃ اور ضیاء الملۃ۔ محمود غزنوی کو خلیفے نے امین الملۃ کا خطاب دیا تھا۔

الدین

خطابوں کی تاریخ میں دولہ، امۃ اور ملہ کے بعد اہم خطاب وہ تھا، جو " الدین " پر ختم ہوتا تھا۔ ابتدا میں دوسرے خطابوں کی طرح یہ خطاب بھی خلیفے کی جانب سے دیا جاتا تھا۔ اس خطاب سے حکمران کی دینی و مذہبی حیثیت ظاہر ہوتی تھی کہ اب وہ دین کی حفاظت اور حمایت و اشاعت میں خلیفے کا شریک ہے اور اپنی سلطنت میں دین کا حامی اور مددگار ہے۔ آل بویہ کے حکمرانوں نے جو خطاب اختیار کیے وہ یہ تھے: قوام الدین، رکن الدین اور عماد الدین۔ بعد میں یہ خطاب سلجوقی حکمرانوں نے اختیار کیے، تو ان کی اہمیت بڑھ گئی، کیوں کہ خلیفہ اپنی سیاسی کمزوری کے بعد اب اس قابل نہیں تھا کہ وہ دین کی حفاظت و حمایت کر سکے۔ اس لیے اب وہ کام خود مختار سلاطین کا ہوا، اس وجہ سے انھیں حق مل گیا کہ وہ " الدین " پر ختم ہونے والے خطابات اختیار کریں۔ اس کے بعد مسلمان حکمرانوں نے یہ خطاب اختیار کیے، جن میں غوری، سلاطینِ دہلی اور ہندوستان میں مغلیہ حکمران شامل ہیں۔ ان خطابات کے ذریعے سے یہ اپنی مسلمان رعایا کو اس بات کا احساس دلاتے تھے کہ وہ دین کی شان و شوکت اور عظمت کا باعث ہیں۔

ابتدا میں خلیفے کی جانب سے صرف ایک خطاب ملتا تھا۔ لیکن بعد میں دولہ، ملہ، امۃ اور دین کے خطابات ایک ساتھ بھی ملنے لگے، جو ان حکمرانوں کی سیاسی و مذہبی خود مختاری کا مظہر ہوتے تھے۔

سلطان

سلطان کا خطاب جو مسلمان حکمرانوں کا انتہائی اہم خطاب رہا اور جس نے آگے چل کر خلافت و سلطنت کی تھیوری کو جنم دیا، ابتدا میں اس اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ سلطان کا لفظ قرآن شریف میں طاقت کے معنوں

ین یا دلیل" کے معنوں میں ہے ۔ حدیث شریف میں بھی طاقت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، اس لیے یہ خطاب ابتدا میں حکمرانوں اور وزیروں نے اختیار کیا۔ عباسی خلیفہ منصور کو خطبے میں "سلطان اللہ" کہا گیا۔ خلیفہ الموفق کو بھی سلطان کہا گیا۔ بعد میں سلطان کے خطاب سے حکومت کی طاقت اختیار کرنے کا اظہار ہونے لگا۔ جعفر برمکی، عہد عباسیہ کے وزیر کو "سلطان" کہا جاتا تھا کیوں کہ وہ خلافت میں سب سے زیادہ طاقت ور تھا۔ فاطمی خلفا نے بھی "سلطان الاسلام" کا خطاب اختیار کیا۔ فارس کے ایک بویہ حکمران کا خطاب سلطان الدولہ تھا۔

اس بات میں اختلاف ہے کہ خلیفے کی جانب سے باقاعدہ سلطان کا خطاب کس کو ملا، اگرچہ محمود غزنوی خود کو سلطان کہتا تھا، لیکن یہ خطاب اسے خلیفے کی جانب سے نہیں ملا تھا۔ خلیفے کی جانب سے یہ خطاب سب سے پہلے سلجوقی حکمرانوں کو ملا، اسی لیے سلجوقی حکمران سلطان کہلاتے تھے اور شہزادے "ملک"۔ ابتدا میں یہ خطاب خلیفہ دیا کرتا تھا، لیکن بعد میں خلافت کی کمزوری اور اس کے خاتمے کے بعد حکمرانوں نے خود سے اختیار کرنا شروع کر دیا۔

قاہرہ میں جب عباسی خلافت قائم ہوئی تو مملوک حکمرانوں نے کوشش کی کہ سلطان کا خطاب خلیفہ صرف انھیں دے، دوسرے حکمرانوں کو نہیں، اس طرح وہ خود کو دوسرے حکمرانوں کے مقابلے میں برتر رکھنا چاہتے تھے۔

بعد میں دوسرے خطابوں کی طرح سلطان میں بھی اضافتوں کا استعمال ہوا جیسے السلطان الاعظم، سلطان السلاطین، سید السلاطین، سلطان الاسلام والمسلمین، یا سلطان البرین والبحرین۔

کچھ حکمرانوں نے فارسی کے مترادف "بادشاہ" اور "شاہ" کے خطابات اختیار کیے، مثلاً عراق و کردستان اور شام کے سلجوقی حکمران شاہ کے خطاب رکھتے تھے۔ صفوی خاندان کے حکمران بھی شاہ کہلاتے تھے، اسی کے ساتھ قدیم ایرانی خطاب شہنشاہ کا بھی اجرا ہوا۔ سب سے پہلے یہ خطاب بویہ حکمرانوں نے اختیار کیا۔ یہ خطاب اتابکان سنجار کے حکمران عماد الدین شہنشاہ (۱۲۱۹ - ۱۱۹۷) کے ہاں نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں مغل بادشاہ بھی شہنشاہ کا خطاب رکھتے تھے۔

ایک اہم پہلو ان خطابات کا یہ ہے کہ جب تک خلافت عباسیہ بغداد اور قاہرہ میں قائم رہی، مسلمان حکمرانوں کی اکثریت نے یہ کوشش کی کہ یہ خطاب خلیفے سے حاصل کر کے اپنی حکومتوں اور سلطنتوں کے

لیے قانونی جواز پیدا کریں، اس لیے باوجودیکہ ان کے خطابات سے ان کی مذہبی اور سیاسی خود مختاری ظاہر ہوتی تھی، انھوں نے ایسے خطاب بھی برقرار رکھے جن سے ان کی خلیفے سے وابستگی اور تعلق ظاہر ہوتا تھا۔ مثلاً ولی، مولا، صفی، ناصر اور حمید امیر المومنین کے خطابات کے ذریعے وہ خود کو خلافت کا ماتحت سمجھتے تھے، بعد میں جب قاہرہ سے بھی عباسی خلافت کا خاتمہ ہوا تو ان خطابات کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

خان

مسلمان حکمرانوں میں "خان" کا خطاب منگولوں کے حملوں اور ان کے سیاسی اقتدار کے بعد سے آیا۔ منگول حکمران، قاآن (کاغان، قاکان) یا خان کہلاتا تھا، بعد میں جب منگول سلطنت وسیع ہوئی تو صوبوں کے حکمران خود کو "ال خان" (نائب خان) کہتے تھے اور خود کو بڑے "خان" کے ماتحت سمجھتے تھے۔ ۱۲۹۵ء تک منگولوں میں یہ قاعدہ رہا، بعد میں قبلائی خان کی وفات کے بعد سے یہ روایت ٹوٹی۔ پہلا ایرانی منگول بادشاہ جس نے قاآن کا خطاب اختیار کیا وہ غازان تھا۔

چوں کہ منگولوں کے حملوں اور سیاسی اقتدار نے عباسی خلافت کے تمام ڈھانچے اور روایات کو گرا دیا تھا اس لیے اب جو حکمران ایران اور وسط ایشیا میں ہوئے انھوں نے اپنا تعلق چنگیز خاں کے خاندان سے قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کی مثال تیمور سے ملتی ہے کہ اس نے اپنا تعلق چنگیز خاں کے خاندان سے ظاہر کرنے کے لیے "گورگان" (خاقان کا داماد) کا خطاب اختیار کیا۔ تیمور اپنی سیاسی طاقت و قوت کے باوجود چنگیز خاں کے خاندان کے بادشاہ کو اپنا سربراہ مانتا تھا اور خود کو صرف "امیر" کہلواتا تھا، تیموری خاندان کے حکمران بھی اس روایت پہ چلے، وہ "میرزا" کا خطاب اختیار کرتے تھے۔ بابر اس خاندان کا پہلا حکمران تھا جس نے بادشاہ کا خطاب اختیار کر کے اپنی خود مختاری کو چنگیزی اور تیموری حکمرانوں پر ظاہر کیا۔ بابر نے خود مختاری کے طور پر "الدین" پر ختم ہونے والا خطاب "ظہیر الدین" اختیار کیا جسے بعد میں مغل حکمرانوں نے آخر تک باقی رکھا۔

ان خطابات کے علاوہ حکمرانوں نے انفرادی طور پر ایسے خطابات بھی اختیار کیے جن سے ان کی کوئی شخصی خوبی ظاہر ہو یا جس کے ذریعے سے وہ اپنے کسی کارنامے کا اظہار کر سکیں، ایسے خطابوں میں سے سب سے اہم خطاب "غازی" کا تھا، یہ ان حکمرانوں نے اختیار کیا جنھوں نے غیر مسلموں کے ساتھ جنگیں لڑیں اور کامیاب و کامران ہوئے۔ جیسے بابر نے کنواہہ کی جنگ کے بعد "غازی" کا خطاب اختیار کیا۔

عثمانی سلطان محمد نے قسطنطنیہ کی فتح کے بعد فاتح کا خطاب اختیار کیا۔ اسی طرح تیمور نے اپنی وسعتِ سلطنت کا اظہار "صاحب قران" کے خطاب سے کیا۔ کچھ حکمرانوں نے اپنے عدل کی صفت کو "امیر عادل" یا "سلطان العادل" کے خطاب سے روشناس کرایا، ان کے علاوہ جہاں گیر، شاہ جہاں اور عالم گیر وہ خطابات تھے، جن کا مقصد اپنی عظمت و برتری کو تسلیم کروانا تھا۔

یہ روایت بھی تھی کہ جب بھی درباری بادشاہ سے مخاطب ہوتے تھے تو اس کو عزت و تکریم کے مختلف خطابوں سے پکارتے تھے، مثلاً ظلِ الٰہی، عالم پناہ، صاحبِ عالم، حضورِ معظم، والی جاہ، عالی جاہ اور جناب عالی وغیرہ۔

خطاب اور مرتبہ

خطابات کی اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر خطاب اپنی سیاسی اہمیت رکھتا تھا جو خطاب اعلیٰ حکمرانوں کے لیے مخصوص تھا وہ ماتحت حکمران اختیار نہیں کر سکتا تھا اور اس کا تعین سیاسی طاقت و قوت سے ہوتا تھا۔ ابتدا میں دولہ، امہ، ملہ اور خان کے خطابات صرف حکمرانوں کے لیے مخصوص تھے، لیکن جب حکمران سیاسی طور پر طاقت ور ہوئے تو انھوں نے اپنے لیے سلطان، شاہ یا بادشاہ کے خطاب پسند کیے، اور یہ خطابات اپنے امرا کو دینا شروع کر دیے۔ چنانچہ ہندوستان میں عہدِ سلاطین میں امرا کے خطابات، ملک اور امیر ہوا کرتے تھے، جب کہ مغلیہ سلطنت میں امرا کو خان، دولہ، بہادر اور جنگ پر ختم ہونے والے خطابات دیے جاتے تھے۔ سلاطینِ دہلی اور عہدِ مغلیہ میں "الدین" پر ختم ہونے والے خطابات صرف حکمرانوں کے لیے مخصوص تھے، لیکن مغلوں کے آخری عہد میں بادشاہ کی کمزوری کے ساتھ یہ خطاب بھی امرا کو دیے گئے۔

وفات کے بعد کے خطابات

یہ بھی ایک قدیم روایت تھی کہ حکمران کی وفات کے بعد بھی اسے کسی خطاب سے یاد کیا جاتا تھا تاکہ عوام میں اس کی تحریم و تکریم باقی رہے۔ مسلمانوں میں یہ روایت سامانی خاندان سے چلی کہ حکمران کی وفات کے بعد اسے کوئی خطاب دیا جاتا تھا جو سرکاری دفتروں اور تاریخوں میں استعمال ہوتا تھا۔ ان خطابات سے یا تو شخصی خوبی اور وصف کو ظاہر کیا جاتا تھا جیسا کہ سامانی حکمرانوں کے خطابات میں ہے۔ مثلاً احمد بن اسماعیل "امیر شہید"، نصر بن احمد "امیر سعید"، نوح بن نصر "امیر حمید" اور عبدالملک "امیر سدید"۔

ہندوستان میں مغل حکمرانوں کے خطابات میں مزید جدت نظر آتی ہے مثلاً بابر "فردوس مکانی" ہمایوں "جنت آشیانی" اکبر "عرش آشیانی" جہاں گیر "جنت مکانی" شاہ جہان "فردوس آشیانی" اور عالم گیر "خلد مکانی" کے خطاب سے یاد کیے جاتے تھے۔

خاتمہ

خطابات کی اس تاریخ سے جہاں سیاست کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ سیاسی قوت و طاقت کے زمانے میں حکمرانوں نے سادے اور پُروقار خطابات اختیار کیے، لیکن جیسے جیسے کمزوری آئی، ان کے خطابات میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ایک کے بجائے دو دو، تین تین خطاب اختیار کر کے اپنی کھوکھلی شان و شوکت کا اظہار کیا، مثلاً اودھ کے حکمراں جو کوئی سیاسی طاقت و قوت نہیں رکھتے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت تھے، انھوں نے یہ شان دار لمبے چوڑے خطابات اختیار کیے: ابو نصر، قطب الدین، سلیمان جاہ، سلطان عادل، نوشیر زماں، حضرت شاہ زماں، نصیر الدین حیدر بادشاہ غازی، یا ابو الفتح، معین الدین، سلطان الزمان، نوشیرواں عادل، محمد علی شاہ، بادشاہ غازی، جب کہ یہ حکمراں ان تمام اوصاف سے خالی تھے۔ اس لیے دورِ آخر میں مسلمان حکمرانوں کے یہ خطاب محض دکھاوے کے تھے، نہ تو یہ سیاسی طاقت کے حامل تھے نہ ان میں کوئی دینی حمیت تھی اور نہ یہ اخلاقی اوصاف رکھتے تھے۔ اپنی ان کمزوریوں کی خانہ پُری یہ محض ان القاب و خطابات کے ذریعے کرتے تھے۔

مخدوم ابراہیم خلیل نقشبندی

نام محمد ابراہیم۔ تخلص مسکین اور خلیل۔ نسباً صدیقی، مذہباً حنفی، طریقاً نقشبندی۔ والد ماجد کا نام مخدوم عبدالکریم تھا جن کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم کرم اللہ قدسرہٗ سے ملتا ہے۔ ترتیب یہ ہے۔

مخدوم عبدالکریم بن مخدوم غلام حیدر بن مخدوم عبدالکریم بن مخدوم محمد زمان بن مخدوم عنایت اللہ بن مخدوم محمد امین بن محمد مخدوم کرم اللہ۔[1]

اس شجرۂ نسب سے ظاہر ہے کہ مخدوم محمد ابراہیم خلیل بزرگانِ نقشبندیہ[2] کے علمائے اسلام کی جلیل القدر اولاد میں سے تھے۔ ماہ جمادی الاوّل ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء کو ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے۔

سال میلاد منفیش بسرِ الہام گفت دل   "گوہر درج شرف علم لدن"
۱۲۴۳ھ

آٹھ سال کی عمر میں قرآن کریم قرأت کے ساتھ ختم کیا۔ اپنے پدر بزرگوار مخدوم عبدالکریم اور دادا مخدوم غلام حیدر سے عربی، فارسی اور فقہ و بیان وغیرہ میں بنیادی کتابیں پڑھیں جن میں گلستان سعدی، بوستان سعدی، مجموعہ صرف و نحو، کافیہ، کنز الدقائق، توضیح اور مطول شامل ہیں۔ علوم ریاضی و منطق سے بھی واقف تھے۔

مخدوم ابراہیم خلیل ٹھٹھوی کی تالیفات میں سب سے اہم تالیف "تکملہ مقالات الشعرا" ہے۔ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے "مقالات الشعرا"[3] لکھی تھی۔ خلیل نے دیگر شعرا کا تذکرہ "تکملۂ مقالات الشعرا" لکھا۔ تکملہ مقالات الشعرا میں ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۰ء) سے لے کر ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۸ء) تک کے فارسی کے سندھی شعرا کا مفصل ذکر ہے۔ اس طرح دو عہد کے ایک سو اٹھائیس سال کے سندھ میں فارسی شعر و ادب کی تاریخ

---

[1] تکملہ مقالات الشعرا۔ ص ۱۶۷۔ (فارسی)

[2] مخدوم خلیل نے تکملہ مقالات الشعرا (ص ۱۶۷ تا ۲۱۰) میں اپنے بزرگوں کے علم و فضل اور عظمت کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

[3] تذکرہ مقالات الشعرا سندھ کے فارسی شعرا کا پہلا مفصل تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ پیر حسام الدین راشدی کے مقدمہ و حواشی کے ساتھ سندھ ادبی بورڈ کی طرف سے ۱۹۵۷ میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔

محفوظ ہوگئی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے[۵۴]۔ تکملہ مقالات الشعرا ۱۹۵۸ء میں پیر حسام الدین راشدی کی تصحیح و حواشی کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے۔

مخدوم ابراہیم نقشبندی ٹھٹھوی نے ۴۴ سال کی عمر میں ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں انتقال کیا۔ مخدوم ابوالقاسم نقشبندی کے قبرستان واقع ٹھٹھہ میں مدفون ہیں۔ متعدد شعرائے سندھ نے تاریخ وفات کہیں۔ مولانا عبدالکریم دوش (کراچی) کی بیاض میں چند تاریخیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

ادبِ کامل یکتا ئے دوران — فروغ بزم اربابِ فضائل
خلیل نقشبند لوح دلہا — ازو فضیان حق میگشت حاصل
بحق پیوست آں حق گوے حق جوئے — بروز آورد کو میداشت در دل
فلک سال وصالش گفت اے دوش — بگو "بستان جنت کرد منزل"[۵۵]

ابراہیم خلیل اپنے وقت کے ممتاز عالم دین تھے۔ فارسی نظم و نثر کے ادیب و شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بلند تھا۔ میاں محمد زاہد بن میاں عبدالواسع شاکرانی سے مشورۂ سخن کیا۔ اپنے استاد موصوف کے حسبِ ہدایت اپنے نام کی مناسبت سے اپنا تخلص خلیل رکھا۔ ان کے دوسرے شعری مجموعے کا نام "دیوانِ خلیل" ہے۔ مکاتیب کا مجموعہ مرتب کیا، جو "انشائے مائدۂ خلیل" کے نام سے موسوم ہے۔

خلیل سے پہلے مسکینؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام کا نام "دیوانِ مسکین" اور ایک مرقع خطوط کا نام "کشکولِ مسکین" ہے۔

خلیل نے اپنے خود نوشت سوانح (تکملہ ص ۲۱۳) میں یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ اگر وہ سندھی زبان میں کچھ کہتے تو اپنا تخلص اداسی رکھتے۔ سندھی میں اداسی فقرا کی ایک قسم کو کہتے ہیں۔ ان کے اس خیال سے دو باتیں منکشف ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے سندھی میں شاعری نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ وہ حقیقی معنوں میں درویش منش شاعر تھے۔

سندھ کے مشہور استادِ سخن غلام محمد شاہ گدا خلیل کے ہم عصر تھے۔ خلیل، گدا سے دس سال بڑے تھے۔

---

۵۴ تاریخ سندھ۔ جلد ششم از غلام رسول مہر۔ ص ۳۰

۵۵ حاشیہ تکملہ۔ مقالات الشعراء۔ ص ۲۵۰

گدا بڑے مجلسی آدمی تھے۔ ان کے ہاں ادب و شعر کی بڑی محفلیں جمتی تھیں۔ سندھ کے بڑے بڑے شعرا و ادبا ان کے جلیس و ہم نشین تھے جن میں لطف اللہ لطف حیدرآبادی، محمد قاسم ہالائی، سید غلام مرتضیٰ صاحب مرتضائی اور محمد ہاشم تخلص وغیرہ شامل تھے۔

خلیل بھی شاہ گدا کی شخصیت اور شاعری سے بہت متاثر تھے۔ گدا سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ انہی کی صحبتوں میں خلیل کو اساتذۂ اردو مثلاً ناسخ، آباد، آتش اور میر کے دواوین کے مطالعہ کا موقع ملا جن سے متاثر ہو کر اردو میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا اور چند غزلیں کہیں۔

اپنے خود نوشت حالات میں رقم طراز ہیں:

زبان ہندی را فقیر نداند مگر از سبب اثر صحبت سید غلام محمد گدا تخلص کہ چار پنج روز ترلہ[۵۶] بودہ و ذکرش در باب الکاف بیاید و دیوان ناسخ، آباد و آتش را دیدہ شدہ، ازان این قدر اثری شدہ کہ چند غزل گفتہ شد[۵۷]

خلیل کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ سندھ کے مختلف شہروں خصوصاً حیدرآباد اور ٹھٹھہ میں فارسی کے علاوہ اردو شاعری کا کافی چرچا تھا۔ دہلی اور لکھنؤ کے مشہور شعرا و اساتذہ کے دواوین پڑھے جاتے تھے اور یہ کہ اس زمانے میں سندھ کا شمالی ہند اور پنجاب سے ادبی رابطہ قائم ہو چکا تھا۔

راقم کو خلیل کا اردو کلام حاصل نہ ہو سکا۔ ان کا اردو کلام تلف ہو چکا ہے۔ پیر حسام الدین راشدی کے گراں قدر مقالے بعنوان "سندھ کے اردو شعرا"[۵۸] میں مخدوم ابراہیم خلیل ٹھٹھوی کا مختصر سا تذکرہ ملتا ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی اردو شعر درج نہیں ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ بقول راشدی صاحب مخدوم ابراہیم کے کلام کا کوئی نمونہ نہیں ملا[۵۹]

البتہ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے اپنی قابل قدر کتاب "سندھ میں اردو شاعری" میں خلیل اور گدا کے دوستانہ مراسم سے متعلق ایک واقعہ تحریر فرمایا ہے اور خلیل کا ایک اردو شعر نقل کیا ہے۔

سید غلام محمد شاہ گدا شہر ٹھٹھہ میں سید کریم بخش عزیز کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ ابراہیم خلیل بھی اُن کے

---

۵۶ گدا کی قیام گاہ ٹھٹھہ مراد ہے

۵۷ تکملہ، ص ۲۱۳

۵۸ مطبوعہ ماہنامہ "اردو کراچی" اکتوبر ۱۹۱۵ء، ص ۲۰

۵۹ ایضاً

یہاں جایا کرتے اور وہ بھی بلاناغہ روزانہ ایک دو مرتبہ ان کے یہاں تشریف لاتے تھے۔ ایک دن وہ نہ آسکے تو خلیل نے یہ رباعی لکھ کر خدمت میں بھجوائی:

بدین قدر زچه آیا رمیده ای از من
بحیرتم که چساں آرمیده ای از من
منت مدام شب و روز آرزومندم
تو از چه دامنِ دل را کشیده ای از من

گدا کو جیسے ہی رقعہ ملا چل پڑے اور کافی فاصلہ طے کرتے ہوئے خلیل کے یہاں پہنچے اور فرمایا:

خلیل سے جو گدا لحظہ رمیدہ ہو — تو پھر زمانے میں کس طرح آرمیدہ ہو

عصر کو دوبارہ تشریف لائے تو خلیل نے کہا:

کہاں ہے لحظہ دو شب ایک دن جدائی تھی — مجھے یہ صبح بھی اک شام بینوائی تھی[۱۰]

اس ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیل اردو میں بہت صاف اور عمدہ شعر کہتے تھے۔

---

[۱۰] سندھ میں اُردو شاعری۔ ص ۱۸۰-۱۸۱

ارمغانِ شاہ ولی اللہؒ: از پروفیسر محمد سرور

حضرت ولی اللہ محدث دہلوی جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت مصنف تھے۔ انھوں نے تفسیر، حدیث، شرح حدیث، فقہ اور تصوف وغیرہ تمام عنوانات پر کتابیں لکھیں اور احکامِ شریعت کی حکم و مصالح کی روشنی میں وضاحت کی۔ "ارمغان شاہ ولی اللہ" ان کے افکار و تعلیمات کا بہترین مجموعہ اور ان کی عربی و فارسی کتابوں کا ایک عمدہ انتخاب ہے جو اُردو کے قالب میں ڈھال کر قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں شاہ صاحب اور ان کے بزرگوں اور مشائخ کے سوانح حیات بھی دیے گئے ہیں۔

صفحات ۵۲۰ — قیمت: ۱۹/- روپے

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عن عبد اللہ بن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ستر عورۃ اخیہ ستر اللہ عورتہ یوم القیامۃ ومن کشف عورۃ اخیہ المسلم کشف اللہ عورتہ حتّٰی یفضحہ بھا فی بیتہ۔ (ابن ماجہ)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص اپنے بھائی کے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے، اللہ قیامت کے دن، اس کے عیوب کی پردہ پوشی کرے گا۔ اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے عیب ظاہر کرتا ہے، اللہ اس کے عیب ظاہر کرے گا، یہاں تک کہ اس کی وجہ سے اس کے گھر ہی میں اسے ذلیل کر دے گا۔

اسلام میں جن اخلاقی قدروں کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے، ان میں اکرام مسلم اور احترام مومن سرِفہرست ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کو ضروری قرار دیا ہے۔ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی عزت کرتا اور اس کے لیے دل میں اچھے جذبات رکھتا ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ میں اس کی بے حد تعریف کی گئی ہے۔ اور جس شخص کا دل اپنے مسلمان بھائی کی تکریم سے خالی ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح اس کے درپے آزار رہتا ہے، آنحضرتؐ نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے۔

کسی کو تکلیف پہنچانے اور ایذا دینے کی کئی صورتیں ہیں۔ اس کی اہانت کرنا، اس کی تذلیل کرنا، اس کو گالی گلوچ دینا، اس کے عیب لوگوں کو بتانا اور ان کی تشہیر کرنا، ایذا رسانی کی ذیل میں آتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو انتہائی مذموم حرکت قرار دیا ہے۔

اس کے برعکس مسلمان کی پردہ پوشی کرنا اور اس کے ذاتی عیوب و نقائص کو چھپانا، بہت بڑی نیکی اور ایک اہم اخلاقی قدر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صفت کے حامل شخص کی تعریف کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی لغزشوں کو چھپاتا اور ان پر پردہ ڈالتا ہے، اللہ قیامت کے دن جب کہ لوگوں کی غلطیاں ایک خاص شکل میں متشکل ہو کر ان کے سامنے آکھڑی ہوں گی، اس کی غلطیوں اور لغزشوں پر پردہ ڈال دے گا اور ان کو ظاہر نہیں ہونے دے گا۔ صرف اس لیے کہ اس شخص نے دنیا میں اپنے مسلمان بھائی کی لغزشوں پر پردہ ڈالا تھا۔ لیکن جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی عیب جوئی کرتا اور اس کے نقائص لوگوں ... ہے، اللہ کی طرف سے اسی دنیا میں اس کے عیب ظاہر ہو جائیں گے اور ایسے حالات پیدا ہو جائیں ... کہ وہ خود اپنے ہی گھر میں اپنے اس غلط کردار کی وجہ سے ذلت و فضیحت میں مبتلا ہو جائے ...

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں دو قسم کے لوگوں کے ذاتی کردار کا ... گیا ہے اور اس کردار سے جو نتیجہ نکلتا ہے، اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

ایک ان لوگوں کا، جنھیں اس بات کا پوری طرح علم ہوتا ہے کہ فلاں شخص کسی غلطی کا ... ہوا ہے، اور اس سے فلاں لغزش سرزد ہو گئی ہے، مگر وہ اس کی تشہیر نہیں کرتے اور کسی کے ... اس کا ڈھنڈورہ نہیں پیٹتے، فقط اس لیے کہ غلطی کا ارتکاب کرنے والا شخص معاشرے میں یا اپنے ... اعزہ و اقارب اور حلقۂ احباب میں بدنام نہ ہو جائے، اور لوگوں میں اس کی توہین نہ ہو۔ اللہ ان ... لوگوں سے خوش ہوتا ہے اور انھیں اس کردار کا بہتر بدلہ ملتا ہے کہ انھوں نے دوسرے کے عیب کو ... لوجہ اللہ لوگوں سے چھپائے رکھا اور غلطی کرنے والے کو جہاں تک ممکن ہو سکا، معاشرے ... ہونے سے بچایا۔

دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے عیوب و نقائص کی ٹوہ میں رہتے ... اگر انھیں کسی کی چھوٹی موٹی غلطی کا پتا چل جائے تو اسے خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں ... یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ اس غلطی کو ہر شخص کے علم میں لے آئیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں اس شخص کی عزت و آبرو باقی نہ رہے اور لوگ اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔

اس قسم کے لوگ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک انتہائی قابلِ نفرت ہیں اور ... صورت میں، جلد یا بدیر اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں۔

دوسروں کی غلطیوں کو اچھالنے اور ان کی لغزشوں کو پھیلانے والے لوگ معاشرے کے ہر طبقے میں پائے جاتے ہیں۔ پڑھے لکھے حضرات میں بھی یہ عادت پائی جاتی ہے اور ان پڑھ لوگوں میں بھی! لیکن ہر شخص کا طریق اظہار اور اسلوب بیان مختلف ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس سے وہ غلطی یا عیب مراد ہے، جس کی نوعیت انفرادی ہو اور وہ کم اہمیت کی حامل ہو — اگر غلطی اجتماعی نوعیت کی ہو اور اس کے ارتکاب سے پورے اسلامی معاشرے کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو اور اس کے چھپانے سے کسی بھی سطح پر قومی، ملکی اور اجتماعی نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو اس سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے اور متعلقہ لوگوں کے علم میں لاکر معاشرے کو اس کے خطرناک نتائج سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب

تصنیف : حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

ناشر : انجمن ارشاد المسلمین، ٦۔ بی شاداب کالونی، حمید نظامی روڈ، لاہور۔

کتابت، طباعت، کاغذ، جلد شاندار۔ صفحات ۵۱۲۔ قیمت ۴۰/- روپے

حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرحوم، برصغیر پاک و ہند کے جلیل القدر علما میں سے تھے۔ آپ کی دینی اور تدریسی خدمات کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ برصغیر سمیت متعدد ملکوں کے بے شمار علما و فضلا نے آپ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ مولانا مدنی مرحوم کی تصنیفات میں زیرِ نظر کتاب ـــ الشہاب الثاقب ـــ ایک مشہور کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو بعض حضرات نے فقہی مسلک کے کچھ پہلوؤں کے بارے میں علمائے دیوبند پر کیے ہیں۔ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے، اس کا تازہ ایڈیشن حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

کتاب کا تازہ ایڈیشن مندرجہ ذیل پانچ کتابوں کا مجموعہ ہے :

۱۔ طویل مقدمہ جو ۱۵٦ صفحات کو محیط ہے۔ یہ مقدمہ جناب انوار احمد صاحب ایم کام نے لکھا ہے اس میں بہت سے علمی اور تحقیقی گوشوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

۲۔ مولانا حسین احمد مدنی کے مجمل حالاتِ زندگی، جو مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی نے تحریر کیے ہیں۔ حالات ۲۲ صفحات پر مشتمل ہیں۔

۳۔ اس کے بعد صفحہ ۱۸۱ سے اصل کتاب ـــ الشہاب الثاقب ـــ شروع ہوتی ہے، جو ۹۲ صفحات تک چلتی ہے۔

۴۔ صفحہ ۲۹۳ سے مولانا سید احمد آفندی برزنجی (جو اس زمانے میں مدینہ منورہ کے مفتی تھے) کا "غایۃ المامول" مع عربی متن اور اردو ترجمہ کے شائع کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ۴۲٦ صفحات تک چلا گیا ہے۔

۵۔ صفحہ ۴۲۹ سے مولانا ابوالرضا محمد عطاء اللہ قاسمی بہاری مرحوم کا رسالہ "ترغیم حزب الشیطان بتصویب حفظ الایمان" ہے جو کتاب کے ۵۰۰ صفحات تک ہے۔
کتاب کے آخر میں ایک فتویٰ درج کیا گیا ہے۔

دعواتِ حق (جلد دوم)

افادات : مولانا عبدالحق صاحب
ضبط و ترتیب : مولانا سمیع الحق
ناشر : مؤتمر المصنفین، دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک، ضلع پشاور
صفحات ۵۲۵ — قیمت ۴۰/- روپے

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب (دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک) کی شخصیت کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ مولانا علم و فضل میں یگانۂ روزگار شخصیت کے مالک ہیں اور وعظ و نصیحت میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ سالہا سال سے تدریسی خدمات میں مصروف ہیں اور اب تک ہزاروں تشنگانِ علوم کو مستفیض فرما چکے ہیں۔ دعا ہے، اللہ تعالیٰ اس چشمۂ فیض کو جو انھوں نے جاری فرمایا ہے، ہمیشہ قائم رکھے۔

مولانا ممدوح کے افادات کا سلسلہ بڑا وسعت پذیر ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب "دعواتِ حق" (جلد دوم) اس کی ایک مفید اور مضبوط کڑی ہے۔ اس میں ان کے وہ مواعظ اور خطبے جمع کیے گئے ہیں، جو انھوں نے مختلف عیدوں اور جمعوں میں ارشاد فرمائے۔ یہ افادات دس ابواب میں منقسم ہیں اور ہر باب کا ایک مستقل عنوان قائم کرکے اس کے ماتحت مختلف ضمنی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ مرتبِ کتاب مولانا سمیع الحق نے اس سلسلے میں بڑے سلیقے سے کام لیا ہے اور کتاب کو مضامین کے لحاظ سے عمدگی سے ترتیب دیا ہے۔

مولانا عبدالحق صاحب مدظلہٗ کا اندازِ بیان بڑا میٹھا، اثر انگیز اور شگفتہ ہے۔ انھوں نے جس موضوع کو چھیڑا ہے، چھوٹے چھوٹے جملوں اور عام فہم اسلوب میں اس کی پوری وضاحت فرمادی ہے۔ اسلام کے مختلف گوشوں کو سمجھنے اور دین کی حقانیت کو حیطۂ فکر میں لانے کے لیے یہ کتاب بڑی سودمند ہے۔ یوں تو یہ کتاب ہر طبقے کے لیے فائدہ مند ہے لیکن مقرروں، واعظوں اور خطیبوں کے لیے بالخصوص بہترین تحفہ ہے۔

(م۔ ا۔ ب)

افکارِ حق

مصنف: جی اے حق محمد ناشر: مکتبہ اشرفیہ، مریدکے ضلع شیخوپورہ ۔ صفحات ۱۱۹ ۔ قیمت ۶/ روپے

چھوٹے بڑے دس عناوین پر مشتمل یہ کتابچہ جناب جی اے حق محمد کی علمی کاوش ہے۔ ابتدائی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ مقالات کسی خاص ترتیب یا منصوبہ بندی کے تحت تحریر نہیں کیے بلکہ وقتاً فوقتاً جو موضوعات زیرِ بحث آتے رہے ہیں، ان پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ ان متنوع مقالات میں جن موضوعات کی اہمیت اس وقت زیادہ ہے، ان میں "اسلامی قانون اور اقوامِ عالم" "اغوا اور اسلامی نظامِ قانون" اور "جہیز۔ معاشرتی و تاریخی حیثیت" قابلِ ذکر ہیں۔ پہلے مقالے میں اسلام کے اصولِ غیر جانب داری پر تاریخی اور علمی حقائق کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ اغوا اور جہیز کے مسائل آج کے اہم اور زندہ مسائل ہیں، ان پہ بھی فاضل مصنف نے قیمتی شذرے لکھے ہیں۔

اس مختصر کتاب میں بہت سے موضوعات ایسے ہیں جو بہت پرکشش ہیں اور عنوان پڑھتے ہی پورے مقالے کو پڑھنے کا شوق اور جستجو بڑھ جاتی ہے، لیکن متعلقہ مقالے کو پڑھا جائے تو تشنگی باقی رہتی ہے، کیونکہ مقالے ضرورت سے زیادہ مختصر ہیں۔ مثلاً "صحابیات کی جنگی خدمات" اور "غیر اسلامی ثقافتوں میں عورت کا مقام" جیسے موضوعات کو لیجیے۔ یہ بہت ہی اہم اور پرکشش موضوعات ہیں۔ لیکن نہ جانے کن مصلحتوں کے پیشِ نظر مصنف نے ان دونوں عناوین میں سے ہر ایک پر ڈیڑھ دو صفحے سے زیادہ نہیں لکھا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اس کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں اس تشنگی کی تسکین کا سامان مہیا فرمائیں۔

کتاب کا نام، عنوانات کی ترتیب دونوں توجہ طلب ہیں۔ کیونکہ کتاب میں عموماً ایسا مواد نئی ترتیب سے استعمال کیا گیا ہے، جو پہلے سے ہمارے پاس موجود ہے۔ اس لیے مواد کو نئی ترتیب دینے سے نئی فکر جنم نہیں لیتی۔ اسی طرح فہرست میں موضوعات کی ترتیب اور کتاب میں موضوعات کی ترتیب میں موافقت نہیں ہے۔ مزید برآں ایک محقق کے قلم سے نکلے ہوئے مواد کی حوالہ بندی (DOCUMENTATION) ضروری ہے جبکہ زیرِ نظر مقالے اس حسن سے بھی معرا ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود اُردو زبان میں اسلام پر اچھا مواد ایک جگہ جمع ہو گیا ہے، جس سے عام قاری کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

(محمد طفیل)

علمی رسائل کے مضامین

البلاغ، کراچی ــ دسمبر ۱۹۷۹

اتوار اور جمعہ کی تاریخی حیثیت	مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی
بخل اور اس کا علاج (افادات مولانا اشرف علی تھانوی)	محمد اقبال قریشی
ایک دینی مدرسہ کے طلبا کے سامنے وداعی تقریر	مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی

البلاغ، کراچی ــ جنوری ۱۹۸۰

اسلامی قانون شہادت اور رہا ہونے کی رپورٹیں	مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی
علامہ مناظر احسن گیلانی اپنے خطوط کے آئینے میں	مولانا اشفاق احمد قاسمی گیاوی

البلاغ، بمبئی ــ دسمبر ۱۹۷۹

مطالعات وتعلیقات	قاضی اطہر مبارک پوری
زائرین حرمین	قاضی اطہر مبارک پوری
حج کی باتیں	محی الدین منیری
مسنون دعائیں	مولانا شاہ ولی اللہ فتح پوری

بینات، کراچی ــ دسمبر ۱۹۷۹

اسلام میں تعلیم	جسٹس کریم اللہ دُرانی
قطع ید اور اس کی شرائط	قاضی بشیر احمد
قومی ملکیت اور اسلام	مولانا عبدالکریم کلاچی

بینات، کراچی ــ جنوری ۱۹۸۰

کتاب ادب القاضی اور الصدر الشہید کی شرح	مولانا سراج احمد فاروقی
کمیونزم کا فتنہ	مولانا محمد اسحاق صدیقی
کوفے کے علمی و دینی سرچشمے	محمود عارف

ترجمان الحدیث، لاہور ــــ دسمبر ۱۹۷۹، جنوری ۱۹۸۰

خاتونِ مسلم کے لیے قیمتی ہدیہ — مولانا عزیز زبیدی
ایک جھوٹا وصیت نامہ — شیخ عبدالعزیز بن باز۔ ترجمہ مولانا سیف الرحمٰن الفلاح
اسلامی قانون اور اس کی تدوین جدید — حافظ منظور احمد ایم اے

ترجمان القرآن، لاہور ــــ نومبر ۱۹۷۹

اجماعِ امت اور قانون سازی میں اس کی حیثیت — جناب طیب شاہین لودھی
اسلام اور سیاست حاکمہ — جناب نعیم صدیقی
معاشی نظام میں [illegible] بحران (مسلسل) — ریاض الحسن نوری ایم اے

تعلیم القرآن، راولپنڈی ــــ جنوری ۱۹۸۰

مذہبِ اسلام کے خلاف بغاوت — ڈاکٹر خالد محمود
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ — آغا ارشد محمود
تحفۃ الاحیا فی عصمۃ الانبیا (مسلسل) — مولانا عبدالغفور
حقیقتِ شرک (مسلسل) — مولانا عبدالغنی

الحق، اکوڑہ خٹک ــــ نومبر ۱۹۷۹

اسلام کے قلعے — مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
دارالعلوم دیوبند اور اردو ادب — مولانا محمد انیس الاسلام قاسمی

الرشید، ساہیوال ــــ جنوری ۱۹۸۰

اسوۂ اکابر — پیرزادہ مولانا بہار الحق قاسمی
ضرورتِ علم — مولانا وحید الدین قاسمی

المجیب، پھلواری شریف (انڈیا)

عصمتِ انبیا — مولانا شاہ محمد نظام الدین قادری
پھلواری شریف کی اہم شخصیتیں — مولانا شاہ عون احمد قادری
امام ربیع بن سلیمان مرادی — حافظ عمیر الصدیق ندوی
فورٹ ولیم کالج اور اردو — ش۔م عارف ماہر آروی

مارچ ۱۹۸۰

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون: ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۳ | مارچ ۱۹۸۰ | ربیع الثانی ۱۴۰۰ | شمارہ ۳

ترتیب

تاثرات

۲۷ جنوری سے ۳۰ جنوری (۱۹۸۰) تک اسلام آباد میں اسلامی ملکوں کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں تقریباً چالیس مسلمان ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی، جن میں عرب، ایران اور افریقہ کے نمائندے شامل تھے۔ اس کا افتتاح صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے کیا۔ تقریروں اور تجویزوں کے لحاظ سے کانفرنس نہایت کامیاب رہی۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے چند باتیں واضح ہو کر سامنے آئیں۔

۱۔ اسلام کی سربلندی کے لیے دنیا بھر کے مسلمان متحد ہیں اور اللہ کے کلمۂ واحدہ کو بلند کرنے کے لیے ہر آن بے تاب، ان کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔

۲۔ مسلمانوں کے مجموعی مفاد کے لیے تمام مسلمان باہمی اتفاق و اتحاد کو ضروری قرار دیتے ہیں اور بین المللی مسائل میں ان کے غور و فکر کا پیمانہ ایک ہی ہے۔ اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔

۳۔ تمام دنیا کے مسلمان، پاکستان کے دوست اور بہی خواہ ہیں، اور ہر خطۂ ارض کی اسلامی حکومتیں اس کے ساتھ مخلصانہ مراسم اور ہمدردانہ تعلقات رکھتی ہیں۔

۴۔ مسلمان سربراہانِ مملکت کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ ان کو ایک مضبوط اور طاقت ور بلاک کی شکل اختیار کر کے اپنی تمام قوتوں کو دوسروں کے مقابلے میں میدانِ عمل میں جھونک دینا چاہیے۔

پاکستان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ عالمی برادری بالخصوص اسلامی ملکوں میں بے پناہ اثر و رسوخ کا حامل ہے۔ اس نے پوری دنیا پر یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ تمام مسلمان یک جان ہیں۔ اس نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ بین الاقوامی بساطِ سیاست پر جو مسائل اسلامی ملکوں کے لیے تکلیف یا تشویش کا باعث ہیں، ان پر سوچ بچار کرنے اور اپنی بین المللی یا بین الاقوامی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی یہ ملک پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر کسی طرف سے خطرے کی گھنٹی بجے تو اجتماعی طور پر اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔

سید جمیل احمد رضوی

اعجازِ قرآن

اعجازِ قرآن کے موضوع کو زیرِ بحث لانے سے پہلے ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ لفظِ "اعجاز" کے معنی کیا ہیں۔ القاموس المحیط میں "عجز" کے ذیل میں لکھا ہے ۔ اعجاز باب افعال سے مصدر ہے ۔ اس کے معنی دوسرے کو عاجز کرنے اور عاجز پانے کے ہیں ۔ معجزہ اس کام کو کہتے ہیں جس کے ذریعے بوقت تحدی مخالف کو عاجز کر دیا جائے ۔ اس میں تائے مدورہ برائے مبالغہ ہے [۱]

علامہ علی نقی لکھتے ہیں کہ "معجزہ وہ غیر معمولی چیز ہے جو کسی نبی کو دعوائے نبوت کے ثبوت میں خداوند عالم کی جانب سے عطا ہو، جس کے مقابل لانے سے اس کی مخاطب دنیا کی تمام طاقتیں عاجز ہوں [۲]

قرآن حکیم میں اس مقصد کے لیے لفظ معجزہ استعمال نہیں کیا گیا بلکہ آیت اور بیّنہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اسی کو متکلمین کی اصطلاح میں معجزہ کہا جاتا ہے ۔

قرآنِ حکیم میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں انبیا کے معجزات کا ذکر ہوا ہے اور ان کو آیات اور بینات کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ ناقۂ صالح کو آیت اور بیّنہ کہا گیا ہے ۔

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ (الاعراف ، ۷۳)

قبیلہ ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا، انھوں نے کہا، اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے "بینہ" آگیا ہے۔ یہ اونٹنی ہے اللہ کی، جو تمھارے

---

[۱] اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۔ ج ۱/۱۲ ، ص ۴۷۰

[۲] علی نقی ۔ مقدمہ تفسیر قرآن ۔ ص ۴۳

لیے آیت (نشانی) ہے۔ اس کو چھوڑ دو کہ یہ خدا کی زمین میں اپنی غذا حاصل کرے اور تم اُسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا جس سے تم دردناک عذاب میں مبتلا ہو جاؤ۔

قرآن میں عصائے موسیٰ اور ید بیضا کے لیے بھی یہی الفاظ آتے ہیں:

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ (الاعراف: ۱۰۶-۱۰۸)

فرعون نے کہا (اچھا) تو تم اگر (اپنے دعوے میں) سچے ہو اور واقعی کوئی معجزہ لے کر آئے ہو تو لاؤ (دکھاؤ بس رہ یہ سنتے ہی) موسیٰ نے اپنی چھڑی (زمین پر) ڈال دی۔ پھر تو یکایک وہ ایک صریحی اژدہا بن گئی اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ہر شخص کی نظر میں جگمگا رہا ہے۔

معجزات کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کو اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا اور انھیں معجزات عطا کرکے بھیجا۔ ان کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟ دراصل معجزات نبوت و رسالت کی صحت پر دلالت کے طور پر عطا کیے جاتے تھے تاکہ خدا کا فرستادہ پیغمبر اپنی صداقت و حقانیت کو ثابت کر سکے اور اپنے آپ کو ان سے ممیز کر سکے جو اسی قسم کا جھوٹا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

تفسیر المیزان میں لکھا ہے کہ جب انبیا علیہم السلام اپنی دعوت کا برملا اعلان کرتے تھے، تو کبھی ان سے معجزہ لانے کا مطالبہ کیا جاتا تھا تو وہ لاتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگوں کے مطالبے سے پہلے ہی وہ معجزہ لاتے تھے۔ حقائق دینیہ مثلاً مبدا و معاد کے امور کی صحت کے لیے معجزات کا صدور نہیں ہوا۔ انبیا دینی حقائق کے اثبات کے لیے معجزات لے کر نہیں آئے، بلکہ اس کے لیے انھوں نے عقلی دلیل پر اکتفا کیا، لیکن معجزات کا لانا رسالت و نبوت کی صداقت و حقانیت پر دلیل کے طور پر تھا۔[۵]

انبیا اور رسل اپنی نبوت و رسالت کی صحت کے اثبات میں معجزات کیوں لاتے تھے؟ اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب وہ وحی کے ساتھ رسالت کا دعویٰ کرتے تھے اور وحی سے

---

[۵] محمد حسین الطباطبائی۔ الاعجاز فی القرآن الکریم، عرض و تلخیص حسین الکورانی۔ الہادی (مجلہ)۔ ج ۳، شمارہ ۱، ص ۷۸-۸۰

مراد اللہ سے ہم کلام ہونا یا فرشتے کا نزول ہے۔ . . تو اُن کی قومیں ان کا دعویٰ تسلیم کرنے سے انکار کرتی تھیں، کیونکہ یہ دعوے معمول کے نہ تھے۔ اگر یہ دعوے میں سچے ہیں تو انھیں ان لوگوں کی نسبت معمولات سے زیادہ تصرف حاصل ہونا چاہیے جن کی طرف وہ مبعوث ہوئے ہیں[۵۴]

پھر عام لوگوں اور ان کے درمیان کیا فرق ہے؟ لوگوں کا جھگڑا اور نزاع دو طرح کا تھا:
اوّلاً وہ ان سے اس بنا پر جھگڑتے تھے کہ وہ ان کی مانند ہیں۔ اس کے بارے میں ہم قرآن کی چند آیات پیش کرتے ہیں:

قَالُوٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ط تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (ابراہیم: ۱۰)

یعنی وہ لوگ بول اُٹھے کہ تم بھی بس ہمارے ہی جیسے آدمی ہو، تم یہ چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے تھے، ہم کو ان سے باز رکھو۔

سورہ صٓ میں اسی بات کی جانب اشارہ کیا گیا:

ءَ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا (ص: ۸)

یعنی کیا ہم سب لوگوں میں بس (محمدؐ ہی اس قابل تھا) کہ اس پر قرآن نازل ہوا۔

کافروں کی اس سے مراد یہ تھی کہ انبیا اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں تو پھر ذکر اور وحی کے ساتھ ان کو خصوصیت کیسے حاصل ہوگئی۔ انبیا کا جواب ہم قرآن کی زبان میں سنتے ہیں:

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ط (ابراہیم: ۱۱)

ان کے پیغمبروں نے اُن کے جواب میں کہا کہ اس میں شک نہیں کہ ہم بھی تمھارے ہی جیسے آدمی ہیں مگر خدا اپنے بندوں میں جس پر چاہتا ہے اپنا فضل (وکرم) کرتا ہے (اور رسالت عطا فرماتا ہے)

انبیا نے جواب میں مماثلت کو تسلیم کیا، لیکن اختصاص کی نفی نہیں کی۔ انبیا بھی بشر ہیں اور ان کی قومیں بھی بشر، لیکن یہ مماثلت اس بات کی نفی نہیں کرتی کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے، چن لیتا ہے اور نبوت و رسالت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے۔[۵۵]

---

۵۴ محمد حسین الطباطبائی۔ الاعجاز فی القرآن الکریم۔ عرض و تلخیص حسین الکورانی۔ الہادی (مجلہ)۔ ج ۳، شمارہ ۱، ص ۷۸ — ۸۰
۵۵ ایضاً

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جب رسول دعویٰ (رسالت) کرتا تھا تو لوگ اس سے دلیل و برہان طلب کرتے تھے اور یہ طریقہ طبعی اور منطقی تھا۔ نبوت ایک خارقِ عادت امر ہے اور جب تک لوگ اس دعوے کی صحت میں شک کرتے رہیں، تو اس میں کیا چیز مانع ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک اور خارق عادت امر (معجزہ) لائے اور وہ دعوائے نبوت پر دلیل ہو۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ مدعیِ نبوت کی اس دعوے میں تصدیق ہو جاتی ہے [۵۶] درحقیقت نبوت و رسالت ایک خداوندی منصب اور روحانی عہدہ ہے جو اپنی واقعی حقیقت کے اعتبار سے ایک روحانی اقتدار، فرماں روائی اور سیادت کا رشتہ رکھتا ہے۔[۵۷]

انبیا کے معجزات

ہر نبی اور رسول کو حالات کے مطابق معجزات دیے گئے اور وہ اس زمانے میں جو شے درجۂ کمال پر ہوتی تھی، اس کو شکست دے کر اپنا لوہا منوا لیتے تھے۔ اس طرح اس فن کے ماہر سمجھ لیتے تھے کہ صاحبِ معجزہ فرستادۂ خدا ہے اور وہ سب سے پہلے اس کی تصدیق کرتے تھے۔ اس کا اثر دوسرے لوگوں پر ہوتا تھا اور وہ بھی ان پر ایمان لے آتے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادوگروں کا زور تھا۔ سرزمینِ مصر ان کے وجود سے معمور تھی۔ چنانچہ آپ کو عصا اور یدِ بیضا کے معجزے دیے گئے جنھوں نے جادو کا زور توڑ دیا اور جادوگر فوراً موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لے آئے۔ حضرت عیسیٰ کے زمانے میں علمِ طب کو بڑا کمال حاصل تھا، چنانچہ انھیں ایسے معجزے دیے گئے جن سے اطبائے حاذق عاجز آ گئے۔ دمِ عیسیٰ مشہورِ عالم ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردے کو زندہ کرتے تھے اور پرندے کے قالب پر دم کرتے تھے تو وہ زندہ ہو کر اُڑ جاتا تھا، مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتے تھے۔ یہ ایسی باتیں تھیں جو علمِ طب کے ماہر نہیں کر سکتے تھے۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ محسوسات کے معجزے بھی دیے گئے، مثلاً شقِ قمر اور سنگ ریزوں کا آپ کے دستِ مبارک پر تسبیحِ خدا پڑھنا۔ چوں کہ آپ کے زمانے میں فصاحت و بلاغت کو

---

[۵۶] محمد حسین الطباطبائی۔ الاعجاز فی القرآن الکریم، عرض و تلخیص حسین الکورانی۔ الہادی (مجلہ)، ج ۲، شمارہ ۱۔ ص ۷۸-۸۰

[۵۷] علی نقی۔ مقدمہ تفسیر قرآن، ص ۲۴۔

بڑا کمال حاصل تھا، اس لیے آنحضرت کو عالم معقولات و معنویات کا بھی ایک ایسا معجزہ عطا کیا گیا جس کو قرآن کہتے ہیں، جن لوگوں کو اپنی زبان، ادب اور شاعری پر ناز تھا، وہ کلام اللہ کے نازل ہونے سے انگشت بدندان رہ گئے اور ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے۔

جاہلیت میں شعر و شاعری کی عظمت

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ جس معاشرے سے قرآن نے براہِ راست خطاب کیا اور جس کے سامنے پہلے پہل اعجاز کی شان لیے ہوئے پیش ہوا، اس میں فصاحت و بلاغت اور شعر و شاعری کی کیا قدر و قیمت تھی۔ تاریخ ادبیات کے حوالے سے اس کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عربی ادب کی تاریخ سے چند واقعات پیش کیے جاتے ہیں، جن سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ دورِ جاہلیت میں فصیح و بلیغ کلام کو کیا مقام حاصل تھا۔

ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں کہ عرب میں جب کوئی شاعر ظاہر ہوتا تھا تو بڑی خوشی منائی جاتی تھی، جشن ہوتے تھے۔ ہر طرف سے یار و احباب، اعزہ و اقربا مبارک باد دینے آتے تھے۔ قبیلے کی عزت و شان دفعتہً بلند ہو جاتی تھی۔ ایک ایک شعر ایک قبیلے یا ایک شخص کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیتا تھا۔ جب شماخ بن ضرار نے عرابہ اوسی کی شان میں یہ شعر کہا:

اذا ما رایۃٌ رفعت المجد　　　تلقّاھا عُرابۃُ بالیمین

یعنی جب عظمت و بزرگی کا جھنڈا کہیں بلند کیا جاتا ہے تو عُرابہ اس کو داہنے ہاتھ میں تھام لیتا ہے۔

تو عُرابہ کا نام تمام عرب میں مشہور ہو گیا اور آج تک یہ مصرع ضرب المثل ہے۔

مُحلق عرب میں ایک گمنام اور غریب شخص تھا، اس کی تین بیٹیاں تھیں جن کو شوہر نہیں ملتا تھا۔ اتفاق سے اعشیٰ کہیں اس طرف آنکلا، محلق کی بیوی کو جو اس کی خبر پہنچی تو شوہر سے کہا کہ یہ وہ شخص ہے کہ جس کی یہ مدح کر دیتا ہے، وہ تمام ملک میں مشہور ہو جاتا ہے۔ محلق نے اس موقع کو غنیمت جان کر فوراً اس کی دعوت کر دی اور خوب خاطر و مدارات کی۔ اعشیٰ نے محلق کی اولاد کا حال دریافت کیا۔ محلق نے کہا کہ تین لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں، مگر بر نصیب نہیں ہوتا۔ اعشیٰ نے کہا کہ اچھا ہم اس کی کچھ فکر کریں گے، تم اطمینان رکھو۔ جب سوق عُکاظ کا وقت آیا تو اعشیٰ نے مجمع عام میں ایک قصیدہ محلق کی مدح میں پڑھا، جس کا مطلع یہ تھا:

ارقت وما ھذا السھاد المؤرق وما بی من سقم وما بی معشق

یعنی میں رات بھر بیدار رہا اور میری یہ بیداری اس آدمی کی طرح نہیں جو بیدار رہنے کا عادی ہو۔ نہ مجھے کوئی مرض ہے اور نہ میں دامِ عشق میں گرفتار ہوں۔

قصیدہ ختم ہونے نہیں پایا تھا کہ محلق کے ارد گرد لوگ جمع ہو گئے اور اس کی تعظیم و تکریم کرنے لگے۔ شرفائے عرب نے آکر لڑکیوں سے شادی کے پیغام دیے اور وہ جلد ہی معزز خاندانوں میں بیاہی گئیں۔[۵۹]

ان واقعات سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ عرب کے اس معاشرے میں شعر و شاعری کو کیا مقام حاصل تھا۔ فصیح و بلیغ کلام کو اس وقت کے نظامِ ابلاغ میں بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ اس پر فخر کیا جاتا تھا۔ ایسے معاشرے میں جب آنحضرتؐ اپنی بعثت کا اعلان فرماتے ہیں تو ایسے کلام کی ضرورت تھی جو انسانی نہ ہو بلکہ الہامی ہو۔ جو کسی بشر کا کلام نہ ہو بلکہ اللہ کا کلام ہو اور جب خاتم النبیینؐ نے قرآن کو اپنی رسالت کی تصدیق کے لیے معجزے کی شان سے پیش کیا، تو تمام فصحائے عرب کی زبانیں گنگ ہو گئیں اور ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ لوگ جو شاعری کو اپنی کنیز سمجھتے تھے، زبان دانی پر ناز کرتے تھے، غیر عرب کو کلام کے میدان میں درخورِ اعتنا نہ جانتے تھے، وہ قرآن مجید کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے۔ فصاحت و بلاغت کے میدان میں سبقت لے جانے والوں نے غور و فکر کیا اور آخر انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ "ما ھذا الکلام البشر"، کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔

اصمعی کی حکایت

کلام اللہ کی عظمت کا کیا کہنا کہ اس میں الفاظ کا استعمال موقع و محل کے اعتبار سے اس قدر موزوں ہے کہ اگر ایک لفظ بھی اپنے مقام سے اِدھر اُدھر ہو جائے تو فوراً معلوم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اصمعی جو کہ عربی ادب میں بہت بڑا ادیب اور ماہر لسانیات گزرا ہے وہ بیان کرتا ہے کہ ایک جنگل میں میرا گزر ہوا اور ایک عرب صحرائی سے میری ملاقات ہوئی۔ کچھ کلامِ خدا کا تذکرہ آیا۔ اس نے کہا کچھ قرآن یاد ہو تو پڑھو۔ میں نے آیتِ سرقہ کو اس طرح پڑھا: "وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَاۗءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ"۔ اس نے کہا: ھذا الکلام من؟ یہ کس کا کلام ہے؟ میں نے

---

۵۹ زبید احمد۔ ادب العرب۔ ص ۱۲۷، ۱۲۸

کہا: خدا کا۔ اس نے کہا کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے۔ میں نے جو خیال کیا تو یاد آیا کہ "غفور رحیم" کی بجائے عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ہے۔ پھر میں نے اس طرح پڑھا: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (المائدہ، ۳۸) یہ سن کر اس عرب نے کہا، ہاں! یہ خدا کا کلام ہے۔ اصمعی نے پوچھا کیوں کر تجھے معلوم ہوا کہ پہلا کلام خدا کا نہ تھا اور یہ کلام خدا کا ہے؟ اس نے کہا کہ اگر غفور رحیم یہاں ہوتا، تو پھر ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ اور جب ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، تو معلوم ہوا کہ وہ عزیز یعنی غالب اور حکیم یعنی صاحبِ حکمت ہے[۱۰]

اعجازِ قرآن کے بارے میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ وجوہِ اعجاز کو بیان کیا گیا ہے۔ اس مضمون کا دامن اتنا وسیع نہیں کہ ان سب کو زیرِ بحث لایا جائے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اعجاز قرآن کے ذیل میں وجوہِ اعجاز میں فصاحت و بلاغت، ندرتِ اسلوب، پیشین گوئیاں، امم سابقہ کے حالات، قوتِ تاثیر، بقا و ثبات (قرآن ابد الآباد تک باقی رہنے والا ہے)، لذتِ تکرار، دعائیہ کلمات کی سحر آفرینی اور نظم و تالیف کا ذکر کیا ہے[۱۱] یہاں اعجاز کے چند پہلوؤں کو بیان کیا جاتا ہے۔ سید محمد حسین الطباطبائی قمی کی تفسیر المیزان میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ رسالہ "الہادی" کے حوالے سے اس تفسیر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن میں بہت سی مکی اور مدنی آیات ہیں جو بتاتی ہیں کہ قرآن ایک معجزہ ہے، آیت ہے، خارقِ عادت ہے۔ یہ آیات قرآن کے اعجاز کو ثابت کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و حقانیت ثابت ہوتی ہے۔

یہ آیات دعوتِ مقابلہ دیتی ہیں۔ یہ دعوت عام بھی ہے اور خاص بھی۔ ان میں سے سب سے زیادہ عام دعوت اس آیت میں موجود ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○ (بنی اسرائیل، ۸۸)

---

[۱۰] محمد مہدی۔ لواعج الاحزان۔ جلد ۲، ص ۹۶

[۱۱] تفصیل کے لیے دیکھیے اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ جلد ۱/۱۶

(یعنی اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ اگر (سارے دنیا جہان کے) آدمی اور جن اس بات پر اکٹھے ہوں کہ اس قرآن کا مثل لے آئیں تو اس کے برابر نہیں لا سکتے، اگرچہ (اس کوشش میں) ایک کا ایک مددگار بھی بنے۔"

اس آیت سے وضاحت ہوتی ہے کہ اعجازِ قرآن کسی خاص رُخ یا پہلو سے نہیں بلکہ قرآن سب کا سب اپنے وجود کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ اگر مقابلہ صرف فصاحت و بلاغت اور اسلوب کا ہوتا، تو دعوتِ مقابلہ دورِ جاہلی کے عربوں کو دی جاتی۔ عام دعوتِ مقابلہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ہر بلیغ کے لیے اس کی بلاغت معجزہ ہے ... کسی حکیم کے لیے اس کی حکمت معجزہ ہے ... جب مقابلے کی دعوت "تمام عالمین" کے لیے ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن تمام جہات سے اعجاز کا دعویٰ کرتا ہے اور تمام انسانوں اور جنوں سے کہتا ہے کہ اگر ان میں مقابلے کی سکت ہے تو وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں اور جو کچھ اس میں موجود ہے اس کا مقابلہ کریں اور اس کی مثل لے آئیں۔

(الف) علم کے ساتھ دعوتِ مقابلہ

قرآن حکیم تمام باتوں کے ساتھ ساتھ علم و معرفت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی دعوت دیتا ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل: ۸۹)

اور ہم نے تم پر کتاب (قرآن) نازل کی جس میں ہر چیز کا (شافی) بیان ہے۔

قرآن میں اس موضوع پر اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ مقابلے کی دعوت صرف دلیل ہی سے نہیں بلکہ اس میں ہر ضروری چیز کے بارے میں اللہ کا حکم موجود ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت ہر لحاظ سے کامل ہے ___ اسلامی تشریع اور قانون کی بنیاد فطرت، توحید اور نفسِ انسانی کے اخلاقِ فاضلہ پر رکھی گئی ہے اور یہ امور ہر حال میں ثابت رہتے ہیں۔ تغیر و تبدل ہرگز ان سے تعرض نہیں کرتے۔ الٰہی قانون (تشریع اسلامی) کے دوام اور انسانی قانون کے تغیر و تحوّل میں یہی راز ہے[۳۱]

(ب) نبیِّ امی کے ساتھ دعوتِ مقابلہ

جس طرح قرآن، علم کے ساتھ دعوتِ معارضہ دیتا ہے، اسی طرح نبیِّ امی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے مقابلے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ پیغمبرؐ جو لفظی اور معنوی لحاظ سے عاجز کر دینے والا قرآن لے کر آئے[۱۱]

---

[۳۱] محمد حسین الطباطبائی۔ الاعجاز فی القرآن الکریم، عرض و تلخیص حسین الکورانی۔ الہادی (مجلہ) ج ۲، شمارہ ۴، ص ۱۱۶-۱۱۹۔ [۳۲] ایضاً

کے باوصف کہ انھوں نے کسی سے علم حاصل نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے تحدی اور دعوتِ مقابلہ ہے:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (یونس ۱۶)

(اے رسولؐ!) کہہ دو کہ اگر خدا چاہتا تو میں نہ تمھارے سامنے اس کو پڑھتا اور نہ وہ تمھیں اس سے آگاہ کرتا، کیونکہ میں تو (آخر) تم میں اس سے پہلے مدتوں رہ چکا ہوں۔ تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔"[۱۱۴]

اس ماحول میں آپ نے چالیس برس گزارے، وہ ماحول جس میں علم و عرفان کا چرچا نہ تھا۔ تعلیم و تعلم کے باقاعدہ ادارے نہ تھے۔ اطلاع (Information) کی نشر و اشاعت کا ساز و سامان نہ تھا۔ ابلاغ عامہ (Mass Communication) کے لیے جدید دور کی سہولتیں نہ تھیں۔ اس دور کے عرب کی تصویر کشی حالی نے اپنی مسدس میں اس طرح کی ہے:

عرب جس کا چرچا ہے یہ، کچھ وہ کیا تھا | جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانہ سے پیوند جس کا جدا تھا | نہ کشور ستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایہ
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا[۱۱۵]

ایسے معاشرے میں وہ نبیِ اُمّی جو کسی سے کچھ تعلیم نہ پائے، کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ نہ کرے، کسی کو استاد نہ بنائے۔ پھر ایسی کتاب لائے اور ایسا کلام سنائے جو کل علوم و فنون کے اصول کو حاوی ہو، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کل ضروریات کا ضامن اور کفیل ہو۔ جب اس نے مخلوق سے نہیں سیکھا، تو یہ جو کچھ لایا، بلاشبہ خالق کا کلام ہے۔[۱۱۶] جب اللہ کا کلام زبانِ رسالت پر جاری ہوا تو اس نے تمام زمینِ عرب کو ہلا کر رکھ دیا۔

---

۱۱۴ محمد حسین الطباطبائی۔ الاعجاز فی القرآن الکریم۔ عرض و تلخیص حسین الکورانی۔ الہادی (مجلہ)، ج ۲، شمارہ ۴، ص ۱۱۶-۱۱۹

۱۱۵ حالی، الطاف حسین۔ مسدس، ص ۱۳

۱۱۶ محمد سبطین۔ جواہر القرآن۔ البرہان۔ جلد ۱۵، شمارہ ۱ (۱۵ دسمبر ۱۹۴۵) ص ۶

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگادی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف یہ غل پیغامِ حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نامِ حق سے[۱۵]

آپ آواز بلند کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر تم میں سکت ہے تو قرآن کی مثل ایک سورت بنا کر لے آؤ۔ کسی میں ہمت نہیں پڑتی کہ وہ دعوتِ مقابلہ کو قبول کرے۔ فصحائے عرب کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔ دعوتِ مقابلہ کی آواز اطرافِ عالم میں پھیل جاتی ہے، لیکن کوئی شخص مقابلے کی جرأت نہیں کرتا۔

(ج) غیب کے ساتھ دعوتِ مقابلہ

قرآن غیب کی خبروں کے ساتھ مقابلے کی دعوت دیتا ہے۔ اس بارے میں بہت سی آیات ہیں۔ بعض کا تعلق تو ماضی سے ہے اور بعض کا تعلق مستقبل سے۔ جو ماضی سے متعلق ہیں، ان میں سے چند یہاں درج کی جاتی ہیں۔

حضرت نوح کے قصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشادِ ربانی ہے:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ (ہود: ۴۹)

(اے رسولؐ) - یہ غیب کی چند خبریں ہیں جن کو ہم تمھاری طرف وحی کے ذریعے سے پہنچاتے ہیں جو اس کے قبل نہ تم جانتے تھے اور نہ تمھاری قوم ہی جانتی تھی۔

حضرت یوسف کے قصے کا ذکر کرتے ہوئے اللہ کا ارشاد ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝ (یوسف: ۱۰۲)

(اے رسولؐ) یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم تمھارے پاس وحی کے ذریعے سے بھیجتے ہیں۔

---

۱۵ - [illegible] حسین - مسدس، ص ۱۷

ورنہ جس وقت یوسف کے بھائی باہم اپنے کام کا مشورہ کر رہے تھے اور (ہلاک کی) تدبیریں کر رہے تھے، تو تم ان کے پاس موجود نہ تھے۔

حضرت مریم کی کفالت کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ قرآن اس کو اس طرح بیان کرتا ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ (آل عمران: ۴۴)

(اے رسولؐ) یہ خبر غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تمہارے پاس وحی کے ذریعے سے بھیجتے ہیں۔ (اے رسولؐ) تم تو ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ لوگ اپنا اپنا قلم (دریا میں بطورِ قرعہ) ڈال رہے تھے (دیکھیں) کون مریم کا کفیل بنتا ہے اور نہ تم اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ لوگ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

حضرت عیسٰی کا قصہ بیان کرنے کے بعد اللہ کا ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ (مریم: ۳۴)

یہ ہے مریم کے بیٹے عیسٰی کا سچا سچا قصہ جس میں یہ لوگ (خواہ مخواہ) شک کیا کرتے ہیں۔

اور وہ آیات جن کا تعلق مستقبل سے ہے، ان میں سے چند یہ ہیں: اہلِ روم کے غلبے کی بشارت ان الفاظ میں دی گئی:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۝ (الروم: ۲-۴)

بہت قریب کے ملک میں رومی (نصاریٰ اہلِ فارس آتش پرستوں سے) ہار گئے۔ مگر یہ لوگ عنقریب ہی اپنے ہار جانے کے بعد چند سالوں میں پھر (اہلِ فارس) پر غالب آجائیں گے۔

اس پیش گوئی کے مطابق صرف چند ہی سال میں رومی سلطنت ایران پر غالب آگئی۔

اور اللہ تعالیٰ کا قول جس میں آپ کا مدینے سے مکے کی طرف مراجعت کرنے کا ذکر ہے:

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ (القصص: ۸۵)

(اے رسولؐ) خدا جس نے تم پر قرآن نازل کیا، ضرور ٹھکانے تک پہنچا دے گا۔

بعض اس سے مراد فتح مکہ کی پیش گوئی لیتے ہیں اور بعض اس سے مرادِ رسولِ خدا کے عالی درجات لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیۡنَ ۙ مُحَلِّقِیۡنَ رُءُوۡسَکُمۡ وَ مُقَصِّرِیۡنَ ۙ لَا تَخَافُوۡنَ ؕ (الفتح : ۲۷)

تم لوگ مسجد حرام میں اپنے سر منڈوا کر اور اپنے بال کترو اکر بہت امن و اطمینان سے داخل ہوگے۔

اور خداوند عالم کا یہ فرمان :

سَیَقُوۡلُ الۡمُخَلَّفُوۡنَ اِذَا انۡطَلَقۡتُمۡ اِلٰی مَغَانِمَ لِتَاۡخُذُوۡہَا ذَرُوۡنَا نَتَّبِعۡکُمۡ ۚ (الفتح ۱۵)

اب تم لوگ غنیمتوں کو لینے جانے لگو گے تو جو لوگ (حدیبیہ سے) پیچھے رہ گئے تھے، تم سے کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول :

وَ اللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ؕ (المائدہ : ۶۷)

خدا تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

ان کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں جن میں اہل ایمان سے وعدہ کیا گیا ہے اور مشرکوں سے وعید۔ اگر ہم ان سب کو بیان کریں تو کلام بہت طویل ہو جائے گا۔

اس بارے میں کچھ ایسی آیات بھی ہیں جو بعض دیگر حقائق پر مشتمل ہیں۔ یہ حقائق ماضی میں معروف نہ تھے۔ مثلاً قرآن حکیم کا یہ کہنا :

وَ اَرۡسَلۡنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ (الحجر ۲۲)

اور ہم ہی نے تو وہ ہوائیں بھیجیں جو بادلوں کو پانی سے بھرے ہوئے ہیں)۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ مَّوۡزُوۡنٍ ﴿۱۹﴾ الحجر : ۱۹)

اور ہم ہی نے اس (زمین) میں ہر قسم کی مناسب چیز اگائی۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد :

وَ الۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ۪ۙ (النبا : ۷)

اور کیا ہم نے پہاڑوں کو زمین کی میخیں نہیں بنایا۔

المختصر قرآن غیب کی خبروں کے ساتھ مقابلے کی دعوت دیتا ہے [۱۸]

(د) عدمِ اختلاف کے ساتھ دعوتِ مقابلہ

قرآن مختلف اقساط میں نازل ہوتا رہا۔ سورہ، قطعہ اور آیت کی صورت میں ــ تقریباً تیئیس برسوں میں اور مختلف حالات میں نازل ہوتا رہا۔ جنگ اور صلح میں، تنگی اور فراخی کے ایام میں، امن اور خوف کے دنوں میں، رات اور دن میں، سفر اور حضر میں، مکے اور مدینے میں ــ ہاں! قرآن مختلف اوقات اور مختلف حالات میں نازل ہوتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف علوم کو بیان کرتا رہا، لیکن اس میں نہ تو تناقض رونما ہوا اور نہ کہیں معمولی سا اختلاف ۔

ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے، ایک حصہ دوسرے حصے کی وضاحت کرتا ہے۔ ایک جملہ دوسرے جملے کی تصدیق کرتا ہے ۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں : ینطق بعضہٗ ببعضٍ ویشھدُ بعضہ علی بعض (نہج البلاغہ)

اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں تناقض اور اختلاف پایا جاتا۔ انسان کی طبیعت ان مصائب و آلام کی وجہ سے جو اس پر گزرتے ہیں، ضرور متاثر ہوتی ہے اور اس کا اسلوب ان حالات کی وجہ سے بدلتا ہے، اس میں تغیر رونما ہوتا ہے ۔ اسی طرح اس کے استدلال کی قوت اور بات کرنے کا لہجہ بھی بدلتا رہتا ہے۔

ان میں سے کوئی چیز بھی ہم قرآن میں نہیں پاتے ۔ اس حقیقت کے باوجود کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ قرآن کے وقت ایسی ایسی مشکلات سے گزرے جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا اور نہ اُن کو برداشت ہی کیا جا سکتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے :

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۝

(النسا: ۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں بھی غور نہیں کرتے (اور یہ خیال نہیں کرتے کہ) اگر خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے (آیا) ہوتا، تو ضرور اس میں بڑا اختلاف پاتے ۔

اسی طرح قرآن تمام صراحت کے ساتھ دعوت دیتا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا دعوتِ مقابلہ کو خاموشی کے ساتھ قبول کر لیا گیا یا اس کی تکذیب کرنے کے لیے کوششیں ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اس سلسلے میں کوششیں ہوئیں، وہ خود تضاد اور اختلاف کی نظر ہو گئیں [۱۹]

فصاحت و بلاغت کے ساتھ دعوتِ مقابلہ

اسی طرح قرآن فصاحت و بلاغت کے ساتھ مقابلے کی دعوت دیتا ہے:

۱۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ (ہود: ۱۳-۱۴)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص (پیغمبر) نے اس (قرآن) کو اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے، تو تم (ان سے صاف صاف کہہ دو کہ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو (زیادہ نہیں) ایسے دس سورے اپنی طرف سے گھڑ لے آؤ اور خدا کے سوا جس جس کو تمھیں بلاتے بن پڑے، مدد کے واسطے بلالو۔ اس پر اگر وہ تمھاری نہ سنیں تو تم سمجھ لو کہ یہ (قرآن) صرف خدا کے علم سے نازل کیا گیا ہے اور یہ کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم اب بھی اسلام لاؤ گے (یا نہیں)

۲۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ ؕ (یونس)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو رسولؐ نے جھوٹ موٹ بنا لیا ہے (اے رسولؐ) تم کہو کہ (اچھا) تو تم (اگر اپنے دعوے میں) سچے ہو تو (بھلا) ایک سورت اس کے برابر کی بنالاؤ۔ اور خدا کے سوا جس کو تمھیں (مدد کے واسطے) بلانے بن پڑے، بلالو (یہ لوگ لاتے تو کیا) بلکہ (الٹے) جس کے جاننے پر ان کا دسترس نہ ہوا لگے اس کو جھٹلانے، حالانکہ ابھی تک ان کے ذہن میں اس کے معانی نہیں آئے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلاغت کے ساتھ مقابلے کی دعوت ہے۔ یہ بات عربوں کی حالت سے ظاہر ہے۔ کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ بلاغت کے اس مقام پر پہنچے ہوئے تھے جہاں کوئی نہ پہنچ سکا۔ کی دعوت ان مشرکوں کے لیے تھی جو اس صحیح دین کے ساتھ مزاحمت کرتے تھے۔ اس تحدی کا تھوڑا سا ہی تحریک دلانے کے لیے کافی تھا، کیونکہ وہ حمیت اور عصبیت میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ان ہی تفاخر تھا۔ لیکن انھوں نے اس دعوت کے مقابلے میں راہِ فرار اختیار کی، حالانکہ مقابلے کی دعوت تکرار کے ساتھ بیان کیا گیا اور اس کی مدت بھی بڑھادی گئی، لیکن انھوں نے استخفا اور فرار کی راہ کو اختیار کیا جیساکہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

اَلَآ اِنَّھُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَھُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْہُ ط اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَھُمْ لا یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ج (ہود : ۵)

(اے رسولؐ) یہ کفار (تمہاری عداوت میں) اپنے سینوں کو گویا دہرا کیے ڈالتے ہیں تاکہ خدا سے (اپنی باتوں کو) چھپائے رہیں (مگر) دیکھو جب یہ لوگ اپنے کپڑے خوب لپیٹتے ہیں (تب بھی تو) خدا ان کی باتوں کو جانتا ہے جو چھپاکر کرتے ہیں اور کھلم کھلا کرتے ہیں۔

اس تحدی (دعوتِ مقابلہ) کو تقریباً چودہ صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن یہ ہمیشہ سے قائم ہے۔ کوئی بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکا، جس نے اس سلسلے میں کوشش کی، اس کو رسوائی کے سوا کچھ نہ ملا اور اس کی جہالت ہی کا اظہار ہوا [۱۰]

فصاحت کے بارے میں اصمعی کی حکایت

اصمعی بیان کرتا ہے کہ ایک لڑکی نے یہ شعر پڑھے :

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِذَنْبِیْ کُلِّہٖ — قَتَلْتُ اِنْسَاناً لِغَیْرِ حِلِّہٖ
مِثْلَ غَزَالٍ نَاعِمٍ فِیْ دَلِّہٖ — فَانْتَصَفَ اللَّیْلُ وَلَمْ اُصَلِّہٖ

میں نے کہا سبحان اللہ کیا خوب فصاحت ہے۔ لڑکی نے کہا کہ اس آیت کے بعد کون سی فصاحت باقی رہ گئی ہے :

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْہِ ج فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْہِ فَاَلْقِیْہِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ ج اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْہُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ٥ (القصص : ۷)

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے پاس یہ وحی بھیجی کہ تم اس کو دودھ پلالو۔ پھر جب اس کی نسبت تم کو کوئی خوف ہو تو اس کو (ایک صندوق میں رکھ کر) دریا میں ڈال دو اور (اس پر) تم کچھ نہ ڈرنا اور نہ کڑھنا (تم اطمینان رکھو) ہم اس کو پھر تمہارے پاس پہنچادیں گے اور اس کو اپنا رسول بنائیں گے۔

اس ایک آیت میں دو امر، دو نہی، دو خبریں اور دو بشارتیں جمع کر دی ہیں [۱۱]

---

[۱۰] ایضاً، ص ۱۲۴-۱۲۵

[۱۱] محمد سبطین - جواہر العرفان - البرہان، ج ۱۵، شمارہ ۲ (۱۵ جنوری ۱۹۳۶) ص ۱۲

ابن ابی العوجا اور اس کے رفقا کا واقعہ

جن لوگوں نے فصاحت و بلاغت کی وجہ سے قرآن کی دعوتِ مقابلہ کے جواب میں اس کا مثل لانے کی کوشش کی ان میں ابن ابی العوجا اور اس کے تین ساتھیوں ابوشاکر دیصانی، ابن مقفع اور عبدالملک بصیری کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ یہ ملحدین میں سے تھے۔ چاروں کعبے کے پاس (حج کے زمانے میں) اکٹھے ہوئے۔ حاجیوں پر ہنس رہے تھے اور قرآن پر اعتراض کر رہے تھے۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ قرآن کے چار حصے کر لیے جائیں اور ان میں سے ہر ایک قرآن کے ایک ایک حصے کا جواب لکھے اور آئندہ سال موسم حج میں مسلمانوں پر پیش کر دے۔ تمام سال کوشش کرتے رہے کہ رد لکھیں مگر کچھ نہ ہو سکا۔ آئندہ سال اکٹھے ہوئے تو ابن ابی العوجا نے کہا جس دن سے یہاں سے گیا ہوں، آج تک اس آیت کو سوچ رہا ہوں۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ (یوسف : ۸۰)

(پھر جب یوسف کی طرف سے مایوس ہوئے تو باہم مشورہ کرنے کے لیے الگ کھڑے ہوئے)۔

ہر چند کوشش کی کہ ایسی آیت بناؤں مگر نہ بن سکی اور تمام سال اسی آیت میں ایسا مشغول رہا کہ دوسری آیات پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

عبدالملک نے کہا کہ میں اسی دن سے اس آیت پر غور کر رہا ہوں:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ (الحج : ۷۳)

(جن لوگوں کو تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو وہ اگرچہ سب کے سب اس کام کے لیے اکٹھے بھی ہو جائیں تو بھی ایک مکھی تک پیدا نہیں کر سکتے)۔

ابوشاکر نے کہا میں اسی وقت سے اس آیت کو سوچ رہا ہوں:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (الانبیا : ۲۲)

(یعنی (بالفرض محال) زمین و آسمان میں خدا کے سوا چند معبود ہوتے تو دونوں برباد ہو گئے ہوتے)۔

ابن مقفع نے جو اس زمانے میں سب سے فصیح مانا جاتا تھا کہا کہ قرآن بشر کا کلام نہیں۔ میں اسی دن سے اس آیت میں غور کر رہا ہوں:

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَاۗءَكِ وَيٰسَمَاۗءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَاۗءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَي الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (ہود : ۴۴)

(اور جب خدا کی طرف سے) حکم دیا گیا کہ اے زمین اپنا پانی جذب کر لے اور اے آسمان (برسنے سے) تھم جا، اور پانی گھٹ گیا اور (لوگوں کا) کام تمام کر دیا گیا اور کشتی جودی (پہاڑ) پر جا ٹھہری اور (چاروں طرف) پکار دیا گیا کہ ظالم لوگوں کو (خدا کی رحمت سے) دوری ہو)۔

اس (ابن مقنع) نے کہا کہ میری فکرِ رسا آج تک ان حقائق تک نہ پہنچ سکی جو اس آیت میں مندرج ہیں۔ ہشام (راوی حدیث) بیان کرتے ہیں کہ اس اثنا میں جب کہ یہ لوگ باتیں کر رہے تھے، حضرت صادق آل محمد وہاں گزرے اور یہ آیت تلاوت فرمائی:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۸۸)[۲۲]

(د) قوتِ تاثیر

قرآنِ عزیز کی قوتِ تاثیر بھی وجوہِ اعجاز میں سے ہے۔ قرآن کے علاوہ کسی کلام میں نظم ہو یا نثر یہ تاثیر، یہ حلاوت و شیرینی اور یہ شوکت و دبدبہ نہیں پایا جاتا۔

ولید بن مغیرہ مکے کا رئیس تھا۔ اس نے آنحضرت کو یہ آیت اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ، (بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے)، پڑھتے ہوئے سن کر کہا: اس بیان میں شیرینی اور حلاوت ہے۔ اس کا زیریں حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے اور بالائی حصہ پھلوں سے لدا ہوا ہے اور یہ انسان کا کلام نہیں۔

جب عتبہ بن ربیعہ حضور علیہ السلام کے پاس آیا تو آپ نے سورہ حٰمٓ السجدہ پڑھنا شروع کی۔ جب اس نے آیت:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُکُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝ (حٰم السجدہ، ۱۳)

(یعنی پھر اگر یہ منہ پھیر لیں تو کہہ دو کہ میں تم کو ایسی آفت سے ڈراتا ہوں جیسی عاد اور ثمود پر آفت آئی تھی)۔

سُنی تو اس نے آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ خدا کے لیے بس کیجیے۔ مجھ میں اس سے آگے سننے کی تاب نہیں۔ عتبہ واپس چلا گیا۔ جب اس کے ساتھی اس کے پاس آئے تو کہنے لگا: بخدا اس (پیغمبر) نے ایسا کلام پڑھا ہے کہ آج تک میرے کان میں نہیں پڑا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کلام کا کیا نام لوں؟

---

[۲۲] ایضاً، ص ۱۱

جبیر بن مطعم نے جب حضور کو سورہ طور کی یہ آیت پڑھتے سنا کہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ عذاب کی لپیٹ میں آگیا ہو، چنانچہ اس نے (اسی وقت) اسلام قبول کر لیا[۲۳]

چار قسم کا دعویٰ

قرآن نے چار قسم کا دعویٰ کیا ہے کہ اس کا پورا مثل بنا لائیں - ایسی دس سورتیں بنا لائیں - ایک سورت ہی بنا لائیں - ایسی ایک آیت اور ایک بات ہی بنا لائیں - فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ۝ (الطور : ۳۴)[۲۴] آخر کار اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے:

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝ (البقرہ : ۲۳، ۲۴)

اور اگر تم لوگ اس کلام سے جو ہم نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا ہے، شک میں پڑے ہو، پس اگر تم سچے ہو تو تم (بھی) ایک ایسا سورہ بنا لاؤ اور خدا کے سوا جو تمھارے مددگار ہوں ان کو (بھی) بلا لو۔ پس اگر تم یہ نہیں کر سکتے اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو، جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے اور کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے -

اعجاز کا باعث تصرف نہیں

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کا اعجاز تصرف کی وجہ سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو قرآن کی مثل لانے سے روک دیا ہے، ورنہ قرآن اپنی ذات کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے - اللہ نے یہ تصرف اس لیے کیا ہے کہ مقام نبوت و رسالت کا تحفظ کیا جا سکے - تاہم ان لوگوں کے نزدیک قرآن معجزہ ہی ہے، لیکن اس کا اعجاز اور لوگوں کی اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کی عدم استطاعت اس وجہ سے ہے کہ اللہ نے (ان کو اپنی قدرت سے) روک رکھا ہے - ان کے نزدیک یہ اس وجہ سے معجزہ نہیں ہے کہ اس کلام کی حد تک کوئی شخص پہنچ نہیں سکتا - انسانی طاقت سے بلند و بالا ہے -

---

۲۳ اردو دائرہ معارف اسلامیہ - ج ۱۶/۱، ص ۴۷۴

۲۴ محمد سبطین - جواہر العرفان - البرہان، ج ۱۵، شمارہ ۲ (۱۵ جنوری ۱۹۳۶)

اس دعوے کے باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کیوں کہ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول موجود ہے:

قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ (ہود: ۱۳)

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو بنا لیا ہے، تم یہ کہہ دو کہ ایسی سی بنی ہوئی دس سورتیں تم بھی لے آؤ اور اگر تم سچے ہو تو اللہ کے سوا تم جن جن کو بلا سکتے ہو بلا لو۔ پھر اگر وہ تمھارے کہنے کو منظور نہ کریں تو سمجھ لو کہ جو کچھ نازل کیا گیا ہے، خدا کے علم سے نازل کیا گیا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آخری جملہ بہت ظاہر ہے کہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے، کسی اور کی طرف سے ہرگز نہیں اُتارا گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ ۝ وَمَا يَنبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ۝ إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ ۝ (الشعرا: ۲۱۰ تا ۲۱۲)

اور اس قرآن کو شیاطین لے کر نازل نہیں ہوئے اور یہ کام نہ ان کے لیے مناسب تھا اور نہ وہ کر سکتے تھے۔ بلکہ وہ تو (وحی کے) سننے سے محروم ہیں۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝ (النسا: ۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کر سکتے اور (یہ خیال نہیں کرتے کہ) اگر خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو ضرور اس میں بڑا اختلاف پاتے۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور یہ ایسا کلام ہے جس کی مثل لانے سے لوگ عاجز ہیں اور یہ ایک عدیم المثال اور عظیم الشان معجزہ ہے۔

کتابیات

۱۔ الاعشیٰ، میمون بن قیس۔ دیوان۔ شرح و تعلیق محمد حسین۔ مکتبۃ الآداب (۱۹۵۰ء)

۲۔ الباقلانی، ابوبکر محمد بن الطیب۔ اعجاز القرآن۔ شرح و تعلیق محمد عبدالمنعم خفاجی قاہرہ۔ محمد علی صبیح، ۱۹۵۱ء

۳۔ حالی، الطاف حسین۔ مسدس (۳)۔ علی گڑھ۔ محمڈن پریس، ۱۹۶۲ء

۴۔ زبید احمد۔ ادب العرب۔ بریلی، نور بک ڈپو، ۱۹۲۶ء
۵۔ زیات، احمد حسن۔ تاریخ ادب عربی، ترجمہ عبدالرحمٰن طاہر سورتی۔ لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ ۱۹۶۱
۶۔ جمیل احمد رضوی۔ "قرآن معجزۂ رسالت ہے"۔ معارف اسلام، جلد ۲۰، شمارہ ۱ (اپریل ۱۹۷۴ء)،
ص ۲۳ - ۳۱۔
۷۔ علی نقی۔ شہید انسانیت۔ لکھنؤ، کتاب گھر (س۔ن)
۸۔ قرآن۔ القرآن الحکیم، ترجمہ فرمان علی۔ لاہور، شیخ محمد حسین اینڈ سنز (س۔ن)
۹۔ محمد حسین الطباطبائی۔ "الاعجاز فی القرآن الکریم"، عرض و تلخیص حسین الکورانی۔ الہادی (مجلہ)
جلد ۳، شمارہ ۱۔ ص ۶۹ - ۸۰۔
۱۰۔ ایضاً، جلد ۳، شمارہ ۴، ص ۱۱۶ - ۱۲۸
۱۱۔ محمد سبطین "جواہر العرفان"۔ البرہان، جلد ۱۵، شمارہ ۱۔ (۱۵ دسمبر ۱۹۳۵ء) ص ۱ - ۸
۱۲۔ عبدالباقی، محمد فواد۔ "المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم"۔ قاہرہ، دار الکتب المصریہ۔ ۱۳۶۴
۱۳۔ محمد مہدی۔ لوائح الاحزان۔ لاہور، شیعہ جنرل بک ایجنسی (س۔ن)، جلد دوم۔
۱۴۔ Quran. The Holy Quran, with English translation of the Arabic text and Commentary by S. V. Mir Ahmad Ali. Karachi, Muhammad Khaleel Shirazi, 1964

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک

علمِ کیمیا کی ترقی میں مسلمانوں کا حصّہ

مسلمانوں میں علمِ کیمیا کی ابتدا

عرب، زمانۂ جاہلیت میں شام اور دیگر قریبی ممالک میں تجارت کے لیے جایا کرتے تھے، اس لیے گمان کیا جاتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے پیشتر عرب کیمیا سے واقف تھے، لیکن اس دور میں ان کی معلومات کیا تھیں، اس بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

روایاتِ عرب بیان کرتی ہیں کہ اسلام میں علمِ کیمیا کا سب سے پہلا طالب علم خالد بن یزید بن معاویہ تھا۔ تختِ خلافت ترک کرنے کے بعد اس شخص نے علم و حکمت کی تحصیل و ترویج کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور پھر تمام عمر مختلف علوم کی تحصیل و تکمیل میں بسر کی۔ اس دور میں اسکندریہ کے عالم ماریئوس کی علمِ کیمیا میں بہت شہرت تھی۔ خالد نے اسے بلا بھیجا اور دھاتوں کی تبدیلی ۔ (TRANSMUTION OF METALS) کے بارے میں استفسارات کیے۔ ماریئوس نے خالد کو الاکسیر (ELIXER) کی تیاری کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ پھر خالد کو اس سائنس سے اتنا شغف ہو گیا کہ اس نے علمِ کیمیا پر یونانی کتب کے تراجم عربی زبان میں کرنے کا حکم دیا۔ خالد کے حکم سے یونانی مصنفین اسطوس (OSTOMES)، ڈیموقرائٹس (DEMOCRITUS)، زسیمس (ZUSIMUS) وغیرہ کی تصنیفات عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ خالد کی سرپرستی میں علمِ کیمیا نے بہت ترقی کی۔ دورِ حاضر کے بعض مفکرین اس روایت کو کہانی سے زیادہ وقعت نہیں دیتے اور ابن خلدون بھی "مقدمہ" میں ان ہی کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ عربوں کے علمِ کیمیا کا بیشتر حصہ یونانیوں سے ماخوذ ہے۔ عربوں کی تصنیفات میں یونانیوں کے اسما کثرت سے بطور حوالہ پیش کیے جاتے ہیں اور ان کے متعدد نظریات اور اصطلاحات بھی ایک دوسرے سے ملتی ہیں، تاہم عرب یونان کے اندھا دھند مقلد نہ تھے۔ انھوں نے یونانیوں سے علمِ کیمیا ضرور سیکھا لیکن تھوڑے ہی عرصے میں وہ خود اس علم میں مجتہدانہ حیثیت کے مالک ہو گئے۔ مسلمان علما نے یونانیوں کے کئی نظریات کی تردید کی اور ان کے مقابلے میں اپنے نظریات

پیش کیے ۔ جدید سائنس مسلمان حکما کو ہی صائب قرار دیتی ہے ۔ مسلمانوں نے یونانی علوم کے ذخیرے کو نہ صرف تباہی سے بچا کر تمدن جدیدہ کے بانیوں تک پہنچایا، بلکہ اس میں بیش بہا اضافے بھی کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اضافے مسلمانوں نے کیے وہ یونانی معلومات کی نسبت کہیں زیادہ اہم اور قابل قدر ہیں ۔

مسلمانوں نے یونانیوں کے علاوہ دیگر اقوام مثلاً چین اور ہندوستان سے بھی معلومات حاصل کیں اور ان سب کو ملانے کے بعد اپنی عقل و دانش کو معیار بنایا اور سائنس کی ترقی میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے ان یونانی معلومات کو مسلمانوں تک پہنچانے میں شامی عیسائی پیش پیش تھے ۔ اسی طرح یونانی علوم کے منتقل ہونے کا ایک ذریعہ فارس بھی تھا، جہاں جندی شاپور کا مدرسہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سرگرم عمل تھا ۔ مزید برآں حران کا گاؤں سکندریہ یونان کے دور ہی سے یونانی علوم و فنون کا مرکز چلا آتا تھا ۔ فارس نے اس سلسلے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں اور یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ مسلمان ماہرین کیمیا میں اکثریت اہل فارس کی ہے ۔

جابر بن حیان

مسلمانوں میں علم کیمیا کا سب سے بڑا ماہر جابر بن حیان (GEBER) ہے جو عرصہ دراز سے مغربی ممالک میں مشہور ہے ۔ جمال الدین القفطی صاحب تاریخ الحکما اور ابن ابی اصیبعہ صاحب طبقات الاطبا نے اس کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے ۔ پروفیسر ہولیمارڈ (HOLYMARD) اپنی کتاب میکرز آف کیمسٹری (MAKERS OF CHEMISTRY) میں لکھتے ہیں کہ جابر کا والد حیان کوفے کا رہنے والا تھا اور عطاری کا کام کرتا تھا ۔ اس کی ابتدائی زندگی تو گمنامی میں بسر ہوئی لیکن آٹھویں صدی (مسیحی) کی ابتدا میں اس نے بنو عباس کی دعوت کا بیڑہ اٹھایا جو بنو امیہ کی خلافت کو ختم کر کے خود حکومت و سلطنت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے ۔ حیان کو فارس روانہ کیا گیا ۔ جب وہ اور اس کی بیوی خراسان کے شہر طوس میں تھے تو جابر پیدا ہوا ۔ جابر کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد حیان کو قید کر لیا گیا، اس کے کچھ مدت بعد اسے قتل کر دیا گیا ۔ جابر واپس عرب لوٹا ۔ وہاں اس نے قرآن، حساب اور دیگر علوم کی تحصیل حربی الحمیری نامی ایک عالم سے حاصل کی ۔ ان دنوں بنو عباس تخت خلافت کے حصول میں کامیاب ہو چکے تھے ۔

جابر حضرت جعفر صادق کی خدمت میں بھی حاضر ہوا اور ان سے بھی تحصیل علم کی۔ جابر کے اساتذہ میں خالد بن یزید بن معاویہ اور حضرت جعفر صادق کے نام لیے جاتے ہیں، لیکن خالد بن یزید سے تلمذ کی روایت صحیح نہیں ہے۔

جابر اور برامکہ

چودھویں صدی کا مسلمان کیمیا دان الجلداقی لکھتا ہے کہ وزیر جعفر برمکی کے ذریعے جابر کی خلیفۂ وقت تک رسائی ہوئی، جس کے لیے اس نے ایک کتاب "دی بک آف بلاسم" (THE BOOK OF BLOSOM) لکھی، جس میں کیمیاگری کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ جابر ہی کی کوششوں سے یونانی علوم کی کتابوں کی دوسری قسط درآمد کی گئی۔ پہلی مرتبہ خالد بن یزید نے کتابیں منگوائی تھیں۔ اگرچہ جابر بن حیان کی زیادہ دلچسپی علمِ کیمیا سے تھی، تاہم وہ دیگر علوم میں بھی ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی مصنفات کی جو فہرست ابن الندیم کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے، وہ اس بات کا بین ثبوت ہے۔

جابر نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ کوفے میں بھی گزارا۔ یہاں اس نے ایک لیباٹری قائم کی۔ جابر کی وفات کے دو سو برس بعد ایک کھدائی کے دوران میں یہ لیباٹری دوبارہ ظاہر ہوئی۔

جابر بن حیان کے نظریات

فرانسیسی سائنسدان برتھیولٹ (BERTHEOLT) نے جابر کی جو کتابیں ترجمہ کی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ مادے کو انسانی خواص کا حامل تصور کرتا تھا۔ لیکن جن کا ہنوز ترجمہ نہیں ہوا، ان میں یہ تصور نہیں پایا جاتا۔ کیمیائی تحقیق کی نسبت جابر کے خیالات نہایت صحیح ہیں۔ اس کا ایک نظریہ دھاتوں کی ارضیاتی پیدائش کے متعلق بڑا دلچسپ ہے۔

جابر بن حیان یہ سمجھتا تھا کہ تمام فلزات (دھاتیں) ایک ہی قسم کے اجزا (گندھک اور پارہ) کے بنے ہوتے ہیں اور مختلف فلزات میں فرق صرف اتنا ہے کہ یہ اجزا ان میں مختلف مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی فلز کے اجزا کو علیحدہ کرنے کے بعد ان کو پھر کسی مقدار میں ملا سکیں تو جس فلز کو چاہیں پیدا کر لیں۔ فلزات کو ایک دوسرے میں تبدیل کرنے کی تحقیق عرصے تک جاری رہی۔ یہ خیالات موجودہ اصول سے کتنے دور سہی لیکن انھوں نے علمِ کیمیا کو بہت فائدہ پہنچایا، کیونکہ ان ہی کی بدولت وہ عملی تحقیقات ہوئیں جو بلا سونے کے لالچ کے ممکن نہیں تھیں۔ جس چیز کی تلاش تھی وہ نہ ملی، مگر وہ چیز بلاشبہ

مل گئی جس کی تلاش سونے کے لالچ کے بغیر ہرگز نہ ہوتی۔

جابر کی تحقیقات میں ایسے بہت سے مرکبات کا ذکر ہے جو اس سے قبل معلوم نہیں تھے، مثلاً شورے کا تیزاب (NITRIC ACID)، ماء الملوک (AQUARIGIA)، ملح القلی، نوشادر (AMONIUM CHLORIDE)، چاندی کا شورہ (SILVER NITRATE)، زیبق سلیمانی اور راسب الاحمر وغیرہ۔ اس نے کئی خالص کیمیائی مرکب تیار کیے۔ مثلاً بیسک لیڈ کاربونیٹ (BASIC LEAD CORBONATE)، سنکھیا (ARSENIC) اور انٹی منی (ANTIMONY) کو ان کے سلفائڈ یعنی گندھک سے حاصل کیا۔ اس کی تصنیفات میں سب سے پہلے کیمیائی عملیات مثلاً عرق کشی، تصعید، قلم بندی، پانی میں حل کرنے وغیرہ کا بیان ہے۔

کیمیا کے فنی استعمال پر بھی اس نے بیانات دیے۔ جیسے فلزات کی تیاری، پارچہ جات اور چرم کی رنگائی، وارنشوں کے ذریعے کپڑے کو واٹر پروف بنانا اور لوہے کو زنگ سے محفوظ کرنا، شیشے کو میگزاڈائے اکسائڈ سے رنگین بنانا۔ آئرن بائرائٹیز سے سونے پر لکھنا، سرکہ کشید کرنا وغیرہ۔ اس نے مشاہدے سے معلوم کر لیا تھا کہ مقناطیسیت پیدا ہونے سے جسم کے وزن میں فرق نہیں آتا۔

جابر بن حیان کی عظمت

اہلِ مغرب جابر بن حیان کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ پروفیسر ایڈورجی براؤن، موسیو لیبان اور تمام مستشرقین اور مورخین مغرب نے جابر کو تاریخ علم کیمیا کا ہیرو قرار دیا ہے۔ ہولیمار اور سارٹن کی رائے میں جابر ایک عظیم المرتبت کیمیا دان تھا۔ فرانس کا مشہور مستشرق برتھیولٹ (BERTHEOLT) جس نے جابر کی بہت سی کتابوں کو اڈٹ کر کے شائع کیا ہے، اپنی کتاب تاریخ الحکمافی قرون الوسطیٰ میں لکھتا ہے کہ جابر بن حیان کو کیمیا میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو ارسطو کو منطق میں ہے۔

سارٹن لکھتا ہے کہ عہدِ وسطیٰ کی سائنس میں جابر ایک بہت بڑی شخصیت کا مالک ہے۔

ابنِ زکریا رازی

جابر بن حیان کے بعد لوگوں میں علم کیمیا کی تحصیل کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ مختلف علما نے اس کی طرف توجہ کی۔ ذوالنون مصری جو صوفیا میں ایک بلند شخصیت کے مالک ہیں اور جاحظ جنھیں عربی ادب کا امام شمار کرتا ہے، علم کیمیا کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ لیکن جابر بن حیان کی وفات کے

بعد اسی درجے کا ماہر کیمیا پورے ایک سو سال بعد پیدا ہوا ۔ وہ ابوبکر محمد بن زکریا الرازی تھا جو ایک وقت طب، طبیعات اور کیمیا میں امام فن کا درجہ رکھتا ہے ۔

رازی ۸۶۶ء میں عراق میں پیدا ہوا، ابتدائی ایام میں اس نے موسیقی، ادب، فلسفہ، نجوم اور کیمیا کی تعلیم حاصل کی۔ جب اس کی عمر تیس برس کی ہوئی تو وہ علی بن سہل نامی یہودی النسل طبیب سے طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بغداد گیا۔ رازی بہت جلد اس فن میں اپنے استاد سے بازی لے گیا اور طب پر ایک سو سے زائد کتابیں تالیف کیں۔ البیرونی نے کیمیا پر رازی کی اکیس تصنیفات شمار کی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام کتاب صنعۃ الکیمیا، کتاب الاحجار، کتاب الاسرار، کتاب سر الاسرار، کتاب حجر الاصفر، کتاب التبویب اور کتاب الرد علی الکندی فی قولہ بامتناع الکیمیا ہیں۔

رازی تاریخ علم کیمیا میں خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اس کی مصنفات میں ہم پہلی مرتبہ مادوں کی صحیح تقسیم اور ان کے بارے میں صحیح حقائق سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس نے کیمیاوی آلات و اعمال کو وضاحت سے بیان کیا اور اپنے بیانات میں کسی پُر اسرار عنصر کی آمیزش کا ذکر نہیں کیا۔

رازی سے پہلے ماہرین علم کیمیا مادوں کو اجسام، ارواح اور جواہر سے تقسیم کرتے تھے لیکن رازی کیمیاوی مادوں کو جمادات، نباتات اور حیوانات میں تقسیم کرتا ہے۔ رازی نے لیبارٹری میں استعمال کیے جانے والے آلات کی ایک فہرست بھی اپنی ایک تصنیف میں دی ہے جو دو حصوں میں منقسم ہے ۔ (۱) وہ آلات جو دھاتوں کو پگھلانے کے لیے ضروری ہیں۔ (۲) وہ آلات جو انھیں ڈھالنے کے کام آتے ہیں۔ رازی کی پیش کردہ فہرست بہت مکمل ہے اور اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو دور حاضر کے (MANUAL OF LABORATORY ARTS) معمل کے آلات اور عملیات کی تشریح میں پایا جاتا ہے۔ (SLAPLITION) رازی کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ دنیا کے تمام ادوار کے مشہور ترین طالبان علم و حکمت میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے دور کا کوئی شخص اس کی رفعتوں کو نہیں پہنچ سکا۔

ابومنصور مؤفق

دسویں صدی عیسوی کے آخر میں ابومنصور مؤفق نے علم الادویہ (PHARMACOLOGY) پر ایک مفصل کتاب لکھی۔ یہ کتاب یونانی، ہندوستانی، عربی اور فارسی زبانوں میں موجودہ معلومات

کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ یہ کتاب طبی نقطۂ نظر سے لکھی گئی تاہم کیمیا کے اعتبار سے بھی یہ اہم معلومات کی حامل ہے۔ ابو منصور غالباً پہلا آدمی ہے جس نے سوڈیم کاربونیٹ اور پوٹاشیم کاربونیٹ میں تفریق کی۔ وہ سلسک ایسڈ (SOLICIC ACID) اور سرمہ (ANTIMONY) سے واقف تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ سرمہ سیاہ رنگ کی چیز ہوتی ہے، لیکن جب تازہ کٹا ہوا ہو تو دھات کی طرح چمکتا ہے۔ اسے تانبے اور سیسے کے مرکبات کے زہریلے اثرات کا علم تھا، وہ جانتا تھا کہ اَن بجھا چونا بال صاف کر دیتا ہے، وہ پلاسٹر آف پیرس کے اجزا اور علمِ جراحت میں اس کے استعمال سے بھی واقف تھا۔

ابو علی ابن سینا

ابو علی ابن سینا جو یورپ میں ایوی سینا (AVICENA) کے نام سے مشہور ہوا، فارسی النسل تھا۔ بخارا کے قریب ۹۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کا والد بلخ کا باشندہ تھا۔ ابن سینا نے بخارا میں تعلیم حاصل کی اور نہایت قلیل مدت میں اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل کیا۔ یہ بہت چھوٹی عمر ہی میں ملک عدم کو سدھار گیا، لیکن اس کے باوجود اس نے علم و حکمت کے وہ انبار یادگار چھوڑے ہیں جو اسے تمام ادوار کے علما کی صفِ اوّل میں جگہ دلانے کے لیے کافی ہیں۔ اس نے بیک وقت طب، ادب، فلسفہ اور سائنس پر کتابیں لکھیں۔

ابن سینا نے اپنی مشہور کتاب "کتاب الشفا" میں نیچرل سائنس پر مفصل بحث کی ہے۔ کتاب کے جزِ اوّل میں چٹانوں اور پتھروں کی تکوین اور دیگر جغرافیائی مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ ان ہی نتائج تک پہنچا ہے جن کی بعد میں لینارڈو (LEONARDO) اور السٹانو (NICH ULASTINO) نے تصدیق کی۔

کتاب کے دوسرے حصے میں دھاتوں اور معدنیات کے خصائص کا تذکرہ ہے۔ ابن سینا لکھتا ہے کہ معدنیات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) پتھر (۲) قابل اتحاد و آمیزش اشیا یعنی دھاتیں (۳) سلفرز (۴) نمکیات۔ دھاتوں کی بناوٹ اور اجزا کے بارے میں ابن سینا جابر کا تتبع کرتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ دھاتیں غالباً پارہ اور گندھک کے امتزاج سے بنتی ہیں۔ ابن سینا کیمیا گروں کے بلند بانگ دعاوی کا رد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کیمیا گر ایسی ٹھوس اشیا (SOLIDS) تو تیار کر لیتے ہیں جو اصل ٹھوس چیزوں (SOLIDS) سے مشابہت رکھتی ہیں لیکن ان کی کیمیاوی خصوصیات اصل سے نہیں ملتیں۔ دھاتوں کی تبدیلی (TRANSMUTATION OF MATALS) کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ یہ بات کیمیا گروں

کے بس کی نہیں کہ وہ ایک دھات کو دوسری دھات میں تبدیل کر سکیں۔ ہاں وہ صرف ان دھاتوں کی نقلیں تیار کر سکتے ہیں۔ مثلاً کسی سفید دھات کو رنگا اور سونے کی نقل تیار کر لی۔ یا کسی رنگ دار دھات کو سفید کر کے چاندی کی نقل تیار کر لی۔ لیکن رنگی ہوئی دھاتوں میں اصل ماہیت وہی رہتی ہے۔

دھاتوں کی تبدیلی (TRANMUTATION OF METALS) کے بارے میں یہ شکوک خاصے قدیم ہیں۔ بعض نے تو اسے غیر ممکنات میں سے سمجھا ہے اور بعض نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ایسا ممکن تو ہے لیکن یہ صرف جادو کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔ الجلداقی نے لکھا ہے کہ جابر کے زمانے میں بھی کیمیاگری کے بارے میں گہرے شکوک کا اظہار کیا گیا اور اسی بنا پر رازی کو، مخالفین کو مطمئن کرنے کے لیے ایک کتاب تالیف کرنی پڑی۔ درحقیقت اس دور کی معلومات کو مدنظر رکھتے ہوئے دھاتوں کی تبدیلی کا امکان مخالف نظریے کی نسبت زیادہ قابلِ قبول تھا۔

منصور الکمیلی

منصور الکمیلی قاہرہ میں مصری دارالضرب کا چیف کیمسٹ تھا۔ اس نے سونے کو صاف کرنے، پرکھنے اور کھودنے کے عملی طریقوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب نایاب ہے اور اس کا صرف ایک نسخہ موجود ہے۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ تیرھویں صدی کے عرب سونے اور چاندی کو نائیٹرک ایسڈ کے ذریعے صاف کرنے، چاندی کو پارے کے ساتھ ملا کر کھودنے اور سونے اور چاندی کے ٹکڑوں کی (QUANTITATIVE CHEMICAL ANALYSIS) سے واقف تھے۔ (PROBIER BUE CHELIN) اور (AGRICOLA) کی (DE RE MELTALLICA) میں جو سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھی گئی، منصور کے نظریات سے زائد کوئی چیز بیان نہیں کی گئی۔

مسلمہ بن احمد المجریطی

مسلمہ بن احمد المجریطی سپینی عربوں کے ایک روشن دماغ گروہِ فضلا کا سرخیل تھا، جنھوں نے الحکم الثانی کے دورِ خلافت میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ وہ اپنے دور کا سب سے بڑا حساب دان اور ماہرِ ہیئت و افلاک تھا۔ قرطبہ میں پیدا ہوا لیکن تعلیم کچھ عرصے تک دمشق میں حاصل کی اور وہیں اخوان الصفا سے متاثر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ رسائل اخوان الصفا کو یورپ میں اسی نے رائج کیا۔ وہ ایک اہم کتاب غایۃ الحکیم کے لیے مشہور ہے۔ مصنف کتاب ہذا غیر عملی کیمیا دان (ARM CHAIR CHEMIST) نہ تھا بلکہ لیبارٹری کے

آلات و اعمال سے بخوبی واقف تھا۔

مسلمہ کی کتاب میں ہم سب سے پہلے (MERCUSI COKIDA) کا ذکر پاتے ہیں اس نے مرکیورک آکسائڈ کی تیاری کے تجربے میں (QUANTITATIVE) طریق استعمال کیا، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس اہم اصول سے واقف تھا جسے کئی صدیوں بعد تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔ مسلمہ اپنی کتاب میں سلفر، پارہ JUTIA ALMUS, LAZWARD, JULE, MAGNESIA, MARCARITE اور دیگر اشیا کا تذکرہ کرتا ہے اور اس کے بعد سونے اور چاندی کو صاف کرنے کے طریقے بیان کرتا ہے۔

عربی علمِ کیمیا پر ایک نظر

جابر بن حیان سے پیشتر علم کیمیا غیر مرتب اور غیر محفوظ تھا۔ اس کے حقائق، جادوگروں اور علوم مخفیہ کے دعوے داروں کے دعووں میں گم ہو چکے تھے۔ جابر اور الرازی کی کاوشوں سے اس علم نے ایک صحیح صورت اختیار کی اور علم کیمیا ایک سائنس کی صورت میں ظاہر ہوا۔ علمِ کیمیا میں عربوں نے جو کچھ یونانیوں سے پایا تھا وہ بہت ہی کم تھا۔ وہ بڑے بڑے مرکبات جن میں یونانی بالکل ناواقف تھے، مثلاً الکحل، گندھک کا تیزاب، شورے کا تیزاب، ماء الملوک وغیرہ کو عربوں نے ہی ایجاد کیا۔ انھوں نے ہی کیمیا کے ابتدائی عملیات عرق کشی وغیرہ کو جاری کیا۔ عربوں ہی نے علم کیمیا میں تجرباتی پہلو پر خاص زور دیا اور بہت سی کیمیائی اشیا کو تلاش کیا اور ان کے خواص کا مطالعہ کیا۔ لیبارٹری کے عام عملیات مثلاً سلمیشن اور کلسینیشن (CALCINATION & SUBLIMATION) عمل تصعید (DISTILATION) عمل تقطیر (CRYSTALLISATION) عمل قلماؤ (SOLUTION) سولیوشن (REDUCATION) ریڈکشن وغیرہ کی عربوں نے تصحیح و تکمیل کی۔ دھاتوں کی (CUPELIATION) اور دیگر طریقوں سے صفائی کے کام کو نہایت بلند معیار تک پہنچا دیا۔ وزنِ مخصوص کے تجربات نہایت صحت کے ساتھ کیے۔

نظری اعتبار سے وہ مختلف دھاتوں کے ایک دوسرے میں بدل جانے کے قائل تھے۔ عربوں نے علمی تحقیقات کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی علوم سے حرفت میں کام لیا اور عملی معلومات کی وجہ سے اُن کے حرفت میں ایک نمایاں عمدگی پیدا ہوگئی۔ ان کے حرفتی نسخے تو ہم تک نہیں پہنچے، لیکن نتیجہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ وہ گندھک، تانبے، پارے، لوہے اور سونے کو کانوں سے نکالنا جانتے تھے، انھیں رنگنے کے فن میں بھی بہت کمال حاصل تھا اور انھوں نے فولاد کو آب دینے کے فن میں بھی بہت

ترقی کی تھی جیسا کہ ہمیں طلیطلہ کی تلواروں سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کی منسوجات، ہتھیار، دباغت کیے ہوئے چمڑے اور کاغذ تمام عالم میں مشہور تھے اور بہت سی حرفتوں میں ہم ان پر سبقت نہیں لے جا سکے ہیں۔

عربوں کی ایک بہت بڑی ایجاد بارود ہے۔ بہت ہی قدیم زمانے سے ایشیا کی اقوام مختلف قسم کی جلانے والی چیزیں لڑائیوں میں استعمال کرتی آئی ہیں۔ لیکن یہ ساتویں صدی عیسوی سے پہلے یورپ میں نہیں پہنچی تھیں۔ سلطنتِ مشرقی کے یونانیوں نے عربوں کے محاصرۂ قسطنطنیہ کے وقت ان آلاتِ حرب سے نہایت کامیابی کے ساتھ کام لیا اور قسطنطین نے ان آلات کے بنانے کا ایک ملکی راز کی طرح تحفظ کیا۔ لیکن یہ راز زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہ رہا۔ عربوں نے بہت جلد اس یونانی آگ کا راز معلوم کر لیا اور ان میں اس کا استعمال بڑھ گیا، لڑائی میں یہ نہایت اہم ہتھیار بن گیا۔ صلیبی جنگوں میں وہ اس کا استعمال کرتے رہے۔ اس یونانی آلات میں قوتِ نفوذ نہیں تھی۔ ایک مدت سے بارود کی ایجاد راجر بیکن کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ فی الواقع اس نے البرٹ اعظم کی طرح محض ان پرانے نسخوں کی تجدید کی، بالخصوص اس نسخے کی جسے مارکس گریکس نے اپنی کتاب میں درج کیا تھا۔ یہ نسخے اور اس کی مثل کے بہت سے نسخے ازمنۂ وسطیٰ کے عربوں سے ماخوذ ہیں۔

عموماً مؤرخین یہ لکھتے ہیں کہ توپ کا استعمال پہلے پہل ۱۳۴۶ء میں کریسی کی لڑائی میں ہوا لیکن مصنفینِ عرب کی مختلف تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ توپ اس سے بہت پہلے استعمال میں آ چکی تھی۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ بربریہ اور دیگر مصنفین نے اپنی کتابوں میں اس کی تصریح کی ہے۔

عربوں نے کاغذ سازی کے فن میں بھی بہت ترقی کی۔ بہت ہی قدیم زمانے سے چینی ایک قسم کا کاغذ ریشمی کپڑے سے بناتے تھے۔ یہ ایجاد اوائلِ سنین ہجری میں چین سے سمرقند آئی۔ جب عربوں نے اس شہر کو فتح کیا تو وہاں کاغذ کا کارخانہ موجود پایا۔ عربوں نے سب سے پہلے ریشم کی جگہ روئی سے کام لیا۔ ان کی پرانی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کاغذ کے بنانے میں بے انتہا ترقی کی اور ان سے بہتر کاغذ آج تک نہیں بنا۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ عربوں نے ہی چیتھڑوں سے کاغذ بنانا ایجاد کیا جو نہایت مشکل اور متعدد دست کاریوں کا محتاج ہے۔

مسلمانوں نے شیشے کے برتن بنانے میں بھی بہت کمال حاصل کیا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں وینس والوں نے بھی اس فن میں کارنامے انجام دیے۔ لیکن اُس دور کے مسلمان اہلِ کمال یورپ والوں سے بہت آگے تھے۔ دمشق، اسکندریہ اور قسطنطنیہ سے ان کی مصنوعہ چیزیں یورپ کے مختلف ممالک کو بھیجی جاتی تھیں۔

شیخ نذیر حسین

تاریخ الفخری

عربی کی کتبِ تاریخ میں کتاب الفخری ایک امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ اس کے مصنف صفی الدین ابو جعفر محمد بن علی طِقطقیٰ ہیں، جن کا سلسلۂ نسب اٹھارہ واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ ابراہیم طباطبا ہیں۔ طباطبا کی وجہِ تسمیہ یہ ہے کہ ابراہیم کے والد نے عید کے روز جب وہ بچے تھے، ان سے دریافت کیا کہ وہ کون سا کپڑا پہنیں گے تو تتلاہٹ کی وجہ سے ان کے منہ سے بجائے "قبا قبا" کے "طباطبا" نکلا۔ اس وقت سے ان کا یہ لقب ہو گیا۔[1]

مصنف کے والد کا نام علی اور لقب تاج الدین اور کنیت ابن طقطقی ہے۔ عربی میں طقطقہ کے معنی جلدی جلدی گفتگو کرنے یا بلا توقف بولنے کے ہیں[2]۔ مصنف کے والد ماجد کوفہ، حلہ اور بغداد میں سادات کے نقیب النقبا اور بہت دولت مند اور جاگیر دار تھے۔ ایک دفعہ ان کے یہاں سرکاری اراضی پر بہت غلہ پیدا ہوا، جسے انھوں نے اپنے مکان کی دیواروں میں بھر لیا۔ اگلے سال قحط پڑا تو انھوں نے یہ غلہ بہت گراں فروخت کیا۔ اس وجہ سے لوگ اس قحط کو ابن طقطقی کا قحط کہنے لگے۔ اس دولت مندی سے انھوں نے سرکاری حلقوں میں بڑا اثر و رسوخ پیدا کر لیا یہاں تک کہ انھوں نے سلطان اباقا خان سے اس کے وزیر عطا ملک جوینی کی شکایت کی۔ اس شکایت کا حال وزیر کو معلوم ہوا تو وہ اس کے اشارے سے ۱۰ھ میں قتل کر دیے گئے اور ان کا مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔[3]

ابن طقطقی سقوطِ بغداد کے چار سال بعد ۶۶۰ھ/۱۲۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہلاکو خاں خلافت عباسیہ کا خاتمہ کر چکا تھا اور دنیائے اسلام میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تاتاریوں کی ہیبت

۱۔ احمد بن علی الداؤدی — عمدۃ الطالب فی انساب آلِ ابی طالب — ص ۱۴۱، مطبوعہ بیروت۔

۲۔ دیکھیے Arabic English Lexicon : Edward Lane، بزیل مادہ طق۔

۳۔ عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب، ص ۱۴۷، ۱۴۸، مطبوعہ بیروت۔

جمائی ہوئی تھی۔ کسی شخص میں ان کے خلاف لب کشائی کی ہمت نہ تھی۔ باپ کے انتقال کے بعد ابن الطقطقی سادات کرام کا نقیب مقرر ہوا۔

۶۹۷ھ/ ۱۲۹۷ء میں انھوں نے مراغہ کا سفر کیا اور پانچ برس کے بعد موصل پہنچے۔ وہ تبریز جانا چاہتے تھے کہ موصل میں برف باری کے سبب رکنے پر مجبور ہو گئے۔ والیِ موصل فخر الدین عیسیٰ بن ابراہیم نے انھیں قیام پر مجبور کر کے اپنے بیش قیمت کتب خانے سے استفادے کی بھی اجازت دی۔ موصل کے قیام کے دوران ابن طقطقی نے تاریخ کی یہ کتاب تصنیف کی اور والیِ موصل کے احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے کتاب کا انتساب اس کی طرف کیا اور اس کا نام کتاب الفخری رکھا۔ ابن طقطقی نے ۷۰۲ھ/۱۳۰۲، ۱۳۰۳ء میں انتقال کیا۔ ان کی شہرت کا مدار اسی کتاب پر ہے، جس کا پورا نام الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ ہے، اس کا فارسی ترجمہ تجارب السلف کے نام سے ہندوشاہ بن سنجر نخچوانی نے ۷۲۳ھ میں کیا، جو کہ مشہور ایرانی فاضل عباس اقبال کی تصحیح اور تحشیہ سے ۱۳۴۳ء میں طہران سے شائع ہو چکا ہے۔ بقول ہندوشاہ اس تاریخ کا نام منیۃ الفضلاء فی تواریخ الخلفاء والوزراء ہے۔ اس نے تجارب السلف کے مقدمے میں لکھا ہے۔ "این کتاب کہ موسوم است بتجارب السلف در علم التواریخ جمع کردہ آمد و اکثر آن از کتاب منیۃ الفضلاء فی تواریخ الخلفاء والوزراء از مصنفات مرتضیٰ سعید ملک المحققین صفی الحق والملۃ والدین محمد بن علی العلوی الطقطقی رحمہ اللہ تعالیٰ کہ بجہت دار الکتب مخدوم زادۂ این ضعیف . . . جلال الدین زنگی شاہ را مغانی ساختہ است۔"[۱]

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ہی کتاب کے دو نام کیسے پڑ گئے؟ اس عقدے کو حل کرتے ہوئے عباس اقبال نے یہ تحقیق کی ہے کہ ابن طقطقی نے کتاب الفخری کا دوسرا نسخہ جو جلال الدین زنگی شاہ کے کتاب خانے کے لیے لکھا، شاید اس پر کتاب کا نام منیۃ الفضلاء فی تواریخ الخلفاء والوزراء لکھ دیا ہو۔

تاریخ الفخری کی قدر موجودہ زمانے میں مشرق سے کہیں زیادہ مغرب میں ہوئی۔ پہلی بار جرمن مستشرق اورٹ (Ahlwardt) نے ۱۸۶۰ء میں گوتھا (غوطا)، جرمنی سے ایک مفصل مقدمے کے ساتھ شائع کی۔ دوسری بار فرانسیسی فاضل (Derenbaurg) درانبورگ نے یہ کتاب نہایت آب و تاب اور مفید

---

[۱] کتاب مذکور، ص ۳

اشاریے کے ساتھ ۱۸۹۵ء میں پیرس سے شائع کی۔ ۱۹۱۰ء میں Emile Amar نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کر کے اہل علم کو تاریخ الفخری کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ یہ ترجمہ مغرب کے علمی حلقوں میں نہایت مستند سمجھا جاتا ہے۔ Whitting کا انگریزی ترجمہ (مطبوعہ لنڈن ۱۹۴۷ء) ناقص اور غیر معیاری ہے۔ الفخری متعدد بار قاہرہ اور بیروت سے بھی شائع ہو چکی ہے، لیکن یہ سب طباعتیں پیرس ایڈیشن کی نقل در نقل ہیں۔

الفخری ایک مقدمہ اور دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں علم اور کتاب بینی کے فوائد اور فضائل بیان کر کے فخر الدین حاکم موصل کے محامد و محاسن لکھے ہیں۔ پھر اس کے لیے اس کتاب کے تالیف کرنے کا ذکر کیا ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں میں نے دو باتوں کا التزام کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ امر حق کی رعایت کی جائے اور دوسرے یہ کہ زبان سلیس اور عام فہم ہو۔ پہلی فصل امور سلطنت اور ملکی سیاست کے متعلق ہے جو جرمن ایڈیشن کے ستر صفحات پر مشتمل ہے۔ ہم اس فصل کے بارے میں آگے چل کر کچھ لکھیں گے۔ دوسری فصل میں خلافت راشدہ سے لے کر آخری خلیفہ عباسی کا حال ہے۔ خلفائے امویہ و عباسیہ کے حالات کے ساتھ ان کے وزیروں کا بھی ذکر ہے۔ ابن طقطقی عربی زبان کے قادر الکلام انشا پرداز ہونے کے علاوہ فارسی زبان سے بھی آگاہ ہیں۔ تاریخ الفخری کا ماخذ زیادہ تر ابن الاثیر کی تاریخ الکامل ہے اور وزیروں کا حال زیادہ تر الصابی کی تاریخ الوزرا سے ماخوذ ہے۔

فصل اوّل بجائے خود انتظام سلطنت اور تدبیر مملکت پر ایک نہایت دلچسپ، دانش افروز اور پُر از معلومات مستقل تالیف ہے۔ ہم اس کو سیاست نامہ یا حکمرانوں کے لیے دستور العمل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں حکمرانی کے رموز اور حاکم و محکوم کے فرائض و واجبات دلچسپ پیرائے میں لکھے ہیں۔ ہر مسئلۂ زیر بحث کی مثال دلچسپ تاریخی واقعات اور حکایات سے دی گئی ہے، ضمناً آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے حوالے بھی مذکور ہیں۔ ایرانی حکما بزرجمہر، اردشیر اور انوشیروان کے اقوال بھی منقول ہیں۔ ابن طقطقی کے خیال میں ایک کامیاب حاکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ عفو اور درگزر سے کام لے، وہ کینہ اور حاسد نہ ہو بلکہ صبر اور حلم سے متصف ہو، رعب دار ہو، ایفائے عہد اس کا شعار ہو۔ شخص واحد کی عقل ملک کے انتظام و انصرام کے لیے کافی نہیں ہے، لہٰذا وہ اصحاب عقل و فہم سے مشورہ کرتا ہے۔

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے اصحاب سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ حاکم کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ ملک کی حفاظت کرے، سرحدوں کی پاسبانی کرے، راستوں کو محفوظ رکھے، شوریدہ سروں کی سرکوبی کرتا رہے، رعایا سے محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آئے۔ زورآوروں کے مقابلے میں کمزوروں کا دفاع کرے۔ وہ عالی ہمت اور کشادہ دل ہو، ملک گیری کا شائق ہو، عورتوں سے زیادہ میل جول نہ رکھے، رعایا سے علیٰ قدر مراتب سلوک کرے۔ جہاں تنبیہ اور فہمائش کافی ہو وہاں سزا نہ دے۔ سزا دیتے وقت نرمی اور رعایت ملحوظ رکھے، فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو تو سزا بلا تامل دے کیونکہ قصاص ہی میں زندگی ہے۔ حکمران کھیل کود اور موسیقی سے پرہیز کرے، ملکی راز کسی پر فاش نہ کرے اور علما اور حکما کی دلجوئی کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کا ذکر اور شکر ادا کرتا رہے۔

رعایا کو لازم ہے کہ وہ حکمران کی اطاعت کرے، کیونکہ عوام کی صلاح و فلاح تابعداری میں منحصر ہے۔ عوام کو چاہیے کہ وہ حکمران کی خیر خواہی کا دم بھرتے رہیں، اس لیے کہ دین ہی خیر خواہی ہے۔ وہ حکمران کی غیبت، بدخواہی اور بدگوئی سے احتراز کریں۔ سفیر کے لیے ضروری ہے کہ وہ عقلمند، امانت دار، پاک دامن اور اپنے مالک کا خیر خواہ ہو۔[۵۵]

فصل دوم میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لے کر آخری خلیفہ عباسی مستعصم باللہ تک تاریخ اسلام نہایت اختصار اور ایجاز مگر دلچسپ انداز سے مذکور ہے۔ اگرچہ مصنف کا میلان شیعیت کی طرف ہے، لیکن خلفائے راشدین کا ذکر احترام سے کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی حکومت دنیاوی بادشاہوں کے نمونے پر نہ تھی بلکہ علیٰ منہاجِ نبوت قائم تھی۔ ان کا لباس انبیا کا اور سیرت و طریقت اولیا کی تھی۔ وہ سادہ کھاتے تھے اور سادہ پہنتے تھے۔ ان کی یہ سادہ گزران کسی احتیاج یا ناداری کی وجہ سے نہ تھی، ان کا مقصد عامۃ المسلمین کو برابری کا احساس دلانا تھا تاکہ غربا اور فقرا دل شکستہ نہ ہوں۔[۵۶]

حضرت عمر کا یمنی چادر اور قمیص والا قصہ ان کی بے نفسی اور انصاف پسندی کے ثبوت میں بیان کیا ہے۔ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے صبر و حلم، ان کے تدبر و فراست اور ان کی دریا دلی اور اکابر قریش

---

۵۵ الفخری، ص ۱۸ تا ۸۳، گوتھا ۱۸۶۰ء

۵۶ کتاب مذکور، ص ۴۳، ۷۹۔

کے حسنِ سلوک کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں[۵۷]۔

اوّلین خلفائے عباسیہ کی سیرت اور اُن کے آئینِ جہاں داری کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ مابعد کے خلفا میں جو کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں اور معاشرے میں جو اخلاقی بگاڑ رونما ہو گیا تھا، اس کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ان کے وزرا کی خوبیوں اور خامیوں کو کھل کر بیان کرتے ہیں۔

ابن طقطقی سقوطِ بغداد کو آخری عباسی خلیفہ المستعصم باللہ کی آرام طلبی، عیش پسندی، گرد و پیش کے حالات سے بے خبری اور ناعاقبت اندیشی پر محمول کرتے ہیں۔ ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی فتح کے بعد مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی تھی، اس کی تفاصیل بیان کرنے کا مصنف کو یارا نہیں۔

تاریخِ وصاف، جامع التواریخ اور طبقاتِ ناصری کے مصنفین المستعصم باللہ کے وزیر مؤید الدین ابنِ علقمی کو ملک و ملت کا غدار قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ نظریہ ہے کہ ہلاکو خان نے عراق پر حملہ ابنِ علقمی کی تحریک سے کیا تھا اور وہ اندرونی طور پر ہلاکو سے ملا ہوا تھا، لیکن ابنِ طقطقی، ابنِ علقمی کے مداح اور [illegible] نظر آتے ہیں۔ شاید یہ اس وقت کے حالات کے دباؤ کا نتیجہ ہو۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی مرعوبیت اور احساسِ کمتری کا یہ عالم تھا کہ فتحِ بغداد کے بعد ہلاکو خان نے علما سے استفسار کیا کہ آیا کافر مگر عادل حکمران بہتر ہے یا مسلمان مگر ظالم سلطان؟ علما نے قدرے توقف کے بعد یہ فتویٰ لکھ دیا کہ عادل اور کافر حکمران، ظالم اور مسلم حاکم پر فضیلت رکھتا ہے[۵۸]۔

اس مایوسی اور شکست خوردگی کے عالم میں اربابِ تصوف نے ہمت نہ ہاری۔ وہ چپکے چپکے اشاعتِ اسلام میں مشغول رہے اور فتح مند تاتاریوں کے دل مہر و محبت سے جیتتے رہے تاآنکہ سقوطِ بغداد کے صرف سینتیس سال بعد (۱۲۹۵ء) میں ہلاکو خان کے چھوٹے جانشین غازان خان نے اپنے دس ہزار لشکریوں کے ساتھ اسلام قبول کر لیا اور اس کے بعد باقی ماندہ تاتار بھی مسلمان ہو گئے۔ اس میں علاء الدین عطا ملک جوینی (مصنف تاریخ جہان کشا) ان کے بھائی شمس الدین جوینی صاحب الدیوان اور رشید الدین فضل اللہ طبیب ہمدانی (مصنف جامع التواریخ) کی درپردہ مساعی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا [illegible] کے کاروبار پر حاوی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ تاتاری حکمران ان

---

۵۷ کتاب مذکور، ص [illegible]

۵۸ کتاب مذکور، ص ۱۹، ۲۰

کے علم و فضل، امانت و دیانت، وفاداری اور فرض شناسی اور حسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف مائل ہو گئے ہوں۔ تاریخ عالم کا یہ عجیب اور حیرت انگیز واقعہ ہے کہ وحشی اور خونخوار تاتاری جو اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کے لیے اُٹھے تھے، اسلام لانے کے بعد خود ہی مسلمانوں کے سرپرست اور محافظ بن گئے۔

پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

نسطوری عیسائی جو تاتاریوں کو عیسائی بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے، ناکام اور نامراد ہو کر رہ گئے۔ ان مختلف موثرات اور عوامل کا تجزیہ مشہور مورخ ٹائن بی نے اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے[۹] بہرحال ابن طقطقی نے اپنی زندگی میں اسلام کے دوبارہ عروج کا نظارہ کر لیا۔

سلوب بیان

الفخری کی مقبولیت اور اہمیت کی ایک بڑی وجہ اس کی عبارت کی سلاست، شگفتگی اور دلکشی ہے۔ فاضل مصنف اپنی شیریں بیانی سے تاریخی واقعات میں افسانے کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی رائے میں اس کا مطالعہ دیوان الحماسہ اور مقامات حریری سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز ہوگا۔ پروفیسر نکلسن کی رائے میں عربی سیکھنے کے لیے قرآن مجید کے بعد اس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں[۱۰]۔ الفخری کا فارسی ترجمہ تجارب السلف بھی سادہ بیانی کے لحاظ سے ممتاز ہے، لیکن یہ فصل اول، جو کہ سیاسیات ملک داری سے متعلق ہے، کے مطالب سے خالی ہے۔ اس کے بجائے فاضل مترجم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارکہ، آل بویہ اور سلاجقہ کے وزرا کے حالات اور بعض حکایات اور عربی اشعار اپنی طرف سے شامل کر دیے ہیں۔[۱۱]

۹ـه A Study of History، جلد دہم، ص ۶۷ تا ۷۲ - لنڈن ۱۹۵۴ء۔

۱۰ـه A Literary History of Arabs، ص ۴۵۴، ذیلی حاشیہ، مطبوعہ کیمبرج۔

۱۱ـه عباس اقبال، مقدمہ، تجارب السلف، ص ی و یا، طہران ۱۹۳۴ء۔

پروفیسر مظفر عباس

"نہج البلاغۃ" سے چند اقتباسات

امیر المومنین حضرت علیؑ کی تربیت درس گاہِ نبوتؐ میں ہوئی تھی اور یہ فضیلت ایسی ہے کہ کوئی اور اس میں ان کا ہم پلہ نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "ازالۃ الخفا" میں امام احمد بن حنبل کی یہ روایت نقل کرتے ہوئے کہ حضرت علیؓ کے جس قدر فضائل مذکور ہیں، کسی کے نہیں، یہ لکھا ہے کہ ان فضائل کی بنیاد حضور اکرمؐ کا تقرب و تربیت ہے۔

اس پس منظر میں جب کہ حضرت علیؓ کی فضیلتِ علمی پر آپؐ کی اس حدیثِ مبارکہ نے مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے ـــــ "انا مدینۃ العلم و علیٌ بابھا" حضرت علیؓ کی علمی فضیلت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ علومِ قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت علیؓ کے مقام کا اندازہ ان کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے۔ "میں ہر آیت کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ کہاں، کیوں اور کس کے حق میں نازل ہوئی"[۵۱]

نہج البلاغۃ، باب مدینۃ العلم، کے خطبات، ارشادات، ملفوظات، رقعات، احکامات اور پند و نصائح کا مجموعہ ہے، جس کے بارے میں حکمائے عرب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے ـــــ "تحت کلام الخالق، فوق کلام المخلوق" ـــــ (یعنی خالق کے کلام کے نیچے اور مخلوق کے کلام سے بالا ہے)۔ یہاں شیخ محمد عبدہٗ مفتیِ اعظم مصر کی رائے بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ نہج البلاغۃ طبع مصر کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"ماہرینِ عرب میں ہر شخص اس کا قائل ہے کہ اللہ اور رسولؐ کے کلام کے بعد علی ابن ابی طالب کا کلام اشرف کلام اور بلیغ ترین زبان ہے اور مواد کے اعتبار سے اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے بہت بلند ہے اور معنی کے لحاظ سے تو وہ جلیل ترین حقائق کا جامع ہے۔"[۵۲]

"نہج البلاغۃ" علوم و فنون کا ایک بحرِ ناپید اکنار، اور بے پایاں خزانہ ہے۔ دنیا اور عقبیٰ کی کوئی ایسی بنیادی چیز نہیں جس کی توضیح امیر المؤمنین نے ان خطبات میں نہ کی ہو۔ آپ نے پکار پکار کر لوگوں کو بلایا ہے اور اعلان فرمایا ہے:

---

۵۱ نہج البلاغۃ (اردو ترجمہ) طبع لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۹۸

۵۲ ایضاً، ص ۱۱

۵۳
اَیُّھَا الناس ! سلونی، سلونی، قبل ان تفقدونی ۔ فلانا بطرق السماء اعلم بطرق الارض۔

لوگو ! مجھے کھونے سے پہلے پوچھ لو کہ میں زمین کے راستوں سے زیادہ آسمانی راہوں سے واقف ہوں ۔

اس تمہید کے بعد اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے میں جناب امیر کے اس خطبے کا حوالہ دوں گا ، جس کا عنوان "دین اور دنیا" ہے ۔ "نہج البلاغۃ" کے دو سو انتالیس خطبات میں سے یہ خطبہ میں نے اس لیے منتخب کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے اس خطبے میں "دین اور دنیا" کی حقیقت واضح کرنے کے ساتھ ساتھ "صراطِ مستقیم" کی جانب راہنمائی کی ہے اور "صراطِ مستقیم" ہی درحقیقت اسلام کا دوسرا نام ہے ۔ اس خطبے کے سلسلے میں جامع "نہج البلاغۃ" علامہ سید رضیؒ کی یہ رائے انتہائی وقیع اور قابلِ ذکر ہے :

"اگر کوئی کلام لوگوں میں دنیا سے بے رغبتی پیدا کر سکتا ہے اور کارِ آخرت پر مجبور کر سکتا ہے تو وہ یہی کلام امام ہے ۔۔۔ اور صرف یہی کلام آرزوؤں کے رشتے قطع کرنے اور وعظ و پند کے چقماق سے آگ روشن کرنے کے لیے کافی ہے ۔"[۵۴]

امیر المومنین اس خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں :

"امابعد ! دنیا منہ موڑ چکی اور اپنے وداع کی اطلاع دے چکی اور آخرت نزدیک و آشکار ہو چکی ۔ آگاہ ہو جاؤ ۔ ! آج کا دن بدن کو چھریرا بنانے کا ہے اور کل کا دن دوڑ کے لیے مقرر ہو چکا ہے ۔ سامنے جنت ہے یا آخر کار دوزخ ! کیا تم میں کوئی ایسا نہیں کہ جو اپنی موت سے پہلے توبہ کر لے ؟ کیا کوئی ہے جو اپنے روزِ بد سے پہلے اپنے لیے کچھ (نیک) کام کر لے ؟

دیکھو ! آج تم امید اور آرزو کی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہو ، جس کے پیچھے موت ہے ۔ جس نے عہدِ آرزو میں ، موت کے آنے سے پیشتر نیک کام کر لیا ، اسے اس کے نیک عمل نے فائدہ پہنچا دیا ۔ اس کی موت اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی اور جس نے اپنے عہدِ آرزو میں موت کے آنے سے پہلے کوتاہی کی تو گویا اس کا عمل [اکارت] گیا ، اس کی موت اسے نقصان پہنچائے گی ۔

دیکھو ! راحت و غم کے زمانے میں اس طرح عمل کرو جس طرح خوف و دہشت کے عالم میں آدمی کر گزرتا ہے ۔ ہاں سچ تو یہ ہے کہ ! میں نے نہ تو جنت کی سی کوئی نعمت دیکھی جس کے مشتاق اس طرح خوابِ غفلت میں غرق ہوں اور نہ جہنم جیسا عذاب دیکھا جس سے بھاگنے والے یوں خوابِ خرگوش میں مبتلا ہوں ۔

---

۵۳ نہج البلاغۃ (اردو ترجمہ) طبع لاہور : ۱۹۶۳ء ، ص ۶۷۴۸

۵۴ ایضاً : ص ۱۹۸

خبردار! جسے حق نفع نہ پہنچائے گا، اُسے باطل نقصان پہنچا کر رہے گا اور ہدایت جس کی رہبری نہ کر سکے گی، اُسے گمراہی کھینچ کر ہلاکت کی منزل تک پہنچا دے گی۔ خبردار! تمھیں کوچ کا حکم دیا جا چکا ہے اور زادِ راہ کی طرف راہ نمائی بھی کر دی گئی ہے۔

مجھے تو تمھاری طرف سے دو چیزوں کی بہت فکر ہے، ایک خواہش نفس کی پیروی، دوسرے امیدوں کی فراوانی! ۔ دنیا سے وہ توشہ اپنے ساتھ لے کر (منزلِ آخرت کی طرف کوچ کرو) جس سے کل قیامت کے دن، اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے بچا سکو۔ ![55]

اس خطبۂ جلیلہ میں دنیا کی جو تصویر سامنے آئی ہے، اس کو دیکھ کر دنیا سے کراہت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ درسِ عبرت و موعظت کے ساتھ ساتھ ادبیت و عالمانہ بالغ نظری اس خطبے کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہے۔ دنیا کے بارے میں امیرالمومنین کا مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ آپ نے دنیا کو "کوڑھی کے ہاتھ میں سوئر کی بے گوشت ہڈی" سے تشبیہ دی ہے اور ان الفاظ میں اس سے خطاب کیا ہے :

"اے دنیا! میرے سامنے سے دور ہو! کیا مجھے اپنا چھب دکھاتی ہے؟ یا مجھ سے ملنے کا شوق ہے؟ تجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہو۔۔۔ دُور ہو کم بخت! میرے علاوہ کسی اور کو دھوکا دے، مجھے تیری کوئی ضرورت نہیں، میں نے تو تجھے تین طلاق دیے، جس کے بعد رجوع کی گنجائش ہی نہیں۔![56]

دنیا سے بے رغبتی پیدا کر کے حضرت علی نے آخرت کے لیے زادِ راہ اکٹھا کرنے کی ترغیب دی ہے اور یہی تمام تر اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

خطباتِ امیرالمؤمنین میں جہاں ایک طرف دنیا کی فلاح اور آخرت کے نیک انجام کی طرف راہنمائی کی گئی ہے، وہاں جدید دور کی تمام فکری الجھنوں کا حل بھی موجود ہے۔ ان خطبات میں علم و ادب کے مسائل، اخلاقیات کے درس، ادبِ عالیہ کے اصول، انسانی زندگی کے مسائل، امراض اور اُن کے علاج کے طریقے، حکومتیں اور ان کے مسائل کا حل، سیاسیات اور صحیح راہِ عمل، معاشی مسائل اور ان کا حل۔ غرض وہ تمام مسائل و موضوعات جن کا تعلق انسانی زندگی سے ہے، جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ جناب امیر کے ان اقوالِ زریں کی روشنی میں کامیاب و کامران زندگی گزارنے کا مکمل لائحہ عمل ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ لائحہ عمل جس کی بنیاد قرآنِ حکیم

---

[55] نہج البلاغۃ (اردو ترجمہ)، ص ۱۶۶ - ۱۶۷

[56] ایضاً، ص ۸۸۲

کے الفاظ میں یہ ہے: رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

یہاں میں حضرت امیر المومنین کے اقوالِ حکمت میں سے چند بلیغ و مختصر حصے پیش کرتا ہوں۔ ان مختصر جملوں میں زندگی کے مختلف مسائل کی نشاندہی کے علاوہ ان مسائل کے بارے میں راہنمائی کی گئی ہے اور یہی ان کا منصبِ حقیقی ہے:

(۱) حواسِ خمسہ کی حقیقت: "اس انسان پر حیرت کرو، چربی سے بولتا ہے، ہڈیوں سے سنتا ہے اور ایک شگاف سے سانس لیتا ہے۔"

(۲) زندگی گزارنے کا سلیقہ: "لوگوں سے اس طرح میل جول رکھو کہ اگر مر جاؤ تو روئیں اور اگر زندہ رہو تو تم سے ملنا چاہیں۔"

(۳) امیدیں: "جس نے اپنی باگ ڈور امیدوں کے ہاتھ میں دی، اس نے ٹھوکر کھائی۔"

(۴) گناہ سے خوف: "فرزندِ آدم! جب دیکھتے ہو کہ خدا برابر نعمتیں دے رہا ہے اور پھر تم گناہ کرو، تو ڈرو۔"

(۵) راز: "کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو دل میں کوئی بات چھپائے اور اس کی زبان کی اتفاقی گفتگو اور چہرے کے آثار چڑھاؤ سے ظاہر نہ ہو جائے۔"

(۶) زہد: "بہترین زہد، زہد کو چھپانا ہے۔"

(۷) حُبِّ علی: "اگر میں اپنی اس تلوار سے مردِ مومن کو سخت تکلیف دوں کہ وہ مجھے دشمن رکھے تو اس سے یہ نہ ہوگا اور اگر دنیا منافق پر نعمتیں برسا دے کہ مجھ سے محبت کرنے لگے تو وہ ہرگز مجھے نہ چاہے گا۔ بات یہ ہے کہ خدا نے رسول کی زبانی فیصلہ کر دیا ہے کہ حضرت نے فرمایا۔ علی تمھیں مومن دشمن اور کافر دوست نہ رکھے گا۔"

(۸) شریف اور کمینے میں فرق: "بھوکے شریف اور پیٹ بھرے کمینے سے ڈرو۔"

(۹) سخاوت: "سخاوت یہ ہے کہ مانگنے سے پہلے عطا ہو، لیکن جو سوال کے بعد ہے، وہ شرم کا تحفظ اور مذمت کا بچاؤ ہے، سخاوت نہیں۔"

(۱۰) مال: "مال خواہشات کا سرچشمہ ہے۔"

(۱۱) زبان: "زبان درندہ ہے کہ اگر چھوڑ دو تو کاٹ لے۔"

(۱۲) قناعت: "قناعت وہ مال ہے جو ختم نہیں ہوتا۔"

(۱۳) قائد : "جو شخص اپنے تئیں عوام کا قائد جتائے، اسے چاہیے دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے اپنی ذات کو تعلیم دے اور اس کا کردار اس کی زبان سے پہلے ادب سکھائے اور نمونہ دکھائے اور اپنے نفس کو مؤدب کرنے اور قابل بنانے والا دوسروں کو تعلیم دینے والے سے زیادہ قابل تعظیم و عزت ہے۔"

(۱۴) نفس : "انسان کا ہر نفس موت کی طرف ایک قدم ہے۔"[۵۷]

(۱۵) حکمت : "حکمت جہاں سے ملے لے لو، اس لیے کہ دانائی منافق کے دل میں بے چین رہتی ہے۔ یہاں تک کہ قلب مومن میں پہنچ کر اپنے مانند دوسروں میں جا ملتی ہے۔"

(۱۶) استغفار : "مجھے تعجب ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص توبہ کرتے ہوئے مایوس نظر آتا ہے۔" (اسی سلسلے میں ایک اور حدیث امام محمد باقرؒ نے امیرالمومنینؑ سے روایت فرمائی ہے) :

"زمین پر عذاب خدا سے دو پناہیں تھیں، ان میں سے ایک تو اٹھالی گئی، اب دوسری چیز سے وابستہ رہیں۔ وہ امان جو اٹھالی گئی، وہ ذات رسالت مآبؐ تھی اور وہ پناہ جو باقی ہے استغفار ہے۔"

(۱۷) حقیقت اسلام : "میں اسلام کی وہ تعریف کرتا ہوں جو مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کی۔ اسلام کے معنے ہیں تسلیم، تسلیم کا مطلب ہے یقین اور یقین تصدیق ہے اور تصدیق سے مراد ہے اقرار اور اقرار ادا اور ادا عمل کو کہتے ہیں۔"[۵۸]

(۱۸) صحت : "سردی کے آغاز سے بچو اور آخر میں جا ملو (یعنی بہت احتیاط کی ضرورت نہیں کیونکہ بدن عادی ہوجاتا ہے)۔ کیونکہ سردی جسم پر وہ عمل کرتی ہے جو درختوں پر کہ شروع میں جلادیتی ہے اور آخر میں پتے نکالتی ہے۔"

(۱۹) آخرت : "ہر ایک کو نتیجہ دیکھنا ہے۔ خوش گوار و شیریں، یا ناگوار اور ترش۔"

(۲۰) ہر کمالے را زوالے : "ہر آنے والا اقبال پلٹے گا۔ جو گیا وہ گویا کہ تھا ہی نہیں۔"

(۲۱) احتیاط : "اکثر یہ ہوا ہے کہ ایک لقمے نے کئی وقت کی غذاؤں کو روک دیا ہے۔"

(۲۲) طمع : "لالچ دائمی غلامی ہے۔"

---

۵۷ یہاں ذوق کا یہ شعر ملاحظہ ہو :

نفس کی آمد و شد ہے نماز اہل حیات   جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو

۵۸ یہاں کس حکیمانہ انداز سے مذہب کے عملی پہلو کی وضاحت کی گئی ہے۔

نہج البلاغہ سے چند اقتباسات

(۲۳) زراندوزی : " اے ابن آدم، یہ جو تو نے اپنی ضرورت سے زیادہ مہیا کیا ہے، اس کے لیے تو دوسروں کا خزانچی ہے۔ (یعنی تو خرچ نہیں کرتا تو دوسرے اڑائیں گے)۔

(۲۴) علم کی خاصیت : " ہر برتن اس سے بھر جاتا ہے جو اس میں رکھا جائے، سوائے ظرفِ علم کے کہ علم سے بڑھتا جاتا ہے۔"

(۲۵) ظلم : " قیامت کے لیے بدترین سامان بندگانِ خدا پر ظلم ہے۔"

(۲۶) عورت : " عورت سراپا آفت ہے، اور اس سے زیادہ آفت یہ ہے کہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔"

(۲۷) ذکرِ خیر : " دوسرے کی غیر موجودگی میں ذکرِ خیر کرو کہ تمھاری غیر حاضری میں تمھارا تذکرہ اچھے لفظوں میں ہوگا۔"

(۲۸) فلسفی : " فلسفی کی بات اگر ٹھیک ہوتی ہے تو دوا ہے اور اگر غلط ہوتی ہے تو مرض ہوتی ہے۔"

(۲۹) عقل : " دیکھنا، آنکھوں ہی سے نہیں ہوتا کہ یہ آنکھیں، آنکھ والے کو غلط بھی دکھاتی ہیں، لیکن نصیحت طلب آدمی کو عقل دھوکا نہیں دیتی۔"

(۳۰) محرومِ علم : " جب خدا کسی کو ذلیل کرتا ہے، علم اس پر حرام کر دیتا ہے۔"

(۳۱) محافظ : " موت کا ہی محافظ ہونا کافی ہے (کہ موت سے پہلے مر نہیں سکتا)۔

(۳۲) قرآنِ حکیم : " قرآن میں تمھارے اگلوں کی خبریں، پچھلوں کی باتیں اور تمھارے درمیانی احکام ہیں۔"

(۳۳) شرارت کا جواب : " پتھر جس طرف سے آئے، ادھر ہی پھینک دو کہ شرارت کا جواب شرارت ہے۔"

(۳۴) اصولِ کتابت : " دوات صاف رکھو، قلم کی زبان لمبی ہو، سطروں کا فاصلہ کافی اور حروف کو ملا کر لکھو (کٹے کٹے نہ ہوں) اس لیے کہ یہ بات خط و تحریر کے نکھار کا سبب ہے۔"

(۳۵) عذر کی عمر : " وہ عمر جس میں خدا انسان کے عذر قبول کرتا ہے وہ ساٹھ سال ہے۔"

(۳۶) دستِ سوال : " تمھارے چہرے کی آب ابھی باقی ہے۔ سوال اس کا جوہر نکال لیتا ہے تو یہ سمجھ لینا کہ اس کا جوہر کسے دیتے ہو۔"

(۳۷) سب سے بڑا گناہ : " (خدا کے نزدیک) سب سے بڑا گناہ وہ ہے جسے گناہ گار معمولی سمجھ لے۔"

(۳۸) اولاد : " بال بچوں کو اپنی سب سے بڑی مشغولیت نہ بناؤ کیونکہ اگر یہ خدا والے ہیں تو اللہ اپنے چاہنے والوں کو بے کار نہیں کرتا اور اگر دشمنانِ خدا ہیں تو کہاں تم اور کہاں خدا کے دشمنوں میں دل لگانا۔"

(۳۹) رزق : " روزی دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جسے تم تلاش کرتے ہو، دوسری وہ جو تم کو تلاش کرتی

ہے کہ اگر تم اس کے پاس نہ جاؤ تو وہ تمھارے پاس آجائے گی، تو سال بھر کی فکر آج ہی نہ کرو، ہر روز کے حالات اس دن کے لیے بہت ہیں۔"

(۴۰) حکومت: "حکومتیں انسانوں کے لیے میدان امتحان ہیں۔"

(۴۱) مومن کا وطن: "کوئی شہر (آبادی) تمھارے لیے دوسرے شہر سے زیادہ حق دار نہیں ہے۔ بہترین شہر وہ ہے جو تمھیں برداشت کرے۔"[۹]

(۴۲) تجارت: "جو بغیر علمِ فقہ تجارت کرے گا، وہ سود میں ڈوب جائے گا۔"

(۴۳) فضول مذاق: "جو شخص ایک مرتبہ بھی (فضول) مذاق کرتا ہے، وہ اپنی عقل کا ایک حصہ ختم کر دیتا ہے۔"

(۴۴) اشتہائے علم: "دو بھوکے ایسے ہیں، جن کا پیٹ نہیں بھرتا۔ طالبِ علم اور طالبِ دنیا۔"

(۴۵) دوستی: "جو تمھاری طرف مائل ہو، اس سے الگ رہنا قسمت کی کمی ہے، اور تمھارا اس کی طرف جھکنا جو تم سے کنارہ کشی چاہتا ہو، نفس کی ذلت ہے۔"

(۴۶) صبر: "جو چھوٹی مصیبت کو بڑا سمجھے گا، وہ اس سے بڑی بلاؤں میں گرے گا۔"

امیر المومنین کے اقوال زریں و ارشادات کا یہ مختصر انتخاب انسانی الجھنوں اور گوناگوں مسائل کے سلسلے میں مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ "مدینۃ العلم" کے کمالات و فضیلتِ علمی کی یہ محض ایک جھلک ہے۔ کیونکہ آپ نے اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کمیل بن زیاد سے فرمایا تھا:

"یاد رکھو! یہاں بے انتہا علم ہے، کاش اس کے اٹھانے والے مل جائیں۔"[۱۰]

(نہج البلاغۃ۔ ترجمہ: رئیس احمد جعفری، عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، نائب حسن نقوی۔

ناشر: شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور۔ (طبع اول)

۹ھ اس ارشاد کی روشنی میں علامہ اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی　　گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

۱۰ھ نہج البلاغۃ، (اردو ترجمہ)، ص ۸۹۸

ڈاکٹر محمد ریاض

کلامِ اقبال میں تغزل

تغزل یعنی مجازی عشق و محبت کے مختلف مراحل کا اظہار۔ اکثر شعرا کی غزل اور قصیدے کی تمہید نیز کئی دوسرے اصنافِ سخن میں تغزلانی مضامین کی فراوانی دیکھی جا سکتی ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں خصوصاً محبوب کی اداؤں، بے وفائیوں اور معاملہ بندیوں کے بیان میں بے حد زورِ قلم صرف کیا جاتا رہا ہے۔ اقبال ان معدودے چند استثنائی شعرا میں سے ہیں جن کا شعر پیغام اور جن کا ادب زندگی کے لیے مخصوص رہا۔ اس لیے ان کے کلام میں پیش پا افتادہ تغزل کے مضامین کی تلاش عبث ہے۔ ان کی اردو غزل اور دوسرے اصنافِ سخن میں تغزل تقریباً ناپید ہے۔ ہاں ان کی فارسی غزل میں بعض عمدہ نمونے ملتے ہیں، مگر ان کی کوئی ایک غزل یا دو بیتی یا قطعہ یا نظم تماماً تغزل نہیں۔ ایک یا چند بیت تغزل آمیز ہیں اور بقیہ خاص پیغام کے حامل ہیں، گو ان تغزل آمیز اشعار کی حقیقی تعبیر بھی ممکن ہے۔ اقبال کی اُردو اور فارسی غزل یوں بھی شاعرانہ روایات سے متفاوت ہے۔ انھوں نے مردّف یا مقفیٰ مطلع لکھنے کی پروا کی نہ مقطع میں ہر جگہ تخلص لانے کی۔ (اس کے برعکس ان کی نظموں اور دوبیتوں میں ان کا تخلص کئی جگہ موجود ہے!)۔ یہی حال اشعار کی تعداد اور اشعار کی معنوی رنگارنگی کا ہے۔ ان کی کئی غزلیں مسلسل ہیں اور غزلیاتِ رومی کی طرح ان میں کسی ایک جذبے کا اظہار مختلف اسالیب سے کیا گیا ہے۔ ان کے ہاں غزل کی زبان بے شک سلیس اور رواں ہے، مگر اس میں مضامین سب ہی آ گئے ہیں۔ وہ تغزل یا حقیقی و مجازی عشق کے اظہار کے لیے مخصوص نہ رہی۔ وہ وسیلۂ پیغام ہے۔ اقبال نے خود کہا ہے:

نہ زبان کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر میں ——— کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو ——— نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

بایں بہانہ درین بزم محرمے جویم ——— غزل سرایم و پیغامِ آشنا گویم

غزل آں گو کہ فطرت سازِ خود را پردہ گرداند ——— چہ آید زاں غزل خوانے کہ با فطرت ہم آہنگ است

در غزلِ اقبال، احوالِ خودی را فاش گفت — زانکہ این نوکافرازآئینِ دیگر آگاہ نیست

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی — کہ بانگِ صورِ سرافیل دل نواز نہیں

اقبال کے مشاہدہ، نکتہ آفرینی اور منظرکشی کی صلاحیتیں اعجاز نظر آتی ہیں۔ الفاظ اور معانی کا وہ حسین تناسب اور امتزاج کہ اس پر سبحان اللہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر انھوں نے اپنے شاعرانہ جوہر اپنے پیغام کے ابلاغ میں صرف کیے، منظرکشی اور تغزل میں نہیں۔ ابتدائی دور (بانگِ درا حصہ اوّل) میں انھوں نے انگریزی ادب سے منظوم اخذ و اقتباس اور ترجمے کے بعض نمونے پیش کیے۔ ان میں بھی ان کا بیانِ حکمت اور پیغام دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دوران آپ حسن کے ناظر تھے۔ یورپ کے قیام کے دوران آپ حسن کے نقاد بنے اور اس کے بعد حسن افروز:

میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں — کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں (نظر شمع)

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا — نقش ہوں، اپنے مصور سے گلا رکھتا ہوں میں (عاشقِ ہرجائی)

بہار برگِ پراگندہ را بہم بربست — نگاہِ ماست کہ بر لالہ رنگ و آب افزود (مے باقی)

اردو شاعری میں تغزل

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، اقبال کی اردو شاعری میں تغزل کے نمونے شاذ ہیں۔ (دراصل خودی، بیداری اور اتحاد و ترقی وغیرہ کے پیغام آور سے تغزل کی توقع رکھنا درست بھی نہیں)۔ بانگِ درا حصہ اوّل (۱۹۰۵ء تک کے کلام) میں داغ کے رنگ کی اس غزل کے چند ابیات معروف ہیں:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی؟ — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی؟

تمھارے پیامی نے سب راز کھولا — خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی؟

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا — تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی؟

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد — مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی؟

اس غزل کے بقیہ دو شعر دیکھیں۔ مقطع میں کسی قدر تعلی ہے، مگر دوسرے شعر میں ایک مشہور واقعے کو کس ندرت اور دلپذیر انداز میں بیان کیا گیا ہے:

کھنچے خود بخود جانبِ طور موسیٰ — کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی؟

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا — فسوں تھا کوئی، تیری گفتار کیا تھی؟

بانگِ درا کے اس حصے میں صوفی، ملا اور واعظ پر طنز یں تو ہیں، مگر تغزل کا کوئی دوسرا نمونہ قابلِ ذکر نہیں۔ دراصل اسی زمانے میں اقبال کو اپنی اُن قومی ذمہ داریوں کا احساس تھا، جنھوں نے بعد میں اُنھیں 'مصورِ پاکستان' اور 'حکیم الامت' بنایا۔ 'شاعر' کے عنوان سے یہ قطعہ اسی زمانے کا لکھا ہوا ہے:

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم — منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم — شاعرِ رنگین نوا ہے، دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ — کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

کتابِ مذکور کے دوسرے حصے کی غزلیات (قیامِ یورپ کے دوران کا کلام ۱۹۰۸ء تک) میں تغزل کا ایک شعر بھی نہیں۔ دراصل اس زمانے میں اقبال "وطنیت" سے گزر کر "ملیت" کی منزل میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ اب برصغیر کے مسلمانوں اور دوسرے باشندوں کے ہمدرد اور دلسوز رہتے ہوئے تمام مسلمانانِ عالم کی آزادی اور بیداری کے نقیب بھی بن گئے تھے۔ اسی دوران کی ایک غزل میں ان کا عزم جزم یوں بیان ہوا ہے:

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا، قافلہ مورِ ناتواں کا — ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا
کہا جو قمری سے میں نے اک دن، یہاں کے آزاد پا بگل ہیں — تو غنچے کہنے لگے، ہمارے چمن کا یہ راز دار ہوگا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے — میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو — شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

بانگِ درا کا حصہ سوم بھی تغزل سے تقریباً خالی ہے۔ ایک غزل کا مطلع ہے:

پھر بادِ بہار آئی، اقبال غزل خواں ہو — غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو

مگر اس غزلِ بہاری میں نئے عزائم کی خاطر شاعر نے اپنے آپ سے مسلسل خطاب کیا ہے اور بس۔

بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کے زمانے کا شاعرِ مشرق، تغزل کی طرف کیسے متوجہ ہوتا؟ اُسے اب لالہ کے حسن سے نہیں، اس کے 'سوزِ جگر' سے واسطہ ہے۔ ستارے کی چشمک زنی میں اسے محبوب کی ادائیں یاد نہیں آتیں، وہ اسے بیداری کا اشارہ قرار دیتا ہے۔ وہ اب حسیناؤں کو حنا (مہندی) کی بجائے خونِ جگر کی پیش کش کرتا ہے:

چمن میں رخصتِ گل شبنم سے تر ہے
سمن ہے، سبزہ ہے، بادِ سحر ہے

مگر ہنگامہ ہو سکتا نہیں گرم
یہاں کا لالہ بے سوزِ جگر ہے

تو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہیں بیدار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی؟
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

تغزل سے قطعِ نظر، شاعر کی نگاہ کا عمق اور اس کی منظر کشی کی صلاحیت اب بانگِ درا سے بھی کہیں زیادہ سحر آفریں ہے۔ مثلاً

بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی
شباب و مستی و ذوق و سرور و رعنائی

اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر، یہ فلکِ نیلگوں کی پہنائی

سفرِ عروسِ قمر کا عماریٔ شب میں
طلوعِ مہر و سکوتِ سپہرِ مینائی

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حسنِ بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کہسار

گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہیدِ ازل، لالہ خونیں کفن

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

فضا نیلی نیلی، ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی

اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گل، روز روز

"بالِ جبریل" میں خالص تغزل کے مجھے صرف دو شعر یاد ہیں :

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ وہ ادب گہِ محبت، وہ نگہ کا تازیانہ ؟

فارسی شاعری میں

مولانا شبلی نعمانی کی فارسی شاعری کی طرح اقبال کی فارسی شاعری بھی تغزل سے خاصی مالامال ہے۔ مولانائے موصوف کی اردو شاعری بیشتر قومی نظموں اور تاریخ اسلام کے بعض واقعات کے منظوم بیان پر مشتمل ہے۔ اس میں تغزل سرے سے مفقود ہے۔ البتہ کچھ بہاریہ اور توصیفِ حسن کے اشعار ضرور مل جاتے ہیں۔ ان کی فارسی شاعری میں بھی یہ سب کچھ ہے مگر غزلیں سراپا تغزل ہیں۔ اقبال کی فارسی غزل اور اس زبان کے دیگر اصنافِ سخن میں ان کے سارے ہی دلپذیر موضوعات ملتے ہیں، مگر تغزل بھی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ دراصل اسی تغزل کی چاشنی نے فارسی زباں حضرات کو اُن کے کلام سے مانوس کیا، اور اب وہ ان کے پیغام کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اقبال کا استحسانِ حسن، ان کا تغزل اور ان کے تلازماتِ غزل، اکثر شاعروں سے مختلف ہیں ـــ پروانے کے عشق کی انھوں نے بھی تعریف کی، مگر وہ چوں کہ دوسرے (شمع) کی حرارت کا عاشق ہے، اقبال اس پر کرمکِ شب تاب (جگنو) کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ موخر الذکر کی روشنی کو اپنی ہے۔ گلِ لالہ اپنے داغِ جگر کی بنا پر ان کا محبوب پھول ہے، مگر وہ نہ خود جلتا ہے نہ دوسروں کو سوزِ جگر دے سکتا ہے۔ اس لیے وہ بھی صوری محبوب ہی رہا۔ حسین، مظہرِ حسنِ ازلی ہیں۔ ان کی دید جذبۂ عشق کی افزائش کا باعث بنتی ہے، مگر ان سے وابستگی، دل کی امارت اور خودی کا ضعف ہے۔ اس لیے اصولی طور پر اقبال اپنے دَورِ پختگی میں نہ حسن و حسینوں کے دلدادہ ہو سکتے تھے، نہ دیگر مظاہرِ زیبائی کے عاشق۔ فرماتے ہیں :

مرا فرمود پیرِ نکتہ دانے ہر امروزِ تو از فردا پیام است
دل از خوبانِ بے پروا نگہدار حریمش جز باو دادن حرام است
مثلِ آئینہ مشو محوِ جمالِ دگراں از دل و دیدہ فروشوے خیالِ دگراں

ایک جملۂ معترضہ اور بھی لکھ دیں : اقبال کو خودی کے استحکام و حفاظت کی خاطر حسنِ ازلی کی شدید تر تجلیات سے بھی احتراز ہے :

اگر نظارہ از خود رفتگی آرد، حجاب اولیٰ نگیرد با من ایں سودا، بہا اندک گراں خواہی

نظر بخویش چنان بستہ ام کہ جلوہ دوست ــــ جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست

تھا "ارنی" گو کلیم، میں ارنی گو نہیں ــــ اس پہ تقاضا روا، مجھ پہ تقاضا حرام

ای کہ نزدیک تر از جانی و پنہان ز نگہ ــــ ہجرِ تو خوشترم آید ز وصالِ دگران

مئے باقی (غزلیات پیامِ مشرق)

اس سلسلے کے تغزل کے اشعار کتاب کی ترتیب کے مطابق حسب ذیل ہیں۔ (بعض اشعار میں حسن کے ماحول کی توصیف ملتی ہے) :

حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ گراں ــــ دلبراں، زہرہ وشاں، گل بدناں، سیم براں

در چمن قافلۂ لالہ و گل رخت کشود ــــ از کجا آمدہ اند این ہمہ خونیں جگراں ؟ (غزل ۲)

بر سرِ بام آ، نقاب از چہرہ بے باکانہ کش ــــ نیست در کوئے تو چوں من آرزومندے دگر

بسکہ غیرت می برم از دیدۂ بینائے خویش ــــ از نگہ بافم بہ رخسارِ تو روبندے دگر

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک ــــ بہرِ پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر (۳)

جادہ ز خونِ رہرواں، تختۂ لالہ در بہار ــــ نازِ کہ راہ می زند، قافلۂ نیاز را ؟

دیدۂ خوابناکِ او گر بہ چمن کشودۂ ــــ رخصتِ یک نظر بدہ، نرگسِ نیم باز را (۶)

بیا کہ ساقیِ گل چہرہ دست بر چنگ است ــــ چمن ز بادِ بہاراں، جوابِ ارژنگ است

حنا ز خونِ دلِ نو بہار می بندد ــــ عروسِ لالہ چہ اندازہ تشنۂ رنگ است (۸)

ہوای فرودیں در گلستاں میخانہ می سازد ــــ سبو از غنچہ می ریزد، ز گل پیمانہ می سازد (۱۰)

از ما بگو سلامے آں ترکِ تند خو را ــــ کآتش زد از نگاہے یک شہرِ آرزو را

این نکتہ را شناسد آں دل کہ دردمند است ــــ من گرچہ توبہ گفتم، نشکستہ ام سبو را (۱۱)

کو آن نگاہِ نازِ کہ اوّل دلم ربود ــــ عمرت دراز باد، ہماں تیرم آرزوست (۱۵)

باز بہ سرمہ تاب دہ چشمِ کرشمہ زائے را ــــ ذوقِ جنوں دو چند کن، شوقِ غزل سرائے را (۲۰)

حسرتِ جلوۂ آں ماہِ تمامے دارم ــــ دست بر سینہ، نظر بر لبِ بامے دارم (۲۲)

ای جانِ گرفتارم، دیدی کہ محبت چیست؟ ــــ در سینہ نیاسائی، از دیدہ بروں آئی

برخیز کہ فروردیں افروخت چراغِ گل ــــ برخیز و دمے بنشیں با لالۂ صحرائی (۲۶)

بیا کہ بلبلِ شوریدہ نغمہ پرداز است عروسِ لالہ سراپا کرشمہ و ناز است (۴۵)

مندرجہ بالا بعض اشعار میں فارسی شاعری کی روایات کے مطابق مے کانی شان جلوہ گر ہے خصوصاً تیسرے، پانچویں، پندرھویں اور سترھویں شعر میں، جنھیں کسی مصور کا موئے قلم بھی اس سے بہتر ابھار نہیں کر سکتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مصوری، شاعری سے مات کھا جاتی ہے۔

"زبورِ عجم" کے بعض تغزل آمیز اشعار

اقبال نے "بالِ جبریل" میں کہا ہے:

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

"زبورِ عجم" اقبال کی فارسی غزل کا نقطۂ عروج ہے۔ اس میں فلسفہ و شعر کا بے حد حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ (اس کتاب کے بعد اقبال نے فارسی میں چند غزلیں ہی لکھی ہیں!)۔ یہاں ہم اس کے دونوں حصوں کے بعض تغزل والے اشعار (بترتیبِ کتاب) نقل کرتے ہیں:

دی مغبچۂ با من اسرارِ محبت گفت اشکے کہ فرو خوردی از بادۂ گلگوں بہ
از چشمِ ساقی، مستِ شرابم بے مے خرابم، بے مے خرابم
شوقم فزوں تر از بے حجابی بینم نہ بینم، در پیچ و تابم
یاد ایامے کہ خوردم بادہ ہا با چنگ و نے جام در دستِ من، مینائے مے در دستِ وے
آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست؟ یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے[۱]
فرصتِ کشمکش مدہ این دلِ بے قرار را یک دو شکن زیادہ کن، گیسوئے تابدار را
بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را
ز مشتاقاں اگر تابِ سخن بردی نمی دانی محبت می کند گویا نگاہِ بے زبانے را
تو ہم بہ عشوہ گری کوش و دلبری آموز اگر ز ما غزلِ عاشقانہ می خواہی
دگر آمادہ دلبہائے یار، نتواں گفت نشستہ بہ سرِ بالینِ من، ز درماں گفت

---

[۱] اس شاہکار مصرع کی ترکیبوں کو (خصوصاً بزمِ شوق اور یک چمن گل) ایران اور پاکستان سے شائع ہونے والے بعض مجلّوں، مقالوں اور کتابوں کا نام بنایا گیا ہے۔

ہر نگاری کہ مرا پیشِ نظر می آید ... خوش نگارے ست ولے خوشتر ازاں می بایست[۵۱]

اس کتاب میں سے معنوی عشق پر مشتمل دو غزلوں کا انتخاب بھی ملاحظہ ہو - پہلی خدا کے ساتھ انسان کی محبت کی مظہر ہے اور دوسری خدا کی اپنی مخلوق کے ساتھ وابستگی کی :

خوشتر ز ہزا پارسائی ... گاہے بطریقِ آشنائی
در سینۂ من دمی بیاسائی ... از محنت و کلفت خدائی
ما را ز مقام ما خبر کن ... ما ئیم کجا و تو کجائی
آن چشمکِ محرمانہ یاد آر ... تا کے بہ تغافل آزمائی ؟

ما از خدای گم شدہ ایم، او بجستجوست ... چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزوست
گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیام خویش ... گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہاؤ ہوست
در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما ... چندان کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگوست
آہے سحر گہی کہ زند در فراقِ ما ... بیرون و اندروں، زیر و زبر و چار سوست
ہنگامہ بست از پئے دیدار خاکئے ... نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بوست

---

[۵۲] ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ... دیکھیے کہ اب ٹھہرتی ہے جا کے نظر کہاں (حالی)

مجمع البحرین : (شیعہ سنی متفق علیہ احادیث) : از مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

یہ کتاب وحدتِ امت کی طرف ایک اہم قدم ہے - اس میں وہ احادیث و روایات جمع کی گئی ہیں جو شیعہ اور اہلِ سنت کے درمیان متفق علیہ حیثیت رکھتی ہیں شروع میں علامہ مفتی جعفر حسین مجتہد کا تعارف و تبصرہ اور علامہ نصیر الاجتہادی کی تقریظ ہے -

صفحات : ۲۲۲ + ۲۸ ... قیمت : -/۹ روپے

ملنے کا پتا :- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِيَ بِلَبَنٍ قَدْ شِيْبَ بِمَاءٍ وَعَنْ يَمِيْنِهٖ اَعْرَابِيٌّ وَعَنْ يَسَارِهٖ اَبُوْبَكْرٍ فَشَرِبَ ثُمَّ اَعْطَى الْاَعْرَابِيَّ وَقَالَ اَلْاَيْمَنَ فَالْاَيْمَنَ۔

(جامع ترمذی۔ ابواب الاشربۃ۔ باب ما جاء ان الایمنین احق بالشرب)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دودھ پیش کیا گیا، جس میں پانی ملایا گیا تھا۔ آپ کے دائیں جانب ایک اعرابی بیٹھا تھا اور بائیں جانب حضرت ابوبکر تشریف فرما تھے۔ حضور نے پہلے خود دودھ پیا، پھر اعرابی کو دیا، اور فرمایا، دائیں جانب سے شروع کرو، دائیں جانب سے شروع کرو۔

اسلام، اونچ نیچ یا ذات پات کا قائل نہیں ہے، نہ وہ کسی کو بلا وجہ تکریم یا تخصیص کا مستحق گردانتا ہے، نہ کسی کی توہین یا تذلیل کرتا ہے، نہ کسی کو بلا سبب کسی پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ انسانیت کا دین ہے، اس کے کچھ اصول ہیں اور کچھ قواعد اور قوانین ہیں، جن کو وہ ہر موقع پر لائقِ عمل اور قابلِ اتباع قرار دیتا ہے۔ اس کی نظر میں گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر، آقا کو غلام پر اور مالک کو مزدور پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اس نے انسان کی جان پرکھ اور اس کے اکرام و احترام کا ایک پیمانہ مقرر کر رکھا ہے، جو شخص اس پیمانے پر پورا اترتا ہے، وہ اس کے نزدیک اوّلیت کا مستحق ہے۔

اس حدیث کو دیکھیے، یہ حدیث چند الفاظ پر مشتمل ہے، لیکن اس میں ایک نہایت عمدہ بات کی وضاحت کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کسی صحابی نے دودھ پیش کیا، جس میں پانی کی آمیزش تھی، اس وقت بارگاہِ رسالت میں جو لوگ حاضر تھے، ان میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی تھے اور ایک اعرابی بھی تھا، جسے بدو، دیہاتی یا گنوار کہا جاتا ہے۔ اتفاق سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور کے بائیں جانب بیٹھے تھے اور بدو یا دیہاتی دائیں جانب تھا۔ آپ نے دودھ پیا۔ اس کے بعد حاضرینِ مجلس میں اسے تقسیم کرنا شروع فرمایا۔ آپ نے سب سے پہلے دودھ بدو کو دیا،

کیوں کہ وہ آپ کے دائیں جانب بیٹھا تھا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بعد میں دیا، اس لیے کہ وہ آپ کے بائیں طرف بیٹھے تھے۔ ساتھ ہی آپ نے زور دے کر دو مرتبہ فرمایا، دائیں جانب سے شروع کرو، دائیں جانب سے شروع کرو۔

یہ حدیث اپنے الفاظ، معنی اور مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ یعنی اس میں صراحت کے ساتھ اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ آپ مجلس میں کوئی چیز تقسیم کرنے لگیں تو دائیں طرف سے شروع کریں۔ وہ چیز کھانے پینے کی ہو یا کسی اور استعمال میں آنے والی ہو۔!

تقسیم کرتے وقت یہ ہرگز نہ دیکھنا چاہیے کہ بائیں جانب کوئی بڑی شخصیت تشریف فرما ہے اور دائیں طرف کوئی کم حیثیت کا آدمی بیٹھا ہے، لہٰذا پہلے بڑے کا حق بنتا ہے، نہیں! اس میں بڑے چھوٹے کا کوئی لحاظ نہیں ہے۔ اندازہ فرمایے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مجلس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف رکھتے ہیں جو ذاتی طور پر بھی بہت بڑی حیثیت کے مالک ہیں، اسلامی معاشرے میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بھی ان کو انتہائی قدر و منزلت حاصل ہے اور آپ ان کو بے حد احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ دوسری طرف ایک اعرابی اور بدو بیٹھا ہے، جو ظاہر ہے، اس مرتبے کا حامل نہیں ہے، لیکن کوئی چیز تقسیم ہوتی ہے تو آنحضرتؐ اس بدو کو پہلے عنایت فرماتے ہیں اور صدیق اکبرؓ کی باری بعد میں آتی ہے۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ بدو، آپ کے دائیں جانب بیٹھا ہے اور صدیق اکبر بائیں جانب ہیں۔! پھر حضور، ارشاد فرماتے ہیں کہ الایمن فالایمن!! دائیں جانب سے شروع کرو! دائیں جانب سے شروع کرو۔!!

ہمارے معاشرے میں عام طور پر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ تقسیم اشیاء کے وقت دائیں بائیں کا خیال نہیں رکھتے، بلکہ شخصیت کا خیال رکھتے ہیں، اور اس طرف سے شروع کرتے ہیں، جس طرف معاشرتی اعتبار سے کوئی بڑا آدمی بیٹھا ہو۔ یہ بات اسلامی آداب اخلاق کے منافی ہے۔ اسلامی طریقہ یہ ہے، جس پر خود آنحضرتؐ نے عمل کرکے دکھایا کہ دائیں جانب سے کوئی چیز دینا شروع کیجیے۔ اگرچہ اس طرف معاشرتی لحاظ سے کوئی کم حیثیت کا آدمی بیٹھا ہو۔

علمی رسائل کے مضامین

بینات، کراچی — فروری ۱۹۸۰

غصب شدہ جائداد کا انگریزی قانون	مولانا مفتی عبدالسلام
قانون اور اسلامی زندگی کی تعمیر	جناب محمد زکریا بھٹی

ترجمان الحدیث، لاہور — فروری ۱۹۸۰

بنک کا سود	مولانا عبدالرحمٰن کیلانی
رسول اکرمؐ — بحیثیت سماجی رہنما	حافظ منظور احمد ایم اے
فقہاء و محدثین	مولانا ارشاد الحق اثری

تعلیم القرآن، راولپنڈی — فروری ۱۹۸۰

مرکزِ اسلام کے خلاف بغاوت (مسلسل)	ڈاکٹر خالد محمود
تحقیقِ بنات النبی صلی اللہ علیہ وسلم	جناب عطاء الرحمٰن رحمانی

الحق، اکوڑہ خٹک — جنوری ۱۹۸۰

مولانا ابوالکلام آزاد اور پاکستان — تصویر کا ایک حقیقی رُخ	ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی
اندلس کے ایک متمول گھرانے کا کتب خانہ	جناب احمد خاں ایم اے
محدث و شیخ مولانا سید فضل اللہ جیلانی	ڈاکٹر غلام محمد

العلم، کراچی — جولائی تا دسمبر ۱۹۷۹

قراردادِ پاکستان کا تعلیمی اور سیاسی پس منظر	سید الطاف علی بریلوی (علیگ)
جسٹس طفیل علی عبدالرحمٰن مرحوم	تحریر: حسن علی عبدالرحمٰن بار ایٹ لا ترجمہ: خواجہ نوید احمد ایڈووکیٹ
اردو میں عربی کا ذخیرۂ الفاظ	حکیم مطیع الرحمٰن قریشی
قومی ادب میں بیداری کے اسباب	ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی
دولتِ سامانیہ	پروفیسر رحمت فرخ آبادی

مولانا شاہ عبدالحلیم صدیقی	جناب محمد حنیف ازہر
برصغیر کا ایک عظیم مجاہد ـــ ٹیپو سلطان شہید	جناب احسان اللہ شریف (علیگ)
پروفیسر ڈاکٹر طاہر فاروقی مرحوم	جناب محمد صادق قصوری
مولانا درد کاکوروی	حکیم مرزا محمد باقر لکھنوی
علامہ رضا علی وحشت کلکتوی	جناب سید عالم

الفرقان، لکھنؤ ـــ جنوری ۱۹۸۰

مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت اور اب میرا موقف	مولانا محمد منظور نعمانی

فکر و نظر، اسلام آباد ـــ جنوری ۱۹۸۰

عظیم ترین معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم	ڈاکٹر عبدالواحد ہلے پوتا ترجمہ پروفیسر کرم حیدری
ہادیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم	ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی
شرعِ محمدی اور دنیا کے دیگر قوانین	سراج احمد فاروقی

فکر و نظر، اسلام آباد ـــ فروری ۱۹۸۰

نبیِ اکرمؐ بحیثیت معلم اخلاق	پیر محمد کرم شاہ
اسوۂ حسنہ کی روشنی میں اسلامی شریعت	مولانا عبدالقدوس ہاشمی
بلوچستان میں اشاعتِ اسلام و ادبیاتِ سیرت	ڈاکٹر انعام الحق کوثر
عربی نعت کا دورِ اول ـ بعثت سے ہجرت مدینہ تک	ارشاد شاکر اعوان
حُبِ رسولؐ کی دینی اہمیت	سید محمود احمد رضوی
سیرۃ النبی کے عملی تقاضے	جی، اے، حق محمد

معارف، اعظم گڑھ ـــ دسمبر ۱۹۷۹

سنائی کا مذہب	ڈاکٹر نذیر احمد
راجہ جے سنگھ کی رصدگاہیں	جناب شبیر احمد خاں غوری
ابن جُلجل ـــ ایک مورخ طبیب	جناب اطہر ریحان فلاحی
شاہ اسد الرحمٰن قدسی	جناب محمود الرحمٰن

اپریل ۱۹۸۰ء

المعارف
علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے
سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر
S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971
جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

المعارف لاہور

جلد ۱۳ | اپریل ۱۹۸۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ | شمارہ ۴

ترتیب

تاثرات

علامہ اقبال انیسویں صدی کے عظیم مفکر اور نامور مدبر تھے۔ انھوں نے امتِ مسلمہ کی جس اسلوب سے خدمت کی اور جس لب و لہجے میں اپنی بات مسلمانوں تک پہنچائی، وہ انھی کا حصہ تھا۔ انھوں نے اپنے دردِ دل کا ایسے الفاظ میں اظہار کیا کہ ہر شخص اس سے متاثر ہوا۔ ان کا پیغام علاقائی یا ملکی نہ تھا، بلکہ ہمہ گیر اور وسعت پذیر تھا۔ پھر وہ ایک خاص وقت یا زمانے تک محدود نہیں، بلکہ اس کی حدیں دُور دُور تک پھیلی ہوئی اور وقت و زمان کے قیود اور علاقہ و ملک کے حدود سے ماورا ہیں۔

اقبال جامع الحیثیات شخصیت کے مالک تھے اور ہر گوشۂ علم پر ان کی نظر تھی۔ انھوں نے الٰہیات کے اساسی مسئلے پر بحث کی، اسلامیات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا، سیاسیات کے ضروری نکات کی صراحت فرمائی، فلسفے کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا، تاریخ کے مبادیات اور اصولِ مباحث کو ہدفِ فکر ٹھہرایا۔ غرض انھوں نے ہر ضروری بحث اور پیش آئند مسئلے کو مرکزِ التفات قرار دیا اور جس مقام کی توضیح و تشریح کی ضرورت محسوس کی، اپنے نقطۂ فکر کے مطابق اس کو خوب منقح کیا۔

انھوں نے اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے لیے نظم کا ذریعہ بھی اختیار کیا اور نثر کا بھی، اور دونوں میں نہایت عمدگی، صفائی اور فیصلہ کن انداز میں مخاطب ہوتے۔ ان کی ذہنی بلندی اور فکری بالیدگی کا ہر شخص کو اعتراف ہے۔ ان کا اس صدی کے مسلمانوں پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ ان کو اس راہ پر گامزن کیا جسے وہ طویل عرصے سے یا تو بھول چکے تھے یا کسی وجہ سے ترک کر چکے تھے۔ اقبال نے ان کے کانوں میں وہ صور پھونکا کہ جس سے وہ تڑپ اُٹھے اور اپنے نقصان اور فائدے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوئے۔

انھوں نے ایک خاص فلسفہ حیات پیش کیا اور اس کے لیے مؤثر ترین پیرایۂ اظہار اختیار فرمایا۔ پھر اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں بیداری کی ایسی شدید لہر اٹھی کہ ان کے قلب و روح کی دنیا بالکل بدل گئی۔ ایک "جہانِ نو" کروٹ لینے لگا اور "عالمِ پیر" کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔

ان کے پیغامِ پُر تاثیر اور اعلانِ حق ہی کا نتیجہ ہے کہ اس برصغیر میں پاکستان کے نام سے مسلمانوں کی ایک

نئی مملکت معرضِ وجود میں آئی اور وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا، جو وہ ایک مدتِ مدید سے دیکھ رہے تھے۔
مملکتِ پاکستان کے قیام کا مقصد، فقط اس تہذیب اور ثقافت کو اجاگر کرنا تھا، جو مسلمانوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھی تاکہ وہ اس ترقی یافتہ دور میں اپنے علوم و فنون کی کھل کر اشاعت کر سکیں اور اس روشنی سے پوری دنیا کو از سرِ نو روشناس کرا سکیں، جو اُن کے اسلاف کا اصل سرمایۂ حیات تھا۔ حالات کی روشنی میں اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کے فروغ اور کتاب و سنت کے بنیادی احکام کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مشغولیت کا اصل ذریعہ یہی مملکتِ خداداد ہو سکتی تھی اور اقبال یہی چاہتے تھے۔
۲۱ اپریل ۱۹۸۰ کو اقبال کی وفات پر بیالیس برس گزر گئے اور پاکستان کو قائم ہوئے تبیس سال کا عرصہ بیت گیا مگر وہ مقاصد پوری طرح تکمیل کی منزل میں داخل نہ ہوئے جو اقبال کے پیشِ نگاہ تھے۔
اقبال کی تعلیم میں یاس و قنوط کے لیے کوئی جگہ نہ تھی، وہ خود بھی ہمیشہ اللہ پر بھروسہ کر کے عمل کی راہ پر قدم زن رہنے کے عادی تھے اور اپنے مخاطبوں کو بھی یہی تلقین کرتے تھے۔ اب کچھ عرصے سے خدا کے فضل سے یہی صورتِ حال نمودار ہو رہی ہے۔ نا امیدی کے بادل چھٹ رہے ہیں، قنوط کے سائے سکڑ رہے ہیں اور یاس کے پردے تیزی سے اُٹھ رہے ہیں۔ اسلام کی منزل سامنے دکھائی دینے لگی ہے اور ایسے اقدام کیے جا رہے ہیں، جو ان شاء اللہ اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کے ضامن ہوں گے اور اقبال نے جس عملی اور فکری نظام کا خاکہ پیش کیا تھا، اس پر عمل کی بنیادیں استوار کی جائیں گی۔
آئیے، اس کے لیے متحد ہو کر آگے بڑھیں اور بحیثیت قوم ایسے حالات پیدا کرنے کے لیے ساعی ہوں، جن سے اسلام کی تابندگی اور روشنی سے ہر جگہ اجالا ہو جائے۔

جناب راسخ عرفانی

نعت

ذکرِ مرسلؐ ہے خموشی میں نواؤں جیسا
ظلِ رحمت ہے مرے سر پہ گھٹاؤں جیسا

کیا عجب کوئی مدینے سے بلاوا آئے
جھونکا اک آیا ہے جنت کی ہواؤں جیسا

جادۂ عشق سے کل شب جو تصور گزرا
چاند کا چہرہ لگا آپؐ کے پاؤں جیسا

اور کیا عرصۂ محشر میں خدا سے مانگے
جس کو اعزاز ملے نعت سراؤں جیسا

کیوں نہ ہوانؐ کے تکلم پہ عدو بھی قرباں
جن کا ہر لفظ لبوں پر ہے دعاؤں جیسا

حشر کی دھوپ میں دامانِ نبیؐ کے صدقے
سایہ حاصل ہے مجھے خلد کی چھاؤں جیسا

سرنگوں ان کو محمدؐ نے کیا اے راسخ
زعمِ باطل تھا جنھیں جھوٹے خداؤں جیسا

سید افتخار حسین شاہ

تاریخ ساز اقبال، معلّمِ تاریخ اور مورّخ کی حیثیت سے

انسان چاند پر اپنا نقشِ قدم ثبت کر چکا لیکن کائنات کی وسعتیں اب بھی اس کے لیے لامحدود ہیں۔ اس کے سامنے سیکڑوں آسمان ہیں، کئی جہان ہیں۔ کچھ انسان کی دست رس میں ہیں اور کچھ انسان کی پروازِ تخیّل سے بھی دور، بہت دور۔ ان کو سمجھنے کے لیے، ان کی تسخیر کے لیے انسان نے کبھی حواسِ خمسۂ ظاہری سے کام لیا اور کبھی حواسِ خمسۂ باطنی کا سہارا ڈھونڈا۔ کبھی کامیابی سے ہم کنار ہوا اور خدا کے مقابلے میں اپنی فتح کا نعرہ اس طرح لگایا:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم (اقبال)

اور کبھی ناکامی کے قعرِ گم نامی میں گم ہوتے ہوئے اپنی شکست اور مجبوری کو اس طرح بیان کیا:

بڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے — جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے (نظیر اکبر آبادی)
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا (میر)

مجبور و مختار اور بیابان و خیابان کی اس دنیا میں تضادات ہیں۔ بوقلمونی ہے، تنوع ہے، ایک دوسرے سے مختلف ایک ہی درخت پر لاکھوں پتے صاحبِ نظر کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ ایک ہی آدم کی اولاد۔ کروڑوں انسان، سب کے ہاتھوں کے نشان ایک دوسرے سے بالکل جدا۔ نہ تن ایک جیسا نہ من ایک جیسا۔ اس عالمِ رنگ و بو کے گوناگوں مظاہر ہیں۔ زندگی کے کئی روپ ہیں، کئی شکلیں ہیں، بہت سے مراحل ہیں، بہت سے پہلو ہیں، سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات ہے۔ اس کارخانۂ قدرت میں سکون محال ہے۔ ثبات صرف تغیر کو حاصل ہے۔ زندگی دمادم رواں ہے۔ حال کا لمحہ ماضی سے ہم آغوش ہے، اور انسان کے اقوال و افعال سے تاریخ کا تانا بانا بن رہا ہے۔ اقوال میں بھی رنگا رنگی ہے اور افعال میں بھی۔ خواہشات الگ الگ ہیں اور ضرورتیں جدا جدا۔ اس سے پھیلاؤ میں الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ جب نہر گلے

تنگ و بوئے دیگر است" کی صورت سامنے ہو اور "پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی" پر عمل ہو تو طرح طرح کے اختلافات اور مسائل کا پیدا ہونا فطری بات ہے۔ الجھن کو سلجھانا اور مسائل کو حل کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ کیوں کہ قدرت کی طرف سے سب کو صلاحیتیں اور وسائل بھی ایک جیسے ودیعت نہیں کیے گئے ہیں۔ کاروانِ حیات کو اس مرحلے پر قافلہ سالار کی ضرورت پیش آتی ہے، راہ رو راہنما کی تلاش کرتا ہے۔ مولانا روم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں :

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کہ از دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست

زین ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود، جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت نشود آنم آرزوست

آرزو کی تکمیل کی صورت کم ہی پیدا ہوتی ہے۔ اکثر یہ کہنا پڑتا ہے۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

لیکن ملتِ اسلامیہ کی بالعموم اور مسلمانانِ برصغیر کی بالخصوص خوش قسمتی تھی کہ مولانا روم نے جس آرزو کا اظہار کیا تھا، وہ علامہ اقبال جیسے لعلِ جلیل کی صورت میں بر آئی۔ علامہ کو اپنی زندگی میں جلد ہی روشنی کے ایک ایسے مینار کی حیثیت حاصل ہو گئی کہ جس سے بغیر کسی امتیاز کے ہر قسم کے انسان انفرادی اور اجتماعی صورت میں کسبِ ضیا کرنے لگے۔ لوگوں نے ان کو ایک عظیم شاعر ہی نہیں، ایک عظیم راہنما بھی تسلیم کر لیا۔ ہر ملی بحران میں ان سے مشورہ کیا گیا۔ وہ ہر آزمائش میں سرخرو رہے۔ جس طرح زندگی کا میدان وسیع ہے، اسی طرح ان کی راہنمائی کی جولان گاہ بھی طویل و عریض تھی۔ لوگ ہر طرح کے مسائل کو لے کر ان کے سامنے آتے تھے اور وہ خندہ پیشانی سے ان کی رہنمائی فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں دامے، درمے، قدمے، سخنے، غرضیکہ بوقتِ ضرورت ہر قسم کی قربانی پیش کرتے تھے۔ انھوں نے جہاں مشہور ماہرِ تعلیم پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم[۵۱] اور معروف شاعر جوش ملیح آبادی[۵۲] جیسے افراد کو ملازمت دلوانے کے لیے سفارشی خطوط لکھ کر ان لوگوں کے ذاتی اور معمولی مسائل حل کیے، وہاں شیخ عبداللہ جیسے قومی کارکن اور راہنما کو ذاتی مفاد اور قومی مفاد میں امتیاز کرنے کا ان الفاظ میں احساس بھی دلایا۔

"یہ تمھارے خطوط پڑے ہیں۔ انھیں لے جاؤ۔ میں کشمیر کا کام کرتا ہوں اور یہ کام مجھے جان سے عزیز ہے

---

۵۱ اوراقِ گم گشتہ۔ مرتبہ رحیم بخش شاہین۔ ص ۱۵۹ ۵۲ اقبال نامہ، حصہ دوم۔ مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ ص ۱۰۵

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ لوگوں کے ذاتی مفاد کے لیے ملکے ملکے کے لوگوں کے پاس جاؤں [۵۳]

ملی خدمات کے لیے ان کا دائرہ برصغیر تک محدود نہیں تھا، انھوں نے افغانستان کے حالات بہتر بنانے اور وہاں مستحکم حکومت کے قیام کے لیے جنرل نادر شاہ افغانستان کے ساتھ ہر طرح سے تعاون کیا۔ شیخ عطاء اللہ کے مرتبہ "اقبال نامہ" میں شامل کئی خطوط سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ فلسطین کے مسائل حل کرنے میں بھی انھوں نے بھرپور حصہ لیا۔ مس فرقوہرسن (FARQUHARSON) کے نام مکاتیب میں اس بات کا ثبوت ملتا ہے[۵۴]۔ سیاست کے میدان میں انھوں نے قوم کی جس قابلِ ستائش صورت میں راہنمائی فرمائی اور پاکستان کے قیام کے لیے فضا ساز گار بنائی، اس کی ترجمانی اور عکاسی قائداعظم کے نام خطوط سے بخوبی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تادمِ آخر ان کی دوسروں کے کام آنے کی وہی خواہش اور کوشش رہی، جس کا اظہار انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں بچوں کے لیے ایک نظم "ہمدردی" لکھتے ہوئے اس شعر میں کیا تھا:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے

علامہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے تو اپنی یادگار ایک ایسا علمی اور ابدی خزانہ چھوڑ گئے کہ جس سے سبھی انسان قیدِ زمان و مکان سے آزاد اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنی جھولیاں بھر سکتے ہیں۔ ان کی مشہور و مقبول اردو نظم "ساقی نامہ" چینیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے لیے پہلے بھی قابلِ توجہ تھی، اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ مذہب، سیاست، اقتصادیات، ادب، سائنس، تاریخ، کسی بھی موضوع پر تحقیق مطلوب ہو، ملی مفاد اور انسانیت کے ضامن راہنما خطوط ان کی تحریروں میں مل سکتے ہیں۔ علامہ کی اور ان کے ارشادات کی یہی وہ اونچی حیثیت ہے، جس کے پیشِ نظر مولانا گرامی جیسے جلیل القدر شاعر اور جوہر شناس نے یہ فرمایا تھا:

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال پیغمبری کرد و پیغمبر نتواں گفت

اقبالیات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے صرف شاعری کی صورت میں پیغمبری نہیں کی، بلکہ وہ جس راہ پر بھی چلے، پیغمبرانہ انداز سے چلے۔ تعلیم و تدریس کو پیشۂ پیغمبری کہا جاتا ہے۔ اقبال نے ۱۸۹۹ء میں

---

[۵۳] اوراقِ گم گشتہ — مرتبہ رحیم بخش شاہین — راوی مولانا علم الدین سالک، ص ۳۵۳

[۵۴] اقبال نامہ حصہ اول — ص ۴۴۵ تا ۴۵۶

ایم۔اے کرنے کے بعد یہی عمدہ پیشہ اپنایا اور اس صورت میں تاریخ سے ان کا تعلق پہلی بار منظر عام پر آیا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار[۵۶] کے مطابق علامہ بی۔ او۔ ایل کے سال اوّل اور سال دوم کی جماعتوں کو J. R. SEELEY کی تصنیف EXPANTION OF ENGLAND پڑھانے کے علاوہ ہندوستان اور انگلستان کی تاریخ کے متعلق نوٹس لکھواتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۰۲-۱۹۰۱ء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے W. STULTS کی تصنیف EOWLY PLANTOGENETS کا اردو ترجمہ کیا تھا اور اس کا خلاصہ لکھا تھا۔ بی۔ او۔ ایل کی جماعتوں کو تاریخ اور اقتصادیات پڑھانے کے علاوہ انٹرمیڈیٹ سال دوم کی کلاس کو وہ فلسفہ بھی پڑھاتے تھے۔ تین مختلف کلاسوں کو تین مختلف مضامین پڑھانا اور پھر اس کے ساتھ تینوں مضامین میں تصنیف و تالیف کا کام کرنا معمولی بات نہیں۔ اس دور کی اہم شخصیتوں سے خط و کتابت اور مختلف امتحانات کے پرچے جانچنے کا کام اس کے علاوہ تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس سال مجھے امید نہ تھی کہ میں کوئی نظم پڑھ سکوں گا۔ مڈل کے امتحان کے پرچوں سے فراغت ہوئی۔ طبیعت کو یک سوئی کس طرح نصیب ہوتی۔ یہ نظم جلسۂ سالانہ سے تین روز پہلے لکھی گئی اور ہفتے کی شام کو مطبع میں بھیجی گئی۔ رات کو کاتب نے لکھی اور جلدی میں بندوں کی ترتیب میں غلطی کر گیا۔

ایف۔ اے کے امتحان کے پرچے مضمون تاریخ یونان و روم کے دیکھ رہا ہوں۔ سامنے بنڈل رکھا ہے اور نتیجہ بھیجنے میں چار دن کا عرصہ باقی رہ گیا ہے لہٰذا مجبوراً بس کرتا ہوں، معاف کیجیے گا۔"[۵۷]

اس سے خلوص، لگن، محنت، دیانت اور فرض شناسی کا ایک قابلِ تقلید نمونہ سامنے آتا ہے۔ ایک شاعرانہ مزاج رکھنے والے نوعمر مجلسی معلم سے اس قسم کی مصروفیت کی توقع کم ہی کی جاسکتی ہے۔ معلم کو جب تک یہ احساس نہ ہو کہ وہ بہترین پیشے سے وابستہ ہے، معمول کا تدریسی کام کرنے کے علاوہ وہ تحقیقی اور علمی کام نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو اپنے پیشے کے تقاضوں کا بخوبی علم تھا۔ تاریخ پڑھاتے ہوئے جن دو مغربی مورخین کی تصانیف ان کی توجہ کا مرکز بنیں، اس مرحلے پر ان کے انداز فکر کا مختصراً جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہیں۔

۱۔ جان رابرٹ سیلی (۱۸۳۴ء تا ۱۸۹۵ء) ایک ایسا انسان ہے کہ جس کی تحریریں خیالات سے پُر ہیں۔

---

[۵۶] مطالعۂ اقبال۔ گوہر نوشاہی (تفصیلات کے لیے اس مجموعے میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا مضمون دیکھیے۔ ص ۴۷ تا ۵۷)

[۵۷] اقبال نامہ۔ حصہ اوّل۔ ص ۹-۸

خواہ ان کا تعلق مذہب سے ہے اور خواہ تاریخ سے، وہ حقائق کے متعلق تفتیش و تحقیق کا کام دوسروں کے لیے
چھوڑ دیتا ہے اور بعض مسلسل حقائق کو سامنے رکھ کر ان سے نتائج تک جا پہنچتا ہے، عام اصول وضع کرتا ہے۔
اس کی تاریخی تصانیف میں سب سے عمدہ EXPANTION OF ENGLAND اور GROWTH OF BRITISH
POLICY ہیں۔ جب سیلی کے بہت سے ہم عصر مورخین ملکی سیاست کے متعلق غور و فکر کر رہے تھے، وہ
بین الاقوامی امور کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہا تھا۔ اس کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ اپنے ملک کے حالات کا
دوسرے ممالک کے حالات سے موازنہ کرتا تھا۔ وہ دوسرے مورخین کی طرح اپنے ہی گھر کا ہر کمرہ پوری تفصیل کے
ساتھ دکھانے کا قائل نہیں تھا، اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اپنے گھر کے کمروں سے باہر گھر کے چمن میں بیٹھ
کر اپنے گھر کا دوسرے گھروں سے موازنہ کیا جائے۔ نوآبادیات کا ذکر کرتے ہوئے وہ سامراجی نظام کی حمایت میں
اعتدال پسند نظر آتا ہے۔ اس کی تحریروں میں جو فلسفیانہ قدامت پسندی کا ایک نمایاں پہلو ہے وہ مبارزت طلب
اور جاذبِ توجہ ہے، رجعت پسندانہ نہیں۔

سیلی کے متعلق A HISTORY OF ENGLISH LITERATURE میں اس کے مصنف ARTHUR
COMPTON RICKETT کے مندرجہ بالا بیان میں مندرجہ ذیل پہلو قابلِ توجہ ہیں:

ا۔ سیلی نے مذہب اور تاریخ سے متعلق قلم اٹھایا اور افکار ان کی تحریروں میں غالب ہے۔
ب۔ اس کی پیش کش میں موازنے کا انداز تھا۔
ج۔ اس کی تحریروں میں فلسفیانہ قدامت پسندی کے باوجود رجعت پسندی نہیں۔

۲۔ ولیم سٹبز (۱۸۲۵ء تا ۱۹۰۱ء) کا تعلق عہدِ وکٹوریہ کے مورخین کے اس دبستانِ فکر سے تھا جسے سائنس
میں سائنس دبستان قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے تین جلدوں میں جو CONSTITUTIONAL HISTORY OF
ENGLAND تحریر کی، اسے اس کے علم و فضل کا ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ شہری زندگی کا ارتقاء دکھانے،
بین الاقوامی تعلقات کی وضاحت کرنے اور قرونِ وسطیٰ کے چرچ (MEDIAEVAL CHURCH) کی قوت کے اظہار
میں کوئی بھی اس کا ہمسر نہیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس کی تاریخوں میں غیر ضروری تفصیلات کا نقص موجود ہے جن
کی حیثیت ان ہڈیوں جیسی ہوتی ہے، جو زندگی کی حرارت سے محروم ہوں اور جن کی اہمیت صرف سائنسی نقطۂ نظر
سے ہو۔[۵]

A HISTORY OF ENGLISH LITERATURE By ARTHER COMPTON RICKETT 56

"اس کے خطبات کے علاوہ اس کی مختصر تصانیف میں THE EARLY PLANTAGENETS
شامل ہے۔ اس کتاب میں اس خاندان کے حکمرانوں کا ذکر ہے جس نے ۱۱۵۴ء سے ۱۳۹۹ء تک انگلستان
میں حکومت کی۔ جس کا پہلا بادشاہ ہنری دوم تھا اور آخری رچرڈ سوم۔ STUBBS ۱۸۸۴ء میں CHESTER
کا اور ۱۸۸۸ء میں آکسفورڈ کا بشپ مقرر ہوا تھا۔"[۵۸]

مندرجہ بالا بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ STUBBS بنیادی طور پر ایک مذہبی قسم کا انسان تھا۔ اسے
انگلستان کے اس قدیم دور میں دلچسپی تھی جس میں چرچ کو غلبہ حاصل تھا۔ وہ معلومات کے خزانے کا مالک تھا۔

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ اورینٹل کالج میں ملازمت کے دوران دیارِ غیر کے جس قسم کے مصنفین کی
تصانیف پڑھانے کے علامہ کو مواقع ملے انہی دنوں میں ویسا ہی ایک مورخ شبلی کے روپ میں انہیں اپنے وطن
میں مل گیا۔ شبلی بھی مذہب کے دلدادہ تھے۔ قدامت پسند تھے لیکن رجعت پسند نہیں۔ مبارزت طلبی ان کی بھی
مشہور ہے۔ ان کا طریقِ کار بھی موازنے کا تھا۔ ان کی دلچسپی بھی صرف اپنے ملکی حالات تک نہیں تھی۔ وہ
بین الاقوامی امور میں دلچسپی لیتے تھے۔ معلومات کا خزانہ بلاشبہ ان کے پاس بھی تھا۔[۵۹] شبلی کا مقام تاریخ نگاری
میں بھی مسلمہ ہے۔ بقول اختر وقار عظیم "شبلی کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں میں مورخ شبلی نے اتنی اہمیت
حاصل کر لی ہے کہ ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو اس کے مقابلے میں مدھم پڑ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے
سب سے بڑے پرستار مہدی نے بھی جو انہیں "خاتم المصنفین" اور "مورخ اسلام" کے نام سے یاد کرتے ہیں،
یہ تسلیم کر لیا تھا کہ شبلی سے اگر تاریخی کتب لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔"[۶۰]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مورخ شبلی کو اس کی عظمت کے باوجود شبلی کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں سے الگ
نہیں کیا جا سکتا، ان کی شخصیت کے مختلف پہلو فنی اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم سر نہ ہونے کے باوجود ایک
دوسرے میں اس حد تک پیوست ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ شاعر شبلی کو مورخ شبلی سے، نقاد
شبلی کو عالم شبلی سے، متکلم شبلی کو سوانح نگار شبلی سے علیحدہ کر کے دیکھنا حقائق کی طرف سے چشم پوشی ہے۔"[۶۱]

---

۵۸ COLLINS NATIONAL ENCYCLOPEDIA, P. 15

۵۹ یادگارِ شبلی۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام۔ ص ۶۷ تا ۶۸

۶۰ افاداتِ مہدی۔ مہدی افادی، ص ۲۱۲

۶۱ شبلی بحیثیت مورخ۔ اختر وقار عظیم، ص ۶۷، ۶۸

یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال بھی جامع الحیثیات شخصیت تھے۔ وہ شاعر تھے، معلم تھے، وکیل تھے، رہنما تھے، مضمون نگار تھے، مقرر تھے، مکتوب نگار تھے، نقاد تھے، محقق تھے، مورخ تھے، اسی طرح سے ان کی شخصیت کے کئی مختلف پہلو تھے، جن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ الگ اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب ایک ہی تنومند درخت کے برگ و بار ہیں۔ ان پہلوؤں کو نمایاں کرنے یا ان مختلف راہوں پر چلنے کا محرک جذبہ شبلی اور اقبال کے ہاں ایک ہی تھا۔ اسی کی وجہ سے شبلی "مورخ اسلام" بنے اور اقبال "شاعرِ اسلام"۔ دونوں کا مرکزِ نگاہ ایک تھا۔ مختلف راہوں پر چلتے ہوئے بھی یا ایک ہی راہ پر ہم سفر بنتے ہوئے دونوں ایک ہی منزل پر پہنچنے کے خواہاں تھے۔ مقصد دونوں کا ایک ہی تھا، شعر کہتے ہوئے بھی، نثر لکھتے ہوئے بھی۔ اس سلسلہ میں شبلی پیش رو نظر آتے ہیں اور اقبال پیرو۔ اور یہ کوئی خلاف توقع بات بھی نہیں، کیوں کہ:

دو راہرو کہ بیک راہ روند یک سمت عجب نباشد اگر اوفتند پے در پے

مولانا شبلی جیسی ہمہ گیر اور متاثر کرنے والی شخصیت سے علامہ اقبال کے رابطے کی پہلی صورت یہ نظر آتی ہے کہ اقبال کی مشہور کتاب علم الاقتصاد کے بعض حصوں میں علامہ شبلی نعمانی نے زبان کے متعلق قابلِ قدر اصلاح دی۔[۱۱]

شبلی سے استفادے کی صورت صرف علم الاقتصاد تک محدود رہی ہو، میرے خیال میں یہ ممکن نہیں۔ کیوں کہ علامہ اقبال کی تحریروں میں شبلی کی تصانیف کے حوالے ملتے ہیں۔ مثلاً "فلسفۂ عجم" میں "علم الکلام" کے اقتباسات موجود ہیں۔ بعض مکاتیب میں شعر العجم کی اہمیت تسلیم کی ہے[۱۲] اور دوسروں کو اس سے فیض حاصل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء کو سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی مرحوم کی زندگی میں مَیں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مولانا مرحوم پنجاب میں مستقل طور پر اقامت کریں سو یا ہیں مگر مسلمان امرا میں مذاقِ علمی مفقود ہو چکا ہے، میری کوشش بارآور نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ دار المصنفین کے کام میں برکت دے اور آپ کا وجود مسلمانوں کے لیے مفید ثابت کرے۔ مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا اور جو چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں وہ نہایت مقبول ہوئیں۔ غزل کے ساتھ وہ یہ سلسلہ بھی جاری رکھتے۔"

مندرجہ بالا سطور کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ علامہ اقبال مولانا شبلی کے تاریخی ذوق سے نہ صرف آگاہ[۱۳]

---

[۱۱] آثار اقبال، مرتبہ غلام دستگیر رشید، ص ۱۰
[۱۲] اقبال نامہ، حصہ اوّل، ص ۵۵

نہیں، بلکہ متاثر بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سید سلیمان ندوی کو تاریخی واقعات کو نظم کرنے کا سلسلہ جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔

اس خط کا تعلق ۱۹۱۶ء سے ہے۔ اقبالیات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید سلیمان ندوی کو شبلی کی راہ پر چلنے کا مشورہ دینے سے پہلے وہ خود اس راہ پر گامزن ہو چکے تھے۔ تاریخ میں ان کی دلچسپی تاریخ کا معلم اور ممتحن ہونے کے علاوہ مورخ کی حیثیت سے بھی ظاہر ہو چکی تھی۔ فقیر وحید الدین روزگار فقیر کی جلد دوم میں لکھتے ہیں کہ علامہ نے اردو زبان میں تاریخ ہند لکھی تھی جو ۱۹۱۳-۱۴ء میں مڈل کی جماعتوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ اس کتاب کا خلاصہ امرتسر کے ایک پبلشر نے ۱۹۱۴ء میں شائع کیا تھا۔ وہ جناب ممتاز حسین کی لائبریری میں محفوظ ہے، اصل کتاب نایاب ہے۔ داخلی اور خارجی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ کا معلم ہونے کی حیثیت تو تادیر قائم نہ رہ سکی، دوسرے امور کی طرف توجہ بڑھ گئی، لیکن شبلی کی تاریخی نوعیت کی تخلیقات سے برصغیر میں جو علمی اور ادبی فضا پیدا ہوئی تھی، اس کا اثر تادم مرگ باقی رہا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ رسمی صورت میں معلم کی حیثیت سے کلاس روم میں تاریخ کی نصابی کتب پڑھانے کا سلسلہ ۱۹۰۵ء میں اس وقت ختم ہو گیا جب علامہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان تشریف لے گئے لیکن غیر رسمی صورت میں سامعین اور قارئین کے اپنے وسیع تر حلقے کے سامنے علامہ تاریخ کے فلسفے اور کسی قوم یا ملک کی تاریخ کے مختلف ادوار اور پہلوؤں کے متعلق اظہار خیال تمام عمر فرماتے رہے، ماحول اور محرکات مختلف ہونے کی وجہ سے اظہار خیال کی صورتوں میں تبدیلی رونما ہوتی رہی اور تاریخ ساز اقبال معلم اور مورخ کی صورت میں اپنی جھلکیاں دکھاتا رہا۔

تاریخ کے فلسفے اور اس کے فنی تقاضوں کے سلسلے میں علامہ کی وہ تحریریں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو ان کی ذاتی ڈائری میں ملتی ہیں۔ علامہ نے اپنی ڈائری ۱۹۱۰ء میں لکھی تھی اور اسے ان کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال نے آج سے چند سال پہلے شائع کیا تھا۔ شذرات فکر اقبال کے نام سے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اسے اردو میں منتقل کر چکے ہیں۔ اس ڈائری میں ہمیں تاریخ کی تعریف ان خوب صورت الفاظ میں ملتی ہے "تاریخ ایک طرح کا ضخیم گراموفون ہے، جس میں قوموں کی صدائیں محفوظ ہیں"[۱۴]

تاریخی مواد کو احتیاط سے قبول کرنے کا مشورہ بدیں الفاظ پیش کرتے ہیں "تاریخ محض انسانی محرکات کی توجیہہ

---

[۱۴] ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی - شذرات فکر اقبال - ص ۱۲۰

تفسیر ہے، لیکن جب ہم اپنے معاصرین بلکہ روزمرہ زندگی میں گہرے دوستوں اور رفیقوں کے محرکات کی بھی غلط
تعبیر کر بیٹھتے ہیں تو جو لوگ ہم سے صدیوں پہلے گزرے ہیں، ان کے محرکات کی صحیح تعبیر و توجیہہ اس سے
کہیں زیادہ دشوار ہے، لہٰذا تاریخ کی روداد کو بڑے احتیاط سے تسلیم کرنا چاہیے۔"[۱۵]

تاریخی پس منظر سے تصورات کے رشتے کی اس طرح وضاحت فرماتے ہیں "فکری ارتقا کو انسانی فضیلت
کے دیگر پہلوؤں سے منقطع نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ فلسفہ کی کتابیں ہمیں یہ تو بتاتی ہیں کہ مختلف قوموں نے کیا
سوچا ہے، لیکن ان مختلف معاشرتی اور سیاسی اسباب و عوامل کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات فراہم نہیں کرتیں،
جن سے فکرِ انسانی کا کردار متعین ہوا ہے۔ فلسفے کی جامع تاریخ مرتب کرنا یقیناً ایک دشوار کام ہوگا۔ لوتھر کی تحریک
اصلاح کے قیمتی مضمرات کی ممکن وضاحت وصراحت کرنا محض ایک عالمِ دینیات کے بس کی بات نہیں۔ ہمارا یہ
رویہ رہا ہے کہ عظیم تصورات کو انسان کی ذہنی فعلیت کے عمومی دھارے سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔"[۱۶]

تاریخ اور اخلاقیات کے سلسلے میں لکھتے ہیں: "تاریخ ایک قسم کی اطلاقی اخلاقیات ہے۔ اگر اخلاقیات دیگر
علوم کی طرح ایک تجرباتی علم ہے تو اسے انسانی تجربے کے انکشافات پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس نظریے کے اعلانِ
علم سے یقیناً ان لوگوں کے احساسات کو بھی صدمہ پہنچے گا جو اخلاقی امور میں بڑے کٹرپن کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن
ان کا عام برتاؤ تاریخ کے تجربات و تعلیمات سے متعین ہوتا ہے۔"[۱۷]

برصغیر کے مختلف ادوار یا حکمرانوں کے متعلق جو شذرات ڈائری میں شامل ہیں، وہ دریا کو کوزے میں
بند کرنے کی عمدہ کوششیں ہیں۔ ان کی افادیت اور اہمیت آج بھی تاریخ کے طالب علم کے لیے بہت ہے۔ اورنگ زیب
کے متعلق یہ شذرہ دیکھیے، جس میں موازنے کی صورت بھی نمایاں ہے۔

اورنگ زیب (۳۱): اورنگ زیب کی سیاسی فطانت بغایت ہمہ گیر تھی۔ اس ملک کی مختلف قومیتوں کو
ایک عالمگیر سلطنت کے تصور میں شامل کر لینا گویا اس کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ لیکن اس سامراجی وحدت کے
حصول میں اس نے غلطی سے اپنے غیر متزلزل عزم و ہمت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا، جس کے پس پشت سیاسی
تجربہ نا کافی تھا۔ اپنی متصور سلطنت کے سیاسی ارتقا میں وقت کے پہلو کو نظر انداز کر کے اس نے ہندوستان کی
منتشر اور بے ربط سیاسی وحدتوں کو اپنی ہی زندگی میں مجتمع کر دکھانے کی توقع پر ایک لامتناہی مہم شروع کر دی۔

۱۵۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ شذرات فکرِ اقبال، ص ۱۳۰ ۱۶۔ ایضاً، ۱۱۱ ۱۷۔ ایضاً، ص ۹۷

جس طرح سکندر پورے ایشیا پر یونان کو مسلط کرنے میں ناکام رہا، اسی طرح وہ بھی ہندوستان بھر کو پرچم اسلام کے نیچے نہ لاسکا۔ انگریز قدیم اقوام کے سیاسی تجربات سے پوری طرح مسلح ہو کر آیا تھا۔ اس کا صبر و تحمل اور پھریرے کا سا استقلال وہاں کامیاب رہا، جہاں اورنگ زیب کی جلد باز فطانت ٹھوکر کھا کر رہ گئی تھی۔ سیاسی فتح لازماً اتحاد کے ہم معنی نہیں۔ علاوہ ازیں سابقہ مسلم خاندانوں کی تاریخ نے اورنگ زیب پر یہ واضح کردیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار اس ملک کے باشندوں کی خیر خواہی پر اتنا منحصر نہیں (جیسا کہ اس کے جدِ اکبر نے سوچا تھا) جتنا کہ خود حکمران قوم کی اپنی طاقت پر مبنی ہے۔ لیکن اپنے گہرے سیاسی شعور کے باوجود وہ اپنے اجداد کے کرتوتوں کو مٹا نہ سکا۔ سیواجی، اورنگ زیب کے عہد کی پیداوار نہیں تھا۔ اس کا وجود ان معاشرتی اور سیاسی عوامل کا مرہونِ منت ہے جو اکبر کی حکمتِ عملی سے ظہور میں آئے۔ اورنگ زیب کا سیاسی فہم و ادراک صائب ہونے کے باوجود، بعد از وقت ثابت ہوا تاہم اس کی سیاسی بصیرت کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے ہندوستان میں مسلم قومیت کا بانی قرار دینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ نسلیں میرے اس قول کی صداقت کو تسلیم کریں گی۔ انگریز حکمرانوں میں سے سب سے پہلے لارڈ کرزن نے ہندوستان میں انگلستان کے اقتدار کے بارے میں حقیقت شناسی کا ثبوت دیا۔ ہندو قومیت، بے جا طور پر اس کی پالیسی سے منسوب کی جاتی ہے۔ زمانہ یقیناً یہ بتادے گا کہ ہندو قومیت کا وجود لارڈ رپن کی پالیسی کا نتیجہ ہے، لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ سیاسی مقصد اور سیاسی ادراک میں مغل فرماں روا اور انگریز حکمران دونوں متفق ہیں۔ مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ انگریز مورخ کیوں اورنگ زیب کو مطعون کرتا ہے، جس کے سامراجی نصب العین کی پیروی خود اس کے اہلِ ملک کرتے رہے ہیں اور جس کے سیاسی ادراک کی وہ توثیق کر چکے ہیں۔ اورنگ زیب کا سیاسی طریقِ کار یقیناً بہت بھدا تھا لیکن جس عہد سے اس کی زندگی اور اُس کے کارنامے وابستہ ہیں، اسی کے نقطۂ نظر سے اس طریقِ کار کی اخلاقی حیثیت کو پرکھنا چاہیے[۵۹]

اپنے ملک کی تاریخ کے علاوہ علامہ کو دوسرے اسلامی ممالک کی تاریخ میں جو دلچسپی تھی، اس کی ترجمانی مندرجہ ذیل دو شذرات سے بخوبی ہوتی ہے:

(۱) فتح ایران (۳۲): اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ تاریخ اسلام کا اہم ترین واقعہ کون سا ہے تو میں

---

۵۹ شذرات فکرِ اقبال، ص ۹۷ تا ۱۰۰

ے تامل کہوں گا، فتح ایران۔ نہاوند کی جنگ نے عربوں کو ایک حسین ملک کے علاوہ ایک قدیم تہذیب بھی عطا
ی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک ایسی قوم سے روشناس ہوئے جو سامی اور آریائی عناصر کے امتزاج سے ایک
ئی تہذیب کو جنم دے سکتی تھی۔ ہماری مسلم تہذیب، سامی اور آریائی پیوندکاری کا حاصل ہے۔ گویا یہ ایسی
اولاد ہے جسے آریائی ماں کی لطافت اور سامی باپ کے کردار کی پختگی و صلاحیت ورثے میں ملی ہے
تح ایران کے بغیر اسلامی تہذیب یک رخی رہ جاتی ہے۔ فتح ایران سے ہمیں وہی کچھ مل گیا جو فتح یونان
ے رومیوں کو ملا تھا۔[۱۹]

۲۔ افغانستان کا مستقبل (۲۵): تاریخ کا فیصلہ ہے کہ حائل مملکتیں عظیم سیاسی وحدتوں کی صورت اختیار کرنے میں ہمیشہ ناکام رہی ہیں۔ ملک شام جو سلطنتِ روما اور اہلِ فارس کے درمیان ایک حائلی مملکت تھا، اسی صورتِ حال سے دوچار رہا۔ لہٰذا افغانستان کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی دشوار ہے۔[۲۰]

علامہ اقبال کا تاریخی تصور ہی قابلِ ستائش نہیں، اقتصادی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت بھی قابلِ داد ہے۔ دونوں کا حسین امتزاج اس شذرے میں ملاحظہ کیجیے:

لٹیری قومیں — جب کوئی قوم محنت، مشقت یا کسی اور ذریعے سے دولت کے ذخیرے جمع کرتی ہے اور اس اکتنازِ زر کے نتیجے میں دنیا کے کاروبار کی گاڑی تھم جاتی ہے، جس کی رفتار مسلسل گردشِ زر پر منحصر ہے، تو لٹیری قومیں نمودار ہوتی ہیں اور مقید دولت کو آزاد کر دیتی ہیں۔ وارن ہیسٹنگز، کلائیو اور محمود غزنوی ایسی قوموں کے مخصوص نمائندے ہیں جو کاروبارِ عالم کی ترقی میں فطرت کے غیر شعوری کارندوں کی حیثیت سے معاون ہوتی ہیں۔ وارن ہیسٹنگز کی لوٹ کی صحیح توجیہہ و تفسیر ہمیں تاریخ کے اس باب میں ملے گی جہاں سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے یورپی زر کا بیان ہے۔[۲۱]

ملتِ اسلامیہ کی حیرت انگیز تاریخ کا احساس ان الفاظ میں دلاتے ہیں:

"مسلم قوم کی حیرت انگیز تاریخ (۴۷) "مسلم قوم کی تاریخ پر آپ جتنا غور کریں گے، اتنا ہی اسے حیرت انگیز پائیں گے۔ ابتدائی دور سے سولھویں صدی کے آغاز تک — پورے ایک ہزار سال — یہ توانا نسل (میں نسلی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اسلام نے ایک نسل ساز قوت کا کردار ادا کیا ہے) سیاسی توسیع

[۱۹] شذراتِ فکرِ اقبال۔ ص ۱۰۰ [۲۰] ایضاً، ص ۸۹ [۲۱] ایضاً، ص ۱۲۰، ۱۲۱

کے ہم۔ جاذب مشغلے میں پیہم منہمک رہی ہے ، تاہم مسلسل جدوجہد کے اس طوفانی دور میں بھی ، اس حیرت انگیز قوم نے بڑے بڑے تہذیبی کارنامے انجام دینے کے لیے کافی موقع نکال لیا - اس نے قدیم علوم کے مدفون خزانوں کو باہر نکالا اور محفوظ کیا - ان میں ٹھوس اضافے کیے - ایک منفرد نوعیت کا ادب تخلیق کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مکمل نظامِ قانون مرتب کیا جو ہمارے لیے مسلم فقہا کا سب سے قیمتی ورثہ ہے[۲۲]

اس سلسلے میں شذرات کے علاوہ علامہ کے انگریزی اور اردو خطوط بھی قابل توجہ ہیں -

اسلامی تاریخ سے گہرے لگاؤ کا ثبوت علامہ کے اس خطبۂ صدارت سے بھی ملتا ہے ، جو ۱۲ جون ۱۹۳۲ء کو " انقلاب " (لاہور) میں بدیں صورت شائع ہوا تھا - اسلامی تاریخ کو نصاب سے خارج کرنے کے متعلق ارشادات :

پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کا مضمون ۱۹۲۳ء میں شروع ہوا لیکن یونیورسٹی میں ہندو عنصر غالب ہونے کی وجہ سے اس مضمون کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی گئی - ۱۹۳۲ء میں جب پروفیسر جے - ایف - بروس تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی میں آئے تو انھوں نے ہندوؤں کے زیر اثر سینٹ میں یہ تجویز پیش کی کہ اسلامی تاریخ کو بی - اے پاس کورس سے خارج کر دیا جائے - یہ تجویز ایک رائے کی اکثریت سے منظور ہوگئی - مسلمانانِ پنجاب نے متعدد جلسے کر کے سخت مذمت کی ، اسی سلسلے میں ۱۱ جون ۱۹۳۲ء کو ایک جلسہ باغ بیرون موچی دروازہ زیر اہتمام ریسرچ انسٹیٹیوٹ منعقد ہوا ، جس کی صدارت علامہ سر محمد اقبال نے کی - خطبۂ صدارت میں آپ نے فرمایا :

" زمانۂ قدیم میں بچوں کو ایک دعا پڑھائی جاتی تھی ، شاید اب بھی وہ رواج قائم ہو - مجھے وہ دعا اب تک یاد ہے : اے اللہ ! میرے دل سے غفلت کے پردے کو اٹھا لے - میرا آج تک یہی خیال تھا کہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں پر غفلت کے گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں اور وہ تمدن و تاریخ اسلام سے ایسے ہی ناواقف ہیں جیسے کوئی غیر مسلم - چند ماہ ہوئے مجھے مصر اور فلسطین جانے کا اتفاق ہوا تھا - وہاں کے واقعات سے مجھے یہ یقین ہو گیا کہ غفلت کے پردے اٹھ چکے ہیں - مصر میں قومیت کا جذبہ اور جوشِ عمل موجود ہے - وہاں ایک ادارہ قائم تھا جو ملکی تمدن و روایات کا محافظ تھا - فلسطین کی مؤتمر اسلامی میں میں نے دیکھا کہ وہاں کے نوجوان مقررین کی داڑھیاں منڈی ہوئی تھیں اور وہ کوٹ پتلون میں ملبوس نظر آ رہے تھے ، انھیں علم و فضل اور جوشِ عمل کے اعتبار سے علمائے کرام پر فوقیت حاصل تھی - مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان میں تاریخِ اسلامی کی تعلیم کا کوئی

---

۲۲ - شذرات فکر اقبال ، ص ۱۳۷

خاص انتظام نہیں۔ لہٰذا میں ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ تاریخ اسلامی سے ناواقف اور قومی روایات سے نابلد طبقے کی راہنمائی کے لیے اسلامی تاریخ کے لیکچروں کا خاص بندوبست کرے۔ وہ لیکچر خواہ آسان اردو میں ہوں یا پنجابی میں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کو تاریخ اسلامی سے آگاہی حاصل ہو جائے۔ اگر لاہور میں یہ انتظام ہو گیا تو میں امید کرتا ہوں کہ پنجاب کے دوسرے شہر بھی لاہور کی تقلید کریں گے۔

"اب میں نفسِ مضمون پر متوجہ ہوتا ہوں۔ ۱۹۲۳ء سے قبل اسلامی تاریخ نصاب میں داخل تھی۔ غالباً ۱۹۲۳ء میں اسے بی۔ اے کے پاس نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔ پاس اور آنرز دو جداگانہ کورس ہیں۔ مسٹر بروس کی تجویز ہے کہ اسے پاس کورس سے خارج کیا جائے اور آنرز اور ایم۔ اے میں اس مضمون کو بہت کم طلبا لیتے ہیں۔ پاس کورس میں طلبا کی زیادہ تعداد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کورس سے اسلامی تاریخ کو خارج کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ عقلِ انسانی جب شرارت پر اُتر آئے تو اپنے اندرونی جذبات اور محرکات سے کام لے کر اپنے مقصد کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس نوع کے جذبات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ یہ ایک علمی مسئلہ ہے، لہٰذا دلائل کا جواب دلائل سے دینا چاہیے۔ مسٹر بروس کی رپورٹ جو شائع ہوئی تھی، میری تحقیقات کے بموجب اس میں چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔ انھوں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ نصاب کے لیے عمدہ کتابیں نایاب ہیں یا قابل پروفیسر نہیں ملتے۔ اگر وہ یہ دعویٰ کرتے تو یہ خود ان کی جہالت کی دلیل ہوتی۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو ہندوستان کی تاریخ پڑھنی چاہیے۔ میرے نزدیک یہ دعویٰ غلط ہے کہ کسی قوم کی تاریخ کو اس قوم کی تاریخ نہ سمجھا جائے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اجتماعی حیثیت سے انسانی روح کی ایک حرکت ہے، روحِ انسانی کا کوئی ماحول نہیں بلکہ تمام عالم اس کا ماحول ہے۔ اگر اسے کسی قوم کی ملکیت سمجھا جائے تو یہ تنگ نظری کا ثبوت ہے۔

"جب میں اٹلی گیا تو مجھے ایک شخص پرنس کتانی ملا۔ وہ اسلامی تاریخ کا بہت دلدادہ ہے۔ اس نے تاریخ پر اتنی کتابیں لکھی ہیں اور اس قدر روپیہ صرف کیا ہے کہ کوئی اسلامی سلطنت اس کے ترجمے کا بندوبست بھی نہیں کر سکتی۔ اس نے لاکھوں روپے صرف کر کے تاریخی مواد جمع کیا ہے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اسلامی تاریخ سے دلچسپی کیوں ہے تو انھوں نے کہا کہ اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے۔

" اسلامی ممالک کی مجموعی آبادی ہندوستان کے مسلمانوں کے تقریباً مساوی ہوگی، پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم اس شعبے کی تدوین و تحقیق اور ترتیب و تنظیم پر متوجہ ہوں۔ انجمن حمایتِ اسلام کو چاہیے کہ ایسے ادارے

کا افتتاح کرے، جہاں تاریخ اسلامی کی تعلیم کا بہترین بندوبست ہو۔ لیکن انجمن تنہا اس کام کو انجام نہ دے سکے گی، بلکہ آپ لوگوں کی امداد کی ضرورت ہے۔ کچھ عرصے سے انجمن مسلمانوں کے مفاد سے غافل اور اُن کے جذبات سے ناآشنا ہے اور بعض غرض مند ہاتھوں میں ایک کھلونا بنی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آزاد طبع اصحاب کو خدمت کا موقع دیا جائے تاکہ کسی کو کوئی شکایت نہ رہے"۔

اس کے بعد یہ قرارداد منظور ہوئی۔

"مسلمانانِ لاہور کا یہ جلسہ ہندوستان کی تمام جدید و قدیم اسلامی درس گاہوں مثلاً مدرسۂ عالیہ دیوبند اور سہارن پور اور لکھنؤ وغیرہ کو تاریخ اسلامی کی تعلیم و ترویج کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مروجہ نصاب میں ترمیم کی جائے اور تاریخ اسلامی کو مسلمانوں کی تعلیم کا جزوِ لاینفک قرار دیا جائے"[۲۳]

نومبر ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے علامہ نے فرمایا کہ" یورپ سے ہمیں تین چیزیں ملی ہیں۔ (۱) انگریزی لٹریچر (۲) غور و فکر کی عادت ــــ درحقیقت یہی وہ چیز ہے جس کی اس وقت تمام مشرق کو ضرورت ہے (۳) ڈیموکریسی ــــ جس کا ذاتی طور پر میں معتقد نہیں ہوں اور محض اس لیے اس کو گوارا کرلیتا ہوں کہ اس کا ابھی تک کوئی نعم البدل نہیں ہے۔"

" ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں، ہمارا انکشاف ماضی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں، میں تو مستقبل کا معتقد ہوں مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال میں ہوں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمۂ تہذیب و شائستگی کو سمجھا جائے، تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ماضی کو سمجھیں۔ چوں کہ ہم جدید تہذیب و شائستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں، اس لیے ہم علوم جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گمشدہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ علوم جدیدہ پر اصولِ استقرائی کے نتائج و ثمرات ہم کو آج نظر آرہے ہیں۔ میں گزشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کرتا ہوں، ہر روز تلاوت کرتا ہوں، مگر میں ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلم بند کروں گا کہ دنیائے جدیدہ اس مطیع

---

[۲۳] گفتار اقبال، محمد رفیق افضل، ص ۱۵۰ - ۱۵۱

حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یونیورسٹی ایسے لوگوں کی ایک تعداد پیدا کردے گی جو مطالعۂ قرآن میں اپنی زندگیاں صرف کردیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔ گزشتہ چند سال سے میں صرف اپنے جسد خاکی کا مالک ہوں، میری روح ہمیشہ آپ کی خدمات کے لیے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں، وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔[۵۲۴]

اعلیٰ سطح کے معلم کا کام صرف درس و تدریس نہیں ہوتا، وہ تحقیق کی دنیا میں قدم رکھنے والوں کی راہنمائی بھی کرتا ہے۔ سید نذیر نیازی مکتوبات اقبال میں لکھتے ہیں کہ جب علامہ نے ۴ جون ۱۹۲۹ء کو خط میں انھیں یہ مشورہ دیا "بہتر ہو کہ آپ کسی اچھے ہنر کی تلاش میں ولایت جائیں۔" تو نذیر نیازی نے جواب میں عرض کیا "کسی سائنس یا صنعت کی تحصیل تو اب میری استطاعت سے باہر ہے۔ فلسفہ تاریخ کا موضوع کیا تصوف اسلام سے بہتر نہیں رہے گا۔" اس کے جواب میں علامہ نے تحریر فرمایا "میں تصوف پر تاریخ کو ترجیح دیتا ہوں"۔

۱۰ اگست ۱۹۳۵ء کو نذیر نیازی کے نام خط میں تاریخ پنجاب کے ایک پہلو پر تحقیقی کام کرنے کی ضرورت کا احساس ان الفاظ میں دلاتے ہیں۔ "میرے خیال میں ایک نئی فیچر جو طلوع اسلام کے لیے ضروری ہے، یہ ہے کہ سکھوں کے دور سے پہلے کی تاریخ پنجاب پر مفصل مضمون لکھے جائیں۔ چوہدری صاحب سے اس بارے میں مشورہ کریں، انھوں نے حال ہی میں مسلمانوں کی تاریخ کے اس حصے کا مطالعہ کیا ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ میں اُسے پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں۔ پنجاب کے مسلمانوں کی بیداری کے لیے اس حصۂ تاریخ پر لکھنا ضروری ہے، باقی خیریت ہے۔ طلوع اسلام کے پہلے نمبر میں ہی ایک مضمون تاریخی ضروری ہے"۔

غلام قادر فصیح نے جب اپنا تاریخی نوعیت کا رسالہ شائع کرنا شروع کیا تو ان کی ان الفاظ میں حوصلہ افزائی فرمائی "میرے نزدیک یہ رسالہ نہایت مفید ہے اور ہر مسلمان کو اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ عام مسلمانوں میں اخلاق حسنہ پیدا کرنے کے لیے اس سے اچھا ذریعہ اور کوئی نہیں کہ اس قسم کے تاریخی رسالے شائع کیے جائیں، جن سے ان کو اسلاف کے حالات معلوم ہوں اور ان کے طرز عمل کا ان پر اثر پڑے۔ قوموں کی بیداری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنی تاریخ سے کہاں تک دلچسپی ہے۔ آپ کے رسالے کی اشاعت سے معلوم ہوگا کہ مسلمان کہاں تک اپنے اسلاف کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

---

[۵۲۴] گفتار اقبال ــ محمد رفیق افضل۔ ص ۱۰۵۔۱۰۴

"حالات موجودہ کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر ایک قسم کی بیداری پیدا ہوگئی ہے اور تاریخی مضامین کو نہایت توجہ سے سنا جاتا ہے۔ اس واسطے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا رسالہ برمحل نکلا ہے اور ہماری ضروریاتِ موجودہ کا کفیل ہوگا۔ خود مجھ پر جو اثر اس رسالے کے مطالعے سے ہوتا ہے اس کا اظہار میں اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کر سکتا کہ بسا اوقات دورانِ مطالعہ میں چشم پُرآب ہو جاتا ہوں، اس کا اثر میرے دل پر کئی دن رہتا ہے۔ خدا کرے کہ کوئی مسلمان گھر اس رسالے سے خالی نہ رہے۔"[۱۲۵]

حافظ فضل الرحمان انصاری کو ۱۹۳۷ میں لکھتے ہیں :

"جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے، فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے۔ ان حالات میں آپ کے بلند مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے لیے یورپ جانا بے سود ہے:

میر کیا سادہ ہیں بیار ہوئے جس کے سبب اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

مصر جائیے، عربی زبان میں مہارت پیدا کیجیے، اسلامی علوم، اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ، تصوف، فقہ، تفسیر کا بغور مطالعہ کر کے محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ پھر اگر ذہن خداداد ہے اور دل میں خدمت اسلام کی تڑپ ہے تو آپ اس تحریک کی بنیاد رکھ سکیں گے جو اس وقت آپ کے ذہن میں ہے"[۱۲۶]

علامہ اقبال کی تعلیقات میں راہنمائی کا یہ میدان بہت وسیع ہے اور ان کی وسعتِ نظر کا عکاس ہے۔ دوسرے ممالک کے بسنے والوں کی راہنمائی کے لیے بھی وہ کوشاں نظر آتے ہیں۔ قسطنطنیہ یونیورسٹی کے پروفیسر خالد خلیل کے نام ان کے مندرجہ ذیل (انگریزی) خط کو ہم راہنمائی کے سلسلے میں ان کا شاہ کار قرار دے سکتے ہیں:

مائی ڈیر خالد خلیل! میں آپ کو یہ خط سید سجاد (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے مکتوب کے جواب میں لکھ رہا ہوں جنھوں نے کچھ عرصہ ہوا آپ کا خط یہاں اخبارات میں شائع کرایا اور خصوصاً مجھ سے ایسی تجاویز طلب کیں جو آپ کی عالمانہ مساعی و مشاغل میں معاون ہو سکیں۔ میرے نزدیک قسطنطنیہ یونیورسٹی کے ادارہ دینیات نے یہ نہایت دانشمندانہ کام کیا ہے۔ اگر اسلامی علم الانساب کا کام باقاعدہ طور پر کیا گیا تو غالباً ایسے انکشافات

---

[۱۲۵] شیخ عطاء اللہ ۔ اقبال نامہ جلد دوم، ص ۱۶۳

[۱۲۶] ایضاً، دیباچہ، ص ۳۶

بروئے کار آئیں گے جن سے دنیائے اسلام کی بابت ترکوں کا دائرۂ نظر وسیع تر ہو جائے گا اور اس طرح ممکن ہے کہ نوخیز نسل کا ذہنی اور روحانی نصب العین محکم تر ہو جائے۔ علاوہ ازیں اس قسم کی تحقیقات سے انسانی علوم کے سرمایہ میں اضافہ ہوگا اور ممکن ہے نسلی خصوصیتوں کی تہ میں وحدت روح کے ایسے سامان دریافت ہو سکیں جن کا اندازہ سطحی مشاہدے سے بمشکل لگایا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے اس سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو سکے کہ ایشیا کی سیرت کی تشکیل میں جس کا راز اب تک معلوم نہیں کیا جا سکا ہے، مہتم بالشان تاتاری نسل کی بعض اہم تر شاخیں کارفرما رہی ہوں۔ جو کام آپ کے پیش نظر ہے، اس کے امکانات بے پایاں ہیں اور مجھے یقین ہے، آپ اپنے خطباتِ علمی سے انسانیت، اسلام اور اپنے ملک و ملت کی زبردست خدمات انجام دیں گے اور کم از کم دس سال کی مستقل سعی و محنت کے بعد آپ ملل اسلام اور ان لوگوں کے لیے جو بطریقِ مختلفہ ان ملل سے دلچسپی رکھتے ہیں، ایک کلیتہً جدید نقطۂ نظر مہیا کر سکیں گے۔

۱۔ میں پہلے ایک عام تجویز پیش کروں گا۔ آپ کو ادارۂ دینیات کو مشورہ دینا چاہیے کہ جتنی کتابیں تاریخی یا اور قسم کی یورپین اور اسلامی زبانوں میں مختلف ممالک کے مسلمانوں کے متعلق لکھی گئی ہیں، وہ ان سب کو فراہم کرے۔ یورپین کتابوں میں سے اکثر بلاشبہ خاص اغراض کو مدِنظر رکھ کر تصنیف کی گئی ہیں (مثلاً تبلیغی، سیاسی، تجارتی وغیرہ) تاہم ان کتابوں میں کہیں کہیں آپ کو اپنے مضمون سے متعلق نہایت مفید معلومات ملیں گی۔ مثلاً مارشل کی "اسلام چین میں"، ایک مشنری نے مشنری اغراض کے لیے لکھی ہے۔ بایں ہمہ اس کتاب کے بعض حصص کے مطالعہ سے چینی مسلمانوں کے موجودہ نصب العین، ان کی تحریکات اور ان کی آرزوؤں کا پتا لگتا ہے۔ مصنف نے ان کی اصلیت کے متنازع فیہ مسئلہ، ان کی موجودہ آبادی، ان کے معابد اور ان کے ادب کی نوعیت سے بھی بحث کی ہے۔ ایک دوسری مثال سٹورڈ کی تصنیف "جدید دنیائے اسلام" ہے۔ یہ ان کتابوں میں سے ہے جو جنگِ عظیم کے بعد ضبطِ تحریر میں آئی ہیں اور اس کے مصنف کا مقصد (جو اینگلو سیکسن نسل کی برتری کا قائل معلوم ہوتا ہے) محض ایک طرح کی سیاسی اشتہار بازی ہے۔ تاہم یہ ایک مفید کتاب یورپین زبانوں میں لکھی ہوئی ان کتابوں کے بے شمار حوالے دیتی ہے جو اسلام اور ملِ اسلامیہ پر لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کتابیں ہیں جن کو سیاحوں یا حکومت ہائے یورپ کے ان سیاسی نمائندوں نے فرداً فرداً بعض اسلامی ممالک پر لکھا ہے، جہاں وہ متعین تھے۔ مثلاً برٹن اور فلبی (عرب) گوبنو (فارس) اور ویری (وسط ایشیا)۔ یہ وہی ویری ہے جس نے مرحوم سلطان عبدالحمید کو بتایا تھا کہ اسلام کے حلقہ بگوش ہونے سے قبل ترک اپنے ایک

مخصوص رسم الخط کے مالک تھے۔

یہ سب کتابیں جمع کرنی چاہییں اور اپنے خطبات کی ترتیب و تیاری میں آپ کو ان سے مدد لینی چاہیے۔ میسرز لوزک اینڈ کمپنی برٹش میوزیم لندن سے مراسلت کیجیے، ان کی فہرست کتب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یورپین مستشرقین نے اسلامی تمدن پر کتنا زبردست ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا لائپزگ (جرمنی) کے پروفیسر ڈاکٹر فشر سے مراسلت کرنا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ میرا خیال ہے وہ آپ کے مضمون کے متعلق قیمتی مشورے دے سکیں گے۔ اگر آپ خود ان سے واقف نہیں تو خط میں میرا حوالہ دے دیجیے گا۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر زویمر کا نام بھی لوں گا جو قاہرہ میں ایک مشنری ہیں۔ وہ اسلام کی مخالفت میں ایک رسالہ "مسلم ورلڈ" کی ادارت بھی کرتے ہیں، لیکن انھوں نے متعدد کتابوں اور مضامین کی صورت میں ملل اسلامی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ گزشتہ سال وہ لاہور آئے تھے اور انھوں نے جرمن زبان میں مجھے ایک کتاب دکھائی تھی، جس میں اسلام اور ملل اسلام پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے عنوانات درج تھے۔ میں اس کے مصنف کا نام بھول گیا ہوں، مگر یہ آسانی سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ ڈاکٹر زویمر کو لکھیں تو وہ آپ کو بتا دیں گے۔ یہ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور اس سے اغلباً آپ کو ایسی کتابوں کے نام ملیں گے جو آپ کے مضمون سے متعلق ہیں۔ پروفیسر ہارو تز (فرینکفرٹ جرمنی) سے بھی مشورہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ تصریحاً میں مشورہ دوں گا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مستقل طور پر پیش نظر رہے۔ اس میں آپ کو اسلامی ممالک مثلاً افغانستان، بلوچستان، کشمیر وغیرہ پر ان کی نسلی اور نسبی خصوصیات پر مضمون ملیں گے۔ فارس کے متعلق میں ETHNOGRAPHIE DE LA PERSE NICOLAS DE KHANIKIF MEMOIR SUR کے مطالعہ کا مشورہ دوں گا۔ یہ کسی قدر پرانی کتاب ہے، مگر اس سے آپ کو اپنے کام کی نوعیت اور ترتیب کا ایک عام اندازہ ہو جائے گا۔

۳۔ جہاں تک آپ کے خطبات کی ترتیب کا تعلق ہے، میں حسب ذیل مشورے دینا چاہتا ہوں۔ شروع میں دو ایک ابتدائی خطبات ہوں، جن میں حسب ذیل امور پر بحث ہو:

(الف) علم وظائف الاعضا کے نقطۂ نظر سے نسل کی حیثیت۔

(ب) وہ اسباب جن سے نسلوں کی تفریق پیدا ہوئی۔

(ج) کیا مذہب ایک نسل آفریں عنصر ہے؟ بذاتہ میں محسوس کرتا ہوں کہ تفریق لسانی کے باوجود

کیا عالمِ اسلام کی ادبیات ایک مشترک پیش نہاد کی حامل ہیں؟ بحیثیت مجموعی میرا خیال ہے کہ ایسا ہے۔

(د) اسلامی نسلوں کا ایک سرسری دائرہ۔

۱۔ سامی۔

(ا) عرب (ب) افغانی اور کشمیری۔ (کیا یہ عبرانی ہیں؟)

۲۔ آریائی۔

(ا) ایرانی (ب) ہندی مسلمان، یہ مخلوط النسل ہیں، آریائی عنصر غالب ہے، جاٹ اور راجپوت جیسا کہ بعض مصنفین کا خیال ہے شاید تاتاری ہیں۔

۳۔ تاتاری۔

(ا) وسط ایشیا کے تاتاری (ب) منگولین (کاشغری اور تبتی)۔ (ج) چینی مسلمان (د) عثمانی ترک

۴۔ حبشی اور بربری۔

۵۔ علم الانساب کے اغراض و مقاصد۔

۴۔ میری رائے ہے کہ مثال کے طور پر افغانوں پر خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے:

خطبۂ اول — افغان، افغانستان میں نسلوں کا خلط ملط، فارسی بولنے والے افغان اور پشتو بولنے والے افغان۔ کیا افغان اور پٹھان میں کوئی چیز مابہ الامتیاز ہے؟ کیا افغان عبرانی ہیں۔ اپنی اصلیت کے متعلق اُن کی اپنی روایات۔ کیا پشتو زبان میں عبرانی الفاظ ملتے ہیں؟ کیا وہ ان یہودیوں کے اخلاف ہیں جن کو ایرانی کسریٰ نے اسیرین کی غلامی سے نجات دلائی تھی؟ جدید افغانستان کے بڑے بڑے قبائل، ان کی تخمینی آبادی۔

خطبۂ دوم — افغانوں کے اسلام لانے کے زمانے سے ان کی سیاسی تاریخ پر سرسری تبصرہ۔

خطبۂ سوم — افغانوں کو متحد کرنے کی جدوجہد۔

(ا) مذہبی۔ پیر روشن اور ان کے اخلاف

(ب) سیاسی۔ مشہور افغان شیر شاہ سوری، جس نے افغانانِ ہند کو متحد اور عارضی طور پر حکومتِ مغلیہ کو برطرف کر دیا تھا۔ اس کی تگ و دو کا صرف ہندوستان تک محدود ہونا۔

(ج) خوشحال خان خٹک — سرحدی افغانوں کا زبردست سپاہی شاعر، جس نے ہندوستان کے مغلیہ کے خلاف افغان قبیلوں کو متحد کرنا چاہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ افغان عبرانی النسل تھے۔ اس نے آخر شہنشاہ

اورنگ زیب سے شکست کھائی اور کسی ہندی قلعے میں قید کر دیا گیا۔ افغانوں کا شاید اوّلین قومی شاعر تھا۔

(د) احمد شاہ ابدالی

(ہ) مرحوم امیر عبدالرحمان خاں۔ موجودہ امیر اور افغانوں میں قومی تشخص پیدا کرنے کی جدوجہد۔

خطبۂ چہارم ــــ موجودہ افغانی تمدن۔ ان کی قدیم اور جدید صنعت وصناعت، ان کی ادبیات، ان کی آرزوؤں اور حوصلہ مندیوں کی ترجمان کی حیثیت سے۔

خطبۂ پنجم ــــ افغانی نسل کا مستقبل۔

۵۔ آخر میں ایک نہایت اہم تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں، گو اس کا تعلق اس خط کے مضمون سے نہیں ہے۔ ادارۂ دینیات کو چاہیے کہ دینیات کی ایک پروفیسر شپ قائم کرے جس پر کسی ایسے شخص کو متعین کیا جائے جس نے اسلامی دینیات اور جدید یورپین فکر وتصور کا مطالعہ کیا ہو تاکہ وہ مسلم دینیات کو افکارِ جدیدہ کا ہم دوش بنا سکے۔

قدیم اسلامی دینیات کے (جس کا ماخذ زیادہ تر یونانی حکمت وفکر تھا) تار پود بکھر چکے ہیں، اب وقت آچکا ہے کہ اس کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ترکی حکومت کو چاہیے کہ جس طور پر وہ اور معاملات میں پیش قدمی کر رہی ہے، اس معاملے میں بھی پیش قدمی کرے۔ یورپ نے عقل والہام کو ہم آہنگ بنانا ہم سے سیکھا ہے، وہ اپنے دینیات کو موجودہ فلسفے کی روشنی میں ازسر نو تعمیر کرنے میں ہم سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اسلام کہ عیسائیت سے کہیں زیادہ عقلی مذہب ہے، اس شعبے میں کیوں بے حس وحرکت رہے۔ ادارۂ دینیات کو ایک جدید علمِ کلام کی طرح ڈالنی چاہیے اور ترکی کی نوخیز نسل کو یورپ کی لامذہبیت سے محفوظ ومصئون کر لینا چاہیے۔ مذہب قوم میں ایک متوازن سیرت پیدا کرتا ہے جو حیاتِ ملی کے مختلف پہلوؤں کے لیے بیش بہا ترین سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یورپ نے اپنے باشندوں کی تعلیم وتربیت سے مذہب کا عنصر حذف کر دیا ہے اللہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی بے لگام انسانیت کا کیا حشر ہوگا۔ شاید ایک نئی جنگ کی صورت میں وہ اپنی ہلاکت کا باعث خود ہو۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور"

علامہ کے شہ پاروں کے سہارے تاریخ میں ان کی غیر معمولی دلچسپی کا جائزہ لینے کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ راہنما اقبال کو ایک ایسے روپ میں دیکھیں جس میں شاعر اقبال اور مورخ اقبال یک جان ویک قالب نظر

اسے ۔۔ ان دو مختلف حیثیتوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ طویل تاریخی واقعات کو ایک یا چند ۔۔۔ میں پیش کرنے میں علامہ کو ید طولی حاصل تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی سامراج نے جب کشمیر کو گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تو علامہ نے فرمایا :

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گزر کنی ۔۔۔ حرفے زما بہ مجلسِ اقوام باز گوی

دہقان و کشت و جوی و خیابان فروختند ۔۔۔ قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

برصغیر میں آج کون ایسا ہے جو میر جعفر اور میر صادق کے نام سے واقف نہ ہو۔ علامہ نے جاوید نامے میں ان کے متعلق جو یہ ایک شعر کہا ہے، وہ تاریخ کے ایک سو صفحات پر بھاری ہے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن ۔۔۔ ننگِ آدم، ننگِ دین، ننگِ وطن

اس کے بعد روحِ ہند کی زبان سے یہ شکایت زبان پر لاتے ہیں :

ملتے را ہر کجا غارت گرے ہست ۔۔۔ اصل او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر الاماں ۔۔۔ الاماں از جعفران این زماں

غلام قادر روہیلہ کی فتح اور تیموریوں کی شکست کا بیان کسی تاریخ میں پڑھ کر ممکن ہے کہ قاری بھول جائے لیکن بانگِ درا میں شامل نظم بعنوان "غلام قادر روہیلہ" کے مندرجہ ذیل اشعار کو فراموش کرنا ناممکن ہے:

روہیلہ کس قدر ظالم، جفا جو، کینہ پرور تھا ۔۔۔ نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے

دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ستم گر نے ۔۔۔ یہ اندازِ ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے

بھلا تعمیلِ فرمانِ ستم ۔۔۔ کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بارِ خنجر سے

کمر سے اٹھ کے تیغ جاں ستاں آتش فشاں کھولی ۔۔۔ سبق آموز تابانی ہوں انجم جس کے جوہر سے

پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے ۔۔۔ شکایت چاہیے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے

مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی، تکلف تھا ۔۔۔ کہ غفلت دور ہے شانِ صف آرایانِ لشکر سے

یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی ۔۔۔ مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے

مگر یہ راز کھل گیا سارے زمانے پر ۔۔۔ حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

علامہ کی اسی قسم کی نظموں اور اسی انداز کے اشعار کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر اعجاز حسین اردو شاعری میں تاریخی رجحان کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

علاوہ ازیں شعر کے اقبال کی حیثیت نے مختلف شخصوں کے کردار بیان کر کے اردو ادب کے ذخیرے کو وسیع کرنے کی بڑی کوشش کی ہے۔ ——— دوسرے شعرا میں امام حسین کے ایثار و استقلال کو جتنا سراہا گیا ہے، اتنا کسی دوسری ہستی کو اردو شاعری میں غزل و نظم میں جگہ نہیں دی۔ اقبال، حفیظ، جوش کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی قومی مجاہد کی بہترین مثال میں امام حسین کو یاد کیا ہے۔[illegible]

میرا خیال ہے کہ مذکورہ بالا کو علامہ نے رموزِ بیخودی میں جس طرح تاریخی حقیقت کو برقرار رکھتے ہوئے دلنشین اور موثر صورت میں پیش کیا ہے، وہ تاریخ اور شاعری کے حسین امتزاج کی ایک لاجواب کوشش ہے۔ حضرت حسین کی شان میں کہے گئے مندرجہ ذیل اشعار کو ہم معنوی اعتبار سے قصیدے کے شعر کہہ سکتے ہیں، لیکن ان میں مبالغہ بالکل نہیں، تاریخی حقائق بیان کیے گئے ہیں:

آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؓ — سروِ آزادے ز بستانِ رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر
بہرِ آں شہزادۂ خیر الملل — دوشِ ختم المرسلین نعم الجمل
رمزِ قرآں از حسین آموختیم — ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت — سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز — تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

میں آخر میں اس حقیقت کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مضمون میں علامہ کی تاریخی یا نیم تاریخی نوعیت کی جملہ تحریریں شامل نہیں۔ اس موضوع پر تحقیقی کام کی بہت ضرورت ہے۔

[illegible] ڈاکٹر اعجاز حسین — نئے ادبی رجحانات، ص ۶-۱۸۵

پروفیسر بختیار حسین صدیقی

جدید نظریاتِ تعلیم اور اقبال

نظریے کا لفظ تعلیم میں کس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے؟ سب سے پہلے ہمیں اس بات کی وضاحت کرنی چاہیے۔ علم عمل کی لازمی شرط ہے۔ اس لیے نظریہ عمل کی ضد نہیں ہے۔ نہ ہی تعلیم میں یہ اس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جس میں یہ سائنس میں مستعمل ہے۔ سائنس میں نظریے سے مراد مربوط بیانات کا ایک سلسلہ ہے جو طبعی دنیا کے کسی پہلو سے متعلق ہمارے تجربے میں آنے والے حقائق کو منضبط کرتا ہے اور تجربی آزمائش کے ذریعے جس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ ڈی۔ جے۔ اکنور (D. J. O' CONNOR) اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ نظریے کو تعلیم میں بھی اس معیار پر پورا اترنا چاہیے، ورنہ وہ نظریہ کہلانے کا مستحق نہیں۔ تعلیمی نظریہ چونکہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا، اس لیے وہ کہتا ہے کہ نظریے کا لفظ جب ہم تعلیم میں استعمال کرتے ہیں تو یہ محض "مروت" (COURTESY) کا ایک خطاب ہے[1] اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

اکنور کی یہ رائے تعلیم پر منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) کے فلسفے کے بڑھتے ہوئے اثر کی ایک مثال ہے، جس کا مقصد فلسفے کو تصور کی بلندیوں سے گھسیٹ کر حقائق کی دنیا میں آباد کرنا ہے۔ تعلیمی تصورات کا منطقی اثباتیت کے نقطۂ نظر سے تجزیہ کرنا ایک بڑی علمی خدمت ہے۔ اکنور کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ سائنسی نظریے اور تعلیمی نظریے کی نوعیت میں فرق کو محسوس نہ کر سکا۔ پال ہرسٹ (PAUL HIRST) نے اپنے مضمون "فلسفہ اور تعلیمی نظریہ" میں جو نومبر ۱۹۶۳ء کے برٹش جرنل آف ایجوکیشنل اسٹڈیز میں شائع ہوا، اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ سائنسی نظریات اور عملی کاموں کے

---

[1] ڈی۔ جے۔ اکنور، این انٹروڈکشن ٹو دی فلاسفی آف ایجوکیشن، لندن، روٹلیج اینڈ کیگن پال، ۱۹۵۷ء ص ۱۱۰۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ وہ کہتا ہے کہ تعلیمی امور میں نظریے (THEORY) کا لفظ ایک ماخوذ (DERIVATIVE) اور کمزور مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ ص ۷۵

اصول اپنی نوعیت میں بالکل مختلف ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ مختلف قسم کے کاموں کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔
سائنس جسے نظریہ کہتی ہے وہ مشاہدے اور تجربے پر مبنی تحقیق کا نتیجہ ہوتا ہے، فطرت کے کسی پہلو سے متعلق صحیح، مربوط اور مکمل علم حاصل کرنے کی کوشش کا ایک ثمرہ۔ یہ کوشش چار مراحل پر مشتمل ہوتی ہے۔
سائنس دان کو جب کسی واقعے کی اصل وجہ معلوم نہیں ہوتی تو حقائق کی روشنی میں پہلے وہ اس کے لیے ایک وجہ فرض کرتا ہے۔ قیاس پر مبنی اس وجہ کو سائنس کی اصطلاح میں مفروضہ (HYPOTHESIS)
کہتے ہیں۔ شروع میں یہ مفروضہ ناکافی شہادت پر مبنی ہوتا ہے۔ تحقیق کے دوران میں اگر اس کے حق میں مزید شہادت مل جائے تو اس کے صحیح ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے اور وہ مفروضے سے ترقی کر کے ایک قابلِ عمل مفروضہ بن جاتا ہے۔ اب حقائق کی روشنی میں مفروضے کی تصدیق (VERIFICATION)
اور توثیق (CONFIRMATION) کی باری آتی ہے جس کے بعد وہ ایک جائز (LEGITIMATE) مفروضہ بن جاتا ہے۔ چوتھے اور آخری مرحلے میں مفروضے کی آزمائش کے لیے کوئی فیصلہ کن مثال (CRUCIAL INSTANCE) تلاش کی جاتی ہے جس پر اگر وہ پورا اترے تو وہ مسلم الثبوت نظریہ بن جاتا ہے۔ یہ ہے نظریے کی تحقیق کا سائنسی طریق کار۔

تعلیم جیسے عملی کام میں نظریے کی حیثیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں وہ صحیح، منظم اور جامع علم حاصل کرنے کی کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ عمل کی راہ متعین کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ ہدایت، رہبری اور رہنمائی کا کام دیتا ہے۔ عملی اصول آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کا تعلق مختلف قسم کے کاموں سے ہوتا ہے۔ تعلیم جس قسم کا عملی کام ہے اس میں نظریہ مختلف قسم کے علوم، اقدار اور عقائد سے مرتب ہوتا ہے، جن میں نفسیاتی اصول، معاشرتی اقدار اور فلسفیانہ اور مذہبی عقائد شامل ہیں۔ نفسیات، عمرانیات، فلسفہ اور مذہب یہ سب مل کر تعلیمی نظریے کا تعین کرتے ہیں۔

ہرسٹ اور اکنور کی فکر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کیا نتائج کو نظریہ کہا جا سکتا ہے؟ ہم یہ کہیں گے کہ دونوں کی حیثیت کم از کم نظری ہے، کیوں کہ ان کا تعلق عام اصولوں سے ہے جو تجربے سے حاصل ہوتے ہیں اور اس سے مسلسل مربوط رہتے ہیں۔ "تعلیم پر نظری بحث میں ہم متعدد اور مختلف قسم کے علوم سے ماخوذ تصورات کی روشنی میں اپنے کام کا جائزہ لیتے ہیں اور ہمارا مقصد اپنے کام کو زیادہ معقول طریقے سے سمجھنا اور اسے بہتر بنانا ہوتا ہے۔"[۲۵] کردار کی دنیا میں سب سے زیادہ اہم سوال "کیا کرنا چاہیے" کا سوال ہے۔ اس کے

---

[۲۵] ایچ۔ ایل۔ ایلون۔ ایجوکیشن اینڈ کنٹمپوریری سوسائٹی، لندن، سی، اے واٹس، ۱۹۶۵ء، ص ۴۔

یہ ضروری ہے کہ ہمیں اصل صورتِ حال، اس کی تاریخ اور اس کی سمت کا پتا ہو جس سمت میں معاشرہ حرکت کر رہا ہے۔ "چاہیے" کی نوعیت کے تمام مسائل فلسفے کے دائرے میں آتے ہیں جب کہ کسی عملی کام کے لیے فلسفے سے صحیح اصول اخذ نہیں کیے جاسکتے۔ پھر بھی ایچ - ایل - ایلون (H. L. ELVIN) کے الفاظ میں عمرانیات، نفسیات، معاشرتی فلسفے اور تعلیمات متقابلہ" کے علوم تعلیم کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس کے تین وجوہ ہیں۔

۱۔ تعلیم سے متعلق "چاہیے" کی نوعیت کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہمارے پاس انتہائی حقائق پر مبنی ایسا ٹھوس علم موجود ہو جسے سائنس کے اصولوں کے مطابق مرتب اور منظم کیا گیا ہو۔

۲۔ سائنسی تکنیک ہی وہ واحد تکنیک ہے جسے ہمیں تعلیمی مسائل پر بحث میں استعمال کرنا چاہیے۔ کیوں کہ سائنس ہی نہ کہ فلسفہ یا مذہب علم کے معاملے میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳۔ "چاہیے" کی نوعیت کے سوالوں پر بحث و تمحیص سے اگرچہ ہمیں کوئی ایسا حتمی جواب نہیں مل سکتا جس پر سب متفق ہوں، لیکن پھر بھی بہتر اور مناسب فیصلہ کرنے میں ہمیں اس سے مدد مل سکتی ہے۔[۵۳]

اُکنور کی طرح ایلون بھی منطقی اثباتیت کا حامی ہے، اس لیے وہ بھی مذہب یا مابعد الطبعیات (METAPHYSICS) کی بجائے تعلیمی نظریے کی بنیاد سائنس کے ٹھوس علم پر رکھنا چاہتا ہے۔ جس کی آج کل "علم حق" پر اجارہ داری ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم تعلیم کے مختلف نظریات کی طرف رجوع کریں گے۔

تعلیم کے مختلف نظریات

انسان میں دو قسم کے رجحانات بیک وقت کارفرما ہیں۔ ایک پرانی روایات کے احترام کا رجحان، دوسرا نئی چیزوں کو قبول کرنے کا رجحان۔ وہ بیک وقت قدامت پرست بھی ہے اور جدت پسند بھی۔ لیکن ان دونوں رجحانات کی شدت ہر فرد، قوم یا معاشرے میں ایک جیسی نہیں ہوتی۔ انفرادی مزاج، معاشرتی ماحول اور ثقافتی ساخت کے اعتبار سے کسی فرد یا معاشرے میں قدامت پرستی کا رجحان زیادہ شدید ہوتا ہے اور کسی میں جدت پسندی کا۔ ہر تعلیمی نظریہ ان دو رجحانات میں سے کسی ایک کی غمازی کرتا ہے یعنی وہ قدامت پرستی کا مظہر ہے یا جدت پسندی کا۔ قدامت پرستی نے جس تعلیمی نظریے کو سب سے پہلے جنم دیا وہ تاریخ میں

---

۵۳ ایچ - ایل - ایلون، ایجوکیشن اینڈ کنٹیمپوریری سوسائٹی، لندن اسی - اے - واٹس، ۱۹۶۵، ص ۲۰

ابدیت (PERENNIALISM) کے نام سے موسوم ہے ۔ بعد میں اس نے مذہب کی قبا اتار کر
(ESSENTIALISM) کا فلسفیانہ لباس پہن لیا ۔ اسی طرح جدت کے رجحان نے پہلے ترقی پسندی
(PROGRESSIVISM) اور تعمیر نو (RECONSTRUCTIONISM) کی شکل اختیار کی جن پر سائنس کے اثرات
کی گہری چھاپ ہے ۔ تعمیر نو ترقی پسندی ہی کی ایک نئی شکل ہے ، جس طرح اصولیت ابدیت کی ایک نئی
شکل ۔ انہیں فلسفیانہ نظریات کے دو جوڑے کہنا اگرچہ نامناسب نہیں تاہم ان چاروں میں نمایاں فرق بھی ہے۔

۱ ۔ ابدیت کا نظریہ

تاریخی اعتبار سے ابدیت کا نظریہ سب سے زیادہ پرانا تعلیمی نظریہ ہے ۔ سدا بہار پودے کی مثال
اس پر پوری طرح صادق آتی ہے ۔ جس طرح یہ پودا دوبارہ بیج بوئے بغیر ہر موسم میں خود ہی اپنی تجدید کرتا
ہے ، اسی طرح تعلیم میں ابدیت کے حامیوں کی دلچسپی حقیقت ، صداقت اور بالخصوص اقدار کے ایسے
اصول دریافت کرنے ، سیکھنے اور سکھلانے میں ہے جو دوامی ، مستقل اور غیر متغیر ہوں ۔ وقت کے ساتھ ساتھ
جنھیں بدلنے کی ضرورت نہ پڑے ۔ صرف ایسے اصول ہی معاشرتی استحکام کی ضمانت دے سکتے ہیں ، لیکن یہ
اصول آسانی سے حاصل نہیں ہوتے ۔ سخت سے سخت ذہنی ریاضت اور وجدان سمیت ذہن کی مختلف صلاحیتوں
کی کڑی سے کڑی تربیت بھی ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتی ، کیونکہ ان کا سرچشمہ عقل یا انسانی تجربہ نہیں بلکہ وحی
الٰہی ہے ۔ خدا پیغمبروں کو ان ابدی اصولوں اور اقدار کا علم عطا کرتا ہے اور وہ ہمیں ان کی تلقین کرتے ہیں ۔
علم ، اقدار اور سچائی کا سرچشمہ مذہب ہے اور صرف مذہب اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے ہی پر فرد کی فلاح
اور معاشرے کا استحکام موقوف ہے ۔ عموماً ہر فرد کو ابدی سچائیوں کی تعلیم دی جاتی ہے ، لیکن صرف اعلیٰ
صلاحیتوں کے حامل افراد ہی کی تعلیم میں یہ سچائیاں اپنی پوری روحانی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں ۔
عام لوگوں کی تعلیم ایصال و انتقال کی منزل سے آگے نہیں بڑھتی ۔

ابدیت کی تاریخ بہت پرانی ہے ۔ یونانی دیو مالا (MYTHOLOGY) کے زیر اثر افلاطون نے سچائی
اچھائی اور حسن کو زندگی کی تین بنیادی اقدار کی حیثیت سے پیش کیا ۔ یہ ابدیت کا ایک قدیم نیم شاعرانہ
نیم مذہبی تصور تھا ۔ قرون وسطیٰ کے تین مدرسی (SCHOLASTIC) فلسفے —— اسلامی ، عیسائی اور یہودی مذہبیت
مذہب اور فلسفے پر مبنی ابدی تعلیم کے شاہکار تھے ۔ جدید دور میں ایچ ۔ ایچ ۔ ہورن (H. H. HORNE)
کا روحانی خود افروزی کا نظریہ ، ایچ ۔ ایس ۔ براوڈی (H. S. BROUDY) کا تکمیل ذات کا نظریہ اور ان کے

"بنیادی مضامین" اور "عظیم کلاسیکی شاہ کاروں" کی تعلیم کے نظریے بھی ابدیت ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔

اصولیت کا نظریہ

ابدیت کی زیادہ تر دلچسپی اخلاقی اقدار میں تھی۔ اس کے برعکس اصولیت کا اصل زور حصول علم کے انتقال پر ہے۔ ابدیت مذہب کی حلقہ بگوش تھی۔ اصولیت فلسفے کی گرویدہ ہے اور ... کی رو سے تعلیم کی غایت یہ ہے کہ وہ ان اصولوں، قدروں، قوانین، رسم و رواج اور ہنروں کو ... میں منتقل کرے جو کسی معاشرے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک خاص حد کے اندر وہ بھی معاشرے میں تغیر و تنوع کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتی ہے، تاہم ابدیت کی طرح اس کی اصل دلچسپی ... استحکام میں ہے نہ کہ معاشرتی تغیر و تبدیلی میں۔ علمیاتی (EPISTEMOLOGICAL) ... سچائی کا انحصار اس بات پر ہے کہ استاد آزمودہ علم کی لازمی خصوصیات کو صحیح طور پر نسل ... میں منتقل کرے۔ جہاں تک قدریات (AXIOLOGY) کا تعلق ہے، یہ ان سیاسی اقدار کی ... کرتی ہے جو جدید مغربی تہذیب کا جزو لاینفک ہیں۔ وجودیاتی (ONTOLOGICAL) اعتبار سے اصولیت حقیقت کے متعلق دو متضاد نظریوں سے منسلک ہے۔

(الف) عینیت (IDEALISM) : اصولیت کے کچھ حامیوں کا نظریہ ہے کہ حقیقت اولیٰ اپنی ماہیت میں ذہنی یا روحیتی ہے۔ وہ خیال یا تصور کے مترادف ہے۔ افلاطون کے نزدیک یہ دنیا ایک اصل کی ... ہے، جو اعیان یا تصورات کی صورت میں عالم ارواح میں محفوظ ہے۔ لاک، برکلے اور ہیوم کے نزدیک ... سے مراد اعیان ثابتہ نہیں بلکہ ذہنی کیفیات ہیں۔ ہیگل کے الفاظ میں حقیقت تصور ہے اور تصور حقیقت ... اس مطلق (ABSOLATE) عینیت کی رو سے آموزش کوئی تخلیقی کام نہیں بلکہ غیر مطلق، حسن مطلق، ... مطلق کو اپنی ذات میں سمونے کا نام ہے۔

(ب) مادیت (MATERIALISM) : اصولیت کے کچھ ہم نواؤں کا خیال ہے کہ حقیقت اولیٰ ... مادی یا مادی ہے۔ فطرتیت (NATURALISM) اور شیئیت (REALISM) مادیت کی دو مختلف ...

... اصولیت کے حامیوں کی وجودیات خواہ کسی قسم کی ہو، وہ سب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ... مقصد معاشرے میں رائج قوانین، اصولوں اور قدروں کو نسلاً بعد نسل منتقل کرنا ہے۔[۱]

---

[۱] ... بریملڈ، ... ایجوکیشنل فلاسفی ... یونیورسٹی آف پٹسبرگ پریس، ۱۹۶۵، ص ۲۳۔

۳- ترقی پسندی کا نظریہ

ابدیت اور اصولیت دونوں سکون و ثبات کے فلسفے ہیں۔ معاشرتی استحکام دونوں کا مقصد ہی ہے اور تعلیم اس مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ۔ لیکن استحکام کے دائرے میں رہ کر ترقی محال ہے۔ اس لیے ترقی کے حامی ثبات کے بجائے تغیر پر زور دیتے ہیں۔ "وہ ابدیت اور اصولیت کے ہم نواؤں سے اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ تعلیم بجا طور پر معاشرتی عقائد اور اقدار کو نئی نسل میں منتقل کرتی ہے، لیکن ان کی اصل دلچسپی نظام انتقال کے بجائے اسلوب حیات کے بدلنے میں ہے۔"[۵۵] ان کا اصل مقصد معاشرتی نظام کو بدلنا ہے جس کا انحصار تعلیم میں سائنس کے تجرباتی طریق کے استعمال پر ہے۔ جس طرح ابدیت پر مذہب کی چھاپ ہے اور اصولیت پر فلسفے کی، اسی طرح ترقی پسند تعلیم پر سائنس کا غلبہ ہے۔ وہ طلبا کو وہ طریق فکر سکھانا چاہتی ہے جو سائنس دان اپنے کسی مسئلے کو حل کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ ڈیوی اس طریق فکر کو مسئلی (PROBLEM) طریق یا منصوبی (PROJECT) طریق کہتا ہے۔

ترقی پسندی کی بنیاد نتائجیت (PRAGMATISM) کے فلسفے پر ہے جو امریکیوں کا مخصوص فلسفہ ہے۔ اس فلسفے کی رو سے حقیقت اولی تغیر ہے اور صرف تغیر۔ ظاہر ہے کہ تغیر کے اس سیل رواں میں سچائی اور اقدار سے پہلے کوئی بنی بنائی مکمل چیزیں نہیں ہو سکتیں جو شرف قبولیت حاصل کرنے کی منتظر ہوں۔ ان کی اصل شکل و صورت تجربے کے عمل میں متعین ہوتی ہے۔ سچائی کوئی پہلے سے بنی بنائی چیز نہیں بلکہ تجربے کے عمل میں بنتی ہے۔ اسی طرح علم بھی تجربے کا ثمر ہے۔ سچائی علم اور اقدار کا ماخذ چونکہ تجربہ ہے "اس لیے تعلیم تجربے کی اس تعمیر نو یا تنظیم نو کا نام ہے جس سے تجربے کی معنویت میں اضافہ ہو اور جو بعد کے تجربات کا رخ متعین کرنے کی لیاقت بڑھائے۔"[۵۶] ایک لفظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تعلیم کا اصل زور تجربے پر ہے نہ کہ پہلے سے بنی بنائی اقدار اور علم پر۔

جس طرح ترقی میں تغیر کا مفہوم پوشیدہ ہے، اسی طرح تغیر میں جدت کا مفہوم مضمر ہے۔ جدت سے مراد کسی پہلے سے موجود حقیقت کو دریافت کرنا نہیں بلکہ صحیح معنوں میں کسی نئی چیز کی تخلیق ہے۔ سب اشیا ایک

---

۵۵ تھیوڈور بریملڈ، دی یوز آف ایکسپلوسو آئیڈیاز، یو۔ایس اے۔ یونیورسٹی آف پٹسبرگ، ۱۹۶۵ء، ص ۲۳

۵۶ جان ڈیوی، ڈیموکریسی اینڈ ایجوکیشن، نیویارک، میکملن اینڈ کمپنی، ۱۹۱۶ء، ص ۱۱۷

ہی وقت میں نہیں بدلتیں اور نہ ہی وہ ایک رفتار سے بدلتی ہیں، اس لیے جدت ایک اضافی تصور ہے۔ پرانی اشیا ہی نئی چیزوں کو جنم دیتی ہیں۔ یہ ہے وہ نتائجی فلسفہ جس کی بنا پر ترقی کے حامی تعلیم میں وہ طریق فکر اپنانے پر زور دیتے ہیں جو سائنس دان اپنے کسی مسئلے کو حل کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ طریقہ پرانی چیزوں کو نئی چیزیں معلوم کرنے، مانوس اشیا کو غیر مانوس اشیا کے جاننے کا ایک وسیلہ سمجھتا ہے اور آئندہ پیش آنے والی نئی صورت حال کے مقابلے کے لیے تیار کرتے ہیں ترقی کے قابل بنا دیتا ہے۔[۵۴]

دلچسپی اور آزادی ترقی پسند تعلیم کے بنیادی اصول ہیں۔ ڈیوی کے یہاں یہ اصول نتائجیت کے نظریۂ علم پر مبنی ہیں۔ ترقی کے کچھ حامی ڈیوی کے بجائے روسو (ROUSSEAU) کو اپنا پیشوا مانتے ہیں، جس نے رومانی فطرتیت (ROMANTIC NATURALISM) کی بنیاد رکھی لیکن جسے قبولیتِ عام کا شرف پسٹالوزی (PESTALOZZI)، فروبل (FROEBEL)، مادام مونٹیسوری (MONTESSORI) وغیرہ نے بخشا۔ رومانی فطرتیت کے حامی ترقی پسند تعلیم کی بنیاد "انسانی فطرت" پر رکھتے ہیں۔ بچہ ان کے نزدیک فطرتاً ایک فعال ہستی ہے۔ وہ خود روحرکت کا پیکر ہے۔ آزادی اس کی روح ہے اور دلچسپی اس کا اصولِ عمل، جس کے ذریعے وہ اپنی ذات کا بے محابہ اظہار کرتا ہے۔ اس مفہوم میں ترقی پسند تعلیم فطرت کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔

تعمیرِ نو کا نظریہ

سائنس اور ٹیکنالوجی نے دنیا کی شکل بدل دی ہے۔ فاصلے سکڑ گئے ہیں۔ ساری دنیا ہماری ہمسایہ بن گئی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم قومی معاشروں اور ملکی ثقافتوں کے محدود دائروں سے نکل کر عالمی سطح پر ایک وسیع انسانی معاشرے اور ثقافت کی تشکیل میں براہِ راست حصہ لیں۔ اقوامِ متحدہ کی تنظیم اس سلسلے میں ایک نیک شگون ہے۔ یہ ہے تعمیرِ نو کے داعیوں کے نزدیک تعلیم کا اصل مقصود۔ جس طرح ترقی پسندی حال میں مگن رہتی ہے، اسی طرح تعمیرِ نو کو مستقبل کا غم کھائے جاتا ہے۔ تعمیرِ نو کا داعی مستقبل کو اپنی وجودیات (ONTOLOGY) کا اصل حصہ سمجھتا ہے، کیوں کہ آگے بڑھنا اس کے نزدیک زندگی کا عمومی وصف ہے۔ اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ اس بات کے متعلق سوچیں کہ مستقبل میں زندگی کا کیا اسلوب ہوگا اور اس کے مطابق حال کی منصوبہ بندی کریں، تو مستقبل حال میں ایک زندہ قوت بن جاتا ہے اور حقیقت کا جامہ پہن لیتا ہے۔[۵۵]

---

۵۴ جے۔ ایس بروبیکر، ماڈرن فلوسوفیز آف ایجوکیشن، نیویارک، میک گرا ہل بک کمپنی، ۱۹۵۰ء۔ ص ۲۹۹

۵۵ ایضاً، ص ۳۰۴

تعمیر نو نے گو ترقی پسندی کی آغوش میں پرورش پائی ہے لیکن وہ اس کی اصلاحات کی سست رفتار اور محدود دائرے سے مطمئن نہیں۔ ایک خاصے مستحکم معاشرے کے لیے ترقی پسندی کا پروگرام بالکل ٹھیک ہے، جس پر تبدیلیاں تو آتی ہیں لیکن اسے قائم و دائم رکھنے کے لیے جو اصلاحات کرنا پڑتی ہیں ان کا دائرہ بہت تنگ اور محدود ہوتا ہے۔ دو عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں، ایٹمی ہتھیاروں کے تیزی سے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ اور بالخصوص اشتراکیت اور سرمایہ داری کی آپس میں بڑھتی ہوئی آویزش نے دنیا کو تباہی کے غار کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ ان حالات میں اِکّا دُکّا اور چھوٹی موٹی اصلاحات کافی نہیں، بلکہ پورے تعلیمی نظام کی ازسرِنو تعمیر ضروری ہے۔ یہ انسانیت کی بقا کا مسئلہ ہے، اس لیے اس کام میں ہمیں دیر ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔

تعمیرِ نو ترقی پسندی کے مقابلے میں زیادہ مقصد نواز ہے۔ ترقی پسندی کی اصل غرض تعلیمی امور میں سائنس کے تجرباتی طریق کے استعمال سے ہے جب کہ تعمیرِ نو کی دلچسپی تمدن کے وسیع اغراض و مقاصد سے ہے۔ جو طریقے ان مقاصد کے حصول میں مدد دیتے ہیں، وہ "گروہی دلچسپی" اور "اجتماعی عمل" کے طریقے ہیں، جنھیں ترقی پسندی نظر انداز کر دیتی ہے، کیوں کہ ان کی دلچسپی صرف "بچے کی نشوونما" میں ہے۔ تعمیرِ نو اس نوع کی تعلیم کی خواہاں ہے جو عالمی سطح پر ثقافت کی تشکیلِ نو میں موثر کردار ادا کر سکے، کیوں کہ اس کے نزدیک تاریخ کے جس بھنور میں ہم پھنس چکے ہیں، اس سے نکلنے کی ہم نے کوشش نہ کی تو تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا[۵۹]

جارحانہ قوم پرستی اور وطن پرستی کی مسموم فضا میں تعمیرِ نو کا عالمی ثقافت کا منصوبہ بظاہر ایک خیالی منصوبہ معلوم ہوتا ہے، تاہم یہ غیر حقیقی بالکل نہیں۔ یہ منصوبہ عوام الناس کی زیادہ سے زیادہ خود افروزی پر زور دیتا ہے۔ عوام الناس چوں کہ زیادہ تر مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اس لیے تعمیرِ نو کی تعلیم پر محنت کش طبقے کی چھاپ ہوگی۔ لیکن اس قسم کی تعلیم کا اہتمام صرف ایک فلاحی مملکت ہی کر سکتی ہے جو عوام کی بہبود کی خواہاں ہو، جس میں جمہوریت کا بول بالا ہو اور انسان کے استحصال کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اس منصوبے پر اتفاق رائے عوامی آئیڈیالوجی کی صورت میں پہلے ہی موجود ہے۔ یہ مشترک عقائد، اقدار، عادات اور اطوار جن پر عوامی آئیڈیالوجی مشتمل ہوگی، ایک طرح کے گروہی ذہن کا تصور پیش کرتے ہیں اور معاشرتی اعتبار

---

۵۹ ہیرپشہ: کتاب مذکور، ص ۲۵

سے زندگی کی ایک عمومی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا لحاظ رکھنا فلسفۂ تعلیم کے لیے ازبس ضروری ہے۔[۱۰]
اس منصوبے میں شرکت کی نوعیت خالصتاً رضاکارانہ ہے اور عوام کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ سکول کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کی جبری ترغیب دے، لیکن استاد یا شاگرد جب ایک مرتبہ اس کا قائل ہو جائے تو وہ بےشک اس کا پروپیگنڈا کر سکتا ہے۔

ابدیت، اصولیت، ترقی اور تعمیر نو کے چار نظریوں میں سے کوئی تعلیمی نظریہ بھی، جیسا کہ بریمیلڈ (BRAMELD) کہتا ہے، اپنی جگہ پر مکمل اور کافی بالذات نہیں، بلکہ ایک مخصوص ثقافتی پس منظر میں زیادہ سے زیادہ ایک تناظر کی ایک حیثیت رکھتا ہے۔ ہر نظریہ دوسرے نظریوں سے بہت کچھ لیتا ہے اور انھیں بہت کچھ دیتا بھی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بہتر ہوگا کہ وہ سب ایک سلسلے میں کام کرتے ہیں۔ انھیں قطعی طور پر ایک دوسرے سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ یہ نظریے آج کل کی فلسفیانہ فکر کی تمام انواع کا احاطہ نہیں کرتے۔ جدید فلسفوں میں وجودیت (EXISTENTIALISM) نے تعلیمی فکر پر گہرا اثر ڈالا ہے، لیکن تعلیمی فلسفے صرف جزوی طور پر ہی اس کا ذکر کرتے ہیں۔[۱۱]

۵۔ اقبال کا نظریۂ تعلیم

تعلیم کے جن چار نظریوں سے ہم نے اوپر بحث کی ہے اس سے ایک بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ وہ معاشرتی استحکام پر زیادہ زور دیتے ہیں یا معاشرتی تغیر پر، اور اسی کے مطابق علی الترتیب ابدی سچائیوں اور آزمودہ اصولوں کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں یا "متواتر نمو" اور "عالمی ثقافت" کو۔ ابدی سچائیوں کا سرچشمہ مذہب ہے۔ آزمودہ اصول مذہب فراہم کرتا ہے اور فلسفہ بھی۔ "متواتر نمو" کا ضامن سائنس کا مسلسل طریق ہے۔ "عالمی ثقافت" کی تشکیل "گروہی دلچسپی" اور "اجتماعی عمل" پر موقوف ہے۔ اقبال کے

---

۱۰ جے، ایس بروبیکر، کتاب مذکور، ص ۲۵

۱۱ اس رجحان میں اب کچھ کمی آ رہی ہے۔ رسالوں میں جستہ جستہ مضامین شائع ہونے کے علاوہ اس موضوع پر اب مبسوط کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں، جن میں یہ دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں: جی؛ ایف، نیلر (KNELLER) "اگزسٹینشیالزم اینڈ ایجوکیشن، نیویارک، جان ولی اینڈ سنز، ۱۹۵۸ — برنارڈ کرٹس (CURTIS) اینڈ ولف میز (MAYS) فینومینولوجی اینڈ ایجوکیشن، لندن، میتھوئن اینڈ کمپنی، ۱۹۷۸۔

نزدیک تعلیم کا محور ابدی سچائیاں ہیں جو مذہب ہمیں فراہم کرتا ہے۔ دینی عقائد اور اقدار ہی کی اساس پر زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے" ایک مستحکم اور " متناسب عمرانی نظام " قائم کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم کا اصل مقصود چوں کہ معاشرتی استحکام ہے، اس لیے اقبال خالصتاً مذہبی مفہوم میں ابدیت کے نظریے کے حامی ہیں، لیکن تعلیم کا مقصود ان کے نزدیک معاشرے کی صرف بقا اور استحکام ہی نہیں، بلکہ اس کی نمو اور ترقی بھی ہے، مستحکم معاشرے کی اساس بے شک قانونِ الٰہی ہے۔ یہ قانون روحانی ہے اور ابدی بھی، لیکن جامد ہرگز نہیں۔ اس کی روحانیت اور ابدیت جہاں استحکام میں جلوہ فگن نظر آتی ہے، وہاں تغیر و تنوع میں بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ "جس معاشرے کی بنیاد حقیقت مطلق کے اس تصور پر ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کا یکساں طور پر لحاظ رکھے۔ اس کے پاس ضرور کچھ ایسے ابدی اصول ہونے چاہییں جو اجتماعی زندگی میں نظم و ربط قائم رکھیں، کیوں کہ ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں ہم اپنا قدم مضبوطی سے جما سکتے ہیں تو ان ہی کی بدولت۔ لیکن یہ ابدی اصول و تغیر و تبدیلی کے امکانات کو بالکل ختم نہیں کرتے کیوں کہ تغیر قرآن کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی ہے جسے نظر انداز کر کے ہم اس شے کو جس کی فطرت ہی حرکت ہے، حرکت سے عاری کر دیں گے۔"[۱۲]

تغیر اور ترقی کی اہمیت کو تسلیم کر کے اقبال ابدیت کے حلقہ بگوش ہونے کے باوجود ترقی کے حامیوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔ زندگی چوں کہ نمو پذیر ہے، اس لیے تعلیم کو چاہیے کہ وہ اس کی قوتِ نمو کی آب یاری کرے۔ لیکن " ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں، اس میں حفظِ ثبات کے بھی کچھ عناصر موجود ہیں۔ اپنی تخلیقی سرگرمیوں سے لطف اندوز ہونے اور اپنی قوتوں کو ہمیشہ زندگی کی نئی جہتیں معلوم کرنے پر مرکوز کرنے میں جب انسان پر اس کی اپنی ذات عیاں ہوتی ہے تو وہ ایک قسم کا اضطراب محسوس کرتا ہے۔ آگے بڑھنے کی کوشش میں وہ اپنے ماضی کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا اور خود اپنے داخلی پھیلاؤ پر اسے گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ آگے کی طرف بڑھنے میں ایسی قوتیں اس کی مزاحمت کرتی ہیں جو مخالف سمت میں کام کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں زندگی ماضی کا بوجھ اپنی کمر پر اٹھائے آگے بڑھتی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ معاشرے میں تغیر و تبدیلی کا جو نقشہ ہم نے تیار کیا ہے، اس

۱۲۔ دی ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۷۷، ص ۱۴۷، ۱۴۸

میں تقلید کی قوتوں کی قدر و قیمت فراموش نہ کریں۔۔۔ کوئی قوم اپنے ماضی کو یکسر نہیں بھلا سکتی، کیوں کہ ماضی ہی نے ان کے ذاتی تشخص کی تشکیل کی ہے[13]

پس اقبال گو اصولی طور ابدیت کے قائل ہیں، لیکن وہ تغیر و ترقی کو اس کے دائرے سے خارج نہیں سمجھتے۔ قانونِ الٰہی ہر چند ابدی اور دوامی ہے، لیکن اس کے باوصف وہ ساکن وجامد ہرگز نہیں۔ وہ تغیر، ترقی اور حرکت کی نفی نہیں کرتا۔ اسلام اعتدال اور توازن کا دین ہے۔ وہ ثبات و تغیر اور تقلید و ترقی میں اعتدال قائم کر کے معاشرے کے بقا اور اس کے نمو دونوں کا سامان مہیا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نہ جامد ابدیت کے حامی ہیں اور نہ ہی بے مہار ترقی کے۔ وہ ان دونوں عناصر کو اپنے نظریۂ تعلیم میں مساوی جگہ دیتے ہیں۔ اسلام میں حرکت اور ترقی کے اصول کا نام اجتہاد ہے[14] جس کے ذریعے "فکرِ دینی کو ازسرِ نو تعمیر کرنا"[15] ان کے نزدیک تعلیم کا اولین فرض ہے۔ لیکن تعمیرِ نو سے ان کی مراد صرف ایک "نئی دینیات اور کلام کی تعمیر"[16] اور فقہ اسلامی کی تشکیلِ نو ہے[17] جس کی نظیر ہمیں فقہائے متقدمین کے یہاں ملتی ہے۔ جب وہ "اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنے" پر زور دیتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد "فکرِ دینی" کی صرف اسی قسم کی تعمیرِ نو ہے۔ اپنے مشہور خطبات کا نام، جو ۱۹۳۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے، "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ"، رکھنے میں بھی یہی مقصد کارفرما ہے۔

اس کے علاوہ اقبال رومانی فطرتیت کے مفہوم میں بھی ترقی پسند تعلیم کے حامی ہیں۔ ان کے نزدیک "بچہ ایک متعلم ہستی نہیں بلکہ سراپا ایک متحرک ہستی ہے جس کی ہر طفلانہ حرکت سے کوئی نہ کوئی تعلیمی فائدہ اٹھانا چاہیے"[18] کیوں کہ اسی پر اس کی "جسمانی اور روحانی نمو"[19] کا دار و مدار ہے۔ تعلیمی عمل کو بچے کی خود متحرکی پر مرکوز کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اُسے اپنی دلچسپیوں کے مطابق تجربے کے ذریعے سیکھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اور دلچسپی اور آزادی ہی وہ اصول ہیں جن پر ترقی پسند تعلیم کی بنیاد استوار ہے۔ لیکن یہ رومانی فطرتیت اقبال

---

[13] ایضاً، ص ص ۱۶۶، ۱۶۷ [14] ایضاً، ص ۱۴۸

[15] محمد حسین خاں زبیری، مؤلف، مشاہیر کے تعلیمی نظریے، کراچی، جاوید پریس، س۔ ن۔ ص ۲۷۰ [16] ایضاً، ص ۲۷۱

[17] اقبال، کتاب مذکور، ص ۱۶۸

[18] سید عبدالواحد معینی، مؤلف۔ مقالات اقبال۔ شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۶۳، ص ۴ [19] ایضاً، ص ۳

پر زیادہ دیر تک حاوی نہیں رہی۔

تیسری دنیا کے مغربی علم برداروں کو انسانیت کی نجات اس میں نظر آتی ہے کہ تعلیم قومی معاشروں اور ملکی ثقافتوں کے محدود دائروں سے نکل کر "عوامی آئیڈیالوجی" کی صورت میں عالمی ثقافت کی تشکیل میں مدد دے۔ اقبال کو اس قسم کی کسی آئیڈیالوجی کی تشکیل کی ضرورت نہیں پیش آتی، کیوں کہ ان کے نزدیک نظریہ ابدیت خود" اخوت کی جہاں گیری"، "محبت کی فراوانی" اور "انسانیت کے احترام" کی تعلیم دیتا ہے جو مشترک مادی اغراض کے مقابلے میں نوع انسانی کی وحدت کے لیے ایک زیادہ پائیدار روحانی اساس مہیا کرتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی اس ابدی تعلیم پر صدقِ دل سے عمل کیا جائے۔ چنانچہ وہ نہایت ہی پُرزور الفاظ میں کہتے ہیں کہ "جب تک تمام دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کردیں، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی۔ کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں۔ اس ایک واقعے سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی محترم ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو رنگ و نسل و زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو مٹایا نہ جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔"[۱۴۵]

ہم سب آدم کی اولاد ہیں اور اس لیے آپس میں بھائی بھائی۔ نہ عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے اور نہ عجمی کو عربی پر۔ نہ گورا کالے سے افضل ہے اور نہ کالا گورے سے۔ صرف اور صرف اسی بنیاد پر دنیا کو ایک ایسی وسیع برادری میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، جس میں حریت، اخوت اور مساوات کا بول بالا ہو۔

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی ۔۔۔ اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا ۔۔۔ نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی[۱۴۶]

---

۱۴۵ لطیف احمد شروانی، مولف، حرفِ اقبال، لاہور، المنار اکیڈمی، ۱۹۴۷، ص ص ۲۴۶-۲۴۷

۱۴۶ کلیاتِ اقبال اردو۔ لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵، ص ۲۷۰

ڈاکٹر محمد ریاض

اقبال کی اردو شاعری کے چند پہلو

علامہ اقبال کی اردو شاعری پر غور کرتے وقت چند ذیلی عنوانات ذہن میں آتے ہیں۔ ان کے پیشرو اُردو شعرا، فارسیت، عرفان وتصوف، حقائقِ دین، خالص اصطلاحات اور نئے اسالیبِ بیان۔

اقبال کی نثر و نظم کی تصانیف میں جن اردو شعرا کے نام مذکور ہیں وہ یہ ہیں: میرزا غالب، امیر مینائی، میرزا داغ، محمد حسین آزاد، خواجہ حالی، شبلی نعمانی، خواجہ عزیز لکھنوی اور اکبر الہ آبادی۔ ان میں امیر مینائی، آزاد اور عزیز کے نام ضمنی طور پر آگئے ہیں۔ میرزا داغ سے اقبال بذریعہ ڈاک اصلاحِ سخن لیتے رہے اور ان کے رنگ میں انھوں نے بعض اشعار بھی کہے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے ظریفانہ رنگ میں اقبال نے کافی اشعار کہے ہیں جن میں سے بعض "بانگِ درا" کے آخری حصے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بانگِ درا (دورِ سوم) کے حصہ غزلیات میں انھوں نے اکبر کا ایک مصرع تضمین کیا۔ اور ان کے لقب "لسان العصر" کو بھی ارقام کیا ہے۔ اقبال کی یہ مختصر غزل دراصل اکبر کے اتباع میں ہے:

گرچہ تو زندانیٔ اسباب ہے — قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں — عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
اے مسلمان ہر گھڑی پیشِ نظر — آیۂ "لا یخلف المیعاد" رکھ[1]
یہ "لسان العصر" کا پیغام ہے — "اِنّ وعد اللہ حق" یاد رکھ[2]

اقبال نے داغ اور اکبر کے مرثیے بھی لکھے۔ داغ کے مرثیے میں انھوں نے اس "بلبل دلی" کے عاشقانہ محاکات لکھنے کی مہارتِ تامہ کو سراہا ہے (بانگِ درا حصہ اوّل)۔ اکبر کا مرثیہ فارسی میں ہے جسے "باقیاتِ اقبال" میں دیکھا جا سکتا ہے:

دریغا کہ رخت از جہان اے اکبر — حیاتش بحق بود روشن دلیلے

---

[1] قرآن مجید۔ ۱۳: ۳۱ [2] ایضاً۔ ۱۳: ۵۵

سر ذروۂ طور معنی کلیمے | بہ بت خانۂ دورِ حاضر خلیلے
نوائے سحرگاہ او کارواں را | اذان درائے، پیام رحیلے
زدلہا برافگندۂ لات و عزیٰ | بجہانہا کشائندۂ سلسبیلے
دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی | دلش پرورش دادۂ جبرئیلے

یہ مرثیہ اور اقبال کے کئی خطوط اس امر کے غماز ہیں کہ وہ اکبر کی شاعری کے موضوعات یعنی ان کی متنوع قومی شاعری کے قدر دان تھے۔

میرزا غالب یقیناً اقبال کے قابلِ ذکر پیشرو تھے، مگر اقبال کی اردو شاعری پر میرزا موصوف کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ اس کی کئی وجوہ ہیں: اقبال نے غالب کی طرح اردو غزل میں تغزل کی طرف توجہ نہ کی کیونکہ وہ ایک صاحبِ پیغام شاعر تھے۔ اقبال کا مقصد ابلاغِ پیغام تھا، اس لیے انھوں نے بیدل کا وہ مشکل پیرایہ اختیار نہ کیا جو غالب کے معتدبہ ابتدائی اشعار کا خاصہ رہا ہے۔ اقبال نے کئی مکاتیب اور بیانات میں اس بات پر اظہارِ خیال کیا ہے کہ غالب اپنی اردو شاعری میں بیدل کی ناکام تقلید کرتے رہے ہیں۔[۵۳] غالب کو اپنی اردو شاعری پر فارسی شاعری سے کمتر ناز رہا ہے،[۵۴] گو ان کی شاعرانہ قدر دانی اردو کی زیادہ منت پذیر رہی ہے۔ اقبال بھی میرزا موصوف کی فارسی شاعری کے بے حد مداح تھے۔ بانگِ درا کی نظم "میرزا غالب" اقبال کے احترام غالب کے احساسات کی آئینہ دار ہے۔ "جاوید نامہ" (فلکِ مشتری) میں اقبال نے غالب کے درج ذیل شعر کو فارسی میں منتقل کرکے اس کے معانی لکھتے ہیں:

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ | اے نالہ، نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟[۵۵]

بانگِ درا (ظریفانہ کلام کا حصہ) اور بالِ جبریل وغیرہ میں اقبال نے غالب کے چند مصرعے اور اشعار بھی تضمین کیے ہیں،

"اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے" | غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکرِ غیر کیا؟

---

۵۳ دیکھیں "انوارِ اقبال" اور "گفتارِ اقبال"۔ مرتبہ بشیر احمد ڈار اور محمد رفیق افضل

۵۴ فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ | بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است
جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشکِ فارسی | گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

۵۵ اس کے معانی پر حالی نے بھی "یادگارِ غالب" میں روشنی ڈالی ہے۔

مرزا غالب خدا بخشے، بجا فرما گئے ہیں[56] — "ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟"

تیریٔ الفت کی حرارت گر نہ ہو دل میں — "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

جاتا ہوں[57] تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ — پہچانتا ہوں ابھی راہبر کو میں

چند دوسرے اردو اشعار میں بھی اقبال نے بظاہر غالب کے کلام کی طرف (صوری لحاظ سے) توجہ رکھی ہے:

غالب:

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور — کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

اقبال:

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج — بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگراں اور

غالب

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم، ملامت نہ کر مجھے — آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

ناکامیٔ نگاہ ہے، برقِ نظارہ سوز — تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر — فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے، اسد — پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

اقبال:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی — ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن — دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست — محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

آخر بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم — طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں — دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

---

[56] مصرعِ اول: ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت، اسد

[57] بالِ جبریل، "قطعہ"، فلسفہ و مذہب"۔ غالب نے چلتا اور راہرو کی جگہ بظاہر چلنا اور تیز رو استعمال کیا تھا۔

آخری مثال بانگ درا حصہ اوّل سے ہے۔ ۱۹۲۳ء میں اگرچہ سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے "دیباچۂ بانگ درا" میں غالب اور اقبال کی غیر معمولی مماثلت کا ذکر فرمایا تھا، مگر حقیقت میں دونوں کی معنوی دنیا مختلف ہے۔ (دونوں کی فارسی شاعری کے ذکر سے یہاں احتراز کیا جاتا ہے) اور اسلوب کی بھی کوئی خاص ہم آہنگی نظر نہیں آتی۔

اقبال، حالی اور شبلی کے یقیناً قدر شناس تھے۔ ۱۹۱۴ء کے اواخر میں جب ان دونوں ناموروں نے انتقال کیا، تو اقبال نے مرثیہ نما چند شعر بھی لکھے تھے:

خاموش ہو گئے چمنستاں کے رازدار — سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں — حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد
"اکنون کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں[۵۸] — بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد"

انھوں نے چند موارد میں حالی کی تعریف کی ہے۔ مسدس "مدوجزر اسلام" انھیں بے حد پسند تھا۔ اس کتاب اور حالی کے "شکوۂ ہند" کا اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ سے کسی قدر رابطہ ضرور مشہود ہے۔ اقبال نے حالی کے رنگ میں بعض اشعار بھی کہے ہیں:

حالی: بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ — مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
اقبال: وہی لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ — جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے حالی اور اکبر کی قومی شاعری کا خاصا اثر قبول کیا ہے۔ طبائع اور اسالیب کا اختلاف البتہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ حالی مسلمانوں کی عظمتِ پارینہ کا راگ الاپتے ہیں مگر ان کے مستقبل کی ترقی کے بارے میں پُر امید نہیں۔ وہ مسلمانوں کے انحطاط پر رو دھو کر چُپ سادھے رہتے ہیں، مگر انحطاط کا احساس دلانا بھی معمولی بات نہیں۔ اکبر نے ظریفانہ حکمت کے ذریعے مسلمانوں کے اصلاحِ احوال کی کوشش کی۔ اقبال نے حالی اور اکبر کا دوگانہ کام کیا اور کچھ اس پر مزید بھی۔ انھوں نے مسلمانوں کی عظمتِ گزشتہ نظم کی، ان کے انحطاط کا ذکر کیا، ان کی پس ماندگی پر طنز و ظرافت کے تیر برسائے، اور اہم تر یہ کہ انھیں درسِ حیات دیا، اور پیغامِ بیداری بھی۔ اس ضمن میں اقبال کی کچھ مماثلت شبلی سے بھی ماننی پڑے گی۔ شبلی، طبیعت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کبھی کبھی اردو یا فارسی میں شعر کہہ لیتے تھے۔ انھیں اس شاعری سے چنداں اعتنا نہ تھا، اور ان کے

---

۵۸ شعر از حافظ شیرازی۔

علمی و ادبی فتوحات کے مقابلے میں یہ کوئی چار ہزار اشعار جو دونوں زبانوں میں تقریباً مساویانہ منقسم ہیں، کوئی خاص وزن رکھتے بھی نہ ہوں گے۔ مگر اقبال، شبلی کی شعر العجم، سیرۃ النبیؐ اور ان کی اردو شاعری کے واصف رہے[۹] ہیں۔ دونوں کی وہ نظمیں جو تاریخِ اسلام کے مختلف وقائع کے بارے میں ہیں، قابل مقائسہ ہیں۔ بلقان اور طرابلس کی معاصر جنگوں کے بارے میں اقبال نے بے نظیر شعر کہے، مگر شبلی کا شہر آشوب اسلام[۱۰] بھی معمولی نہیں۔ شبلی نے ایک نظم میں کان پور کے شہدا کی قربانیوں کو منعکس کیا، اور اقبال نے اسی طرح طرابلس کے شہدا کو نذرانہ پیش کیا ہے، کسی مفصل موازنے کی ضرورت نہیں۔ شبلی، شبلی ہے اور اقبال، اقبال۔ مقدم الذکر نے تو سنجیدگی سے شاعری کی ہی نہیں، مگر عجیب اتفاق ہے کہ اقبال کی اردو نظم، شبلی کی اردو شاعری سے اقرب نظر آتی ہے۔ (شبلی کی اردو شاعری، تغزل سے عاری ہے۔ اقبال کے ہاں بھی تغزل کے شعر انگشت شمار ہیں۔ شبلی کی فارسی غزل سراپا تغزل ہے، اور اقبال نے بھی اُردو کے مقابلے میں فارسی میں قابلِ ملاحظہ تغزل آمیز اشعار کہے ہیں)

اقبال نے اردو میں ۶ ہزار سے کچھ زیادہ اشعار کہے ہیں۔ ان میں تھوڑے سے اشعار مذکورہ بالا اردو شعرا کے کلام کے تتبع کہے جا سکتے ہیں، مگر مجموعی طور پر فکر کی طرح ان کا اسلوب بھی منفرد اور بے نظیر ہے۔ ان کے ہاں صوری اور معنوی طور پر "آمد" ہی نظر آتی ہے، آورد کے شائبات ان کے دورِ تجربہ کی یادگار ہیں۔

فارسیت

اقبال کے اردو کلام میں 'فارسیت' (فارسی لغات، ترکیبات اور محاورات) بہت نمایاں ہے۔ اُردو نے فارسی کی صفات، ترکیبات، اسما اور سابقے لاحقے بہت سے جذب کر لیے ہیں اور کئی آئندہ جذب کرے گی۔ ہمارے اکثر ذولسانین شعرا (فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہنے والوں) کے ہاں "فارسیت" خاصی ثقیل نظر آتی ہے۔ مگر غالب اور اقبال اس معاملے میں دوسروں سے ممتاز تر ہیں۔ ان دونوں نے اردو کے مقابلے میں فارسی میں زیادہ شعر کہے ہیں۔ (اقبال کے فارسی اشعار ان کے اردو اشعار سے ڈیڑھ گنا سے بھی زیادہ ہیں) اور

---

۹ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ — مکاتیب بنام سید سلیمان ندوی

۱۰ اس نظم کے آخری دو شعر ہیں:

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں — تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک؟

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں — کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک؟

"فارسیت" کے رنگ میں رنگے ہوئے - اقبال نے فارسی محاورے (جیسے خوش آنا بمعنی اچھا لگنا جو خوش آمدن کا ترجمہ ہے) زیادہ نہیں استعمال کیے - فارسی شعرا کے ترجمے اور ان کے اشعار کی تضمین، اقبال کے ہاں زیادہ ہیں، اور یہ اُن کی اپنی جدت ہے - انھوں نے نہایت خوبصورت فارسی تراکیب استعمال کیں۔ ان کے قافیے اور ردیفیں بھی اکثر فارسی لغات پر مبنی ہیں[۱۱] یہ سب کچھ بظاہر قابل نقد و تنقید نہیں، مگر عربی اور فارسی زبانوں سے بے رغبتی کے نتیجے میں فارسی تراکیب اور اضافات کا حامل ان کا کلام نہ صحیح لکھا جاتا ہے اور نہ صحیح پڑھا جاتا ہے - حالیہ سالوں میں شائع ہونے والے ان کے اردو کلام کے مجموعوں اور کلیاتِ اُردو طبع ۱۹۷۳ میں اضافتوں کی متعدد غلطیاں نظر آتی ہیں - نظم "ذوق و شوق" کو جب بھی ریڈیو یا ٹیلیویژن سے سنا، ذیل کے شعر میں "علم" کے م کو متحرک (اضافت کے ساتھ) اور "نخیل" کے ل کو ساکن پڑھا گیا:

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ شب و روز   مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیلِ بے رُطب

یہ حقیقت ہے کہ غالب اور اقبال کے اردو کلام کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے فارسی کی خاص استعداد بہم پہنچانا ضروری ہے۔

عرفان و تصوف

صوفیانہ مضامین، ہمارے ادب کا ایک اہم عنصر رہے ہیں۔ تصوف بقول اقبال اب زوال پذیر ہو چکا اور اس کے احیا کا امکان بھی نہیں، مگر صوفیانہ موضوعات اب بھی مسلمانوں کے شعر و ادب (خصوصاً فارسی اور اُردو) میں سموئے جا رہے ہیں - اقبال، اسلامی تصوف کے قدردان تھے - انھوں نے متعدد صوفیا کی خدمات کو سراہا بھی ہے مگر وہ جامد اور بے عمل صوفیا کے خلاف تھے، اور غفلت آموز آدابِ تصوف کے بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کے ذریعے اردو زبان انتہائی اعلیٰ عرفانی اور صوفیانہ مضامین سے مالا مال ہوئی ہے - خواجہ میر درد کے بعد اردو کو دوسرا عارف شاعر اقبال کی صورت میں ملا ہے - دیگر اردو شعرا کے ہاں بھی کہیں کہیں عارفانہ مضامین بیان ہوئے ہیں، مگر درد اور اقبال کے ہاں یہ خاص موضوعات ہیں - اقبال کے اُردو (اور اسی طرح فارسی) کلام کا ایک قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اس میں پہلی بار خودی اور بے خودی (یعنی تعمیرِ شخصیت اور تشکیلِ ملت) کے آداب ایک

---

۱۱ مثلاً حافظ اور اقبال کی یہ غزلیں جن کے مطلعے بالترتیب نقل کیے جا رہے ہیں:

سحر با باد می گفتم حدیثِ آرزو مندی   خطاب آمد کہ واثق شو بہ الطافِ خداوندی

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی   مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اقبال نے پوری غزل میں غزلِ حافظ کے قوافی استعمال کیے ہیں۔

لریۂ حیات کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ کیا "فقر اسلامی" کی اردو شعر میں یہ توصیف قابلِ غور اور لائقِ قدر نہیں ہے۔

فقر کے ہیں معجزات، تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد — فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
علم فقیہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم — علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر — فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی — ایک سپاہی کی ضرب، کرتی ہے کارِ سپاہ
دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو — تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ

روح اسلام کی ہے نورِ خودی، نارِ خودی — زندگانی کے لیے نارِ خودی، نور و حضور
یہی ہر چیز کی تقویم، یہی اصلِ نمود — گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظِ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر — دوسرا نام اس دین کا ہے "فقرِ غیور"

اقبال اس تصوف کے مؤید اور قائل ہیں جس میں خودی کی تکمیل اور بے خودی کی نشو و نما کے سامان موجود ہوں۔ یعنی وہ مسلمان فردِ حقیقی "صوفی" کہلانے کا مستحق ہے جو ملتِ مسلمہ کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہو:

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علمِ لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار — شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

روایتی اور اقبال کے پسندیدہ فقر و تصوف کا امتیاز مندرجہ ذیل تین شعروں سے نمایاں ہو جاتا ہے:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری
اک فقر ہے شبیری، اس فقر میں ہے میری — میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیری

حقائقِ دین

ضمناً اقبال کی اردو شاعری کے اس معنوی پہلو پر غور کرنا چاہیے کہ انھوں نے حقائقِ دین کے چہرے کو نئی آب و تاب کے ساتھ نمایاں کیا اور اردو ادب کے افتخارات میں اضافہ فرمایا۔ توحید، رسالت، ہجرت، جہاد، معراج،

نماز اور حج وغیرہ کے عقائد و اعمال صدیوں سے معروف و متداول تھے، مگر مرورِ ایام سے ان صداقتوں کے عمق کو لوگ بھلا بیٹھے تھے۔ الا ماشاء اللہ۔ ایک مفکر اردو شاعر نے ان حقائق و حکم کے دقیق پہلوؤں کی طرف مسلمانوں کی توجہ ازسرِ نو مبذول کرائی۔ مثلاً توحید کا تقاضا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان فکر و عمل کی اساسیات میں متحد ہوں[۱۲]۔ رسالت، انسانی حریت اور مساوات کی مظہر ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مکمل فرما گئے اور نمونے کی ایک امت کی تشکیل بھی ان کے مقدس ہاتھوں انجام پا گئی، لہٰذا اب کسی دوسرے نبی کی نقلاً و عقلاً ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہجرت، محدود وطنیت (وطن پرستی) کا ردِ عمل تھی کہ مسلمانوں کا وطن، کسی ایک خطۂ ارضی میں محدود نہ رہے۔ معراج کا واقعہ انسان کی روحانی اور جسمانی قویٰ کی غیر محدودیت کا مظہر ہے کہ اجرامِ فلکی اور سیارات انسانی دسترس سے باہر نہیں ہیں[۱۳]۔ نماز، عبدیت، پاکیزگی، اتحاد اور مساوات[۱۴] کی عکاس ہے۔ جہاد، سخت کوشی کی علامت ہے کہ مسلمان دفاع اور اصلاح کی غرض سے سرگرمِ عمل رہے اور خدا کی زمین کو شر و فساد سے پاک رکھنے کی کوشش کرے، جبکہ حج اُسے ہجرت، اتحاد اور مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ ان باتوں کو فصیح و بلیغ نثر میں لکھنا بھی کارے دارد، مگر اقبال نے انھیں (بلکہ متعدد دیگر حقائق کو) حسنِ شعر کی آب و تاب دے کر بیان کیا، اور ان تعلیمات نے نئی نسل پر خاطر خواہ اثر ڈالا ہے!۔

اقبال نے اردو زبان کے دامانِ لغات میں نئی اور خاص معانی کی حامل اصطلاحات کا اضافہ کیا ہے، اور اقبال خواں افراد اب ان اصطلاحات کو اپنی تحریروں میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ مگر شعرِ اقبال کی تفہیم کا تقاضا ہے کہ ان کی خاطر کچھ ممارست کی جائے۔ خود، خودی، بیخودی، عشق، عقل (خرد، خبر)، نظر، دل، فقر، غیور، شوق، تجلیات، حریم کبریا، حریم ابدی، عرب، عجم، افرنگ، افرنگ زدہ، سوز و ساز، عشق و مستی، خدا مستی، یقیں۔ دانش برہانی، دانش نورانی، جذب و مستی، خاراشگافی، شیشہ گری، شیشہ گدازی، زجاج گر، خاکبازی، شاہبازی۔ ذوقِ تجلی، تقدیر شکنی، زندانی تقدیر، نے نواز، نے نوازی، نواگر، رند، قلندر، آہ سحرگاہی،

---

[۱۲] آہ اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہ — وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

[۱۳] رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں — کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے — کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

[۱۴] یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے — ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

نغانِ نیم شبی، جذبِ مسلمانی، شاہینی وعقابی اور طائرِ لاہوت وغیرہ اصطلاحات اس وقت نمونے کے طور پر نقل کی جاتی ہیں۔

نئے اسالیبِ بیان

معنوی انقلابات سے قطع نظر صوری لحاظ سے اقبال کی اُردو شاعری کے نئے اسالیب بیان قابلِ توجہ اور جالب نظر ہیں۔ ان کی منظرکشی، تشبیہات استعارات، کنایات اور دیگر محاسنِ سخن کا طبیعی استعمال اور ان کی غیر معمولی مکالماتی (ڈرامائی) صلاحیت پڑھنے والے کے قلب ونظر کو مسحور کر دیتی ہے۔ اصنافِ سخن کی ندرت اور جدت پر مبنی اشارے ملاحظہ ہوں۔ اقبال کی غزل میں اشعار کی کوئی قید نظر نہیں آتی۔ ان کی غزل کے مطلعے کئی جگہ مردّف اور مقفّیٰ نہیں، مثلاً مندرجہ ذیل مطلعے دیکھیں:

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب — لرز جاتے ہیں آوازِ اذان سے
الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے — اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے
یوں تو اے بزمِ جہاں، دلکش تھے ہنگامے ترے — اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی
اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا — قبضے سے امت بیچاری کے، دیں بھی گیا، دنیا بھی گئی
نہ دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ چمن تو کیا — جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی، نوائے زیرِ لبی رہی
گرچہ تو زندانیٔ اسباب ہے — قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ

مندرجہ بالا مطلعے بانگِ درا کے تینوں حصّوں کی بعض غزلیات کے ہیں جو قطعے کی صورت میں ہیں۔ اب بالِ جبریل کی پانچویں غزل کا مطلع اور مقطع دیکھیں۔ یہاں مقطع، ردیف، قافیہ اور وزن میں باقی اشعار سے مختلف ہے مگر اقبال نے اسے غزلوں میں ہی درج فرمایا ہے:

کیا عشق ایک زندگیٔ مستعار کا — کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا
کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو — یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

سولھویں غزل بھی قطعے کی صورت میں یوں شروع ہوتی ہے:

یارب! یہ جہانِ گذراں خوب ہے، لیکن — کیوں خوار ہیں مردانِ صفاکیش و ہنرمند؟

مگر قطعات پر نگاہ ڈالیں تو بہت سے قطعے، غزل کے مطلعوں کی طرح مردّف اور مقفّیٰ نظر آتے ہیں۔[۵۱۵] اقبال نے

---

۵۱۵ مثالیں اقبال کی سب اردو کتابوں میں فراواں دیکھی جا سکتی ہیں۔

معروف وزن " لاحول ولا قوۃ الا باللہ" میں رباعی کوئی نہیں کہی - انھوں نے فارسی شاعر باباطاہر ہمدانی کی فہلویات کے وزن میں " دوبیتیاں" کہی ہیں اور انھیں عرفِ عام کی اصطلاح میں " رباعی" کہا ہے - معنوی اعتبار سے ان دوبیتیوں میں بے شک رباعیات کے اوصاف نظر آتے ہیں مگر یہاں بھی اقبال نے عام ادبی راہ کی پیروی نہیں کی - کہیں چاروں مصرعے مردّف اور مقفیٰ رکھے (یہ کام خال خال دوسرے شعرا نے بھی کیا ہے کہ تیسرے مصرعے کو قافیہ اور ردیف کے بغیر نہیں چھوڑا) اور کہیں بیت اولیٰ کا مصرعِ اوّل قافیہ اور ردیف کے بغیر ہے :

کبھی دریا سے مثل موج اُبھر کر — کبھی دریا کے سینے میں اُتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر — مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

تمیز خار و گل سے آشکارا — نسیم صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے — اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

کہا اقبال نے شیخ حرم سے — تہِ محراب مسجد سو گیا کون ؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی — فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون ؟

اقبال نے دیگر شعرا کی طرح مسمط، مثلث، مخمس اور مستزاد لکھے جو خوب سے خوب تریں کے نمونے فراہم کرتے ہیں - بانگِ درا کی ایک نظم "حسن و عشق" مسبع کی مثال بھی سامنے لاتی ہے - انھوں نے چند ترجیع بند لکھے - ترکیب بند کی صنف میں ان کی بعض عظیم نظمیں موجود ہیں - شمع اور شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، مسجد قرطبہ اور ذوق و شوق ان نظموں میں سے چند ہیں - اقبال کی یہ جدّت قابلِ غور ہے کہ وہ بعض نظموں کے آغاز میں مصرعِ مستزاد لے آتے ہیں - نظم " انسان" (بانگ درا) اس طرح شروع ہوتی ہے :

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے

انسان کو راز جُو بنایا — راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا — کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے — آئینے کے گھر میں اور کیا ہے ؟

صنعتِ تلمیع (ایک اردو اور دوسرا فارسی مصرع) ان کے ہاں بہت زیادہ ہے - بلکہ ان کی کئی اُردو

نظموں کے بعض حصے فارسی میں ہیں: نظم شمع اور شاعر میں شاعر کی گفتگو بزبان فارسی ہے۔ نظم پیر و مرید (بالِ جبریل) میں اقبال کے سوالات اردو میں ہیں اور جوابات مثنوی رومی سے منقول ہیں۔ یہ ساری جدتیں مجھے کم از کم دوسرے اُردو شعرا کے ہاں نظر نہیں آئیں۔ مگر جس خصوصیت نے اقبال کو ترجمانِ حقیقت، مصورِ پاکستان، شاعرِ مشرق، حکیم الاُمت اور شاعرِ اسلام کے القاب کا سزاوار بنایا، وہ ان کے عشق و فلسفے کا امتزاج ہے۔ مسلمانوں اور دنیا بھر کے انسانوں کی بیداری اور بہبودی کی قلبی آرزوؤں نے انھیں ایک خاص لہجہ دیا جس کے ذریعے ان کا کلام دوسرے شعرا کے کلام سے ممتاز و منفرد ہو گیا۔ انھوں نے تاریخ میں مذکور اور معاصر حوادث سے خاص اثرات اور تاثرات لیے اور نتائج و مآلات کو امید و کامیابی کی نظر سے دیکھتے رہے۔ اپنے نفسِ گرم اور سوزِ نفس کا جو ذکر انھوں نے کیا، اس میں تعلّی نہیں، واقعیت کا اظہار کیا گیا ہے:

نفسِ گرم کی تاثیر سے اعجازِ حیات — ترے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر

یہ کون غزل خواں ہے پُرسوز و نشاط انگیز — اندیشہ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

نگاہِ گرم کہ شیروں کے جس سے ہوش اُڑ جائیں — نہ آہِ سرد کہ ہے گوسفندی و میشی

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری مری — وگرنہ شعر مرا کیا، شاعری کیا ہے؟

کیا عجب مری نوا ہائے سحر گاہی سے — زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے

اندھیری شب ہے، جدا اپنے قافلے سے ہے تو — ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا، قندیل

مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں — یہی سوزِ نفس ہے، اور میری کیمیا کیا ہے؟

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک — رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک

وہ خاک، کہ جس کا جنوں صیقلِ ادراک — وہ خاک، کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک

وہ خاک، کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی — چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ سَمَّعَ النَّاسَ بِعَمَلِہٖ سَمَّعَ اللّٰہُ بِہٖ اَسَامِعَ خَلْقِہٖ وَحَقَّرَہٗ وَصَغَّرَہٗ (مشکوٰۃ - فصل ثانی - باب الریاء والسمعۃ)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ جو شخص لوگوں میں اپنے عمل کی تشہیر کرتا ہے، اللہ لوگوں کے کانوں میں اس کی بدنیتی کی سب باتیں پہنچا دیتا ہے اور اس کو حقیر اور ذلیل بنا دیتا ہے۔

بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بڑے ہر کام کی خوب تشہیر کرتے ہیں، اسے لوگوں میں پھیلاتے اور ہر شخص کے سامنے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے لیے جو ذرائع بھی انھیں میسر آسکتے ہوں، ان کو استعمال میں لاتے ہیں اور ہر بات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ اپنی تعریف میں اخباروں میں خطوط چھپواتے ہیں اور پروپیگنڈے کا جو ذریعہ بھی مفید مطلب ہو سکتا ہو، اس سے کام لیتے اور اپنے نام کو اونچا کرنے کے لیے ہر طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

وہ لوگ سماجی کاموں میں حصہ لیتے اور چندہ دیتے ہیں۔ مسجدوں کی تعمیر میں روپے خرچ کرتے ہیں، دینی درس گاہوں کی مدد کرتے ہیں، ضرورت مندوں، مستحقوں، یتیموں، مسکینوں، بیواؤں کو صدقات و خیرات دیتے ہیں، مذہبی جماعتوں کو عطیات سے نوازتے ہیں، معاشرتی بہبود کے اداروں کی اعانت کرتے ہیں، مگر اس سے ان کے دل میں یہ خواہش پنہاں ہوتی ہے کہ عوام میں ان کی شہرت ہو، لوگ ان کا بہتر الفاظ میں ذکر کریں، اخباروں میں اچھے تعارف کے ساتھ ان کی تصویریں چھپیں، جگہ جگہ ان کی سخاوت کے تذکرے ہوں، مسجدوں اور جلسوں میں ان کے چندے کا تعریفی الفاظ کے ساتھ اعلان کیا جائے۔ جن اداروں کی تعمیر و ترقی میں وہ حصہ لیتے ہیں، ان میں ان کے نام اور چندے کی تختی نصب کی جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیثِ مبارکہ میں فرمایا ہے کہ نام و نمود کی یہ سب تمنائیں اور شہرت و ناموری کی یہ تمام خواہشیں سراسر غلط، منافیِ اسلام، خلافِ انسانیت اور قابلِ مذمت ہیں۔

جو لوگ شہرت اور ناموری کے لیے دوڑ دھوپ کرتے اور کئی قسم کے تکلفات میں پڑتے ہیں، دراصل نفسیاتی طور پر وہ احساسِ کم تری کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اندر کی اصل کمزوری سے اچھی طرح باخبر ہوتے ہیں اور انھیں خوب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اخلاق کی بلندی اور علمی و عملی کمالات سے محروم ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کی ان کے نزدیک یہی آسان صورت ہوتی ہے کہ انھیں عوام میں شہرت حاصل ہو اور لوگ ان کی عزت کریں۔ حالاں کہ اس طرح حاصل کی گئی عزت ہمیشہ عارضی ثابت ہوتی ہے اور لوگوں کے دلوں میں ان کا کوئی احترام جاگزین نہیں ہوتا۔ اصل عزت اور اصل آبرو وہی ہے جو اخلاق کی بلندی، کردار کی رفعت اور اخلاص کی دولت سے حاصل ہو۔ اپنی بڑائی کی ناجائز خواہش سے معاشرے میں کوئی اہم جگہ نہیں مل سکتی۔

معاشرے میں صحیح عزت و احترام کے لیے خلوص کی دولت سے مالا مال ہونا ضروری شرط ہے۔ جن لوگوں کا خزانۂ قلب خلوص کی دولت سے خالی اور صحیح ہمدردانہ جذبات سے تہی ہوگا، وہ معاشرے میں اس مرتبے کو نہیں پہنچ سکتے، جس کے وہ طالب ہیں۔ ان کی نیک نامی کی شہرت کے بجائے قدرتی طور پر ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں سے ان کا اثر کلیتہً ختم ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ تکمیلِ تمنا کی تمام امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں۔

اس قسم کے لوگوں کی غلط تمناؤں کا جب لوگوں کو علم ہوتا ہے اور ان کی ناروا خواہشیں مختلف مقامات سے گردش کرتی ہوئی معاشرے کے اچھے افراد کے کانوں میں پہنچتی ہیں تو ان کی رہی سہی آبرو بھی جاتی رہتی ہے اور وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو جاتے ہیں ـــــ اصل چیز جو انسان کی متاعِ عظیم ہے اور جسے اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور لوگوں کے نزدیک انتہائی قدر و منزلت حاصل ہے، وہ اخلاص ہے۔ ریا، سمعہ اور دکھلاوے کو اللہ کی بارگاہِ عالی میں قطعاً کوئی اہمیت حاصل نہیں ـــــ دکھلاوے اور ریا کے لیے خواہ کتنا ہی مال و دولت خرچ کیا جائے اور لوگوں کی خدمت کا بے شک کتنا ہی ڈھنڈورہ پیٹا جائے، اللہ کے حضور اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، بلکہ اس کے نتائج ہمیشہ غلط نکلتے ہیں اور لوگ بالآخر اس قسم کی ذہنیت کے لوگوں سے نفرت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جو کام جس نیت سے کیا جائے، اسی پس منظر میں اس کا صلہ ملتا ہے۔ اللہ کی طرف سے بہتر بدلہ اسی کام کا ملتا ہے جو صرف اللہ کی رضامندی اور خوشنودی کے لیے کیا جائے اور جس میں خدمتِ خلق کا مخلصانہ جذبہ کارفرما ہو۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا ہے کہ جو شخص اپنی ذاتی شہرت اور ناموری کے لیے کوئی عمل کرے گا تو اللہ کی طرف سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ وہ لوگوں کی نظروں سے گر جائے گا اور معاشرے میں اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی ـــ اس لیے انسان کا فرض ہے کہ وہ انسانیت کی خدمت کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرائے اور وہی کام کرے جس میں اللہ کی رضا

نقد و نظر

آکھیا بابا فرید نے

مصنف : پروفیسر محمد آصف خاں

ناشر : پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۵۸ لارنس روڈ، لاہور

صفحات ۳۲۸ - کاغذ، طباعت، کتابت، سرورق عمدہ - قیمت ۲۰ روپے

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ایک عرصے سے پنجابی زبان کی خدمت میں مصروف ہے۔ اب تک اس کی طرف سے متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں، جن میں نظم اور نثر دونوں قسم کی مطبوعات شامل ہیں۔ بورڈ کی تازہ مطبوعات میں سے جو کتاب اس وقت پیشِ نگاہ ہے، اس کا نام ہے "آکھیا بابا فرید نے"۔

حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ برصغیر پاک و ہند کے مشہور بزرگ اور جلیل القدر شیخ تھے۔ علم و فضل میں بھی ان کا نام بڑا اونچا تھا اور تصوف و طریقت میں بھی بلند مرتبے پر فائز تھے۔ یوں تو سرزمین برصغیر (پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش) کی گود ہمیشہ بزرگانِ دین اور مشائخ کرام کے وجود سے پُرفخار رہی ہے، لیکن چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کا دَور تو اس سلسلے میں بہت زرخیز تھا۔ اس زمانے کے صوفیائے عالی مقام کی ایک طویل قطار سامنے کھڑی نظر آتی ہے اور اسلامی ہند کی تاریخ نے ان کے بارے میں بڑا اہم مواد بہم پہنچایا ہے۔

ان صوفیا و مشائخ میں سے بعض حضرات تو وہ تھے جو بیرونِ ہند سے یہاں آئے اور پھر اسی خطۂ ارض کو اپنا مسکن قرار دے لیا۔ بعض وہ تھے جو اسی ملک میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اور پھر اسی ملک کی خاک میں آرام کی نیند سو گئے ۔۔ ان حضرات کی زندگیاں ہر لحاظ سے قابلِ رشک تھیں۔ انھوں نے یہاں کے لوگوں کی جو روحانی تربیت کی اور جس طرح بے شمار غیر مسلموں کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا اور ان میں اسلام کی روح پھونکی، وہ تاریخ کا ایک عظیم الشان باب ہے۔

خطۂ پنجاب کو بھی یہ فخر حاصل ہے کہ وہ بھی ابتدا ہی سے بزرگانِ دین اور مشائخ ذوی الاحترام کے وجود

گرامی سے مالا مال رہا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں اس میں جن حضرات نے معرفت و ادراک اور مشیخت و طریقت میں خاص شہرت حاصل کی، ان میں حضرت شیخ فریدالدین مسعود شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کا اسمِ گرامی لائق تذکرہ ہے۔ وہ پنجاب ہی میں پیدا ہوئے اور پنجاب ہی کو تبلیغِ دین کا مرکز بنایا اور پنجاب ہی کے ایک مقام پاکپتن میں محو استراحت ہوئے۔

شیخ فرید وہ بزرگ تھے جو پنجابی کے بہترین شاعر بھی تھے، ان کا کلام اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ یہ عارفانہ کلام ہے جس میں شعریت کی چاشنی بھی ہے اور زبان کی مٹھاس بھی!

پروفیسر محمد آصف خاں نے اُسے بڑی محنت اور کاوش سے مرتب کیا ہے، اس کے لیے وہ شکریے کے مستحق ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی محنت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی، ہندی اور پنجابی کی جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ان کی تعداد ۱۴۰ تک پہنچتی ہے، جن میں سات کتابیں قلمی ہیں۔ پنجابی ادبی بورڈ نے اسے شائع کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے۔

"آکھیا بابا فرید نے" ۳۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، جن میں ابتدا کے ۱۴۰ صفحات پنجابی نثر میں ہیں، ان صفحات میں کتاب کی اہمیت، بابا فرید کے حالات، ان کا کلام اور اس کی معنوی حیثیت، ان کے آبا و اجداد اور دیگر بہت سے عمدہ معلومات جمع کر دیے گئے ہیں، اس سے کتاب کی تصنیف میں پروفیسر محمد آصف خاں اور ان کے ساتھیوں کی بے پناہ محنت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے، اور اس کے مطالعہ سے بہت سی نئی باتیں قاری کے علم میں آتی ہیں۔ لیکن کتاب کے فاضل مصنف اور بورڈ کے معزز حضرات کی خدمت میں ہم نہایت ادب سے عرض کریں گے کہ انھوں نے پنجابی نثر میں جو زبان استعمال کی ہے، وہ کچھ اس انداز کی ہے کہ اس کو پڑھنے اور سمجھنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ زبان وہی لکھنی چاہیے جو مروج ہو اور جسے ہر پنجابی آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکے — امید ہے، پنجابی ادبی بورڈ کے فاضل دوست آئندہ اپنے قارئین کے مزاج اور قوتِ فہم کا خیال رکھیں گے — علاوہ ازیں مصنف کو یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسی قسم کی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا جائے، جس قسم کے موضوع یا شخصیت پر اُسے لکھنا مقصود ہو۔

دیس پردیس

مصنف : سلیم خاں گمی

ناشر : پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۸۵ لارنس روڈ، لاہور

صفحات ۱۴۰ - قیمت ۱۱ روپے

اس کتاب کی حیثیت سفرنامے کی ہے - جناب سلیم خاں گمی نے ۱۹۷۸ء میں بی، بی، سی، لندن کے دفتر میں ٹریننگ کے سلسلے میں اسلام آباد سے لندن کا سفر کیا - اس میں انھوں نے ویزا کے حصول سے لے کر آخر تک کی تمام روئیداد پنجابی زبان میں بیان کی ہے - یہ سفرنامہ دلچسپ اور معلوماتی ہے - سفر کے لیے پاکستان سے ضروری اشیا کی خرید و فروخت، جہاز کا سفر، راستے کے واقعات، لندن میں ورود، وہاں کی ادبی مجلسوں کا ذکر اور ان میں شمولیت، مختلف افراد سے میل جول اور لطائف، تمام چیزیں بڑی سلیس اور عام فہم پنجابی زبان میں تحریر کی ہیں - اسلوب کلام کچھ ایسا ہے کہ شروع سے آخر تک کہیں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی، ہر مقام پر دلچسپی برابر قائم رہتی ہے - زبان وہی لکھی ہے جسے ہم آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں -

پنجابی زبان میں ہمارے اسلاف نے بہت کام کیا ہے، تفسیر، حدیث، فقہ، ادبیات اور بعض دیگر علوم کو نہایت خوب صورتی سے پنجابی کے قالب میں ڈھال دیا ہے، لیکن وہ ایسی پنجابی ہے، جس کو ہر شخص آسانی سے پڑھ بھی سکتا ہے اور سمجھ بھی سکتا ہے -

گمی صاحب نے بھی اپنا سفرنامہ "دیس پردیس" آسان اور عام فہم اسلوب میں تحریر کیا ہے اور قابلِ مطالعہ ہے - کاغذ، کتابت، طباعت، سرورق دیدہ زیب -

کہند اسائیں

مرتب : افضل پرویز

ناشر : پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۵۸ لارنس روڈ، لاہور

صفحات ۲۱۶ - کاغذ، کتابت، طباعت، سرورق عمدہ - قیمت ۱۸ روپے

سائیں احمد علی پشاوری، پنجابی کے مشہور شاعر تھے - وہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن اللہ نے ان کو اس قدر ذہانت عطا کی تھی اور اس درجہ ملکۂ شعری سے نوازا تھا کہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور اردو میں بھی - لیکن ان کا اصل میدان پنجابی تھا - پنجابی زبان میں انھوں نے شاندار اشعار کہے اور بہترین کلام اپنے پیچھے چھوڑا - سائیں احمد علی نے صحیح روایت کے مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۳۰ کو وفات پائی -

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے "کہند اسائیں" کے نام سے ان کا وہ کلام شائع کیا ہے، جو میسر آسکا - کلام جناب افضل پرویز صاحب نے ترتیب دیا ہے، لائق مرتب نے کتاب کے شروع میں ۹۶ صفحات کا مقدمہ سپردِ قلم کیا ہے جس میں سائیں احمد علی کے حالات ان کی شاعری، ان کا دور، ان کے شاگرد وغیرہ امور کو تفصیل سے بیان کیا ہے - کتاب ہر لحاظ سے دلچسپ ہے -

علمی رسائل کے مضامین

البلاغ، بمبئی - جنوری ۱۹۸۰

مطالعات و تاثرات	قاضی اطہر مبارک پوری
زائرینِ حرم	قاضی اطہر مبارک پوری
یاایھا الانسان	حسن البنا شہید
مسنون دعائیں	مولانا شاہ وصی اللہ
اکابر کے عرفان و ارشادات	مولوی محمد ارشد اعظمی

البلاغ، کراچی — فروری ۱۹۸۰

مکاتیب حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی	مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم کے نام
منتخب اشعار مولانا اشرف علی تھانوی	مولانا مفتی عبد الحکیم

بیّنات، کراچی - مارچ ۱۹۸۰

مولانا اشرف علی تھانوی کی تجدیدی مساعی	مولانا حسین احمد نجیب
کتاب ادب القاضی اور الصدر الشہید کی شرح	سراج احمد فاروقی
شخصی ملکیت اور اسلام	مولانا سید عبد الشکور ترمذی
بصرہ کی تعلیم گاہوں میں چند لمحے	جناب محمود عارف

الحق، اکوڑہ خٹک — جنوری ۱۹۸۰

اسلامی قانون سازی کے چند بنیادی اصول	جناب سراج احمد فاروقی
شاہ فیصل شہید اور ان کی دینی دعوت	مولانا نصیب علی شاہ بخاری
ذکری مذہب کا تفصیلی جائزہ	ڈاکٹر ضیاء الحق صدیقی

سب رس، کراچی — دسمبر ۱۹۷۹، جنوری ۱۹۸۰ (یادِ رفتگان نمبر)

ابراہیم جلیس کے حالات و سوانح	مختلف اہلِ قلم کی مضامین اور نظمیں

ابن انشا کے حالات وکوائف	متعدد اہل قلم کے مضامین اور نظمیں
پروفیسر محمد حسن عسکری کے حالات وسوانح	" "
صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے حالات وسوانح	" "
ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے حالات وسوانح	" "
سید آل رضا کے حالات	" "
سیدہ عروج مظہر کے حالات وسوانح	" "
ماہر القادری کے حالات وسوانح	" "

المجیب، پھلواری شریف (بھارت) دسمبر ۱۹۷۹، جنوری ۱۹۸۰

پھلواری شریف کی اہم شخصیتیں	مولانا شاہ عون احمد قادری
امام ربیع بن سلیمان مرادی	حافظ محمد عمیر الصدیق
علم حدیث	مولانا شاہ عز الدین ندوی پھلواروی
عوام اور حکومت کے لیے چند مفید قوانین	سید نعمان غنی ... وری
اردو ادب میں طنز ومزاح اور اکبر الہ آبادی	محمود نہ سوتی
اردو ادب اور ملک کی مختلف تحریکیں	رشید اختر مجیبی

المجیب، پھلواری شریف (بھارت) — فروری ۱۹۸۰

علم حدیث	مولانا شاہ عز الدین ندوی پھلواروی
رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا شاہ عون احمد قادری پھلواروی
سیرت نبوی کی کچھ باتیں	مولانا شاہ عثمان غنی فردوسی پھلواروی
جو سارے عالم کے لیے رحمت بن کر آیا (صلی اللہ علیہ وسلم)	مولانا جمال الحق قادری پورنوی

معارف، اعظم گڑھ — فروری ۱۹۸۰

مولانا شبلی اور ان کی فارسی خدمات (مسلسل)	ڈاکٹر نذیر احمد
سیرت نبوی کی ایک اہم کتاب، الشفا پر ایک نظر (مسلسل)	ضیاء الدین اصلاحی
مولانا سید محمد شاہ نقوی محدث رام پوری	سید بہاء الحق رضوی

مئی ۱۹۸۰

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے
سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر
S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971
جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

جلد ۱۳ | مئی ۱۹۸۰ | جمادی الاخریٰ ۱۴۰۰ | شمارہ ۵

ترتیب

تاثرات

مشہور عالم مولانا احتشام الحق تھانوی ۶۵ سال کی عمر پاکر ۱۱ر اپریل ۱۹۸۰ء کو ہندوستان کے شہر مدراس میں وفات پاگئے۔ وہ مارچ کے وسط میں دار العلوم دیوبند کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کے لیے دیوبند جانا چاہتے تھے، لیکن کاغذات مکمل نہ ہوسکنے کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہوسکے۔ بعد میں جب انھیں عدم اعتراض کا سرٹیفکیٹ ملا تو ۲۶ مارچ کو دہلی گئے۔ وہاں سے دیوبند پہنچے، اپنے آبائی شہر تھانہ بھون بھی گئے۔ اس کے بعد ایک سیرت کانفرنس میں شرکت کے لیے ۳ر اپریل کی شب کو ساڑھے نو بجے مدراس پہنچے۔ وہ پچیس سال بعد مدراس گئے تھے، وہاں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ پر سات دن میں بیس تقریریں کیں۔ ۱۱ر اپریل کو صبح ساڑھے سات بجے اپنے میزبان کے مکان پر دل کی حرکت بند ہوجانے سے انتقال کرگئے۔ اِنّا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا احتشام الحق کی ولادت تھانہ بھون میں ہوئی، جو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع مظفر نگر کا ایک مشہور قصبہ ہے، تھانہ بھون کی مناسبت سے وہ تھانوی کہلائے۔ برصغیر کے نامور عالم مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم ان کے ماموں تھے ـــــ انھوں نے ابتدائی تعلیم سہارن پور میں پائی، بعد ازاں دار العلوم دیوبند میں بھی تعلیم حاصل کرتے رہے ـــــ قیام پاکستان سے قبل مولانا احتشام الحق تھانوی نئی دہلی کے سیکرٹریٹ کی مسجد میں خطابت و امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ قیام پاکستان کے اعلان سے دو ہفتے قبل وہ کراچی آگئے اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی رفاقت میں ملکی خدمات انجام دینے لگے۔ کراچی میں انھوں نے جیکب لائنز میں ایک شان دار مسجد تعمیر کرائی، ۱۹۴۸ء میں سندھ کے قصبہ ٹنڈو الٰہ یار میں انیس ایکڑ رقبے میں جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ اس جامعہ میں کئی سو طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں جن میں افریقہ، افغانستان، برما اور یمن وغیرہ ممالک کے شائقین علم بھی شامل ہیں۔ اس جامعہ کی ایک شاخ کراچی میں جیکب لائنز کی مسجد میں بھی قائم ہے ـــــ مولانا احتشام الحق مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، وہ بہت اچھے مقرر اور واعظ تھے۔ مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے رکن اور چیرمین بھی رہے۔ مشاورتی کونسل کے رکن بھی رہے۔ اس کے علاوہ مختلف اوقات میں اور بھی کئی سرکاری نوعیت کی کمیٹیوں سے ان کا تعلق رہا۔ ان کی وفات سے ملک ایک سلجھے ہوئے عالم دین سے محروم ہوگیا ہے۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک

قرونِ وسطیٰ کے اسلامی کتب خانے

انسان نے جب سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا ہے اسی وقت سے اس کے ذہن میں یہ خیال جاگزین ہے کہ وہ اپنی مصنفات و مؤلفات کے حفظ و بقا کا بھی اہتمام کرے۔ اس مقصد کے لیے دارالکتب اور لائبریریاں قائم کرنے کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔

اقوامِ عالم میں سے سب سے پہلے بابلیوں نے کتب خانے قائم کیے، جن کے آثار بابل و آشور کے کھنڈرات میں ملے ہیں۔ بابلیوں کے بعد قدیم مصریوں نے کتب خانے کی طرف توجہ مبذول کی۔ یونانیوں نے بھی اپنے دورِ عروج میں بہت سی لائبریریاں قائم کیں۔ انھوں نے اسکندریہ میں جو مشہور مکتبہ قائم کیا وہ اسلامی فتوحات کے وقت موجود تھا۔ جب رومیوں کو عروج نصیب ہوا تو ابتدا میں انھوں نے یونانیوں کے کتب خانے روم میں منتقل کیے اور پھر اپنے ذاتی کتب خانوں کی داغ بیل ڈالی۔ بعدازاں دنیا کی اقوام و ملل نے لائبریریوں کے قیام کی طرف توجہ دینی چھوڑ دی۔ حتیٰ کہ مسلمان برسرِ اقتدار آئے اور انھوں نے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کو جمع کرنا اور انھیں لائبریریوں میں محفوظ کرنا شروع کیا۔

اسلامی کتب خانے

اسلام نے دینی و دنیوی علوم میں تفریق نہیں کی، بلکہ ان تمام علوم کو جن کے ذریعے انسان رموزِ کائنات سمجھ سکے اور اسرارِ عالم سے واقف ہو کر ہستیِ باری تعالیٰ تک پہنچ سکے سیکھنا لازمی قرار دیا۔ اس سلسلے میں قرآنِ مجید اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں واضح اور بیّن احکام موجود ہیں۔ ان ارشادات کی تعمیل میں مسلمانوں نے علوم و فنون کی تحصیل کو اپنا شعار بنا لیا۔ مسلمان جب مفتوح ممالک میں داخل ہوتے تو انھوں نے مفتوحین کے ساتھ وحشی اور جاہل اقوام کا سا سلوک نہیں کیا، بلکہ ان کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جس کی توقع ہم دورِ حاضر کی انتہائی مہذب اور متمدن اقوام سے بھی نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں نے ان کے علمی مراکز کی حفاظت کی اور ان کے علما کی تعظیم کو ضروری سمجھا۔ علوم و فنون کی اس محبت کی وجہ سے جو اسلام نے ان کے دلوں میں پیدا کی تھی، انھوں نے مختلف علوم و فنون کی کتابیں محفوظ کرنے کی طرف

بھی خصوصی توجہ مبذول کی۔

اسلام کے ابتدائی دور ہی میں اہلِ علم حضرات نے اپنے لیے کتابوں کے مجموعے تیار کر لیے تھے۔ اگرچہ شروع شروع میں یہ کتابیں اشعار، اخبار اور امثال وغیرہ پر مشتمل تھیں، لیکن رفتہ رفتہ دیگر علوم کی کتابیں بھی ان کتب خانوں میں جگہ پانے لگیں۔ یہ کتابیں جھلیوں، چمڑے کے ٹکڑوں یا کپڑوں پر لکھی گئی تھیں۔ ابو عمرو بن العلاء کے بارے میں روایت ہے کہ کتابوں سے اس کا گھر بھر گیا تھا۔ اصمعی، حماد ابو عبیدہ اور دیگر رواتِ شعر کے بارے میں بھی اس قسم کی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ یہ لائبریریاں افراد کی ذاتی ملکیت تھیں۔ خلفائے بنو امیہ نے پبلک لائبریریاں قائم کرنے کی طرف توجہ منعطف کی۔ چنانچہ ایسی ہی ایک لائبریری سے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اہرون نامی طبیب کی کتاب حاصل کی اور اس کی مملکتِ اسلامیہ میں اشاعت کی۔

عباسی دور کو علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے مسلمانوں کا سنہری زمانہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس دور میں لائبریریوں کے قیام کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ عباسی خلفا نے ان میں ذاتی دلچسپی لی۔ عباسیوں کے دورِ عروج میں ہمیں بغداد میں متعدد عظیم الشان لائبریریاں نظر آتی ہیں۔ اندلس میں بنو امیہ نے بھی عباسیوں کے تتبع میں علم و حکمت کی سرپرستی کی اور بہت سی عظیم لائبریریاں قائم کیں۔ مصر کے فاطمی خلفا نے بھی اس سلسلے میں اہم کارنامے انجام دیے۔ ذیل میں ہم مسلمانوں کے چند اہم کتب خانوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

بغداد کی لائبریریاں

بغداد کے کتب خانوں میں اہم ترین کتب خانہ بیت الحکمت تھا، جسے مشہور ترین روایت کے مطابق خلیفہ ہارون الرشید نے جاری کیا۔ اس کتب خانے میں علومِ اسلامیہ، طب اور دیگر علوم پر دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ شدہ کتابیں جمع کی گئی تھیں۔

جب مامون تختِ خلافت پر متمکن ہوا اور اس نے عجمی زبانوں سے عربی میں تراجم کے لیے مجالسِ ترجمہ کی بنیاد رکھی تو اس نے یونانی، سریانی، فارسی، ہندی، قبطی اور دیگر زبانوں کی بہت سی کتابیں بیت الحکمت میں جمع کر دیں۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ خلیفے کو کتابوں کے ساتھ گہرا شغف ہے تو وہ اطراف و اکناف سے کتابیں لے لے کر بغداد میں خلیفے کے پاس آنے لگے۔ بیت الحکمت میں ترجمہ، نسخ، درس و تدریس

اور تصنیف و تالیف کے لیے علیحدہ علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ نساخ کے لیے ایک جگہ مخصوص تھی، جہاں بیٹھ کر وہ کتابوں کی نقلیں تیار کرتے تھے۔ اسی طرح مترجمین، مؤلفین اور قارئین کے لیے بھی جگہیں معین تھیں۔ بیت الحکمت کے نساخوں میں علان الشعوبی کا نام خاص طور سے مشہور ہے۔ وہ فارسی النسل تھا اور بہت بڑا راوی، عالم اور ماہر النساب تھا۔ وہ بیت الحکمت میں بیٹھ کر ہارون الرشید اور برامکہ کے لیے کتابیں نقل کیا کرتا تھا۔ جو علما بیت الحکمت میں مطالعہ کی غرض سے آیا کرتے تھے، ان میں محمد بن موسیٰ خوارزمی، یحییٰ بن ابی منصور الموصلی، فضل بن نوبخت اور اولادِ شاکر قابلِ ذکر ہیں۔ بیت الحکمت کی نگرانی کے لیے ایک ناظم مقرر تھا جسے صاحبِ بیت الحکمت کہا جاتا تھا۔ مختلف اوقات میں جو لوگ بیت الحکمت کی نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے ان میں سہل بن ہارون اور مسلم کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سہل بن ہارون فارسی النسل تھا۔ مسلم بھی فارسی النسل تھا۔ اس نے متعدد کتابیں فارسی سے عربی میں ترجمہ کیں۔

باشندگانِ بغداد نے بیت الحکمت کے نمونے پر بعد میں متعدد دارالکتب قائم کیے، جن میں سے مشہور ترین وہ مکتبہ تھا جسے بہاؤالدولہ کے وزیر صابور بن اردشیر نے ۳۸۱ھ میں کرخ میں وقف کیا۔ اس مکتبے میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں موجود تھیں۔ یہ کتب خانہ ۴۴۸ھ میں جب پہلا سلجوقی فرماں روا طغرل بیگ بغداد میں داخل ہوا تو کرخ کے کچھ محلوں کے ساتھ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ عبدالسلام البصری اللغوی (متوفی ۴۰۵ھ) اس مکتبے کے نگران کے طور پر کام کرتا رہا۔

اندلس کی لائبریریاں

اندلس کے اموی حکمرانوں میں سے حکم بن الناصر کا نام علمی خدمات کے اعتبار سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ حکم بن الناصر ۳۵۰ھ میں خلیفہ بنا اور ۳۶۶ھ میں فوت ہوا۔ وہ بڑا علم دوست خلیفہ تھا اور علما کی بہت تعظیم اور مصنفین کی بڑی تکریم کرتا تھا۔ اسے کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے قرطبہ میں ایک عظیم کتب خانے کی بنیاد رکھی، جس میں دنیا کے مختلف حصوں سے کتابیں منگوا کر رکھیں۔ کتابوں کی خریداری کے لیے اس کے نمائندے مختلف ممالک میں جاتے اور منہ مانگی قیمت دے کر کتابیں خرید لیتے۔ ابوالفرج اصفہانی مصنف کتاب الاغانی اس کا ہم عصر تھا۔ حکم نے اس کی طرف قاصد بھیجا اور کہا کہ وہ اپنی کتاب کا پہلا نسخہ بنی عباس کے دربار میں بھیجنے کی بجائے اسے بھیجے، اس کے عوض اس نے ایک ہزار دینار دیے۔ ابوبکر الابہری کی کتاب شرح المختصر ابن عبدالحکم کا پہلا نسخہ حاصل کرنے کے لیے اس نے قاضی ابوبکر الابہری

کو بہت بڑا انعام دیا۔ حکم نے اپنے محل میں کتابوں کے لیے علیحدہ کمرے مخصوص کر دیے تھے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے خادم مقرر تھے۔ کتابوں کے موضوع کے اعتبار سے فہرستیں تیار کی گئیں۔ اس لائبریری میں جو دیوان موجود تھے ان کی ۴۴ فہرستیں تھیں۔ ہر فہرست میں ۲۰ ورق تھے۔ اگر ایک صفحے میں ۲۰ نام ہوں تو اس حساب سے صرف دیوانوں کی تعداد ۴۴۰۰۰ ہوگی۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کتب خانے میں کتابوں کی کل تعداد کتنی ہوگی۔ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ اس مکتبے میں کتابوں کی تعداد چار لاکھ کے قریب تھی۔

حکم کے درباریوں اور امرا نے بھی اس سے متاثر ہو کر کتب خانے قائم کرنے کی طرف توجہ مبذول کی۔ کہا جاتا ہے کہ صرف غرناطہ میں ۷۰ پبلک لائبریریاں تھیں۔ اندلس میں کتابوں کے ساتھ محبت اور ان کے حصول کے لیے سرمایہ خرچ کرنا سرداری و ریاست کی علامت خیال کیا جاتا تھا۔ بسا اوقات ایک جاہل اور ان پڑھ رئیس صرف اس بنا پر کتب خانہ قائم کرتا اور اس پر دولت صرف کرتا تاکہ لوگ اس کے کتب خانے کی تعریف کریں۔ حضرمی بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ قرطبہ گیا اور ایک کتاب کی تلاش میں بازاروں کی خاک چھانتا رہا۔ بالآخر وہ کتاب مجھے ایک جگہ نیلام ہوتی نظر آگئی۔ یہ دیکھ کر میں بہت خوش ہوا اور میں نے نیلام میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ جب میں بولی دیتا تو نیلامی کرنے والا کسی دوسرے کے نام زائد بولی کا اعلان کر دیتا۔ اس طرح کتاب کی قیمت بڑھتی رہی۔ حتّٰی کہ کتاب کا خریدنا میری استطاعت سے باہر ہو گیا۔ میں نے نیلامی کرنے والے سے کہا۔ "براہِ کرم مجھے وہ آدمی تو دکھا دیجیے، جس کی بنا پر میں کتاب سے محروم ہو گیا ہوں۔" اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو سرداری اور ریاست کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور کہا "اے بزرگ فقیہ! اللہ تعالیٰ آپ کا بھلا کرے، اگر آپ کو اس کتاب کی ضرورت ہے تو میں آپ کے حق میں دست بردار ہوتا ہوں، کیوں کہ اس کی قیمت پہلے ہی بہت بڑھ چکی ہے۔ اس نے جواب دیا "میں نہ فقیہ ہوں اور نہ فقہ کے بارے میں کچھ جانتا ہوں۔ میں نے تو ایک کتب خانے کی بنیاد رکھی ہے اور اس میں اس غرض سے اچھی اچھی کتابیں جمع کی ہیں تاکہ اعیانِ شہر کے مقابلے میں تفاخر کا اظہار کر سکوں۔ اس کتب خانے میں ایک کتاب کی جگہ خالی تھی۔ میں نے اس کتاب کو خوش خط لکھا ہوا پایا اور اس کی جلد بھی خوب صورت دیکھی تو یہ مجھے بھا گئی۔ میں ایک رئیس شخص ہوں، اب مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ اس پر کتنا مال صرف ہوتا ہے۔"

حضرمی لکھتے ہیں، اس کا یہ جواب مجھے بڑا محسوس ہوا اور میں نے کہا۔" ہاں رزق تو آپ ایسے لوگوں کے پاس ہی کثرت سے ہوتا ہے۔ بادام اُسے کھانے کے لیے ملتے ہیں جس کے دانت نہ ہوں۔ میں اس بات سے باخبر ہوں کہ اس کتاب میں کیا لکھا ہے اور اس سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں، لیکن میرے پاس رزق تھوڑا ہے اور قلتِ مال میرے اور میری خواہش کے مابین حائل ہو رہی ہے۔"

قرطبہ والے ہر دور میں کتابوں کے پرستار رہے اور اس کے برعکس اشبیلیہ والے لہو و لعب اور طرب کے دل دادہ تھے۔ چنانچہ اگر اشبیلیہ میں کوئی عالم فوت ہو جاتا اور اس کی کتابوں کو فروخت کرنے کا ارادہ ہوتا تو وہ قرطبہ بھیجی جاتیں۔ اور اگر قرطبہ میں کوئی گویّا مر جاتا تو اس کے آلاتِ موسیقی فروخت کے لیے اشبیلیہ روانہ کیے جاتے۔

مصر کے کتب خانے

خلفائے بغداد اور اندلس کی طرح مصر کے فاطمی خلفا بھی بڑے علم دوست اور علما کے قدردان تھے۔ ان کے دور میں مصر میں بھی بہت سے کتب خانے قائم کیے گئے۔ اس سلسلے کی ابتدا عزیز باللہ ثانی نے کی جو ۳۶۵ھ میں تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ اس نے تاریخ، ادب، فقہ اور دیگر علوم پر اہم تالیفات کے حاصل کرنے کی غرض سے زرِ کثیر صرف کیا اور اپنے محل کے متعدد کمروں کو ان کتابوں کے لیے مخصوص کر دیا۔ اس کتب خانے کو اس نے "خزانۃ الکتب" کے نام سے موسوم کیا۔ اس کتب خانے میں خلیل بن احمد کی کتاب العین کے تیس سے زیادہ نسخے تھے۔ ان میں سے ایک نسخہ خلیل کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ تاریخِ طبری کے بیس نسخے تھے، جن میں سے ہر ایک نسخہ سو سو دینار میں خریدا گیا تھا۔ الجمہرہ ابن درید کے بھی سو نسخے اس کتب خانے میں موجود تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس کتب خانے میں مختلف کتابوں کے نسخوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ جب سلطان صلاح الدین مصر پر قابض ہوا، اس وقت اس میں تاریخِ طبری کے بارہ سو نسخے تھے۔ قرآن مجید کے ۲۴۰۰ نسخے تھے، جو مشہور و معروف خطاطوں کے لکھے ہوئے تھے، اور جن پر آبِ زر کے ساتھ نقش و نگار کیے گئے تھے۔ المقریزی لکھتے ہیں کہ اس کتب خانے میں فقہ، نحو، لغت، حدیث، تاریخ، نجوم، روحانیت اور دیگر علوم پر ۱۶ لاکھ کتابیں موجود تھیں، جن میں سے صاحبِ تراجم الحکما کے بیان کے مطابق ۱۸ ہزار کتابیں علومِ قدیمہ پر تھیں۔ ۶۵۰۰ اجزا نجوم، ہندسہ اور فلسفے سے متعلق تھے۔

عزیز باللہ کو اپنے کتب خانے کے ساتھ گہرا شغف تھا۔ وہ بذاتِ خود کتابوں کی دیکھ بھال کے لیے وہاں جایا کرتا تھا۔ کتب خانے کا ایک ناظم مقرر تھا جو کتابوں کی نگہداشت کرتا اور خلیفے کو کتابیں پڑھ کر سناتا۔ ابنِ خلقان لکھتے ہیں کہ ابوالحسن الشابشتی الکاتب (متوفی ۳۹۰ھ) یہ خدمت بجالاتے رہے۔

فاطمیوں کے زوال کے ساتھ ہی یہ کتب خانہ انقلابِ زمانہ کا شکار ہو گیا اور اس کی بہت سی کتابیں نذرِ آتش ہو گئیں۔ باقی ماندہ کتابیں دریائے نیل اور صحرا میں پھینک دی گئیں۔ صحرا میں کتابوں کے ڈھیروں کے ارد گرد ریت کے ٹیلے بن گئے جو "کتابوں کے ٹیلے" کے نام سے مشہور ہوئے۔ چھٹی صدی ہجری کے وسط میں جب قاہرہ پر کرد قابض ہوئے تو انھوں نے دیگر اشیا کے علاوہ محلات سے ایک لاکھ بیس ہزار کتابیں بھی حاصل کیں جو سلطان صلاح الدین نے عبدالرحیم البریانی کو دے دیں۔

دار الحکمت

یہ کتب خانہ دار العلم کے نام سے بھی مشہور تھا۔ اس کی بنیاد ۳۹۵ھ میں حاکم بامر اللہ بن عزیز باللہ نے قاہرہ میں قصر غربی کے جوار میں رکھی۔ خلیفے نے محلوں کے کتب خانوں سے کتابیں دار الحکمت میں منتقل کر دیں اور اس کے علاوہ متعدد وقف قائم کیے، جن کی آمدنی سے کتابیں خرید کر اس کتب خانے میں رکھی جاتی تھیں۔ اس مکتبے کو فرش و ستور کے ساتھ آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا اور اس کے لیے بہت سے خادم اور نگہبان مقرر تھے۔ بعض مؤرخین دار الحکمت کو لائبریری کے بجائے مدرسہ قرار دیتے ہیں، کیونکہ الحاکم نے اس میں قاری، منجم، علمائے صرف، ماہرین نحو اور اطبا وغیرہ کو بھی متعین کر رکھا تھا، جو لوگوں کو درس دیتے تھے۔ مطالعے کے تمام شائقین کو دار الحکمت میں جانے اور استفادہ کرنے کی عام اجازت تھی۔ کاغذ، قلم اور روشنائی کا حکومت کی جانب سے انتظام تھا۔ الحکم دار الحکمت کے علما کو اپنے دربار میں بلاتا اور مامون کی طرح ان کے درمیان مناظرہ کراتا اور انھیں انعام دیتا۔ دار الحکمت میں استفادے کے لیے آنے والوں کو خلیفے کی جانب سے بحث و مناظرے کی اجازت تھی چنانچہ وہاں مجالس مناظرہ منعقد ہوتیں اور بعض اوقات مناظرے سے بڑھ کر نوبت جدال تک جا پہنچتی۔ اصحابِ بدعت نے ان اجتماعوں سے غلط فائدہ اٹھایا اور اپنے فاسد عقائد پھیلانے کے لیے ان مجلسوں میں شریک ہونے لگے چنانچہ افضل بن امیر الجیوشی نے چھٹی صدی ہجری کے شروع میں ان مجالس کو بند کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ جب افضل فوت ہوا تو خلیفہ آمر باحکام اللہ نے اپنے وزیر المامون بن البطائحی کو حکم دیا کہ ان مجالس کو پھر سے شروع کر دیا جائے لیکن یہ شرط عاید کی کہ ان میں کوئی خلافِ شرع بحث نہ کی جائے۔ اس مکتبے میں کم و بیش ایک لاکھ کے قریب کتابیں جمع تھیں۔ جب صلاح الدین ایوبی سلطانِ مصر بنا تو اس نے دار العلوم کو منہدم کرا کر اس کی جگہ شافعیوں کا ایک مدرسہ تعمیر کر دیا۔

شام کے کتب خانے

فاطمیوں کے دور میں شام میں بھی بہت سے کتب خانے قائم ہوئے۔ طرابلس الشام میں ایک بہت بڑی لائبریری تھی۔ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ جب فرنگیوں نے طرابلس الشام کو فتح کیا تو اس کتب خانے کو لوٹ لیا۔ گبن لکھتا ہے کہ اس میں ۳۰ لاکھ کتابیں تھیں جن کو فرنگیوں نے نذرِ آتش کر دیا۔ جب نور الدین زنگی شام کا والی بنا تو اس نے مختلف شہروں میں مدرسے قائم کیے، جن کے ساتھ کتب خانے بھی تھے۔ یہ کتب خانے "الخزائن النوریہ" کے نام سے مشہور ہوئے۔ سلطان صلاح الدین نے بھی اپنے دورِ حکومت میں متعدد کتب خانے قائم کیے۔

مذکورہ بالا کتب خانوں کے علاوہ عالمِ اسلام کے اطراف و اکناف میں اور بھی بہت سے کتب خانے موجود تھے، جن میں ہزاروں کتابیں تھیں۔ فارس، خراسان اور ماوراء النہر کے کتب خانوں کا تذکرہ تاریخ و ادب کی کتابوں میں آتا ہے۔ یاقوت حموی "معجم البلدان" میں مرو الشاہجہان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس شہر میں دس کتب خانے موجود ہیں، جن کی کتابوں کی جودت و کثرت کے اعتبار سے کہیں مثیل نہیں ملتی۔ یاقوت نے ان کتب خانوں اور ان کے واقفوں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ بخارا میں بھی سلطان نوح بن منصور سامانی کا ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ ابو علی بن سینا اس کتب خانے کے بارے میں لکھتا ہے "میں نے اس کتب خانے میں ایسی ایسی کتابیں دیکھی ہیں، جن کے نام بھی لوگوں تک نہیں پہنچ سکے"۔ ہلاکو خان تاتاری نے بھی نصیر الدین طوسی کے لیے مراغہ میں ایک کتب خانہ قائم کیا تھا، جس میں ۴ لاکھ کتابیں جمع تھیں۔ یہ کتابیں بغداد، شام اور عراق سے لوٹ کر لائی گئی تھیں۔

گزشتہ سطور میں ہم نے "مکاتبِ عمومیہ" یعنی پبلک لائبریریوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ لائبریریاں خلفاء و امرا نے لوگوں کے استفادے کے لیے قائم کی تھیں۔ ان میں مسجدوں، مدرسوں اور ہسپتالوں کی لائبریریاں شامل تھیں۔ بعض علما نے اپنی ذاتی لائبریریاں بھی قائم کر رکھی تھیں، جو کتابوں کی وسعت اور کثرت کے اعتبار سے سرکاری لائبریریوں سے کم نہ تھیں۔ صاحب بن عباد کی کتابیں ۴۰۰ اونٹوں پر لادی جاتی تھیں۔ ابراہیم نامی مصری طبیب جب فوت ہوا تو اس نے بیس ہزار کتابیں ترکے میں چھوڑیں۔ موفق الدین المطران کے مکتبے میں دس ہزار کتابیں تھیں، امین الدولہ کے پاس ۲۰ ہزار جلدیں تھیں۔ اسی طرح فتح بن خاقان اور ابن القفطی کے بھی ذاتی کتب خانے تھے۔

جناب رحمت فرخ آبادی ایم۔اے

حضرت مخدوم نوح ہالائی علیہ الرحمہ

برصغیر پاک و ہند میں مسلم فاتحین اس وقت آئے جب اسلامی فتوحات کا مقصد کشور کشائی، حکمرانی اور قصر خلافت کی نگرانی کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا۔ اسلام کے سرچشمہ ہدایت سے یہ لوگ خود تو فیض یاب ہوئے لیکن اس کی اشاعت ان کے مقاصد مملکت میں شامل نہ تھی۔ اس خطہ ارض پر درحقیقت جن ہستیوں نے اشاعت اسلام کا فرض سرانجام دیا، وہ نہ تو فاتحین اور حکمران تھے اور نہ تاجر اور سوداگر۔ یہ منصب جلیلہ علمائے عظام اور صوفیائے کرام کے حصے میں آیا، جنھوں نے مختلف وقتوں میں عرب کے مختلف حصوں سے خصوصاً اور اسلامی ریاست کے دیگر علاقوں سے عموماً نکل کر برصغیر کا رُخ کیا اور جہاں مناسب خیال کیا، قیام فرمایا اور ان کی یہی جائے قیام بعد میں سرچشمہ ہدایت بن گئی۔

سندھ جغرافیائی لحاظ سے ایک ایسی جگہ واقع ہے کہ برصغیر میں داخل ہونے والی ہر طاقت نے بحری اور بری راستے سے عام طور پر ادھر ہی کا رُخ کیا۔ یہی حال صوفیائے کرام کے قافلوں کا ہے، چنانچہ سرزمین سندھ کی خوش نصیبی ہے کہ برصغیر کے اسلامی دور کے اوائل میں تمام اولیائے کرام کے قدم اس خطے پر سے گزرے اور یہاں کے رہنے والے اُن کی رشد و ہدایت سے مستفیض ہوئے۔ سندھی تہذیب میں مسافر نوازی، مہمان داری، بزرگوں کا ادب و احترام، مسکینی انکساری اور فقیری یہ تمام خوبیاں تصوف ہی کا عطیہ ہیں۔ سندھی تہذیب پر تصوف کے اثرات ایک وسیع موضوع ہے جو ہنوز تحقیق طلب ہے۔ سندھ میں جن صوفیائے کرام نے مستقل قیام لیا اور اس سرزمین کو اپنی رشد و ہدایت کا مرکز قرار دیا، ان کے مختلف سلسلے ہیں جن میں سے بعض اب تک جاری ہیں۔

ایسے ہی سلسلوں میں جن صوفیائے کرام نے ہمہ گیر اثرات چھوڑے اور جن کی تعلیمات آج بھی اس سندھ کے لیے روح پرور اور باعث خیر و برکت ہیں ان میں حضرت مخدوم نوح ہالائی علیہ الرحمہ کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ ان کے بارے میں صاحب حدیقۃ الاولیا نے لکھا ہے:

"آں پیر ولایت، صاحب ارشاد و ہدایت، شمع شبستان وحدت، مہر سپہر معرفت، عارف معارف دین، سالک مسالک یقین، سالار قافلۂ اہل اللہ، سردفتر ذاکران آگاہ، یعنی مخدوم نوح ولد نعمت اللہ از جملہ مشائخ عظام و اولیائے کرام سندھ

سلسلۂ نسبش بسلک نسب حضرت امیر المومنین ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ انتظام می باید۔"

حضرت مخدوم نوح علیہ الرحمہ قریشی صدیقی کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، جو میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے اپنی کتاب تحفۃ الکرام جلد سوم میں اس طرح درج کیا ہے:

"غوث الحق حضرت مخدوم نوح بن مخدوم نعمت اللہ بن مخدوم اسحاق بن مخدوم شہاب الدین بن مخدوم سرور بن مخدوم فخر الدین صغیر (جو ہالا میں مدفون ہیں) بن شیخ عزیز الدین بن شیخ فخر الدین کبیر (جو ہالاجی میں شیخ ابوبکر کے مقبرے میں مدفون ہیں) بن شیخ ابوبکر کتابی (ساکن کوٹ کروڑ) بن شیخ اسماعیل بن شیخ عبداللہ بن شیخ نصیر الدین بن شیخ سراج الدین بن شیخ ابو نجیب ضیاء الدین عبدالقادر سہروردی (جو سلسلۂ سہروردیہ کے بانی ہیں) بن شیخ ابراہیم بن شیخ وحید الدین بن شیخ محمد عمر بن شیخ عبداللہ بن شیخ رضا الدین محمد بن شیخ مسعود بن شریف ابوالقاسم بن شیخ محمد عمر بن حضرت عبدالرحمٰن بن امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

حضرت مخدوم کے آباؤ اجداد میں سے شیخ فخر الدین کبیر ملک عرب سے ہجرت کرکے برصغیر آئے اور ڈیرہ غازی خان کے قرب وجوار میں قصبہ کوٹ کروڑ میں قیام پذیر ہوئے۔ لیکن اعجاز الحق قدوسی اپنی کتاب تذکرہ صوفیائے سندھ میں بیاض سیجیڈ نہ مملوکہ سندھی ادبی بورڈ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آپ کے جد اعلیٰ شیخ ابوبکر کتابی، شیخ احمد، شیخ محمد، شیخ علی المعروف بہ قاضی اور شیخ جلال الدین، یہ پانچ حضرات سب سے پہلے آکر کوٹ کروڑ میں آباد ہوئے۔ اس زمانے میں یہ قصبہ صوفیائے کرام اور بزرگان دین کا ایک اہم مرکز تھا۔ اب بھی یہاں کئی صوفیائے کرام کی درگاہیں موجود ہیں اور ان میں سے کئی ایک کی اولاد بھی یہیں آباد ہے۔ بقول مولانا اعجاز الحق قدوسی، شیخ ابوبکر کتابی اپنے وقت کے عظیم المرتبت صوفی اور درویش تھے۔ آپ عوام وخواص میں شیخ شمس الدین کوٹ کروڑی کے نام سے مشہور ہوئے اور کوٹ کروڑ ہی میں وفات پائی۔

شیخ فخر الدین کبیر کچھ عرصہ کوٹ کروڑ میں قیام کرنے کے بعد سندھ کے ایک شہر لوبک چلے گئے۔ یہ شہر بھی اس زمانے میں صوفیائے کرام اور بزرگان دین کا مسکن تھا۔ شیخ فخر الدین کبیر علوم ظاہری اور علوم باطنی میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ وہ اپنے دور کے ایک مایہ ناز بزرگ اور عارف کامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا انتقال لوبک ہی میں ہوا اور یہیں ان کا مدفن ہے، لیکن دلیل الذاکرین میں ہے کہ آپ نے سیوستان میں وفات پائی اور حضرت شہباز قلندر کے قرب وجوار میں مدفون ہوئے۔

شیخ فخر الدین کبیر کے لوبک چلے جانے کے بعد ان کے پوتے شیخ فخر الدین صغیر نے بھی ڈیرہ غازی خان کو خیرباد

کہہ دیا۔ انھوں نے بھی سندھ کا رُخ کیا اور ہالا کنڈی (پرانا ہالا) کے مقام پر سکونت اختیار کی۔ یہ بھی ایک صاحب کرامت بزرگ تھے اور اپنے وقت کے صوفیا میں ان کا بہت اہم مقام تھا۔ ان کے بارے میں میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے اپنی کتاب تحفۃ الکرام جلد سوم میں لکھا ہے کہ یہ شیخ ابونجیب سہروردی کی اولاد میں بڑے مقتدر ولی اور راہِ ہدایت کے بڑے باخبر سالک ہیں۔ ہالا میں قیام پذیر ہیں۔ یہ مخدوم نوح کے پانچویں دادا ہیں اور ان کی زیارت اہلِ ایمان کے لیے باعثِ فخر ہے۔ ان کی درگاہ میں قبولیت کا فیض بہت عام ہے۔ فخرالدین صغیرؒ کا مزار ہالا میں شیخ ابوبکر کے مقبرے میں ہے۔ شیخ ابوبکر بھی ہالا کے ایک کامل اور قدیم ولی ہیں اور اس سرزمین میں ان کا مزار اہل اللہ کی زیارت گاہ ہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد نے ہالا کے قریب گوٹھ ٹوڑھی میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے یہاں لاکھو اور سومرہ قوم میں شادیاں کیں اور اس طرح ان کی نسل یہاں خوب پھلی پھولی۔

مخدوم نوح کا تعلق بھی شیخ فخرالدین ہی کی نسل سے ہے اور یہ بات ان کے شجرۂ نسب سے بھی ظاہر ہے۔ آپ کے والد کا نام نعمت اللہ ہے۔ مخدوم نوح کی ولادت سے قبل اس وقت کے کئی بزرگوں اور درویشوں نے اس بات کی پیشین گوئی کی تھی کہ اس شہر میں بعد ہی اپنے زمانے کا ولی اور مخلوقِ خدا کا ہمدرد پیدا ہوگا جس کی چار دانگ عالم میں دھوم ہوگی۔

حضرت مخدوم نوح کے والد مخدوم نعمت اللہ نے پچاس سال کی عمر میں شادی کی تھی۔ آپ کی اہلیہ کا نام بی بی سکینہ تھا لیکن مولانا اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں کہ ان کا نام بی بی راجی تھا جو قبیلہ راکھا سے تھیں۔ شادی کے ٹھیک نو ماہ بعد ۲۷ رمضان المبارک ۹۱۱ھ بمطابق ۱۵۰۵ء بروز جمعرات کے وقت حضرت مخدوم نوح تولد ہوئے۔ آپ کا نام لطف اللہ رکھا گیا۔ آپ کی پیدائش کے وقت کئی کرامتیں ظاہر ہوئیں جن کا تذکرہ آپ کے ملفوظات سکینۃ الروح میں تفصیل سے ملتا ہے۔ یہی مخدوم لطف اللہ بعد میں حضرت غوث الحق مخدوم نوح علیہ الرحمہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس سلسلے میں سکینۃ الروح میں درج ہے کہ ایک دفعہ حضرت مخدوم نوح نے اپنے فقیروں کی مجلس میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا نام نوح رکھا ہے، اسی وجہ سے والدین کا رکھا ہوا نام اللہ تعالیٰ کی طاقت و قدرت سے لوگوں کے دلوں سے محو ہو گیا۔ اب آسمان اور زمین والوں کے نزدیک میرا نام نوح ہے۔ اس سلسلے میں مرزا قلیچ بیگ لکھتے ہیں کہ مخدوم نوح کے والد مخدوم نعمت اللہ کو کسی ولی کامل نوح ہوتنزانی نے یہ کہا تھا کہ اپنے لڑکے کا نام میرے نام پر نوح رکھنا۔ چنانچہ مخدوم نعمت اللہ نے اس حکم کی تعمیل میں آپ کا نام نوح رکھا۔

دلیل الذاکرین میں ہے کہ زمانۂ طفلی ہی سے آپ کی پیشانی سے انوارِ ولایت ہویدا اور تاباں تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ آیندہ چل کر آپ آفتابِ ولایت بننے والے ہیں۔ جب حضرت مخدوم نوح کی عمر سات سال کی ہوئی تو قرآن کریم کی تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ اس سلسلے میں آپ کے استاد مخدوم عربی عرف مخدوم شاہ ٹھٹہ تھے۔ یہ بھی اپنے زمانے کے ایک ولی کامل تھے اور قرآن کریم کی تلاوت بڑے خوش الحان انداز میں کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مخدوم عربی نے جو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے نانا بھی تھے، صرف ایک مقام پر قیام کر کے قرآن کریم کی ایک سو چالیس مرتبہ تلاوت کی تھی۔ حضرت مخدوم نوح علیہ الرحمہ نے آپ کے پاس قرآنِ کریم کے پچیس سیپارے پڑھے اور بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے ان سے فقہ کی بھی چند کتابیں پڑھی تھیں۔ صاحب حدیقۃ الاولیا اور صاحب تحفۃ الکرام نے لکھا ہے کہ چودہ سال کی عمر میں آپ کو علوم میں درک حاصل ہو گیا تھا۔

جس زمانے میں حضرت مخدوم نوح قرآن کریم کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اس زمانے میں آپ کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو قرآن کریم کے معنی اور تفسیر کے ساتھ ساتھ الفاظ کا صحیح تلفظ تک بتایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں سکینۃ الروح میں ہے کہ حضرت مخدوم نوح فرمایا کرتے تھے کہ مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے چار چیزیں عطا ہوئی ہیں (الف) ذکرِ الٰہی (ب) تفسیر قرآن کریم (ج) حدیث کا مطالعہ کرنا، اسے سمجھنا اور سمجھانا اور (د) خواب کی تعبیر۔ ۱

مخدوم نوح ہالائی، تصوف میں اویسی تھے۔ کتاب سراج العارفین میں بھی یہ بات درج ہے کہ حضرت نوح کا کوئی مرشد نہ تھا اور وہ شب و روز ذکرِ حق تعالیٰ میں مشغول و مصروف رہا کرتے تھے اور یہ کہ ایسے ہی بزرگانِ دین کو اویسی مسلک سے منسلک قرار دیا جاتا تھا جن کا کوئی مرشد نہ ہوتا تھا۔ اویسی مسلک کی نسبت درحقیقت حضرت اویس قرنیؓ سے ہے۔ دلیل الذاکرین میں ہے کہ ایک روز شیخ ابوبکر قریشی نے جو حضرت بہاالدین زکریا ملتانی کی اولاد سے تھے اور حضرت مخدوم نوح سے عقیدت رکھتے تھے، مخدوم فضل اللہ سے پوچھا کہ حضرت مخدوم نوح تصوف کے کس سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں، وہ فوراً دوڑتے ہوئے حضرت مخدوم نوح علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ابھی زبان سے کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ آپ نے فرمایا کہ میرا اس کے پاس نہ کوئی شفیع ہے اور نہ ولی۔ اس سے اس طرف بلیغ اشارہ تھا کہ میں فیضان کے حصول میں کسی کا مرید نہیں ہوں اور یہ کہ آپ نے علوم باطنی میں انتساب کسی شیخ یا مرشد سے نہیں کیا تھا بلکہ آپ کا علم وہبی اور من جانب اللہ تھا۔

حضرت مخدوم نوح ہمیشہ ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے اور جو شخص آپ کا مرید بنتا، اسے بھی ذکرِ الٰہی میں

مشغول رہنے کی ہدایت کرتے۔ ان کی ذکرِ الٰہی میں مشغولیت کی یہ کیفیت تھی کہ زبان سے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا جاری رہتی اور آپ ایک طالبِ حق کی طرح اس میں اس درجے محو ہو جاتے کہ یہ معلوم ہوتا کہ آپ صرف جسمانی لحاظ ہی سے موجود ہیں۔ اسی لیے دلیل الذاکرین میں ہے کہ آپ کا تمام وقت عبادت اور یادِ الٰہی میں گزرتا اور ہر وقت زبان پر ذکرِ الٰہی جاری رہتا۔ ہمیشہ لب مبارک حرکت کرتے رہتے اور حجامت کے وقت حجام سوچتا تھا کہ آپ ذرا سکوت فرمائیں تو وہ مونچھوں کو درست کرے۔ آپ حجام کے چہرے سے اس کے ارادے کا اندازہ کر کے فرماتے، میاں امام اعظم اور حضرت امام شافعی کا حجام جب حجامت بناتا اور مونچھیں درست کرنے کا ارادہ کرتا تو کہتا کہ اے امام المسلمین ذرا ہونٹوں کی حرکت روکیے تاکہ میں مونچھوں کو درست کر دوں، تو وہ فرماتے کہ اگر تم آفتاب اور آسمان کی حرکت کو روک دو تو ہم بھی اپنے ہونٹوں کی حرکت روک سکتے ہیں۔

ذکرِ الٰہی میں اس درجہ محویت کے باوجود جب بھی کوئی طالبِ حق کچھ پوچھتا یا کوئی شخص مرید بننے کے لیے آتا تو آپ پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ اس سے گفتگو کرتے اور اسے راہِ حق دکھاتے۔ اسی طرح عالمِ استغراق میں ہونے کے باوجود آپ شریعت کے پوری طرح پابند تھے اور نماز باجماعت کے تو اس طرح پابند تھے کہ نماز باجماعت ہمیشہ مسجد ہی میں جا کر ادا فرماتے۔

مخدوم نوح نے اگرچہ علومِ ظاہری کی تعلیم بہت ہی کم حاصل کی تھی لیکن علومِ ظاہری اور باطنی پر اس درجہ عبور حاصل تھا کہ اس زمانے کے نامور علما و فقہا ان کی علوم القرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ میں خداداد ذہانت اور قابلیت دیکھ کر رشک کرتے تھے۔ جب بھی کوئی شخص آپ سے سوال کرتا تو آپ اس کے جواب میں قرآن کریم کی کوئی آیت یا حدیثِ نبوی بیان فرماتے اور اس کی تشریح کرتے ہوئے سائل کے سوال کا اس قدر عمدہ جواب دیتے کہ وہ مطمئن ہو جاتا۔ علوم القرآن پر حضرت مخدوم کو اس درجہ عبور حاصل تھا کہ آپ ایک آیت کی کئی کئی انداز سے اور کئی طور پر تفسیر بیان فرماتے۔ ان کی یہ تفسیر انسان کی ظاہری اور باطنی دونوں زندگیوں پر حاوی تھی۔ چنانچہ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی اپنی کتاب تحفۃ الکرام جلد سوم میں لکھتے ہیں کہ حضرت مخدوم نوح کسی وقت ٹھٹھے تشریف لائے۔ علمائے ظاہر نے سنا تھا کہ یہ ناخواندہ ہونے کے باوجود قرآن پاک کی آیات کے معنی بڑی خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، چنانچہ وہ انھیں دیکھنے کے لیے آئے۔ اس وقت مخدوم صاحب ایک آیت کی تفسیر میں مصروف تھے۔ راوی کہتا ہے کہ میرے ہاتھ میں تسبیح تھی اور ہر معنی پر میں دانے بدلتا جاتا تھا۔ جب انھوں نے سکوت کیا تو میں نے شمار کیا کہ کل اسّی (۸۰) دانے ہو گئے۔

مخدوم نوح کے روحانی فیض اور ان کی علوم ظاہری اور علوم باطنی پر دسترس کی ان کے علاقے میں دھوم تھی اور روزانہ دور دراز کا سفر کرکے لوگ آکر آپ کے مرید بنتے تھے۔ اسی طرح اگر وہ کبھی کسی دوسرے شہر میں جاتے تھے تو سیکڑوں آدمی نہ صرف آپ کے مرید ہونے آتے بلکہ آپ سے فیض روحانی بھی حاصل کرتے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دفعہ جب آپ ننگر ٹھٹھہ کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے تشریف لے گئے تو نماز جمعہ کے بعد وہاں کی نومڑیہ قوم کے سیکڑوں آدمی گروہ در گروہ آپ کے پاس مرید ہونے کے لیے آتے۔ حضرت مخدوم نوح کا یہ اصول تھا کہ آپ اپنے مریدوں کو صرف ذکر الٰہی میں کثرت سے مشغول رہنے کی ہدایت کرتے تھے۔ یوں تو ہر وقت ہالاکنڈی میں آپ کے مرید اور معتقدین آپ کی خدمت میں حاضر رہا کرتے لیکن آپ نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ سال میں ایک مرتبہ ماہ ذی الحجہ کی ۹ تاریخ کو آپ کے تمام مرید آپ کے ساتھ نماز عید ادا کرتے اور پھر اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے۔ دلیل الذاکرین میں ہے کہ شیخ درویش، حضرت محمود بوبکانی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے مخدوم معظم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ ذکر الٰہی تنہائی میں کرو۔ کسی نامحرم عورت سے بات نہ کرو۔ فساق و فجار کی صحبت سے پرہیز کرو۔ علما سے بحث اور مجادلہ نہ کرو۔ دنیاداروں اور بادشاہوں کے گھروں میں نہ جاؤ اور اگر وہ بلائیں تو جانے سے انکار کردو۔

حضرت مخدوم نوح ہالائی اپنی حیات میں لاکھوں مریدوں کے مُرشد تھے اور آج تک ان کی اولاد کے بھی لاکھوں مرید ہیں، انھوں نے ایک ایسا چشمۂ فیض جاری کیا جس سے تاقیامت لوگ فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ دلیل الذاکرین میں ہے کہ سید محمود بن صدیق فخری کا بیان ہے کہ جن دو بزرگوں نے سب سے پہلے مخدوم نوح ہالائی سے توحید کی تلقین حاصل کی ان میں سب سے پہلے مخدوم ساہر لنجار اور پھر شیخ ہوتی لاکھا کا نام آتا ہے۔ دلیل الذاکرین ہی کے حوالے سے مولانا اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں کہ حضرت مخدوم نوح کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ سندھ کے اکثر اکابر صوفیا آپ ہی کے سلسلے سے متعلق نظر آتے ہیں۔ آپ کے مریدوں اور عقیدت مندوں کو یاروں سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ کسی نے حضرت مخدوم نوح سے سوال کیا کہ آپ کے مریدوں کو یار کہتے ہیں حالانکہ آپ سے پہلے جتنے بزرگ گزرے ہیں ان کے ارادت مندوں کو مرید کہا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ فقیر کا قدم چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پر شریعت کے عین مطابق ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی بھی چونکہ یار کہلاتے تھے، اس لیے میرے ساتھی اور معتقدین بھی یار کہلاتے ہیں۔ آپ کے مریدین اور خلفا میں جو حضرات بہت مشہور ہیں، ان کے نام مولانا اعجاز الحق قدوسی نے دلیل الذاکرین کے حوالے سے درج کیے ہیں۔ ان میں سے چند

کے مختصر سوانح حیات ان کی کتاب تذکرہ صوفیائے سندھ میں درج ہیں ۔

میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے بھی اپنی کتاب تحفۃ الکرام میں حضرت مخدوم نوح کے چند خاص مریدوں اور معاصرین کا تذکرہ کیا ہے ۔ اسی طرح تحفۃ الکرام میں بھی حضرت مخدوم نوح کے بعض معاصرین کا تذکرہ ملتا ہے ۔

سکینۃ الروح میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مخدوم نوح نے فرمایا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا تجرد دیکھ کر میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں بھی شادی نہ کروں لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے یعنی دنیا سے تعلقات کو توڑ لینا یا دنیاوی فرائض سے روگردانی اسلام میں نہیں ہے اور پھر جب میں نے دیکھا کہ ہمارے آقائے نامدار، احمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی شادیاں کیں اور اولاد ہوئی تو میں نے رسول اکرم کی متابعت کرنا ضروری سمجھا اور اسی لیے شادی کی ۔

چنانچہ مخدوم نوح نے چالیس سال کی عمر میں پہلی شادی جام تماچی سمہ کی ہمشیرہ بی بی زلیخا عرف باجارت کی جن سے چار لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں ۔ ان کے صاحب زادوں کے نام یہ ہیں ۔

(۱) مخدوم میاں محمد امین ۔ یہ سب سے پہلے صاحب زادے ہیں جنھیں آپ کے بعد خلافت ملی ۔ بقول صاحب دلیل الذاکرین مخدوم میاں محمد امین ایک عارف کامل، متقی اور پرہیزگار تھے اور اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے تھے ۔ ان سے تصوف اور عرفان کا نور پورے سندھ میں پھیلا ۔ (۲) مخدوم میاں محمد حامد (۳) مخدوم میاں نور محمد (۴) مخدوم میاں احمد

آپ کی اہلیہ کا انتقال ۹۵۶ھ میں ہوا، اس کے بعد آپ نے دوسری شادی چوہان قوم میں کی، ان کی دوسری اہلیہ سے پانچ بیٹے تولد ہوئے ۔ (۱) مخدوم میاں موسیٰ (۲) مخدوم میاں آدم (۳) مخدوم میاں ہارون (۴) مخدوم میاں داؤد (۵) مخدوم میاں یوسف

آپ نے تیسری شادی دوسری اہلیہ کی موجودگی ہی میں کی تھی اور ان سے تین لڑکے اور ایک لڑکی تولد ہوئیں ۔ صاحب زادوں کے نام یہ ہیں : (۱) مخدوم میاں ابراہیم ۔ انھیں مخدوم نوح سلطان ابراہیم ادہم ثانی کے نام سے بھی یاد کیا کرتے تھے ۔ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے لکھا ہے کہ یہ اپنے وقت کے بزرگ اور جماعت فقرا کے مرشد تھے ۔ (۲) مخدوم میاں میراں محمد ۔ (۳) مخدوم میاں جلال الدین محمد ۔ ان کے بارے میں صاحب تحفۃ الکرام نے لکھا ہے کہ مخدوم جلال بزرگی اور شائستگی کی نشانیوں اور کمال کی خوبیوں میں بے مثال تھے ۔

مخدوم نوح نے چوتھی شادی قبیلہ سعتہ میں بھی کی تھی لیکن ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔

حضرت مخدوم نوح علیہ الرحمہ کے مریدین اور معتقدین میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے، ان میں حاکمِ وقت بھی تھے اور زمیندار اور غریب اور متوسط طبقے کے افراد بھی شامل تھے۔ یہ لوگ خلوصِ نیت اور صدقِ دل سے قیمتی سے قیمتی تحائف اور نذرانے آپ کی خدمت میں پیش کرتے، لیکن آپ نے کبھی بھی مال و دولت جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ جو کچھ بھی نذرانے اور تحائف وصول ہوتے، ان میں سے بہت کم حصہ اپنے اہل و عیال کی گزر اوقات میں صرف کرتے، باقی مستحقین میں بانٹ دیتے۔ آپ بہت کم خوراک تھے اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لباس اور خوراک کے معاملے میں آپ کی سادگی ضرب المثل تھی۔

مخدوم نوح علیہ الرحمہ کا انتقال ۲۷ ذی قعدہ شب پنجشنبہ ۹۹۸ھ بمطابق ۱۵۹۰ء بعد نماز عشا ہوا۔ صاحب حدیقۃ الاولیا نے شیخی بنوح بود (۹۹۸ھ) سے آپ کی تاریخ وفات نکالی۔ انتقال کے وقت مخدوم نوح کی عمر ستاسی سال کی تھی۔ اگرچہ آپ کی عمر کافی زیادہ تھی لیکن اس کے باوجود اپنا تمام کام خود کرتے تھے اور صحت کا یہ عالم تھا کہ آخری لمحے تک بالکل تندرست اور نہایت چاق و چوبند تھے۔

حضرت مخدوم نوح نے وصیت فرمائی تھی کہ انتقال کے بعد مجھے کوئی غسل نہ دے۔ عبد و فقیر جہاں کہیں بھی ہوگا، وہ صبح کے وقت آجائے گا اور میری میت کو غسل دے گا اور یہ کہ غسل دینے کے بعد جلدی نہ کرنا، کئی غیبی جماعتیں میرے جنازے کی نماز پڑھیں گی، ان کے بعد جو لوگ حاضر ہوں وہ نماز جنازہ پڑھیں۔ چنانچہ جمعے کے دن فجر کی نماز سے قبل ہی عبد و فقیر مسجد میں آیا اور نمازِ فجر کے لیے کہا۔ اگرچہ لوگ عبد و فقیر کو پہچانتے نہیں تھے لیکن اس کے انداز سے جان گئے کہ یہی وہ عبد و فقیر ہے۔ نمازِ فجر کے بعد عبد و فقیر نے حضرت مخدوم نوح کے جسدِ خاکی کو حویلی سے لا کر غسل دیا اور جنازہ تیار کر کے میدان میں رکھ دیا۔ نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد حضرت مخدوم نوح کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور ان کے وطن ٹوڑھی (پرانا ہالا) میں دفن کیا گیا۔ لیکن بارہ سال کے بعد سیلاب کی وجہ سے آپ کے جسدِ خاکی کو وہاں سے نکال کر ایک نئے قصبے میں دفن کیا گیا اور اس کا نام اسلام آباد رکھا گیا۔ کچھ عرصے بعد یہی اسلام آباد نیا ہالا کے نام سے مشہور ہوا۔ آج کل آپ کے سجادہ نشین آپ ہی کی اولاد میں سے جناب مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ ہیں جو پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن بھی رہ چکے ہیں اور سندھ کی ایک مایہ ناز ادبی شخصیت بھی ہیں۔ سندھی ادب کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں آپ نے جو خدمات سرانجام دیں، ان کے اعتراف کے طور پر عرصہ دراز تک آپ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد کی مجلس انتظامیہ کے صدر رہے۔

مخدوم نوح کے مرقد پر جو مقبرہ ہے وہ ان کے پوتے مخدوم محمد زمان پانچویں سجادہ نشین نے ۱۲۰۵ھ میں تعمیر

کرایا تھا۔ اس مقبرے کے جنوب میں ایک اور مقبرہ ہے جو مخدوم میر محمد ـــ پچھلے سجادہ نشین ـــ کے مرقد پر بنایا گیا ہے۔ یہ مقبرہ سندھ کے تالپور حکمران میر فتح علی خاں نے ۱۲۱۰ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ مخدوم نوح کے مقبرے کے شمال میں ایک عالی شان جامع مسجد ہے جو سندھ کے تالپور حکمران میر کرم علی خان نے جو میر فتح علی خاں کے بھائی بھی تھے ۱۲۲۴ھ میں تعمیر کرائی تھی۔

حضرت مخدوم نوح کے ملفوظات اور مکتوبات کا مجموعہ سکینۃ الروح کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا دین محمد وفائی مرحوم اس مجموعے کی تہذیب و ترتیب کے لیے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان کئی مرتبہ ہالا تشریف لے گئے تھے۔ اسی طرح مخدوم صاحب کے موجودہ سجادہ نشین مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ کے حکم پر استاذی مولائی شیدائی نے ایک کتاب سفینۃ النوح کے نام سے لکھی تھی جو ہنوز غیر مطبوعہ اور مخدوم طالب المولیٰ صاحب کی تحویل میں ہے۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں کہ حضرت مخدوم نوح ہالائی کے ملفوظات دلیل الذاکرین میں بڑی کثرت سے نقل کیے گئے ہیں جو اثر و تاثیر، حکمت و موعظت اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بے نظیر ہیں۔

اس سلسلے میں شمس العلماڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ لکھتے ہیں کہ حضرت مخدوم نوح کی حیات اور ان کے ارشادات کو اصل فارسی میں مخدوم غلام حیدر صاحب نے مدون کیا تھا اور پھر اشاعت کے لیے ان کا سندھی میں ترجمہ کیا۔ میں نے فارسی نسخہ نہیں دیکھا لیکن سندھی ملفوظات (مراد سندھی ترجمہ سے ہے) میرے پاس کافی عرصہ تک رہے۔ اسی سلسلے میں پیر سید حسام الدین راشدی لکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں دو کتابیں لکھی گئیں۔

۱۔ سفینۃ النوح (فارسی) تالیف مخدوم غلام حیدر (۱۲۴۴ھ)

۲۔ اور راحت الروح (سندھی) از مولانا دین محمد وفائی مرحوم

سید حسام الدین راشدی نے حدیقۃ الاولیا مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ۱۹۶۷ء کے مقدمے میں ان مخطوطات کا تذکرہ کیا ہے جن میں مخدوم نوح اور ان کے خانوادے کے سلسلے میں مواد ملتا ہے۔ ہم ذیل میں اُن کتب کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ رسالہ ملاّ خیالی۔ تالیف ملا حسین خیالی۔ یہ مخدوم نوح کے ہم عصر تھے۔

۲۔ رسالہ بہار الدین دلق پوش۔ مؤلف حضرت مخدوم نوح کے خاص مرید اور ان کے صاحب زادوں کے استاد تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے مخدوم نوح کے سوانح اور ملفوظات نقل کیے ہیں۔ صاحب دلیل الذاکرین نے اس کتاب سے بیشتر روایتیں نقل کی ہیں۔

۳۔ رسالہ فتحیہ، تالیف فتح محمد جو حضرت مخدوم نوح کے پوتے تھے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۴۴۴ ہے۔ یہ کتاب ۱۱۰۹ھ میں لکھی گئی، اس مخطوطے کی نقل غالباً سندھ یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کتاب کا ۱۲۸۸ھ میں ایک نامعلوم شاعر نے تحفۃ المریدین فی مناجات المرشدین کے نام سے سندھی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اس کے ۳۴۲ صفحات ہیں۔

۴۔ دلیل الذاکرین۔ مؤلفہ حاجی پھنور۔ یہ کتاب ۱۱۰۶ھ میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں اس دور کے سیاسی و سماجی حالات پر کافی اہم معلومات ملتی ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ سندھ یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

۵۔ کوس فخریہ: مؤلفہ حاجی یعقوب۔ یہ کتاب دلیل الذاکرین کا ضمیمہ اور سندھ میں تصوف کی تاریخ پر ایک اہم ماخذ ہے۔

۶۔ ارشاد الطالبین۔ مؤلفہ غلام رسول قریشی ہالائی۔ کاتب سید علی محمد متعلوی۔ سن کتابت ۱۳۰۵ھ۔ صفحات ۵۷۴۔ اس مخطوطے میں سندھ کے ۱۶۴ بزرگان دین کا تذکرہ ہے۔

۷۔ سراج العارفین۔ مؤلفہ غلام رسول قریشی ہالائی۔ تالیف ۱۲۱۵ھ مؤلف مذکورہ، مخدوم نوح کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ جلد اول کے ۵۲۳ صفحات ہیں اور جلد دوم موجود نہیں ہے۔ رموز تصوف اور مخدوم نوح اور ان کے خانوادے کے علاوہ سندھ کے دیگر مشائخ اور نزخان دور پر ایک اہم ماخذ ہے۔

۸۔ گنجینہ اولیا۔ مؤلفہ اخوند محمد صالح تالیف ۱۳۱۴ھ۔ اس کے کل ۴۸۸ صفحات ہیں اور کاتب کا نام عمر نقش بندی ہے۔

یہ تمام کتب مخطوطات کی صورت میں مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ کی تحویل میں ہیں۔ کاش مخدوم صاحب اور سندھی ادبی بورڈ ان کو طبع کرانے کی طرف توجہ کرے۔ یہ ایک اہم دینی، علمی اور تاریخی خدمت ہوگی۔

دلیل الذاکرین میں ہے کہ حضرت مخدوم نوح تصنیف و تالیف سے گریز فرماتے تھے۔ ایک دفعہ سید اسماعیل بخاری نے جو آپ کے مریدوں میں سے تھے، ارادہ کیا کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں، اس کو لکھ لیا جائے۔ آپ کو یہ معلوم ہوا تو فرمایا، میاں طالب حق قدرت کے قلم سے ان باتوں کو صحیفۂ دل پر لکھتا ہے، کاغذ پر نہیں لکھتا۔ کبھی کبھی فرمایا کرتے کہ بزرگان سلف کی طرح خیال ہوتا ہے کہ تصوف پر ایسی جامع کتاب لکھی جائے کہ قدما کی کتابیں دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہے لیکن ادب ہمیشہ مجھے اس خیال سے مانع رہا۔ میرے مریدین مستقل تصوف کی کتاب ہیں کہ جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا ہے وہ بزرگوں کے قول کے مطابق اور شریعت کے موافق ہوتا ہے۔

مخدوم نوح اپنی مجالس میں مریدوں اور معتقدوں کو ہمیشہ قرآن و حدیث کی روشنی میں درس دیا کرتے تھے۔ سطور ذیل میں ہم ان کی چند اخلاقی نصیحتوں اور ہدایتوں کو درج کر رہے ہیں جو اُن کے ملفوظات سکینۃ الروح میں بھی شامل ہیں۔

ایک مرتبہ مخدوم نوح سے ان کے ایک معتقد نے دریافت کیا کہ ہم انسان کے قلب کو کس طرح پہچانیں۔ آپ نے جواب دیا کہ دنیا کی حرص و طمع اپنے دل سے بالکل نکال دو اور ذکرِ الٰہی میں مصروف ہو جاؤ تو بہت آسانی سے تم اس کو جان جاؤ گے۔

ایک مرید کافی دور سے دکھ اور تکالیف اٹھا کر حضرت کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے اُسے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ بھائی تم اتنی دور سے یہاں آئے ہو۔ اس سفر کے دوران تمھیں کافی آدمی ملے ہوں گے لیکن ہماری محبت کی وجہ سے تم نے ان میں سے کسی کی طرف دھیان نہیں دیا ہو گا۔ اب جبکہ تم مجھ تک آ گئے ہو تو مجھے بھی فراموش کر دو اور اللہ کی طرف دھیان دو اور اسے یاد کرو۔

ایک دفعہ حضرت مخدوم کی خدمت میں ایک حاکم وقت حاضر ہوا اور آپ سے نصیحت اور ہدایت کا طالب ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ملک کی ساکھ سیاست کے علاوہ کسی اور چیز سے قائم نہیں رہ سکتی اور سیاست کے لیے لشکر لازم ہے اور لشکر کے لیے خزانہ۔ خزانہ، رعایا سے ٹیکسوں کی وصولی پر قائم ہے اور ٹیکسوں کی وصولی کے لیے رعایا کی آبادی اور خوش حالی ضروری ہے اور یہ صرف اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب ملک میں عدل و انصاف قائم ہو اس لیے تجھے لازم ہے کہ عدل و انصاف اور رحم و احسان کے کام کرے۔

ایک دفعہ مجلس میں مخدوم نوح نے اپنے فقرا کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ذکرِ الٰہی کے لیے مجاہدہ ضروری ہے اور اگر تم مجاہدہ چھوڑ کر ذکرِ الٰہی کرو گے تو خود کو نقصان پہنچاؤ گے اور اگر صرف مجاہدہ کرو گے تو بے اثر ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا صرف انھی کو حاصل ہوتی ہے جو مجاہدہ اور ذکرِ الٰہی ساتھ ساتھ کریں۔ اگر تم میں بہت زیادہ مجاہدہ کرنے کی طاقت نہیں ہے تو وہ عمل کرو جو آسان ہے مثلاً دن میں صرف ایک وقت کھانا کھاؤ۔ جہاں تک ہو سکے، اس دنیائے فانی کی لذت سے بچو۔ لذت سے بچنے میں جو مزہ ہے وہ اگر تمھیں معلوم ہو جائے تو تم نفسانی لذتوں کو یکسر فراموش کر دو۔ یقین کرو اس دنیا میں اچھی چیز نوش کے بجائے نیش یعنی انسان کے اچھے اعمال ہیں۔ یہاں کا کمال خود زوال اور راحت میں جراحت ہے۔ اس دنیا میں اصل چیز ذکرِ الٰہی ہے اور ذکرِ الٰہی کی نشانی یہ ہے کہ ذاکر میں حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہو۔

ایک دفعہ مخدوم نوح نے فرمایا کہ اگر کسی فقیر کو حضرت آدم صفی اللہ کا صفوت (پاک باطنی)، حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا کلام (اللہ سے ہم کلام ہونا) اور حضرت عیسٰی روح اللہ کی روحانیت بھی حاصل ہوجائے تو وہ ان پر قانع نہ ہو کیونکہ جو اصل مقصود ہے وہ دوسرا ہے۔ ایک سچے طالب کو اس کی طلب میں رہنا چاہیے یعنی یہ کہ حق تعالیٰ کی ذات پاک میں محو اور گم ہوجائے۔ اگر کسی طالب کو ذکر، فکر، علم، عمل، محبت، عشق، قرب اور وصل بھی حاصل ہوجائے لیکن ان کے ساتھ محویت نہ ہو تو یہ سب گھاٹے کا سودا ہے۔

بہرحال حضرت مخدوم نوح جہاں ایک طرف اپنے وقت کے مایہ ناز صوفی اور عارف کامل تھے اور انھوں نے عوام کی اصلاح اور تبلیغ کا کام سرانجام دیا تو دوسری طرف ادب میں بھی ان کا بیش بہا حصہ ہے۔ مثلاً برصغیر میں سب سے پہلے انھوں نے فارسی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے لیکن اخباری اطلاعات سے پتا چلا ہے کہ سندھ کے مشہور عالمِ دین علامہ پروفیسر غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب غالباً سندھی ادبی بورڈ یا شاہ ولی اللہ اکیڈیمی حیدرآباد کے لیے اس ترجمے کو ایڈیٹ کر رہے ہیں۔ اگر یہ ترجمہ شائع ہوجائے تو یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوگی اور برصغیر میں اس سلسلے میں سندھ کو جو اوّلیت حاصل ہے وہ واضح طور پر سامنے آجائے گی۔ اسی لیے پروفیسر لطف اللہ بدوی مرحوم لکھتے ہیں کہ مخدوم صاحب کی کرامات بہت ہیں، ان میں سے کچھ کا ذکر تحفۃ الکرام اور حدیقۃ الاولیا میں ہے، وہ نہ صرف اپنے وقت کے ایک عظیم صوفی تھے بلکہ ان کا شمار اپنے دور کے مقتدر علما میں ہوتا تھا۔ مخدوم صاحب کی تصنیفات میں قرآن کریم کا فارسی میں ترجمہ بہت مشہور ہے۔ متقدمین میں شیخ سعدی اور ملا حسین واعظ کاشفی۔ وہی نے قرآن کریم کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ کاشفی کا ترجمہ اور تفسیر، تفسیر حسینی کے نام سے مشہور ہے۔ مخدوم نوح کے ترجمے کو ہندوستان میں شرفِ اوّلیت حاصل ہے۔ ان کے بعد ہی علامہ شہاب الدین دولت آبادی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآنِ کریم کے فارسی میں ترجمے کیے۔

اسی طرح حضرت مخدوم نوح نے فارسی ترجمۂ قرآن کے علاوہ مختصر تفسیر قرآن بھی اپنے مرید بہاء الدین گوڑیہ سے لکھوائی جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ پروفیسر لطف اللہ بدوی مرحوم اور ڈاکٹر عبدالمجید میمن لکھتے ہیں کہ ان کے کچھ سندھی ابیات بھی ان کے ملفوظات میں ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ سندھی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کے اور ابیات بھی ہوں گے لیکن وہ محفوظ نہ رہ سکے۔ ان کے ابیات کا مضمون تصوف اور اخلاقیات ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ابیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے خاص مریدوں سے بڑی محبت تھی۔

ڈاکٹر محمد ریاض

اقبال کی شاعری میں مکالماتی حُسن

مکالمہ، محاورہ، مصاحبہ یا مخاطبہ وہ ہے جس میں دو یا اس سے زیادہ کردار باہم گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ گفتگو کبھی سادہ انداز میں ہوتی ہے اور کبھی سوال و جواب کے فکری اسلوب میں۔ سوال و جواب میں زورِ بیان کے تفاوت کا امکان رہتا ہے اور ادیب و شاعر فرضی اور اصلی کرداروں کو پیش کرتے وقت اس تفاوت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس طرح ممکن ہے کہ سوال مختصر ہو اور جواب مفصل یا اس کے برعکس طویل الذیل سوال کو مجمل جواب سے نمٹا دیا جائے۔ دانش مند حضرات کہتے رہے ہیں کہ نطق و زبان اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کی بنا پر (منجملہ دلائل) انسان دوسری مخلوقات سے فائق اور صاحبِ فضیلت بنا ہے۔ اس نطق و زبان کے متعلقات کو ہی صوری و معنوی محاسن اور فصاحت و بلاغت کے نام دیے جاتے ہیں۔ اور "بیان" اور "معانی" کے علوم میں اس سلسلے کی مفصل بحثیں موجود ہیں۔ فصیح و بلیغ، مقرر و ناطق کی سحر بیانی اور اثر آفرینی میں کسے کلام ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیان و سحر کو بالترتیب سحر و حکمت قرار دیا ہے۔ (صحیح بخاری) مکالماتی حسن، خوبی پیدا کرنے والے شعرا کی فن کاری، بہرحال غیر معمولی توجہ کی محتاج ہے کیونکہ یہ ان کی سحر بیانی اور حکمت آفرینی کا موثر آلہ ہے۔ اقبال ایسے شاعر فلسفی کا یہ پہلو اور بھی توجہ طلب ہے، کیونکہ ان کے افکار کو زبانِ شعر نے زیادہ موثر بنایا، اور اس میں ان کے مکالماتی حسن و خوبی نے بڑا کام کیا ہے۔ "شعرا" کے عنوان کا حامل یہ قطعہ (ضربِ کلیم) ان کے عندیے کو ظاہر کر دیتا ہے:

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

مکالمہ اور ڈرامائی عنصر

ادب میں مکالمات کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ ڈرامے اور ناول کے اہم ترین عناصر یہی ہیں، اور ادب و شعر کی مختلف اصناف میں ان کے استعمال سے اثر و تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک اچھے ادیب اور شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسبِ ضرورت حقیقی، فرضی اور مجسم (PERSONIFIED) کرداروں کو مناسب ترین الفاظ

یں متشکل کرے اور نثر یا نظم کا ڈرامائی زور قائم رکھ سکے۔ ڈرامائی یا مکالماتی زور کا حسن ان امور میں مضمر ہے کہ عبارت یا شعر میں گرمی یا نرمی (جیسے احتیاج ہو) نظر آئے، بیان و تخاطب کا اطناب یا اختصار قابلِ توجہ ہو اور کرداروں کے پیشِ نظر منتخب کلمات و الفاظ کی صوتی کیفیت ایسی ہو جیسی اسٹیج پر پیش کیے جانے والے ڈرامے کے پس پردہ، موسیقی۔ علامہ اقبال کی اردو و فارسی شاعری کے مکالماتی حسن و خوبی کا یہی حال ہے۔ گو اس حسن کے بعض امور محسوس کیے جا سکتے ہیں اور بیان نہیں ہو سکتے، پھر بھی چونکہ اس موضوع پر ابھی کسی نے قلم نہ اٹھایا تھا، راقم الحروف نے اس مبحث کو چھیڑنا مناسب جانا ہے۔ افکارِ اقبال کے بحرِ زخار کی غوطہ زنی سے ابھی کئی اقبال دوستوں کو فرصت نہیں ملی کہ وہ 'اقبالِ شاعر' پر بھی کماحقہ توجہ کریں، لہٰذا موجودہ نارسا ادبی بحث ایسے صدہا مباحث کا ایک جزو جانیں۔ یہ نکتہ البتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال کی طویل اردو اور فارسی نظموں میں سوال و جواب اور مکالمات کی خوبیاں بالعموم آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں مگر شاعرِ مشرق کے ہاں ایسی مختصر نظموں کی بھی کمی نہیں جن میں ان کی ناطقانہ اور متکلمانہ چیرہ دستی، ادنیٰ تامل کے ساتھ، دیکھی جا سکتی ہے۔ مگر مکالمات، تمثیلات اور ڈرامائی اسلوب چونکہ 'فنون لطیفہ' سے مربوط ہیں، اس لیے ان فنون کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر جاننا ضروری ہے:

مرا معنیٔ تازۂ مدعاست — اگر گفتہ را باز گویم رواست

فنونِ لطیفہ برائے زندگی

فنونِ لطیفہ کو انسان کی معنوی ترقی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تہذیب اور تمدن یا فرہنگ کے بیشتر اجزا یہی فنون ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے بارے میں صاحبانِ نظر دو گروہوں میں منقسم رہے ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک فنون (ادب، موسیقی، مصوری اور تعمیرات وغیرہ) کو آزاد رکھنا چاہیے اور ان پر دین یا اخلاق کے نقطۂ نظر سے کوئی پابندی نہ لگانا چاہیے۔ فن کار جو سوچے، اسے جس طرح چاہے پیش کر دے، خواہ معاشرے پر اس کی تخلیق کے اثرات برے ہی ہوں۔ دوسرے گروہ کا نقطۂ نظر اس کے برعکس ہے۔ اس گروہ کے نزدیک دین، اخلاق یا معاشرتی نقطۂ نگاہ کی بالادستی ماننا ضروری ہے۔ ادب اور اس کے متعلقات کے سلسلے میں بحث کے ضمن میں اس نظریے کو ادب برائے زندگی کا نام دیا جاتا ہے۔ اقبال اسی متاخر گروہ سے منسلک ہیں۔ وہ ادب برائے زندگی بلکہ 'فنونِ لطیفہ برائے زندگی' کے قائل ہیں اور اس سلسلے میں علامہ کے خیالات گو ان کی ہر تصنیف میں موجود ہیں، مگر 'مرقعِ چغتائی' کے دیباچے میں بالاجمال انھوں نے سارے امور

بیان کر دیے ہیں۔ دیوانِ غالب کا یہ مرقع، مصورِ مشرق عبد الرحمٰن چغتائی مرحوم نے ۱۹۲۸ء میں شائع کر دیا اور اقبال نے بزبانِ انگریزی اس پر دیباچہ لکھا تھا۔ فرماتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ اسی صورت میں مفید ہیں کہ وہ 'خودی' (انائے فردی) اور 'بیخودی' (انائے ملت) کی ترقی اور تشکیل میں معاون ہوں۔ بزبانِ شعر سنیے:

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی — بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی — خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

(ضربِ کلیم: دین و ہنر)

'خودی' اور 'بیخودی' ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں اور ان نقاطِ نظر کی پوری توضیح، اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی نام کی مثنویوں نیز اقبال کی جملہ تصانیف میں دیکھی جا سکتی ہے۔ قصہ کوتاہ، خودی اور بیخودی کا فلسفہ، دین اور اخلاقی اقدار سے پیوستہ اور وابستہ ہے اور اقبال نے انواع و اقسام کے اسالیب سے اس بات کو بار بار بیان کیا ہے کہ فنونِ لطیفہ میں ترقی پذیری، جدت، تنوع اور ہمہ گیری موجود ہو، مگر وہ دین سے روگردانی اور معاشرۂ انسانی میں فساد، بے نظمی اور بدعملی کا موجب نہ بنیں، بلکہ انھیں دین و اخلاق کے تابع ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں علامہ مرحوم کے افکار اجمالاً 'ضربِ کلیم' کے دو حصوں میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ "تعلیم و تربیت" اور "ادبیات، فنونِ لطیفہ"۔ راقم سطور دونوں حصوں میں سے بالترتیب ایک ایک قطعہ نقل کر رہا ہے۔ پہلے کا عنوان "خوب و زشت" ہے اور دوسرے کا 'فنونِ لطیفہ':

ستارگانِ فضا ہائے نیلگوں کی طرح — تخیلات بھی ہیں تابعِ طلوع و غروب
جہاں خودی کا بھی ہے صاحبِ فراز و نشیب — یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب
نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو، وہ جمیل — جو ہو نشیب میں پیدا، قبیح و نامحبوب

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا، وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

فنونِ لطیفہ کے منفی رجحانات مثنوی، بندگی نامہ، (زبورِ عجم) میں خاص طور پر منعکس ہیں۔ فرماتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ میں، ترقی پذیری اور شکوہ و عظمت دکھانا ان ہی اقوام و ملل کا خاصہ ہے جو آزادی سے بہرہ مند ہوں۔ صوری اور معنوی غلامی و مجبوری میں سانس لینے والے فن کاروں کا شعر و ادب، رقص و موسیقی اور مصوری، بلکہ ان کا دین و مذہب بھی، ملال آور، سکون آموز اور جمود پرور ہے۔ اقبال، دینِ اسلام کے اس لیے موید نہیں تھے کہ ان کی چند پشتوں نے اسے قبول کیا یا وہ خود اس پر پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ وہ علیٰ وجہ البصیرۃ دیکھ رہے تھے کہ ایک عالمی اور ابدی دین کی خصوصیات صرف اسی دین میں پنہاں ہیں، ورنہ بے عملی لانے والے اور خواب آور ادیان سے بھی انھیں اعراض تھا:

وای آن دینی کہ خواب آرد ترا — باز در خوابِ گراں دارد ترا
سحر و افسون است یا دین است این؟ — حبِّ افیون است یا دین است این؟

بعض سلبی فنون

دینِ اسلام کے اساسی رجحانات نیکی، عفت اور جملہ فضائلِ اخلاق ہیں۔ رذائل سے اجتناب کی تلقین کے نتیجے میں، بعض فنونِ لطیفہ کی ترویج کے بارے میں مسلمان علما و زعما کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ ایسے امور میں رقص و موسیقی، تھیٹر اور سینما بھی ہیں۔ بعض صوفیا کا محافلِ سماع میں رقص و موسیقی کا سلسلہ جاری رہا ہے، مگر ایک تو یہ اختلافی عمل تھا، دوسرے خاص آدابِ محفل کے ساتھ مربوط۔ اقبال نے جسمانی رقص کو ایک ورزش سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مگر رقص و موسیقی چونکہ بالعموم منوط و مخلوط ہیں، اس لیے موسیقی کار ایسا شخص فنِ رقص سے بالکل بے تعلق بھی رہ سکتا ہے:

شعر سے روشن ہے جانِ جبرئیل و اہرمن — رقص و موسیقی سے ہے سوز و سرورِ انجمن
فاش یوں کرتا ہے اک چینی حکیم، اسرارِ فن — شعر گویا روحِ موسیقی ہے، رقص اس کا بدن

(ضربِ کلیم، قطعہ، رقص و موسیقی)

اقبالؒ، بہر حال فرماتے ہیں کہ یورپ میں رقصِ بدن کے اس قدر رواج کے باوجود، اقوامِ مشرق کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص یہی مناسب ہے کہ اس فن سے چنداں لگاؤ نہ رکھیں اور رقصِ روح پر اپنی

تمام تر توجہ مبذول کریں۔ "رقص دل یا رقص روح، فضائلِ اخلاق اپنانے (فلسفۂ خودی کے مطابق) کا ایک کنایہ ہے، اور مجھے اقبال سے قبل کے ادبا اور شعرا کے ہاں یہ تعبیر نظر نہیں آئی۔ جاوید نامہ کے آخر میں اقبال فرماتے ہیں کہ ہوی و ہوس اور رنج و غم پر غالب آئے بغیر "رقصِ روح" کی نعمت میسر نہیں ہو سکتی۔ یہ تکامل خودی کا بیان ہے۔ ان کے نزدیک مولانا جلال الدین محمد رومی (وفات ۶۷۲ھ) کے "سماع" کا مقصد بھی "رقص روح" تھا، مگر ان کے پیروؤں (فرقہ مولویہ) نے اسے رقص بدن بنا دیا:

پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

رقصِ تن از حرفِ اُو آموختند — چشم را از رقصِ جاں بر دوختند

رقصِ تن در گردش آرد خاک را — رقصِ جاں برہم زند افلاک را

علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست — ہم زمیں، ہم آسماں آید بدست

فرد از وے صاحب جذب کلیم — ملت از وے وارث ملکِ عظیم

رقصِ جاں آموختن کارے بود — غیر حق را سوختن کارے بود

تا ز نار حرص و غم سوزد جگر — جاں برقصِ اندر نیاید اے پسر

می شناسی حرص "فقر حاضر" است — من غلام آنکہ بر خود قاہر است

ضعف ایمان است و دیگری است غم — نوجوانا، نیمۂ پیری است غم

آخری دو اشعار میں دو احادیث نبویؐ سے استفاضہ کیا گیا ہے۔ "رقص روح" پر عمل پیراؤں کے لیے اقبال کی یہ خاص توصیف ملاحظہ ہو کہ وہ دوسرے جہان میں بھی ان کے لیے دعاگو ہیں:

اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب — تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب

سرِ دینِ مصطفیٰ[۱۴] گویم ترا — ہم بہ قبر اندر دعا گویم ترا

"ضرب کلیم" کے درج ذیل قطعہ کا عنوان ہی "رقص" ہے:

چھوڑ یورپ کے لیے رقصِ بدن کے خم و پیچ — روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللّٰہی

صلہ اُس رقص کا ہے تشنگیِ کام و دہن — صلہ اِس رقص کا درویشی و شہنشاہی

اقبال، خاصے موسیقی دوست اور موسیقی داں تھے۔ ایک زمانے میں وہ ستار نواز بھی رہے۔ ان کے کلام میں موسیقیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ الفاظ کا انتخاب، ہم مخرج حروف کا لانا اور مترنم

بحور (مشترک بحر رمل اور ہزج کی جو بالترتیب فاعلاتن اور مفاعیلن کی چار بار تکرار سے سالم مثمن بنتی ہیں) کا استعمال ان کی موسیقی دوستی کی دلیل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں، جو بالترتیب پیامِ مشرق، زبورِ عجم، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں سے ہیں:

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر — رَست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ہوائے فرودیں در گلستاں میخانہ می سازد — سبو از غنچہ می ریزد، ز گل پیمانہ می سازد

موج را از سینۂ دریا گسستن می تواں — بحرِ بے پایاں بجوئے خویش بستن می تواں

نہ تو اندر حرم گنجی نہ در بت خانہ می آئی — ولیکن سوئے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی

نوائے من ازاں پُر سوز و بیباک و غم انگیز است — بخاشاکم شرار افتاد و بادِ صبحدم تیز است

ازاں آبے کہ در من لالہ کارد ساتگینے دہ — کفِ خاکِ مرا ساقی بہ بادِ فرودینے دہ

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم — کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

ز شاعر نالۂ مستانہ در محشر چہ می خواہی — تو خود ہنگامہ ای، ہنگامۂ دیگر چہ می خواہی

خودی را مردم آمیزی دلیلِ نارسائی ہا — تو اے در دآشنا بیگانہ شو از آشنائی ہا

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما — اے جوانانِ عجم، جانِ من و جانِ شما

اگر کج رَو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟ — مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی — دلِ ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے — جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی — مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم — عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علمِ لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کرو دوبارہ — کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثلِ ہوس — پرِ شہباز سے ممکن نہیں پروازِ مگس

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی — بازو ہے قوی جس کا وہ عشق ید اللّٰہی

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی — ہو صاحبِ مرکز، تو خودی کیا ہے؛ خدائی

منقولہ اشعار مطلعے ہیں یا بعض نظموں کے افتتاحی ابیات۔ اقبال نے بعض کلمات کی تکرار سے بھی اپنے کلام اِی موسیقیت میں اضافہ کیا ہے۔ اس ضمن میں پیامِ مشرق، زبورِ عجم اور ضربِ کلیم کے مستزادات (مثلث اور مخمس وغیرہ) خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ یہ ضمنی بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال نے آواز بے حد سمع نواز پائی تھی، اور گو زندگی کے آخری چار سالوں میں ان کی آواز بیٹھی رہی، پہلے وہ زیادہ تر ترنم سے پڑھتے تھے۔ مگر وہ جرأت آموز اور بیلڈ ساز موسیقی کے حامی تھے۔ مصوری، فنِ تعمیر اور دیگر فنونِ لطیفہ کے بارے میں بھی ان کا نقطۂ نظر ایسا ہی ہے کہ یہ فنون قوت و شکوہ، اور جمال و جلال کے مظہر ہوں اور خودی اور بے خودی کے عمل کو ان سے مدد ملے۔ علامہ مرحوم کے افکار، ان کے دیگر آثار و تصانیف کے علاوہ مثنوی بندگی نامہ (زبورِ عجم) میں بالتفصیل موجود ہیں۔

اقبال، تمثیل و نقالی (ڈرامے، تھیٹر اور سینما وغیرہ) کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھتے۔ انھوں نے اردو میں سینما اور تیاتر (تھیٹر) کے خلاف ایک نظم بھی لکھی ہے۔ سینما ان کی نظر میں تہذیبِ مغربی کی ایک ایسی خطرناک سوغات ہے جس میں بت پرستی (کردار پرستی) کی تعلیمات لپٹی ہوئی نظر آتی ہیں اور ہیرو، ہیروئن یا ان کے مخالفین نیز دیگر کرداروں کے نقوش سے انسانی شخصیت (خودی) کا نقصان ہو رہا ہے۔ یہ نقصان ان سب افراد کا ہے، جو سینما سے وابستہ ہیں، وہ اداکار ہوں یا تماشابین:

وہی بت فروشی، وہی بت گری ہے	سینما ہے یا صنعتِ آزری ہے؟
وہ صنعت نہ تھی، شیوۂ کافری تھا	یہ صنعت نہیں، شیوۂ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوامِ عہدِ کہن کا	یہ تہذیبِ حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹی، یہ دوزخ کی مٹی	وہ بتخانہ خاکی، یہ خاکستری ہے

تیاتر یا تھیٹر کا کام بھی سینما کے عمل کے شبیہ ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اداکار نقال ہوتا ہے جو اپنی اصلی خودی دے کر ایک فرضی اور موہوم خودی سے کام لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اقبال کے نزدیک اداکاری 'نفیِ خودی' کے مرادف ہے:

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود	حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام	اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
حریم تیرا، خودی غیر کی، معاذ اللہ	دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے　　　رہا نہ تو، تو نہ سوزِ خودی، نہ سازِ حیات

ڈرامے کی مخالفت، مگر؟

ڈرامے کی مخالفت کے باوجود اقبال ڈرامائی اظہارِ نظر کے مخالف نہ تھے۔ چنانچہ بڑے بڑے ڈرامہ نگار جیسے ولیم شکسپیر اور گوئٹے (یہ دونوں شاعر بھی تھے) کے وہ مداح اور قدردان رہے ہیں۔ اقبال کو خودی کے نقطۂ نگاہ سے ڈرامے اور تمثیل کی اداکاری پر اعتراض تھا اور بس۔ ڈراما نویسوں کے ہاں، بعض کرداروں کی زبانی، خود کلامی (MONOLOGUE) ہوتی ہے (مثلاً دیکھیں شکسپیر کا مکبتھ)۔ اقبال مدت العمر احساسِ تنہائی رکھتے تھے اور رازداں احباب کے فقدان پر نالاں رہے، اس لیے ان کے ہاں بعض درد انگیز خود کلامیوں کے نمونے ملتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

دلِ من بے قرار آرزوئے　　　درونِ سینۂ من ہائے و ہوئے
سخن اے ہمنشین از من چہ خواہی　　　کہ من باخویش دارم گفتگوئے
من اندر مشرق و مغرب غریبم　　　کہ از یارانِ محرم بے نصیبم
غمِ خود را بگویم با دلِ خویش　　　چہ معصومانہ غربت را فریبم

یہاں میں ضربِ کلیم میں سے دو خود کلامیوں کی طرف اشارہ کروں گا، تمہید اور ہندی مکتب۔ پہلی نظم کی ابتدا میں شاعر، براعظم ایشیا میں فقدانِ خودی کا ذکر کرتے ہوئے اقوامِ مشرق کو بیدار کرنے کا عزم ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے حصے میں وہ اپنے کامیاب مشن کے نتائج کے سلسلے میں خود کلامی کرتا ہے:

ترا گناہ ہے اقبال، مجلس آرائی　　　اگرچہ تو ہے مثالِ زمانہ کم پیوند
جو کوکنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو　　　تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہائے بلند
تڑپ رہے ہیں فضاہائے نیلگوں کے لیے　　　وہ پَر شکستہ کہ صحنِ سرا میں تھے خرسند
تری سزا ہے نوائے سحر سے محرومی　　　مقامِ شوق و سرور و نظر سے محرومی

دوسری نظم آزاد اور غلام افراد کا موازنہ ہے اور وہ اس طرح شروع ہوتی ہے:

اقبال، یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا　　　موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے　　　پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

مکالماتی حسن: اشارے اور مختصر نمونے

یہ بحث موضوع ایک مقالے کی حدود میں نہیں آ سکتا۔ یہ کم از کم ایک کتاب کا متقاضی رہے گا۔

سرِدست اشارات اور مختصر نمونوں کے ذریعے خلاصۂ مطالب پیش کریں گے ۔ اقبال کی طویل نظموں پر کئی حضرات نے لکھا ہے، اس لیے ان سے نمونے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ۔ تاہم اس امر کی طرف اشارہ مناسب ہے کہ ہم مثنوی 'جاوید نامہ' (کسی قدر حذف اور اختصار کے ساتھ) اور نظم 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کے مطالب' کو اسٹیج پر بھی دکھا سکتے ہیں (روحِ اقبال سے معذرت کے ساتھ) ۔ پہلی نظم کے کردار چالیس کے لگ بھگ ہیں اور دوسری کے چھ ۔ مگر فی الحال آئیے اقبال کے اُردو اور فارسی کلیات میں حسنِ کلام اور خوبیٔ مطالب کے نمونوں کو تلاش کریں ۔

بانگِ درا

کتاب ۱۹۲۴ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور اس میں شاعر کا کوئی ایک چوتھائی صدی کا کلام ہے جسے تین حصوں میں منقسم دکھایا گیا ہے : ۱۹۰۵ء تک کا ابتدائی کلام، ۱۹۰۵ سے ۱۹۰۸ تک (قیام یورپ) کا کلام اور بعد کی مدت کا (تا اشاعت) ۔ مجموعی طور پر اس کتاب میں تیس مقالے ملتے ہیں ۔ ہم ان کی مختصر تحلیل کریں گے، اور کہیں کہیں نمونے بھی نقل کریں گے ۔ پہلے حصے میں بیشتر مکالماتی نظمیں بچوں کی خاطر لکھی گئی ہیں ۔ ان میں سے بعض انگریزی زبان کے انگلستانی یا امریکی شعرا کی نظموں سے ماخوذ ہیں ۔ ان سات نظموں کا مکالماتی ماحصل یہ ہے :

۱ ۔ ایک مکڑا اور مکھی :۔ مکڑا چکنی چپٹی باتوں سے فریب دے کر مکھی کو اپنے ہاں بلاتا اور اسے ہڑپ کرتا ہے ۔

۲ ۔ پہاڑ اور گلہری :۔ ایمرسن کی نظم کا ترجمہ ہے ۔ گلہری، پہاڑ کو یہ نکتہ سمجھاتی ہے کہ دنیا میں ادنیٰ سے ادنیٰ اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کی اپنی جگہ افادیت اور اہمیت ہے ۔

۳ ۔ ایک گائے اور بکری :۔ گائے اپنی تکالیف اور زحمات کی شاکی ہے مگر بکری اسے قدرِ نعمت پر توجہ دلاتی ہے ۔

۴ ۔ ہمدردی :۔ شاعر کے بقول ولیم کوپر سے ماخوذ ہے مگر مجھے انگریزی کے اس شاعر کے مجموعۂ کلام میں اس کا سراغ نہ ملا ۔ ایک جگنو از راہِ ہمدردی ایک آشیانہ بھول جانے والے بلبل کو شبِ تاریک میں منزلِ مقصود کا راستہ دکھاتے بتایا گیا ہے ۔

۵ ۔ عقل و دل :۔ عقل اور دل کو مجسم کر کے شاعر ایک فکر انگیز مکالمہ ترتیب دیتا ہے جس میں دل (عشق) عقل پر اپنی برتری کے دلائل دیتا ہے ۔

۶ ۔ عشق اور موت :۔ لارڈ ٹینی سن کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ عشق اور موت کو دو فرشتوں کی صورت میں مجسم کر کے محوِ سخن دکھایا گیا ہے۔ حاصل یہ کہ 'عشق' امر اور لافانی ہے۔

۷ ۔ ایک پرندہ اور جگنو :۔ اصل خیال ولیم کوپر کا ہے۔ (نظم بلبل اور جگنو)۔ پرندہ، جگنو کو ایک چمکدار دانہ جان کر چگنے لگا تھا کہ اتنے میں جگنو نے اسے اپنے آپ سے متعارف کروایا اور یہ نکتہ بھی سمجھایا کہ 'ہر کسے را بہر کارے ساختند':

چمک بخشی مجھے، آواز تجھ کو دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو

مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز جہاں میں ساز کا ہے، ہم نشین سوز

کتاب کے حصہ دوم میں صرف تین مکالمے ہیں (۱) حقیقتِ حسن (۲) عاشق ہرجائی اور (۳) چاند اور تارے۔ پہلی نظم جرمن زبان سے کسی قدر ماخوذ ہے۔ (دیکھیے جرمن فورم کراچی کی طرف سے شائع کردہ کتاب 'محمد اقبال' میں ممتاز حسن مرحوم کا مقالہ، کتاب مذکور کراچی ۱۹۶۸ء)۔ حسن (جمال) اور خدا کا مکالمہ ہے۔ ماحصل یہ کہ حسن، زود گزر اور زوال پذیر ہے۔ پیامِ مشرق (لالۂ طور) میں ایک دوبیتی ہے:

سحر می گفت بلبل باغباں را درین گِل جز نہال غم نگیرد

بہ پیری می رسد خارِ بیاباں ولے گُل چوں جواں گردد، بمیرد

دوسری نظم ایک مکالمہ ہے یا خود کلامی۔ شاعر اپنی متنوع اور جامع الاطراف شخصیت کو منعکس کرتا ہے۔ تیسری پیاری نظم میں شاعر ستاروں اور چاند کی گفتگو کے پردے میں حرکت و سعی کا راز سمجھاتا ہے:

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسمِ قدیم ہے یہاں کی

ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس رہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

محولہ بالا نظموں میں جواں سال فکر پرور شاعر نے لفظ و معنی کی خوب جولانیاں دکھائیں اور یہ دس نظمیں طلبہ کے لیے بغایت دلچسپ بھی ہیں، مگر صاحبِ پیغام، اقبال کتاب کے آخری حصے میں مشہود ہے۔ اس حصے کی مندرجہ ذیل نظموں کے عنوانات ملاحظہ ہوں:

دو ستارے، شکوہ، جوابِ شکوہ، رات اور شاعر، بزمِ انجم، موٹر، شمع اور شاعر، مسلم، حضورِ رسالتمآب

ہیں، شفاخانۂ حجاز، شبنم اور ستارے، ایک مکالمہ (مرغِ سرا اور مرغِ ہوا)، شبلی و حالی، صدیق، عرفی، کفر و اسلام (تضمین شعرِ میر رضی دانش)، پھولوں کی شہزادی، فردوس میں ایک مکالمہ، جنگِ یرموک کا ایک واقعہ، خضرِ راہ۔

ان نظموں میں شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع اور شاعر اور خضرِ راہ طویل ہیں۔ شکوہ اور جوابِ شکوہ کی تصنیف میں اگرچہ چند سال کا فرق ہے، مگر ان دونوں نظموں کو سوال و جواب جاننا چاہیے۔ ان میں لازوال اور دلآویز مکالمے ہیں۔ موجودہ متن کی رو سے شکوہ کے ۳۱ بند ہیں (دو تمہیدی) اور جوابِ شکوہ کے ۳۶ (پانچ ابتدائی تمہیدی) مگر سوال و جواب (یعنی شاعر کا شکوۂ خدا اور خدا کا جوابِ شکوہ) پوری ترتیب کے ساتھ نہیں۔ اس کے باوجود اکثر بند سوال و جواب کی ترتیب سے ہیں، اور مکالماتی حسن و خوبی کا شاہکار کہلانے کے قابل ہیں، مثلاً:

شکوہ: صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تُو بھی تو دلدار نہیں

جوابِ شکوہ: صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟
نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے تو آبا وہ تمھارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

شکوہ: یہ شکایت نہیں، ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں؟

جوابِ شکوہ: کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور؟
شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے، موسیٰ ہی نہیں

شکوہ: تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربیؐ کو چھوڑا؟
بت گری پیشہ کیا؟ بت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟
رسمِ سلمانؓ و اویس قرنیؓ کو چھوڑا؟

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں — زندہ مثل بلالؓ حبشی رکھتے ہیں

جوابِ شکوہ: کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختارؐ؟ — مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟ — ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں — کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں

شمع اور شاعر میں از روئے ترتیب شاعر (بزبانِ فارسی) سوال پوچھتا ہے، اور شمع (۱۰ بند) جواب دیتی ہے۔ سوال ۵ اشعار میں ہیں اور جواب ۱۸ ابیات میں۔ شاعر، شمع سے پوچھتا ہے کہ اس کے سوز و ساز کا راز کیا ہے؟ جل وہ بھی رہا ہے مگر وہ شمع کی مانند پروانوں کو اپنے گرد جمع نہ کر سکا، ایسا کیوں ہے؟ شمع ان سوالوں کے جوابات میں سخن دانی کے دریا بہا دیتی ہے۔ ان جوابات میں فرد اور معاشرے کے روابط اور مسلمانوں کے عالمی اتحاد کے بارے میں گراں قدر خیالات مشہود ہیں، مگر خالص مکالماتی حصہ اس میں بہت کم ہے۔ کیونکہ شاعر مختصر سوالات سن کر شمع ایک مسلسل تقریر کرتی ہے۔ مکالمے کا نمونہ یہ ہے:

شاعر: مدتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم — در طوافِ شعلہ ام بالے نزد پروانہ؟

از کجا این آتشِ عالم فروز اندوختی؟ — کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیمؑ آموختی؟

شمع: میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز — تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا

شمعِ محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا — تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے

وہ جگر سوزی نہیں، وہ شعلہ آشامی نہیں — فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے

در غمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز — گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری — ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

آنکھ کو بیدار کر دے، وعدۂ دیدار سے — زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے

خضرِ راہ میں بھی یہی کیفیت ہے۔ جنابِ خضر سے شاعر نے اساساً یہ سوال پوچھے تھے کہ:

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد — زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟ — اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے — کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے:

ان سوالوں کے جواب میں خضر کی زبانی دو تو بند کی صورت میں، صحرا نوردی، زندگی، سلطنت [illegible]

[illegible] یہ عظیم نظم ۱۹۲۲ میں لکھی گئی اور سلطان ترکی مرحوم نے

ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ (مئی ۱۹۲۲) میں اس پر ریویو لکھا اور منتخب طور پر اُسے شائع کیا۔ انھوں نے "لکھا تھا کہ یہ نظم اس قابل ہے کہ اسے انگریزی میں ترجمہ کیا جائے، اور نیز اس کی شرح لکھی جائے۔ مگر جوابِ خضر کے مکالمات میں تندی و تیزی کا فقدان ہے۔ اقبال نے جواباً لکھا تھا کہ خضرؑ کی طبیعت کا تقاضا یہ ہے کہ ان زبانی ادا کیے جانے والے کلمات میں سنجیدگی، متانت اور گہرائی ہو، مگر جوش و حرارت میں کمی ہو (دیکھیے اقبال نامہ جلد ا مرتبہ شیخ عطاء اللہ لاہور ۱۹۴۵ ، مکاتیب بنام سید سلیمان ندوی)۔ علامہ مرحوم کی یہ توجیہ کس قدر مناسب تھی اس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ مکالمات میں متکلم کی شخصیت کو نظر کے سامنے رکھتے تھے، مگر فاضل تبصرہ نگار غور نہ فرمایا تھا کہ قرآن مجید کی سورۂ کہف اور احادیث و روایات کے مجموعوں میں "سیرتِ خضرؑ" کی تصویر ہے ؟ منقولہ بالا سوالات کے جواب میں "جوابِ خضر" کے مکالمات کا حُسن ذیل کے نمونوں سے ہویدا ہے:

کیوں تعجب ہے مری صحرانوردی پر تجھے؟ — یہ تگاپوئے دمادم، زندگی کی ہے دلیل
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی — ہے یہی اے بے خبر، رازِ دوامِ زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ — جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ انّ الملوک — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
ہوگیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو — مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
گفت رومی، ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند — می ندانی اوّل آن بنیاد را ویراں کنند؟
نامِ حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے — اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش — اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش
مسلم استی، سینہ را از آرزو آباد دار — ہر زماں پیشِ نظر 'لا یخلف المیعاد' دار

منقولہ اقتباس کے چوتھے اور آخری شعر میں آیاتِ قرآنیہ کی طرف اشارہ ہے (بالترتیب ۲۷: ۳۴ اور ۹: ۳) اور آٹھویں شعر میں رومی کا ذیل کا بیت شاعرِ مشرق کے پیشِ نظر رہا ہے:

ہر بنای کہنہ کآباداں کنند — نہ کہ اوّل کہنہ را ویراں کنند

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر صابر آفاقی

شیخ الرئیس بو علی سینا (۳۷۰ - ۴۲۸ھ)

حجۃ الحق شرف الملک شیخ الرئیس بو علی حسین سینا بخاری کے والد کا نام عبداللہ تھا جو بلخ کا باشندہ تھا۔ عبداللہ نوح بن منصور کے عہد (۳۶۶ - ۳۸۷) میں بخارا چلا گیا اور وہاں کے گاؤں خرمیثن کا نمبردار بن گیا۔ یہاں اس نے افشنہ گاؤں کی ایک لڑکی ستارہ سے شادی کر لی۔ اس زوجہ سے ۳۷۰ھ کے ماہ صفر میں حسین متولد ہوا۔ عبداللہ اپنے بیٹے حسین کو ہمراہ لے کر شہر بخارا میں منتقل ہو گیا۔ اب حسین جس کا لقب بو علی تھا قرآن مجید اور ادب کی تعلیم میں مشغول ہو گیا۔ دس سال کی مختصر مدت میں اس نے قرآن اور متعدد دیگر علوم ادب میں مہارت حاصل کر لی۔

اس کے والد عبداللہ اور تایا علی نے اسمعیلیہ عقائد کو اپنا لیا تھا۔ انھوں نے نفس و عقل کے مسائل سن رکھے تھے اور کبھی کبھی آپس میں اس موضوع پر گفتگو بھی کرتے تھے۔ ننھا بو علی ان مباحث میں دلچسپی لینے لگا۔

اس کے بعد باپ نے بیٹے کو ایک سبزی فروش کے پاس بٹھا دیا جو علم حساب و ہندسہ خوب جانتا تھا۔ اس عرصے میں بو علی نے فقہ بھی سیکھ لی۔ یہی زمانہ تھا جب ابوالفرج بن الطیب کا شاگرد ابو عبداللہ الناقلی بخارا میں آ کر رہنے لگا۔ ابو عبداللہ نے بو علی کو دعوت دی کہ وہ اس کے گھر آ کر اصول فلسفہ کی تعلیم پائے۔ بو علی نے علوم منطق و فلسفہ کی تکمیل اسی استاد سے کی۔ اس نے اقلیدس سے پانچ شکلوں اور المجسطی کی اشکال ہندسیہ تک تعلیم پائی۔ پھر تو شاگرد نے وہ وہ مسائل دریافت کیے جو خود استاد نے اس سے سمجھے۔

اس کے بعد ناقلی کو گرکانج جانا پڑا تو بو علی تنہا تحقیق میں مصروف رہا۔ فلسفہ طبیعی و الہیات کے متون و شروح کے مطالعہ کے بعد بو علی نے طب سیکھنا شروع کر دی اور جلد ہی وہ اس فن میں یگانۂ روزگار بن گیا۔ پھر علاج شروع کیا اور تجربے کے طور پر کئی نئے علاج دریافت کیے۔ اس وقت بو علی کی عمر سولہ سال تھی۔ اس نے ایک سال اور معلومات بڑھانے اور منطق و فلسفہ کے مسائل کے تکرار میں

رہ رہا۔ وہ جب منطق، علم طبیعی اور ریاضی میں ماہر ہو گیا تو علم الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ اس علم کو اس نے چالیس بار پڑھا مگر پوری طرح وہ اسے سمجھ نہ سکا۔ یہاں تک کہ ایک دن اسے ابونصر فارابی کی کتاب درا عراض مابعد الطبیعیہ مل گئی تب اس کی مدد سے وہ اس علم سے آگاہ ہوا۔ اسی عرصے میں سامانی بادشاہ منصور بن نوح بیمار پڑ گیا تو بوعلی کو علاج کے لیے طلب کیا گیا۔ چنانچہ بوعلی امیر خراسان کے پاس پہنچا اور علاج کے ساتھ سامانی بادشاہوں کے کتاب خانے سے بھی استفادہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ جب وہ اٹھارہ سال کا ہوا تو تمام علوم میں پوری پوری مہارت پیدا کر چکا تھا۔ بعد ازاں اس کے علوم میں پختگی تو پیدا ہوئی لیکن اضافہ کچھ نہ ہوا۔ کیونکہ وہ شباب میں ہی سب علوم میں یگانۂ روزگار ہو چکا تھا۔

پھر بوعلی کتاب خوانی کے مرحلے سے گزر کر صاحب کتاب ہونے کا شوق دل میں لیے تحقیق و تصنیف میں مشغول ہو گیا، بوعلی ابھی بائیس سال کا تھا کہ ۳۹۲ھ میں اس کا والد فوت ہو گیا اور وہ اپنے والد کی ذمہ داریاں سنبھالنے لگا۔ اسی سال دولت سامانی کا خاتمہ ہو گیا۔ بوعلی خوارزم شاہ علی بن مامون بن محمد کے پاس چلا گیا۔ یہاں بوعلی خوارزم شاہ اور اس کے وزیر ابوالحسین احمد کے دربار میں رہنے لگا اور چند کتابیں اس نے لکھ کر انہی کے نام معنون کیں۔

بوعلی کی خوارزم میں چند مشہور علما مثلاً ابوریحان البیرونی، ابوسہیل مسیحی اور ابونصر عراقی سے ملاقات ہوئی اور وہاں کے ساتھ میٹھنے لکھنے لگا مگر اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد یعنی ۴۰۳ھ سے پہلے وہ نسا، ابیورد، طوس، سمنگان، جاجرم اور گرگان کی سیر و سیاحت پر نکل کھڑا ہوا۔ گرگان کا سفر تو اس لیے کیا کہ وہاں کے حکمران شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے دربار تک رسائی حاصل کر سکے، لیکن بوعلی جب وہاں پہنچا تو شمس المعالی کو زندان میں ڈال دیا گیا تھا۔ چنانچہ بوعلی گرگان سے دہستان چلا گیا لیکن یہاں ایسا بیمار پڑا کہ بمشکل صحت یاب ہوا۔ چنانچہ واپس گرگان آ گیا۔ یہاں ابو عبید عبدالواحد جوزجانی نے اس کی شاگردی حاصل کی جو بعد میں شہرۂ آفاق ہوا۔ شیخ بوعلی کچھ عرصہ گرگان میں ہی مقیم رہا اور چند کتابیں یہیں تالیف کیں۔ وہ ۴۰۴ھ میں رے چلا گیا اور فخر الدولہ دیلمی کے فرزند مجد الدولہ ابو طالب رستم کا علاج کیا۔ ۴۰۵ھ کے بعد شیخ بوعلی سینا قزوین اور پھر ہمدان چلا گیا۔ ہمدان میں مجد الدولہ کے بھائی شمس الدولہ کی خدمت میں پہنچا اور وزیر اعظم کا قلمدان سنبھالا۔ پھر اتفاق یہ ہوا کہ شمس الدولہ کی فوج نے بغاوت کر دی

اور بوعلی کے قتل کا مطالبہ کیا، وہ کچھ مدت کے لیے وزارت سے علیحدہ ہو گیا۔ بوعلی شیخ ابو سعید دخدوک کے گھر میں چھپ گیا اور مطالعہ و تالیف کتب میں مشغول رہا، مگر پھر شمس الدولہ نے اسے بلا بھیجا اور وزارت دوبارہ دے دی۔ شمس الدولہ کی وفات پر اس کے بیٹے سماء الدولہ نے ۴۱۲ھ سے ۴۱۴ھ تک حکومت کی۔ اس کی سلطنت کے آغاز میں شیخ بوعلی حاکم اصفہان علاء الدولہ کے ساتھ خط و کتابت کے جرم میں چار ماہ قلعہ فردجان میں محبوس رہا۔ آزادی ملی تو بھیس بدل کر اپنے بھائی محمود شاگرد ابو عبید اور دو غلاموں کے ساتھ ہمدان سے نکل گیا۔

شیخ بوعلی نے روپوشی و اسارت کے زمانے میں چند اہم کتابیں تالیف کیں۔ رات کو اس کے شاگرد اس سے درس لیا کرتے تھے۔ پھر شیخ جب اصفہان کے گاؤں تیران میں پہنچا تو امیر علاء الدولہ کے دربار میں اسے دعوت دی گئی، چنانچہ اسے پورے احترام کے ساتھ اصفہان لے جایا گیا۔ یہاں شب جمعہ کو شہر کے علما علاء الدولہ کی مجلس میں جمع ہوتے اور علوم و فنون میں شیخ بوعلی سے استفادہ کرتے۔ بوعلی یہاں تالیف و تصنیف میں مصروف رہا۔ پھر امیر علاء الدولہ کی درخواست پر ابو عبید جوزجانی کے تعاون سے رصدگاہ تعمیر کی اور اس رصدگاہ کے لیے بوعلی نے ایسے ایسے آلات بنائے جو اس سے پہلے موجود نہ تھے۔ افسوس کہ اس حملے میں جو ۴۲۵ھ میں مسعود بن محمود نے اصفہان پر کیا بوعلی کی بعض کتابیں تباہ ہو گئیں۔ ان کتابوں میں ایک الحکمۃ المشرقیہ والحکمۃ العرشیہ بھی ہے جسے وہ غزنی اٹھا کر لے گئے یہاں تک کہ جب ملک الجبال حسین غوری نے غزنہ پر حملہ کیا تو یہ اہم کتاب نذر آتش ہو گئی۔

آخری سفر میں جب شیخ بوعلی سینا علاء الدولہ کے ساتھ ہمدان کا سفر کر رہا تھا تو یہ نابغہ روزگار رمضان ۴۲۸ھ میں فوت ہو گیا اور اسی شہر میں مدفون ہوا، جہاں آج اس کا خوب صورت مقبرہ موجود ہے۔ بقول شاعر:

ھیہات ان یاتی الزمان بمثلہ   ان الزمان بمثلہ بخیل

بوعلی سینا مضبوط اور خوب صورت جسم کا مالک تھا۔ وہ عاشق کتاب تھا اور دل دادۂ علوم و فنون اور دن اور رات کا اکثر حصہ مطالعہ و تالیف میں بسر کرتا۔ حد یہ ہے کہ روپوشی و اسارت کے ایام میں بھی وہ ہر حال کسی نہ کسی کتاب پڑھنے، کتاب لکھنے اور کتاب پڑھانے میں مشغول رہتا۔ وہ

سیاسی و سرکاری امور میں بھی مشغول رہا لیکن کوئی شغل اسے مطالعۂ کتاب سے روک نہ سکا۔

بو علی سینا کی ذہانت و فطانت کی داستانیں زبان زدِ عام ہیں۔ اس کی ذہانت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے زمانے کے مروجہ علوم میں ماہر ہو گیا تھا۔

مورخین نے لکھا ہے کہ بوعلی مغرور تھا اور معاصر علما بلکہ بعض اوقات قدما کے بارے میں نامناسب الفاظ استعمال کرتا۔ بہرحال اس نے اکثر معاصرین سے ملاقاتیں کی تھیں جس سے ملاقات نہ ہوتی اس سے خط و کتابت ضرور کی۔ ان معاصرین کے نام یہ ہیں: ناقلی، ابوبکر احمد بن محمد البرقی الخوارزمی۔ ابوسہیل مسیحی، ابومنصور الحسن بن نوح القمری، ابوسعید بن ابی الخیر، ابوعلی بن مسکویہ، ابوریحان البیرونی، ابوالقاسم الکرمانی، ابوالفرج بن الطیب، ابونصر عراقی اور ابوالخیر خما۔

شیخ بوعلی سینا کے شاگردوں نے بھی علوم و فنون میں بڑا نام پیدا کیا۔ نظامی عروضی، البیہقی۔ اور ابن ابی اصیبعہ اور شہرزوری کی روایات کے مطابق بوعلی سینا کے شاگرد مندرجہ ذیل ہیں۔

کیا رئیس بہمن یار، ابومنصور حسین بن طاہر بن زیلہ، ابوعبید عبدالواحد الجوزجانی، ابوعبداللہ المعصومی الحکیم، سلیمان دمشقی، امیر فخر الدولہ ابوکالیجار، ابوالقاسم عبدالرحمٰن نیشاپوری، السید ابوعبداللہ محمد بن یوسف علی النسائی وغیرہ۔

بوعلی سینا ایک خشک فیلسوف اور دلیل باز منطقی ہی نہ تھا، وہ عربی و فارسی میں شعر بھی کہتا تھا۔ اس کے عربی کلام کا نمونہ ابن ابی اصیبعہ نے درج کیا ہے۔ اس کلام میں اس کا قصیدہ عینیہ مشہور ہے، جس کی کئی شرحیں کی گئی ہیں۔ یہ قصیدہ جسم میں نفسِ ناطقہ کے حلول اور پھر عالم اصل کی طرف رجوع کی کیفیت کے بارے میں ہے۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

هبطت اليك من المحل الارفع   ورقاء ذات تعزز و تمنع

دوسرا قصیدہ نونیہ ہے جس کا ایک نام "الجمانیۃ الالہیہ" بھی ہے۔ فرماتے ہیں:

ياطالب الصفة الاله وخلقه   بتصور يهدى الى الايمان

بوعلی سینا کے فارسی اشعار ایڈورڈ براؤن نے تاریخ ادبیاتِ فارسی میں درج کر دیے ہیں۔

اب ہم بوعلی سینا کی تالیفات و رسالات کا ایک تعارف پیش کرتے ہیں۔

بوعلی سینا کی تالیفات اور رسائل

۱۔ کتاب الشفا (اٹھارہ جلدیں)۔ اس اہم تصنیف میں فلسفہ، ریاضی، طبیعات اور منطق پر مباحث ملتے ہیں۔ یہ بارہا شائع ہو چکی ہے۔ نیز اس کے تراجم و حواشی بھی مختلف زبانوں میں چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔

۲۔ کتاب النجاۃ (تین جزو)۔ کتاب الشفا کا خلاصہ ہے۔ اس کے متعدد نسخے موجود ہیں اور یہ روم اور قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے تراجم سریانی، لاطینی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں ہوئے ہیں۔

۳۔ کتاب الانصاف: یہ بیس حصوں پر مشتمل تھی۔ افسوس کہ یہ کتاب اس وقت ضائع ہو گئی جب غزنویوں نے اصفہان پر حملہ کیا اور اب غالباً اس کا ایک آدھ جزو باقی ہے۔ اس میں مشرقی و مغربی علما کے درمیان محاکمہ کیا گیا تھا۔

۴۔ کتاب الاشارات والتنبیہات: بوعلی سینا نے اس میں مسائل فلسفہ کو بیان کیا ہے اور یہ دس نہج اور دس نمط پر مشتمل ہے۔ جن اہم مسائل کو سلجھایا گیا ہے ان کے عنوان اس طرح ہیں۔

فی تجوھر الاجسام - فی الجھات واجسامھا الاولیٰ والثانیہ - فی النفس الارضیہ والسماویہ - فی الوجود والعلۃ - فی الصنع والابداع - فی البھجۃ والسعادۃ۔

اس میں مسائل عرفانی بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اس کی شرحیں امام فخرالدین رازی، علی الآمدی، نصیرالدین طوسی، ابن کمونہ وغیرہ نے لکھی ہیں۔ یہ تصنیف طہران اور فرانس وغیرہ میں شائع ہو چکی ہے۔

۵۔ اقسام العلوم الحکمیہ۔ (رسالہ)۔ شیخ بوعلی سینا نے اس رسالے میں علوم عقلیہ کی اقسام بیان کی ہیں۔ عبرانی میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ قلمی نسخے، مشہد، استنبول، بودایان، قاہرہ اور برٹش میوزیم کے کتاب خانوں میں موجود ہیں۔

۶۔ حی بن یقظان (رسالہ عرفانی): بوعلی سینا نے اسے فردجان کے قید خانے میں قلم بند کیا تھا۔ اس کے شاگرد ابن زیلہ نے اس کی شرح لکھی ہے۔ اس رسالے میں عرفانی داستان بطور رمز بیان ہوتی ہے۔ یہ بیت المقدس کے ایک معمر آدمی حی ابن یقظان کی داستان ہے۔ حی بن یقظان سے مراد عقل فعال ہے جو صوفی کو حق تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔

۷۔ الحکمۃ واقوال الحکما، (رسالہ)۔ اس کے نسخے استنبول میں موجود ہیں۔

۸۔ شرح اثولوجیائے فلوطین۔ یہ رسالہ ارسطو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور بوعلی سینا نے اس کی

شرح لکھی ہے۔ بعض محققین نے اسے کتاب الانصاف کا ایک جزو قرار دیا ہے۔

۹۔ شرح کتاب النفس:۔ ارسطو کی کتاب النفس کی شرح ہے۔ اس کے فارسی تراجم بھی موجود ہیں۔

۱۰۔ المباحثات:۔ بوعلی سینا نے گوناگوں مسائل و مشکلات کے بارے میں اپنے شاگردوں بہمن یار اور ابی منصور بن زید سے گفتگو کی اور جوابات دیے۔ یہ کتاب انہی جوابات پر مشتمل ہے۔ اس کے متعدد قلمی نسخے قاہرہ، استنبول، لیڈن وغیرہ میں موجود ہیں۔

۱۱۔ التعلیقات فی الحکمہ:۔ اس میں منطق، طبیعیات اور الٰہیات پر بحث کی گئی ہے۔

۱۲۔ رسالہ فی الحدود:۔ اس میں فلسفے کی ستر اصطلاحات کی شرح کی گئی ہے۔ اس کے مشہور قلمی نسخے مشہد، استنبول، بودلیان، برلن، لیڈن اور برطانیہ میں موجود ہیں۔

۱۳۔ الحکمۃ العروضیہ:۔ بوعلی سینا لکھتے ہیں بخارے میں میرے ہمسایہ میں ایک صاحب ابوالحسین العروضی رہتے تھے۔ انھوں نے درخواست کی کہ میں ان کے لیے ایک جامع کتاب لکھوں، لہٰذا میں نے یہ کتاب لکھی اور اسے انہی کے نام معنون کیا۔ اس میں ریاضی کے ساتھ ساتھ دیگر علوم پر بھی مفصل لکھا گیا ہے۔ اس وقت مصنف کی عمر ۲۱ سال تھی۔ اس لیے اسے بوعلی سینا کی اوّلین تصنیف ماننا چاہیے۔ اس کے قلمی نسخے سویڈن میں موجود ہیں۔ جزو اوّل میں وحدۃ، قوۃ، فعل، واجب، کلی، تام، اختلاف القضایا، برہان مطلق، حد، مبادی حد، تناسب حد و برہان، فصول وغیرہ مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔

۱۴۔ الحکمۃ المشرقیہ:۔ اس معرکۃ الآرا تصنیف میں بوعلی سینا نے حکمائے بغداد (مشرقیین) کے عقائد بیان کیے ہیں۔ منطق، طبیعیات، ریاضیات اور الٰہیات کے مسائل بیان ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے دو قلمی نسخے استنبول کے کتاب خانے، ایاصوفیا اور کتاب خانہ نور عثمانیہ میں موجود ہیں۔ یہ کتاب منطق المشرقین کے نام سے ۱۹۱۰ء میں قاہرہ سے چھپ چکی ہے۔

۱۵۔ عیون الحکمۃ:۔ اس کے تین حصے ہیں جن میں بالترتیب منطق، طبیعیات اور الٰہیات کے مسائل پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ قلمی نسخے کتاب خانہ مجلس (طہران)، استنبول، واشنگٹن اور لیڈن میں موجود ہیں۔ امام فخرالدین رازی نے اس کی شرح لکھی تھی۔

۱۶۔ ارجوزۃ فی المنطق:۔ یہ طویل عربی قصیدہ ہے۔

۱۷۔ تلخیص المنطق:۔ یہ رسالہ ابوعلی سینا نے بعض دوستوں کی درخواست پر تالیف کیا تھا، جیساکہ

نام سے ظاہر ہے، اس میں علم منطق کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ قلمی نسخہ کتاب خانہ فاتح (استنبول) میں محفوظ ہے۔

۱۸۔ علم البرہان (اصول علم البرہان)۔ علم القضایا کے بیان میں عربی قصیدہ ہے۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے

ان القضایا کلّھا محصورۃ   فی خمس عشرۃ عند اھل المنطق

الممکنات جمیعھا ھی اربع   عام وخاص عند کل محقق!

۱۹۔ المسائل العشرۃ :۔ یہ دس موضوعات پر مشتمل ہے۔ موضوعات یہ ہیں، علت اولیٰ، حقیقتِ روح، حقیقت نفس کلی، شمس وقمر وکواکب، کیا یہ جائز ہے کہ قدیم ایک سے زیادہ ہو؟، وجودِ واحد، فعلِ ارادی وفعلِ طبعی کے درمیان فرق، عدم، حدِ موجود، تعلقِ فعل با فاعل۔

۲۰۔ فی المنطق :۔ رسالہ منطق استنبول کے کتاب خانوں میں موجود ہے۔

۲۱۔ الموجز فی المنطق :۔ مقالہ اوّل میں علمِ منطق کے قضایا اور اس کی غرض بیان کی گئی ہے۔ باقی حصے میں قضایا اور قیاسات کی اقسام تحریر کی گئی ہیں۔

۲۲۔ الموجز الکبیر :۔ اس کا موضوع [illegible] طق ہے۔ اس کا قلمی نسخہ کتاب خانہ ایاصوفیا استنبول میں موجود ہے۔

۲۳۔ مقالۃ فی النفس :۔ یہ کتاب [illegible] سینا نے امیر نوح بن منصور کے لیے دس فصلوں میں مرتب کی تھی۔ متعدد قلمی نسخے ایشیا اور یورپ کے کتاب خانوں میں موجود ہیں۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع بھی ہو چکے ہیں۔

۲۴۔ احوال النفس :۔ (حال المعاد) سولہ فصلوں میں ہے۔ مضامین کی فہرست اس طرح ہے : فی التعریف حد النفس۔ فی التعریف قوی النفسانیہ۔ فی اختلاف افاعیل القوی المدرکہ وغیرہ۔ قلمی نسخے مشہد، برلن، قاہرہ اور استنبول میں ہیں۔ فارسی ترجمہ بھی موجود ہے۔

۲۵۔ فی معرفۃ النفس الناطقۃ واحوالھا :۔ تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ فصل اوّل اس کے اثبات میں کہ جوہر نفس، جوہر جسم سے مغائر ہے۔ فصل دوم، جسم کے فنا ہونے کے بعد بقائے نفس۔ فصل سوم، سعادت و شقاوت کے اعتبار سے مراتبِ نفوس۔ کتاب قاہرہ میں شائع ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے مشہور لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں۔

۲۶۔ ایضاح البراہین فی مسائل عویصہ :۔ تین فصلوں میں ہے، موضوع ہے، اثبات جوہریت وبقائے روح۔ شیخ الرئیس نے اس کتاب میں ان مسائل کی وضاحت کی ہے جو کتب متقدمین میں بیان ہوئے۔ اس کا ایک نسخہ کتاب خانہ ایاصوفیا استنبول میں ہے۔

۲۷- بقاء النفس الناطقہ، اس میں یہ بحث ہے کہ نفس ناطقہ جوہر ہے یا عرض - اگر عرض ہے تو کیا قابلِ فساد ہے یا نہیں۔ مصنف نے بقائے نفس کو نو دلیلوں سے ثابت کیا ہے۔

۲۸- الحجج العشرہ فی جوہریۃ نفس الانسان الناطقہ :- دس دلائل سے جوہریتِ نفس ثابت کی گئی ہے۔

۲۹- ماہیۃ الحزن (رسالہ): حقیقتِ حزن، اس کے اسباب اور معالجے کا بیان ہے۔ ابوعلی سینا کا ایک مختصر سا رسالہ اسی موضوع پر ہے، جس کا نام ہے دفع الغم والھم۔

۳۰- تحقیق الانسان :- ایک مقدمے تین مبحث اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ انسان کی تعریف کرتے ہوئے اس کا مقام و مرتبہ دکھایا گیا۔

۳۱- تعلق النفس فی البدن :- یہ ایک رسالہ ہے، جو مشہور صوفی ابوسعید ابوالخیر کے جواب میں بوعلی سینا نے تحریر فرمایا تھا۔ اس کے نسخے استنبول کے کتاب خانوں میں مل سکتے ہیں۔

۳۲- الفیض الالٰہی (رسالہ) :- جسمانی قویٰ پر افعال و انفعالات سے متعلق شیخ رئیس کا یہ مشہور رسالہ ہے۔ اس میں وحی، الہام، معجزہ، کرامت، منامت، سحر اور اس کے اقسام پر بحث کی گئی ہے۔ قلمی نسخے مشہد اور استنبول کے کتاب خانوں میں موجود ہیں۔

۳۳- المبداء والمعاد (رسالہ) : اس میں مبداء و معاد سے متعلق مشائین کے عقائد بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ خود مصنف کے بقول یہ رسالہ علم الٰہیات و طبیعیات پر مشتمل ہے۔ کل تین مقالے ہیں اور ہر مقالے کی کئی فصلیں ہیں۔

۳۴- اربع مسائل فی امر المعاد (رسالہ) شائع ہو چکا ہے۔ ترکی کے کتاب خانوں میں اس کے قلمی نسخے بھی مل جاتے ہیں۔

۳۵- فی حجج المثبتین للماضی مبدأ زمانیا :- اس کی گیارہ فصلیں ہیں۔ مصنف نے اس میں قدمِ زمان کے ماننے والوں کو ہدفِ تنقید ٹھہرایا ہے۔ ان کے عقائد کے بطلان اور اپنے مدعا کے اثبات میں دلائل دیئے ہیں۔

۳۶- الممکن الوجود :- یہ ایک رسالہ ہے جس کے نسخے ترکی اور برطانیہ کے کتاب خانوں میں موجود ہیں۔

۳۷- رسالہ فی العشق :- شائع ہو گیا ہے۔ اس کا ترجمہ آقای مشکوٰۃ کا تصحیح کیا ہوا طہران میں چھپ چکا ہے۔

۳۸- قصہ سلامان و ابسال : یہ شیخ الرئیس کا ایک رمزیہ قصہ ہے جسے حی بن یقظان کے زمرے میں شمار کرنا چاہیے۔ خواجہ نصیر الدین طوسی نے اس کی شرح لکھی ہے۔ جامی نے اسی قصے کو "سلامان و ابسال"

کے عنوان سے منظوم کیا تھا۔

۳۹۔ مکاتیب : بوعلی سینا سے اکثر معاصرین سوالات کرتے تھے اور وہ ان کے جواب دیا کرتے تھے، اس طرح ان کے متعدد خطوط باقی رہ گئے ہیں۔ اکثر مکاتیب شیخ ابوسعید ابوالخیر کو لکھے گئے۔ ایک خط کا عنوان ہے ، الارشاد فی الدخول فی الکفر۔ اس کے قلمی نسخے استنبول کے کتاب خانوں میں موجود ہیں۔ ایک خط کا عنوان ہے ،حصول علم وحکمۃ ۔ شروع میں یہ الفاظ ہیں، جواب الی ابی سعید بن ابی الخیر یبین لہ فیہ ان الحکمۃ ام الفضایل و معرفۃ اللہ اوّل الاوائل ۔ یہ خط کتاب النجاۃ کے ساتھ قاہرہ میں شائع ہوچکا ہے۔ دوسرے خطوط بہمن یار اور ابوجعفر الکیا، ابوعبید جوزجانی ، ابوطاہر احمد، علاء الدولہ کاکویہ ، ابن زملہ اور ابوجعفر کاشانی کے نام ہیں۔ ان میں سے بعض مکاتیب کتاب " ارسطو عند العرب" میں چھپ چکے ہیں۔ شیخ الرئیس کی خط وکتابت ابوریحان البیرونی سے بھی رہی ہے ۔ ان مکاتیب کا مجموعہ اجوبۃ ست عشرۃ مسألۃ لابی ریحان" کے نام سے موجود ہے۔ عربی میں ان مختلف تصانیف ومکاتیب کے علاوہ بوعلی سینا نے درجنوں رسالے لکھے تھے، جن میں سے اکثر کے قلمی نسخے مل جاتے ہیں اور کچھ چھپ بھی چکے ہیں۔ ان رسائل کی فہرست ہم درج کر رہے ہیں :

(۴۰) دیطوریقا وسوفسطیقا (۴۱) الفصول الموجزہ (۴۲) البھجۃ فی المنطق (۴۳) اختلاف الناس فی امر النفس (۴۴) فی بیان الصورۃ المعقولۃ المخالفۃ الحق (۴۵) تزکیۃ النفس (۴۶) الجمل من الادلۃ المحققۃ لبقاء النفس الناطقہ (۴۷) حقیقۃ الروح (۴۸) العقول (۴۹) الفراسۃ (۵۰) مختصر ارسطو فی النفس (۵۱) المذاھج فی معرفۃ النفس (۵۲) رسالۃ النفس (۵۳) رسالہ فی امر النفس (۵۴) النفس (۵۵) النفس والعقل (۵۶) النفوس (۵۷) المنامۃ (۵۸) الآثار العلویۃ (احکام نجوم کے ابطال کے بارے میں)۔ (۵۹) الاجرام العلویہ (۶۰) اسباب الرعد والبرق (۶۱) استفاء النور (۶۲) تلخیص کتاب الکون والفساد (۶۳) الجسم (۶۴) حد الجسم (۶۵) الحدث (۶۶) حدوث الاجسام (۶۷) الطول والعرض (۶۸) الفضاء فی ان الکمیۃ والبرودۃ والحرارۃ لیست بجوھر۔ (۶۹) النبات والحیوان (۷۰) النفس الفلکیہ (۷۱) رسالۃ العروش (۷۲) اثبات المبدء الاوّل (۷۳) رسالۃ التمجید (۷۴) الخطبۃ التوحیدیہ (۷۵) شرح اسماء اللہ (۷۶) العرشیہ (۷۷) عقل الکل (۷۸) الفصول ثلاثۃ (۷۹) فصول الحکمۃ (۸۰) الکلمۃ الالٰہیۃ (۸۱) المسائل (۸۲) العلم اللدنی (۸۳) فی کلمات

الصوفیہ (۸۴) مخاطبات الارواح بعد مفارقۃ الاشباح (۸۵) فی بیان المعجزات والکرامات (۸۶) الوعظ (۸۷) مواقع الالہام (۸۸) الموت والحیات (۸۹) الورد الاعظم (۹۰) اثبات النبوۃ (۹۱) الاخلاق (۹۲) الارزاق (۹۳) السبر والاثم (۹۴) السیاستہ۔

یہ تو تھی شیخ بوعلی سینا کی عربی تصانیف ورسائل اور مکاتیب کی فہرست اور مختصر تعارف۔ اب ان کی فارسی تصانیف کا اجمالی تعارف ملاحظہ ہو:

۹۵۔ دانشنامۂ علائی: فارسی تصانیف میں دانشنامۂ علائی (حکمتِ علائی) بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب ابوجعفر محمد بن دشمنزیار کاکویہ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ اس میں پانچ علوم، منطق، طبیعیات، علم ہیئت، علم موسیقی، علم بیرون از طبیعہ کی تفصیل ملتی ہے۔

۹۶۔ رسالہ نبضیہ:۔

۹۷۔ رسالہ معراجیہ: اس میں تاویلاتِ اصطلاحی درج کی گئی ہیں۔ مثلاً روح القدس، وحی، کلام اللہ، نبوت، شریعت، معراج یعنی یہ کہ معراج روحانی تھا یا جسمانی۔ قلمی نسخے ایران، قاہرہ، استنبول میں موجود ہیں۔

۹۸۔ ظفرنامہ:۔ اس کتاب کو بوعلی سینا سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں یہ سامانی امیر نوح بن منصور کے لیے لکھی گئی تھی۔

۹۹۔ کنوز المعزین:۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اسے بوعلی سینا کی طرف منسوب کیا ہے۔ بظاہر یہ کتاب رسالہ النیرنجیات کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔

۱۰۰۔ شرح کتاب النفس ارسطو:۔ یہ کتاب بھی بوعلی سینا کی عربی تصنیف کتاب النفس ارسطو کا فارسی ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔

۱۰۱۔ رسالہ در حقیقت وکیفیت سلسلۂ موجودات۔ قلمی نسخہ کتاب خانہ مشہد ایران میں موجود ہے۔

۱۰۲۔ قراضۂ طبیعیات موجود:۔ بوعلی سینا کی اکثر تصانیف ورسائل شائع ہو چکے ہیں، ان میں سے یہ رسائل مشہور ہیں۔

۱۰۳۔ تسع رسائل:۔ یہ رسائل ۱۳۱۸ میں ہندوستان میں اور ۱۲۹۸ میں استنبول میں اور ۱۳۲۶ھ میں قاہرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ مذکورہ بالا نو رسالوں کی تفصیل یہ ہے: (۱) عیون الحکمۃ (۲) اجرام العلویہ

(۳) قوی النفس و ادراک الانسان (۴) حدود و تعریفات (۵) اقسام العلوم العقلیہ (۶) مسائل النبوۃ (۷) الرسالۃ النیروزیہ (۸) رسالۃ العہد (۹) رسالۃ الاخلاق

۱۰۴۔ رسائل عرفانی:۔ اس مجموعے میں یہ رسالے شامل ہیں۔ (۱) حی بن یقظان (۲) سہ نمط۔ (۳) رسالۃ الطیر (۴) رسالۃ فی العشق (۵) فی ماہیۃ الصلاۃ (۶) فی معنی الزیارہ وکیفیت تاثیرہا (۷) رسالہ فی دفع الغم من الموت (۸) رسالۃ القدر

۱۰۵۔ جامع البدایع:۔ ۱۳۳۵ میں قاہرہ میں چھپی۔ اس میں جو رسائل شامل ہیں، ان کے نام یہ ہیں:
(۱) رسالۃ فی الصلاۃ (۲) تفسیر الصمدیۃ (۳) بیان ماہویہ (۴) تفسیر المعوذۃ الاولی (۵) تفسیر المعوذۃ الثانیہ (۶) رسالہ الزیارۃ والدعاء (۷) رسالہ اجوبۃ علی مسائل ابی الریحان البیرونی۔

۱۰۶۔ مجموعۃ الرسائل:۔ یہ مجموعہ ۱۳۲۸ میں قاہرہ میں شائع ہوا۔ اس میں اہم رسائل یہ ہیں:
(۱) علم الاخلاق (۲) رسالۃ العہد (۳) القوی الانسانیہ (۴) اقسام العلوم العقلیہ (۵) رسالہ سر القدر (۶) رسالۃ المبدأ (۷) رسالۃ الجواہر النفیس۔

۱۰۷۔ سبع رسائل:۔ یہ مجموعہ حیدرآباد دکن میں شائع ہوا تھا۔ اس میں یہ رسائل شامل ہیں:۔
(۱) رسالۃ الفعل و الانفعال (۲) الرسالۃ العرشیہ (۳) السعادۃ والحج العشرہ (۴) فی الموسیقی (۵) فی اسباب الرعد۔

پروفیسر علیم الدین سالک
مرتب: پروفیسر احسان الحق سالک

چندا: اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ

چندا کے والدین

چندا کا باپ مرزا سلطان بلخ کا رہنے والا تھا۔ بعض نامساعد حالات نے اسے ترک وطن پر مجبور کیا اور اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تیموری اپنی عظمت کھو چکے تھے، ان کے جلال کا خاتمہ ہو چکا تھا، دہلی کے تخت پر احمد شاہ متمکن تھا اور شاہ عالم کی شہزادگی کا دور تھا۔ مرزا سلطان نے اپنی خدمات دربار شاہی کو پیش کیں۔ اس وقت نیشاپوریوں اور تورانیوں کی باہمی رقابت زوروں پر تھی۔ دربار کی یہ دونوں پارٹیاں اپنی اپنی طاقت اور قوت میں اضافہ کر رہی تھیں۔ چنانچہ مرزا سلطان کو ملازمت مل گئی۔ اسے بعض خدمات جلیلہ کے سلسلے میں صلابت خان کا خطاب ملا اور جب شاہ عالم بادشاہ ہوا تو اسے بسالت خاں کا پُر اعزاز خطاب عطا ہوا اور اسے شاہی افواج کا بخشی مقرر کیا گیا۔ چندا کی ماں گجرات کے حسن خیز خطے کی رہنے والی تھی۔ اس کا نام راج کنور بائی تھا اور وہ خواجہ محمد حسین خاں کی دختر تھی۔

پیدائش، تعلیم و تربیت، مشاغل

۱۱۸۰ھ میں چندا پیدا ہوئی۔ اس زمانے کے شرفا کے قاعدے کے مطابق اسے مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی گئی۔ ذہین اور طباع تھی، اس لیے مختلف علوم و فنون میں سرآمد روزگار ہو گئی۔ شعر گوئی اور موسیقی میں بھی اچھی خاصی دسترس حاصل کر لی، چنانچہ اس کے ہاں مشاعرے ہوتے اور بلند پایہ شعرا اور اونچے درجے کے ادیب اس میں شرکت کرتے۔ وہ فنون حربیہ سے بھی واقف تھی، چنانچہ گھوڑے کی سواری، تیر اندازی اور دیگر مردانہ کھیلوں میں بھی کافی مہارت رکھتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دولت کافی دے رکھی تھی اس لیے صرف اس کی اردل میں پانچ سو سپاہی ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ علوم و فنون کی بھی دلدادہ تھی۔ چنانچہ اس کی سرپرستی میں تاریخ دل افروز[1] مرتب ہوئی۔ یہ

---

[1] تاریخ دل افروز، فہرست مخطوطات موزۂ بریطانیہ لندن۔ نمبر ۲۶۳۰۔ اڈیشن

خاندانِ آصفیہ کی تاریخ ہے مگر درحقیقت تمام ہندوستان کی تاریخِ عمومی ہے۔ اس کا مصنف غلام حسین جوہر ہے۔ اس کے ماخذ، روضۃ الصفا، حبیب السیر، فرشتہ، مراۃ العالم، اقبال نامہ جہانگیری، اکبرنامہ، آثرالامرا، منتخب اللباب، چار چمن، سوانح دکن، ہفت اقلیم، شاہ نامہ، تاریخِ بہمنی، تاریخِ قطب شاہی، زبدۃ التواریخ، عالمگیرنامہ، شاہ جہاں نامہ (یا بادشاہ نامہ)، توزکِ آصفیہ اور توزکِ تیموری ہیں[۵۲]

کردار اور یومیہ پروگرام

چنداؔ صبح اٹھ کر نماز سے فارغ ہوتی۔ طلوعِ آفتاب تک ادعیہ ماثورہ اور وظائف و اوراد میں مصروف رہتی۔ قرآنِ پاک کی تلاوت اور ناشتے سے فارغ ہوتی تو دوپہر ہو چکی ہوتی۔ پھر قیلولہ کے لیے بالاخانے میں جاتی اور آرام کرتی۔ نمازِ ظہر سے عصر تک تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتی۔ نمازِ عصر کے بعد دیوان خانے میں خانگی حساب کتاب اور امورِ خانہ داری کے انصرام کی ہدایات دیتی۔ اس کے بعد علما و فضلا اور اہلِ سخن سے علمی گفتگو ہوتی۔ اسے کتب بینی کا بڑا شوق تھا۔ زیادہ تر حبیب السیر اور روضۃ الصفا زیرِ مطالعہ رہتیں۔ ان کے علاوہ فارسی اور ریختہ کے دیوان بھی باقاعدہ پڑھتی۔ یہ سلسلہ نمازِ مغرب تک جاری رہتا۔ نمازِ مغرب کے بعد کھانا ہوتا، پھر نمازِ عشا کے بعد فنِ موسیقی کے اساتذہ کا اجتماع ہوتا جو آدھی رات تک جاری رہتا۔ رمضان المبارک میں روزے کی بجائے روزانہ ایک سو بیس خوان غربا کو دیا کرتی تھی[۵۳]

تاریخ دل افروز کی وجہِ تالیف

"چون حقوق تربیت و عنایت خاندانِ عالیہ آصفیہ خصوص نوازش و عنایت حضرت نواب غفران آب (آصف جاہ ثانی) بریں عاجزۂ بے مقدار بچندیں سرفرازی، ثابت و محقق است، للہٰذا دلِ فدویت چناں می خواہد کہ تاریخ در مآثر ایام سلطنت حضرت بعنوان اجمال کردہ شود۔ درذیل آں بعد از ذکر ارکان و اعیان و امرائے عہد ذکر ایں جزہ ہم طراز داماں یاد فرماتی و یادگاری یاد باشد"[۵۴]

---

۵۲ تاریخ دل افروز، ص ۵۵۵

۵۳ ماخوذ از تاریخ دل افروز   ۵۴ ایضاً۔ ص ۱۲

شعروشاعری کا شوق

چنداؔ کو شعروشاعری کا ذوق تھا اور وہ شیر محمد خان ایماؔن سے اصلاحِ سخن لیتی تھی۔ اس کے ہاں اس دَور کے بڑے بڑے شعرا کے اجتماع ہوتے اور اکثر مشاعرے کی محفل جمتی۔ محافل موسیقی بھی منعقد ہوتیں، جن میں کبار امرا جمع ہوتے۔ اس کی تعریف میں قصیدے کہے جاتے۔ میر عالم بہادر نے اس کی مدح میں ۱۷۵ شعروں کی مثنوی لکھی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

اے مہر سپہر روشنائی — سرتا پائے تو دلربائی

اے مردم دیدۂ محبت — سرتا قدمت طلسم الفت

شکل تو بفلک دل مصور — چشم تو مات جان مجمر

اے ماہ ــــ ماہِ پیکر — وے ماہ جبین و ماہ منظر

اس کے دیوان کا دیباچہ فارسی میں ہے۔ اس میں حمد و نعت کے بعد حضرت علیؑ کی منقبت ہے اور پھر آصف جاہ ثانی کی مدح لکھی ہے۔ اس کے بعد سلطنت کے دیوان (وزیر اعظم) کی تعریف ہے۔ ان دنوں دیوان، راجہ راؤ رمنیا تھا۔ اس کے دیوان کے مؤلف سید نصیر الدین خان قدرتؔ نے چنداؔ کے کمالِ فن اور شعر و سخن کی تعریف کی ہے:

"در زمان تہنت عنوان سنہ سبعۃ ثلاثین از جلوس میمنت مانوس بندگانِ نظام الملک آصف جاہ نظام الدولہ ولد میر نظام علی خان مکاینِ سنہ ثالث عشرین ماتین بعد الف (۱۲۱۳ھ) اوان اوج و عروج مدار المہامی، غلام سید خان سہراب جنگ معین الدولہ مشیر الملک اعظم الامرا بہادر وکیل مطلق مختار دولتِ آصفیہ امیر اعظم نواب ارسطو جاہ کہ . . . ماہ منیر فلک انبساط برجبین منور برج نشاط نازنین چار بالش رعنائی المخاطب ماہ لقا بائی در سر رشتہ ملازمی مہاراج عالی مزاج منبع المناقب معالی المراتب علو منزلت و مرتبت ذی شوکت و حشمت و الاتیار عالی مقدار راجہ راؤ رمنیا جیونت بنا لکر مداللہ عمرہ و زاد ثروتہ، محفل افروختہ نکتہ دانی بیشتر از بیداجزائی معانی کہ عبارت از تصنیف دیوان غزل بندلیست گردیدہ و سوادِ اعظم بر صفحہ را بتحریر و تقریر دلپذیر مانند خطوط شعاعی خورشید کشید . . . "

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چنداؔ نے جو راجہ راؤ رمنیا کی ملازمت میں داخل تھی، قدرتؔ (نصیر الدین خان)

سے دیباچہ لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دیوان راجہ صاحب کی خواہش سے مرتب ہوا، جسے بعد از ترتیب نواب ارسطو جاہ دیوانِ وقت نے پسند فرمایا۔ اس کی تاریخ "ھو اللطیف الاعظم" یعنی ۱۲۱۳ھ ہے۔ اس میں فقط غزلیات ہیں۔ ابتدا:

کہاں طاقت کہ راہِ حمد میں ہو زباں گویا — کہ یہاں جز عجز و خاموشی نہیں ہے یک زباں گویا

سوائے حق کے کب کوئی واصف ائمہ ہو — رہا چندا ملک پر بھی ہے نکتہ نہاں گویا

ساقی دے مجھکو جام مئے ارغوان پھر — افسردہ دل میں آئے جو شعلہ سی جان پھر

ملتے ہیں توقع پہ تری غیر سے کم ہم — رکھتے ہیں ترے دور میں یہ چشم کرم ہم

چشم کافر بھی ہے اور غمزۂ خونخوار بھی ہے — قتل کو پاس سپاہی کے یہ تلوار بھی ہے

اس دیوان کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد دکن) میں موجود ہے۔ اس کا ایک اور مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں ہے [۵]

---

[۵] BLOOM HART.S COLLECTION NO 11288. FASCIMILE 34 SIZE 9½" × 5¾"

لمحات : از:۔ شاہ ولی اللہ — ترجمہ: پیر محمد حسن

یہ حضرت شاہ ولی اللہ کے عربی رسالہ "لمحات" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے چند اسرار بیان کیے ہیں۔ تمام حقائق کا مرجع اول الاوائل ہے اور اسی سے کائنات کے مختلف مدارج میں صدور ہوا۔ اس کائنات میں ابداع، تدبیر، خلق اور تدلّی کے ذریعہ افعالِ حق رونما ہوتے ہیں۔ اور یہ تجلیاتِ الٰہی ہیں جن کے واسطے سے بندہ اپنے رب کے کلام کو سنتا اور دیکھتا ہے۔ ان کو بعض مذاہب نے غلطی سے ذاتِ خداوندی کا قائم مقام سمجھ لیا، حالانکہ یہ صرف اس کے انوار کا محل ہیں اور اس کی طرف رہنمائی کرتی ہیں — یہ دقیق مسائل اس کتاب میں زیرِ بحث آئے ہیں۔

صفحات ۹۶ قیمت: -/۵ روپے

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اَبَرَّ الْبِرِّ اَنْ یَّصِلَ الرَّجُلُ اَھْلَ وُدِّ اَبِیْہِ ۔ (ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی اکرام صدیق الوالد)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے، سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ انسان اپنے باپ کے حلقۂ احباب سے تعلقات قائم رکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام امور کی پوری طرح وضاحت فرما دی ہے جو اخلاقیات کے مختلف دائروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ عام لوگوں سے میل جول کے آداب، رشتے داروں سے مراسم استوار رکھنے کے طریقے، بہن بھائیوں سے برتاؤ کا انداز، ماں باپ سے پیش آنے کے اسالیب، اولاد و احفاد سے تعلقات کے اصول، چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی تکریم۔ یہ اور اس قسم کی تمام باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیل سے بیان فرما دی ہیں اور اس چیز کی صراحت کر دی ہے کہ معاشرے کے کن لوگوں سے کس نوعیت کے مراسم قائم رکھنے چاہئیں۔

جیسا کہ اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ باپ کے دوستوں اور حلقۂ احباب سے بھی تعلقات قائم رکھنے چاہییں اور ان کی پوری عزت کرنی چاہیے، آنحضرتؐ نے اس طرزِ عمل کو بہت بڑی نیکی قرار دیا ہے۔

بات یہ ہے کہ اسلام کے احکام کسی خاص دائرے تک محدود نہیں ہیں اور اس کے اوامر و نواہی کا سلسلہ کسی ایک ہی موضوع میں سمٹا اور سکڑا ہوا نہیں ہے، بلکہ اس کی حدیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور عبادات و معاملات کے چھوٹے سے چھوٹے حکم سے لے کر بڑے سے بڑے مسئلے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے کو محیط اور انسان کو پیش آنے والی ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ اس کے نزدیک نیکی کی تعریف بڑی وسعت پذیر ہے اور اپنے اندر انتہائی جامعیت رکھتی ہے۔ پھر اسلام کی خوبی یہ ہے کہ نہایت خوب صورت طریقے سے جچے تلے الفاظ میں ان اقدار کی تشریح کرتا ہے جو انسان

کے فکر وعمل سے عین مطابقت رکھتی ہیں اور معاشرے کے افراد میں باہمی محبت اور ایک دوسرے سے الفت اور یگانگت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط و مستحکم بنانے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔

اسی حدیث کو لیجیے، یہ چند الفاظ کے ایک چھوٹے سے جملے پر مشتمل ہے۔ مگر اس میں جس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، وہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ باپ کا اگر کوئی مخلص دوست ہو تو لازماً اپنی ہمدردیوں کا مرکز اپنے دوست کی اولاد کو سمجھتا ہے۔ اس کی زندگی میں بھی وہ اس کی اولاد سے ہمدردانہ برتاؤ کرتا ہے اور اگر وہ فوت ہو جائے تو اس کے ہمدردانہ رویے میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ دوست کی وفات کے بعد اس کی اولاد کو کسی ذہنی اور پریشانی سے دوچار نہ ہونا پڑے اور وہ کسی قسم کی تکلیف میں مبتلا نہ ہو۔ وہ ان کے بہتر مستقبل کے لیے غور کرتا ہے اور ایسے ذرائع تلاش کرتا ہے جو ان کے لیے آئندہ زندگی میں معاون ہوں — لیکن ان کا زیادہ تر انحصار خود ان کے مرحوم دوست کی اولاد کے اس طرزِ عمل پر ہوتا ہے، جو وہ اس کے بارے میں اختیار کرتی ہے۔ اگر وہ اپنے باپ کے دوست سے تعلقات استوار رکھے گی تو ظاہر ہے، وہ بھی اس کو اپنی ہمدردیوں کا مستحق سمجھے گا اور کوشش کرے گا کہ ہمارے مراسم میں مزید استحکام پیدا ہو۔ اور اگر بالفرض اس کی اولاد اپنے باپ کے دوست کو ناقابلِ اعتنا سمجھنے لگے گی تو فطرتاً خود اس کے دل میں بھی ان کے بارے میں وہ جذبات باقی نہ رہیں گے جو آئندہ زندگی میں بہتر نتائج کا باعث بنتے ہیں۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی انسانی نفسیات سے عین ہم آہنگ ہے کہ اولاد کو باپ کے دوست سے تعلقات قائم رکھنے چاہییں اور ضروری معاملات میں مناسب حد تک اس سے مشورہ لیتے رہنا چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دوست کی اولاد ہی سے یہ توقع رکھے کہ انھی پر اس کی عزت و تکریم کا فریضہ عاید ہوتا ہے۔ خود اس کا بھی فرض ہے کہ وہ بھی ان کی طرف دستِ تعاون بڑھاتا اور انھیں مستحقِ اعانت سمجھتا رہے۔ ان پر ہمیشہ شفقت کا ہاتھ رکھے اور دین و دنیا کے ہر معاملے میں ان کی رہنمائی کا فرض انجام دیتا رہے۔ تعلقات کو اپنے دوست کی زندگی کے بعد ختم نہ کر دے بلکہ جہاں تک ممکن ہو، ان سے میل جول قائم رکھے اور ان کی برابر خبر گیری کرتا رہے۔ یعنی جس طرح اولاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے باپ کے دوست کے اکرام کو ملحوظ رکھے، اسی طرح دوست کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی اس کی اولاد کو شفقت و مہربانی کا مستحق گردانے۔

نقد و نظر

آخری سورتوں کی تفسیر

مرتب:- مولانا سید محمد متین ہاشمی

ملنے کا پتا:- کتب خانہ شانِ اسلام، راحت مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

صفحات: ۲۳۲۔ کاغذ، کتابت، طباعت، سرورق عمدہ۔ قیمت ۱۲ روپے

مولانا سید محمد متین ہاشمی (ریسرچ ایڈوائزر، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور) پاکستان کے محقق علما میں سے ہیں۔ اللہ نے ان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور خدمتِ علم ان کا اصل مشغلہ ہے۔ وہ متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں ایک کتاب "آخری سورتوں کی تفسیر" ہے جو اس وقت پیشِ نگاہ ہے۔ اس میں سورۂ فاتحہ بھی شامل ہے۔ کتاب جن سورتوں کے ترجمے اور تفسیر پر مشتمل ہے وہ یہ ہیں: سورہ فاتحہ، والضحیٰ، الم نشرح، والتین، اقرأ، القدر، البینہ، الزلزال، العادیات، القارعہ، التکاثر، العصر، الہمزہ، الفیل، القریش، الماعون، الکوثر، الکافرون، النصر، تبت، اخلاص، الفلق، الناس ـــ یہ کل تیئیس (۲۳) سورتیں ہیں اور یہ وہ سورتیں ہیں جنھیں عام طور پر ہر نمازی خواہ وہ امام ہو یا مقتدی ہر سری یا جہری نماز میں پڑھتا ہے۔ اس میں سورہ فاتحہ کو اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ اس کا پڑھنا بھی ہر نمازی پر فرض ہے۔

ترتیب اس طرح ہے کہ لائق مصنف نے پہلے ہر سورہ کا مع اعراب کے متن درج کیا ہے اور سورہ کے [illegible] دیا ہے۔ پھر اس کا تعارف کرایا ہے، پھر شانِ نزول بتایا ہے، اس کے بعد اس کی تفسیر بیان کی ہے۔ پھر [illegible] وہ روحانی خواص بیان کیے ہیں جو روایات میں درج ہیں یا بزرگانِ دین سے منقول ہیں اور مجرب ہیں۔ زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے تاکہ ہر شخص آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکے۔ زیادہ علمی دقائق اور تحقیقی مباحث سے احتراز کیا گیا ہے، کیوں کہ اس سے کم پڑھے لکھے اور معمولی استعداد کے لوگ استفادہ نہیں کر سکتے۔ مصنف نے اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا ہے کہ اس سے بچے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔

ہمارے خیال میں اپنے [illegible] یہ ایک مفید کتاب ہے، جو سورتیں عام طور پر ہر نماز میں لوگ پڑھتے ہیں ان کا

اس میں پورا ترجمہ اور مفہوم بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب چھوٹے بڑے ہر شخص کے لیے فائدہ مند ہے۔ بچوں کو یہ بالخصوص پڑھنی چاہیے اور اگر وہ خود اس کے بعض مطالب کو نہ سمجھ سکیں تو والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو پڑھائیں تاکہ ان کے دل میں قرآن مجید سے دلی لگاؤ اور محبت پیدا ہو اور انھیں یہ پتا چلے کہ جو سورتیں وہ روزانہ نماز میں پڑھتے اور سنتے ہیں، ان کا کیا ترجمہ اور کیا مطلب ہے۔

فہرست مخطوطات دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری (جلد سوم)

ترتیب و تحقیق :- مولانا سید محمد متین ہاشمی و حافظ نام حسین

شائع کردہ :- مرکز تحقیق، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، نسبت روڈ، لاہور

صفحات ۴۸۶ - قیمت ۶۰ روپے

دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری (لاہور) کے عربی و فارسی مخطوطات کی اس سے قبل دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، جو مولانا سید محمد متین ہاشمی کی مرتب کردہ ہیں۔ اب تیسری جلد شائع ہوئی ہے، جس میں دو سو مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے، جن میں نو مخطوطے اردو زبان کے اور دو پشتو کے ہیں۔ ایک مخطوطہ پنجابی زبان میں ہے۔ یہ مخطوطہ علم طب سے متعلق ہے اور اس کا نام "دستور الفصد" ہے۔ مصنف کا نام حکیم دیندار ہے۔ باقی تمام مخطوطے عربی اور فارسی میں ہیں۔

"فہرست مندرجات" کے بعد جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا مقدمہ ہے، جس میں اختصار مگر جامعیت کے ساتھ مخطوطات کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور اس سلسلے میں اب تک جو کوششیں ہوئی ہیں، ان کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ مقدمہ بہت سے معلومات کا حامل ہے۔ اس کے بعد "تعارف" کے عنوان سے دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کی مجلس منتظمہ کے چیئرمین لفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) خواجہ عبدالرشید نے زیر نظر "فہرست مخطوطات" کا تعارف کرایا ہے۔

فاضل مترتبین نے مخطوطات کی اس فہرست کا آغاز بعنوان "مصاحف" قرآن مجید سے کیا ہے۔ قلمی قرآن مجید کے یہ تین نسخے ہیں۔ اس کے بعد تراجم و تفاسیر ہیں، جن کے نو نسخے اس لائبریری کی زینت ہیں۔ پھر قرأت و تجوید سے متعلق تین قلمی کتابیں ہیں۔ بعد ازاں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ آٹھ قلمی کتابیں ہیں۔ پھر سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع کی کتابوں کا تذکرہ ہے، جن کی تعداد پانچ ہے۔ اس کے بعد تصوف کی انیس کتابیں ہیں۔

اوراد و وظائف کے بارے میں پانچ، اخلاق کے متعلق گیارہ، فقہ اور اصول فقہ کی اڑتیس، فلسفے کی تین،

علم کلام و عقائد کی چھ، منطق کی چار، علم نحو کی دس، علم صرف کی تین، لغت و بلاغت اور خطبہ جات کی پانچ، انشا و قواعد رسم الخط کی گیارہ، ادب کی تیس، تاریخ و تذکرہ کی سات، طب اور دیگر فنون کی چودہ، علم نجوم اور رمل کی پانچ، علم الانساب کی ایک ——— عربی، فارسی، اردو، پشتو اور پنجابی کی یہ کل دو سو قلمی کتابیں ہیں جو دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری میں موجود ہیں اور جن کا فہرست مخطوطات کی تیسری جلد میں خوبصورت انداز میں تعارف کرایا گیا ہے۔

آخر میں پہلے تو موضوع کی ترتیب سے تمام مخطوطات کے نام درج کیے گئے ہیں اور پھر حروف تہجی کی ترتیب سے تمام کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعد ازاں مؤلفین اور کاتبین کے نام درج کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد مرتبین حضرات نے جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، "کتابیات" کے عنوان سے ان کا ذکر کیا ہے اور یہ پچپن[۵۵] کتابیں ہیں پھر مخطوطات بہ لحاظ سنین، پھر اسمائے کتب، پھر اسمائے اماکن، اور آخر میں غلط نامہ۔

بہر حال "فہرست مخطوطات" ہر لحاظ سے مکمل اور شاندار ہے۔ محققین کے لیے یہ نہایت مفید چیز ہے۔ اس کی ترتیب و تحقیق پر بے ساختہ مولانا سید محمد متین ہاشمی اور حافظ غلام حسین کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی علمی خدمت ہے جو انھوں نے بہت محنت اور جاں فشانی سے سرانجام دی ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ ! محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علم فقہ سے کس طرح روشناس ہوا، یہاں کے علما و زعما نے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دور حکومت میں کتب فقہ مرتب کی گئیں، ان کے طریق حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس زمانے کے علمائے کرام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و ربط رکھتے تھے۔ پھر فقہ کی جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، ان کے اقتباسات بھی فاضل مصنف نے درج کتاب کیے ہیں۔ آخر میں فقہ کی ان مشہور اکیاسی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں، جن کو مسائل فقہ کے اصل مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے متعلق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔ صفحات ۴۰۱ قیمت: -/۱۵ روپے

ملنے کا پتا :- ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

علمی رسائل کے مضامین

البلاغ۔ کراچی۔ مارچ، اپریل ۱۹۸۰

مآثر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی	ڈاکٹر محمد عبدالحی
دار العلوم دیوبند نے کیا دیا؟	محمد اکبر شاہ بخاری
دار العلوم دیوبند — ایک مثالی درس گاہ	سید فضل الرحمٰن جعفری
دینی اداروں اور تحریکوں کے بارے میں ہمارا طرزِ عمل	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
لکھنؤ میں دو روز	پروفیسر محمد اسلم
نسبت — صوفیائے کرام کی اصطلاح میں	مولانا مفتی عبدالحکیم سکھروی
ابوبکر الخصّاف — تیسری صدی ہجری میں فقہ حنفی کے امام	سراج احمد فاروقی

ترجمان الحدیث۔ لاہور۔ اپریل ۱۹۸۰

حضرت مولانا شمس الحق عظیم آبادی	مولانا ارشاد الحق اثری
راہِ سعادت ترجمہ کتاب الزیارت	مولانا حافظ سیف الرحمٰن

ترجمان القرآن۔ لاہور۔ اپریل ۱۹۸۰

محدثِ قرطبہ بقیؒ بن مخلدؒ (مسلسل)	جناب طیب شاہین
مغربی تہذیب کا بحران (مسلسل)	جناب ریاض الحسن نوری

جامعہ۔ دہلی۔ مارچ ۱۹۸۰

مولانا محمد علی کے سیاسی افکار — ایک پہلو	پروفیسر علی اشرف
اردو کی کوزی آوازیں اور ان کا ارتقا	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ
نواب محسن الملک	محمد دست گیر خاں
رہ نوردِ شوق — ایک مکتوبی سفرنامہ	پروفیسر مشیر الحق
عابد صاحب پر سیمینار — ایک رپوتاژ	عبداللطیف الاعظمی

الجامعہ، جامعہ محمدی شریف۔ جھنگ۔ اپریل ۱۹۸۰

مقامِ ابوبکر رضی اللہ عنہ	غلام رسول سعیدی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سیاست دان و حکمران	جناب ریاض حسین
ابوالحسن امیر خسرو دہلوی	جناب ایم نذیر چیمہ ری

سب رس۔ کراچی۔ فروری، مارچ ۱۹۸۰

پروفیسر آغا حیدر حسن کا اسلوبِ بیان	سید بادشاہ حسین
مکتوباتِ امام ربانی	وارث سرہندی
مخدوم کی غزل گوئی	بلقیس جہاں
خطوطِ غالب کا تعزیتی اسلوب	ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی
ادیب کاکوی کی یاد میں	جناب فرید احمد

ناران۔ کراچی۔ جنوری، فروری ۱۹۸۰

خیر البشر کی سات صحابیات	طالب ہاشمی
سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ	نثار المصطفیٰ شیدائی
امام بخاریؒ	عبدالرشید عراقی

الفرقان۔ لکھنؤ۔ اپریل ۱۹۸۰

حکیم الامت مولانا تھانوی کی محفلِ ارشاد (مسلسل)	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی
مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی۔ چند یادیں	مولانا محمد منظور نعمانی
مرحوم و مغفور قاضی محمد عدیل عباسی	مولانا محمد منظور نعمانی

فکر و نظر۔ اسلام آباد۔ مارچ ۱۹۸۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاعی نظام	حافظ محمد یونس
سیرت نگار شبلی کی دینی شاعری	ڈاکٹر محمد ریاض
ترک اور اسلام	جناب ثروت صولت
امام ربانی کی تعلیماتِ تصوف	صاحبزادہ ساجد الرحمٰن

جون ۱۹۸۰

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

فون نمبر ۵۲۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۳ | رجب المرجب ۱۴۰۰ | جون ۱۹۸۰ | شمارہ ۶

ترتیب

تاثرات

نہایت افسوس ہے، شیخ محمد اشرف کم و بیش ۸۰ سال عمر پاکر ۹ مئی ۱۹۸۰ء کو رات کے نو بجے انتقال کر گئے۔

شیخ محمد اشرف برصغیر پاک و ہند میں اسلامی کتابوں کے مشہور ناشر تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں کشمیری بازار لاہور میں "شیخ محمد اشرف ناشر کتب" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ ابتدائی کام بالکل معمولی نوعیت کا تھا، شیخ صاحب اپنے اُس دور کے واقعات اور آغازِ کار کے حالات بڑے دلچسپ انداز میں سنایا کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ انھوں نے جو ترقی کی اور اپنے کام کو جس نہج سے آگے بڑھایا، وہ ان کی تاریخ کا ایک شاندار باب ہے۔

پوری اسلامی دنیا میں شیخ صاحب مرحوم کے ادارے کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کی طرف سے سیکڑوں کتابیں انگریزی میں شائع ہوئیں جو مغرب و مشرق میں پھیلیں اور اسلامی تعلیمات کے فروغ کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوئیں۔ علامہ عبداللہ یوسف علی کا قرآن مجید کا مع متنِ قرآن کے انگریزی ترجمہ شیخ صاحب کے ادارے نے شائع کیا، کتبِ حدیث میں سے صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مشکوٰۃ کا ترجمہ بھی شیخ صاحب کی کوشش سے معرضِ اشاعت میں آیا۔ علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و ارشادات کی وضاحت اور اسلام کے بہت سے گوشوں کی صراحت میں انھوں نے انگریزی میں اہم خدمات انجام دیں۔

انگریزی مطبوعات کے علاوہ شیخ صاحب نے اردو میں بھی بہت سے نامور علما و محققین کی متعدد عمدہ کتابیں شائع کیں۔ قرآن مجید کا اُردو ترجمہ جو حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی اور حضرت مولانا نواب وحید الزمان حیدرآبادی کے تراجم پر مشتمل ہے، مع ضروری حواشی کے طبع کیا اور بعض اہم عربی کتابوں کے اردو ترجمے بھی شائع کیے۔

بہر حال شیخ محمد اشرف نے اسلامی مباحث سے متعلق انگریزی اور اُردو میں کئی سو کتابیں شائع کیں اور ہر حلقے میں ان کو پہنچایا۔ نشر و اشاعت کے لحاظ سے وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ وہ ایک متحرک شخصیت تھے، محنت، جد و جہد اور کوشش ان کا طغرۂ امتیاز تھا۔ وہ اپنے افکار و خیالات، لباس اور وضع قطع میں چند خصوصیات کے حامل تھے، جن کو انھوں نے ہمیشہ قائم رکھا۔ وہ اگرچہ عمرِ طبعی کو پہنچ گئے تھے، لیکن نشر و اشاعت کے میدان میں جو خدمات انجام دے رہے تھے، اس کے پیشِ نظر ابھی ان کی بہت ضرورت تھی۔

اللھم اغفر لہ و ارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

اسلام اور تجارت

وسائلِ معیشت میں زراعت کے بعد دوسرا درجہ تجارت کا ہے جو اقتصادی نظام کا جزوِ اعظم ہے، اس لیے اسلام میں اس کی خاص طور سے ترغیب دی گئی ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ۔ (جمعہ: ۱۰)

جب نماز پوری ہو جائے تو زمین پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو۔

لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ ؕ (النساء: ۲۹)

آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن باہمی رضامندی سے تجارت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ۔ (البقرہ: ۲۶۷)

اے ایمان والو! تم خرچ کرو ان پاک چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

حتیٰ کہ حج کے موقع پر بھی تجارت کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا:

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ ؕ (البقرہ: ۱۹۸)

اس کا تمھیں کچھ گناہ نہیں کہ (حج کے دنوں میں بذریعہ تجارت) اپنے رب سے روزی حاصل کرو۔

اگر ہم تجارت کے متعلق احادیث نبویؐ پر نظر ڈالیں تو ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔ محدثین عظام اور فقہائے کرام نے خاص طور سے "باب التجارت" قائم کر کے اس بارے میں تمام احکام کی وضاحت کی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ "سچے اور امانت دار تاجروں کا حشر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔" ایک اور حدیث میں کپڑے کی تجارت کی ترغیب دیتے ہوئے اس کا نفسیاتی پہلو بھی بیان کر دیا ہے "کپڑے کی تجارت کرو کیوں کہ کپڑے کا تاجر چاہتا ہے کہ لوگ خوش حال اور فارغ البال رہیں۔"

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت فرمائی۔ حضرت خدیجہؓ کا مالِ تجارت لے کر گئے، فروخت کیا، جس میں کافی نفع ہوا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کپڑے کی تجارت

کی، بلکہ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد بھی جب صدیقِ اکبرؓ کپڑے کی گٹھری لے کر چلے تو حضرت فاروق اعظمؓ نے منع فرمایا اور پھر بیت المال سے وظیفہ مقرر ہوا۔ اسی طرح دوسرے خلفائے عظام اور صحابہ کرام نے تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش قرار دیا۔

قبل از اسلام

عرب میں اسلام سے قبل تجارت کی کیا حالت تھی، اس سلسلے میں طائف اور مکے وغیرہ کے حالات پیشِ نظر رکھنا ضروری ہیں۔ طائف کی وادی زرخیز تھی۔ تجارت میں گندم، منقٰی اور لکڑیاں نمایاں تھیں۔ یہاں کے لوگ عراق اور ایران سے تجارت کرتے تھے۔ طائف میں سود کا بھی رواج تھا۔ سرمایہ دار اور غریب طبقے کی کش مکش بھی شروع ہوگئی تھی۔ مکے میں ہاشم پہلے شخص ہیں جنھوں نے قریش کے لیے جاڑے اور گرمی کے موسموں کے دو سفر مقرر کیے اور ان سفروں کا ذکر قرآن کی سورہ ایلاف میں موجود ہے۔ غرض قریش تاجر لوگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مکے کے مہاجرین مدینہ منورہ پہنچے تو انھوں نے سب سے پہلے یہ پوچھا کہ بازار کہاں ہے۔ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی کاروبار کرتی تھیں۔ ابوجہل کی ماں عطر کا کاروبار کرتی تھی۔ حضرت خدیجہؓ کا تجارت کا کاروبار مشہور ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے بڑے کاروباری کارواں لے کر جاتے تھے۔ ہاشم نے تجارتی معاہدے کیے، پھر ان کے بھائیوں نے تجدید کی۔ مختلف قبائل سے مفاہمت کی کہ قریش کے تجارتی قافلے امن سے گزریں، اور یہ قافلے ان قبیلوں کے لیے ضروری سامان بہم پہنچاتے تھے۔ اس طرح قریشی تاجروں کو دو فائدے تھے۔ مدینے میں بھی تجارت ہوتی تھی۔ یہاں کی تجارت میں یہودیوں کا زیادہ ہاتھ تھا، بلکہ تجارت کے اعتبار سے حجاز میں یہودیوں کا ایک خاص مقام تھا۔

بعد از اسلام

اسلام نے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے فاسد اصولِ تجارت کو چھوڑ کر تجارت کے وہ اصول و طریق اختیار کیے جو انسانی معاشرے کے لیے مفید اور نافع ہوں۔ ان اصولوں کو اپنا کر مسلمانوں نے تجارت کو بڑی ترقی دی۔ ان کی اقتصادی حالت درست ہوئی اور فارغ البالی نصیب ہوئی۔ تجارت سے نہ صرف دنیوی فائدہ ہوا بلکہ تبلیغِ اسلام کا کام بھی باحسن وجوہ پورا ہوا۔ اس کا ثبوت چین، سماٹرا، جاوا، بورنیو، لنکا اور جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ہے کہ

تاجروں کے ذریعے سے ان علاقوں میں اسلام پہنچا اور پھیلا۔ تجارت فلاح و فارغ البالی کی ضامن ہے، انگریزوں کی مثال موجود ہے۔ اس تجارت کی بدولت ہی انگریزوں کو برصغیر پاک و ہند کی حکومت حاصل ہوئی۔

اسلام نے تجارت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے:
(۱) صحیح اصولِ تجارت (۲) فاسد اصولِ تجارت۔ اسلام صحیح اصولِ تجارت کا حامی ہے جو انسانیت اور معاشرے کے لیے فلاح و بہبود کا ذریعہ ہیں۔ فاسد اصولِ تجارت کی اسلام نہ صرف مخالفت کرتا ہے بلکہ ان کو بیخ و بن سے مٹا دینا چاہتا ہے، کیوں کہ فاسد اصولِ تجارت معاشرے میں غیر متوازی حقوق قائم کر کے معاشرے کی جڑیں کھوکھلی کرتے ہیں۔

بنیادی اصول

۱۔ چوں کہ تجارت کا انحصار باہمی تعاون پر ہے لہٰذا دونوں معاملہ داروں میں تعاون ہو اور ایک کو دوسرے کے نفع و نقصان کا خیال ہو اور گناہ و ظلم کا شائبہ نہ ہو۔
۲۔ طرفین کی پوری رضامندی ہو۔ اضطراری کیفیت کا اعتبار نہیں۔
۳۔ اہلِ معاملہ، معاملہ داری کی پوری پوری اہلیت رکھتے ہوں، عاقل، بالغ اور آزاد ہوں، بچے، مجنون اور مجبور نہ ہوں۔
۴۔ معاملے میں کسی قسم کے دھوکے، فریب، خیانت، ضرر، نقصان اور معصیت کا دخل نہ ہو۔

اسلام ان اصولوں کے ساتھ تجارت کی اجازت دیتا ہے اور فاسد اصولِ تجارت کی اس کے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔

فاسد اصول

۱۔ مال کی زیادتی اور حصول کا ایسا معاملہ جس میں باہمی تعاون قطعاً مفقود ہو۔ ایک کا نقصان اور دوسرے کا نفع ہو مثلاً جوا، لاٹری اور سٹے کے تمام اقسام ممنوع ہیں۔
۲۔ مالی نمو اور حصولِ نفع کا وہ معاملہ جس میں باہمی رضامندی پوری پوری اور حقیقی نہ ہو مثلاً سودی لین دین یا اجیر کی زیادہ محنت کی اجرت مجبوری سے فائدہ اٹھا کر کم دینا۔
۳۔ ایسا کاروبار جو اسلام کی نگاہ میں معصیت ہو۔ مثلاً شراب، مردار، اصنام اور خنزیر

وغیرہ کی بیع وشریٰ اوران اشیا کی خرید وفروخت جونجس وناپاک ہوں۔

۴۔ ایسے معاملات جن سے جانبین سے معاملہ ہونے کے باوجود جھگڑے کا اندیشہ ہو مثلاً قیمت وغیرہ میں ابہام یا مال کا بغیر دیکھے لے لینا وغیرہ۔

۵۔ ایسا معاملہ جس میں دھوکہ بازی ہو۔ درست چیز کا ذکر کرکے ناقص مال دے دینا یا کسی جگہ قحط پڑا ہو اور باہر سے مال آئے تو شہر کے باہر ہی کم قیمت پر خرید لینا۔

غرض اس قسم کے فاسد اصول اسلام کی نگاہ میں قابلِ قبول نہیں جن سے سماج اور معاشرے میں اصلاح کی بجائے خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اسلام ایک ایسے معاشرے کا حامی ہے جہاں مواسات، مساوات، ہمدردی اور باہمی اخوت ومحبت ہو، نہ کہ جاگیردار و سرمایہ دار کا گروہ ایک طرف ہو اور دوسری طرف مفلس وقلاش گروہ ہو اور معاشرے میں جھگڑا اور فساد پیدا ہو۔

اسلام تجارت کے سلسلے میں دو چیزوں کا خاص طور سے مخالف ہے۔

۱۔ اکتناز، دولت کے عظیم الشان ذخیرے افراد کے پاس ہوں۔ اسی لیے اسلام نے خیرات، زکوٰۃ اور صدقات کا سلسلہ مقرر کیا ہے۔

۲۔ احتکار، غلہ وغیرہ جمع کر لینا۔ احتکار کی دوسری قسم ضمار ہے۔ اس میں جوئے وغیرہ کی شکلیں آجاتی ہیں۔ آج احتکار و اکتناز سے تجارت ملوث ہے اور دنیا ایک کربِ عظیم میں مبتلا ہے۔ زمانۂ سابق میں اس کی مختلف صورتیں تھیں۔ احتکار کی سب سے ملعون قسم سودی لین دین ہے۔ اسلام میں ربوٰ کا مفہوم مہاجنی سود سے وسیع ہے۔ اسلام نے ان سب کی جڑ کاٹ دی ہے۔ آج کل ربوا اور سود میں تجارتی طور سے کوئی فرق نہیں ہے۔ بینک، ہنڈیاں، غرض سود کی لعنت ہر جگہ موجود ہے اور انسانی معاشرہ تمام برائیوں اور خرابیوں کا سرچشمہ بن گیا ہے اسلام باہمی امداد کا منکر نہیں ہے، اسلام میں اس کی پوری پوری گنجائش ہے کہ باہمی اصول پر اجتماعی کمپنیاں بنا کر تجارت کی جائے، مگر اس میں سود کا ذکر تک نہ ہو۔

تجارت کے تین طریقے ہیں:

۱۔ انفرادی

۲۔ اجتماعی

۲۔ مضاربت

پہلی صورت یہ ہے کہ انسان خود سرمایہ لگائے اور خود ہی محنت کرے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ چند اشخاص مل کر سرمایہ اور محنت کو استعمال میں لاکر تجارت کریں۔

تیسری صورت مضاربت کی ہے کہ ایک شخص روپیہ لگائے اور دوسرا محنت کرے اور نفع جس نسبت سے طے ہو جائے وہ تقسیم کرلیا جائے۔

مشترکہ تجارت چار طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ اس کو اسلام نے چار مختلف ناموں سے واضح کیا ہے اور چاروں اپنی نوعیت کے اعتبار سے جداگانہ ہیں۔ (۱) شرکت المفاوضہ (۲) شرکت العنان۔ (۳) شرکت الوجوہ (۴) شرکت الصنائع۔

شرکت المفاوضہ

مفاوضہ کے معنی ہیں ایک دوسرے کو سونپ دینا۔ اس میں ہر حصے دار اپنا سرمایہ ایک دوسرے کو سونپ دیتا ہے۔ اس میں کل شرکا مساوی روپیہ یا زر لگا کر شریک ہوتے ہیں اور صرف زر میں شرکت ہو سکتی ہے، سامان میں نہیں۔

شرکت المفاوضہ کے لیے صرف دو شرطیں ہیں۔ پہلی شرط اس معاہدے کو متعین کرتی ہے۔ شرکا میں سے ہر ایک لفظ مفاوضہ یا اس کے ہم معنی لفظ ضرور استعمال کرے، جس کا ہماری زبان میں یوں ترجمہ کیا جائے گا کہ فلاں اور فلاں کے درمیان مساویہ شرکت کا معاہدہ ہے۔

دوسری شرط مساوات سے پیدا ہوتی ہے، لہٰذا یہ ضروری رکھا گیا ہے کہ اس شرکت کے تمام شرکا کی حیثیت مساوی ہو، جس کی تفصیل یہ ہے کہ دونوں کا سرمایہ، دونوں کے اختیارات اور دونوں کے تصرف کی صورتیں بالکل مساوی ہوں۔ لہٰذا یہ معاہدہ ایک بالغ اور بچے کے درمیان، ایک آزاد اور غلام کے درمیان نہیں ہو سکتا (بچے کی طرف سے اس کا ولی معاہدہ کر سکتا ہے)۔ اگر سرمایہ کم اور زیادہ ہوگا تو وہ شرکت تو ہوگی مگر شرکت المفاوضہ نہیں ہوگی۔

وکالت اور کفالت

اختیارات اور ذمہ داریاں

وکالت کے معنی ہیں اختیارات ذمہ داری اور جواب دہی کو دوسرے کے سپرد کر دینا، کفالت

کے معنی ہیں ایک شخص کی ذمہ داری کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو بھی شریک کر دینا (اصل معنی ہیں جوڑنا اور قوت پہنچانا)۔

اس معاہدے کی رُو سے ہر شریک اپنے ساتھی کا وکیل ہوتا ہے، اس لیے ہر ایک شریک دوسرے کی جانب سے مال فروخت کرنے، خریدنے، قرض دینے اور امانت رکھوانے کا مستحق ہے اور حق رکھتا ہے۔ اس طرح ہر شریک اپنے ساتھی کا کفیل بھی ہوتا ہے۔ یعنی ہر وہ معاملہ جو ایک شریک کرتا ہے، ذمہ داری اس کے ساتھی پر بھی آتی ہے۔

شرکت العنان

اس شرکت میں جتنے شرکا ہوتے ہیں وہ سب سرمایہ یا سامان سے شریک ہوتے ہیں، لیکن سرمایہ کا مساوی ہونا یا نفع، اختیارات اور تصرف کا مساوی ہونا اس شرکت میں ضروری نہیں ہے۔

شرائط ۱۔ شرکت العنان کی پہلی شرط ایک منفی (انکاری) شرط ہے جس کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اگر یہ شرط ذکر نہیں کی جاتی ہے تو خود اس معاہدے کی نوعیت متعین نہیں ہو سکتی، کیوں کہ شرکت العنان کے معنی ہیں وہ شرکت جس میں سرمایہ، نفع اور اختیارات وغیرہ برابر نہ ہوں۔

۱۔ اس شرکت میں شرکا کے سرمائے کا مساوی ہونا ضروری نہیں۔

۲۔ جس طرح اس میں سرمائے کی برابری غیر ضروری ہے اسی طرح نفع کی برابری بھی غیر ضروری ہے، بلکہ اس شرکت میں یہ بات بالکل جائز ہے کہ تھوڑے سرمائے والا شریک زیادہ سرمائے والے شریک کے مقابلے میں زیادہ نفع کا مستحق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تھوڑا سرمایہ لگا کر شریک ہونے والا کاروباری تجربے کے اعتبار سے زیادہ سرمائے والے شریک کے مقابلے میں ممتاز ہو اور نفع کا حاصل ہونا اس کی تجربہ کارانہ تدبیروں کا نتیجہ ہو۔

۳۔ چوں کہ شرکت العنان میں مساوات کی شرط نہیں ہے، اس لیے یہ معاہدہ بالغ اور بچوں کے درمیان یا آزاد اور غلام کے درمیان ہو سکتا ہے بشرطیکہ غلام کو اس کا آقا اجازت دے دے۔

ذمہ داریاں اور اختیارات ۱۔ اس معاہدے میں ہر شریک، دوسرے کا صرف وکیل ہوتا ہے، کفیل نہیں بنتا، ہر ایک شریک مالی شرکت کو بیچنے اور خریدنے کا حق رکھتا ہے لیکن کسی شریک کو مالی شرکت میں قرض دینے کا حق نہیں ہے اور اگر کسی شریک نے دوسرے شرکا کی اجازت کے بغیر

کوئی قرض لیا ہے تو اس کی ذمے داری صرف اسی شخص پر ہوتی ہے، دوسرے شرکا پر نہیں ہوتی ہے۔

شرکت الوجوہ

وہ شرکت ہے جس میں شرکا میں سے کسی کا بھی زر نہ ہو بلکہ سب کی محنت ہو اور اس شرکت میں باہمی اعتماد پر کام کیا جاتا ہے، گویا چند اشخاص کا محض اپنی ساکھ کی بنا پر بغیر کسی سرمائے کے تجارتی کاروبار میں شریک ہو جاتا ہے۔ شرکت الوجوہ کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ ہر شریک نفع نقصان میں برابر کا حصے دار ہو۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

شرکت الصنائع

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ چند کاری گر عملِ پیدائش کو انجام دیں۔ شرکت الصنائع کے بارے میں امام شافعی کا اختلاف ہے، وہ اس کو درست نہیں سمجھتے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حصولِ منفعت کے لیے سرمایہ کا ہونا ضروری ہے، صرف محنت بدوں سرمایہ پیدائش کا ذریعہ نہیں بن سکتی، لیکن ان کے علاوہ دوسرے ائمہ نے اس کو جائز تصور کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک تو اس میں اتنی وسعت ہے کہ دو مختلف ہنر یا پیشے والے جیسے درزی اور رنگریز چاہیں تو مل کر شرکت کا معاملہ کر سکتے ہیں یعنی جسے جو کام آتا ہے وہ انجام دے گا اور کمپنی کو جو نفع ہوگا وہ تقسیم کر لیا جائے گا۔

ان ائمہ کی پہلی اور بنیادی دلیل یہ ہے کہ عہدِ نبویؐ میں عبداللہ ابنِ مسعود اور سعد اس قسم کی شرکت کا معاہدہ کر چکے ہیں (غزوۂ بدر کے موقع پر ہتھیار بنانے کی صنعت میں شرکت کی تھی) اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا، لہٰذا اس کا جائز ہونا منشائے نبوی کے مطابق ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ محنت بھی ایک نوع کا سرمایہ ہے۔ امام سرخسی نے "المبسوط" میں محنت کو سرمایہ اور راس المال قرار دیا ہے۔ "راس مالھما صنعتھما" کے الفاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شرکت الصنائع میں شرکت الوجوہ کی طرح نفع و نقصان میں برابری ضروری نہیں بلکہ کاری گر اپنی محنت اور کاری گری کی حیثیت کے اعتبار سے باہم جس معاہدے پر رضامند ہو جائیں وہ قابلِ قبول ہوگا۔

امام مالک اور ان کے شاگردوں نے "المدونۃ الکبریٰ" نامی کتاب میں اس شرکت کی اور بہت

سی قسمیں ذکر کی ہیں، مثلاً طبّی شرکت کہ چند معالج مل کر ایک اسپتال قائم کریں، تعلیمی شرکت کہ چند اساتذہ مل کر ایک تعلیمی ادارہ قائم کریں، زرعی شرکت (مشترکہ کاشت)۔ المدونۃ الکبریٰ میں ان تمام صورتوں کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

شرکت کی بحث ختم کرتے ہوئے امام سرخسی کی نقل کردہ ایک شرط کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ شرکت کے معاہدے کی تکمیل کے لیے چاہے وہ کسی قسم کی شرکت ہو، دستاویز لکھی جانی ضروری ہے کیوں کہ یہ معاہدہ ایک مقررہ میعاد کے لیے ہوا کرتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ (البقرہ: ۲۸۲)

اے ایمان والو! جب تم ایک مقرر مدت تک کے لیے ادھار کا معاملہ کرنے لگو تو اسے لکھ لیا کرو۔

امام سرخسی اس آیت کے پیش نظر کہتے ہیں کہ شرکت کا معاہدہ بھی چوں کہ ایک مدت تک کے لیے ہے اس لیے اس کا لکھ لینا ضروری ہے۔ اس گفتگو کے بعد انھوں نے معاہدے کے فارم کا ایک نمونہ بھی پیش کیا ہے جس میں امور ذیل کی صراحت ضروری سمجھی ہے۔

۱۔ تاریخِ معاہدہ

۲۔ شرکا کا نام

۳۔ مدتِ معاہدہ

۴۔ سرمائے کی تعداد

(شرکت الصنائع یا شرکت الوجوہ میں شے کی وضاحت کرنا)

اور اس بات کی صراحت کہ یہ سرمایہ شرکا کے قبضے میں فلاں مدت تک موجود ہے۔

مضاربت یا قراض

مضاربت اس کو کہتے ہیں کہ ایک شخص روپیہ لگائے اور دوسرا شخص محنت کرے اور نفع جس نسبت سے طے ہو جائے، وہ تقسیم کر لیا جائے۔ اسے شرکتِ مضاربت یا قراض اس لیے کہتے ہیں کہ قراض کے معنی ہیں سفر کرنا اور چوں کہ ایک شخص یعنی رب المال صرف روپیہ لگا کر سب ذمہ داریوں سے بری ہو جاتا ہے اور دوسرا شخص پوری محنت کرتا ہے یا قراض کے معنی ہیں قرضہ دینے کے، چوں کہ یہ ایک قسم کا احسان ہوتا ہے جو ایک شخص پر دوسرا شخص کرتا ہے۔

ایک شخص دوسرے کو اپنا روپیہ دیتا ہے تاکہ وہ اس کو اپنی تجارت میں لگائے۔ اس لیے اس کو قراض بھی کہتے ہیں۔

مضاربت پر بحث کرنے کے لیے درج ذیل چار چیزیں زیر غور ہیں :-

(۱) سرمایہ

(۲) سرمایہ دار

(۳) محنت

(۴) نفع

۱۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ مضاربت صرف زرہی میں ہوسکتی ہے سامان میں نہیں، اور اس پر کل فقہا متفق ہیں، سوائے قاضی ابن ابی لیلیٰ کے، ان کا کہنا ہے کہ مضاربت سامان میں بھی ہوسکتی ہے جب کہ قیمتِ خرید مقرر کر دے۔ لیکن چوں کہ سامان کی صورت میں، رب المال اور مضروب کے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے، اس لیے تمام فقہا اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

۲۔ رب المال، تمام سرمایہ مضروب کو اس طرح سپرد کردے کہ اس کا کوئی قبضہ اس پر نہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ اس امر کا بھی مجاز نہ ہو کہ بغیر مضروب کی خواہش کے اس کو کسی معاملے میں مشورہ دے، البتہ اگر مضروب کسی مشورے کا خواہش مند ہے تو وہ اسے مشورہ دے سکتا ہے۔

۳۔ عامل یا مضروب کے لیے سب سے ضروری اور پہلی چیز یہ ہے کہ وہ ان تمام شرائط کی پوری طرح پابندی کرے جو رب المال اور اس کے درمیان طے پائی ہیں اور یہاں تک کہ اگر اس شرط میں کسی خاص مقام پر اور کسی خاص شے کی تجارت کرنے کا ذکر ہے تو مضروب کو چاہیے کہ ان شرائط کے مطابق عمل کرے۔

۴۔ حصولِ نفع کی بھی تمام شرطیں اس طرح پر طے ہوں کہ کل حاصل شدہ نفع کا اس قدر فی صد رب المال کا اور اس قدر فی صد مضروب کا ہے۔ سہام یعنی مقدار کی شکل درست نہیں، مثلاً یہ کہ رب المال پانچ سو روپیہ نفع لے اور باقی مضروب لے، یا مضروب سے پانچ سو روپے اور باقی رب المال کے بلکہ شرح فی صد مقرر ہو، جس کی صورت میں رب المال اور مضروب کے درمیان نفع تقسیم ہوا کرے۔

وضاحت

اگر مضروب بسلسلہ تجارت سفر کرتا ہے تو سفر کے اخراجات راس المال میں شمار کیے جائیں گے نہ کہ نفع میں، اور نفع وہ خالص آمدنی ہے جیسا کہ نفع کی نوعیت اور لغوی معنی سے ظاہر ہے، گویا نفع وہ خالص آمدنی ہوگی جس میں کسی قسم کی کوئی دوسری چیز شامل نہ ہو سوائے اس روپیہ کے جو اخراجات کے بعد بطور اضافہ حاصل ہوا ہے۔

مضاربت کا طریقہ عرب میں اسلام سے پہلے رائج تھا اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے قبل عادل کی حیثیت سے یہ معاملہ کیا ہے۔ اسلام چوں کہ ہر مفید معاملے کو جائز شکل میں باقی رکھنے کا حامی ہے اس لیے نبوت کے بعد بھی صحابہ کرام مضاربت کرتے رہے اور حضورؐ نے بجائے منع فرمانے کے اس کی ہمت افزائی فرمائی۔

برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ :- از محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر سلطان اورنگ زیب عالمگیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علم فقہ سے کس طرح روشناس ہوا، یہاں کے علما و زعما نے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دورِ حکومت میں کتبِ فقہ مرتب کی گئیں، ان کے عہد اور طریق حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس زمانے کے علمائے کرام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و ربط رکھتے تھے۔ پھر فقہ کی جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، ان کے اہم اقتباسات بھی فاضل مصنف نے درج کتاب کیے ہیں۔ آخر میں فقہ کی ان مشہور اکیاسی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں اور جن کو مسائلِ فقہ کے اصل ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے متعلق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

صفحات : ۴۰۸ قیمت : -/۱۵ روپے

ملنے کا پتا :- ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

پروفیسر محمد صدیق

اُردو کے خوش نویس شعرا

شاعری اور خوش نویسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس طرح شاعر خیالات کو منظم الفاظ کا جامہ پہنا کر خیالات میں روانی پیدا کرتا ہے، بالکل اسی طرح ایک خطاط اپنے مزاج، اپنے طبعی رجحان اور فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر منتشر حروف کو خوش نما لباس میں ملبوس کرتا ہے جس سے شاعر اور خطاط کے ہم رنگ ہونے کا احتمال ہونے لگتا ہے۔

زمانۂ قدیم میں ہر شاعر خوش نویس اور تقریباً ہر خوش نویس شاعر ہوتا تھا۔ اگرچہ آج زمانے کی بے قدری نے اس ہم آہنگی کو بڑا ضعف پہنچایا ہے، لیکن آج بھی تلاش کریں تو ایسی مثالیں مل جائیں گی۔

یہ مقالہ ہمارے اسی خیال کی ترجمانی کرتا ہے، بلکہ ہمارے ذوق اور وجدان کی ایک آواز ہے جسے الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خطاط شعرا کے اس تذکرے کی ترتیب اُردو شعرا کے معروف اور ضخیم تذکرہ "خم خانۂ جاوید" کے بالاستیعاب مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ "خم خانۂ جاوید" میں ہر شاعر کے کلام کے منتخب اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ ہم نے ان اشعار میں سے صرف دو یا تین کا انتخاب کیا ہے، مگر قارئین کی اطلاع کے لیے "خم خانۂ جاوید" میں دیئے گئے کُل اشعار کی تعداد کو شاعر کے حالات کے اختتام کے فوراً بعد درج کر دیا گیا ہے۔ مثلاً خم خانۂ جاوید میں مرزا احسن علی احسن کے اشعار کی تعداد ۱۹ دی گئی ہے۔ لیکن ہم نے صرف دو شعر منتخب کیے ہیں۔ احسن کے حالاتِ زندگی کے اختتام پر قوسین پر ۱۹ لکھ دیا گیا ہے۔

لالہ سری رام

لالہ سری رام کا سلسلۂ نسب شہنشاہِ ہندوستان اکبرِ اعظم کے وزیر راجہ ٹوڈرمل تک پہنچتا ہے۔ لالہ جی ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام رائے بہادر مدن گوپال تھا۔ وہ ایم۔ اے، بار ایٹ لا تھے۔ ان کا شمار لاہور اور دہلی کے ممتاز وکلا میں ہوتا تھا۔ لالہ جی

نے دہلی اور لاہور میں تعلیم پانے کے بعد ۱۸۹۵ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم۔اے انگریزی کیا۔ تھوڑے عرصے بعد آپ کو جج بنا دیا گیا، مگر ۱۹۰۴ء میں ادبی مصروفیات کی بنا پر ان کو یہ نوکری چھوڑنا پڑی۔

لالہ جی فراخ دل، وسیع المشرب، ملنسار اور با اخلاق شخصیت کے مالک تھے۔ شاعر نہیں تھے، مگر بہترین سخن فہم، سخن شناس اور شاعر نواز تھے۔ "زمانہ" اور "مخزن" کے ابتدائی ادوار میں لالہ جی کے کئی ادبی اور تنقیدی مضامین شائع ہوئے۔

لالہ جی کی لائبریری ادب اور آرٹ کی حسین گیلری تھی۔ لالہ جی کی لائبریری میں فارسی، عربی، اردو اور ہندی کی نادر، کم یاب اور نایاب کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ نہ صرف کتب بلکہ قلمی تصاویر، خطاطی کے بہترین نمونے، پرانے شاہی فرامین اور مسودات بھی خاصی تعداد میں ان کے کتب خانے کی زینت تھے۔ ان کی موت کے چند سال بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کا یہ نادر ذخیرہ بنارس یونیورسٹی کو تحفتاً دے دیا گیا تھا۔

لالہ جی کا عظیم کارنامہ "تذکرہ ہزار داستان" یعنی "خم خانۂ جاوید" ہے۔ یہ معروف تذکرہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس تذکرے کی چار جلدیں تو لالہ جی کی زندگی ہی میں شائع ہو گئی تھیں، مگر پانچویں جلد کو ان کے بہترین دوست اور رفیق پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے مرتب کر کے چھپوایا۔ لاجی نے ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء میں اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔

آرام

آرام، رائے پریم ناتھ، کھتری، دہلی کے قدیم رؤسا میں تھے۔ ان کے بزرگ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں سرکاری ملازم تھے اور یہ خود بھی صاحبِ اقتدار تھے۔ آخر عمر میں تارک الدنیا ہو کر بندرابن (متھرا) میں جا بسے تھے۔ تیر اندازی اور خوش نویسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ دو ہزار شعر کا ایک دیوان یادگار زمانہ ہے۔ ان کے کلام میں کسی قسم کی جدت اور بلند پروازی نہیں پائی جاتی۔ البتہ کلام کی موزونی اور زبان کی سادگی میں کچھ شبہ نہیں:

خون آنکھوں سے نکلتا ہی رہا　　　دل کا فوارہ اچھلتا ہی رہا

کون غم خواری کرے آرام کی ایک مجنوں تھا سو جلتا ہی رہا

آغا

آغا، مرزا آغا جان عرف آغا صاحب، دہلی کے باشندے تھے۔ اصل میں عیسائی تھے، مگر اپنے استاد سید محمد امیر پنجہ کش کی ہدایت و تلقین سے مسلمان ہو گئے تھے۔ خوش نویسی میں ایسی مشق بہم پہنچائی تھی کہ سید محمد امیر پنجہ کش کے شاگردوں میں ان سے بہتر کوئی نہ تھا۔ اخیر دم تک ریاست الور میں ملازم رہے۔ ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت میں یہ دونوں استاد شاگرد گوروں کے ہاتھ سے گولیاں کھا کر راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ کچھ عرصہ ریاست جھجر میں بھی ملازم رہے تھے۔ وہاں نواب صاحب نے ایک لاکھ روپیہ کے صرف سے ایک نہایت بیش بہا اور قابلِ قدر گلستان ان سے لکھوائی۔ پھر الور میں ملازم ہو کر ویسی ہی دوسری گلستان لکھی۔ یہ دونوں نسخے خوش خطی اور خوبیِ نقش و نگار کے باعث عدیم النظیر ہیں۔ جھجر والی گلستان مہاراجہ منگل سنگھ والیِ الور نے خرید کر دورانِ سیاحتِ پنجاب میں ۱۸۸۰ء میں مہاراجہ راجندر سنگھ والیِ پٹیالہ کو بطور ہدیہ دے دی تھی۔ دوسرا نسخہ اب تک الور کے کتب خانے کی زینت ہے۔ اس پر متعدد نمائشوں میں تمغہ بھی ملا ـــ آغا صاحب گاہے گاہے فکرِ سخن بھی کرتے تھے۔ دو شعر بطور یادگار درج تذکرہ کیے جاتے ہیں۔

کوئی دارا، کوئی جم اور کوئی اسکندر ہوا داغ سر اپنا ہمیں نامِ خدا افسر ہوا
سرخ ہے موباف قاتل آج دیکھا چاہیے قصد اس قاتل کا اب ہے کس کے خون پر ہوا

احسن

احسن، مرزا احسن علی، ان کے نام میں کچھ اختلاف ہے۔ قاسم نے اپنے تذکرے میں احسن قلی لکھا ہے۔ مرزا علی لطف اور صفیر بلگرامی نے اپنے تذکروں میں صرف مرزا احسن نامی خوش نویس تھے۔ پہلے میر ضیاء الدین ضیاؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ پھر مرزا رفیع السودا کو استاد بنایا۔ لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کی سرکار میں بہ زمرۂ شعرا داخل ہوئے۔ مصحفی نے اپنے تذکروں میں لکھا ہے کہ اس شاعر کے اشعار ظرافت آمیز ہوتے تھے اور یہ شخص پہلے خواجہ محمد یونس خاں کی خدمت میں رہا، بعد ازاں نواب آصف الدولہ مرحوم کے ہاں چلا آیا۔ ۱۲۱۵ھ میں کئی برس سے

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں کی رفاقت میں ایام زندگی بسر کرتے تھے۔ انھوں نے فنِ نظم میں اور فنون سے زیادہ نام پیدا کیا۔ بہرحال حضرت احسن صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کے کلام میں لطافت و فصاحت دونوں مزے ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو : (۱۹)

اسی لیے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسن ___ گھڑی گھڑی مرے پاؤں کو چشمِ تر نہ لگا
سجدہ گہ ہے، خاکِ احسن اب تو ساری خلق کی ___ جان دی تھی اس نے کس کے حسرت پاؤں میں

احسن

احسن، حکیم منظر حسن خان ولد حکیم محمد مجتبیٰ خان باشندہ رام پور۔ خط نستعلیق میں کامل اور ہفت قلم ہیں۔ فن سخن میں منشی مظفر علی اسیر سے استفادہ کیا ہے۔ ابتدائے شوق میں مرزا غالب کو بھی چند غزلیں دکھائی تھیں۔ طب میں قرابادین مختصر تحریر فرمائی اور عروضِ سیفی کا اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ۱۸۸۶ء میں ایک رسالہ موسوم بہ خورشید افق بھی جاری کیا تھا۔ تذکرہ انتخاب یادگار مولفہ امیر مینائی مرحوم کی ترتیب کے وقت ان کی عمر چھبیس برس کی تھی۔ کلام حاضر ہے: (۱۲)

اتنا تو میرے عشق نے آخر اثر کیا ___ مضطر ہوں میں یہاں وہ وہاں بے قرار ہے
کبھی زندہ کبھی مردہ ہیں جب سے تیری فرقت ہے ___ قیامت ایک سنتے تھے یہاں ہر دم قیامت ہے

ادیب

مولوی سیف الحق مرحوم ادیب دہلوی ابن مولوی محمد احسان الحق مغفور خلف الصدق مفتی محمد اکرام الدین خان بہادر صدر امین (سب جج) دہلی — شاہ عبدالحق محدث کی اولاد، اہلِ اسلام کے ایک نامی گرامی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ دو سو برس سے زیادہ گزرے، شیخ الاجل شاہ عبدالحق کے اسلاف نے علم و عمل، رشد و ارشاد کے شوق میں وطن قدیم بخارا کو خیر باد کہہ کر دہلی میں طرحِ اقامت ڈالی۔ اور علومِ حدیث کی اشاعت سے اپنے مذہب اور قوم کو مستفیض کیا۔ شاہ صاحب کا مزار سرزمینِ مہرولی معروف بہ قطب صاحب میں کنار حوضِ شمسی واقع ہے۔

مشہور ہے کہ عموماً اس خاندان کے بچے جاہل نہیں ہوتے۔ چنانچہ محدث علیہ الرحمہ کے ڈھائی سو برس بعد سیف الحق ۱۸۴۶ء میں بمقام دہلی محلہ مفتی صاحب پیدا ہوئے۔ خاندانی تربیت تو تھی ہی مگر باعث صد حیرت اور استعجاب یہ امر ہے کہ مکتب اور سرکاری مدرسے میں صرف

معمولی عربی، فارسی اور برائے نام انگریزی تعلیم پائی، جس کی معراج مڈل کے درجے تک تھی۔ ادیب کی اچھوتی اور ہونہار طبیعت نے وہ قابلیت و استعداد فراہم کرلی کہ اچھے اچھوں کی ٹکر جھیلنے لگے اور لڑکپن ہی میں قابلِ امتثال لیاقت حاصل کرلی۔ شعر و سخن کا شوق بچپن سے رفیق تھا۔ خود بھی شکیل و وضعدار تھے اور حسن پرستی کا مادہ ازل سے ان کے خمیر میں ودیعت ہوا تھا۔ شروع میں مرزا یوسف علی خاں عزیز شاگرد مرزا غالب سے تلمذ اختیار کیا اور کئی برس تک ان کی روش پر کہتے رہے۔ ایک دفعہ کسی مشاعرے میں غزل پڑھی جس کا مطلع یہ ہے:

لے جاؤ میرے سینے سے ناوک نکال کے ۔۔۔ پر دل نکل نہ آئے کہیں دیکھ بھال کے

سنا ہے کہ مرزا غالب بھی موجود تھے۔ پاس بلا کر پیار کیا اور فرمایا کہ "میاں سیفو۔ ہمارے پاس آیا کرو، آج سے تم ہمیں بتائیں گے۔" مرزا غالب کی توجہ سے اور ہی رنگ پیدا ہوگیا۔ جب روزگار کی ضرورت پڑی تو کچھ دن عدالت منصفی میں نائب ناظر رہے لیکن انشا پردازی کی خداداد قابلیت نے سرکاری خدمت کی قیود کا پابند رہنا گوارا نہ کیا، اس لیے اخباری دنیا میں قدم رکھا۔ "میوگزٹ" نامی ایک پرچہ نکالا جو کچھ دنوں بڑی دھوم سے چلا۔ اس میں اعلیٰ درجے کے شاعرانہ مضامین اور غزلیات شائع کرتے رہے۔ پھر جب یہ پرچہ بند ہوگیا تو مختلف اخباروں کو اپنے مضامین نظم و نثر سے معقول امداد دیتے رہے۔ اس اثنا میں انجمن تصور کے سکرٹری ہوکر وہاں چلے گئے اور انجمن مذکور کا رسالہ بڑی کامیابی سے چلاتے رہے۔ جب وہاں سے جی اوچاٹ ہوا تو لاہور آکر کچھ دن سررشتۂ تعلیم میں ملازم رہے۔ پھر کچھ عرصہ "کوہ نور" کے اڈیٹر رہے۔ اکثر اخبارات میں علمی مباحثوں میں حصہ لے کر اس زمانے کے نامی فاضلوں، شاعروں اور لیڈروں سے اُلجھ پڑے۔ نازک مزاجی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ "رفیق ہند" کے بعض مضامین سے ناراض ہوکر اس کے جواب میں "شفیق ہند" نامی پرچہ لاہور سے جاری کیا، جس کے ساتھ "نسیم صبح" اور "شام وصال" کے نام سے دو ضمیمے بھی نکلتے تھے۔ ان پرچوں کا ایک ایک فقرہ شوخی سے بھرا ہوا اور مذاق میں ڈوبا ہوتا تھا۔ الغرض پنجاب میں آپ نے اچھی شہرت حاصل کرلی اور نامور لیڈر آپ کی قابلیت کا لوہا مان گئے۔ آپ کی طبیعت میں غضب کا استحضار تھا، وقت پر سوجھتی تھی اور خوب سوجھتی تھی۔ غالب کے تلمذ نے آپ کے کلام میں ایک عجیب شان پیدا کردی، وہ یہ کہ مومن اور غالب کے رنگ کلام کو

ہوکر جدت پسندی سے ایک ایسا دلچسپ اور پسندیدہ رنگ اختیار کیا جس میں فصاحت و بلاغت، شوکت لفظی، مناسبت شعری اور نازک خیالی سب اپنی اپنی جگہ جداگانہ شان دکھاتی تھیں۔ اردو فارسی دونوں زبانوں کا کلام نہایت آب دار و بلند پایہ ہے، مگر ان کے فطرتی استغنا سے بہت سا حصہ تلف ہوگیا اور جو کچھ بچ رہا وہ بھی نایاب ہے اور چھپنے کی توقع نہیں۔ بڑی مشکل سے تھوڑا سا کلام ہمارے ہاتھ لگا ہے۔ نثر کا بھی کافی ذخیرہ آپ سے یادگار ہے۔ تاریخ گوئی میں اپنا نظیر ہی نہ رکھتے تھے۔ بات بات میں مادۂ تاریخ نکال لیتے تھے۔ اکثر تاریخی فقرے بولتے تھے۔ ہزاروں قطعات، بیسیوں عرضیاں اور خطوطِ تاریخی، جن کے ہر دل آویز فقرے سے سن و سال نکلتا تھا، لکھ ڈالیں۔ چنانچہ حضور نظامِ دکن کے ولی عہد کی پیدائش پر ان کے تاریخی نام اور قصیدے، قطعے اس کثرت اور عمدگی سے لکھے کہ دھوم مچ گئی۔ عجیب ترین قصہ ان کی برجستہ تاریخ گوئی کا یہ ہے کہ ۱۳۰۲ھ میں ان کے بھائی مولوی محمد انوار الحق میر منشی راجستان نے اپنی بیٹی کی شادی کی، وقتِ وداع سامانِ جہیز کی فہرست لکھنے کی خدمت ان کے سپرد ہوئی، چنانچہ فہرست جو بڑی لمبی تھی مع عنوان بقیہ نام جنس تمام و کمال تاریخی ہے۔ ہر شے کے ساتھ ایسے موزوں اور مناسب الفاظ ملائے ہیں کہ ہر جملے میں تاریخ موجود ہے۔ فصیح البیانی کے ساتھ ساتھ صحتِ لفظی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ طبیعت میں تحقیقات کا مرض، اس پر اپنی مادری ٹکسالی اردو میں اختراعوں کا شوق جس کی مناسبت اور دل فریبی زبان اور قلم سے نکلتے ہی قبولیتِ عامہ کا مرتبہ حاصل کر لیتی تھی۔ مختلف جلسوں اور قومی کانفرنسوں میں وقتاً فوقتاً لکچر بھی دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے چھوٹی ہی عمر میں اپنی لیاقت اور ذکاوت سے ہندوستان میں اچھا نام پیدا کر لیا تھا۔ آخر اسی شہرت کی بدولت سرکار آصفیہ حیدر آباد دکن میں بمشاہرہ چار سو پچاس روپیہ گورنمنٹ رپورٹر کے معزز عہدے پر ممتاز ہوئے۔ دکن میں سات آٹھ ہی برس کی ملازمت میں ایسا رسوخ پیدا کر لیا کہ صدہا کے رشک و حسد کا باعث تھا۔ حضرت داغؔ مرحوم جب پہلی مرتبہ دکن تشریف لے گئے تو آپ ہی کے مکان پر عرصہ تک فروکش رہے۔ پھر جب دہلی واپس چلے آئے تو دوبارہ آپ ہی کی تحریک سے عازمِ دکن ہوئے تھے، اور ان کے تقرر میں بہت کچھ آپ کی مساعی جمیلہ کا دخل تھا۔ نوک جھونک کی عادت ایسی تھی کہ کسی سے چوکتے نہ تھے۔ امیرؔ، ارشدؔ دہلوی، مرزا داغؔ، راسخؔ، مولانا شوکتؔ،

احسن سے مزے دار چونچلیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے مولوی عبدالرحمٰن راسخ ساکن بت نے غالب کی طرز میں غزل لکھی جس کے مقطع میں غالب مرحوم پر منہ آگئے۔

کہیں چھپ چھپ کے مے پیتے ہیں شاید حضرت راسخ ترے اشعار بھی غالب کی ٹکر ہوتے جاتے ہیں

پھر کیا تھا ادیب نے میاں ملنگ سبزی فروش سے اسی زمین میں غزل پڑھوائی جس کا ایک شعر یہ ہے:

عجب جھم جھم کا مضمون ہے کہیں بس اپنے دعوے میں بت والے بھی اب غالب کی ٹکر ہوتے جاتے ہیں

مختصر یہ کہ ادیب مرحوم خوبرو، خوش وضع، رنگین طبع، نازک خیال، خوش تقریر، خوش تحریر آدمی تھے۔ خوش نویسی میں بھی اچھا ملکہ تھا۔ مزاج میں لاپروائی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ کے دریائے معیشت میں اکثر جزر و مد کا عالم رہتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کو دق کا مرض، جس میں ان کا انتقال ہوا، زیادتیِ فکرِ سخن کی بدولت ہوا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ شراب کی زیادتی اس مرضِ مہلک کا باعث ہوئی۔ آخرکار علوم الشیائی کا یہ زبردست ادیب و ماہر جو فنِ عروض میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا، ۴۵ برس کی عمر میں جون ۱۸۹۱ء میں بمقام دہلی فوت ہوگیا اور قطب صاحب میں اپنے مورثِ اعلیٰ کے مزار کے قرب میں دفن ہوا۔ دم دم نکلتے نکلتے بھی ہوش و حواس درست تھے، نویں محرم کو انتقال سے چند گھنٹے پیشتر جس وقت تعزیہ گشت کناں ترابہ بیرم خان میں آپ کے مکان کے متصل پہنچے تو ماتمی تاشہ کی آواز سے چونک کر آپ نے اپنے عزیز کو اپنے پاس بلایا اور یہ رباعی لکھوا کر فرمایا کہ اسے تعزیے سے لٹکا آؤ۔ اس رباعی کو اس طوطیِ شکرستانِ سخن کی آخری نغمہ سنجی کہنا ناموزوں نہیں ہے:

بیمار ہوں، ناتواں ہوں، زار ہوں میں وقفِ غم و درد و رنج و آزار ہوں میں
اے سبطِ رسول، راکبِ دوشِ نبیؐ کچھ عقدہ کشائی کیجیے ناچار ہوں میں

آپ کے سب سے چھوٹے صاحب زادے مولوی انعام الحق بی اے ہونہار اور لائق نوجوان ہیں اور فی الحال فارس میں کانسل برطانیہ کے دفتر میں ایک معزز عہدے پر فائز ہیں۔ انتخابِ کلام حاضر کیا جاتا ہے: (۸۱)

باز آتا نہیں الفت سے کسی طرح ادیب ____ شوق ہے آپ اسے اپنی گرفتاری کا

جان جائیں گے یہ سب آپ مرے بعد ادیب ___ علم کیا چیز ہے ہوتی ہے لیاقت کیسی

رہا اگر یہی بت پرستی کا عالم ___ تخلص ادیب اپنا رامی کریں گے

اشرف

شیخ اشرف علی نام، خلف شیخ مظہر علی ساکن مصطفیٰ آباد عرف کسمنڈی جو مضافات لکھنؤ میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جناب اشرف کی عمر کا زیادہ حصہ بلکہ ساری عمر لکھنؤ میں گزری۔ اگرچہ ان کا دائرۂ علم زیادہ وسیع نہ تھا مگر ضروریاتِ شعری کے لیے کافی تھا۔ نہایت اعلیٰ درجے کے خوش نویس تھے۔ کامل چالیس برس تک ان کو منشی نولکشور کے مطبع سے تعلق رہا۔ نہایت خلیق اور باوضع آدمی تھے۔ کیا لباس و کیا طریقِ رہائش جملہ امور میں جیسا جوانی میں رنگ تھا ویسا ہی عہدِ پیری بلکہ مرتے دم تک قائم رہا۔ جس سے جس قسم کی ملاقات تھی، اس سے ہمیشہ وہی ارتباط رہا۔ جس کام کے لیے جو وقت مقرر کر رکھا تھا، اس میں کبھی فرق نہ آیا۔ اشرف نے تمام عمر شادی نہیں کی اور نہایت نیک نامی اور اتقا کے ساتھ زندگی بسر کی۔ آپ نواب اصغر علی خان صاحب نسیم دہلوی کے قدیم اور رشید شاگردوں میں تھے۔ ناسخ، آتش، خلیل، وزیر، صبا، رند کی محفلوں میں شریک رہے۔ مگر اپنے طرزِ کلام میں اساتذۂ دہلی بالخصوص اپنے استاد کا تتبع کرتے رہے اور باوجود کششِ ہم وطنی و تعلقاتِ روزمرہ طرزِ لکھنؤ کے اثر کو غالب نہ آنے دیا۔ اچھے اچھے مضامین پاک اور لطیف زبان میں بڑے سلیقے سے ادا کرتے تھے۔ حق یہ ہے کہ آپ کا کلام گو سارا ایک ہی مرتبے کا نہیں ہے۔ لیکن اکثر مشاہیر کے کلام سے لگا کھاتا ہے۔ اپنے استاد مرحوم سے ایسی عقیدت رکھتے تھے کہ فدائی کا رتبہ حاصل تھا۔ منشی امیر اللہ صاحب تسلیم کے گہرے دوستوں میں تھے۔ ساٹھ برس تک ہم مشق و ہم صحبت رہے۔ الغرض اساتذۂ قدیم کی ایک قابلِ قدر یادگار تھے۔ غزل کے علاوہ تاریخ گوئی میں بھی بڑا ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ مطبع نولکشور یا دیگر کتب مطبوعہ لکھنؤ میں عموماً آپ کی تاریخ ہوتی تھی۔ ان کے دو اردو دیوان مکمل موجود ہیں۔ ۸۵ برس کی عمر پاکر ۱۹۰۲ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ (۳۸)

اشرف میرے کلام کی رنگینیوں نے آج ___ دامنِ سخن کا دامنِ گلزار کر دیا

مضموں نیا، زمیں نئی، طرز بھی نیا ___ اشرف یہ ہے نسیم سے استاد کے لیے

اشرف کرو جلاتے وطن اختیار اب   جب تک کہ سلطنت تھی مرا لکھنؤ میں تھا

اشک

اشک، مولوی حاجی ہادی علی اشک لکھنوی - خلف شیخ حسین علی بجنوری، شاگرد رشید فتح الدولہ برق لکھنوی - فارسی کے بھی شاعر تھے۔ آپ اپنے استاذ کے ہمراہ کلکتے بھی گئے تھے - غدر کے بعد مطبع محمدی میں بطور مصحح کام کرتے رہے۔ صنعت تاریخ گوئی میں اچھی مہارت تھی - عربی کا خط نسخ نہایت عمدہ لکھتے تھے۔ منشی نول کشور کے مطبع میں اُن کے ہاتھ کا قرآن مجید چھپا تھا، جو نہایت خوش خط اور صحیح مانا جاتا ہے - اکثر فارسی درسیہ کتابوں پر، جو اس مطبع میں چھپیں، حاشیہ اور شرح حاشیہ بھی آپ ہی لکھا کرتے تھے۔ آپ کا اردو دیوان شائع ہو چکا ہے - ۱۸۸۱ء میں انتقال فرمایا۔ (۸)

اشک آنکھوں میں کبھی آہ کبھی ہے لب پہ   درد ہر وقت نئی طرح کا پایا دل میں

سمجھوں کشتہ ہوں میں تیغ نگاہ یار کا   غسل میت کے لیے پانی ملے تلوار کا

اعجاز

اعجاز، شیخ منشی محمد عبدالعزیز معروف بہ اعجاز رقم ابن محمد صالح ساکن سہسوان ضلع بدایوں، ان کا تاریخی نام آغا میر ہے، جس سے ۱۲۵۲ھ نکلتے ہیں۔ ایام طفولیت میں اپنے والدین کے ہمراہ لکھنؤ آئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی - فن سخن کی تحصیل اوّل مولوی الٰہی بخش نازش اور پھر اسیر لکھنوی سے کی۔ اخیر میں امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اب کہتے کہتے مشاق ہو گئے ہیں - خط نستعلیق میں منشی کالکا پرشاد موجد سے اصلاح لی ہے - ۱۸۵۷ میں ریاست بھوپال میں تعلق پیدا کیا۔ فارسی میں مولانا عباس رفعت کے شاگرد ہیں۔ بارہ برس بھوپال میں ملازمت کر کے گوالیار چلے آئے، ۱۲ سال وہاں رہے۔ اب چند سال سے پھر بمقام بھوپال نواب یٰسین محمد خان کی سرکار میں ملازم ہیں - تاریخ عمدہ اور بہت جلد کہتے ہیں - خوش نویسی میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے - یہ کلام کا نمونہ ہے - (۱۰)

بلا آئے، وبال آئے، غضب آئے، اجل آئے   نہ آئے پر نہ آئے دل کسی انساں کا انساں پر

کیا ہے بے خودی نے نیک و بد سے بے خبر ایسا   کہ شکوہ دوست کا کرتا ہوں میں جا جا کے دشمن سے

انور

سلطان الشعرا سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا مرحوم دہلوی۔ آپ سید جلال الدین حیدر مرصع رقم خوش نویس و استاد ابوظفر بہادر شاہ ثانی کے خلف اصغر اور فخر اساتذہ مولانا ظہیر دہلوی کے چھوٹے تھے۔ انورؔ مرحوم بڑے ذکی اور طباع شاعر تھے۔ اوائل مشق میں خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوقؔ سے استفادہ کیا۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا غالبؔ سے مشورہ لیتے رہے۔ طبیعت نہایت دِقت پسند اور مضمون خیز واقع ہوئی تھی۔ [illegible] کی چلبلاہٹ، فکر کی رسائی، روزمرہ کے نئے نئے الوٹ فریفتگانِ سخن کے دماغ میں عجیب سرور اور عاشق مزاجوں کے دلوں میں غضب کا درد پیدا کرتے تھے۔ جو شعر دیکھو پھڑکتا ہوا۔ حسنِ خیال، بلندیِ مضمون پر نظر ڈالو تو ایک خوش آیند حیرت پیدا ہوتی ہے۔ اس جوان طبیعت کو خدا نے وہ مضمون آفرینی بخشی تھی کہ شعر سن کر بوڑھوں کے ٹھٹھرے ہوئے دلوں میں عشق کی اُمنگ پیدا ہو جاتی تھی۔ افسوس ہے کہ اس جوان مرگ نے عالمِ شباب میں اپنی موت کا داغ دیا۔ اگر آج انورؔ زندہ ہوتے تو ہر جگہ ان کا ہی نور جھلکتا نظر آتا اور ان کے سامنے کسی کا چراغ روشن نہ ہونے پاتا۔ مگر اس مرحوم کا کلام اس ناپرسی اور ناقدری کے زمانے میں بھی انصاف پسند طبائع کو اپنے کمال کا معترف بنائے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اس قدر دِقت پسند اور نازک خیال ہونے کے باوجود مشاقی اور پُرگوئی کا یہ عالم تھا کہ کیسی ہی مشکل زمین کیوں نہ ہو تعدادِ اشعار میں کمی نہ آتی اور ایک ایک قافیے کو کئی کئی طرح سے ادا کرتے۔ اکثر مشاعروں میں مصرعِ طرح پر سہ غزلہ اور چوغزلہ کی نوبت آجاتی۔ جس بحر اور جس قافیے میں مضمون کی گنجائش نہ ہوتی، اسی میں گوہرِ مضمون نکال کر دکھا دیتے۔ غدر سے دس برس بعد جو دلی میں مشاعرے کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اس کی روحِ رواں انھیں کہنا چاہیے۔ حضرت داغؔ، مولانا ظہیرؔ، حالیؔ، مجروحؔ، سالکؔ، عزیزؔ، ارشدؔ، مشاقؔ، ان مشاعروں میں شریک ہو کر دادِ سخن دیا کرتے تھے۔ ثقات سے سنا گیا ہے کہ اکثر یونہی ہوا کہ ان کی غزل سب پر فوق لے گئی۔ حکیم مومن خان صاحب مومنؔ نے خیال گوئی کی جو ایک خاص طرز ایجاد فرمائی تھی، جس کا ان کے زمانے ہی میں شہرہ ہو گیا تھا، اگر اس کے موجد مومنؔ تھے تو پورے پورے مقلد حضرت انورؔ۔ اگر نگاہِ غور سے دیکھا جائے تو جیسا ان کی طرز کو حضرت انورؔ

نے نباہا ہے اور کسی سے نہ بن پڑا۔ اس طرح مرزا غالب کی استعارہ بالکنایہ کی خوش اسلوب ترکیب
کی تقلید انور مرحوم کے برابر کسی سے نہیں ہوئی۔ الغرض ذوق، غالب اور مومن کے جداگانہ طرزوں
کو سمو کر مرحوم نے ایک خاص رنگ ایسا ہر دلعزیز پیدا کیا تھا جو سب کے دلوں میں نقش ہوگیا۔
حضرت انور کو افکار زمانہ نے نہایت تکلیفیں پہنچائیں۔ دست برد غدر سے ایسے پریشان ہوئے،
کہ ترک وطن کرکے جے پور جا رہے۔ بعد کو وہیں ۳۸ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ ان کے دو
مکمل دیوان تلف ہوگئے، جن میں سے ایک تو خاص حمد و نعت اور تصوف کے رنگ میں ڈوبا
ہوا تھا۔ مولف تذکرہ نے بڑی محنت اور مشقت سے متفرق و پریشان مسودوں سے ایک
دیوان مرتب کرکے چھپوایا ہے۔ مگر یہ ان کے کلام کا آٹھواں حصہ بھی نہیں ہے اور اس میں بیشتر
ایسا کلام ہے جو نظر ثانی سے محروم رہا۔ یہ بھی امر قابل ذکر ہے کہ استاد ذوق کے مروجہ دیوان کی
اشاعت میں انور مرحوم کا نام شکریے کے ساتھ یاد رکھنے کے قابل ہے کیوں کہ یہ دیوان حافظ
ویران، حضرت ظہیر اور انور کی متحد سعی و کوشش کا نتیجہ ہے۔ خوش نویسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔
معظمی و محترمی شمس العلما مولانا حالی نے راقم کی تحریک سے جو تقریظ ان کے دیوان پر لکھی ہے
قابل دید ہے۔ اب انتخاب کلام ملاحظہ ہو: (۱۳۳)

دل میں بحر الفت ساقی ہے انور موج زن — جانتا ہوں ایک قطرہ کوثر و تسنیم کو
مسیحائی کرو مرتے ہیں تم پر — خلاصہ ہے یہ اپنی داستاں کا

انور

انور، منشی محمد انور لکھنوی، خوش نویس و مصلح سنگ، کلکتے کے امیر الاخبار کے مطبع میں
کتابت کرتے تھے۔ دو تین سال ہوئے دہلی میں انتقال کیا۔ حضرت داغ کے شاگردوں میں
تھے۔ کلام ہدیۂ احباب ہے۔ (۴)

شاید اے بلبل شیدا یہ تیری تاک میں ہے — آج گلشن سے جو ہلتا نہیں صیاد کہیں
یاس سے دیکھا جب، وہ کہنے لگے — دل میں کیا ہے، بتائیے تو سہی

اویسی

اویسی، منشی غلام محی الدین خان متوطن سرہند، حضرت سید حسن رسول نما صاحب کے

خاندان کے مرید [illegible] قابل و ذہین، صاحب فکر سلیم، خوش نویس کامل اور درویش سیرت بزرگ تھے۔ قرآنِ شریف کی ایک تفسیر نظم میں خوب لکھی تھی جس میں طرح طرح کے صنائع و بدائع ملحوظ رکھے تھے۔ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں داد خوش کلامی دیتے تھے۔ تذکرہ شوق کی ترتیب کے وقت زندہ و سلامت تھے۔ شیفتہ نے انھیں بریلی کا باشندہ لکھا ہے اور ان کا دکن جانا بھی درج ہے۔ (۸)

ذکر و شغل اب تو اویسی کا یہی آٹھہرا ____ کچھ کٹی رونے میں کچھ تیری حکایات میں رات
کس طرح چھوڑ سکوں تیری گلی کو جانا ____ سر اگر جائے تو جاوے، یہ قدم رکتا ہے

بلند

بلند، مرزا صفدر علی بیگ خلف مرزا فضل علی بیگ ساکن کھاری باؤلی (دہلی) الور کے سررشتہ تعلیم میں ملازم اور مرزا صابر دہلوی کے شاگرد تھے۔ نہایت دوست نواز اور قابل شخص تھے۔ علم حساب کے عدد، نستعلیق اور شکستہ اچھا لکھتے تھے۔ کچھ دنوں تھانے دار بھی رہے۔ طبیعت میں بے حد شوخی تھی۔ کلام یہ ہے:

قیس و فرہاد و وامق اور بلند ____ عشق میں جو رہا خراب رہا
تیرے ہرجائی پن نے اے بے مہر ____ مجھکو عالم سے شرمسار کیا

پیر

مصر مہاراج سنگھ ساکن متھرا، ذات کے چوبے اور جائے تعجب ہے کہ بہت کم خوراک تھے۔ خط شکستہ کی تحریر میں اچھی مہارت حاصل تھی۔ اوائل میں جوان تخلص کرتے تھے۔ پھر پیر تخلص اختیار کیا۔ دہلی قبل از غدر اکثر آیا کرتے تھے۔ (۳)

میں وہ خاکستر افسردہ ہوں جوں صبح کہ پیر ____ داغ خورشید سے اگ اٹھے سوزاں میرا
قبر پر فریادیوں کے اپنے تو ہرگز نہ جا ____ تیرا پیچھا کب چھٹا اس خاک دامن گیر سے

تمکین

میر ہدایت علی متوطن قصبہ کندرکی ضلع مراد آباد۔ نہایت ذہین اور طباع اور علوم و فنونِ عربی و فارسی میں دست گاہِ کامل رکھتے تھے۔ خوش نویسی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ

اکثر خطوط متداولہ نہایت عمدگی سے لکھتے تھے۔ تمام عمر درس و تدریس میں بس کی۔ فارسی شعر اکثر اور ریختہ بہت کم کہتے تھے۔ متقی، پرہیزگار و ادیب کامل تھے۔ قدرت اللہ شوق کے تذکرے کی ترتیب کے وقت یعنی بارھویں صدی کے آخر تک زندہ تھے۔ چند شعر انہی کے تذکرے سے انتخاب کرکے درج کیے جاتے ہیں، جن سے تلاش الفاظ و مضامین اور رنگین بیانی کا پتا چلتا ہے۔ ملاحظہ ہوں: (۲۵)

تمکین کوئے یار شبستان ہے دوسرا — ہر چند شب کے رہنے کی ہے گھر جگہ ولے
ظاہر ہے یہ کہ خوبیِ ذہنِ رسا ہے یہ — تمکین غزل کا کہنا تیرا ایسی طرز میں

ثریا

عالی جناب شاہ زادہ ثریا قدر مرزا محمد تقی علی بہادر المتخلص بہ ثریا ابن عالی جناب مستطاب معلی القاب ہز ہائی نس شاہ زادہ عالم و عالمیان یادگار اودھ پرنس سلیمان قدر مرزا محمد حسن علی بہادر دام اللہ اقبالہ، برادر زادہ و خویش سلطانِ عالم حضرت محمد واجد علی شاہ جنت آرام گاہ۔ دسمبر ۱۹۰۳ میں راقم تذکرہ سے بمقام لکھنؤ ملاقات ہوئی تھی۔ ۳۸۔ ۳۹ سال کی عمر ہے۔ ...با گورنری میں آپ کا چھٹا نمبر ہے۔ آپ کو سنِ طفولیت سے ہی ہر علم و ہنر کا شوق رہا۔ کئی زبانیں جانتے ہیں اور صنعت و حرفت میں بھی مہارت ہے۔ ہر فن میں دست گاہ ہے مصوری، نقاشی، خوش نویسی، فنِ سپہ گری اور نظم و نثر میں اچھا ملکہ ہے۔ مرثیہ، واسوخت، قصائد، غزل وغیرہ جملہ اصنافِ سخن پر قادر ہیں۔ علاوہ ازیں علم ہیئت و ہندسہ، نصائح و فلاسفی وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ کا ذہنِ رسا و جودتِ طبع خداداد ہے۔ فن شعر کا مذاق وراثتاً ملا ہے۔ اکثر مشاعرے بھی کرتے رہتے ہیں۔ زبان صاف، روزمرہ سلیس، نشستِ الفاظ مرغوب ہے۔ اکثر دشوار و سنگلاخ زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے، جس سے ان کی مشاقی ظاہر ہے۔ ایک رسالہ آپ کے کلام کا شائع ہو چکا ہے۔ اس میں سے چند شعر اپنے مذاق کے بموجب انتخاب کرکے پیش کرتے ہیں: (۲۶)

یہ مشتِ خاک، راز حق تعالیٰ کی امیں نکلی — اٹھا بار امانت، اے ثریا! جز بشر کس سے
ہاتھ سے صیاد کے جو کھا گئی بلبل شاخ پر — اے ثریا محو تھے نظارۂ گل میں ہزار

جان

جان عالم خان لکھنوی خلف نواب منور خان مغفور، برادرِ خرد نواب روشن الدولہ ظفر خان فنِ سخن سے میر سوز مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔ فی الجملہ علومِ عربیہ سے واقف تھے۔ خطِ نستعلیق و شکستہ میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ یہ ان کے اشعار ہیں: (۴)

اس سنگدل کے دل میں ذرا بھی نہ راہ کی دور از اثر سدا رہی ہت تیری آہ کی
بیٹھا ہوں یار آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے جوں تا بداں میں شیشۂ رنگیں بھرے ہوئے

حسن

مولوی سید امیر حسن صاحب مرحوم تخلص حسن ابن حاجی سید اکبر علی صاحب مرحوم ساکن سہارن پور، سادات موسوی اثنا عشری تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ سید عبد الہادی صاحب عرف شاہ چراغ کاشان سے سلطان محمود غزنوی کے ہم راہ ہندوستان میں آئے تھے۔ مولانا حسن نے تقریباً پچاس سال تک سرکارِ انگریزی کی عدالت ہائے ضلع میں وکالت کی۔ جائداد آبائی بھی بہت کچھ تھی۔ نہایت متقی و پرہیزگار، عربی و فارسی میں استعداد کامل رکھتے تھے۔ اس لیے اوقاتِ فرصت میں شغلِ درس بھی جاری رہتا تھا اور علمی مباحثات اور اہلِ علم و فن سے ان کی صحبت ہمیشہ گرم رہتی تھی۔ لکھنؤ، دہلی کے باکمال سہارن پور میں وارد ہوتے تو انہی کے مہمان ہوتے۔ خوش نویس بھی اعلیٰ درجے کے تھے۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ملک الشعرا مولوی مہدی علی خان صاحب مراد آبادی اکثر ان کے یہاں آکر مقیم ہوتے تھے۔ چنانچہ انہی سے تلمذ اختیار کیا تھا۔ سہارن پور کے مقتدر شرفا اور عمائد میں گنے جاتے تھے۔ دہلی و لکھنؤ بھی گئے اور وہاں کے اہلِ کمال سے مل کر دادِ سخن دینے اور لینے کا موقع ملا۔ آخر میں بوجہ پیرانہ سالی اور داغِ مرگِ فرزندِ جوان کی وجہ سے حواس میں اختلال آگیا تھا۔ ۱۸۸۹ء میں ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کیا اور سہارن پور میں دفن ہوئے۔ افسوس کہ کلام مصنف کے امراضِ دماغ اور ورثا کی کم التفاتی سے تلف ہو گیا۔ اس لیے جو کچھ دستیاب ہوا، حاضر کیا جاتا ہے: (۱۱)

زلف و رخ انتخاب ہیں دونوں روز و شب کے جواب ہیں دونوں
کام کے آدمی تھے قیس و حسن عشق میں پر خراب ہیں دونوں

حسن

سید علی حسن شاہ جہان آبادی۔ آپ شجاع، تیرانداز، خوش نویس، دست کار، فن بانک و پٹہ میں مہارت کامل رکھتے تھے اور باہمہ صفت موصوف تھے۔ صاحب غیرت ایسے تھے کہ اگرچہ عدمِ مساعدتِ روزگار سے پریشان رہے مگر کسی سے اپنی حاجت کا اظہار نہ کیا۔ طبع موزوں تھی، یہ چند اشعار ان کی یادگار ہیں:

ناز آئینے پہ اتنا یہ سکندر مت کر — کیا تماشا ہو جو سینے سے دل آوے باہر
یہ تم جانو ہو بجلی کو سکھائیں کس نے کچپلیاں — ہمارے دل ستی تعلیم نے سیکھی ہے بکلیاں

حیران

حافظ بقاء اللہ خلف حافظ ابراہیم۔ یہ دونوں باپ بیٹے خط نسخ و نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ شعر و سخن کا بھی مذاق تھا۔ ۱۸۴۸ء میں زندہ تھے۔ یہ ان کے کلام کا انتخاب ہے: (٦)

حیراں کو بعد مرگ تکلف نہیں ضرور — اک مشتِ استخواں ہے لے کے داب دو
کہدو مرے مزار پہ کوئی نہ لائے گل — چھاتی پہ میری داغ ہیں کافی بجائے گل

دارا

صاحب عالم و عالمیان میرزا محمد دارا بخت دارا مرحوم عرف مرزا شبو، ولی عہد اول حضرت ظل سبحانی محمد بہادر شاہ اخیر بادشاہِ دہلی۔ شاگردِ رشید ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق۔ ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء میں بعمر پچاس انتقال فرمایا اور شاہ چراغ دہلی کے مزار کے قریب میں دفن ہیں۔ آپ حضرت ابوظفر کے خلف اکبر تھے اور مشہور ہے کہ عمر میں صرف بارہ برس چھوٹے تھے۔ ان کی والدہ زکیۃ النسا بیگم مرزا سلیمان شکوہ کی دختر تھیں، جو اکبر شاہ کے حقیقی برادرِ خرد تھے۔ آپ کے آٹھ اور بقول بعضے بارہ فرزند دلبند تھے، جن میں سے دو میرزا احمد اختر اور نصیر الملک اب بقیدِ حیات ہیں، اور ایک صاحب زادی بھی زندہ و سلامت موجود ہیں۔ میرزا دارا بخت صاحب مولانا فخر الدین کے خلیفہ تھے اور میر محمدی صاحب سے بھی استفادہ کیا تھا، اور مولانا عماد الدین کے خط نسخ اور نستعلیق میں شاگرد تھے۔ بہت نیک خصلت، بھولے بھالے شاہ زادے تھے۔ آپ کے کلام میں حضرتِ ذوق کا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔ انتخابِ کلام ہدیۂ ناظرین ہے: (۲۵)

کوئی بھی ساتھ کسی کے گیا نہ اے دارا —— عدم کو جاتا ہے گیا قافلہ جریدوں کا
ہم سے اے دارا وہ کب ہوتا ہے صاف —— اس کے دل میں بدگمانی اور ہے

راغب

حافظ یار خان خلف الصدق نواب ذو الفقار خان ابن حافظ الملک حافظ رحمت خان نصیر جنگ، جوان، وجیہہ، صاحب حوصلہ، مجمع قابلیت، صاحب علم و فن، خوش نویس، انشا پرداز، کبھی کبھی شعر فارسی اور ریختہ میں کہہ لیتے تھے۔ یہ چند شعر ان کے کلام سے تذکرہ قدرت اللہ شوق سے منتخب ہوئے۔ (۹)

غیر سے چاہ جب تمھاری ہو —— دیکھیے شکل کیا ہماری ہو۔
نہ ہوگا فرق کچھ صاحب تمھاری قدر و عزت میں —— کسی روٹھے کو اپنے گر مناؤ گے تو کیا ہوگا

راقم[1]

خلیفہ غلام محمد راقم دہلوی۔ لکھنؤ جانے سے پیشتر حکیم قدرت اللہ خان قاسم سے عربی، فارسی کی انشا پردازی کے سبق لیے تھے اور شاعری میں بھی انہی کے شاگرد تھے۔ معلم پیشہ تھے اور طب میں دخل تھا۔ خوش نویسی میں فرد تھے۔ فارسی شعر کا بیشتر اور اردو کا کمتر شوق تھا۔ (۶)

نے دیر میں کچھ ہے نہ حرم میں کچھ ہے —— نے ہستی میں کچھ ہے نہ عدم میں کچھ ہے
دنیا ہے طلسمات عجائب راقم —— دم میں کچھ ہے اور ایک دم میں کچھ ہے

رخشان

عالی جناب نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر مرحوم جاگیردار ریاست لوہارو خلف اصغر فخر الدولہ نواب احمد بخش خان والی ریاست فیروز پور۔ نواب احمد بخش خان نے اپنے حین حیات بڑے لڑکے شمس الدین احمد خان کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا اور پرگنہ لوہارو جو مہاراجہ الور نے بطور انعام دیا تھا، اپنے چھوٹے صاحب زادوں امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان کو بطور مدد معاش دے دیا

---

[1] راقم نہ صرف خوش نویس تھے بلکہ خوش نویسی کی تاریخ کے اہم مورخ بھی تھے۔ راقم کی شہرہ آفاق کتاب تذکرہ خوش نویساں بہ تصحیح و ترتیب مولوی ہدایت حسین مرحوم ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کلکتہ) سے ۱۹۱۰ء میں چھپ چکی ہے۔

تھا۔ چند سال بعد نواب شمس الدین احمد خان کی حرکاتِ زبوں کے باعث ریاست فیروز پور ضبط سرکار ہوئی، مگر ریاست لوہارو بحال رہی۔ نواب صاحب ممدوح نواب اسد اللہ خان غالب سے علاوہ قرابت قریبہ کے سلسلۂ تلمذ رکھتے اور ان کے خلیفۂ اوّل تھے۔ انتظام ریاست شروع سے نواب امین الدین خان کے سپرد رہا اور ان کی وفات کے بعد ان کے بلند نام صاحب زادے نواب علاؤ الدین خان مسند نشین ہوئے اور نواب ضیاء الدین خان صرف جاگیر دار نسلاً بعد نسل تصور کیے گئے۔ نواب صاحب مذکور رؤسائے شاہ جہان آباد میں نہایت ذی اقتدار اور باثر و رسوخ تھے۔ ان کی اعلیٰ خاندانی ذاتی شرافت اور علم و فضل کی وجہ سے حکامِ وقت ان پر خاص توجہ مبذول فرماتے تھے۔ نواب صاحب اعلیٰ درجے کے سخن سنج اور سخن فہم اور تاریخی معلومات کا سرچشمہ مانے جاتے تھے۔ بڑے غیور اور پابندِ وضع رئیس تھے۔ بلوۂ غدر کے بعد ان کی ذات والاصفات دہلی میں غنیمت سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ جو شخص کسی فن کا ماہر یا کامل دہلی آتا تھا تو آپ کے فیضِ صحبت سے ضرور مستفید ہوتا تھا۔ علمِ تاریخ سے نہایت ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ جس وقت الیٹ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے اپنی ضخیم تاریخِ ہند مرتب کی تو فراہمی حالات و تواریخ قدیم میں نواب صاحب نے بڑی امداد کی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں گاہ گاہ فکرِ سخن فرماتے تھے۔ اردو میں رخشاں اور فارسی میں نیر تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں انتقال فرمایا اور درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ واقعہ مہرولی میں دفن ہوئے۔ تاریخ وفات مولوی رضی الدین خان دہلوی نے جو سلسلۂ حضرت امیر پنجہ کش، خوش نویس ہیں، ایک صوری و معنوی تاریخ کہی ہے۔ اور بے مثل مادہ ہے، جس پر مصرعے مولانا حالی نے لگائے ہیں:

چون ضیاء الدین احمد خان کشید	رخت از دنیا سوئے دار السلام
گفت ہاتف بارضی سالِ وفات	روز شنبہ سیزدہ شہر صیام

حضرت نیر رخشاں کا کلام متانت سے پُر، عالمانہ مذاق سے معمور ہے۔ استاد والا قدر کے تلمیذ رشید تھے۔ چنانچہ کلام میں بھی انہی کی طرز کا اتباع ہے۔ ان کی اور ان کے خاندان کی زبان دہلی میں مستند مانی جاتی ہے۔ پاکیزہ اور نازک خیالات کی بندش خاص انہی کا حصہ ہے۔ کاش نواب احمد سعید خان صاحب طالب کہ خود بھی اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں، اپنے والد مرحوم کا

کلام چھپوا دیں تاکہ نواب صاحب مرحوم کی پُر فیض زندگی کی دوامی یادگار رہ جائے۔ آپ کے بڑے صاحب زادے نواب شہاب الدین احمد خان کا انتقال آپ کی حیات ہی میں ہو گیا تھا۔ ان کے بیٹے جناب سائل دَورِ موجودہ کے مشہور کہنے والوں میں ہیں۔ (۳۱)

رخشاں جو آتے آتے ابھی رک گئے ہیں اشک ——— آنکھوں میں آگیا کوئی لختِ جگر نہ ہو
بوالہوس اور بھی مرنے کی کریں گے خواہش ——— لے کے گل قبر پہ رخشاں کی نہ آیا کیجیے

(باقی آئندہ)

الفہرست ؛- محمد بن اسحاق ابنِ ندیم وراق

اردو ترجمہ : محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآنِ مجید، نزولِ قرآن، جمع قرآن اور قرائے کرام، فصاحت و بلاغت، ادب و انشا اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، حدیث و فقہ اور اس کے تمام مدارسِ فکر، علم نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعتِ کیمیا وغیرہ تمام علوم، ان کے علما و ماہرین اور اس سلسلے کی تصنیفات کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں واضح کیا گیا ہے کہ یہ علوم کب اور کیوں کر عالمِ وجود میں آئے۔ پھر ہندوستان اور چین وغیرہ میں اس وقت جو مذاہب رائج تھے، ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اس دَور میں دنیا کے کس کس خطے میں کیا کیا زبانیں رائج اور بولی جاتی تھیں اور ان کی تحریر و کتابت کے کیا اسلوب تھے۔ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اور وہ ترقی و ارتقا کی کن کن منازل سے گزریں۔ ان زبانوں کی کتابت کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

ترجمہ اصل عربی کتاب کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ضروری حواشی دیے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

صفحات ۹۴۶ مع اشاریہ قیمت -/۳۰ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

علامہ سید غلام حسن شاہ کاظمی

فارسی شاعری میں شاہ پارے

● علامہ تفتازانی (متوفی ۷۹۲ھ) جہاں بے بدل فقیہ تھے وہاں شاعر بھی تھے۔ ان کی ایک رباعی ہے۔ اس میں ادبی مہارت کے ساتھ ساتھ ان کا تفقہ بھی دیکھیے کس طرح بھرا ہوا نظر آتا ہے:

دہ لفظ از نوادر الفاظ بر شمر — ہر لفظ را دو معنی و آن ضد یکدگر
جون و صریم و سدفہ و ظن است و شف و بین — قرء است و ہاجد و جلل و رہوہ اے پسر

(۱) جون = سیاہ و سفید (۲) صریم = صبح و شام (۳) سدفہ = ضیائے صبح و ظلمت (۴) ظن = شک و یقین (۵) شف = زیاد و کم (۶) بین = وصل و فراق (۷) قرء = طہر و حیض (۸) ہاجد = خفتہ و بیداری (۹) جلل = کوچک و بزرگ (۱۰) رہوہ = فراز و نشیب

● خواجہ سلیمان ساوجی کی رباعی ادب و شعر اور محاورہ و روزمرہ کی جان ہے:

اے آب روان سرو برآوردۂ تُست — وے سرو چمان چمن سرا پردۂ تُست
اے غنچہ عروس باغ در پردۂ تُست — اے باد صبا این ہمہ آوردۂ تُست

اسی موضوع پر سراج الدین قمری نے طبع آزمائی کی ہے اور خوب کی ہے:

اے ابر بہار خار پروردۂ تُست — وے خاردرونِ غنچہ خون کردۂ تُست
گل سرخوش، و لالہ مست و نرگس مخمور — اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تُست

● علامہ تفتازانی کے دس نوادر الفاظ اور ان کی شرح و لغت نظر افروز ہو چکی۔ اب مولانا آگہی کے مجلسی، نفسیاتی اور ادبی نوادر بھی لائق توجہ ہیں۔ فرمایا:

در جہاں دہ چیز دشوار است نزد آگہی — کز تصور کردن آن می شود دل بے حضور
ناز عشق، زہد فاسق، شرم ممسک، بذل بذل — عشوۂ محبوبِ بد شکل و نظر بازئ کور
لحن صوت بے اصولاں، بحثِ علم جاہلاں — مہمانئ بتقلید و گدائی بزور

معاشرے کی کج روی، کور ذوقی کا کیا خوب محاسبہ کیا ہے۔

— مولانا لطف اللہ نیشاپوری کی رباعی میں کئی امور کا اجتماع نظر افروز ہے:

در مرو پریر لالہ آتش انگیخت — دی نیلوفر بلخ در آب گریخت
امروز گل از خاک نیشاپور دمید — فردا بہری باد سمن خواہد ریخت

مولانا نسیمی نے بھی حضرت نیشاپوری کے رنگ میں رنگ آمیزی کی ہے:

گل داد پریر درع فیروزہ بباد — دی جوشن لعل لالہ برخاک نہاد
داد آب سمن خنجر مینا افروز — یاقوت سنان آتش نیلوفر داد

میر ابوالمکارم شہود سندھی (متوفی ۱۰۷۲ھ) نے بھی ان کی پیروی اور تتبع میں یوں گل کاری کی ہے:

گل داد پری قبائے یاقوت بہ نار — دی بادہ بہ درع لالہ شد لعل نگار
امروز درآب کلۂ زد نسرین — فردا سازد سمن ز خاک فیروزہ ازار

— حکیم عمر خیام کے فکر و نظر نے پرواز کی اور ان کی طبع رسا نے شوخی دکھائی اور یوں کہا:

آں کس کہ گناہ نہ کرد چون زیست بگو — واں کس کہ گناہ نہ کرد درجہاں کیست بگو
من بد کردم و تو بد مکافات دہی — پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

سید احمد احمدی بلگرامی (۱۱۶۱ھ) نے غالباً یہ رباعی پڑھی تو ضبط نہ کرسکے اور از خود رفتہ ہو کر کہا:

آں کس کہ گناہ نہ کرد پیدا نہ بود — او خود خلفِ آدم و حوّا نہ بود
حق است اگر خطا ز انساں نشود — عبد است اگر عفو خدا را نہ بود

— حاجی محمد جان قدسی کا نعتیہ کلام توصیف سے بالاتر ہے۔ ان کی نعتیہ رباعی قابلِ ستائش ہے:

بہ رخت کہ جز رخے تو گہے بہ رخے دگر نظرے نشد — بہ سرت کہ جز سر تو گہے بہ سرم سرے دیگرے نشد
من کم ترین سگانِ تو و لے جملہ بے قدرم و لے — بہ درت کہ جز در تو گہے بہ دے دگر گزرے نشد

— محمد خان تاقسال نے واقعات کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور حقیقتِ حال واضح کر دی ہے:

از صد سخنِ پیرم یک حرف مرا یاد است — عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است
تا جاں کہ تو رند داد تاد کہ تواند برد — جان دادن و دل بردن ایں ہر دو خداداد است

— جب سلطان شمس الدین التمش نے ۶۲۳ھ میں قلعہ رنتھنبور فتح کیا تو اس کی تہنیت میں

امیر روحانی بخاری نے مندرجہ ذیل اشعار رقم کیے:

خبر بہ اہلِ سما بُرد جبرائیل امین ۔۔۔ ز فتح نامۂ سلطانِ عہد شمس الدین
کہ اے ملائکۂ قدس آسماں ہا را ۔۔۔ بدین بشارت بندید حلہ و آئین
کہ از بلادِ سوالک شہنشہِ اسلام ۔۔۔ کشاد بارِ دگر قلعہ سپہر آئین
شہ مجاہد و غازی کہ دست و بازو را ۔۔۔ روانِ حیدرِ کرّار می کند تحسین[1]

قلعہ گوالیار فتح کیا گیا تو شاہی میر منشی و بیرِ مملکت تاج الدین ریزہ نے فتح کی خوشی میں ذیل کی رباعی لکھی تھی جو قلعے کے دروازے پر کندہ کرائی گئی۔

ہر قلعہ کہ سلطانِ سلاطین بگرفت ۔۔۔ از عونِ خدا و نصرتِ دین بگرفت
آن قلعۂ گوالیار و آں حصن حصین ۔۔۔ در ستہ ما بہ سنہ ثلثین بگرفت[2]

● اب ایک اور شخص سامنے ہے، وہ اپنی فکری معروفیت، خیالی اذیت اور اپنے محبوب کی تصوریت میں غرقاب ہے اور اپنے حالِ زار پر گریاں۔ وہ ماتم گساری یا قلبی مسرت کے عالم میں گنگناتا چلا جا رہا ہے۔ دیکھیے کہ معاشرے کا یہ شخصی انداز کیا کیا رنگ لاتا ہے:

دل بُرد از من دیروز شامے ۔۔۔ فتنہ طرازے، محشر خرامے
از چشمِ لرزان، لرزاں دو عالم ۔۔۔ وز زلفِ برہم، برہم نظامے
عارض چہ عارض زلفِ چہ زلفے ۔۔۔ صبح چہ صبحے شامِ چہ شامے
گاہے بہ مستی چو طاؤس رقصاں ۔۔۔ گاہے بہ شوخی چو آہو خرامے

● اب ایک اور دوسرا شخص ہے کہ غم و الم کا پیکر بنا ہے، رنج و اندوہ میں چکنا چور ہے، اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ وہ کہتا ہے:

کیستم؟ دل شکستہ غم زدۂ ۔۔۔ بے دل و خستہ و ستم زدۂ
از گداز نفس بہ تاب و تبے ۔۔۔ وز بیانِ یاس تشنہ لبے
دردمندے جگر گداختۂ ۔۔۔ از غم دہر زہرۂ باختۂ

---

[1] تاریخ فرشتہ، ج ۱، ص ۲۷۰ [2] ایضاً، ص ۲۷۱

اور ساری بات یہ ہے کہ یہ غمِ دہر کا کشتہ ہے۔ غمِ دہر میں مبتلا ہے۔ اس کا پورا ماضی اس کی پوری زندگی، اس کی تمام سرگزشت حالات وواقعات کے سیلِ رواں سے گزر چکی ہے، اور جو کچھ کہہ رہا ہے دیدہ و شنیدہ ہے، کائناتِ انسانی نیم بسمل ہے، تڑپ رہی ہے اور یہ اس پرغمِ دہر کا ماتم گسار ہے۔

● مولانا لطف اللہ نیشاپوری گراں مایہ فاضل، بالغ نظر ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے قلب و روح اور فکر و نظر کے مابین مغائرت بالکل نہ تھی۔ ان کے دل و دماغ متحد و یک آہنگ تھے۔ ان پر جو واقعات و حالات وارد ہوئے، تجربات و مشاہدات جو اُن کی سرگزشت کا حصہ ہیں، اُنھیں وہ لباسِ شعر میں آراستہ کرتے رہے۔ حالات کی ستم شعاری اور واقعات کی بے پناہ استبدادیت اور جور و جفا کی الم ناکی کو وہ یوں پیرایۂ اظہار بخشتے ہیں:

طالعے دارم کہ از پئے آب گر بروم سوئے بحر، بر گردد
ور بہ دوزخ روم پئے آتش آتش از یخ فسردہ تر گردد
گر زکوہِ التماسِ سنگ کنم سنگ نایاب چوں گہر گردد
چوں زپیش کسے روم بسوال ہر دو گوشش بحکم کر گردد
اسپِ تازی اگر سوار شوم زیرِ رانم رواں چو خر گردد
ایں چنیں ... شمات پیش آید ہر کرا روزگار بد گردد
● باہمہ نیز شکر باید کرد کہ مبادا کزیں بتر گردد

شخصیات کے نکتہ چین، عیب بین، حاسدین ہوا کرتے ہیں، کوئی عہد بھی اس سے الگ نہیں ہے۔ مولانا جامی نے جب حرمین شریفین کا قصد کیا اور چل پڑے تو ان کے معاصر حاسد شاعر نے کہا:

اے بادِ صبا بگو بہ جامی کائے دزدِ سخنورانِ نامی
بُردی اشعارِ کہنہ و نو از سعدی و انوری و خسرو
اکنوں کہ سرِ حجاز داری و آہنگِ حجاز ساز داری
دیوانِ ظہیر فاریابی در کعبہ بدزد اگر بیابی

خواجہ شمس الدین حافظ اپنے معاصر خواجو کرمانی کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے ہیں :

استادِ انل سعدی است پیش ہمہ کس اما — دارد غزل حافظ طرزِ غزلِ خواجو

- سلیم طہرانی شاعر ہیں، خود اپنی نسبت کہتے ہیں :

دیوانِ کیست از سخنانم تہی سلیم — تنہا نہ بر من این ستم از دستِ صائب است

دیوانِ خود بدستِ حریفاں مدہ سلیم — غافل مشو کہ غارت باغِ تو می کنند

ملّا وارستہ شعر کہتے تھے، وہ سلیم کی نسبت کہتے ہیں :

دخلے کہ نہ کردی کلام اللہ است — بیتے کہ نبردۂ تو بیت اللہ است

ایک تذکرہ نویس نے رائے دی ہے کہ مولانا جامی اور امیر خسرو نے نظامی گنجوی پر دست درازی کی ہے :

"خانہ شعر و شاعری نظامی گنجوی تاراج کردۂ مولوی جامی ۔ امیر خسرو است "

کیا یہ دست درازی تسلیم کی جا سکتی ہے ؟

- سید غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ) نے ماثر الکرام موسوم بہ سروِ آزاد میں سرقہ توارد کی نسبت محاکمہ کیا ہے، اور وہ خلاصۃً یوں ہے :

" مقتضائے حسن ظن آنکہ اشتراک مضامین را حمل بر توارد کنند و تا کہ محملِ حسنے داشتہ چرا در پے حمل دیگر روند۔ و اگر کسے بنظرِ تفتیش ملاحظہ کند کم شاعرے را از توارد مضامین خالی یابد۔ چہ احاطۂ جمیع معلومات، معلومات خاصہ حضرتِ علم الٰہی است۔ تعالیٰ شانہٗ۔

منم کلیم بطور بلندئ ہمت — کہ استفادۂ معنیٰ جز از خدا نکنم

بخوانِ فیض الٰہی چو دسترس دارم — نظر بکاسۂ دریوزۂ گدا نکنم

ولے علاج توارد نمی توانم کرد — مگر زباں بہ سخن گفتن آشنا نکنم

آزاد بلگرامی نے علامہ سعد الدین تفتازانی کی رائے سرقہ و توارد کے باب میں نقل کی ہے :

" علامہ تفتازانی در مطول نقل می کند ملخص کلامش اینکہ : حکم سرقہ وقتے کردہ می شود کہ اخذ ثانی از اول یقینی باشد۔ و الا احکام سرقہ مترتب نمی تواند شد و از قبیل توارد خواہد بود ۔ و در صورت کہ اخذ ثانی از اول معلوم نباشد، باید گفت کہ فلاں شاعر

چنیں گفتہ است ۔ و دیگرے سبقت بُردہ چنیں یافتہ و بایں حسنِ تدبیر مغتنم داند فضیلت صدق را محفوظ دارد ۔ خود را از دعویٰ علم الغیب و نسبت نقص بغیر انتہی [۵۲]

---

[۵۲] تذکرہ سرو آزاد ، ص ۶۹ ۔ بحوالہ مطول ۲ : ۲۴۰ ۔ بحث سرقہ

مطالعۂ حدیث

از : مولانا محمد حنیف ندوی

گولڈ زیہر (GOLDZIHER) اور اس قبیل کے دوسرے استشراق زدہ حضرات نے حدیث و سنت کے بارے میں اس ہرزہ سرائی کو علمی و تحقیقی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی تدوین و تسوید تیسری صدی ہجری میں محض تاریخی عوامل کی بنا پر معرضِ ظہور میں آئی ۔ مولانا ندوی نے اس کتاب میں اس اعتراض کا مثبت انداز میں جواب دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ حدیث نبویؐ کی اشاعت و فروغ اور حفظ و صیانت کا سلسلہ عہدِ نبوی سے لے کر صحاح ستہ کی تدوین تک ایک خاص قسم کا تسلسل لیے ہوئے ہے جس میں شک و ارتیاب کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی ۔ علاوہ ازیں اس میں مولانا نے حدیث کے علوم و معارف پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ ایک مکمل سائنس ہے ، جس میں نہ صرف رجال و رواۃ کی جانچ پرکھ کے پیمانوں کی تشریح کا اہتمام کیا گیا ہے بلکہ ان اصولوں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے جن سے محدثین نے متن کی صحت و استواری کا تعین کیا ہے ۔ اسلام میں حدیث و سنت کا کیا درجہ ہے ، اس نے کب اور کس طرح تدوین و تصنیف کے محنت طلب مرحلے طے کیے اور کن موثق علمی ذرائع سے ہم تک ان کی برکات پہنچیں ، یا یہ کہ یہ اپنے آغوش میں تحقیق و تفحص کے کن معیاروں کو سمیٹے ہوئے ہے ؟ ان سوالات کا تحقیقی جواب اگر مطلوب ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کیجیے ۔

قیمت : ۱۶ روپے　　　　صفحات : ۱۲ + ۲۱۶

ملنے کا پتا : ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ، کلب روڈ لاہور

ڈاکٹر محمد ریاض

اقبال کی شاعری میں مکالماتی حُسن

دوسری اور آخری قسط

اسرار و رموز

اپنی پہلی فارسی مثنوی (اسرارِ خودی) میں اقبال نے چند حکایات لکھی ہیں، بھیڑوں اور شیر کی حکایت، ہیرے اور کوئلے کے مکالمے کی حکایت، دریائے گنگا اور کوہِ ہمالیہ (یا برہمن و شیخ کا مکالمہ۔ دوسری مثنوی (رموزِ بےخودی) میں بھی دو ایسی حکایتیں ملتی ہیں، جن کے مکالمے قابلِ توجہ ہیں۔ نوکِ تیر اور شمشیر کی گفتگو، سلطان مراد اور معمار کی حکایت۔ یہ اور دیگر حکایتیں مثنوی رومی کی حکایات کے اسلوب پر ہیں اور شاعر نے ان سے دلپذیر نتائج نکالے ہیں، مگر ان ابتدائی فارسی مثنویوں میں (بالترتیب شائع شدہ ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء) میں بھی مکالموں کا زور غور طلب ہے۔ مثلاً آخری عنوان والی حکایت (سلطان مراد اور معمار) پر ایک مختصر ڈراما تیار کیا جا سکتا ہے۔ حکایت یہ ہے کہ سلطان مراد کے حکم سے ایک معمار نے مسجد بنائی مگر سلطان کو مسجد کی عمارت بالکل پسند نہ آئی اور غصے میں اس نے معمار کا ہاتھ کٹوا ڈالا۔ معمار نے قاضیِ شرع سے شکایت کی جس نے سلطان مراد کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالنے کا فیصلہ دیا۔ سلطان نے شرعی حکم کی تعمیل کرنا چاہی مگر معمار نے سلطان کی معذرت اور شرمندگی کے پیشِ نظر اسے معاف کر دیا اور قصاص کی حد جاری نہ ہونے دی۔ مکالمے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

معمار خطاب بہ قاضی: گفت، اے پیغامِ حق گفتارِ تو — حفظِ آئینِ محمدؐ کارِ تو

سفتہ گوشِ سطوتِ شاہان نیم — قطع کن از روئے قرآن دعویم

سلطان مراد: گفت شہ، از کردہ خجلت بردہ ام — اعتراف از جرمِ خود آوردہ ام

قاضی: گفت قاضی، فی القصاص آمد حیوٰۃ — زندگی گیرد بایں قانون ثبات

عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست — خونِ شہ رنگین تر از معمار نیست

معمار : گفت: از بہر خدا بخشیدمش از برائے مصطفیٰؐ بخشیدمش

چوتھے شعر میں آیۂ مبارکہ (۱۷۹ : ۲) کی طرف تلمیح ہے کہ قصاص، بقائے حیات کا ضامن ہے۔

پیامِ مشرق

اس کتاب (اشاعت اول ۱۹۲۳ء) کے "افکار" اور "نقشِ فرنگ" والے حصے میں کئی مکالمے ہیں اور ان کی دلآویزی مسلّم ہے۔ بوئے گل، افکار انجم، محاورہ علم و عشق، محاورہ خدا اور انسان، شاہین و ماہی، دو غزال (ہرن)، زندگی، حور و شاعر، زندگی و عمل، الملک للہ، طیارہ، صحبتِ رفتگان، جلال و ہیگل، محاورہ اگسٹس کومت و مرد مزدور، جلال و گوئٹے، لینن و قیصر ولیم، آزادیٔ بحر۔

ان ۱۷ عنوانات میں سے تین کو خود اقبال نے محاورہ (مکالمہ) لکھا ہے، اور سب کے سب شاعر کی قادر کلامی اور غیر معمولی فصاحت و بلاغت کے مظہر ہیں۔ مگر مقالے کی طوالت کم کرنے کی خاطر ہم چند مختصر ترین نمونوں پر اکتفا کریں گے۔ (اشارہ شدہ عنوانات کے علاوہ نظم "میلادِ آدم" میں بھی عشق، حسن اور فطرت وغیرہ محوِ گفتگو دیکھے جا سکتے ہیں)۔

نظم "زندگی" میں شاعر نے کسی بلند نگاہ دانش مند سے اپنی گفتگو قلم بند کی ہے۔ ایک ایک مصرعے کی شرح کافی لمبی ہو سکتی ہے۔ اپنی گفتگو کے پردے میں شاعر نے زندگی کے بارے میں منفی خیالات نقل کیے اور "حدیثِ دیگراں" میں ان کی تردید کی ہے۔ یہی پانچ اشعار اقبال کے فلسفۂ حیات کے ترجمان بن سکتے ہیں۔ دیکھیں، ان کی نظر میں زندگی سخت کوشی، حرارت و جستجو، آویزشِ خیر و شر، سیرِ دوام اور ارتقائے پیہم کا کس قدر حسین و جمیل امتزاج ہے:

پرسیدم از بلند نگاہے "حیات چیست؟" گفتا "مئے کہ تلخ ترا و نکو تر است"

گفتم کہ "کرمک است و ز گِل سر بروں زند" گفتا کہ "شعلہ زاد مثالِ سمندر است"

گفتم کہ "شر بفطرتِ خامش نہادہ اند" گفتا کہ "خیر او نشناسی، ہمیں شر است"

گفتم کہ "شوق سیر نہ گردش بہ منزلے" گفتا کہ "منزلش ہمیں شوق مضمر است"

گفتم کہ "خاکی است و بخاکش ہمی دہند" گفتا "چو دانہ خاک شگافد، گلِ تر است"

حضرت طارق بن زیادؒ کا جبرالٹر میں ورود اور جنگی جہازوں کو جلانے کا واقعہ معروف ہے مگر اقبال نے تاریخی واقعات کے طومار کو مکالمہ نما تین شعروں میں سمو دیا ہے۔ "الملک للہ" عنوان کا

یہ قطعہ یوں ہے :

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت — گفتند ' کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن ، باز چوں رسیم ؟ — ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست ؟
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت — ' ہر ملک ، ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست '

ایسا ہی ایک شاہ کار مکالمہ ' زندگی و عمل ' ہے جس میں ' ساحل ' اور ' موج ' کو مجسم صورت میں مصروفِ سخن دکھایا گیا ہے ۔ اقبال کا یہ دو شعری قطعہ ایرانیوں کو بھی بہت پسند ہے ،

ساحلِ افتادہ گفت ' گرچہ بسے زیستم — ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم ؟
موج زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت — ' ہستم اگر می روم ، گر نروم ، نیستم

اشعارِ غزل میں مکالمے

اقبال نے کئی غزلوں کے مختلف اشعار میں موجز مکالمے لکھے ہیں ۔ ایسے اشعار میں ' گفتند ' کی فاعل غیبی قوتیں (یہ کارکنان قضا و قدر) ہیں ۔ ذیل کے پہلے دو شعر ' پیامِ مشرق ' میں سے ہیں اور تیسرا " زبورِ عجم " (اشاعت اول ۱۹۲۷ء) سے :

گفتند ' لب ببند و ز اسرارِ ما مگو ' — گفتم کہ ' خیر ، نعرۂ تکبیرم آرزوست '
گفتند ' ہرچہ در دلت آید زما بخواہ ' — گفتم کہ ' بے حجابیِ تقدیرم آرزوست '
گفتند ' جہانِ ما آیا بتو میسازد ؟ — گفتم کہ ' نمیسازد ' گفتند کہ ' برہم زن '

کتابِ مکالمات ، جاوید نامہ

جاوید نامہ (طبع اوّل ۱۹۳۲ء) بالاتفاق علامہ اقبال کا شاہ کار ہے ۔ کتاب فارسی مثنوی میں ہے مگر اس میں غزلیات اور ترجیع و ترکیب بند بھی دیکھے جا سکتے ہیں ۔ یہ ایک رزمیہ اور ادبی ڈراما ہے جس میں مشاہیر کی ارواح اور بعض مجسم کردار (اصلی کردار ۴۱ ہیں) ، چھ سات کرات (افلاک) پر مختلف دینی ، ادبی ، سیاسی اور اجتماعی مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں ۔ جاوید نامہ کے کئی کردار فرضی نوعیت کے ہیں ۔ کئی اشخاص اور اماکن کے نام بھی ضمنی ہیں ۔ راقم الحروف نے سالِ اقبال کی مناسبت سے اس کتاب پر چند خاص مقالے لکھے ہیں ۔ مثلاً سہ ماہی " اقبال " (لاہور) ، معارف ، ماہنامہ تعلیم ، اور ماہنامہ " فنون " وغیرہ کے اقبال نمبروں میں ۔ یہاں کتاب کی ترتیب کے مطابق

چند توضیحی گزارشات پیش کی جائیں گی اور بعض مکالماتی نمونے، جن کا کچھ استحسان بھی ہوگا۔

مناجات :۔ یہ مناجات ایک خود کلامی ہے اور دردِ مہجوری کا اظہار :

گرچہ از خاکم نروید جز کلام حرفِ مہجوری نمی گردد تمام

تمہید :۔ کتاب کی تمہید دراصل تخلیقِ آدم کی تمہید ہے۔ آسمان کی طعنہ زنی اور زمین کے اظہارِ فخر کے پردے میں شاعر نے انسانی شرف و فضیلت کو اجاگر کیا ہے۔

کتاب کا اصلی حصہ شاعر کی روحِ رومیؔ کے ساتھ گفتگو کے توسط سے شروع ہوتا ہے شاعر رومی سے "موجود" اور "محمود" کے معانی پوچھتا ہے اور اس سے حقیقتِ معراج زیرِ بحث آتی ہے۔ اسی بحث کے نتیجے میں شاعر کی اپنی معراج شروع ہوجاتی ہے۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعۂ معراج، دنیا کا عجیب ترین واقعہ تھا اور مسلمانوں نے مختلف اسالیبِ بیان کے ذریعے اس واقعہ کی ترجمانی کی ہے۔ غیر مسلم بھی واقعۂ معراج کے اثرات سے آزاد نہ رہ سکے۔ چنانچہ اٹلی کے مشہور مصنف ڈلنٹے الیغیری (م ۱۳۲۱ء) کی ڈیوائن کمیڈی بھی روایاتِ معراج سے اثر پذیر ہے۔ اس ضمن میں اسپین کے آسن نامی ایک پروفیسر کی تحقیقات لائقِ مطالعہ ہیں۔ ہسپانوی زبان میں کتاب کا متن ۱۹۱۹ء سے میڈرڈ سے شائع ہوا، اور اس کا انگریزی ترجمہ (عنوان "اسلام اینڈ ڈیوائن کمیڈی) ۱۹۲۶ء میں لندن میں چھپا۔ جاوید نامہ کو بھی روایاتِ معراج کے تحت لکھی جانے والی کتب کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ فارسی زبان میں (نثر اور نظم دونوں میں) یہ ایک منفرد اور بے نظیر کتاب ہے۔

فلکِ قمر :۔ شاعر اور اس کے افلاکی راہنما (رومی) کی پہلی منزل "فلک قمر" (= چاند کا کرہ) ہے۔ یہاں وہ وشوامتر (شیوجی مہاراج) سے ملتے ہیں جسے رام چندر جی کا استاد اور دوست بتایا جاتا ہے۔ چار انبیا کے "طواسین" (بنیادی تعلیمات کے ارواح) بھی نظر آتے ہیں۔ یہاں اہرمن، زن رقاصہ، اسقروطی، افرنگین، افلاطوس اور ٹالسٹائے وغیرہ کے کردار سامنے آتے ہیں مگر مکالمات کا شاہ کار وہ حصہ ہے جو جہان دوست (وشوامتر) سے مربوط ہے۔ ذیل کے پانچ اشعار کے ہر مصرعے میں سوال و جواب ہیں۔

یہ مکالمے، حسنِ خطاب اور ایجازِ بیان کا اعلیٰ نمونہ کہے جاسکتے ہیں (خصوصاً صنعتِ سوال و

جواب کے نقطۂ نظر سے)۔

گفت "برگِ عقل"؟ گفتم "ترکِ فکر" — گفت "مرگِ قلب"؟ گفتم "ترکِ ذکر"

گفت "تن"؟ گفتم کہ "زاد از گردِ رہ" — گفت "جاں"؟ گفتم کہ "رمز لا الٰہ"

گفت "آدم"؟ گفتم "از اسرارِ اوست" — گفت "عالم"؟ گفتم "او خود روبروست"

گفت "این علم و ہنر"؟ گفتم کہ "پوست" — گفت "حجت چیست"؟ گفتم "روئے دوست"

گفت "دینِ عامیان"؟ گفتم "شنید" — گفت "دینِ عارفاں"؟ گفتم کہ "دید"

فلک عطارد : یہاں بیشتر گفتگو سید جمال الدین افغانی (م ۱۸۹۷ء) اور شاہ زادہ سعید حلیم پاشا (م ۱۹۲۱ء) کے ساتھ ہے۔ رومی یہاں اقبال کو "زندہ رود" (= دریائے زندہ) کے افلاکی نام سے متعارف کراتے ہیں، اور کتاب کے اختتام تک شاعر اسی نام سے موسوم ہے :

گفت رومی " ذرہ گردوں نورد — در دلِ او یک جہانِ سوز و درد

چشم جز برخویشتن نکشادۂ — دل بکس نادادۂ ، آزادۂ

تند سیر اندر فراخائے وجود — من ز شوخی گویم او را "زندہ رود""

فلک زہرہ :- اس فلک پر قدیم اقوام کے معبودانِ باطل (بت) نیز چند ظالم اور مظلوم کردار مجسم کیے گئے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے معاصر فرعون کو "فرعونِ کبیر" کہا گیا ہے اور محمد احمد سوڈانی متمہدی (م ۱۸۸۵ء) کی آرام گاہ کو خراب کرنے والے لارڈ کچنر (م ۱۹۱۶ء) کو فرعونِ صغیر۔ فرعون کہتا ہے کہ آثارِ قدیمہ کے دلدادوں نے میری قبر کھودی اور میری ممیائی ہوئی نعش کو قاہرہ کے عجائب خانے میں آرکھا، مگر کچنر نے مہدی سوڈانی کی قبر کیوں کھدوائی تھی ؟

فرعون : قبرِ ما را علم و حکمت بر کشود — لیکن اندر تربتِ مہدی چہ بود ؟

روحِ مہدی : گفت "اے کشنر، اگر داری نظر — انتقامِ خاکِ درویشے نگر

آسماں خاکِ ترا گورے نداد — مرقدے جز در یمِ شورے نداد"

ان سوال و جواب میں تلمیحات کی ایک دنیا پنہاں ہے۔ خلاصۂ مطلب ہم لکھے دیتے ہیں۔ محمد احمد سوڈانی (مہدی) نے سوڈان کا شہر خرطوم انگریزوں کے قبضے سے آزاد کروایا تھا مگر ان کی وفات کے تیرہ برس بعد جنرل کچنر نے اس شہر کو دوبارہ تسخیر کر لیا۔ اس سیاہ کار نے جوشِ انتقام میں اس

مہدویش سوڈانی کی قبر اکھڑوائی اور مرحوم کی نعش کو دریا برد کروایا۔ جنرل کچنر بعد میں انرییری ڈاکٹر لارڈ اور فیلڈ مارشل بنا۔ اس نے برصغیر اور افریقہ کے انگریزی مستعمرات میں مدتوں فوجوں کی کمانڈ سنبھالے رکھی اور پہلی جنگ عظیم میں بھی شریک ہوا۔ مگر ۱۹۱۶ء میں ایک جرمن آبدوز نے اس بحری جہاز کو تباہ اور غرقِ دریا کر دیا جس میں وہ روس جا رہا تھا۔ کچنر اور اس کے ہمراہانِ سفر کی نعشیں بھی نہ مل سکیں۔ اقبال اسے درویشِ سوڈانی کی نعش کی بے حرمتی کا شاخسانہ بتاتے ہیں۔ اس درویش سوڈانی کی روح عربوں سے بھی مخاطب ہے کہ:

گفت "اے روحِ عرب بیدار شو | چوں نیاگان، خالقِ اعصار شو
زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر | تا کجا تقدیرِ تو در دستِ غیر
بر مقامِ خود نیائی تا یکے | استخوانم در لحد نالد چو نے"

فلکِ مریخ:۔ شاعر یہاں ایک مریخی انجم شناس سے دنیا و دین کے اہم ترمسائل سے متعلق گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔ انجم شناسِ مریخی کی سوال و جواب آمیز گفتگو کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔ سبحان اللہ! فارسی، شاعر کی اکتسابی اور غیر مادری زبان ہے مگر کمالاتی فصاحت و بلاغت اس کے ہر مصرعے سے ہویدا ہے۔ اس اسلوبِ تخاطب اور حسنِ ادا پر کون فدا نہ ہوگا؟:

وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا | باز در خوابِ گراں دارد ترا
سحر و افسوں است یا دین است ایں؟ | حبِ افیون است یا دین است ایں؟
می شناسی طبعِ دراک از کجا ست؟ | حورِ اندر پیکرِ خاک از کجا ست؟
قوتِ فکرِ حکیماں از کجا ست؟ | طاقتِ ذکرِ کلیماں از کجا ست؟
ایں دل و ایں وارداتِ او زکیست؟ | ایں فنون و معجزاتِ او زکیست؟
گرمیٔ گفتار داری؟ از تو نیست | شعلۂ کردار داری، از تو نیست
ایں ہمہ فیض از بہارِ فطرت است | فطرت از پروردگارِ فطرت است
زندگانی چیست؟ کانِ گوہر است | تو امینی صاحبِ او دیگر است
ارضِ حق را ارضِ خود دانی، بگو | چیست شرحِ آیۂ "لا تفسدوا"؟
زیرِ گردوں فقر و مسکینی چرا ست؟ | آنچہ از مولاست، می گوئی زماست۔

نویں شعر میں ایک آیۂ قرآنیہ کی طرف تلمیح ہے (۵۱ : ۷)۔

فلک مشتری :۔ اس فلک کے اہم تر کردار ابلیسِ لعین، حسین بن منصور حلاج، بابیہ شاعرہ قرۃ العین طاہرہ اور میرزا اسداللہ خان غالب ہیں۔ حسنِ مکالمہ ہم غالب سے مربوط حصے سے نقل کریں گے۔ انیسویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی کے آخری سالوں میں برصغیر کے اکابر علما کی توجہ ایک تازہ مسئلے کی طرف منعطف ہوتی تھی۔ اسے 'امتناعِ خلقِ نظیرِ رحمۃ للعالمینؐ' کا عنوان دیا گیا تھا۔ مطلب یہ کہ آیا خدائے تعالیٰ کسی دوسرے رحمۃ للعالمینؐ کی تخلیق پر قادر ہے (اعوذ باللہ بنقلہ)؟ اس مناظرے کے اہم رکن مولانا سید اسماعیل (شہید) اور مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔ مقدم الذکر (خاص شرائط اور آداب ذکر کرکے) سوال کا جواب اثبات میں دیتے تھے اور مؤخر الذکر نفی میں۔ میرزا غالب نے بھی اس قضیے کا راہِ وسط بتانے کی خاطر ۱۲۸ اشعار کی حامل ایک مثنوی لکھی۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پیدا کرنے پر قادر ہے، مگر اس کے کام حکمت سے مملو ہوتے ہیں۔ رحمۃ للعالمینؐ، تخلیقِ انسانی کا تکامل اور نقطۂ آخر ہے، لہٰذا اس کی تکرارِ تخلیق خلافِ مصلحت ہے۔ غالب کے تضمین شدہ شعر اور اس مکالمے کو اس سیاق میں دیکھیں۔ آخر میں ضمنی توضیح حلاج کی زبانی ہے۔ اقبال نے یہاں حلاج کی 'کتاب الطواسین' کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ اقبال کی محبوب ترین کتب میں سے ایک تھی اور اُسے ۱۹۱۳ء میں لوئی میسینون نے پیرس سے شائع کیا تھا۔

زندہ رود: صد جہاں پیدا درین نیلی فضاست — ہر جہاں را اولیا و انبیاست؟

غالب: نیک بنگر اندریں بود و نبود — پے بہ پے آید جہانہا در وجود

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ للعالمینے ہم بود

زندہ رود: فاش تر گو زانکہ فہمم نارساست

غالب: این سخن را فاش تر گفتن خطاست

زندہ رود: گفتگوے اہلِ دل بے حاصل است؟

غالب: نکتہ را بر لب رسیدن مشکل است

زندہ رود: تو سراپا آتش از سوز طلب — بر سخن غالب نیائی اے عجب

غالب: خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست — رحمۃ للعالمینی انتہاست

زندہ رود: من ندیدم چہرۂ معنی ہنوز — آتشے داری اگر ما را بسوز

غالب: اے چو من بینندۂ اسرار شعر — این سخن افزوں تراست از تار شعر
شاعراں بزم سخن آراستند — ایں کلیماں بے ید بیضا ستند
آنچہ تو از من بخواہی کافری است — کافری کو ماورائے شاعری است

حلاج: ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

ایک دوسرا نمونہ خواجۂ اہلِ فراق (ابلیس) کے ساتھ گفتگو میں سے بھی دیکھیں:

گفتمش "بگذر ز آئین فراق — ابغض الاشیاء عندی الطلاق"
گفت "ساز زندگی، سوزِ فراق — اے خوشا سرمستیٔ روز فراق
بر لبم از وصل می ناید سخن — وصل اگر خواہم نہ او ماند نہ من"

فلک زحل:۔ اس فلک میں میر جعفر بنگالی اور میر صادق میسوری نیز روحِ ہند کی درد انگیز 'خود کلامیاں' ملتی ہیں:

جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن
ناقبول و ناامید و نامراد — ملتے از کارِ شاں اندر فساد
می ندانی خطۂ ہندوستان — آن عزیز خاطرِ صاحبدلاں؟
در گلش تخمِ غلامی را کہ کِشت؟ — ایں ہمہ کردارِ آں ارواحِ زشت

ماورائے افلاک:۔ اس طویل حصّے میں فلسفیوں، شاعروں، عارفوں اور بادشاہوں کے متعدد کردار ہیں۔ بہشتِ بریں میں شاعر اور اس کے راہنما کو حوریں نظر آتی ہیں، مگر یہاں راہنما رخصت ہو جاتا ہے اور شاعر کو 'جمال لایزال' کی ندائیں آتی ہیں۔ زندہ رود کئی سوال پوچھتا ہے اور ندائے جمال سے ان کے جوابات سنتا ہے۔ مگر 'تقادیرِ عالم' کے بارے میں اس کے سوال کا کوئی براہِ راست جواب نہیں ملتا بلکہ غیب کے راز پوچھنے پر 'جمال'، 'تجلی جلال' سے بدل جاتا ہے اور شاعر کو یارائے سخن نہیں رہتا۔ یہاں ہم سلطان شہید (سلطان فتح علی ٹیپوؒ)، حوروں اور حضور' (در حضور ندائے جمال) والے حصوں سے چند اشعار نقل کرتے ہیں، مگر فارسی دان حضرات

کے لیے ضروری ہے کہ وہ جاوید نامے ایسی اعلیٰ کتاب کو تمام پڑھیں۔

موسمِ گل ؟ ماتم و ہم نائے و نوش
غنچہ در آغوش و نقشِ گل بدوش

لالہ را گفتم و یکے دیگر بسوز،
گفت، راز ما نمی دانی ہنوز

از خس و خاشاک تعمیرِ وجود
غیر حسرت چیست پاداش نمود ؟

در سرائے ہست و بود آئی ؟ میا
از عدم سوئے وجود آئی ؟ میا

زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟
یک دمِ شیری بہ از صد سال میش

جنگِ مومن چیست ؟ ہجرت سوئے دوست
ترکِ عالم ، اختیار کوئے دوست

با دل پُرخوں، رسیدم بر درش
یک ہجومِ حُور دیدم بر درش

بر لبِ شاں "زندہ رود" اے زندہ رود
زندہ رود، اے صاحب سوز و سرود

شور و غوغا از یسار و از یمیں
یک دو دَم با ما نشیں، با ما نشیں

چیست بودن دانی اے مردِ نجیب ؟
از جمالِ ذاتِ حق بردن نصیب

آفریدن ؟ جستجوئے دلبرے
وا نمودن خویش را بر دیگرے

زندہ ای؟ مشتاق شو، خلاق شو
ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو

چیست ملت اے کہ گوئی لا الہ ؟
با ہزاراں چشم بودن یک نگہ

مردہ ای؟ از یک نگاہی زندہ شو
بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

زندہ رود: من کیم؟ تو کیستی؟ عالم کجاست
درمیانِ ما و تو دوری چراست ؟

من چرا در بند تقدیرم بگوئے
تو نمیری من چرا میرم بگوئے

ندائے جمال: بودہ ای اندر جہانِ چار سو
ہر کہ گنجد اندرو ، میرد در او

زندگی خواہی خودی را پیش کن
چار سو از غرق اندر خویش کن

باز بینی من کیم تو کیستی ؟
در جہاں چوں مُردی و چوں زیستی

بالِ جبریل (طبع اوّل ۱۹۳۵ء)

یہ کتاب اقبال کی اردو شاعری کا نمونۂ کمال ہے۔ فارسی نظم اور غزل کا جو عروج "پیامِ مشرق" اور "زبورِ عجم" میں بالترتیب نظر آتا ہے، اردو شاعری کے لحاظ سے اُسے "بالِ جبریل" میں دیکھنا

چاہیے۔ مکالماتی حسن و خوبی والے اشعار کی بھی اس کتاب میں کمی نہیں۔ اس کے علاوہ 'خود کلامی' والے اشعار بھی موجود ہیں۔ قطعہ 'پروانہ اور جگنو' ملاحظہ ہو:

پروانہ: پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو — کیوں آتشِ بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

جگنو: اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں — دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں

(پروانے اور جگنو کے بارے میں یہ نقطۂ نظر اقبال کے ہاں کئی جگہ ملتا ہے۔ مثلاً 'پیامِ مشرق' کے حصہ لالۂ طور میں اس مضمون پر متعدد دو بیتیاں دیکھی جا سکتی ہیں)۔

مکالمہ 'مرید و پیر' ایک فکر انگیز نظم ہے جس میں 'مرید ہندی' (اقبال) اردو میں سوال کرتا ہے اور جواب میں 'پیر رومی' (مولانا جلال الدین محمد) کی مثنوی کے اشعار نقل کرتا ہے۔ کوئی دو درجن سوالات کے ذریعے شاعر مختلف مسائل کے بارے میں افکار رومی کو پیش کرتا ہے۔ فارسی اشعار مثنوی کے سارے چھ دفاتر سے ماخوذ ہیں اور سوال و جواب کبھی ایک ایک بیت پر مبنی ہیں اور کبھی بیشتر پر۔ اس شاہ کار نظم کا انتخاب مشکل ہے مگر مقالے کے اختصار کی مشکل چند مکالموں کو نقل کرنا مجاز قرار دے گی۔ مگر اقبال کی رومی شناسی اور مکالمہ سازی پر توجہ رکھنا بہرحال ضروری ہے۔

مرید: آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں — ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

پیر: مرغ پر نارستہ چوں پراں شود — طعمۂ ہر گربۂ درّاں شود

مرید: زندہ ہے مشرق تری گفتار سے — اُمتیں مرتی ہیں کس آزار سے؟

پیر: ہر ہلاکِ اُمتِ پیشیں کہ بود — زانکہ بر جندل گماں بردند عُود

مرید: اب مسلماں میں نہیں وہ رنگ و بُو — سرد کیوں کر ہو گیا اس کا لہو؟

پیر: تا دلِ صاحبدلے نامد بدرد — ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد

مرید: اے شریکِ مستیٔ خاصانِ بدر — میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر

پیر: بال بازاں را سوئے سلطاں برد — بال زاغاں را بہ گورستاں برد

مرید: علم و حکمت کا ملے کیوں کر سراغ؟ — کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟

پیر: علم و حکمت زاید از نانِ حلال — عشق و رقت آید از نانِ حلال

'جبریل و ابلیس' کا مکالمہ بھی اقبال کی قدرتِ سخن کا اعجاز ہے۔ 'جاوید نامے' کی منقولہ مثالوں کی

طرح یہاں بھی ایک ایک مصرعے میں سوال وجواب کو دیکھ سکتے ہیں، جیسے،

جبریل : ہمدمِ دیرینہ ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو ؟

ابلیس : سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے و آرزو

'اذان' میں ستارۂ سحر، چاند، مریخ، زہرہ اور دوسرے ستارے مصروفِ گفتگو ہیں۔ شاعر کا مدعا یہ ہے کہ شب زندہ دار اور سحر خیز مسلمانوں کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔

واقف ہو اگر لذّتِ بیداریِ شب سے — اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پُر اسرار

آغوش میں اس کی وہ تجلّی ہے کہ جس میں — کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار

کتاب کے آخر میں 'شیر اور خچر' اور 'چیونٹی اور عقاب' کے ایک ایک بیت پر مبنی دلچسپ مکالمے ملتے ہیں:

شیر : ساکنانِ دشت و صحرا میں ہے تو سب سے الگ — کون ہیں تیرے اب و جد؟ کس قبیلے سے ہے تو؟

خچر : میرے ماموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور — وہ صبا رفتار، شاہی اصطبل کی آبرو

چیونٹی : میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند — تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند؟

عقاب : تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں — میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

ضربِ کلیم (طبع اوّل ۱۹۳۶ء)

اس کتاب کو اقبال نے 'اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف' کا عنوان دیا ہے۔ مکالمے ان نظموں میں دیکھے جا سکتے ہیں: علم و عشق (مثلثِ مستزاد)، تقدیر (ابلیس و یزداں)، شعاعِ امید، نسیم و شبنم، صبحِ چمن، ایک بحری قزاق اور سکندر۔

'تقدیر' (مکالمہ ابلیس و یزداں) کا اصل خیال شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ھ) کی 'الفتوحات المکیہ' (جلد ۳) سے ماخوذ ہے مگر ایک عام مطلب کو مکالمے کا دلپذیر اسلوب اقبال نے بخشا ہے:

ابلیس : اے خدائے کن فکاں! مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر — آہ، وہ زندانیٔ نزدیک و دور و دیر و زود

حرفِ 'استکبار' تیرے سامنے ممکن نہ تھا — ہاں مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

یزداں : کب کھلا تجھ پر یہ راز، انکار سے پہلے کہ بعد؟

ابلیس : بعد، اے تیری تجلی سے کمالاتِ وجود!

یزداں : پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اُسے — کہتا ہے 'تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود'

(فرشتوں کی طرف دیکھ کر) : دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام — ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

"نسیم و شبنم" میں شاعر نے ایک بہت بڑی بات کو آسان مکالمے میں بیان کر دیا ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ فکری بلند پروازی کے نتیجے میں عملی اور حقیقی زندگی سے دست کش نہ ہونا چاہیے:

نسیم : انجم کی فضا تک نہ ہوئی میری رسائی — کرتی رہی میں پیرہنِ لالہ و گل چاک
مجبور ہوئی جاتی ہوں میں ترکِ وطن پر — بے ذوق ہیں بلبل کی نواہائے طربناک
دونوں سے کیا ہے تجھے تقدیر نے محروم — خاکِ چمن اچھی کہ سراپردۂ خاک
شبنم : کھینچیں نہ اگر تجھ کو چمن کے خس و خاشاک — گلشن بھی ہے اک سِرِّ سراپردۂ افلاک

"صبحِ چمن" ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں شاعر کا مشاہدہ، نکتہ آفرینی، نتیجہ گیری اور قوتِ مکالمہ اور حسن و خوبیِ ادا وغیرہ نقطۂ کمال پر پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دیکھیں سخت کوشی، لذتِ پرواز اور عملی زندگی سے لو لگائے رکھنے کا درس کس خوش اسلوبی سے دیا گیا ہے۔ نظم کے کردار تین ہیں:

پھول : شاید تو سمجھتی تھی وطن دور ہے میرا — اے قاصدِ افلاک! نہیں، دور نہیں ہے
شبنم : ہوتا ہے مگر محنتِ پرواز سے روشن — یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے
صبح : مانندِ سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ — آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش و لیکن — ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

"ایک بحری قزاق اور سکندر" میں اقبال نے جوع الارض رکھنے والے لشکر کشوں اور فاتحین کو قزاق اور راہزن قرار دیا ہے:

سکندر : صلہ تیرا تری زنجیر یا شمشیر ہے میری — کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی
قزاق : سکندر! حیف تو اس کو جواں مردی سمجھتا ہے — گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی؟
ترا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی — کہ ہم قزاق ہیں دونوں، تو میدانی میں دریائی

ارمغانِ حجاز

اقبال کا یہ آخری مجموعۂ کلام ان کی وفات کے چند ماہ بعد ۱۹۳۸ء کے آخر میں شائع ہوا اور اس کے اُردو حصے میں تین چار مکالمات سے پُر نظمیں بے حد اثر انگیز ہیں۔ ایک دو بیتی کے تین کردار دیکھیں:

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے — تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون؟

ندا مسجد کی دیواروں سے آئی : فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

نظموں کے عنوانات 'عالمِ برزخ، تصویر و مصور، اور ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' ہیں۔ پہلی نظم کے کردار، مردہ، قبر، زمین اور صدائے غیب ہے۔ یہ نظم ابدیت اور بقائے ذات کے بارے میں اقبال کے تصورات کی آئینہ دار ہے۔ اقبال کے نزدیک حیاتِ اُخروی کی نعمتوں سے وہی افراد بہرہ مند ہوں گے، جو آزاد، خوددار اور خود شناس رہے ہوں۔ تصویر و مصور میں جبر و قدر، عقل و عشق کے مسائل پر اظہارِ نظر کیا ہے۔ ضمناً یہ نکتہ بھی زیرِ بحث آیا ہے کہ وہی تصویر اپنے مصور کا دیدار کر سکتا ہے جو خود شناس ہو۔ دونوں نظموں میں بقائے ذات اور دیدارِ ذاتِ باری نیز تکاملِ خودی کے امور زیرِ نظر ہیں تیسری نظم البتہ زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ، ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی۔ اس کے کردار چھ ہیں، ابلیس اور اس کے پانچ مشیر۔ جیسا کہ راقم نے چند سال قبل لکھا تھا (سہ ماہی 'اقبال'، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۹ء) زکریا قزوینی کی عربی کتاب 'عجائب المخلوقات' میں بھی ابلیس اور اس کے مشیروں کی، ساحلِ سمندر پر ایسی مجلس کا انعقاد بہ زبانِ نثر موجود ملتا ہے، مگر اس میں اقبال کے سے عصری مسائل پر تبصرے، نعرہ، مکالمے اور راہنما پیغامات کہاں؟ یہ اقبال کی زندہ جاوید اور تازہ بتازہ نو بنو طویل نظموں میں سے ایک ہے۔ ہم یہاں مطالب کی ایک تلخیص اور چند مکالموں کو نقل کر کے اس مجمل بحث کو ختم کرتے ہیں۔

ابلیس اپنے مشیروں کو اپنے سیاہ کارناموں سے آگاہ کرتا ہے کہ ملوکیت کا استبداد، دین و دنیا کی تفریق، نظامِ سرمایہ داری اور رضا بہ تقدیر اسی کی سوغاتیں ہیں۔ پہلا مشیر ابلیس کے دعوؤں کی توثیق کرتے ہوئے بعض دیگر امور پہ روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے نزدیک مسلمانوں کی ملوکیت دوستی، ان کی کلامی اور الٰہیاتی بحثیں، بے روح عبادات و مناسک اور بعض علما و فقہا کی طرف سے ترکِ جہاد کا اعلان، تلبیسِ ابلیس کے کرشمے ہیں۔ سلطانیِ جمہور کے بارے میں دوسرے مشیر کے ایک سوال کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ یورپ کے طرزِ جمہوریت میں بھی ملوکانہ استبداد مضمر ہے۔ تیسرا اور چوتھا مشیر اشتراکی نظام کے خطرے پر تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ پانچواں مشیر اس خطرے پر ابلیس کی خصوصی توجہ مبذول کراتا ہے۔ ابلیس کہتا ہے کہ ملوکیت، جمہوریت اور اشتراکیت میں

سے ایک بھی نظامِ ابلیسی کے لیے خطرہ نہیں بن سکتا۔ اس کا حقیقی رقیب اسلام ہے۔ بشرطیکہ مدعیانِ ایمان اس پر عمل کرنے لگیں۔ اسلام میں دنیا اور آخرت اور دین و سیاست کی تفریق نہیں۔ اس دین میں شخصی اور قومی ملکیت کے حدود متعین ہیں۔ مال و دولت کا نیکی کی راہ میں خرچ کرنا، اس دین کے پیروؤں کا ایک فعلِ معروف ہے اور دیگر راہنما اصول بھی جامع اور ابدی نوعیت کے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اسلام ابلیسی نظام کے لیے "لا حول و لا قوۃ الا باللہ" کا مظہر ہے۔

پہلا مشیر: یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج ۔۔۔ صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی ۔۔۔ ورنہ 'قوالی' سے کچھ کمتر نہیں 'علمِ کلام'

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا ۔۔۔ کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

دوسرا مشیر: خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر؟ ۔۔۔ تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

پہلا مشیر: ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس ۔۔۔ جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو ۔۔۔ ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تیسرا مشیر: روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب ۔۔۔ ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب؟

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد ۔۔۔ توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

چوتھا مشیر: توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ ۔۔۔ آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب

پانچواں مشیر: گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام ۔۔۔ اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار

خطابِ ابلیس: وہ یہودی فتنہ گر، وہ روحِ مزدک کا بروز ۔۔۔ ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج ۔۔۔ کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

ابلیس: پست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک ۔۔۔ مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد ۔۔۔ یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے ۔۔۔ جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ ۔۔۔ کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے ۔۔۔ مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے ۔۔۔ نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمین
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے — پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ابلیس اور اس کے مشیروں کے منصوبے اندازہ کیجیے، کس قدر خطرناک ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۵۴)

کے میزبان کی حیثیت سے اُسے نشر کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

جس طرح اس رسالے کا نام "آسان قرأت" ہے، اسی طرح عملی طور پر بھی یہ بہت آسان اور سہل ہے۔ اس پر بہت سے علمائے کرام اور قرائے عظام کی تقریظیں ہیں، جن میں مولانا قاری عبدالقادر آزاد، مولانا حافظ عبدالرشید، قاری اظہار احمد تھانوی، قاری نثار احمد عثمانی، مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، قاری محمد علی رضوان، قاری محمد ظریف، مولانا محمد بخش مسلم، جناب عبدالحی دہلوی، جناب حافظ نذر احمد کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جو اس بہترین فن سے خود بھی آگاہ ہیں۔

ہم مدارس کے اساتذہ، قرائے کرام اور عام حضرات سے اس کے مطالعے کی سفارش کرتے ہیں۔ یہ رسالہ اپنی افادیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اسے سرکاری مدارس اور دیگر سرکاری اداروں میں جہاں قرآن مجید کی تعلیم کا التزام ہو، داخلِ نصاب کیا جائے۔

ایک حدیث

قَالَ اَنَسٌ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَحْسَنِ النَّاسِ خُلُقًا فَاَرْسَلَنِيْ يَوْمًا لِحَاجَةٍ ، فَقُلْتُ وَاللّٰهِ لَا اَذْهَبُ ، وَفِيْ نَفْسِيْ اَنْ اَذْهَبَ لِمَا اَمَرَنِيْ بِهٖ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، قَالَ فَخَرَجْتُ حَتّٰى اَمُرَّ عَلٰى صِبْيَانٍ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ فِي السُّوْقِ ، فَاِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَابِضٌ بِقَفَايَ مِنْ وَرَائِيْ ، فَنَظَرْتُ اِلَيْهِ وَهُوَ يَضْحَكُ ، فَقَالَ يَا اُنَيْسُ اِذْهَبْ حَيْثُ اَمَرْتُكَ ، قُلْتُ نَعَمْ اَنَا اَذْهَبُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ۔ قَالَ اَنَسٌ وَاللّٰهِ لَقَدْ خَدَمْتُهٗ سَبْعَ سِنِيْنَ اَوْ تِسْعَ سِنِيْنَ مَا عَلِمْتُ قَالَ لِشَيْءٍ صَنَعْتُ ، لِمَ فَعَلْتَ كَذَا وَكَذَا وَلَا لِشَيْءٍ تَرَكْتُ ، هَلَّا فَعَلْتَ كَذَا وَكَذَا ۔ (ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الحلم واخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ حسنِ اخلاق کے مالک تھے ۔ آپ نے ایک دن مجھے کسی کام کے لیے جانے کو فرمایا، میں نے جواب دیا، خدا کی قسم میں نہیں جاؤں گا، اور میرے جی میں یہ بات تھی کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، میں ضرور جاؤں گا، چنانچہ میں جانے کے لیے گھر سے نکلا تو میرا گزر ان بچوں پر ہوا جو بازار میں کھیل کود رہے تھے ۔ اچانک وہاں حضور تشریف لے آئے اور آپ نے پیچھے سے میری گردن پکڑ لی، میں نے دیکھا تو آپ ہنس رہے تھے ۔ آپ نے (پیار سے مجھے) فرمایا، اُنیس جہاں [illegible] جانے کو کہا تھا، وہاں جاؤ، میں نے عرض کیا، ہاں! یا رسول اللہ جا رہا ہوں ۔۔۔۔ (یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد) حضرت انس نے سات سال فرمایا یا نو سال (اس میں راوی کو شک ہے) کہ میں نے حضورؐ کی خدمت کرنے کا شرف حاصل کیا، لیکن مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی چیز کے بارے میں کہا ہو کہ یہ کام میں نے کر دیا ہے تو آپ نے فرمایا ہو کہ تم نے اس طرح کیوں کیا؟ اور نہ یہ کہ میں نے کہا ہو کہ یہ کام میں نے نہیں کیا تو آپ نے فرمایا ہو کہ تم نے اس طرح کیوں نہیں کیا؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی اور خادمِ خاص تھے ۔

انھوں نے نو سال سے زیادہ عرصہ (تقریباً دس سال) تک حضور کی خدمت کرنے کی سعادت حاصل کی۔ یہ ان کے بچپن کا زمانہ تھا۔ اس زمانے کا یہ واقعہ جو انھوں نے بیان فرمایا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی حسنِ اخلاق، نہایت متحمل مزاجی اور بہ درجہ غایت رحم دلی پر دلالت کرتا ہے۔ ظاہر ہے، حضرت انس وہی عادات رکھتے تھے جو عام طور پر بچوں میں پائی جاتی ہیں، یعنی دل چاہا تو فوراً تعمیلِ حکم کر دی اور کام کے لیے بھاگ دوڑے، اگر نہ جی چاہا تو صاف انکار کر دیا اور کوئی پروا نہ کی۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ حضور کے کہے بغیر کوئی کام کر دیا اور وہ غلط ہوا، یا حضور کے کہنے کے باوجود سستی کی اور اپنے آپ کو کام کے لیے آمادہ نہ کر سکے۔ یعنی بچپن میں جو عادتیں ایک بچے میں ہو سکتی ہیں، وہ حضرت انس میں موجود تھیں اور ان کا اظہار وہ خود بھی کرتے ہیں، جس طرح ضد میں آکر بچے قسمیں کھانے لگتے ہیں، اسی طرح انس بھی قسمیں کھاتے اور انکار پر اتر آتے تھے۔ لیکن قربان جائیے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر کہ آپ نے نہ کبھی ان کو ڈانٹا، نہ مارا پیٹا اور نہ سختی اور تشدد کا کسی صورت میں بھی برتاؤ کیا۔ ہمیشہ نرمی، حلم اور شفقت کا مستحق گردانا اور جو کچھ کہا، انتہائی پیار اور محبت بھرے الفاظ سے کہا۔ بچے کو ہر معاملے میں بچے کی سطح پر ہی رکھا اور اس کے لیے وہی الفاظ استعمال فرمائے جو بچے کے لیے مخصوص ہیں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام بچوں کی نفسیات کا خوب علم رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان پر سختی کی جائے تو وہ ضد اور سرکشی پر اتر آتے ہیں اور اس سے ان کی عادتیں بگڑ جاتی ہیں۔ جو کام نرمی سے ہو سکتا ہے وہ سختی سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خادم اور ملازم کو بالخصوص نرمی کا مستحق گرداننا چاہیے کیوں کہ اس سے ہر وقت کام پڑتا ہے اور اس سے کام لینے کا صحیح طریقہ نرمی ہے۔

ہمارے گھروں میں بھی عام طور پر چھوٹی عمر کے بچوں کو ملازم اور خادم کی حیثیت سے رکھا جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ ہمارا ان کے بارے میں کیا طرزِ عمل ہوتا ہے؟ کیا ہم ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا سختی اور تشدد سے پیش آتے ہیں؟ کیا ہم اپنے طرزِ عمل سے ان کی عادتوں کو بگاڑنے کا باعث تو نہیں بنتے؟ اس حدیث کی روشنی میں ہم سب کو اس پر غور کرنا چاہیے۔

نقد و نظر

آسان قرأت

مرتب : جناب محمد نور الاسلام غازی مونگیری

ناشر : مجمع شبان المسلمین العالمی (پاکستان) فورٹ روڈ، لاہور

صفحات ۳۲+۱۵ کل ۴۸ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپے

قرآن مجید، اللہ کا کلام اور دنیا کی مقدس ترین کتاب ہے۔ یہ وہی نطقِ جبریل ہے جو اللہ نے اپنے آخری نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مطہر پر نازل فرمایا۔ اس کے ایک ایک حرف کی تلاوت سے دس دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں، جس جگہ اس کی تلاوت کی جائے وہاں اللہ کی رحمتوں کا نزول شروع ہو جاتا ہے اور فرشتے آسمان سے اتر کر رحمتِ خداوندی کا نظارہ کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔ خیرکم من تعلم القرآن وعلمه۔ یعنی تم میں بہتر شخص وہ ہے جو خود قرآن پڑھتا اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔

قرآن مجید کے بارے میں خصوصیت سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اسے ٹھہر ٹھہر کر اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھا جائے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں بالعموم اس کا التزام نہیں کیا جاتا، اور ہم میں سے اکثر کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اس کی تلاوت کا اصل طریقہ کیا ہے۔ ہم جناب محمد نور الاسلام غازی مونگیری کے شکر گزار ہیں کہ اللہ نے ان کو توفیق مرحمت فرمائی اور انھوں نے "آسان قرأت" کے نام سے ایک ایسا رسالہ سپردِ قلم کیا، جس میں قرآن کے حروف کے صحیح تلفظ اور مخارج کی عمدہ طریقے سے وضاحت کی گئی ہے۔ ان کا سمجھانے کا انداز بڑا ہی سہل ہے، بچے، جوان، بوڑھے، عورتیں سب اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

غازی مونگیری خود بہترین قاری ہیں اور قرأت کی مشہور درس گاہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کے سند یافتہ ہیں۔ یہ وہی غازی مونگیری ہیں جو روزانہ ریڈیو پاکستان (لاہور) سے اسلامی اور مذہبی پروگرام

(باقی بر صفحہ ۵۱)

علمی رسائل کے مضامین

البلاغ، بمبئی۔ اپریل ۱۹۸۰

مطالعات و تعلیقات	قاضی اطہر مبارک پوری
زائرینِ حرم (مسلسل)	قاضی اطہر مبارک پوری
سفریات مغربی افریقہ	مولانا خالد کمال مبارک پوری

بینات، کراچی۔ اپریل، مئی ۱۹۸۰

دارالعلوم دیوبند اور اس کے بنیادی اصول	مولانا قاری محمد طیب
عقیقہ اسلام کی نظر میں	مولانا محمد اجمل خاں
روس میں اشتراکیت	مولانا بشیر احمد کشمیری
بصرے کی تعلیم گاہوں میں چند لمحے	جناب محمود عارف

ترجمان الحدیث، لاہور۔ مئی ۱۹۸۰

حافظ ابن کثیر	ملک عبدالرشید عراقی
مولانا شمس الحق عظیم آبادی	مولانا ارشاد الحق اثری
قمری تقویم اور ہجری تقویم	مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

الحق، اکوڑہ خٹک۔ فروری، مارچ ۱۹۸۰

علمائے دیوبند اور میدانِ صحافت	مولانا سمیع الحق
قرآن کریم کا ایک زندہ اعجاز — اعداد و شمار کی روشنی میں	حسن احمد عابدین۔ ترجمہ: مولانا عبدالرؤف حقانی
دین و سیاست۔ اہل اسلام کے لیے لمحۂ فکریہ	مولانا منصور انصاری غازی
شاہ ولی اللہ کا نظریۂ تصوف	مولانا عبدالحی فاروقی ایم۔ اے
اقبال کی ایک غیر مدون نظم	جناب احمد خاں صاحب
منظوم پشتو ادب کی ایک فقہی کتاب	جناب وحید الرحمٰن شاہ ایم اے

العلم، کراچی۔ جنوری تا مارچ ۱۹۸۰

دوسری اسلامی کانفرنس برائے اسلامی تعلیم	جناب شاہ الحق صدیقی
کتاب "دی ہنڈریڈ" میں آنحضرت کا نمایاں ذکر جمیل	جناب اخلاص حسین زبیری ایم۔اے
قائد اعظم کی اصول پروری	رئیس احمد جعفری مرحوم
ممتاز حسن اور اقبال	پروفیسر سعیدہ بلقیس
قرنیہ کی پیوندکاری۔ ایک انسانی مسئلہ	جناب افتخار حسین
سمعی و بصری امدادی اشیا کا تعلیمی استعمال	جناب صادق علی عباسی
محاورات اور ان کی وجہ تسمیہ	جناب محبوب عالم عکس
"واحد متکلم کا شاعر، انور شعور"	جناب احفاظ الرحمٰن
پروفیسر محمد معین الرحمٰن دردائی مرحوم۔ حیات و تصانیف پر ایک نظر	پروفیسر ابو الفتح سرور
سر سید کا سیاسی نظریۂ فکر	محترمہ ایم، اے، ایچ کوثر
"نیک عمل کی برکات"	بدر النسا ء الرحمٰن، ایم۔اے
سندھی کی اساسی شاعری (رسالہ العارفین)	ڈاکٹر میمن عبد المجید سندھی

الفرقان، لکھنؤ۔ مئی ۱۹۸۰

دار العلوم دیوبند کا اجلاس صد سالہ	مولانا محمد منظور نعمانی
کردار سازی میں مدارس اور دینی تعلیم کا حصہ	مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

معارف، اعظم گڑھ۔ مارچ ۱۹۸۰

سیرۃ النبی کی ایک اہم کتاب "الشفا" پر ایک نظر (مسلسل)	مولانا ضیاء الدین اصلاحی
قطب الدین بختیار کاکی کے مجموعہ ملفوظات فوائد السالکین کا مطالعہ	مولانا اخلاق حسین دہلوی
امام یوسف بن یحییٰ بویطی	مولانا محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی
کشمیر میں اسلام کی اشاعت	ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری

جولائی ۱۹۸۰

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف - قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے
سالانہ چندہ ۱۵ روپے - بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکار نمبر
S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971
جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون نمبر ۵۲۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۳ | جولائی ۱۹۸۰ | شعبان ۱۴۰۰ھ | شمارہ ۷

ترتیب

تاثرات

سالِ رواں میں جن اہم شخصیتوں نے سفرِ آخرت کیا ان میں مولانا غلام اللہ خاں بھی شامل ہیں۔ مولانا مرحوم ۲۶ اپریل کو عمرہ کرنے کے لیے مکہ معظمہ گئے، وہاں سے دہران پہنچے اور پھر تبلیغ کے لیے دوبئی کا عزم کیا۔ دوبئی میں ۲۷ مئی ۱۹۸۰ء کو علی الصبح دل کا دورہ پڑا، اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۷۶ سال کی تھی۔ ان کی میت پاکستان لائی گئی اور اٹک میں انھیں دفن کیا گیا۔

مرحوم کا شمار پاکستان کے مشہور علما میں ہوتا تھا۔ وہ بہت بڑے مقرر اور ناموَر مبلغ تھے۔ انھوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا سید انور شاہ کشمیری اور مولانا حسین علی (واں بھچراں ضلع میانوالی) جیسے جلیل القدر اساتذہ سے استفادہ کیا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی زندگی اشاعتِ دین کے لیے وقف کر دی۔

مولانا مرحوم قیامِ پاکستان کے بعد سے راولپنڈی میں اقامت گزیں تھے، وہاں انھوں نے ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھی اور لوگوں کو خوب مستفید فرمایا۔ راولپنڈی کی مسجد میں وہ خطابت و امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔

مولانا غلام اللہ خاں کا شمار جرأت مند اور حق گو علما کی جماعت میں ہوتا تھا، ان کا ایک خاص اندازِ بیان تھا، جس پر وہ سختی سے قائم تھے۔ اس میں کئی دفعہ ان کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا، لیکن وہ اپنے موقف پر ہمیشہ قائم رہے۔ تقریر کے علاوہ انھوں نے تحریری خدمات بھی انجام دیں۔ قرآن مجید کی تفسیر ان کا اصل موضوع تھا۔

انھوں نے ہر اس تحریک میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس کا مقصد اسلام کی نشر و اشاعت اور دین کی تبلیغ تھا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی

جمال الدین اصفہانی کے کلام میں ہجو و مزاح کا عنصر

محمد جمال الدین بن عبدالرزاق اصفہان میں پیدا ہوا۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ اصفہان ہی میں گزرا۔ حصولِ معاش کے لیے اسے آذربائیجان اور مازندران کا بھی سفر کرنا پڑا۔ علم و حکمت اور ریاضی میں دسترس کے علاوہ اس نے نقاشی اور زرگری میں بھی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ اسی بنا پر اپنے زمانے میں جمالِ زرگر و نقاش کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی زبان میں لکنت تھی۔ اس کے چلہ بیٹوں میں سے صرف ایک بیٹے کمال الدین اسمٰعیل نے شاعری میں نام پیدا کر کے خلف الصدق ہونے کا ثبوت دیا۔ جمال نے ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں وفات پائی۔

جمال الدین نے اصفہان کے مختلف رؤسا، رجالِ بزرگ اور سلاطین، امرا اور صدور کی مدح سرائی کی ہے۔ اس کے ممدوحین کی تعداد ۲۷ تک پہنچتی ہے۔ اپنے دور کے بعض مشہور شعرا، مثلاً خاقانی، انوری، ظہیر فاریابی اور رشید وطواط سے اس کے روابط تھے۔

جس طرح اس نے شاعری کی مختلف انواع ــــ قصیدہ، غزل، قطعہ، ترکیب بند، رباعی وغیرہ ــــ میں طبع آزمائی کر کے اپنی مہارت و استادی کا لوہا منوایا ہے، اسی طرح موضوعات و مطالب ــــ مدح و ہجو، اور وعظ و حکمت ــــ کے معاملے میں بھی اسے ماہر ہونے کا شرف حاصل ہے۔

فارسی کے دیگر شعرا کے مقابلے میں جمال کے ہجویہ اشعار میں عریانی، رکاکت اور ابتذال کسی حد تک کم ہے، وہ سیدھے سادے اور پُر تاثیر انداز میں، ہجو اور طنز کے مضمون کو اٹھاتا اور آگے بڑھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ایسے اشعار میں غیر مانوس الفاظ، دشوار ترکیبات اور دور از کار تشبیہات و استعارات شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ اور یہ امر اس بات کی علامت ہے کہ اس کے یہ اشعار اس کے ذوق و طبع بلند اور احساسات کی پیداوار ہیں اور شاعر نے اس ضمن میں ہر قسم کے تکلف، تصنع اور بھاری بھرکم علمی اصطلاحات کے استعمال سے پہلوتہی کی ہے، جبکہ اس دور کے بعض شعرا کے یہاں یہ باتیں عام دیکھنے میں آتی ہیں۔

یوں تو جمال کے یہاں مختلف شعرا اور اشخاص کی ہجویں اشعار ملتے ہیں، لیکن زیادہ تر خسیس امرا اور بخیل شرفا اس کے ان حملوں کا نشانہ بنے ہیں۔ اپنی جائے ولادت کو بھی اس نے کسی بنا پر برا بھلا کہا ہے۔ اس کی ہجوگوئی کے کئی اسباب ہیں، جن کا اپنے اپنے مقام پر ذکر ہوگا، تاہم ایک سبب، جسے بنیادی سبب سمجھنا چاہیے، خود اس کے نزدیک یہ ہے کہ جو میرا حق ضائع کرتا ہے اس کی ہجو کہنا عین جائز ہے اور اس وجہ سے مجھے معذور و مجبور جاننا چاہیے:

اگر در شعر من زین پس یکی بیت ہجا گفتم — مرا معذور باید داشت چو آن بیت می خوانی
روا باشد ہجای آن کہ حق من کند ضایع — بخوان "ان لا یحب اللہ" اگر قرآن ہمی دانی

ایک اور قطعے میں، جسے علامہ شبلی نے انوری سے منسوب کیا ہے، جمال نے ہجوگوئی کا سبب یہ بتایا ہے کہ حریص شعرا کے یہاں تین طریقے رائج ہیں۔ پہلے مدح کہتے ہیں، جب ممدوح سے کچھ ہاتھ نہیں لگتا تو تقاضے کے طور پر ایک قطعہ لکھ کر پیش کیا جاتا ہے، اور جب اس صورت میں بھی بات نہ بنے تو حصولِ مال کے لیے، ہجو کا ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ یہ تفصیل دے کر اپنے ممدوح سے کہتا ہے، حضور اول الذکر دو باتیں ہو چکیں، اب تیسری کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ دوسرے لفظوں میں وہ کہتا ہے، نکالتا ہے مال یا کروں تیری رگڑائی:

بزرگوارا در انتظار بخشش تو — نماندہ است مرا طاقت شکیبائی...
سہ چیز رسم بود شاعران طامع را — نخست مدح و دوم قطعۂ تقاضائی
اگر بداد سوم شکر، اگر نداد ہجا — من آن دوگانہ بگفتم، سوم چہ فرمائی؟

درج ذیل دو اشعار میں اس نے مدح اور ہجوگوئی میں اپنی شاعرانہ قوت و استعداد کا بلند بانگ دعویٰ اور خود کو کچھ اس قدر خوفناک ظاہر کیا ہے کہ شاید ہی کوئی ممدوح اسے ایسا جان کر بھی خست و بخیلی سے کام لے سکے۔ ہجوگوئی میں وہ آسمانِ مردم خوار اور اس کا قلم سانپ کی طرح زہر فشاں ہے:

من گہِ مدح آفتابِ نور فشانم — من گہِ ہجو آسمانِ مردم خوارم
شہد چشاند بمدح لفظِ چو نوشم — زہر فشاند بہجو کلکِ چو مارم

اس دعوے کے علاوہ وہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ تمام تر انعام و اکرام کے باوصف اگر میں نے کسی کی ہجو نہیں کہی تو یہ میرا اس پر احسان ہے:

راستی با این تفضلہا و این انعامہا — ہر کرا ہجوی نگفتم بروی از من منتی است

مندرجہ بالا اشعار سے بظاہر یہ پتا چلتا ہے کہ جمال طبعاً ایک ہجو گو شاعر ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور مختلف قرائن کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فطرتاً ہجو و ہزل کا شاعر نہیں ہے۔ ممکن ہے ان گوناگوں اسباب و علل کے علاوہ جنھوں نے اسے اس ناشائستہ کام پر مجبور کیا اس نے بھی اپنے بیٹے کمال الدین اسمٰعیل کی طرح ہجو گوئی کو شاعری کے لوازم میں سے جانا ہو۔ بہرحال آخر میں اس نے اُسے بُری بات سمجھتے ہوئے اس سے توبہ کر لی تھی، جس کا اظہار اس کے اس قطعے سے ہوتا ہے۔ اس میں وہ ہجو اور سابقہ کی ہوئی مدح دونوں سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے:

مرا خود نیست عادت ہجو گفتن — کہ کردستم طمع زین قوم کوتاہ

معاذاللہ کہ کس را ہجو گویم — ز مدحِ گفتہ نیز استغفر اللہ

اگر ہم تاریخِ ادب کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں اربابِ فضل و دانش خوار و زبوں رہے ہیں جبکہ کاسہ لیسوں، بے غیرتوں اور گھٹیا اور پست فطرت لوگوں کی زندگی بڑی خوش حالی میں بسر ہوئی ہے اور وہ اوجِ کمال پر بھی پہنچے ہیں۔ ظاہر ہے شاعر کسی معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے، یعنی نازک دل، لطیف احساسات اور تند و سوزاں جذبات اس کا سرمایۂ حیات ہیں۔ جب وہ معاشرے میں کسی قسم کی ناہمواری، غلط بخشی، غلط کاری اور اس قسم کی خرابیاں دیکھتا ہے تو اس کا دل کڑھتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ دل میں آئی ہر بات کہہ کر اپنی ذہنی کوفت کو کم کر لیتا ہے۔ جمال کا قطعہ "مقتدایانِ شہر" ایسے ہی دلی رنج اور کوفت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس قطعے میں شاعر نے ان امرا و وزرا کو ہجو و طنز کا نشانہ بنایا ہے جن کا تعلق تو معمولی گھرانوں سے ہے اور جو علم و فضل سے بے بہرہ ہیں، لیکن فضل و دانش کی لاف مارتے تھکتے نہیں، وہ انھیں کفش دزد، فریب کار اور دھوکا باز کے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان خود ستا خواجگان کا نہ تو ظاہر اچھا ہے اور نہ باطن ہی کسی خوبی سے آراستہ ہے۔ یہ رذیل لوگ ہیں۔ ان کی مدح و ستائش سے اجتناب بہتر ہے کہ وہ اس لائق ہی نہیں ہیں۔ ان کے اعمال و افعال چارپایوں کی حرکات سے ملتے جلتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شاعر ان بے وقعت و کم مایہ "حضرات" کو تکبر و نخوت کے باعث جن کا سر آسمان سے چھو رہا ہے لیکن جو حقیقت میں بھک منگے ہیں، بُری طرح آڑے ہاتھوں لیتا ہے،

ہر چند ان سے اس کی شناسائی ہی کیوں نہ ہو۔

چھوٹی بحر کے اس قطعے میں ایک خاص نغمگی اور طنطنہ ہے، پھر چھوٹی چھوٹی دلچسپ و دلکش تراکیب، پُرطمطراق قوافی، روانی کلام اور پُرتاثیر صنائع لفظی نے اس پورے قطعے کو ادبی اور فنی دونوں لحاظ سے ایک شاہ کار ہجو بنا دیا ہے:

خواجگان را مگر برای خدا — کاندرین شهر مقتدایانند
همه عامی و آن که از پی فضل — لاف پیما و ژاژ خایانند
هریکی در ولایت و ده خویش — کفش دزد و کله ربایانند
خشک مغزان و لیک تر دامن — تیره رویان و خیره رایانند
چه ستایش کنم گروهی را — که همه خویشتن ستایانند
بسکه شان چارپای کردستند — لاجرم جمله چارپایانند
همه چون اره تیز دندانند — همه چون تیشه سر گرایانند
لقمه نزد جمله فاضل تر — زانکه در شرع رهنمایانند
همه از هیچ کمترند، ار چه — از تکبر همه خدایانند
من ازینان چه طرف بر بندم — که همه همچو من گدایانند
تیز در ریششان بخروار ان — ور چه ام جمله آشنایانند

اسی طرح ایک قصیدے "در شکایت از روزگار" میں ایک جگہ ان پست فطرت امرا کے لتے لیے گئے ہیں۔ شاعر کے مطابق ان لوگوں کی نحوست و بدبختی نے زندگی کے تمام شعبوں کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب سے یہ متکبر برسر اقتدار آئے ہیں، پانی بھی سراب کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ احترام، عزت اور بزرگی کا جنازہ نکل چکا ہے۔ خست و بخل کا کچھ اس قدر دور دورہ ہے کہ آواز بھی جواب دینے میں خاموش ہے۔ سورج نے بھی گویا ان بخیلوں کی طبع اپنالی ہے جو بادلوں میں جا چھپا ہے۔ ان کا سر مغز سے تو عاری ہے لیکن کبر کی باد نے اسے اس طرح کر دیا ہے جیسے وہ خیمہ سحاب ہو . . .

شاعر اسی انداز میں اس گروہ کے بُرے اثرات گنوا کر قصیدے کے آخر میں اپنے قاری کو فضل و

دانش کے حصول سے منع کرتا ہے۔ اس لیے کہ بقول اس کے اس دور میں علم و فضل کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ آج وہی صاحبِ اختیار و اقتدار اور اہلِ عز و وقار ہے جس کے یہاں مال و دولت کی ریل پیل ہے، بے شک اس مال و دولت کا وسیلہ ناجائز اور غیر مباح ہو۔ اس قصیدے کے بعض اشعار حسن تعلیل کا دلچسپ نمونہ ہیں:

آہ ازین خواجگان دون ہمت — کآب از او بار شان سراب شدست
تا شدستند کدخدای جہان — خانۂ مکرمت خراب شدست
بخل از ایشان جہان چنان آموخت — کہ صدا خامشِ جواب شدست
طبع ایشان گرفت ہم خورشید — لاجرم ز ابر در حجاب شدست
سرِ ہمغز شان نگر کز باد — راست چون خیمۂ حباب شدست
لعل از بارِ منّت خورشید — در دل سنگ خون ناب شدست
گوہر از لافِ رعد و طعنۂ ابر — در دہانِ صدف لعاب شدست
دست اندر عنانِ فضل مزن — کہ کرم پای در رکاب شدست
فضل بگذار کآنکہ زر دارد — در جہان مالک الرقاب شدست

ایک اور قصیدے "در شکایت روزگار" میں جمال نے اپنی عقل و دانش اور فضیلت و شاعری کی ستائش کی ہے اور آخر میں ایسے ہی دوں فطرت خواجگان کو رگیدا ہے، لیکن ان سے پہلے اپنی ذات کو ہدفِ طنز و ہجو بنایا ہے۔ اسے شکایت ہے کہ اس کے دَور میں صحیح معنوں میں کوئی ممدوح نظر نہیں آرہا، اسی لیے وہ اپنی مدح کرنے پر مجبور ہے، یعنی مدح گوئی اس کی گھٹی میں پڑی ہے، صاحبِ بخشش و عطا ممدوح نہ ملے تو اپنی مدح ہی سہی۔ وہ خود کو ایک بے ہودہ گو اور بے حمیت انسان قرار دیتا ہے جسے حالات نے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ جس انداز میں شاعر نے اپنے اصفہانی ہونے کا ذکر کیا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس وقت اہلِ اصفہان اقتصادی بدحالی کا شکار تھے:

چکنم چون نماند ممدوحی — مدح بر خویشتن ہمی خوانم
ورنہ معلوم ہر کست کہ من — مردکی ژاژخای و کشخانم

شکمم از طعام خالی ماند | لاجرم ہمچو چنگ نالانم
ہمہ احوال خویشتن گفتم | چون بگفتم من از سپاہانم
اینچنین خواجگان دون ہمت | کہ ہمی نام گفت نتوانم
تا دل اندر مدیحشان بستم | بکفِ نیستی گروگانم

ہر چند جمال نے کنجوس امرا و رؤسا کو لتاڑا ہے لیکن ان کا نام کہیں بھی اس نے کھل کر نہیں لیا۔ مندرجہ بالا قطعے میں اس نے اتنا کہا ہے کہ میں خواجگان کا نام نہیں لے سکتا۔ بظاہر اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جمال نے مروت سے کام لے کر ان کے نام پردۂ اخفا میں رکھے ہیں۔ لیکن ہم عصر شعرا کے معاملے میں اس کے یہاں ایسی مروت نظر نہیں آتی۔ انھیں وہ نام لے لے کر کوستا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس نے بالواسطہ اور عام امرا کی ہجو کہہ کر اپنے ممدوحین کو ڈرایا یا شرم دلائی ہے اور اس میں وہ شاید کسی حد تک کامیاب رہا ہے۔ ورنہ ایک آدھ جگہ وہ ضرور کسی امیر کا نام لیتا۔ بہرحال صورت حال کچھ بھی ہو، شاعر اپنی تمام تر بدحالی کے باوصف یہاں ننگا نظر نہیں آتا۔

درج ذیل قطعے میں بھی یہی اشراف اس کے طنز و ہجو کا ہدف ہیں۔ ان کی انتہائی کنجوسی کو بظاہر سیدھے سادے انداز میں پیش کیا گیا ہے لیکن یہ سادہ الفاظ اپنے اندر بھرپور طنز لیے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ممدوح کی اطاعت کو نماز کا درجہ دیتا ہے لیکن اس کے جواب میں اُسے مال و دولت اور انعام و اکرام سے محرومِ رہنا اور روزہ رکھنا پڑتا ہے۔ جو ممدوح خود 'حرص' سے بھی بڑھ کر بھوکا ہو، اس سے صلے کی توقع عبث ہے۔ وہ ان آدم صورت لیکن سگ فطرت ممدوحین سے اجتناب کو بہتر قرار دیتا ہے۔ اس کے مطابق ان کا وعدہ اور ان کی گفتار دونوں حقیقت سے عاری ہیں۔ بخل کے باعث ان کا دروازہ کچھ اس طرح بند ہے کہ اس کے کھلنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

از نعمت آن بروزہ می باشم | کش طاعت چون نماز می بینم
از خوان کسی چہ چشم شاید داشت | کش گرسنہ تر ز آز می بینم
زین سگ صفتان آدمی صورت | اولیٰ تر احتراز می بینم

مندرجہ ذیل دو قطعات میں، دو ایک سخت الفاظ کے سوا ہجو کا انداز اتنا ہلکا پھلکا اور

بےآزار ہے کہ شاید وہ شخص بھی، جس کی ہجو کہی گئی ہے، اس کا ملال نہ کرے۔ جمال نے ان دو قطعات میں کسی نامعلوم امیر کی کنجوسی کی عکاسی بڑے پیارے اور اچھوتے انداز میں کی ہے۔ پہلے قطعے میں اس نے اس امیر کو کتے سے کم تر قرار دے کر مسلمانوں کے لیے اس کا طعام جائز نہیں سمجھا، اس لیے کہ اس کے نزدیک اس امیر کا طعام ظلم و جور اور مالِ حرام سے تیار ہوا ہے۔ پھر خود لوگ بھی ایسی دعوت کو پسند نہیں کرتے، اور اگر کوئی اتفاق سے اس کے دروازے پر چلا بھی جائے تو دربان اور حاجب اسے اندر نہیں جانے دیتے۔ شاعر ایسے شخص کی دعوت کو پسندیدہ نہیں سمجھتا جو مہمان کے ہر ہر لقمے پر نظر رکھے۔ وہ اس کے دستر خوان کو منحوس جانتا ہے۔ آخر میں وہ صنعتِ مراعاۃ النظیر سے کام لے کر اس امیر کی انتہائی باریک روٹی کو، کہ خود اس سے گرسنگی ٹپک رہی ہے، ہلالِ رمضان سے تشبیہ دیتا ہے:

خوان می فگند کنون مسلمانان — آن خواجہ کہ سگ بر او شرف آرد
خوانی کہ ز خون آدمی باشد — افطار بدان کسی روا دارد؟
خود کس نرود، وگر رود آنجا — دربانش و پردہ دار نگزارد
خوانی چہ کنی کہ میزبان او را — ہر لقمہ ہزار بار بشمارد
آن سُفرۂ نحس مردِ ریگش بین — کش پیش شدن کسی نمی یارد
وآن قرص حقیر چون ہلالِ صوم — کش گرسنگی ز لب ہمی بارد

دوسرا قطعہ صنائع لفظی اور ہلکے پھلکے طنز کا بہترین مظہر ہے۔ الفاظ کے الٹ پھیر، رواں بحر اور حرف "ن" کی پیہم تکرار نے ایک خاص نغمگی پیدا کر دی ہے اور ہلوں قاری طنز اور نغمگی و موسیقی دونوں سے لطف اندوز ہو کر تھوڑی دیر کے لیے اس قطعے میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ شاعر نصیحت کرتا ہے کہ ایسے رئیس کے دستر خوان سے بہرہ اندوز نہ ہونا چاہیے جو مال کو اپنی جان سے عزیز تر جانتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی بیوہ یا بچے کا مال کھانا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ایسے خسیس کی دعوت قبول کی جائے۔ وہ اس کے دسترخوان کو خون کی طرح حرام کہہ کر اس کے گرد پھٹکنے سے بھی منع کرتا ہے۔ پھر وہ مختلف دلائل و توجیہات پیش کر کے اپنی اس بات پر اصرار کرتا ہے:

خواہی کہ نزد خواجہ قبولی بود ترا — منشین بخوانِ او، برو از نانِ او مخور

هرچند گویدت بتکلف که نان بخور | فرمان بر آنچه گفت و بفرمان او مخور
زنهار خور ولیک مخور نانش زینهار | هم زنان طفل و بیوه بخور زان او مخور
خوانش چو خون حرام بود گرد آن مگرد | نانش چو جان عزیز ست از جان او مخور
از گوشتش همی بچش و از نان او بچش | از خون او همی خور و از خوان او مخور

ذیل کے تین قطعات کو، جو "دربستہ"، "دو خواجہ تاش" اور "تقاضای کاہ" کے عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں اور جن سے اس دور کے امرا و رؤسا کی انتہائی بخیلی کا پتا چلتا ہے، طنز اور کنایہ و اشارہ گوئی کا دلچسپ نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ یعنی شاعر کسی کنجوس امیر کو براہِ راست خسیس اور بخیل نہیں کہتا بلکہ مختلف اشاروں کنایوں اور بھرپور طنزیہ انداز میں اس کی اس برائی کو آشکار کرتا ہے۔ اس انداز میں مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ تینوں قطعات میں شاعر نے مضامین زیبا اور معانی لطیف پیدا کیے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی دشوار ترکیب یا اجنبی لفظ نہیں ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بڑی سادگی اور روانی سے گفتگو میں مشغول ہے۔

"دربستہ" میں کہتا ہے کہ فلاں امیر کے دروازے تک پہنچنا دشوار کام ہے۔ اور اگر کوئی پہنچ بھی جاتا ہے تو اسے دروازے کی اس جانب سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ شاعر خود کو کتنا ہی چھوٹا اور مختصر کیوں نہ کرلے، پھر بھی دروازے کی محکمی اور سخت بندش کے باعث وہ اندر گھس نہیں سکتا۔ وہ اپنی کوچکی یعنی چھوٹے پن کے باوجود اس قابل نہیں ہے کہ دروازے کے کسی سوراخ ہی سے اندر داخل ہو جائے، یا سورج کی روشنی کی طرح پردوں میں سے گزر کر یا قضائے بد کی طرح دروازے میں سے گزر کر اندر چلا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس خواجہ نے ایسا زبردست اہتمام کر رکھا ہے کہ کوئی شخص بھی اس تک رسائی حاصل کرکے اس سے فیض نہیں پا سکتا:

گفتند دی مرا کہ "بر خواجہ میروی؟ | گفتم "چو راہ یابم آنجا بسر روم
لیکن چو در ببندد و ندہد جواب کس | من ساعتی بباشم و جای دگر روم
دربستہ دارد اوی و من ارچند کوچکم | ہم نیستم چنانکہ ز سوراخ در روم
من ہمچو آفتاب ز پردہ بنگذرم | نہ چون قضای بد ز در بستہ در روم

شاعر اور اس کا گھوڑا اپنے آقا کے دروازے پر دو خواجہ تاش اور صبر کرنے کے معاملے میں

شہرۂ آفاق ہیں۔ چوں کہ فاقوں نے دونوں کا کچومر نکال دیا ہے، مجبور ہوکر شاعر اپنے آقا سے گھوڑے کے لیے جَو مانگتا ہے تاکہ اس بہانے وہ خود بھی منہ میں کچھ ڈال لے، اور اگر آقا کچھ گندم بھی اسے دے دے تو سبحان اللہ! اس کے وارے نیارے ہوجائیں، اس کو وہ مقام حاصل ہوجائے کہ وہ آسمان کی آنکھوں میں بھی خاک جھونک دے:

من بندہ و اسب ہر دو امروز　　بر درگہ تو دو خواجہ تاشیم
ور گرسنگی بصبر کردن　　ما ہر دو درین دیار فاشیم
قدری جو اگر دہی باسبم　　ما نیز طفیل اسب باشیم
ور گندم پارۂ دہی نیز　　در دیدۂ چرخ خاک پاشیم

تیسرے قطعے میں بھی اسی طنزیہ انداز میں تھوڑی سی گھاس کا تقاضا کیا ہے[۱]

بخیلانِ عصر کی خست معاشرے اور ماحول پر کچھ اس قدر اثر انداز ہوتی ہے کہ لوگوں بالخصوص شاعر کی طبع بھی کنجوسی کی طرف مائل ہوگئی ہے، یعنی وہ شاعر جس کی فکر آسمان سے بھی بلند تر تھی اور جس کا ذہن نئے نئے اور بدیع معانی پیدا کرنے کے سبب "کان معنی" سے مخاطب تھا، آج اس کی طبع نے ان امرا کے بخل کا کچھ ایسا رنگ پکڑا ہے کہ سیکڑوں مرتبہ فکر کرنے پر بھی اسے ایک مضمون نہیں سوجھتا۔ گویا اس کی طبع آب رواں کی مانند تھی جو آب برف کی طرح جم کر رہ گئی ہے، یا پھر اس کی طبع آفتاب کی طرح تھی جو بخل کے بادل میں چھپ گئی ہے:

اگرچہ شاعر نے اس قطعے میں اپنی طبع کی یخ بستگی کا ذکر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایک نیا مضمون پیدا کیا ہے اور یہاں اس کا طنز بھی سخت و تند ہے۔ دوسرے فارسی شعرا نے بھی بخیلوں کی ہجو کی ہے، لیکن ایسی صورت کسی کے یہاں نظر نہیں آتی:

مرا ایزد تعالیٰ خاطری داد　　کہ دایم با فلک بودی عتابم
بمعنی دادنِ بکر آنچنان بود　　کہ با او کانِ معنی بُد خطابم
بہر وقتی کزد کردم سؤالی　　نہادہ بود صد معنی جوابم
کنون از بخلِ ممدوحان ممسک　　غلط بینم ہمی با او حسابم

---

[۱] دیوان کامل جمال، ص ۴۱۶

چناں پذرفت رنگ بخل کزوی | بصد اندیشہ یک معنی نیا بم
ز دم سردی این مشتی بخیلان | چنین یخ بند شد طبع چو آبم
در ابر بخل وبی آبی نہان شد | دریغا خاطر چون آفتابم

قطعات "صائم الدہر"، "اسپک"، "تشریف"، "بر دینشاپوری" سے بھی ممدوحین کی بخیلی و خست کا پتا چلتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ قطعات، طنز و مزاح اور حسن طلب میں بھی ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں، اور فنی لحاظ سے بھی اوصاف کے حامل۔

ایک مدت سے شاعر کے گھوڑے کو ممدوح نے گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں بھجوایا، جس کے نتیجے میں گھوڑا مجبور ہو گیا ہے کہ وہ شب و روز روزے سے رہے۔ خوش قسمتی سے عید کا دن قریب آ پہنچا ہے۔ شاعر کو بہانہ ہاتھ لگا ہے، چنانچہ وہ ممدوح سے اپنے روزہ دار گھوڑے کے لیے گھاس دلانے کی درخواست کرتا ہے۔ اس قطعے کا آخری شعر حاصل قطعہ اور شاعر کے مدعا کا غماز ہے۔ یعنی بباطن اسے اس بات کا خدشہ ہے کہ ممدوح اس کی درخواست کو شرف پذیرائی نہ بخشے گا، لہٰذا اس سے کہتا ہے کہ اگر میری درخواست قابلِ قبول نہ ہو تو کم از کم اتنا فتویٰ صادر فرما دیں کہ عید کے روز بھی روزہ رکھنا جائز ہے، گھوڑے کے ضعف و ناتوانی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے، دن کے وقت وہ زخمی سور کی طرح سویا رہتا ہے۔ رات کو اٹھ کر کتے کی طرح پاسبانی کرتا ہے۔ ہمیشہ رکوع میں رہتا ہے لیکن کبھی کبھار سجدے میں بھی گر پڑتا ہے۔

صائم الدہر اسپکی دارم | کہ بدہ روز روزہ نگشاید
بروز چون یوز خستہ می خسبد | شب چو سگ پاس در ہمی پاید
در رکوعست سال و مہ لیکن | گہ گہی در سجود افزاید
پارۂ کاہ آرزو کردست | مدتی رفت و بر نمی آید
روز عید است و ہر کسی لابد | بطعامی دہان بیالاید
گر تفضل کند خداوندم | پارۂ کاہ وجوش فرماید
ورنہ رخصت دہد کہ اندر شرع | روزۂ عید داشتن شاید

اگلے قطعے میں بھی فاقہ زدہ گھوڑے کو موضوع بنا کر طنز و مزاح سے کام لیا ہے۔ شاعر کا گھوڑا صبح سے شام تک گھاس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ لیکن شاعر کے پاس پیسہ نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے گھاس خرید سکے۔

تو جس طرح:

دل ہی عاشق کی بڑی سوغات ہے　　　اور بیچارے کی کیا اوقات ہے

شاعر کے پاس بھی سوائے غزل اور رباعی کے کچھ نہیں۔ وہ بیچارہ ہر پھر کر گھوڑے کے کانوں میں اپنی غزلیں اور رباعیاں ہی پھونکتا رہتا ہے، لیکن بدذوق گھوڑے کا اصرار گھاس ہی پر ہے، مجبوراً شاعر ممدوح کی طرف رجوع کرتا اور ایک توبرہ گھاس کے لیے کہتا ہے، مگر چونکہ اُسے اپنے مخدوم کا جواب معلوم ہے اس لیے وہ ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجتا ہے کہ اگر حضور کے بھرے ہوئے اصطبل میں گھاس نہ ہو تو ہمارے پڑوس میں ایک شخص گھاس بیچتا ہے:

دعاگو اسپکی دارد کہ ہر روز　　　زعشق کاہ تا شب می خروشد
غزل میخوانم و در وی نگیرد　　　دو بیتی نیز کمتر می نیوشد
توقع دارد از انعام مخدوم　　　کہ بروی توبواری کاہ پوشد
وگر کہ نیست در اصطبل معمور　　　در این ہمسایہ شخصی می فروشد

قطعہ "نکہت جہاں" میں شاعر کا لہجہ بڑا تند ہے۔ لیکن باوجود کسی قدر عریانی کے یہ قطعہ مضمون آفرینی کا دلچسپ نمونہ ہے۔

قطعہ "پوستین" میں شاعر نے اپنے ممدوح سے پوستین کا تقاضا کیا ہے اور ساتھ ہی اسے بڑے سخت لہجے میں تہدید کرتے ہوئے بالواسطہ یہ کہا ہے کہ پوستین نہیں بھیجو گے تو تمھاری پوستین یعنی کھال ادھیڑ دی جائے گی۔ اس کے لیے اس نے کلماتِ تنبیہ "ہین" اور "ہان" استعمال کیے ہیں جن سے شعر میں ایک خاص لطف پیدا ہوگیا ہے:

پوستینی بخواستیم از تو　　　تا زمستان بسر بریم در آن
حرمت ما بر تو بود چنانک　　　حرمت پوستین بہ تابستان
بدہ ای خواجہ پوستینم ہین　　　پیشتر زانکہ پوستینت ہان

جمال الدین کی اپنے بعض ہم عصروں سے خاصی چشمک اور نوک جھونک رہی۔ چنانچہ سب ایک دوسرے کی ہجو میں پیش پیش رہے۔ مجیر الدین بیلقانی اپنے وقت کا ایک مشہور شاعر اور اتابکان آذربائیجان کی جانب سے اصفہان کا حکمران تھا۔ اس نے کسی موقع پر اہل اصفہان کی ہجو و ذم میں اشعار کہے جو ایک قطعہ اور

دو رباعیوں کی صورت میں موجود ہیں۔ ان میں اس نے اصفہان کی تو تعریف کی لیکن اہلِ اصفہان کو "زاغ طبع" کہا اور پائے طاؤس سے تشبیہ دی، پھر انھیں اندھا، بد عہد، سُست اور ایسی قوم قرار دیا جس کا مہدی دجّال ہو۔ جمال نے بھی جواب میں اسے خوب خوب لتاڑا۔ جس سے مجیر کی آزردگی کا سامان ہوا۔ جب مجیر دوسری مرتبہ قزل ارسلان کی طرف سے اصفہان کا مستقل اور خود مختار حاکم بنا تو جمال ڈر کے مارے کہیں چھپ گیا۔ کچھ عرصے بعد اس نے اس سے معذرت کر لی۔ مجیر کے اشعار ملاحظہ ہوں:

صفاہان خرم و خوش مینماید ... بسانِ پرِ شہر آرای طاؤس
دلی زین زاغ طبعان کاہل شہرند ... خجل شد بال خوش سیمای طاؤس
یقین می دان کہ مجموع صفاہان ... چو طاؤس است و اینان پای طاؤس
گفتم ز صفاہان مدد جان خیزد ... لعلیست مروّت کہ ازان کان خیزد
کی دانستم کاہل صفاہان کورند ... با آنہمہ سُرمہ کز سپاہان خیزد
نہ اہل صفاہان ورنہ بد عہدیشان ... درکار ہنر سستی دنی جہدیشان
عیسی دمی ای مجیر دامن در کش ... زین قوم کہ دجّال بود مہدیشان

اگرچہ اصفہان کے شعرا نے مجیر کو سخت جواب دیے لیکن ان کی نسبت جمال کے اشعار بلند تر ہیں۔ ہاں ایک جگہ آخری شعر میں تھوڑی سی غلاظت اچھل گئی ہے۔ اس غلاظت کا ذکر کرنے میں وہ واحد شاعر نہیں ہے بلکہ فارسی کے اکثر شعرا نے اپنے مخالفین کو رگیدتے ہوئے اس کثافت کا تذکرہ کیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ بہرحال جمال کا درج ذیل قطعہ اس غلاظت کے باوصف مضمون بدیع اور خاص طنطنے کا حامل اور اس کی قدرتِ بیان کا اچھا نمونہ ہے۔ کہتا ہے کہ روزِ ازل جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے نفسِ ناطقہ کو شارعِ عقل سے پیدا کیا تو قدرت نے اپنی چھاتیوں سے شعرا کی پرورش کی اور ہر شاعر نے اپنی اپنی فصاحت کے مطابق ان چھاتیوں سے دودھ پیا لیکن مجیر چونکہ دیر سے پہنچا تھا اور دودھ ختم ہو چکا تھا لہٰذا فطرت نے اس کے منہ میں فضلہ ڈال دیا:

زاول کہ نفس ناطقہ را از شارع عقل ... ایزد بلطف خویش و برحمت بیافرید
پستان خویش در دہنِ شاعران نہاد ... تا ہر کسی بقدر فصاحت ہمی مکید
وز بہر اینکہ دیرتر آمد مجیر دین ... شیرش نماندہ بود پس اندر دہانش رید

ایک اور قطعے میں اس نے مجیر کو اصفہان کی ہجو پر سخت ڈانٹ پلائی اور آذربائیجان کے مختلف شہروں مثلاً گنجہ، تفلیس، بیلقان اور شروان کو گالیاں دینے کے ساتھ ساتھ غریب خاقانی کو بھی رگڑا دیا ہے۔ خاقانی نے اپنی مثنوی تحفۃ العراقین کا ایک نسخہ تحفے کے طور پر جمال کو بھیجا۔ اس مثنوی میں خاقانی نے اپنے تمام ہم عصر شعرا کو ذم بھرے انداز میں یاد کیا اور اپنے سے کم تر قرار دیا تھا، جیسا کہ کہتا ہے:

در نوبت من ہر آنکہ ہستند — دندان سخن، بریدہ دستند

کس را سخن بلند ازین دست — سوگند بمصطفیٰؐ اگر ہست

جمال الدین نے جو یہ اشعار پڑھے تو جھلا اٹھا، اور جواب میں قصیدۂ ذیل لکھ کر شروان بھجوا دیا:

کیست کہ پیغام من بشہر شروان برد — یک سخن از من بدان مرد سخندان برد

اس قصیدے میں اس نے خاقانی کو طنز و طعن کا نشانہ بنایا ہے، لیکن عجیب بات یہ کہ قصیدے کے آخر میں اسے بڑے احترام اور ستائش سے یاد کیا ہے۔ یہاں صرف طنزیہ اشعار ہی کا تذکرہ مقصود ہے۔ جمال کہتا ہے کہ خاقانی نے شروان سے اپنی مثنوی کا تحفہ عراق بھیج کر اپنی جہالت و حماقت کا ثبوت دیا ہے کیوں کہ اس کی یہ حرکت تو "الٹے بانس بریلی کو" کے مصداق ہے۔ پھر وہ صنعت تلمیح سے کام لے کر خاقانی کے دعویٔ فضل و دانش پر تنقید کرتا ہے۔ اس کے مطابق نہ تو عراق میں رجال کی کمی ہے اور نہ فضل و دانش ہی کا دنیا سے جنازہ اٹھ گیا ہے جو خاقانی ایسا شخص فضل و شجاعت کا ادعا کرے۔ وہ خاقانی کے بھیجے ہوئے تحفے کو ٹڈی کی اس ٹانگ سے تشبیہ دیتا ہے جو کوئی چیونٹی حضرت سلیمانؑ کے پاس بطور تحفہ لے جائے۔ یا یہ کہ کوئی اناڑی بڑھیا عید کے روز گدھے پر سوار ہو کر چوگان جیتنے کی کوشش کرے۔ آخر میں جمال نے خود کو بھی اور خاقانی کو بھی ابلہ اور احمق قرار دے کر دونو کو زندان کے لائق ٹھہرایا ہے اور یہ آرزو کی ہے کہ کوئی ہم دونو کو لے جا کر زندان میں بند کر دے۔ جمال کا یہ شعر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ خاقانی سے متاثر ضرور ہے۔ خاقانی کے جواب میں اور اس کے خلاف اس نے سخت الفاظ استعمال تو کر لیے لیکن غالباً اس کے ضمیر نے اسے [illegible] کا نوٹس اس نے خود کو بھی برا بھلا کہہ کر کیا اور یوں اپنے دل کی بھڑاس بھی نکال لی اور ضمیر کو بھی [illegible] لیا اور دوسری صورت اس کی یہ

۱؎ ایران میں کبھی عید کے موقع پر چوگان بازی کا بڑا رواج تھا۔ نوجوان اور پہلوان قسم کے لوگ اس میں شریک ہوتے تھے

بھی ہو سکتی ہے کہ شاعر نے غالب کی طرح جیسا کہ وہ کہتا ہے:

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ　　　پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

خود کو ملوّث کر کے مخالف کی حماقت و ابلہی پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہو۔ اس قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تحفہ فرستی زشعر سوی عراق اینت جہل　　　ہیچکس از زیرکی زیرہ بکرمان برد؟

مرد نماند از عراق، فضل نماند از جہان　　　کہ دعوی چون تو ئی سر سوی کیوان برد؟

شعر فرستادنت بما چنانست راست　　　کہ مور پای ملخ نزد سلیمان برد

زشت بود روز عید اینکہ زنی چابکی　　　پیر زنی خرسوار گوی زمیدان برد

من ز تو احمق ترم تو ز من ابلہ تری　　　کسی بباید کہ مان سر دو بزندان برد

اصفہان جمال الدین کا مؤلد تھا اور اپنے اس زاد بوم سے اُسے بے پناہ محبت تھی۔ چنانچہ جب مجیر بیلقانی نے اصفہان کی ہجو کہی تو جمال نے نہ صرف اس کا جواب دیا بلکہ مجیر کو خوب خوب کوسنے بھی دیے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود جب اس کا قاری یہ دیکھتا ہے کہ اس نے خود بھی اصفہان کو اپنی ہجو کا تختہ مشق بنایا ہے تو وہ تھوڑی دیر کے لیے "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے" کی تصویر بن جاتا ہے۔ دراصل معاملہ یوں ہے کہ اس دَور میں اس شہر کی بُری اور بدحال وضع اجتماعی، ناموافق حالات، وہاں کے لوگوں کی بدفطرتی و بدخوئی اور اسی قسم کے دیگر ناگوار عوامل نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی زادگاہ کے خلاف بھی لب کشائی کرے۔ دیوان جمال الدین کے مرتب آقائے حسن وحید دستگیردی نے اس کا جواز ان الفاظ میں پیش کیا ہے: "جمال الدین با اینہمہ وطن پرستی و زادبوم دوستی و ستایش اصفہان گاہ گاہ از اصفہان شکایت کردہ یا بنکوہش و ذم یہودی نژادان این شہر کہ پدران آنان بمصلحت وقت برای منافع شخصی مسلمان شدہ ولی تمام خصایل یہود در آنان ہست، پرداختہ است، چنانکہ در این ابیات ملحوظ می افتد:

چند گوئی مرا کہ مذموم است　　　ہر کہ او ذم زاد بوم کند

آنکہ از اصفہان بود محروم　　　میتواند کہ ذم روم کند؟"

(کب تک تم مجھے کہو گے کہ اپنی زاد بوم کی مذمت کرنا بُری بات ہے۔ جو شخص اصفہان سے محروم ہو گیا وہ روم کی مذمت کر سکتا ہے؟)

ایک اور قطعے میں کہتا ہے:

زاد مرا خاک سپاہان و لیک — خوی ندارد کہ پسر پرورد
گرچہ شرر زاید از آتش ہمی — نیست بر آتش کہ شرر پرورد

(اصفہان کی سرزمین نے مجھے جنا ہے لیکن اس میں اپنا فرزند پالنے کی خو نہیں ہے، اگرچہ شرر آگ سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہ آگ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ شرر کی پرورش کرے)

اور اس رباعی میں اصفہان میں فن و ادب کی زبوں حالی وخواری کا ذکر کیا ہے:

زینگونہ کہ شد خوار و فرو مایہ ہنر — از جہل پس افتاد بصد پایہ ہنر
یارب تو بفریاد رس آن مسکین را — کش خانہ صفاہان بود و مایہ ہنر

درج ذیل قطعے میں اس نے اصفہان کے اربابِ حشمت کی خست وبخیلی اور دروغ ونفاق پر بڑے طنزیہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ شروع کے اشعار میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو لیکن آخری شعر اس تعریف کی قلعی کھول دیتا ہے۔ وہ اصفہان کو عراق کا سب سے اچھا شہر کہتا ہے جس میں کسی قسم کے بخیل اور خسیس لوگ نہیں رہتے، جہاں کسی قسم کا دروغ و نفاق دیکھنے میں نہیں آتا اور جس کے اصحابِ دولت وثروت سبھی اربابِ نام و ننگ اور حاکمانِ مطلق ہیں، اور سب کے سب اہل مال و مکنت اور سرداری و سروری کے اہل و مستحق ہیں۔ آخر میں کہتا ہے کہ یہ سب ہیں تو صاحبانِ بخشش و عطا لیکن دیتے صرف گالیاں ہی ہیں:

نیست شہری چو شہر اصفاہان — بحقیقت ز شہرہای عراق
کہ نبینی درو خساست و بخل — کہ نیابی درو دروغ و نفاق
خواجگانی بنام و ننگ درو — ہر یکی حاکمی علی الاطلاق
ہمہ را خواجگی با ستعداد — ہمہ را سروری باستحقاق
ہم دہندہ ہمہ ولی دشنام — ہم خورندہ ہمہ ولی اطلاق

اسی طرح اس قطعے میں بھی اہل اصفہان کے بخل ونفاق اور بے وفائی کی مذمت کی ہے۔ اس میں اس نے ایک نیا مضمون پیدا کیا ہے۔ یعنی اہلِ اصفہان کی کنجوسی کو وہ ریت کی تشنگی سے تشبیہ دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ مال سمیٹنے میں تو بہت تیز ہیں لیکن سمیٹے ہوئے مال کو ذرا بھی ہوا نہیں لگنے دیتے۔ اس کے مطابق ان کے مقابلے میں کتے بھی زیادہ وفا ہے:

نفاق و بخل در اہلِ سپاہان | چنان چون تشنگی در ریگ دیدم
بزرگ و خُرد شان دیدم و از یشان | وفا در سگ کرم در دیگ دیدم

درج ذیل قطعے میں جمال نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ مقصود تو اصفہان اور اہلِ اصفہان کی ہجو ہے لیکن ساتھ ہی اہل قم کو بھی رگید ڈالا ہے۔ اس قطعے میں بھی اس نے کتے کو اہلِ اصفہان سے افضل قرار دیا ہے۔ وہ انھیں بے مروت اور پست ہمت و فطرت کہتا ہے۔ یہ لوگ اپنے فائدے کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں، کتے کی طرح لوگوں کی کھال کھینچنے والے اور بچھو کی طرح ڈنک مارنے والے ہیں۔ ان میں اور گدھے میں صرف اتنا فرق ہے کہ اس کے ذرا کان لمبے اور کھُر گول ہوتے ہیں۔ اپنے کتے پن اور خست میں وہ اہلِ قم سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ شاعر کے بقول اصفہان میں سوائے انسانیت، جود و سخا اور مردمی کے سب کچھ مل جاتا ہے:

سگ بہ از مردم سپاہانست | بوفاق و وفا و پویہ و دُم
آنچنان مدخلان دون ہمت | ہمہ از عالم مروت گم
ہمہ درندہ پوستین چون سگ | ہمہ مردم گزای چون کژدم
زن و فرزند شان و یکجو زر | دل و جانشان و یکدرم گندم
این چہ بخلست و این چہ امساکست | ہم عفی اللہ سگی مردم قم
بچہ بتوان شناخت خر ز ایشان | بدرازی گوش و گردی سُم
بس دریغ آیدم چنین شہری | بگروہی ہمہ چو دُردی خم
مردمی اندر و بجوی از انک | ہمہ چیزی در اوست جز مردم

جمال الدین کے کلام میں ظرافت و مزاح کی چاشنی بھی کسی قدر پائی جاتی ہے۔ اس میں اس کا انداز ہلکا پھلکا ہے۔ مثلاً ایک قطعہ "مولانا ترازوست" میں اس نے مزاحیہ انداز میں کسی خاص مولانا یا قاضی کی رشوت خوری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کسی نے اس کے سامنے اُن مولانا کے عدل و انصاف کی تعریف کرتے ہوئے انھیں ترازو سے تشبیہ دی۔ شاعر نے بھی اس کی تائید کی لیکن اس طرح کہ وہ قاضی ایسا ترازو ہے جس کا پلڑا اُدھر جھکتا ہے جدھر مال زیادہ ہو:

مرا گویند مولانا ترازوئیست کز عدلش | نہ میل این یکی دارد نہ قصد آن دگر دارد

درین شک نیست کو ہجو تراز و نیست زین معنی — کہ میلش سوی آن باشد کہ او زر بیشتر دارد

جمال نے کسی امیر شخص سے شراب بھجوانے کی درخواست کی۔ اس نے اپنی خست یا کسی دوسری بنا پر ہلکی قسم کی اور بے مزہ سی شراب بھجوا دی۔ شراب پینے پر جب یہ راز اس پر آشکار ہوا تو اس نے درج ذیل قطعہ لکھ کر اس امیر کو بھجوا دیا۔ اس قطعے کا آخری شعر حاصل قطعہ ہے اور اس میں شاعر نے ظریفانہ انداز میں شراب کی بے کیفی کا ذکر کیا ہے۔ اس میں پہلے تو اپنے اس مخدوم کے الطاف و عنایات اور اپنی کم مائگی اور تقصیر کا ذکر کیا ہے اور بعد میں شکوہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ گلہ بظاہر آپ سے ہے لیکن حقیقت میں اپنے زمانے سے ہے۔ یہ آپ نے کیسی شراب بھجوائی کہ سارے شہر میں اس کا چرچا ہے۔ اگرچہ وہ آپ ایسے مخدوم کے شایانِ شان نہ تھی لیکن ہم ایسے احمقوں کے واقعی لائق تھی۔ بہر حال اگر اسے شراب کہا جا سکتا ہے تو ہمارا کنواں پھر شراب خانہ قرار پائے گا۔

مضمون کی جدت کے علاوہ سادگی و روانیِ کلام نے بھی قطعے کو دلچسپ بنا دیا ہے:

ای کریمی کہ دام منت را — کرم و بخشش تو دانہ ماست
ہمہ وقت چون فرو مانیم .. — کف زربار تو خزانہ ماست
گر بخدمت ہمی رود تقصیر — عفو و حلمیست کان بہانہ ماست
از تو ما را شکایتیست لطیف — وان نہ از تست از زمانہ ماست
آن چہ می بود کم فرستادی — کہ ہمہ شہر پُر فسانہ ماست
لایق بخشش تو نیست ولی — درخور ریش ابلہانہ ماست
اگر آنرا شراب شاید خواند — چاہِ ما پس شرابخانہ ماست

قطعہ "شیشہ می" کا مخاطب بھی غالباً یہی مخدوم ہے۔ اس قطعے میں بھی شراب کی درخواست کی گئی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی جتا دیا ہے کہ پچھلی مرتبہ والی نہ ہو کہ وہ "چاہ آب خانہ" سے تھی۔

ذیل کے قطعات (جن کے عنوانات مرتب دیوان نے قائم کیے ہیں) "قارورۂ بیمار"، "شیشۂ آب" اور "آب بجای می" بھی اسی مضمون کے حامل ہیں۔ یعنی اس نے مختلف اربابِ حشمت سے شراب منگوائی بھی اور ہر کسی نے اسے بے مزہ اور بے کیف شراب ہی بھجوائی۔ اس کے یہ تمام قطعات تازہ و بدیع اور دلچسپ مضامین کے حامل اور خاص اسی کا حصہ ہیں، اس لیے کہ دوسرے شعرا کے کلام میں یہ مضمون شاذ ہی

نظر آتے ہیں ۔

"قارورۂ بیمار" کے مطابق اس نے کسی نجیب سے شراب مانگی ۔ اس نے اپنے غلام کے ہاتھ ایک چھوٹی سی بوتل میں تھوڑی سی بھجوادی۔ شاعر کو وہ شراب کی بجائے کچھ اور ہی شے نظر آئی، چنانچہ اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ کم بخت کہیں بیمار ہوگا اور یہ قارورہ اس نے طبیب کے پاس بھجوایا ہوگا :

پارۂ می بخواستم ز نجیب — زان می ناب کز زبیب برند (زبیب : خشک انگور)

روز دیگر غلامکش آورد — پارۂ می کہ از نجیب برند

شیشۂ خرد بود و آبی زرد — گندہ تر زان کہ از ... برند

گفتی آن زن بمزد بیمار ست — کآب چونین بر طبیب برند

"شیشۂ آب" میں بھی آب چاہ خانہ والی بات ہے لیکن اس کے شروع میں شاعر نے اس مخدوم کو کوسنے دیے ہیں، اور بعد میں اس قسم کی شراب وصول کرنے سے معذرت چاہی ہے ۔

"آب بجای می" میں شاعر نے پہلے ممدوح کی مدح و ستائش کرتے ہوئے غلو سے کام لیا ہے ۔ پھر اسے طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا اور آخر میں اُسے بالواسطہ گالیاں دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے ایسا حکم نہیں دیا کہ اس خاکسار کو شراب کی بجائے پانی دیا جائے، اس لیے کہ آپ سے اس کی ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی اور اگر واقعی آپ ہی نے ایسا حکم دیا ہے تو اس سے یقیناً آپ کی یہ غرض ہوگی کہ ایسی چیز بھیجی جائے جو سب مذاہب میں حلال ہو ۔

قطعے کے بیشتر اشعار میں طنز پورے طور پر کارفرما ہے ۔ یہ قطعہ بھی سادہ گوئی کی ایک اچھی مثال ہے :

ای بزرگی کہ پایۂ قدرت — اولش غایت کمال بود

آفتاب سعادتت آن نیست — کش پس استوا زوال بود

زین تحیت پس از دعا و ثنا — غرض بندہ یک سؤال بود

بارہا با خواص خود گفتی — دست تحقیق چون جمال بود

پس ز بہر یکی قرابۂ می — کہ مرا بر تو رسم سال بود

تا ندیدم من آن ندانستم — کآب ہرگز چنان زلال بود

ہر کہ زین گونہ می دہد بکسی — راستی جای قاف و دال بود

تو نفرمودہ ای من این دانم — کز تو این موصلت محال بود
یا غرض این مُدست تا باری — بہمہ مذہبی حلال بود

ذیل کے قطعے میں گھوڑے کی ہجو مزاحیہ انداز میں کی گئی ہے۔ ممدوح نے اسے انعام کے طور پر ایک گھوڑا عنایت کیا ہے۔ یہ گھوڑا خاصا بوڑھا اور ضعیف ہے۔ شاعر اسے آدم کی مبارک سواری اور حضرت نوح کے زمانے کی یادگار قرار دیتا ہے جسے کشتیِ نوح میں سوار کیا گیا تھا۔ پھر شاعر نے اس قدیم گھوڑے سے اپنی گفتگو کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ اس سے پوچھتا ہے کہ میاں گھوڑے یہ تو بتاییے آپ نے اس دنیا میں پہلا قدم کب رکھا؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں وہ پہلا جانور ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بھیجا تھا:

خسروا ز اصطبل معمور تو کو معمور باد — وارثِ اعمار اسبان شیخ ابو عامر رسید
مرکب میمون آدم دام توفیقہ کہ ہست — یادگار نوح پیغمبر کہ در کشتی کشید
گفت با اسب قدیم آخر کہ تو باری بگو — تا مبارک مقدمت در دو عالم کی چمید
گفت چون بسیار گفتی، ہیچ دانی من کیم — آن نخستین جانور کایزد تعالیٰ آفرید

ان ہجویہ اور مزاحیہ قصائد قطعات کے علاوہ، جن کا اس مضمون میں ذکر ہوا، جمال الدین کے کلام میں ایسے اور بھی بہت سے اشعار ہیں جو ”شکایت از روزگار“، شکایت از رنج و سفر، نکوہشِ زر و سیم اور در نکوہش روزگار وغیرہ نام کے قصایٔد اور ترکیب بندوں میں موجود ہیں۔ طولِ کلام کے خوف سے ان سے صَرفِ نظر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

ہندوستان کے مسلمان حکمران اور خطبہ

اسلام کے ابتدائی دور میں دو قسم کے خطبوں کا رواج تھا، ایک افتتاحیہ خطبہ جو نیا خلیفہ دیا کرتا تھا اور جس میں وہ اپنا لائحہ اور پالیسی کی وضاحت کرتا تھا۔ دوسرا خطبہ وہ ہوتا تھا جو جمعے اور عیدین کی نمازمیں دیا جاتا تھا۔ ابتدائی دور میں ان دونوں خطبوں میں خلیفے کا نام یا اس کا خطاب نہیں ہوتا تھا اور اس کی حیثیت اس وقت تک شاہی علامت کی نہیں ہوتی تھی[1]۔

سب سے پہلے حضرت ابن عباس رض (وفات ۶۸۷ء) نے جب کہ وہ حضرت علیؑ کی جانب سے بصرے کے گورنر تھے، خطبے میں حضرت علیؑ کا نام پڑھا اور ان کے لیے دعا کی[2] باقاعدہ سے خطبے میں مسلم حکمران کا نام شامل کرنے کی ابتدا محمد امین (۸۱۳ - ۸۰۹) کے زمانے سے ہوئی جب کہ اس کا نام مع اس کے خطابات کے خطبے میں شامل کیا گیا اور مساجد میں پڑھا گیا[3]۔ اس کے بعد یہ رسم شروع ہوگئی کہ ہر جمعے اور عیدین کی نماز میں مسلمان اجتماع کے سامنے خلیفے کا نام خطبے میں پڑھا جاتا تھا اور اس کے لیے دعائے خیر کی جاتی تھی۔ اس کے بعد خطبہ ایک شاہی علامت بن گیا کہ جب تک نئے خلیفے یا حکمران کا نام خطبے میں نہیں پڑھا جاتا تھا اس وقت تک اس کی قانونی حیثیت مستحکم نہیں ہوتی تھی۔

عباسی خلافت کی کمزوری کے زمانے میں جب کہ صوبائی حکومتیں آزاد ہوئیں تو وہاں کے حکمرانوں نے اپنی خود مختاری کے اظہار کے طور پر خطبے میں خلیفے کے نام کے ساتھ ساتھ اپنا نام بھی شامل کرایا۔ اس تبدیلی سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفے کی سیاسی طاقت کس حد تک کمزور ہوئی اور کس حد تک

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے۔ راقم الحروف کا مضمون: THE KHUTBA: A SYMBOL OF ROYALLY IN ISLAM: IN: SIND UNIVERSITY RESEARCH JOURNAL, 1978 - 79

[2] ابن خلدون: مقدمہ، (انگریزی ترجمہ) نیویارک ۱۹۶۸، حصہ دوم، ص ۷۱

[3] سرسید: مقالات سرسید، حصہ اول، لاہور ۱۹۶۲ء، ص ۱۸۵۔

صوبائی حکومتیں خود مختار ہوئیں۔

محمود غزنوی (۱۰۳۰ - ۹۹۸) کے عہد میں خطبے میں مزید تبدیلیاں آئیں۔ چونکہ محمود غزنوی، خلیفۂ بغداد کی مذہبی سیادت کو تسلیم کرتا تھا لہٰذا اس کی مملکت میں خطبے میں خلیفہ اور اس کا نام پڑھا جاتا تھا، لیکن جب اس نے دوسری ریاستوں کو فتح کیا تو اپنی سیاسی برتری کے اظہار کے لیے اس نے مفتوح حکمرانوں سے کہا کہ وہ خطبے میں اس کا نام بھی پڑھیں، لہٰذا خطبے میں خلیفۂ وقت محمود غزنوی اور حکمران کا نام شامل کیا جانے لگا،[۵۴] جس سے سیاسی تبدیلیوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی قوت ایک مرکز سے تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

غزنویوں کے بعد جب غوری خاندان طاقت میں آیا تو انھوں نے بھی اسی روایت کو اختیار کیا اور انہی کے ذریعے سے یہ ہندوستان میں روشناس ہوئی۔ التتمش (۱۲۳۶ - ۱۲۱۰) نے اپنے دورِ حکومت میں ایک وفد بھیج کر خلیفے سے سندِ حکومت حاصل کی اور اس کے بعد خطبے میں خلیفے کا نام پڑھا گیا۔[۵۵] التتمش سے پہلے بھی یقیناً خطبے میں خلیفے کا نام پڑھا جاتا ہوگا اور اس کے زمانے میں خلیفۂ وقت کا نام معلوم کر کے شامل کیا گیا ہوگا۔ کیونکہ اکثر اسلامی مملکتوں میں ایسا بھی ہوا ہے کہ خلیفہ وفات پا چکا ہے لیکن نئے خلیفے کا نام معلوم نہیں اور متوفی خلیفے کا نام ہی خطبے میں پڑھا جاتا رہا۔ اس لیے التتمش نے اپنے عہد میں نئے سرے سے خلیفۂ وقت سے تعلقات قائم کیے اور اس کے نام کا خطبہ مساجد میں پڑھا گیا۔

محمد تغلق (۱۳۵۱ - ۱۳۲۵) کے زمانے تک اسلامی دنیا میں انقلابی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ منگولوں کے حملے نے عالمِ اسلام کو تہہ و بالا کر دیا تھا اور ہلاکو خاں (وفات ۱۲۶۵) نے بغداد میں عباسی خلافت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس نئی صورتِ حال میں اکثر اسلامی حکومتوں میں یا تو کسی متوفی خلیفے کا نام خطبے میں لیا جاتا تھا یا خلیفے کا نام ختم کر کے صرف حکمران کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ محمد تغلق نے سیاسی وجوہ کی بنا پر اور ان بغاوتوں کے پیشِ نظر جو اس کے خلاف پورے ہندوستان میں ہو رہی تھیں، قاہرہ میں قائم شدہ عباسی خلافت سے اپنا رشتہ جوڑا، جو مملوک سلاطین نے اپنے سیاسی فائدے کے لیے قائم کر رکھی تھی۔ اس نے ایک وفد بھیج کر خلیفے سے سندِ حکومت حاصل کی اور اپنی حکومت کے قانونی جواز کو عوام پر ثابت کرنے کے لیے

---

۵۴ مبارک علی، خطبہ: ایک شاہی علامت۔ ص ۹۲ - ۹۳

۵۵ طبقات ناصری: حصہ اول (اردو ترجمہ) لاہور ۱۹۷۵ - ص ۴۹۵

اس نے تمام شاہانِ سابق کو غاصب قرار دیا کہ انھوں نے خلیفے سے سندِ حکومت حاصل نہیں کی تھی، اس لیے خطبے میں سے ان تمام ہندوستانی حکمرانوں کے نام مع اپنے باپ غیاث الدین تغلق کے، جن کے پاس خلیفے کی سند نہیں تھی، نکال دیے[56]۔ محمد تغلق نے عوام کے اذہان کو متاثر کرنے کے لیے اس بات کا اہتمام کیا کہ خلیفے کا نام جب پہلی مرتبہ خطبے میں پڑھا جائے تو شان و شوکت کی ایک فضا قائم ہو۔ چنانچہ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ جب پہلی مرتبہ خلیفے کا نام پڑھا گیا تو سونے چاندی سے بھرے ہوئے طباق نچھاور کیے گئے۔ سلطان ہر جمعے کو مع اپنے امرا کے سیری کی جامع مسجد میں جاتا تھا جہاں اس کا نام خلیفے کے نام کے بعد خطبے میں پڑھا جاتا تھا[57]۔

فیروز شاہ تغلق (۱۳۸۸ - ۱۳۵۱) نے اپنی تخت نشینی کے بعد خطبے میں ترمیم کی اور ہندوستان کے تمام سابق حکمرانوں کے نام خطبے میں شامل کرائے۔ چنانچہ سراج عفیف نے وہ تمام نام دیے ہیں جو خطبے میں تھے اور وہ یہ ہیں: (۱) معزالدین محمد بن سام (۲) التتمش (۳) ناصرالدین محمود (۴) بلبن (۵) جلال الدین خلجی (۶) علاء الدین خلجی (۷) قطب الدین خلجی (۸) غیاث الدین تغلق (۹) محمد تغلق (۱۰) فیروز شاہ تغلق ـــــ فیروز شاہ تغلق کے پورے عہد میں یہ رسم رہی کہ ان تمام حکمرانوں کے نام پورے ہندوستان میں جمعہ و عیدین کے خطبوں میں پڑھے جاتے تھے[58]۔

بغداد میں عباسی خلافت کے خاتمے اور منگولوں کے اقتدار کی وجہ سے جہاں اور تبدیلیاں آئیں، وہاں خطبے میں بھی ترمیمات ہوئیں۔ منگول حکمران جو ایران میں "ال خان" کے نام سے مشہور ہوئے تو وہ خود کو سیاسی لحاظ سے انتہائی طاقتور سمجھتے تھے، اسی لیے انھوں نے مصر میں قائم شدہ خلافت کو تسلیم نہیں کیا اور مسلمان ہونے کے بعد انھوں نے خطبے میں ایک نئی تبدیلی کی۔ اگر وہ سنی مسلک کے ہوتے تھے تو خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی خطبے میں پڑھواتے تھے اور اگر شیعہ مسلک کے حامل ہوتے تو بارہ اماموں کے نام خطبے میں شامل کراتے تھے۔ اس کے بعد سے خطبہ دو قسم کا ہونے لگا۔ ایک سنی اور دوسرا شیعہ۔

---

[56] تاریخ فرشتہ، حصہ اول (اردو ترجمہ) کراچی ۱۹۷۴، ص ۴۳۸

[57] ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ) لاہور ۱۹۶۹ - ص ۷۰۰

[58] سراج عفیف: تاریخ فیروز شاہی - کراچی ۱۹۶۵ - ص ۸۴ - ۸۵

ایران میں صفوی حکومت کے قیام کے بعد وہاں شیعہ خطبے کا رواج ہوا، اور دوسری شیعہ سلطنتوں کے لیے صفوی بادشاہ مذہبی عقیدت کی ایک علامت بن گیا اور عقیدتاً وہ اس کا نام بھی خطبے میں پڑھوانے لگے۔

ہندوستان میں شیعہ خطبے کا رواج دکن میں یوسف عادل شاہ (۱۵۱۰ - ۱۴۸۹) کے عہد میں ہوا، اور بارہ اماموں کے نام خطبے میں پڑھے گئے[۹] اس کے بعد سے دکن کی اسلامی ریاستوں میں یہ ہوتا رہا کہ اگر حکمران سُنی ہوا تو خطبے میں خلفائے راشدین کے نام شامل ہوتے اور اگر شیعہ تو بارہ اماموں کے نام خطبے کی یہ تبدیلی حکمران کے مسلک کو ظاہر کرتی تھی، چنانچہ عادل شاہ کے بعد کمال خاں سرنوبت نے، اس کے لڑکے اسماعیل (۱۵۱۰) کی جگہ انتظامِ سلطنت سنبھالا تو خطبے میں خلفائے راشدین کے ناموں کا رواج دیا۔[۱۰]

اسماعیل عادل شاہ کے زمانے میں، ایرانی سفیر اس کے دربار میں آئے تو خطبے میں والیِ ایران کے لیے دعا مانگی گئی اور یہ سلسلہ عادل شاہی عہد میں جاری رہا۔[۱۱] ابراہیم عادل شاہ (۱۵۷۹ - ۱۵۵۷) نے خلفائے راشدین کے ناموں کے ساتھ ساتھ بارہ اماموں کے ناموں کو خطبے میں شامل کر کے مفاہمت کی راہ تلاش کی۔[۱۲]

نظام شاہی خاندان میں، برہان نظام شاہ (۱۵۵۴ - ۱۵۰۸) نے شیعہ مذہب اختیار کیا اور اس نے خطبے کو تبدیل کر کے بارہ اماموں کے نام اس میں شامل کرائے۔[۱۳] حسین نظام شاہ (۱۵۶۵ - ۱۵۵۴) نے شیعہ خطبے کو جاری رکھا۔ اسماعیل نظام شاہ (۱۵۹۱ - ۱۵۸۹) کے امیر جمال خاں (وفات ۱۵۹۱) جو بہت بااثر تھا اور اس کی تخت نشینی میں اس کی کوششوں کو دخل تھا، وہ مہدوی عقائد رکھتا تھا، اس لیے اس نے خطبے میں سے بارہ اماموں کے نام نکلوا دیے۔[۱۴] لیکن برہان نظام شاہ ثانی (۱۵۹۵ - ۱۵۹۱) نے پھر سے شیعہ خطبہ شروع کرایا۔[۱۵]

قطب شاہی خاندان کے بانی، سلطان قلی (۱۵۴۳ - ۱۵۱۲) نے بھی اپنی سلطنت میں شیعہ خطبے کا رواج دیا۔[۱۶] اس نے شاہ اسماعیل صفوی (۱۵۲۴ - ۱۵۰۰) کا نام اظہارِ عقیدت کے طور پر خطبے میں اپنے نام سے پہلے شامل کرایا۔[۱۷] اس کے بعد سے قطب شاہی سلطنت میں یہ رواج رہا کہ بارہ اماموں اور ایران کے بادشاہوں کے نام خطبے میں شامل ہوتے تھے۔[۱۸]

---

[۹] تاریخ فرشتہ، حصہ دوم، ۸۹ - ۱۰۵ [۱۰] ایضاً: ص ۱۱۴ [۱۱] ایضاً: ص ۱۲۸
[۱۲] ایضاً: ص ۲۴۲ [۱۳] ایضاً، ص ۲۱۳ [۱۴] ایضاً، ص ۲۱۰
[۱۵] ایضاً، ص ۲۱۴ [۱۶] ایضاً: ص ۴۵۰ [۱۷] ایضاً، ص ۴۵۰، ۴۵۹ [۱۸] ایضاً، ص ۴۵۹

ہندوستان میں مغل حکمرانوں نے کبھی بھی عثمانی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ مغل دورِ حکومت میں جو خطبہ پڑھا جاتا تھا، اس میں خلفائے راشدین کے ناموں کے بعد امیر تیمور سے، موجود مغل حکمران تک تمام مغل بادشاہوں کے نام شامل ہوتے تھے۔ مغلیہ دورِ حکومت میں رواج تھا کہ ہر نیا مغل حکمران اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد آنے والے پہلے جمعے کی نماز میں مع شہزادوں اور امرا کے شریک ہوتا تھا اور جب امام خطبہ شروع کرتا تو ہر سابق حکمراں کے نام پر اس کو خلعت دی جاتی اور جب وہ نئے حکمران کا نام پڑھتا تو اسے سنہری خلعت عطا کی جاتی۔[۱۹] ہندوستان کی راجپوت اور مسلمان ریاستوں میں، خطبے میں مغل حکمران کا نام پڑھا جاتا تھا۔

اورنگ زیب نے جب دکن کی ریاستوں کو فتح کیا تو اس نے وہاں شیعہ خطبے کی جگہ سنی خطبے کو رواج دیا۔ ۱۶۶۵ء میں جب اس نے قطب شاہی حکمران سے معاہدہ کیا تو اس نے معاہدے میں خاص طور سے یہ شق رکھوائی کہ خطبے سے بارہ اماموں اور صفوی حکمرانوں کے نام نکال دیے جائیں۔[۲۰]

اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ (۱۷۱۲ - ۱۷۰۷) نے پہلی مرتبہ مغل سلطنت میں شیعہ خطبے کو رائج کرانے کی کوشش کی اور یہ فرمان جاری کیا کہ اس کی سلطنت میں بارہ اماموں کے نام کا خطبہ پڑھا جائے، اس کے اس فرمان کی وجہ سے پوری مغلیہ سلطنت میں مذہبی فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور خصوصیت سے لاہور، آگرہ اور احمد آباد میں سخت جھگڑے ہوئے۔ آخر کار بہادر شاہ نے اپنا فرمان منسوخ کیا اور پھر سے سنی خطبے کا اجرا ہوا۔[۲۱]

آخر عہدِ مغلیہ میں جب کہ مغل حکمران سیاسی طور سے کمزور ہوتے چلے گئے اور نئی طاقتیں ملک میں ابھرنے لگیں تو سلطنت کے آزاد اور خود مختار علاقوں سے مغل حکمران کا نام خطبے سے نکال دیا گیا۔ شاہ عالم (۱۸۰۶ - ۱۷۵۹) تک مغل حکمران کا نام خطبے میں لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد دہلی اور اس کے قریب کے علاقوں میں تو اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا ورنہ اور جگہ اس کا نام خطبے سے خارج کر دیا گیا۔[۲۲]

---

[۱۹] صالح کنبوہ: عمل صالح، حصہ اول، کلکتہ ۱۹۱۲ء، ص ۲۲۶

[۲۰] J.N. HOLLISTER : THE SHI'A IN INDIA, LONDON, 1953, P 124.

[۲۱] خافی خاں: منتخب اللباب، حصہ چہارم، کلکتہ ۱۸۶۹ء، ص ۶۸۱ - ۶۸۲

[۲۲] سرسید: ص ۱۸۷ - ۱۸۸

شاہ عالم کی وفات کے بعد سے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ مغل بادشاہ اب ان کی حفاظت کے قابل نہیں تو اس کے بعد سے ہندوستان میں خطبے میں عثمانی خلیفے کا نام پڑھا گیا۔ یہ عمل ہندوستان کے مسلمانوں کے اس ذہن کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ اس ذریعے سے خود کا عالم اسلام سے تعلق قائم رکھنا چاہتے تھے اور امید کرتے تھے کہ مصیبت کے وقت میں عثمانی خلیفہ اُن کی مدد کر سکے گا۔ لیکن جیسا کہ سرسید نے لکھا ہے کہ اکثر مساجد میں عثمانی خلیفے کا نام نہیں لیا جاتا تھا اور صرف یہ دعا ہوتی تھی:

اللھم ایّد المسلمین بالسلطان العادل والخیر واتباع سنن سید الموجودات[۲۳]

اے خدا مسلمانوں کی مدد کر، بادشاہ عادل کی حکومت سے، ان کی مدد کر بھلائی کرنے سے اور خدا کی فرماں برداری اور رسول کی پیروی کرنے سے جو تمام موجودات کے سردار ہیں۔

ہندوستان میں خطبے کی اس مختصر تاریخ سے ہندوستان اور عالم اسلام کی سیاست اور اس کے نشیب و فراز کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور اس کے ذریعے سے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے فقہی مسلک کا بھی پتا چلتا ہے۔

---

[۲۳] سرسید : ص ۱۸۸

مولانا دین محمد وفائی مرحوم
ترجمہ: رحمت فرخ آبادی ایم۔اے

سندھی زبان کی مختصر تاریخ

ہمارے علاقہ سندھ میں اس دور میں جو سندھی زبان بولی جاتی ہے، اگر اس کی ساخت اور پرداخت پر صحیح طور سے غور کیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ سندھی زبان، عربی اور پراکرت یا بگڑی ہوئی سنسکرت کی ملاوٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ جس طرح نر اور مادے کے جنسی تعلق سے بچہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح سنسکرت اور عربی کی ملاوٹ سے سندھی زبان پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح اگر سنسکرت کو سندھی کی ماں کہا جائے تو عربی کا تعلق سندھی سے باپ کا سا ہوگا۔

جب ہم سندھ کی تاریخ کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ عربی زبان کا سندھ سے تعلق اسلام سے بھی بہت پہلے سے تھا۔ سندھ، جزیرہ نما عرب کے قریب ترین علاقوں میں سے ہے اور اسی وجہ سے ان دونوں علاقوں میں قریب ترین تعلقات ہیں۔ جس طرح آج کل خانہ کعبہ، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور عبادت کا مرکزی نقطہ ہے، اسی طرح قدیم زمانے میں یہی خانہ کعبہ دنیا کے بت پرستوں کی زیارت گاہ بھی تھا۔ تاریخ فرشتہ میں مرقوم ہے کہ اسلام سے پہلے ہندوستان کے ہندو بت پرستی کے ارادے سے خانہ کعبہ کی زیارت کو جاتے تھے۔

اس واقعہ کو مصر کے خدیو عباس حلمی پاشا نے اپنے سفرنامہ "رحلۃ الحجازیہ" میں پوری تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے، اسی لیے سوامی دیانند نے جو ہندو قوم کا ایک بہت بڑا آدمی ہے، اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں لکھا ہے کہ مہابھارت کی لڑائی کے دور میں ہندوستان کے راجے مہاراجے عربی زبان بولتے تھے۔ سوامی دیانند نے اپنی اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب یدھشٹر، لاکھی کے گھر گیا تو اس نے اس سے عربی میں کچھ کہا جس کا جواب یدھشٹر نے بھی عربی ہی میں دیا۔ اس کے علاوہ بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے سمندر پار ملکوں سے بھی تعلقات تھے، جس کی وجہ سے ان کے لیے عربی اور دیگر زبانوں کا سیکھنا لازمی امر تھا[1]۔ سوامی دیانند کی تحقیقات

---

[1] دیکھیے ستیارتھ پرکاس، بنارس ایڈیشن۔ سملاس ۱۱،۷۔ صفحہ ۲۶۵

کے مطابق ہندوستان یا سندھ کے اسلام سے قبل عرب سے ایسے تعلقات تھے کہ عربی زبان یہاں کے راجاؤں کے دربار میں بولی اور سمجھی جاتی تھی - اسی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عربی زبان کا قدیم ترین تاریخی دور سے ہی سندھ سے تعلق تھا۔ یہ غلط ہے کہ یہ تعلق آفتابِ اسلام کے طلوع ہونے کے بعد پیدا ہوا۔

اسلام کے بعد سندھ میں باقاعدہ عربی زبان کے رواج کی ابتدا ہوگئی - بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے لے کر بنو عباس کے گورنروں کے دور تک سندھ میں سرکاری دفتری زبان عربی تھی اور اسی زبان میں تمام خط و کتابت ہوتی تھی اور کئی نومسلم سندھی آسمانِ علمِ حدیث کے آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ ابو معشر نجیح السندھی، عربی علم و ادب کے اس پائے کے جید عالم تھے کہ امام ابو عیسیٰ ترمذی اور کئی دوسرے بلند پایہ عالموں اور محدثوں نے ان سے احادیث روایت کی ہیں۔ اسی طرح کئی دوسرے بلند پایہ علما اور عربی کے شاعر سندھی یا سندھی النسل عرب تھے اور عراق میں پہلی صدی ہجری میں درس و تدریس میں مشغول تھے۔

عباسی خلیفہ مامون کے دور میں سنسکرت کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے کئی پنڈت سندھ اور ہندوستان سے دربارِ خلافت بغداد میں طلب کیے گئے، جنھوں نے سنسکرت زبان کی کئی نادر اور نایاب کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ پھر یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ سندھ میں ایک ایسا دور بھی گزرا ہے کہ یہاں کے بیشتر لوگوں کی مادری زبان عربی تھی - اسی وجہ سے مشہور عرب سیاح ابنِ حوقل بغدادی اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ اہلِ سندھ کی بولی عربی اور سندھی ہے -

درج بالا تاریخی حقائق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے جزیرہ نما عرب سے تعلقات ازمنۂ قدیم سے ہیں - یہ گمان کرنا کہ عربی زبان کا سندھ میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد رواج ہوا بالکل غلط ہے - سوامی دیانند بذاتِ خود ان قدیم تعلقات کا اقرار کرتے ہیں۔ عربوں کی حکومت کے بعد اگرچہ سندھ میں عربی زبان کے مادری زبان ہونے کا درجہ نہ رہا لیکن سندھی زبان میں عربی کے سیکڑوں الفاظ اس طرح شامل ہوگئے کہ علم اللسان کے ماہرین کے علاوہ عام آدمی ان کو نہیں جان جاسکتا کہ اس لفظ کی بنیاد عربی ہے یا سندھی۔ مثلاً وطاً سے وٹو۔ بطخ سے بدک ۔ تعویذ سے تائتھ ۔ شراع سے سرطہ۔ بیعاً سے بیانو۔ ضعیفہ سے نزائفا، بصل سے بصر۔ ثوم سے تھوم ۔ قاطع سے کاتی ۔ قال سے گال ۔ رداً سے رئو۔ حاذق سے ہاتک ۔ حوض سے ہود وغیرہ ۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو عربی سے بگڑ کر سندھی بن گئے ،

لیکن سندھی زبان میں ایسے الفاظ بھی کثرت سے ہیں جو اپنی اصل شکل و صورت اور لب و لہجے سمیت سندھی زبان میں کچھ اس طرح شامل ہو گئے ہیں کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ عربی زبان سے ان کا تعلق ہے ۔ مثلاً حاصل، مطلب، قدر، نظر، عیب، ثواب، عزت، غریب، نکاح، طلاق، عید، جمعہ، موت، حیات، عام، خاص، صحیح، غلط، وکیل، اصیل، طبیب، غرض، فرض، دعا، دوا، وقت وغیرہ ۔

سندھی زبان کی تاریخ میں سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ سندھ میں سندھی زبان کس نمونے اور کس انداز کی بولی جاتی تھی۔ جس سے ہمیں یہ اندازہ ہو سکے کہ موجودہ سندھی زبان اور اس دور کی سندھی زبان میں کس حد تک فرق یا تبدیلی پیدا ہوئی ہے ۔ اسی طرح اسلام سے پہلے مہابھارت کے دور تک کی سندھی زبان کی اصلیت پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا ہے ۔

موئن جوڈرو کے آثارِ قدیمہ کی کھدائی کے بعد ہمیں جو کتبے یا اشیا دست یاب ہوئی ہیں ان سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ تین ہزار سال قبل مسیح میں سندھ میں جو حروفِ تہجی استعمال ہوتے تھے وہ عراق کے اس دور کے حروفِ تہجی سے ملتے جلتے تھے ۔ نہ صرف رسم الخط بلکہ سندھ کی تہذیب اور یہاں کا تمدن بھی بالکل اہلِ عراق سے ملتا جلتا تھا ۔ اس دور سے لے کر ابتدائے اسلام تک یعنی کئی ہزار سال تک کی سندھی زبان اور اس کا رسم الخط تاریکی میں ہے ۔

سندھ سے عربوں کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد جب سندھ غزنوی سلطنت کے زیرِ انتظام آیا تو اب عربی زبان کے بجائے سرکاری زبان فارسی قرار پائی اور اسی زبان میں سرکاری خط و کتابت کی جانے لگی۔ اس زمانے میں سندھ کے کچھ مخصوص علاقوں پر سومرہ خاندان حکومت کر رہا تھا ۔ لیکن اس دور کی سندھی زبان کی اصلیت یا حقیقت پر کسی طرح کی روشنی نہیں ڈالی جا سکتی ۔ سومرہ خاندان کی حکومت کے بعد اقتدار پر سمہ خاندان کا قبضہ ہو گیا ۔ سمہ خاندان کے آخری حکمرانوں میں سے ایک یعنی جام فیروز کے دور میں ٹھٹھے کے مشہور صوفی، عالم اور فاضل حضرت قاضی قاضن (متوفی ۹۵۸ھ) گزرے ہیں ۔ ان کا سندھی کلام جو بیان العارفین میں درج ہے ہمیں قدیم سندھی زبان کے رنگ اور آہنگ سے آگاہ کر سکتا ہے ۔ اس کے بعد کے زمانے میں جب ارغون خاندان کے وارثوں نے اپنے جانشین حکمران ترخان خاندان پر ہندوستان کے مغل بادشاہ اکبر اعظم سے حملے کرائے تو اسی زمانے میں نئے ہالہ کے مشہور ولی اللہ مخدوم نوح علیہ الرحمۃ نے

سندھی زبان میں شاعری کی۔ ان کے کلام سے بھی ہمیں قدیم سندھی زبان کے بارے میں واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی دور میں مخدوم محمد جعفر بوبکانی نے عربی زبان میں "حل العقود فی طلاق السنود" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں انھوں نے سندھی زبان کے ایسے الفاظ اور جملوں سے بحث کی ہے کہ جن کے ادا کرنے سے طلاق ہو سکتی ہے۔ ان کے اس رسالے سے ہم یہ اندازہ بڑی آسانی سے لگا سکتے ہیں کہ دسویں صدی ہجری میں سندھی میں سندھی زبان بولی جاتی تھی۔ ان کے بعد حضرت مخدوم نوح علیہ الرحمۃ کے معتقد اور تربیت یافتہ سید عبدالکریم بلڑی والے کے سندھی کلام نے شہرت حاصل کی۔ شاہ عبدالکریم غالباً سب سے پہلے بزرگ ہیں جن کا سندھی کلام قلم بند کیا گیا ہے۔

شاہ عبدالکریم بلڑی والے کے دور کے بعد فوراً ہی سندھ کا تعلق دہلی اور قندھار سے قائم ہوا، اور دوسری طرف ہندوستان میں اسلامی بادشاہت میں زوال کے آثار بھی نظر آنے لگے۔ اس دور میں بلوچوں اور سندھ کے کلہوڑہ حکمرانوں کے درمیان جھگڑے شروع ہوئے۔ اسی دور میں ہمیں سندھی زبان وادب کے کئی بلند پایہ شیریں مقال نظر آتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب سلطنتوں کا زوال شروع ہوتا ہے تو اس زمانے میں قوم کے نازک خیال شاعر اور بلند پایہ فلسفی عالم وجود میں آتے ہیں۔ سندھ کی اسلامی سلطنت کے زوال کے زمانے میں یا پھر یوں کہیے کہ بارھویں صدی ہجری میں سندھی زبان کو عام طور پر پھیلانے اور مروج کرنے والے جید عالم مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی ہیں جنھوں نے اس زمانے میں کئی کتابیں اپنے دور کی مروجہ زبان میں لکھ کر اہلِ سندھ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ اسی دور میں مخدوم صاحب کے اطراف و جوانب میں سندھی شعرا کا ایک حلقہ نظر آتا ہے جس میں مخدوم ضیاء الدین ٹھٹھوی، علامہ محمد معین ٹھٹھوی، فقیر عبدالکریم گرہوڑی، پیر محمد زماں لواری والے، میاں محمد حسین ٹھٹھوی اور سندھ کے زندہ جاوید شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے علاوہ بھی اس دور کے کئی اور بزرگ شامل ہیں جنھوں نے سندھی زبان میں اپنے افکار و خیالات کو قلم بند کر کے لوگوں تک پہنچایا۔

اس دور میں سندھ کی سرکاری اور دفتری زبان فارسی تھی اور عربی زبان کا استعمال مدرسوں کے علما و اساتذہ کرتے تھے، لیکن عوام الناس کی زبان سندھی تھی مگر سندھی زبان کا نہ تو کوئی رسم الخط تھا اور نہ سندھی زبان عام طور پر لکھی جاتی تھی، جو کچھ لکھا بھی جاتا تھا اس کو عربی رسم الخط میں لکھا جاتا اور عربی کے ہی اعراب استعمال کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ دستور ہے کہ جب کوئی زبان عملی رنگ اختیار کرتی ہے اور

زندہ رہنے کے لیے کوشش کرتی ہے تو سب سے پہلے وہ نظم میں لکھی جاتی ہے۔ آپ اردو زبان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ابتدا میں اس میں منظوم کلام کہا گیا اور پھر اس کے بعد اس زبان نے ترقی کی دیگر منازل طے کیں۔ اُردو زبان کے محققین کے خیال کے مطابق اردو نثر سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے قرآن کریم کے ترجمے کی صورت میں پیش کی، اس کے بعد یہ ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی موجودہ دَور تک پہنچی ہے۔ اسی طرح سندھی زبان نے بھی پہلی مرتبہ نثر میں پیش ہوتے وقت قرآن کریم کے ترجمے کا شرف حاصل کیا۔ چنانچہ مٹیاری کے ایک بزرگ مخدوم عزیز اللہ (وفات ۱۲۷۲ھ) نے بارھویں صدی کے وسط میں قرآن پاک کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا جو کئی مرتبہ بمبئی سے شائع ہو کر اہلِ سندھ کے لیے موجبِ خیر و برکت ہوا۔

اس کے بعد ۱۲۹۹ھ (۱۸۵۲ء) کے قریب سندھ کے کمشنر سر بارٹل فریر نے فارسی کی جگہ سندھی زبان کو سرکاری خط و کتابت اور دفتری زبان کے طور پر لازم قرار دیا تو اس کے ساتھ ہی ساتھ سندھی کے مخصوص حروف کا نقطوں اور نشستوں کے لحاظ سے الگ رسم الخط بھی تیار کیا جو اب تک مروج ہے۔

سندھی رسم الخط کی تیاری سے اور اس کے بدلنے سے سندھ کی قدیم نظم کی تصویر بھی بدل گئی، کیوں کہ اس دورِ وسطی میں سندھی نظم نے عربی عروض کا قالب اختیار کر لیا تھا جو ہر لحاظ سے اس کے قد و قامت کے لیے موزوں تھا۔ خلیفہ گل محمد ہالائی پہلے سندھی بزرگ ہیں جنھوں نے سندھی زبان کو عربی اور فارسی کے قالب میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد تیرھویں صدی ہجری میں ایسے ایسے اور نامور جید عالم پیدا ہوئے جنھوں نے فارسی شعر کے ساتھ ہی ساتھ سندھی شعر و ادب کی بھی خدمت کی۔ ایسے شعرا میں سید غلام محمد شاہ گدا، مخدوم غلام محمد پیر جھنڈے والے، مخدوم ابراہیم خلیل ٹھٹھوی، سید غلام مرتضیٰ شاہ مرتضائی، آخوند عبدالواحد سائل حیدر آبادی، خلیفہ محمد قاسم ہالائی، حافظ حامد کھڑائی وغیرہ زندہ جاوید شاعر نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد سے آج تک سندھی شعر و ادب کے میدان میں جو گل سر سبد نظر آتے ہیں وہ ان ہی بزرگوں کے گوشہ چین ہیں۔

سندھی زبان کی عبارت اور رسم الخط نے ۱۸۵۲ء سے جو تبدیلیاں اختیار کی ہیں، وہ ایک بہت ہی طویل داستان ہے، ہم اس سے قطع نظر کر کے یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو سندھی اخبارات اور کتابوں میں لکھی جاتی تھی وہ ہندو اور مسلمانوں میں یکسانیت کی حامل تھی اور دونوں کا رنگ و آہنگ بھی

ایک ہوتا تھا۔ سندھی کے قدیم ترین اخبار "سندھ سدھار" کے پرانے فائلوں کے مطالعے سے ہمارے اس دعوے کا بیّن ثبوت مل سکتا ہے۔ اسی طرح سندھ کے محکمۂ تعلیم کی وہ کتابیں جن کے مصنفین ہندو اور مسلمان ہیں، تمام کی تمام ایک زبان اور ایک اسلوب اور رنگ و آہنگ کی حامل ہیں، لیکن گزشتہ دس پندرہ سال کے عرصے میں کچھ ہندوؤں کے دماغوں میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ سندھی میں سنسکرت اور ہندی کے الفاظ شامل کر کے سندھی زبان کی روانی اور اسلوبِ بیان کی سادگی کو بدل دیا جائے، اسی طرح دوسری طرف کئی مسلمانوں نے اُردو کی پیروی اختیار کرتے ہوئے سندھی میں اُردو، فارسی اور عربی کے نئے الفاظ داخل کرنے شروع کیے۔

سندھی زبان کی ابتدائی قدیم حالت سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ سندھی زبان کا عربی زبان سے بہت ہی گہرا اور ہمہ گیر تعلق ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ سندھی زبان کی ابتدا اور اس کے ارتقائی عمل کا کام اس جماعتِ اہلِ علم کی گود میں انجام دیا گیا جس کے علم و فضیلت کے سرچشمے اب تک ہمارے پاس بطور یادگار موجود ہیں۔ سندھی علم و ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ زبان مسلمانوں کے ہاتھوں ہی پلی پھولی ہے اور اب قیامِ پاکستان کے بعد بھی سندھی زبان کی مزید ترقی و ارتقا کا دارو مدار بھی مسلمانوں ہی پر ہے۔

اساسیاتِ اسلام :- از مولانا محمد حنیف ندوی

اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں اور کس حد تک ان سے فرد و معاشرہ کے تقاضے پورے ہوتے ہیں، موجودہ دَور کے غلط علمی رجحانات نے کن غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے اور اسلام کے نقطۂ نظر سے اُن کا کیا جواب ہے؟ اسلام علوم و فنون کے ارتقا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور عقیدہ و عمل کے وہ کون سے خطوط ہیں جو انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں؟ اساسیاتِ اسلام میں ان سوالات سے متعلق بڑے یقین پرور اور پُراثر اسلوب میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں ان تمام مشکلات کا تسلی بخش حل پایا جاتا ہے، جن سے کہ آج نوعِ انسانی دوچار ہے۔

صفحات : ۱۶ + ۲۸۴ قیمت -/۲۵ روپے

پروفیسر محمد صدیق

اردو کے خوش نویس شعرا

(دوسری اور آخری قسط)

رزاق

حاجی محمد عبد الرزاق خان مرحوم خلف اسحاق خان، خاندانِ حافظ الملک رحمت خان سے تھے۔ دیوان گلشنِ نعت ان کی تصنیف سے شائع ہوچکا ہے۔ ۱۸۸۲ء میں انتقال کیا۔ لیاقت علمی خاصی تھی۔ خوش نویسی سے بسر اوقات کرتے تھے۔ یہ چند شعر نعتیہ کلام سے منتخب ہوئے۔ (۳)

آدم کو جو سجدہ نہ کیا حکمِ خدا سے ابلیس ہوا کبر سے پابند بلا کا
رزاق سے رزاق کی ہر دم ہے تمنا کر مجھ کو سلامی نہ کسی شاہ وگدا کا

زار

منشی برہان الدین خان زار شاہ جہان آبادی شاعر دربار اکبر شاہ ثانی، فارسی، اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ خط شکستہ لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ پہلے اکبر شاہ کے خواصوں کے زمرے میں منسلک تھے، پھر شعرا میں داخل ہوگئے۔ (۳)

چرخ کے کیسے انقلاب ہوئے ___ پر کبھی ہم نہ کامیاب ہوئے
کیونکر اس بت کو یہ حالِ دلِ بدنام لکھوں کب وہ دیکھے ہے خدا کا بھی اگر نام لکھوں

زاہد

سخن ور شوخ طبع سید زاہد حسین زاہد ابن سید علی حسین مرحوم سادات موسوی اثنا عشری اور عمائد سہارن پور سے ہیں۔ آپ نے جو حالات لکھ کر بھیجے ان کا یہ خلاصہ ہے کہ ان کے جدِ اعلیٰ عبد الہادی عرف شاہ چراغ سلطان محمود غزنوی کے ہم راہ ہندوستان آئے۔ حضرت زاہد کے دادا حاجی سید اکبر علی مرحوم پہلے مالیر کوٹلہ کی ریاست میں ملازم رہے۔ پھر بہادر شاہ بادشاہ کی سرکار میں معتمدی وکالت کے عہدہ پر ممتاز ہوئے، اور اسی زمانے میں لارڈ کمبر میر کمانڈر انچیف ہند کے میر منشی

کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ حضرت زاہد کے والد ڈیرہ دون میں وکالت کرتے تھے، لیکن ان کا انتقال ان کی صغرسنی میں ہوگیا، اس لیے جو کچھ قابلیت انھوں نے بہم پہنچائی، اسے اپنے دلی شوق اور رغبت کا نتیجہ کہنا چاہیے۔ فارسی کی درسی اور عربی کی ابتدائی کتب قاضی محمد غلام عباس منیر شاگرد خواجہ آتش و حضرت دبیر سے اور بعض کتب مولوی غلام حسین شاگرد مولانا صہبائی سے پڑھیں اور انٹرنس کے درجے تک انگریزی مدرسہ میں بھی پڑھا۔ خداداد ذہانت اور ذوقِ سلیم کی امداد سے اچھی استعداد اور قابلیت حاصل کر لی اور کتب بینی کے شوق سے اُسے درجہ بدرجہ ترقی ہوتی چلی گئی۔ فنِ شعر کا مذاق فطرتاً طبیعت میں موجود تھا اور شفیق استاد کی فیضِ صحبت اور توجہ سے اس میں فی الجملہ اچھی استعداد بہم پہنچائی۔ ۱۸۸۶ء سے حضرت امیر کے دمِ آخر تک تخمیناً سترہ اٹھارہ برس ان سے اصلاح کا سلسلہ جاری رہا۔ محاوراتِ زبان کی تحقیق و چھان بین کا بے حد شوق رہا۔ اپنے استاد کے عقیدت مند تلامذہ میں رہے اور ان کی خدمت بھی کرتے رہے۔ چنانچہ امیر اللغات کی ترتیب میں بھی حصہ لیا۔ شعر گوئی بطور تفنن طبع کے ہے، ورنہ اس سے صلۂ شہرت کے طالب نہیں ہوتے۔ کلام میں کثرتِ مشق سے روانی اور پختگی اور بندش میں چستی اور زبان میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا ہوگئی ہے۔ تخلص کے برعکس ان کے اکثر اشعار میں معاملہ بندی، رنگینیِ خیال اور شوخی کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ زبان میں صفائی اور مضمون میں جدت کا زیادہ لحاظ رکھتے ہیں۔ خوش نویس بھی ہیں۔ خلیق، متواضع، پُرگو اور آزاد منش شخص ہیں۔ اب تینتالیس چوالیس برس کا سن ہوگا۔ دیوان مرتب ہوگیا ہے، مگر شائع نہیں کیا۔ حالات اور کلام مرسلہ کا انتخاب درج تذکرہ کیا گیا۔ (۴۳)

صحبتِ رنداں سے زاہد مدتوں بچتا پھرا ـــــ میکدے میں ہو کے آخر خراب آ ہی گیا

احباب کا دنیا سے سفر دیکھ رہے ہیں ـــــ دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہے ہیں

سپہری

مولوی محمد احمد صاحب خلف مولوی خواجہ انتظام علی ساکن سہارن پور مہتمم کوتوالی سرکار نظام دکن۔ اپنے والد کے قیامِ دکن کی وجہ سے اکثر وطن سے دور رہے اور حیدرآباد ہی میں تعلیم و تربیت پائی۔ فارسی زبان میں شعر کہنا شروع کیا اور مولانا فضل رب عرشی سے اصلاح لینے لگے اور انھی

کی رعایت سے سپہری تخلص اختیار کیا۔ عربی، فارسی کی استعداد عالمانہ پایہ کی تھی۔ دری زبان میں اچھا دخل تھا۔ طبیعت میں شوخی، رنگینی بلا کی تھی اور فطری طور پر سخن گوئی کا مادہ تھا۔ اعلیٰ درجے کے خوش نویس تھے۔ ہر قسم کے خطوط نسخ، نستعلیق، شفیعہ، ریحان وغیرہ پر کامل دسترس تھی۔ دوست نوازی، مروت، زندہ دلی نے ان کو مرجع احباب بنا رکھا تھا۔ ۱۳۰۳ھ میں مالک کارخانہ فنون حیدرآباد سے کچھ بحث آپڑی تو آپ نے ایک ناٹک "قران السعدین" کے نام سے لکھا۔ ایک اُردو فسانہ موسوم بہ فسانہ محبوب بھی لکھنا شروع کیا تھا، مگر وہ ناتمام رہا۔ ۱۸۹۸ء میں بمقام بیدر علاقہ دکن بہ حیات والد بزرگوار زیب خاک ہوئے۔ ۳۸ برس کی عمر پائی۔ اُردو کے مقابلے میں فارسی کلام پختہ تھا۔ ریختہ اُردو کا نمونہ یہ ہے:۔ (۵)

کس کا کرتی ہیں انتظار آنکھیں ــــــ بند ہوتی نہیں دمِ آخر
خطا معاف، عبث ہیں جناب کی باتیں ــــــ غضب یہ ہے میرا قاصد یہ مجھ سے کہتا

سحر

سرو بوستانِ فصاحت، چمن پیرائے بلاغت، جواہر رقم، ہفت قلم، جناب منشی دیبی پرشاد صاحب قوم کایستھ خلف منشی چنی لال اخگر، بزرگوں کا وطن بانگرمئو متصل قصبہ سندیلہ تھا۔ مگر آپ ۲۴ دسمبر ۱۸۴۰ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے اور تکمیلِ تعلیم کے بعد اپنے والد سے استفادۂ سخن فرمایا۔ مدتوں سر رشتۂ تعلیم میں ملازم رہے۔ ترقی پاکر ڈپٹی انسپکٹری کے فرائض انجام دینے کے بعد سرکار سے پنشن حاصل کی۔ شباب کے ہنستے کھیلتے دن دہلی اور لکھنؤ میں گزرے۔ کشیدہ قامت، سانولا رنگ، چیچک رو تھے۔ مزاج نفیس اور عطریات کے شوقین تھے۔ عادات و اخلاق کے لحاظ سے شریف اور صاحبِ تصانیف تھے۔ نظم پروین، خلاصۃ المنطق، معیار الاملا، محیط المساحت، مراۃ العلوم وغیرہ کے سوا واسوخت اور دو دیوان آپ کی یادگار ہیں، جن میں ایک کا نام "سحر سامری" ہے۔ آپ بدایوں میں دورِ اول، دورِ دوم کے مشاعروں میں شرکت فرماتے رہے۔ چودھری اصغر علی ضابطؔ، مولوی غنی رضا وحشیؔ مرحوم کے ہم عصر تھے۔

۱۸۹۳ء میں آپ زندہ تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ نواب سید محمد زکریا خان زکیؔ مرحوم بقید حیات تھے اور حافظ عنایت احمد صاحب رئیس بدایوں کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ لالہ رام لال راقمؔ

اور منشی گنیدن لال گو سحر بدایونی کے یارانِ صادق میں تھے۔ نہایت علم دوست، کلام کے حسن و قبیح پر کھنے میں اپنے احباب سے گوئے سبقت لے گئے تھے۔ خوش نویسی میں یگانہ، زود گوئی میں مشہور زمانہ تھے۔ آپ نے پنشن لینے کے بعد بھی علمی زندگی اور درس و تدریس کا شغل جاری رکھا۔ طلبا کو کتابت سکھائی اور ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو اس وقت صاحبانِ مطابع ہیں۔ بدایوں میں بہت سے نوجوان آپ کے سرچشمۂ علوم سے بہرہ ور ہو کر اس وقت اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہیں۔ افسوس ہے کہ آپ کے انتقال کے بعد آپ کا کتب خانہ برباد ہو گیا اور نایاب قلمی کتابیں پنساریوں کی ردی میں شامل ہو کر کوڑیوں کے مول فروخت ہوئیں۔

منشی انوار حسین تسلیم جو کاملِ فن اور شعر کے نقاد تھے۔ حضرت سحر کے کلام پر یہ رائے دیتے ہیں کہ آپ محاورہ دانِ اردو و ہم زبانِ حضرات لکھنؤ ہیں۔ جو مضمون ہے عالی ہے۔ کلام حشو و زواید سے خالی، بندش کی چستی، الفاظ کی درستی دلوں کو لبھاتی ہے۔

آپ کے کلامِ معارف نظام میں تصوف اور حقائق کے نکات موجود ہیں۔ صنائع بدائع کے برتنے میں روزمرہ اور سادگی۔ بے ساختہ پن کو زیرِ نگاہ رکھتے۔ عاشقانہ شعر خوب کہتے ہیں۔ جو عہدِ عالمِ جوانی کے لکھے ہوئے ہیں ان میں دلی واردات کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ جادو نگاری کے کرشمہ یہ ہیں۔ (۱۷۰)

نظر آتے ہو سحر عاشق کسی پر	تمھیں ہر گھڑی چشم نم دیکھتے ہیں
پسندیدہ نہ ہو لے سحر کیوں سب کو کلام اپنا	رہے مدتوں دہلی میں چھانا لکھنؤ برسوں
لے سحر جیتے جی نہ رہائی ہوئی نصیب	چھوڑا تو جان لے کے غمِ ہجرِ یار نے

سرور

آب و رنگ طلسمِ بیان، جادو مقال، سحر زبان، ناظم نظم دلپذیر، ناثر عدیم النظیر سخن ور مشہور و معروف نزدیک و دور میرزا رجب علی بیگ سرور خلف میرزا اصغر علی۔ آپ فسانۂ عجائب کے مصنف اور آغا نوازش حسین خان نوازش کے شاگرد رشید تھے۔ نفاست پسند، خوش مزاج، باسلیقہ انسان تھے۔ ہمیشہ رؤسا نوابوں کی مصاحبت میں رہے۔ ان کو فسانہ نگاری نے پروان چڑھایا۔ یارانِ انجمن کی محفل سے واجد علی شاہ کے دربار تک پہنچایا، شہرت اور ناموری میں

چار چاند لگتے ہی راجہ بنارس اور مہاراجہ الور کی مصاحبت میں داخل ہوئے۔ مگر بہ مقتضائے "حُبِّ الوطن از ملکِ سلیمان خوشتر"، لکھنؤ کے لیے ہمیشہ تڑپتے رہے۔
کلکتہ، لکھنؤ، میرٹھ، دہلی، راجپوتانہ وغیرہ کی سیر و سیاحت بھی کی تھی۔ بڑے یار باش اور زندہ دل تھے۔ شرف الدین میرٹھی شعرائے ہند کے یارانِ صادق میں تھے۔ ابتدا میں مرثیہ خوانی کا شوق ہوا، مگر جب اس گروہ میں رنگ نہ جما تو خوش نویسی کی جانب متوجہ ہوئے، گو اعلیٰ درجے کے خوش نویس ہو گئے، مگر کاملانِ فن میں ان کا نام نہ نکلا۔ فنِ موسیقی میں دست گاہ حاصل تھی۔ لیکن نثاری، مقفیٰ اور بلیغ سحر نگاری میں اپنے معاصرین سے بازی لے گئے اور کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکا۔ آپ طرح دار خوش وضع جوان تھے۔ جامہ زیبی میں یگانۂ وقت، نک سک سے درست اپنے زمانے کے زبردست منشی اور قابل مصنف تھے۔ سرورِ سلطانی، شگوفۂ محبت، گلزارِ سرور، انشائے سرور، شبستانِ سرور وغیرہ کئی کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔ مگر سچ ہے کہ فسانۂ عجائب نور دیدۂ ادب ہے۔ جس کا ہر فقرہ رنگینی میں غازۂ جمالِ خوباں اور دلفریبی میں نابشِ عارضِ محبوباں ہے۔ عروسانِ مضامین کو آراستہ کرنے میں نہایت عرق ریزی اور جان فشانی سے کام لیا ہے۔ ہر بیان میں لکھنؤ کے پری وشاں ماہ رُخ کا جلوہ دکھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت میرزا غالب جیسے دبیرِ روزگار نے فسانۂ مذکور کی تقریظ لکھتے ہوئے اردو میں سرور کو سرخیلِ نثاراں مانا ہے۔ متعدد لوگوں نے اس کا جواب لکھنے پر قلم اٹھایا مگر اس میدان میں کچھ نہ پایا۔ جس طرح اُردو مثنویوں میں گلزارِ نسیم اور بدرِ منیر لاجواب ہے، اسی طرح فسانوں میں فسانۂ عجائب انتخاب ہے۔ میرزا سرور ۱۲۸۵ھ میں اس دارِ فنا سے راہیِ عالمِ بقا ہوئے۔ آپ کی نظم، نثر کے مقابلے میں کوئی درجہ [illegible] رکھتی ہے۔ کلام یہ ہے۔ (۴۶)

رات کس جا رہا سرور بھلا ___ آپ کا یہ بھی افترا دیکھا
جب سے اپنا لقب ہوا ہے سرور ___ روز و شب ہے خمار آنکھوں میں

سلیم

جناب منشی گوری شنکر صاحب کایستھ لکھنوی خلف تیج بھان عرف لالہ چین سکھ رائے صاحب آپ کے دادا لالہ سادھو رام صاحب محلہ اشرف آباد لکھنؤ کے قدیم شرفا میں سے تھے۔ سلطانِ عالم

واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کے عہد میں آپ کو تصنیف و تالیف کا مذاق پیدا ہوا تھا۔ ۱۹ سال کی عمر میں سید احمد میرزا صاحب صابر سے خوش نویسی و علمِ عروض میں دست گاہ حاصل کی۔ پھر محمد میرزا صاحب اُنس شاگردِ رشید حضرت ناسخ کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ منشی صاحب سرکارِ انگریزی میں بھی مختلف عہدوں پر ممتاز رہ چکے ہیں۔ آخر وقت میں آپ ٹھاکر مہاراج سنگھ صاحب بہادر تعلقہ دار کے نائب ریاست تھے۔ گو آپ کا کلام لکھنؤ کی قدیم شاعری کا نمونہ ہے، مگر مضمون آفرینی سے خالی نہیں۔ اپنے زمانے کے رنگ کے موافق استعارہ اور تشبیہ کے دلدادہ تھے۔ گو ناسخ کی تحریر کے فریفتہ تھے، تاہم بعض اشعار میں درد بھی ہے۔ بعض بعض شعر ایسے کہتے ہیں کہ بے ساختہ منہ سے داد نکلتی ہے۔ معنی بندی میں کسی طرح اپنے ہم عصروں سے کم نہیں۔ نکتہ یاب ہیں، معنی طراز ہیں۔ آپ کا دیوان ۱۳۱۲ھ میں شائع ہو چکا ہے، جس کا انتخاب یہ ہے: (۱۴۴)

بولے سعدی یہ غزل سنکر سلیم ——— شعر کیا تحفے ہیں ہندوستان کے
دیکھو سلیم خنجرِ قاتل کے سامنے ——— جھپکے نہ آنکھ، منہ نہ دمِ امتحاں پھرے
جب نظر آیا جمالِ یار غش آیا سلیم ——— وصل کی راتیں شبِ فرقت سے بدتر ہو گئیں

شاطر

مولوی رضا احمد ابن مولوی حکیم نیاز احمد صدیقی۔ آپ بدایوں کے قدیم معزز شرفا سے تھے۔ عربی فارسی میں اچھی استعداد تھی۔ اپنے والد سے فن خوش نویسی میں کمال حاصل کیا تھا۔ لطیفہ گو، نکتہ سنج شاعر تھے، سلیس سادہ گو تھے اور شعر میں صفائی کو بلند کرتے تھے۔ بلند شہر، سہسوان میں وکالت کرتے رہے۔ پھر اپنے وطن بدایوں میں آکر وکالت شروع کی۔ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔ جو دو چار شعر دستیاب ہوئے ہیں درج کیے جاتے ہیں: (۴)

گو ضد سے لاکھ بار کرے بیوفائیاں ——— لیکن خدا قسم تیری عادت وفا کی ہے
اے اہلِ بزم حضرت شاطر کو دیکھیو ——— کیسے چلے ہیں بغلوں میں نعلین داب کے

شباب

جناب صاحب زادہ میرزا محمد اختر یار خان صاحب خلف صاحب زادہ میرزا برکت علی خان صاحب گلشن آبادی برادر خالہ زادہ نواب غوث محمد خان والیِ جاورہ، جناب میاں شاہ نظام الدین

صاحب خلف جناب میاں نصیر الدین صاحب عرف میاں کالے صاحب کے ہاں ان کی ننھیال تھی ۔ میرزا عبدالقادر بیگ دہلوی داروغہ تسبیح خانہ وجواہر خانہ اکبر ثانی و بہادر شاہ آپ کے حقیقی نانا تھے ۔ شجرۂ نسب حسب مظہر ہے کہ آپ شریف خاندان ہیں۔ اور آپ کے بزرگوں نے کارہائے نمایاں کیے ہیں۔ آپ کے دادا میرزا غلام چشتی خان صوبہ دار چھاؤنی مہد پور شاہ نظام الدین کے خلیفہ تھے ۔ صاحب زادہ صاحب موصوف جاورہ کی پیدائش ہیں ۔ پیدائشی نام نیکو اختر (۱۲۸۷ھ) اور یہی سال ولادت ہے ۔ آپ نے مولانا عبدالرحمٰن صاحب دہلوی سے فارسی کی تعلیم پائی اور خوش نویسی کی مشق فرمائی ۔ ابھی علوم رسمیہ کی تکمیل کا وقت بھی نہ آیا تھا کہ نو عمری میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا ۔ لڑکپن سے آپ ذہین اور طبیعت دار تھے، اور آخر ۶ - ۱۸۹۵ء میں اختر تخلص کیا او صاحب زادہ میرزا محمد اشرف یار خاں صاحب شرف جو اُن کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے ، ان کے تلامذہ میں داخل ہو گئے ۔ کچھ دنوں بعد شوق نے پھر دل میں گدگدی پیدا کی اور اختر کی بجائے شباب تخلص اختیار کیا اور شاہدان سخن کی اداؤں پر نثار ہونے لگے ۔ ۱۸۹۸ء میں جناب داغ مرحوم کے سرچشمۂ تلمذ سے فیض یاب ہوئے ۔ ہنستے کھیلتے شعر کہے ۔ شگفتہ زمینوں میں زورِ طبع دکھایا ۔ قصائد میں ہمیشہ شاہ زادہ مرزا عبدالغنی ارشد سے اصلاح لیتے رہے ۔ آپ کا ایک قصیدہ جو تحفۂ احباب در مدحِ نواب سرامیر الدین خان کے نام سے طبع ہو چکا ہے ، اس پر حضرت جلال لکھنوی مرحوم نے نہایت عمدہ ریمارک کیا ہے ۔ آپ غزل گوئی کے سوا قصائد اور نیچرل نظمیں بھی لکھتے ہیں ۔ ریاست مالیر کوٹلہ اور جاورہ کے جلسوں میں آپ سخن ورانِ باکمال سے داد پا چکے ہیں اور سب نے آپ کی تیغ زبان کے جوہر کو مانا ہے ۔ صاحب زادہ صاحب موصوف ریاست جاورہ میں عرصہ تک مختلف شعبوں میں ملازم رہے ہیں ۔ ہز ہائینس نواب محمد اسمٰعیل خان مرحوم سابق والیِ جاورہ آپ کو نہایت عزیز رکھتے تھے اور آپ کے خدمات کی قدر کرتے تھے ۔ آپ مشہور مقاماتِ ہند کی سیر و سیاحت کر چکے ہیں ۔ مہارادت اودے سنگھ کی ہم راہی میں دیولہ پرتاب گڑھ میں بھی رہ چکے ہیں ۔ علمِ موسیقی سے دلی ذوق، مرثیہ خوانی کا بہت شوق ہے ۔ آپ نے ایک نیشنل ڈراما بھی تصنیف کیا ہے ۔ جس میں نظم و نثر کے دلکش نمونوں کو پیش کرنے میں سحر بیانی کے کرشمے دکھائے ہیں ۔ ٹھمری اور فارسی غزل بھی کہہ لیتے ہیں ۔ چند قصائد تحفۂ احباب ، نور سحر ،

ثواب جج کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ طبیعت کا بانکپن اور شوخی اکثر اشعار میں اپنی جھلک دکھا جاتا ہے۔ ۱۳۰۶ھ میں بعمر ۱۹ سال ان کی شادی نواب قاسم جان کے خاندان میں نواب محمد حسین خان کی دوسری بیٹی سے دہلی میں ہوئی۔ اس کے بعد بارہا نواب نصیر الدین احمد خان برادر نواب صاحب لوہارو جو اُن کے ہم زلف بھی ہیں انکے پاس امرتسر، لاہور، بھوانی رہے۔ لوہارو اور کوٹلہ میں رہے۔ ۱۸۹۶ء میں نواب سر امیر الدین احمد کے مصاحب رہے اور کئی ریاستوں میں بطور معتمد بھیجے گئے۔ نواب صاحب ان کی خدمات سے بہت راضی وخوش رہے۔ ۱۹۰۰ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور اعزا کے اصرار سے جاورہ میں مستقل قیام ہوگیا۔ ان کے متعلق ایک عجیب اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ آپ نے بلا کسی قسم کی سابق شناسائی کے اپنا پورا قلمی دیوان جس میں دو ہزار سے زیادہ اشعار ہیں راقم تذکرہ کو بھیج دیا اور پھر جب کبھی کسی غزل یا قصیدے کی ضرورت ہوتی تو اس میں سے نقل منگا لیتے۔ کئی سال خط وکتابت رہی۔ پھر سلسلہ مسدود ہوگیا۔ سالہا سال بعد نواب سر امیر الدین احمد خان صاحب والیِ لوہارو سے ان کے ذکر پر معلوم ہوا کہ جوان انتقال کر گئے۔ افسوس! کلام فصاحت التیام ملاحظہ ہو۔ (۱۲۵)

میری شبِ فراق سلامت رہے شباب ــــ قصہ ہزار طول ہو زلفِ دراز کا

رنج اور رنج بھی جدائی کا ــــ اب تو ہنسنا ہے بے حیائی کا

کوئے جاناں میں اے شباب اپنا ــــ کوئی تو صورت آشنا ہوگا

شگفتہ

شگفتہ: منشی خیراتی لال کایستھ۔ خلف رائے طوطا رام۔ تیز فہم، نکتہ جو، جدت پسند تھے۔ مرزا اصغر علی خان نسیم دہلوی کے تلمیذ وارادت مند تھے۔ صاحبِ دیوان گزرے ہیں۔ کلام بہت پُر اثر ہے۔ محاورہ بندی نہایت مناسب اور زبان شستہ ہے۔ مضمون آفرینی بھی پسندیدہ ہے۔ کہیں عشق ومحبت کا اظہار، کہیں شوق وانتظار کی تصویر، کہیں اشکِ حسرت کی تراوش ہے اور کہیں خونِ آرزو۔ غرض جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کا نقشہ کھینچ دیا۔ وطن لکھنؤ تھا مگر فیضِ استاد سے کہیں کہیں کلام میں دہلی کا رنگ وبو پایا جاتا ہے۔ ۱۸۹۸ء کو وفات پائی۔ کتابت کے ذریعہ سے بسر اوقات کرتے تھے۔ لکھنؤ چھوڑ کر کان پور کو اپنا وطن بنا رکھا تھا۔

آپ کا دیوان منشی جاندبلی متخلص بہ تکلم نے آپ کی وفات کے بعد شائع کیا۔ مگر افسوس ہے کہ ایک خوش رقم اور مشہور خطاط و خوش نویس کا کلام عمدہ حالت میں اشاعت پذیر نہ ہوا۔ دیوان میں اعلیٰ درجے کا کاغذ لگایا گیا ہے، مگر خط نہایت خراب، چھپائی بالکل معمولی، پھر طرہ یہ کہ شاگردوں نے کلام کی صحت کا بھی لحاظ نہ کیا۔ خیر یہی کیا کم ہے کہ مرحوم کا کلام تاریکی اور گمنامی سے نکل کر روشنی میں آگیا۔ انتخاب کلام یہ ہے۔ (کل اشعار ۳۶۰)

بے جا مصیبتوں کی شکایت بجا نہیں ___ کیا دخل ہے مشیت پروردگار میں
رنج تنہائی نہ ہوگا شام غربت میں مجھے ___ ساتھ میرے جائے گی مجھ بے وطن کی آرزو
جو کام آج کا ہے وہ کل پر نہ چھوڑیئے ___ اس عمر مستعار کا ہے اعتبار کیا
زمین کوئے جاناں سے بڑھا کر صحبتیں اپنی ___ شگفتہ دیدہ و دانستہ ہم برباد ہوتے ہیں

شمس

منشی سید ظفیر الدین صاحب ساکن شیر گھاٹی، محلہ شمالی، ضلع گیا (صوبہ بہار) ۱۳۱۱ھ سال ولادت ہے۔ فارسی اُردو کے درسیات اپنے مکان پر پڑھنے کے بعد سیاحت کا شوق دامن گیر ہوا۔ کلکتہ، رنگون وغیرہ مختلف مقامات پر رہے۔ شعر و سخن کے علاوہ فن سپاہ گری میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ جوان، رعنا، ذہین و خوش فکر ہیں۔ اُردو نثر کی تحریروں میں آپ کی ڈراما نویسی بھی قابل قدر ہے۔ کئی ڈرامے لکھے ہیں۔ فن نقاشی اور مختلف قسم کے خطوط صنعتی لکھنے میں خاص مہارت ہے۔ اوائل عمری سے شاعری کا مذاق ہے۔ مولانا شفق عماد پوری کو اپنا کلام دکھاتے ہیں اور ان کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔ (۱۱)

جب کلیسا کو گئے خانہ کعبہ سے گئے ___ شمس جب کعبہ میں آئے تو کلیسا ہو کر
نہ آئی نیند مجھ کو دیدۂ بیدار کی صورت ___ پھری آنکھوں میں پتلی بن کے شب بھر یار کی صورت

شمس

منشی محمد شمس الدین صاحب خوش نویس لکھنوی شاگرد خواجہ محمد مرتضیٰ خان بہادر بقا لکھنوی مطبع سرکاری بک ڈپو لاہور میں مدتوں مؤلف "تذکرہ ہذا" کے عم نامدار رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب کے ماتحت کام کرتے رہے۔ متعدد قطعے ان کے ہاتھ کے موجود ہیں۔ بعد کو لکھنؤ جا کر مطبع

نولکشور میں ہیڈ خوش نویس رہے۔ تمام شمالی ہندوستان میں ان کی فنِ خطاطی کی مہارت اور نستعلیق کتابت کی شہرت تھی۔ فنِ سخن میں بھی مشق تھی۔ ذہن کی رسائی مضامین سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اسّی برس سے زاید عمر پاکر انتقال کیا۔ یہ ان کا کلام ہے۔ (۴۳)

دانہ ہائے سبحہ سے لیکر امام سبحہ تک ___ سلسلہ دوڑا ہوا ہے رشتۂ زنار کا
حضرتِ استاد تو ہیں آسمانِ شاعری ___ شمس میں ہوں، کیوں نہ ہو شُہرہ مرے استاد کا

شوخ

میر اقدار علی صاحب، قدیم وطن بلگرام ہے۔ مگر ان کے والد ماجد مولوی سید فرخند علی سانڈی ضلع ہردوئی میں جا رہے۔ اس وقت سے یہی ان کا وطن ہو گیا۔ حضرت شوخ نے طبیعت بہت چلبلی اور شوخ پائی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے استاد حضرت امیر مینائی نے ان کا تخلص شوخ تجویز فرمایا۔ فارسی و عربی کی تکمیل کے بعد انھوں نے خوش نویسی، شاعری اور فن سپاہ گری میں بھی کمال پیدا کیا۔ پھر انگریزی میں انٹرنس پاس کر لیا۔ شاعری کا مذاق فطری تھا۔ حضرت امیر مینائی کے فیضِ اصلاح سے طبیعت میں اور بھی روانی پیدا ہو گئی۔ مگر زیادہ دنوں جناب امیر سے استفادہ نہ کر سکے تھے کہ انھوں نے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد سید منصب علی صاحب ہنر مرحوم شاگرد رشید آفتاب الدولہ قلق لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ اب طبیعت بہت منجھ گئی ہے اور اصلاح کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہردوئی میں ماسٹر ہیں۔ ہردوئی میں حکام کی طرف سے کوئی جلسہ ہوتا ہے تو یہ نظم پڑھنے کے لیے ضرور یاد کیے جاتے ہیں۔ ہندی شاعری سے بھی ذوق ہے۔ اپنے کلام کو دلکش لہجہ اور انداز سے پڑھتے ہیں۔ پُرتاثیر شعر ہوتا ہے۔ زبان کی شستگی اور بیان کی سلاست، شوخی اور متانت کا پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے۔ روزمرہ صاف ہے۔ اب انتخابِ کلام نذرِ ناظرین ہوتا ہے۔ (۱۷)

اس طرح سے دل محوِ تصور ہے کہ ہر دم ___ آنکھوں میں پھرا کرتی ہے تصویر کسی کی
شوخ ہے آٹھ پہر دل میں حسینوں کا خیال ___ بندۂ عشق ہیں، ہم یادِ خدا کیا جانیں

شوخ

سید علی متقی خان شوخ خلف سید علی مجتبیٰ رئیس امروہہ، استعداد عربی و فارسی معقول ہے۔

انگریزی بھی بقدرِ ضرورت جانتے ہیں۔ نہایت سلجھی ہوئی طبیعت ہے اور بہت سنجیدہ مزاج ہیں۔ جس زمانے میں مولانا محمد علی مرحوم نے اول مرتبہ "ہمدرد" جاری کیا تھا آپ بھی عملۂ ادارت میں شامل تھے۔ تقریر اور تحریر دونوں باتوں میں اچھا دخل ہے۔ میونسپل کمشنر اور سینئر وائس چیئرمین رہ چکے ہیں۔ خط بہت پاکیزہ ہے۔ فنِ شعر میں سید محسن حسین صاحب سخیؔ امروہوی سے تلمذ رہا ہے۔ چالیس سال کے قریب عمر ہوگی۔ عرصہ سے شغلِ شعر گوئی ترک ہے۔ ایک غزل جو رسالہ اعجاز امروہہ میں شائع ہوئی تھی، جناب منظور حسین صاحب افسر صدیقی نے کراچی سے روانہ فرمائی ہے۔ اس کا انتخاب حاضر خدمت ناظرین ہے۔ (۵)

پیام موت ہے حکم رہائی ۔۔۔ ہوئی میعاد پوری قید غم کی
دکھا دے صورت اس پردہ نشیں کی ۔۔۔ تو سمجھوں کچھ حقیقت جام جم کی
اسی نے دل دُکھایا خوب اے شوخ! ۔۔۔ توقع ہم نے کی جس سے کرم کی

شوریدہ

شیخ سلطان دین، برہان پور میں وطن تھا۔ ایک عرصہ تک اورنگ آباد میں بھی قیام رہا تھا۔ خطِ نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ پہلے سلطانؔ تخلص کرتے تھے، اس کے بعد تشہیرؔ، بعد کو شوریدہؔ ہوگئے۔ یہ اشعار ان کی طبع آزمائی کا نتیجہ ہیں۔ (۴)

یک رنگ میں کئی رنگ بناتا ہے رنگیلا ۔۔۔ ہر طرح میں کئی طرح دکھاتا ہے رنگیلا
رنگین ادا سے جب تو گیا باغ میں سجن ۔۔۔ ہر نقش پا زمین پہ نہ تھے گل کے دستے تھے

شہید

جناب منشی محمد بخش شہیدؔ ابن منشی خدا بخش خوش نویس، باشندہ قصبہ سندیلہ ضلع ہردوئی، شاگرد حضرت ناسخ و میر علی اوسط اشک مرحوم۔ جناب شہیدؔ نے محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ بادشاہان اودھ کا زمانہ دیکھا۔ ۱۲۴۳ھ میں ان کے والد منشی خدا بخش کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ انھوں نے خواجہ وزیر اور حضرت اسیر کی صحبتیں اٹھائی تھیں۔ ان حضرات کے مکانوں پر جس جس طرح میں مشاعرے ہوا کرتے تھے، ان میں ان کی غزلیں موجود ہیں۔ ۱۲۷۷ھ میں حیات تھے۔ سنِ وفات نہ معلوم ہو سکا۔ شباب و شیب کا زمانہ لکھنؤ کے شعرا کی صحبتوں میں

گزرا ۔ خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے ۔ رعایتِ لفظی کے دل دادہ تھے اور اپنے استاد حضرت ناسخ کے پیرو ۔ بڑی بڑی مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کے جوہر دکھائے ہیں ۔ کوئی شعر مضمون آفرینی اور جدت طرازی سے خالی نہیں ۔ لیکن سوز و گداز ان کے کلام میں کم نظر آتا ہے ۔ مگر یہ مجبور تھے ، کیوں کہ وہ زمانہ ایسی ہی شاعری کو پسند کرتا تھا ۔ ہر طرف گل و بلبل کے افسانے اپنا رنگ جمائے ہوئے تھے ۔ شہید کا کلام اپنے معاصرین کے کلام سے کسی طرح کم نہیں ۔ قصائد ، غزلیات ، رباعیات ، مثنویاں اور تاریخیں کثرت سے کہی ہیں ۔ کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا اور اپنے عقاید کے بہت سخت پابند تھے ۔ اچھے پُرگو شاعر تھے ۔ مگر جیسا کہ اس زمانے کا مذاق تھا ، کلام میں رکاکت اور ابتذال کی کمی نہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ کلام میں اکثر فارسی اشعار کے ترجمے بھی ملتے ہیں ، مگر یہ کوئی عیب نہیں ، سوال سلیقۂ ادا کا ہے ۔ انتخابِ کلام ملاحظہ ہو ۔ (۴۹)

نام آیا جب آشنائی کا ۔۔۔ پھر گلہ کیا ہے بے وفائی کا

بیٹھے کیا ہو چلو شہید کہیں ۔۔۔ وقت ہے قسمت آزمائی کا

اثرِ تربیتِ حضرتِ ناسخ ہے شہید ۔۔۔ شہرہ کیونکر نہ بھلا میرے سخن کا ہوتا

صبا

منشی گوبند لال پسر منشی گوکل چند لکھنؤ کے متوطن تھے ۔ ۱۲۹۰ھ میں عمر ۶۰ سال تھی ۔ سرکار رام پور میں ملازم تھے ۔ اُردو ، فارسی اور عربی کے ماہر تھے اور بقول امیر احمد مینائی مرحوم "معانی ، بیان ، عروض ، قافیہ ، معما ، حساب ، جبر و مقابلہ ، جغرافیہ ، تواریخ ، مساحت ، فلاحت میں دست گاہ ، نقاشی ، مصوری و خطِ نستعلیق و ناگری و انگریزی سے آگاہ" ۔ فارسی ، عربی ، اردو ہر سہ زبان میں شعر کہتے تھے ۔ فارسی کلام زیادہ ہے ۔ تذکرۂ انتخابِ یادگار سے دو شعر انتخاب کر کے نذرِ ناظرین ہیں ۔

گرمیاں وہ کر کے غیروں سے جلاتے ہیں مجھے ۔۔۔ میں مسلماں جیتے جی ہندو کا مردہ ہو گیا

ذکرِ خال و خط بھی روئے صافِ جاناں میں نہیں ۔۔۔ زاغ و طوطی کی حکایت اس گلستاں میں نہیں

ظہور

مولوی محمد ظہور علی دہلوی مرحوم خلف مولوی فتح علی خان بہادر ۱۲۲۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے ۔

کتبِ درسیہ مفتی صدرالدین خان آزردہ سے پڑھیں۔ اوائلِ مشقِ سخن میں چند غزلیں شاہ نصیر اور حکیم مومن خان کو دکھائیں، بعدازاں ذوق مرحوم سے تلمذ اختیار کیا۔ ملازمت پیشہ اور مشہور خوش نویس تھے۔ پہلے مدت تک تھانے دار رہے۔ پھر سررشتۂ تعلیم میں مدرس فارسی مقرر ہوئے۔ سرکارِ شاہی سے شمس الشعرا کا خطاب ملا تھا۔ ۱۲۸۶ھ میں بعمر ۶۵ سال انتقال کیا۔ ان کے والد سرکارِ انگریزی کے جاگیردار تھے۔ گورنر جنرل ہند نے بمقام دہلی ۱۸۲۲ء میں بصلہ مدح گستری انھیں خلعتِ فاخرہ عنایت کیا تھا۔ سرکارِ شاہی سے بھی اکثر انعام و اکرام ملتے رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے منشی ذوالفقار حسین مدرسہ دہلی میں مدرس تھے اور انھوں نے غنیؔ تخلص اختیار کیا تھا۔ ظہورؔ مرحوم کو معما میں بڑا کمال تھا۔ اس فن میں ایک رسالہ جس میں معما حل کرنے کے قاعدے لکھے تھے، نظم میں مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کو مرزا قادر بخش گورگانی نے طبع کرایا تھا، مگر یہ نسخہ ایامِ غدر میں تلف ہوگیا۔ دیوان مطبوعہ میں بیشتر حصہ غدر کے بعد کی تصنیف ہے۔ قصیدے اور مرثیے بھی خوب کہتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بھی اچھا ملکہ تھا۔ ظرافت اور بذلہ سنجی میں مشہورِ زمانہ تھے۔ فکر بلند اور مضامین دلپسند ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو - (۱۰)

گدا کو اے ظہورؔ اک دم میں دیکھا یاں غنی ہوتے — غنی کو ایک لمحے میں یہاں ہوتے گدا دیکھا
تسکینِ دل ہو کیا ترے قول و قرار پر — کب تک جیا کرے کوئی اس انتظار پر

عارف

سید عارف علی عرف پیرجی صاحب ساکن ریاست الور مقیم حال کوٹہ، خطہ راجپوتانہ۔ آپ نے فارسی کی کتبِ درسیہ مولوی امیر علی صاحب نازنولی سے پڑھیں۔ جھالرا پاٹن کے ہائی سکول میں تعلیم پائی۔ وہیں محکمہ حساب میں اہل مد تھے۔ اب ریاست کوٹہ کے اکونٹنٹ آفس میں ملازم ہیں۔

۱۸۹۸ء میں جب ریاست جھالرا پاٹن کے دو مثلث علاقے کا کوٹہ کی ریاست سے الحاق ہوگیا تو اس کے ساتھ ملازمین کا جمِ غفیر بھی کوٹہ آگیا۔ اسی سلسلے میں آپ کو بھی منتقل ہونا پڑا۔ ابتدا میں منشی عبدالشکور خان صاحب برق اجمیری سے اصلاح لیتے رہے۔ کوٹہ میں مولوی نذیر حسین صاحب فتنہ سندیلوی سے رسم دوستانہ قائم ہوجانے پر اُن سے مشورۂ سخن جاری رکھا۔ ترتیب تذکرہ کے وقت آپ کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ کلام میں شگفتگی، طبیعت میں جدت اور آمد ہے۔ آپ

خوش نویس بھی ہیں۔ اشعار ذیل آپ کے کلام سے انتخاب کیے جاتے ہیں۔ (۲۰)

آتی ہے نظر خدا کی قدرت — جب اُن کا جمال دیکھتے ہیں
نہ طریقے کی محبت نہ قرینے کا ستم — نہ وفا آتی ہے تم کو نہ جفا آتی ہے
نہ نکلا کام کچھ آہ و فغاں سے — نہ بدلہ لے سکے ہم آسماں سے

عالی

سید محب اللہ الرفاعی الملقب نواب میر منور علی خان بہادر، آپ کے جدِ اعلیٰ محمد شاہ بادشاہِ دہلی کے عہد میں مچھلی بندر اور ارکاٹ (حصہ ملک دکن) کے صوبے دار تھے۔ اس خاندان کا سلسلہ سید احمد کبیر رفاعی تک پہنچتا ہے۔ اس قبیلے کی صاحب زادیاں شاہی خاندان اور والیانِ سلطنت سے بیاہی گئی ہیں۔ آپ کے والد نواب مظفر جنگ مرحوم حضرت آصف جاہ خامس والیِ دکن کے نواسے تھے، جو اپنے زمانے کے فاضل اجل، خطاط ہفت قلم اور فارسی کے عمدہ شاعر شمار کیے جاتے۔ وہ آخر دم تک صیغہ امورِ مذہبی کے ناظم رہے۔ درویش صفت، برگزیدہ صفات، نیک خُو تھے۔ دودمانِ آصف جاہی کی اکثر شاہ زادیاں آپ کے خاندان میں منسوب ہوئیں۔ انھوں نے نظام گورنمنٹ میں تین سال کنبٹ کونسل میں رہ کر اپنی انتظامی قابلیت کا نقش دلوں پر بٹھا دیا۔

حضرت عالی کو لڑکپن سے شاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں نشتر تخلص کرتے تھے۔ اپنے والد بزرگوار کی فہمائش سے اس تخلص کو چھوڑا اور عالی تخلص کیا۔ اس زمانے میں آپ کی عمر چودہ، پندرہ برس کی تھی۔ پہلے آپ سید محمد کاظم حسین شیفتہ کنتوری مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ پھر ان کے بعد کبھی اپنا کلام سید حیدر علی صاحب نظم طباطبائی لکھنوی حیدر یار جنگ کو دکھاتے رہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ اپنے دادا نواب فریدوں جنگ رفیع الدولہ حیدر الملک ثانی مرحوم کی نگرانی میں گزرا۔ پھر آپ کے والد بزرگوار نے تعلیم پر دلی توجہ فرمائی۔ آپ عربی اور فارسی میں کامل دست گاہ رکھتے ہیں۔ خوش نویسی باپ سے ورثے میں ملی ہے اور چار خطوط میں کمال حاصل ہے۔ آپ کو اصلاحِ زبان اردو اور محاوراتِ الفاظ کی تحقیقات سے خاص دلچسپی ہے۔ آپ نے ایک انجمن اربابِ اردو کی بنا ڈالی تھی، جس کے معتمد اعزازی رہے۔ رسالہ تحفہ

کے مدیرِ اعلیٰ تھے۔ آپ نے ایک ضخیم کلیات قدما کے طور پر مرتب کیا ہے، جس میں تقریباً دس ہزار بیت ہیں اور ایک دیوان بھی مرتب کیا ہے۔ جدید وضع کی شاعری میں خامہ فرسائی کی ہے۔ کلام میں شوکتِ الفاظ کے ساتھ شوخی اور متانت بھی ہے۔ نہایت پُرگو اور زود فکر ہیں۔ گو آپ دہلی اور لکھنؤ کی بے جا پیروی کو حلقۂ غلامی سمجھتے ہیں اور خذ ما صفا کے موید ہیں، لیکن کلام کا زیادہ حصہ قدمائے لکھنؤ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

حضرت عالیؔ سلیم الطبع، منکسر المزاج، کم سخن، درویش صورت و درویش سیرت، خوش اخلاق، گوشہ نشین، حنفی المذہب، صوفی مشرب ہیں۔ مولفِ تذکرہ کو جو کلام روانہ کیا گیا تھا، اس کا انتخاب درج ذیل ہے۔ (۴۸)

کہوں کیا محبت کی تکلیف عالیؔ — جو گزری ہے مجھ پر خدا جانتا ہے
مری آنکھوں سے جو دیکھو آئینہ — تم بھی رہ جاؤ کلیجہ تھام کے
حیف اے دل تو نہ سمجھا عمر بھر — عمر گزری تجھ کو سمجھاتے رہے

سیاستِ شرعیہ :- از مولانا رئیس احمد جعفری

حکومتِ الٰہیہ کے داعیوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن یہ بتانے کی زحمت اب تک کسی نے برداشت نہیں کی ہے کہ حکومتِ الٰہیہ اپنی وضع و ہیئت کے اعتبار سے کیا ہوگی؟ عوام، خواص اور سربراہِ مملکت کے مابین کیا روابط ہوں گے؟ حکومت کی آمدنی کے وسائل کیا ہوں گے؟ وہ خرچ کس طرح کیے جائیں گے؟ آزادیِ فرد کی حدود کیا ہوں گی؟ کن کن معاملات و مسائل میں عوام کی آزادی غیر مشروط ہوگی اور کہاں پابند کی جاسکے گی؟

مصر کے مشہور اہلِ علم اور صاحب قلم علامہ عبدالوہاب خلاف نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں انہی مسائل پر بڑی دقت نظر سے روشنی ڈالی ہے جس کا سلیس شگفتہ ترجمہ ادارہ نے شائع کیا ہے۔

صفحات ۲۶۷ قیمت

ملنے کا پتا :- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ يَضْمَنْ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مجھے اپنے جبڑوں اور پاؤں کے درمیان کے اعضا کو محفوظ رکھنے کی ضمانت دے، میں اسے جنت کی ضمانت دوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مبارک حدیث نہایت مختصر اور چند الفاظ پر مشتمل ہے، لیکن اس میں جو کچھ بیان فرمایا گیا ہے، اس کو انسانی زندگی میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں انسان کی دنیوی اور اُخروی زندگی کی نجات اور کامیابی کا ایک بنیادی نسخہ بالکل آسان لفظوں میں بتا دیا گیا ہے۔ اگر انسان اپنے عمل و حرکت اور گفتار و کردار میں اس کو پیش نگاہ رکھے تو اس کے لیے فوز و فلاح کے تمام راستے ہر وقت کھلے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی جسم کے وہ حصے جو اس کو گناہ کی راہ پر لگنے اور معصیت کی دلدل میں پھنسانے کا باعث بنتے ہیں، وہ اس کے پاؤں سے لے کر دماغ تک کے اعضا کو محیط ہیں۔ ان میں پیٹ، معدہ، دل، زبان اور اس کے متعلقات شامل ہیں۔ انسان دماغ سے سوچتا، دل میں ایک منصوبہ بناتا، زبان سے اس کا اظہار کرتا، پاؤں سے چلتا اور ہاتھوں کو کسی کام کی تکمیل کے لیے حرکت میں لاتا ہے۔ اگر ان اعضا کو امورِ خیر کے لیے استعمال کرتا ہے تو اس کا نتیجہ اُخروی فوز و فلاح یعنی حصولِ جنت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اگر خدانخواستہ ان اعضائے جسمانی کی مدد سے وہ شر اور برائی کی طرف حرکت کناں ہوتا ہے تو اس کے لیے آخرت کی کامیابی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ خود ہی اپنے لیے عذابِ الٰہی میں مبتلا ہونے کے اسباب، پیدا کر لیتا ہے۔

امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الرقاق میں بیان کیا ہے۔ "رقاق" جمع ہے رِقّت کی۔

رقت کے معنی ہیں، نرمی، رافت اور لینت کے۔۔۔! پھر اس کے لیے جو ذیلی عنوان قائم کیا ہے، وہ ہے "باب حفظ اللسان"۔۔۔ یعنی زبان کی تمام مکروہات سے حفاظت کرنا، سب برائیوں سے اس کو بچائے رکھنا، ہر قسم کی آلائشوں سے اس کو محفوظ رکھنا اور ایسا کوئی لفظ منہ سے نہ نکالنا جو غلط نتائج پیدا کرنے کا باعث بن سکتا ہو اور جس سے برائی کے دروازے تک پہنچنے کے امکانات ابھر سکتے ہوں۔

اللہ کی بے شمار نعمتوں میں سے زبان بہت بڑی نعمت ہے جو اس نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔ اس کو انتہائی غلط اور ناروا باتوں کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور بہ درجہ غایت صحیح اور عین موافقِ کتاب و سنت امور کے لیے بھی!

جو شخص زبان کو فحش کلامی اور برائی سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کو کسی خلافِ حقیقت یا منافیِ اخلاق بات کے لیے استعمال نہیں کرتا، وہ اس عالمِ آب و گِل کا بہترین شخص ہے۔ اسی لیے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کوئی غلط بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیے۔ اگر کوئی بات کرنا مقصود ہو تو اچھی بات کرنی چاہیے ورنہ خاموش رہنا چاہیے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ۔ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان)

یعنی جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ زبان سے اچھی بات نکالے، اگر اچھی بات نہیں سوجھتی تو چپ رہے۔

اعضائے انسانی میں زبان کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ اسی سے انسان اکرام و احترام کے بلند ترین مرتبے پر رسائی حاصل کرتا ہے اور اسی سے ذلت کی پستی میں جا گرتا ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ اس کو بہتر طریقے سے استعمال کیا گیا تو فتح و کامرانی کی مشکل سے مشکل منزلیں آسانی سے طے کر لیں اور غیر متوازن اور غلط انداز سے حرکت دی گئی تو ناکامی و نامرادی کے وہ داغ اٹھانے پڑے کہ پوری دنیا میں ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔

نیکی، صلح جوئی اور ایک دوسرے سے خیر خواہی کے جذبات بھی اسی سے پیدا ہوتے ہیں، اور

دشمنی، عداوت، بدخواہی اور باہمی نفرت و حقارت کی راہیں بھی اسی سے نکلتی ہیں۔

بہر حال پاؤں سے لے کر زبان تک کے تمام اعضا کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ پاؤں سے غلط راہوں کی طرف بڑھنا، ہاتھوں سے منافیِ اسلام حرکات کا ارتکاب کرنا۔ پیٹ میں ناجائز چیزوں کو ڈالنا، معدے کو اشیائے حرام سے بھرنا، زبان کو بُری باتوں کے لیے حرکت دینا اور دماغ سے خلافِ شرع امور کے لیے سوچ بچار کرنا، سب کتاب و سنت کی ضد ہے۔ اس سے انسان دنیا میں بھی ناکام اور بدنام ہوتا ہے اور آخرت میں بھی ذلت و رسوائی سے دوچار ہوگا۔

جو شخص ان اعضا کی صیانت کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واضح الفاظ میں اس کو جنت کی ضمانت دیتے ہیں۔ یعنی آنحضرت کے ارشاد کی روشنی میں حصولِ جنت کی اصل کنجی یہی اعضا ہیں۔ اگر یہ انسان کے قابو میں ہیں اور ان سے وہ کوئی ناجائز کام نہیں لیتا تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے لیے جنت کا دروازہ کھل گیا اور اُخروی کامیابی کی راہیں ہموار ہوگئیں، کیوں کہ آخرت میں انھی اعمال کی جزا یا سزا ملے گی جن کا وہ دنیا میں مرتکب ہوا ہے۔ اگر دنیوی زندگی معصیت کی آلودگیوں سے پاک رہی ہے تو آخرت میں اس کے نتائج بہر حال بہتر نکلیں گے۔ لیکن اگر دنیا کی زندگی میں برائیوں کے ارتکاب میں کٹی ہے تو پھر آخرت میں اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

معاشرتی اصلاح اور انفرادی و اجتماعی اخلاق کی رفعت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر اس کے مطابق عمل کی بنیادیں استوار کی جائیں تو دنیا سے تمام برائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

نقد و نظر

مولانا محمد علی (سوانح و حیات)

مرتب: ابو سلمان شاہ جہان پوری، پروفیسر ڈاکٹر انصار زاہد، پروفیسر فصیح الدین صدیقی۔

ملنے کا پتا: گورنمنٹ نیشنل کالج، شہید ملت روڈ، کراچی

صفحات ۲۸۷ - قیمت درج نہیں

گورنمنٹ کالج کا "مجلہ علم و آگہی" کالج کے پرنسپل جناب پروفیسر سید امتیاز حسین کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے۔ "مجلہ علم و آگہی" کے اب تک کئی شاندار خصوصی شمارے چھپ چکے ہیں، جن میں زیر نظر شمارہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ شمارہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی سوانح و خدمات پر مشتمل ہے اور اس موضوع کے وقیع مضامین کو محیط ہے۔ اس میں مولانا مرحوم کے خاندان، مولانا کی ملکی، ملی اور سیاسی خدمات، ان کی صحافت، ان کی شاعری اور دیگر امور کی پوری تفصیل موجود ہے۔ پھر ان کی قدیم تحریروں اور تحریک خلافت کی چند نایاب اور غیر مطبوعہ نظموں کے بارے میں بھی بہترین مواد درج ہے۔

مضمون نگار حضرات میں سے پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری، سید محمد ٹونکی جامعی، پروفیسر رحیم بخش شاہین، جناب احسن علی، منشی عبدالرحمٰن خاں، سلیم فاروقی، صوفی نذیر احمد کاشمیری، پروفیسر کوثر اقبال شیخ، پروفیسر محمد جہانگیر عالم، منظور احمد جاوید، ابو سلمان شاہ جہان پوری اور دیگر اصحاب قلم شامل ہیں۔ تمام مضامین پُر از معلومات ہیں۔

مجلہ علم و آگہی کے فاضل مرتبین نے یہ نمبر بڑی محنت سے مرتب کیا ہے اور اس میں مولانا محمد علی جوہر کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو بہترین اسلوب سے اجاگر کیا ہے۔

مجلہ علم و آگہی کراچی

یہ شمارہ دو خصوصی نمبروں پر مشتمل ہے۔ ایک نمبر کا تعلق رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے حالات

و سوانح سے ہے اور انہی مضامین کو محتوی ہے، جن کا اوپر کی سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرا شمارہ تحریکِ پاکستان (افکار و مسائل) سے متعلق ہے اور اس کے مرتب بھی پروفیسر ڈاکٹر انصار زاہد، پروفیسر فصیح الدین صدیقی اور ابو سلمان شاہ جہان پوری ہیں۔ یہ حصہ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ تحریکِ پاکستان اور اس کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اس میں ملک کے مشہور اہلِ قلم کے مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ پہلے تحریکِ پاکستان کے بارے میں ایک سوال نامہ مرتب کیا گیا ہے۔ پھر مختلف حضرات نے ہر سوال کے جواب دیے ہیں۔ ان حضرات میں ابو الاثر حفیظ جالندھری، ڈاکٹر عبد السلام خورشید، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، جسٹس قدیر الدین احمد، پروفیسر رحمت فرخ آبادی، پروفیسر رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر ایس معین الحق، پروفیسر محمد اسحاق الانصاری، پروفیسر محمد جہانگیر عالم، پروفیسر غلام حیدر چنہ شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین قابلِ مطالعہ ہیں جو ۱۴۴ صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔

علاوہ ازیں گوشۂ طلبا کے عنوان سے ۱۷ صفحات کا ایک اور سلسلہ بھی اس خصوصی شمارے میں شامل ہے۔ یہ حصہ جناب رفیع احمد باری اور شمس تسنیم نے مرتب کیا ہے۔ اس میں قرآن، سیرت، عبادات، شخصیات و سوانح، معاشرت و اقتصادیات، معلوماتِ عامہ، شعر و سخن، طنز و مزاح اور افسانہ وغیرہ کے بارے میں مواد فراہم کیا گیا ہے۔ اس طرح مجلہ علم و آگہی کا یہ خصوصی نمبر تقریباً ۱۰۵۰ صفحات میں پھیلا ہوا ہے اور ایک ہی جلد میں ہے ـــ ہمارے قارئین کو اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ قیمت اس کی بھی درج نہیں ہے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ تحریک پاکستان (افکار و مسائل) کے عنوان سے مجلہ علم و آگہی کا خصوصی نمبر الگ سے بھی شائع ہوا ہے جو ۱۴۴ صفحات کو محیط ہے

یہ خصوصی شمارے ایک قابلِ قدر دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، ہمارے معزز قارئین کو ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔

علمی رسائل کے مضامین

البلاغ، کراچی — مئی ۱۹۸۰

دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی
نیا طوفان اور اس کا مقابلہ	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
تہذیب مغرب کی تقلید قرآن و سنت کی روشنی میں	مولانا مفتی عبدالحکیم

البلاغ، بمبئی — جون ۱۹۸۰

مطالعات و تعلیقات	قاضی اطہر مبارک پوری
شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جون پوری (مسلسل)	مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی
زائرین حرمین (مسلسل)	قاضی اطہر مبارک پوری

ترجمان الحدیث، لاہور — جون ۱۹۸۰

حضرت مولانا شمس الحق عظیم آبادی (مسلسل)	مولانا ارشاد الحق اثری
قمری تقویم اور ہجری تقویم	مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

ترجمان القرآن، لاہور — مئی ۱۹۸۰

محدث قرطبہ بقی بن مخلدؒ (مسلسل)	جناب طیب شاہین
حضرت امام احمد بن حنبل	جناب عبدالرشید عراقی
مغربی تہذیب کا بحران	جناب ریاض الحسن نوری

ترجمان القرآن، لاہور — جون ۱۹۸۰ء

حضرت امام شافعی	عبدالرشید عراقی
محدث قرطبہ بقی بن مخلدؒ (مسلسل)	طیب شاہین

الحق، اکوڑہ خٹک — مئی ۱۹۰۰

علامہ رحمت اللہ کیرانوی	مولانا محمد [illegible]

عرفات، لاہور۔ مئی ۱۹۸۰

اسلامی معاشرے میں مزدور کا مقام	مولانا مفتی محمد حسین نعیمی
قرآن پاک کا معجزانہ انقلاب	میاں محمد عارف اشرفی
اسلام اور سائنس	محفوظ احمد ایم اے

الفرقان، لکھنؤ۔ جون ۱۹۸۰

مولانا تھانوی کی محفل ارشاد	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

فکر و نظر، اسلام آباد۔ جون ۱۹۸۰

احمد رضا خاں بریلوی (مسلسل)	ڈاکٹر محمد مسعود احمد
اقبال اور عبادات و شعائر اسلامی	ڈاکٹر محمد ریاض
خالد بن یزید ــ پہلا مسلمان سائنس دان	ملک محمد فیروز فاروقی
ادارہ تحقیقات اسلامی اور علامہ عبدالعزیز میمن	محمد محمود میمن
کتب خانے	عظمت علی صدیقی

الولی، حیدر آباد۔ فروری ۱۹۸۰

فارسی شاعری کے ارتقا میں عربی شاعری کا ہاتھ (مسلسل)	ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ
کتب خانہ عبداللہ بھائی	ڈاکٹر محمد ایوب قادری
سوانح شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	پروفیسر ثناء اللہ مجاہد
ریشمی خطوط (مسلسل)	ابوسلمان شاہ جہان پوری

الولی، حیدر آباد۔ مارچ ۱۹۸۰

ریشمی خطوط (مسلسل)	ابوسلمان شاہ جہان پوری
حالی کی تصانیف کا جائزہ	سعید حسن
فرنگی محل کے تین مایہ ناز فرزند اور ان کی مطبوعات و مخطوطات	ڈاکٹر جمیل احمد

اگست ۱۹۹۰

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقام اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون :- ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۳ | اگست ۱۹۸۰ رمضان المبارک ۱۴۰۰ | شمارہ ۸

ترتیب

تاثرات

اگست ۱۹۸۰ء میں پاکستان کے قیام پر ۳۳ تینتیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ عرصہ قوموں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس عرصے میں بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے ہیں اور بوڑھوں نے سفرِ آخرت اختیار کر لیا ہے۔

پاکستان کا قیام اس برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کی متحدہ آواز کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کو ایک ایسے خطۂ ارض کی ضرورت تھی جس میں وہ کسی رکاوٹ کے بغیر نہایت آزادی کے ساتھ اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کو پروان چڑھا سکیں اور اسلام نے ان پر جو فرائض عاید کیے ہیں، ان پر عمل کی بنیادیں قائم کر سکیں۔ یہاں کے در و دیوار اسلام کی روشنی سے منور ہوں اور اس ملک کے باشندوں کے قلب و نظر میں دینِ محمدی کا سکّہ جاری ہو۔

یہ بڑا ہی مبارک عزم اور انتہائی لائقِ تعریف مقصد تھا، لیکن افسوس ہے، حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا اور انقلاب و تغیر کی ایسی لہریں اٹھیں کہ اس بنیادی مقصد پر عمل نہ ہو سکا۔

خدا کا شکر ہے کہ اب ایسے حالات کروٹ لے رہے ہیں، جن سے وہ منزل قریب نظر آنے لگی ہے جو قیامِ پاکستان کے مطالبے کے وقت لوگوں کے سامنے تھی۔ ہر پاکستانی کی یہ خواہش اور دعا ہے کہ ان کے ملک میں وہی نظام جاری ہو جو ہر اعتبار سے اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ اور دینی اقدار سے ہم رنگ ہے۔

اگست کا مہینہ باشندگانِ پاکستان کے دل میں نئی امنگیں پیدا کرتا ہے، دعا ہے ہم اس ملک کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے اہل ہو سکیں اور اسلامی اقدار کو اپنی زندگی میں پوری طرح سمو سکیں۔

کریم بخش خالد
ترجمہ : جناب رحمت فرخ آبادی ایم۔اے

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سندھ کے ادبی سرمایہ کا جائزہ

سندھ میں اسلامی حکومت کی ابتدا پہلی صدی ہجری کے آخر میں ہوئی اور اس وقت سے اب تک سندھ تعلیم اور علمی تحقیق کا کام جاری ہے۔ دیبل، منصورہ، سیوہن اور بکھر میں اعلیٰ تعلیم کے بے مثال ادارے موجود تھے جہاں سندھی علما اور اساتذہ نے تاریخ و سوانح، تفسیر و حدیث اور فقہ و ادب کے شعبوں میں تحقیق اور تصنیف کا اعلیٰ معیار قائم کیا تھا۔ سطورِ ذیل میں ہم تمام شعبوں سے قطع نظر کرکے سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے متعلق سندھ کے ادبی سرمایے کا ایک جائزہ پیش کرتے ہیں:

۱۔ مکاتیب النبی :۔ سندھ کے قدیم اور اولین اسلامی علوم کے علما میں سے کچھ لوگ سندھ سے نکل کر دیگر اسلامی علاقوں میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، جہاں انھیں اپنے علم و فضل کی بدولت بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ قدیم عربی کتب میں ایسے سندھی علما اور ان کی تصانیف کے بارے میں کافی تفصیلات ملتی ہیں، مثلاً ابوجعفر دیبلی اور ان کی کتاب "مکاتیب النبی" اور امام سعود بن شبیہ بن حسن سندھی کی کتاب "مقدمہ کتاب التعلیم" جو انھوں نے حضرت امام ابوحنیفہ کے نظریۂ تعلیم کی وضاحت میں لکھی تھی۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت ہے کہ سندھی علما اور اساتذہ نے قرآن کریم اور سیرۃ النبی کے سلسلے میں کافی کتب تصنیف کیں۔

۲۔ قرآن کریم کے تراجم :۔ تاریخی معلومات کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے قرآن کریم کا علاقائی زبان میں ترجمہ سندھ میں ہباری خاندان کے دور میں ہوا۔

اسی طرح قرآن کریم کے فارسی ترجمے کی سعادت سب سے پہلے حضرت مخدوم نوح ہالائی اور پھر سندھ کے جہانیاں خاندان کے ایک بزرگ ابوالفتح نظام الدین محمد مقبول عالم جلالی کو حاصل ہوئی جو بعد میں سندھ سے ہجرت کرکے احمد آباد (گجرات) چلے گئے تھے۔ یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ سیرۃ النبی کے سلسلے میں ابوجعفر دیبلی کی کتاب "مکاتیب النبی" سیرت پر اولین تصانیف میں شمار کی جاتی ہے۔

۳۔ سندھ کا علمی عروج :۔ جب سندھ کو ایک آزاد فضا میسر آئی تو یہاں علمی ترقی کو کافی عروج

حاصل ہوا۔ سندھ کی زرخیزی، مہمان نوازی اور علم دوستی کی وجہ سے ہر دور میں ایران اور دیگر ملکوں سے علما اور شعرا سندھ میں آکر آباد ہوئے اور انھوں نے اسے اپنا وطن مالوف قرار دیا۔

سندھ پر مغلیہ خاندان کی حکومت کے دور میں، احادیثِ نبویؐ کے سلسلے میں صرف تین کتابیں یہاں فارسی زبان میں لکھی گئی تھیں، ان کے نام یہ ہیں،

(الف) شرحِ مشکوٰۃ از مخدوم عبدالعزیز، ساکن کاہان ضلع دادو

(ب) حواشی متین از قاضی محمود، ساکن ٹھٹھہ

(ج) شرح اربعین از مخدوم رکن الدین ساکن ٹھٹھہ

۴۔ قدیم ادبی سرمایہ:۔ سیرۃ النبی کے سلسلے میں قدیم ادیبوں میں حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی کی علمی و ادبی کاوشیں لائق صد ستائش ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ عالم، فقیہ اور مبلغ تھے۔ مخدوم صاحب کی تصانیف پرانے طرزِ تحریر کا نقش ہیں، اس کی بنیادی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس دور میں وعظ کی صورت میں نظم کو سامعین عام طور پر پسند کرتے تھے۔ مخدوم صاحب نے اپنے دورِ شباب ہی میں ذوق و شوق اور دلجمعی کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام کی ابتدا کر دی تھی۔ اسلام کے ہمہ گیر اصولوں کو عام کرنے اور اختلاف رائے رکھنے والے علما اور صوفیا کو صراطِ مستقیم دکھانے کے لیے انھوں نے عربی، فارسی اور سندھی میں تقریباً ایک سو پچاس کتابیں تصنیف کیں، ان میں سیرتِ پاک سے متعلق ان کی مندرجہ ذیل کتابیں آج بھی عوام الناس میں بے حد مقبول ہیں:

(الف) بذل القوت فی حوادث سنی النبوت:۔ یہ کتاب برصغیر میں سیرۃ النبیؐ کے سلسلے میں غالباً سب سے پہلی تصنیف ہے جس میں آنحضرتؐ کی حیاتِ مبارکہ کے واقعات سال بہ سال ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور اسے سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ اس کا سندھی ترجمہ ماہنامہ "الرحیم" حیدرآباد میں اور اردو ترجمہ ماہنامہ "البلاغ" کراچی میں شائع ہو چکا ہے۔

(ب) حدیقۃ الصفا فی اسماء المصطفیٰ:۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ سو اکیاسی اسمائے مبارک بیان کیے گئے ہیں۔

(ج) وسیلۃ الفقیر لشرح اسماء الرسول البشیر:۔ یہ کتاب فارسی میں ہے اور حدیقۃ الصفا کی شرح ہے۔

(د) خمسۃ العقائد : یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔

(ہ) وسیلۃ الغریب الیٰ جناب الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم : یہ کتاب فارسی میں ہے اور اس میں اہل بیت کی تاریخ اور فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا غلام مصطفیٰ صاحب قاسمی ریسرچ پروفیسر جامعہ سندھ نے اس کتاب کا سندھی اور اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اردو ترجمہ ۱۹۷۲ میں شائع ہو چکا ہے۔

(و) ذریعۃ الوصول الیٰ جناب الرسول : سیرۃ النبی پر یہ کتاب بھی عربی میں ہے۔

(ز) قول العاشقین : یہ کتاب مخدوم صاحب نے ۱۱۲۷ھ میں لکھی تھی جس میں مدح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن وسنت کی روشنی میں جائز قرار دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں اہلِ علم کی ایک جماعت ٹھٹھے میں مخدوم صاحب کے پاس آئی اور ان سے کہا کہ کچھ علما میلاد و مدح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منع کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا روزگار بند ہونے کا خطرہ ہے، ان علما کا خیال تھا کہ حمد و ثنا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ بشر ہیں، اس لیے ان کی مدح نہ کرنا چاہیے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

۵۔ مجموعۂ مولود : سندھی ادب کے ابتدائی سرمائے میں مولود کی صنف سخن بہت مقبول اور مشہور تھی۔ مولود کے معنی ہیں وہ نظم جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے سلسلے میں خوشی اور مسرت کا اظہار ہو۔

پرانا ہالا کے مخدوم عبدالرؤف بھٹی (۱۶۸۲ تا ۱۷۵۲ء) کے کہے ہوئے مولود سندھ میں بہت مشہور اور مقبول ہیں اور ہر جگہ ان کو ترنم سے پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی "مدحوں" (در مدح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) بھی بہت مشہور ہیں۔ ان مدحوں میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے بارے میں خوشی اور مسرت کا اظہار ہے لیکن زیادہ تر آپ کی محبت اور زیارت کے لیے سچا اور کامل شکوہ ظاہر کیا گیا ہے۔ بعض مولودوں میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں مثلاً آپؐ کی شادی اور معجزات وغیرہ۔ مدحوں میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ اور روحانی نصیحتوں کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ حج کو جانے کے بارے میں جو واقعہ بطور مدح بیان کیا گیا، اس میں اسی راستے کا بیان ہے جو اس زمانے میں حجاج استعمال کرتے تھے۔

۶۔ کنز العبرت : اسی زمانے کے ایک اور بزرگ مخدوم عبداللہ واعظ المعروف بہ میاں

موریو تھے جو ۱۱۰۵ھ بمطابق ۱۶۹۳ء میں ٹھٹھے میں پیدا ہوئے۔ یہ مشہور سندھی عالم میاں ابوالحسن کے بھانجے تھے۔ ان کی کتاب کنز العبرت ۱۱۷۵ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب کی دوسری جلد میں دیگر اہم باتوں کے ساتھ حج کی حقیقت، خانہ کعبہ کی تعمیر، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور وصال، ازواجِ مطہرات کے بارے میں تفصیل، اصحاب کرام اور رسولِ اکرمؐ کے بچوں کا ذکر ہے۔ اسی کتاب کی جلد اوّل میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ معراج کی مکمل تفصیل، مشرکوں سے لڑائیاں اور آپؐ کی شجاعت کے بارے میں مفصل بیان ہے۔ کنز العبرت درحقیقت سیرۃ النبیؐ کے بارے میں ایک دائرۃ المعارف ہے۔ یہ کتاب پہلے قدیم سندھی طرزِ تحریر میں اور پھر بعد میں جدید سندھی زبان میں شائع ہوئی۔

۷۔ **قمر المنیر**:۔ مخدوم عبداللہ کی دوسری کتاب قمر المنیر ہے۔ یہ عربی کتاب شرح سراج المنیر کا منظوم سندھی ترجمہ ہے جو بمبئی سے ۱۴ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ بمطابق ۱۳ مئی ۱۸۵۴ء کو شائع ہوا۔ چونکہ مخدوم عبداللہ عاشقِ رسولؐ کی حیثیت سے یہ کتاب لکھ رہے تھے، اس وجہ سے اس میں تشبیہوں، استعاروں اور تمثیلوں کا جا بجا استعمال کیا گیا ہے۔ طبیعت کی روانی اور فصاحت و بلاغت کے پیشِ نظر اس قدیم دور میں بھی دیگر عالموں اور شاعروں کی بہ نسبت مخدوم عبداللہ زیادہ پختہ اور تجربہ کار شاعر نظر آتے ہیں۔

۸۔ **مجموعو**:۔ مخدوم عبداللہ کی ایک اور کتاب کا نام "مجموعو" (مجموعہ) ہے۔ یہ کتاب بھی لیتھو پر چھپی تھی اور اس میں پانچ مختصر کتابچے شامل ہیں، جن میں ایک کا نام غزوات ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی جنگوں کے بارے میں ہے۔ دوسرے کا نام "شجاعت سید انام" ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی طاقت اور پہلوانی کا تذکرہ ہے۔

۱۰۔ **سیر بستان**:۔ یہ کتاب سندھی نظم میں مولانا محمد حسین نور رنگ زادہ نے فارسی کتاب قصص الانبیا سے ترجمہ کی ہے۔ یہ ترجمہ ۱۱۷۷ھ بمطابق ۱۷۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تک قرآن کریم اور احادیثِ نبویؐ سے معلومات اخذ کر کے لکھی ہیں اور ان سے اخلاقی نصیحتیں بیان کی ہیں۔ یہ کتاب پور بندر کاٹھیاواڑ سے شائع ہوئی تھی۔

۱۰۔ **شمائل نبویؐ**:۔ یہ کتاب مولوی عبدالسلام مرحوم نے عربی سے سندھی میں ترجمہ کی تھی اور ۱۱۹۷ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ کتاب بڑے سائز کے ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی سیرت وصورت کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے کتاب سندھی نثر میں ہے لیکن اس زمانے کے دستور کے مطابق عبارت مقفع ومسجع ہے اور ہر سطر کے آخر میں "آ" کا قافیہ ہے جس کی وجہ سے عبارت پر نظم کا گمان ہوتا ہے۔

۱۱- مدح :- قدیم سندھی ادب میں "مولود" کی طرح "مدح" بھی ایک مشہور اور لوک صنف ادب ہے۔ سندھ کے ایک حکمران میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے حیدرآباد سندھ کے قلعے میں دوران قید ایک مدح لکھی، جو اپنی موزونیت، روانی اور رقت آمیز مضامین کی وجہ سے آج بھی سندھ میں عام طور پر مشہور ہے۔ یہ مدح یک بیتی ترجیع بند ہے جس میں ہر بیت کے بعد دوبارہ وہی ایک بند دہرایا جاتا ہے۔

۱۲- مشکوٰۃ المصابیح :- بارھویں صدی ہجری کے آواخر اور تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں ایک بالغ نظر محقق اور روشن خیال عالم، مٹیاری کے مخدوم محمد عثمان بن عبداللہ تھے، انھوں نے سندھ میں علم حدیث کی بڑی خدمت کی۔ مخدوم محمد عثمان نے مشکوٰۃ شریف سے احادیث کا انتخاب کر کے ان کے ۲۹۶ ابواب پر مشتمل ایک شرح لکھی جس کا نام انھوں نے "بیان معانی احادیث یا منتخبہ از مشکوٰۃ شریف" رکھا۔ یہ کتاب بروز ہفتہ ۲۹ ذوالحج ۱۲۰۰ھ کو مکمل ہوئی۔

۱۳- صحیح بخاری :- مخدوم محمد عثمان نے بروز پیر، ۲۳ شوال ۱۲۱۷ھ تک نصف سے زائد صحیح بخاری لکھی تھی، جس کا مسودہ آج بھی موجود ہے، اس پر مخدوم محمد اکرم نصرپوری کی شرح بھی نقل ہے۔

۱۴- شمائل ترمذی :- اسی طرح مخدوم محمد عثمان نے شمائل ترمذی کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

۱۵- زبدۃ المو الید :- تیرھویں صدی ہجری میں ایک اور عربی تصنیف کا بھی پتا چلتا ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارک اور اسوۂ حسنہ کا ذکر خیر ہے۔ اس کتاب کا نام "زبدۃ المو الید" ہے اور اسے دائرہ شریف (اوڈیرو لعل) کے سید علی محمد شاہ (۱۲۲۶ھ تا ۱۲۸۷ھ) نے ۹ ربیع الاوّل ۱۲۸۱ھ کو مکمل کیا تھا۔

۱۶- سیرۃ رسول اکرمؐ :- یہ کتاب چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں مولوی محمد عثمان کوروائی نے تصنیف کی اور کوٹری سے لیتھو میں شائع ہوئی۔

۱۷- حکایت الصالحین :- یہ کتاب مولوی ولی محمد نے عربی سے سندھی میں ترجمہ کر کے لکھی۔ اس کتاب کے بیس ابواب اور ۵۱۸ صفحات ہیں۔ اس کتاب میں اخلاقی اور روحانی تعلیمات سے متعلق ابواب

بھی ہیں جو آپؐ سے پہلے کے انبیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اصحاب کرام کی تحریر کردہ اور روایت کردہ حکایات پر مشتمل ہیں ۔ زمانۂ ماقبل میں علما اس کتاب کو بطور وعظ، عوامی اجتماعات میں پڑھتے تھے اور مکاتب و مدارس میں بھی بطور درس داخل نصاب تھی۔

۱۸۔ حیات النبیؐ :- سیرۃ النبی پر سندھی نثر میں گراں مایہ تصانیف ہیں، جن میں حیات النبی ساتویں مرتبہ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھی ۔ یہ کتاب مولوی حکیم فتح محمد سیوہانی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے اور یہ پہلی مرتبہ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی تھی ۔ زبان و بیان، اسلوب کی ندرت، مختلف موضوعات پر پیش کش، مدلل مضمون اور جواب مضمون کی وجہ سے یہ کتاب بہت اہمیت رکھتی ہے۔ حکیم فتح محمد سیوہانی مرحوم بذات خود علوم جدیدہ سے واقف، سیاسی کارکن اور مدرس تھے، جس کی وجہ سے اس کتاب کا انداز بیان دل نشین اور اثر انگیز ہے۔

حیات النبی کے بعد حکیم فتح محمد سیوہانی مرحوم نے ایک دوسری کتاب "اخلاق النبی" تحریر کی، جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ اور عادات و اطوار بیان کرکے آپ نے امتِ مسلمہ کو اپنی روزمرہ زندگی میں انھیں اپنانے اور ان پر عمل کرنے کی نصیحت کی ۔

اس سلسلے کی تیسری اہم کتاب "سیرۃ النبی" ہے جس کی صرف دو جلدیں شائع ہوئی ہیں اور پھر اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ یہ کتاب علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی مرحوم کی سیرۃ النبی کے انداز پر مولانا فضل احمد غزنوی نے تالیف کی ہے اور اسے نہایت ہی تفصیل سے قلم بند کیا ہے ۔

قیامِ پاکستان سے پہلے حیدرآباد (سندھ) کی سندھ مسلم ادبی سوسائٹی نے جو مقصدی کتب کی نشر و اشاعت کا ایک اہم سلسلہ جاری کیا تھا، اس میں سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کئی اچھی کتابیں شائع کی گئیں جن میں محمد بخش واصف کی کتاب ہمارے رسول (اسانجو پیارو رسول) ۱۹۳۵ء میں، دُرِّ یتیم ۱۹۳۸ء میں، نبیوں کے قصے (نبین جا قصا) ۱۹۳۹ء میں اور چالیس حدیثیں (چالیھ حدیثوں) ۱۹۴۰ء میں اور رسول پاکؐ ۱۹۴۰ء میں قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۔ افسانوی انداز :- اسی دور میں سندھ کے مشہور ادیب محترم محمد عثمان ڈیپلائی نے کئی کتب شائع کیں، جن میں نور توحید دو حصہ، جلوۂ اسلام، عروجِ اسلام اور شوکتِ اسلام بہت مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا محمد عثمان ڈیپلائی نے حافظ عبداللہ بسمل کی مثنوی محمدی کے ساتھ مولانا دین محمد وفائی

مرحوم کی تصنیف تجرید بخاری کا خلاصہ بھی شائع کیا۔

۲۰- ہندوؤں کی عقیدت مندی :- سندھ کے ہندوؤں کی اکثریت بُت پرست نہیں ہے، وہ صوفیانہ عقیدہ رکھتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ خیر اور سچائی جہاں سے بھی ملے، اسے قبول کر لیا جائے۔ وہ سندھ کے تقریباً تمام صوفی بزرگوں کی عزت کرتے ہیں اور اسی وجہ سے انھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی عقیدت ہے اور ان کا احترام کرتے ہیں۔

سندھی نثر میں ہندوؤں کی دو مختصر لیکن بہترین کتابیں موجود ہیں جو قیام پاکستان سے قبل شائع ہوئی تھیں۔ ان میں پہلی کتاب "محمد۔ رسول اللہ" ہے جو محترم لعل چند امرڈنو مل جگتیانی نے ۱۹۱۱ء میں شائع کرائی۔ جگتیانی تھیاسافی خیالات کے حامل تھے اور انھوں نے اسی نقطۂ نظر سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک لکھی ہے۔

دوسری کتاب امر لعل وسن مل ہنگورانی وکیل نے " میر محمد عربی" کے نام سے ۱۹۴۷ء میں شائع کرائی۔ اس کتاب کا دیباچہ مرحوم مولانا دین محمد وفائی نے لکھا تھا۔ یہ کتاب ایک طرح سے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رسالہ "شاہ جو رسالو" کے ان اشعار کی شرح ہے جو انھوں نے در مدح رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کہے تھے۔

۲۱- قصیدہ بردہ :- یہ علامہ بوصیری کا مشہور نعتیہ قصیدہ ہے جس میں رسول اکرم صلی علیہ وسلم کی کی سیرتِ مبارکہ کا کافی تفصیل سے تذکرہ ہے۔ اس قصیدے کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے تراجم اور شرحیں دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں۔

سندھ میں سب سے پہلے مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی مرحوم نے اس قصیدے کی مبسوط شرح لکھی۔ پھر مخدوم محمد شفیع نے اس کا سندھی میں منظوم ترجمہ کیا۔ اس کے بعد سندھی نعت کے عظیم ماہر مولوی علی محمد میری نے سندھی نظم و نثر میں اس کا ترجمہ کیا جو مولوی عبداللہ اثر نے ۱۹۴۷ء میں شائع کرایا۔

ڈوکری ضلع لاڑکانہ کے فقیر علی محمد قادری نے بھی اس قصیدے کا سندھی میں ترجمہ کیا تھا جو ان کے لڑکے میر محمد نے "بحر الاسرار قادری" کے نام سے شائع کیا۔

۲۲- قصیدہ بانت سعاد :- یہ عربی کا ایک اور مشہور قصیدہ ہے جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بہت پسند کیا تھا، اور اس کے مصنف شاعر کعب بن زہیر کو اپنی کملی اوڑھنے کو دی۔ اس قصیدے

کا منظوم سندھی ترجمہ مولوی عبداللہ اثر نے کیا ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

۲۳۔ عشقِ حبیبؐ :۔ رومڑی کے قاضی علی اکبر درازی نے حضرت سچل سرمستؒ کے کلام سے محبتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق اشعار کا انتخاب کر کے اسے اپنے حج و زیارت کے سفرنامے میں درج کیا۔ عشق حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں یہ کتاب ایک بہترین پیش کش ہے۔

۲۴۔ کارنی :۔ مرحوم سرور سندھی غزل کے شاعر تھے لیکن اس کتاب میں آپ نے کارنی کی حیثیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے فلسفے کے مطابق پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ۶۰-۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

۲۵۔ مدنی محبوب :۔ یہ کتاب سندھی شعرا کے نعتیہ کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے اور اُسے ۱۹۶۲ء میں مرحوم سرور نے مکتبہ فروغِ ادب کراچی سے شائع کرایا۔

۲۶۔ سندھی لوک ادب :۔ سندھی لوک ادب سکیم کے مطابق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی زیرِ نگرانی مولود، معجزہ، مناقبا، اور مدحوں اور مناجاتوں کے نام سے چار ضخیم جلدیں سندھی ادبی بورڈ نے شائع کیں۔

۲۷۔ تجرید بخاری :۔ سندھ میں علم حدیث کی ترویج و ترقی میں سب سے زیادہ خدمت مولانا دین محمد وفائی نے کی۔ مولانا وفائی مرحوم نے الہام باری کا سندھی میں ترجمہ کیا، لیکن برصغیر میں سب سے پہلے آپ ہی نے تجرید بخاری کا سندھی میں ترجمہ کیا۔ اردو اور برصغیر کی دوسری زبانوں میں تجرید بخاری کا ترجمہ بہت بعد میں ہوا۔ یہ کتاب سکھر کے حکیم عبدالحق نے لیتھو پر طبع کرا کے شائع کی۔

۲۸۔ عشق رسول :۔ اس موضوع پر بیسویں صدی میں کافی کتب شائع ہوئی ہیں جو مختصر اور درسی نوعیت کی بھی ہیں۔ ان میں سے کئی اہم سندھی کتابوں کے نام ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۔ کامل رہنما :۔ مخدوم محمد صالح بھٹی

۲۔ ہمارے نبیؐ (اسانجو نبی) :۔ مولوی خیر محمد نظامانی

۳۔ رسول پاکؐ :۔ غلام محمد شاہوانی

۴۔ رسول پاکؐ :۔ مولانا عبدالواحد سندھی

۵۔ حالات نبویؐ :۔ علی خان ابڑو۔ ایم۔ اے

۶۔ سیرت پاکؐ :۔ شمس العلما میرزا قلیچ بیگ
۷۔ معجزاتِ محمدیؐ :۔ سید حسین علی شاہ ساکن میرپور بتھورو
۸۔ سیرۃ النبیؐ :۔ از مولوی عبدالرحیم مگسی سابق استاد فقہ، سندھ مدرستہ الاسلام کراچی
۹۔ معراج محمدیؐ :۔ سید حسین علی شاہ ساکن میرپور بتھورو
۱۰۔ دو جہانوں کا سردار :۔ (ٻنهي جهانن جو سردار) از مخدوم امیر احمد مرحوم
۱۱۔ رہبر اعظم :۔ از محمد اسحاق ہالائی
۱۲۔ سیرۃ خیر البشر :۔ مولوی محمد علی لاہوری
۱۳۔ ہمارے پیارے نبی (اسانجو پیارو نبی) قاضی عبدالرزاق مرحوم
۱۴۔ اسمائے نبی :۔ غلام محمد پنھور
۱۵۔ شمائل ترمذی (صفات النبی) از مولانا محمد عثمان مہاجر مکی
۱۶۔ شمائل نبوی ۔ از مولوی عبدالکریم بصیرائی
۱۷۔ بنات الرسول ۔ از حافظ محمد احسن چنہ
۱۸۔ حقیقت معراج ۔ از مخدوم امیر احمد مرحوم
۱۹۔ اخلاق النبیؐ ۔ از مولوی دین محمد ادیب
۲۰۔ شاہ عرب ۔ از الحاج محمد یعقوب ابڑو
۲۱۔ رتبۂ رسول ۔ از مولوی حکیم عبدالکریم چشتی مرحوم
۲۲۔ محمد مصطفیٰ ۔ از رشید احمد لاشاری مرحوم
۲۳۔ سرکار مدینہ ۔ از پروفیسر میک محمد عنایت اللہ

سندھ میں سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں عربی، فارسی اور سندھی میں جو ادبی ذخیرہ ہے، وہ اپنی نوعیت اور افادیت کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے، افسوس ہے کہ آج تک اس سلسلے میں کتب و مقالات کی کوئی جامع فہرست شائع نہیں کی گئی اور نہ کسی ادارے نے اس طرف توجہ دی کہ وہ انگریزی یا کسی دوسری زبان میں یہ کام کرے تاکہ سندھی ادب دیگر علاقوں اور زبانوں میں روشناس ہو سکے۔

محمد شہاب الدین ندوی

علمِ کیمیا اور طبیعیات کی اہمیت

قرآن اور خلافتِ ارض کے نقطۂ نظر سے

قرآنِ مجید کا تاریخی کارنامہ

یورپ کو سائنس کے میدان میں ترقی کے بامِ عروج تک پہنچنے کے لیے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی قربانی دینی پڑی، جو کلیسا (CHURCH) اور سائنس کی کش مکش کا طویل اور خونی باب ہے، مگر اسلام کی تاریخ اس قسم کی کسی آزمائش اور عبرت ناک داستان سے آشنا نہیں ہے، کیونکہ اسلام، عیسائیت کی طرح تجربہ و مشاہدہ کا حریف نہیں بلکہ علم و تجربہ کو پروان چڑھانے والا اور مشاہدے کی ہمت افزائی کرنے والا تھا۔

یہ حقیقت اب کوئی راز کی بات نہیں رہی کہ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (RENAISSANCE) کی ساری ترقیاں قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے تجربات و مشاہدات اور بلند پایہ تحقیقات کا نتیجہ تھیں اور مسلمانوں کی تمام ترقیاں قرآنِ حکیم کی انقلابی دعوتِ فکر کا منطقی نتیجہ تھیں، جو یونانی طرزِ فکر سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ لہٰذا مسلمان فکرِ یونان سے سیراب ہونے کے باوجود ارسطو اور دیگر حکما کے مقلدِ جامد نہیں تھے، بلکہ انھوں نے قرآنی فکر اور اس کے منشا کے مطابق بہت جلد تجربات و مشاہدات شروع کر کے جدید سائنس کی داغ بیل ڈالی اور ایک بالکل نئے عہد کا آغاز کیا۔

قرآنِ حکیم دنیا کا وہ پہلا صحیفہ ہے جو غلط نظریات و مفروضات اور تقلید پرستی کی مذمت کرتے ہوئے نظامِ کائنات سے استدلال کرتا ہے اور زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، ابر، ہوا، پہاڑ، مختلف حیوانات اور نباتات وغیرہ تمام مظاہرِ فطرت کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کرنے کی مختلف اسالیب میں تاکید کرتا ہے مثلاً :

اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (الانعام: ۹۹)

غور سے دیکھو اس کے پھل کو جب وہ پھلنے اور پکنے لگے۔ یقیناً اس باب میں ایمان لانے والوں کے لیے دلائل و نشانات موجود ہیں۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ○ (الحجر، ۱۶)

اور ہم نے آسمان میں بہت سے برج (کہکشائیں) بنا دیے ہیں اور بغور دیکھنے والوں کے لیے انھیں مزین کر دیا ہے۔

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ○ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ○ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ○ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ○ (الغاشیہ، ۱۷ - ۲۰)

* کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اونٹوں کی تخلیق کس طرح کی گئی ہے؟ اور آسمان کیسا اونچا اٹھایا گیا ہے؟ اور پہاڑ کس طرح (مضبوطی سے) نصب کیے گئے ہیں؟ اور زمین کس طرح (اس کی پوری گولائی میں) بچھائی گئی ہے؟

قُلِ انظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ط (یونس، ۱۰۱)

کہہ دو کہ تم غور سے دیکھو کہ زمین اور آسمانوں میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ (العنکبوت، ۲۰)

کہہ دو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ تخلیق کی ابتدا کس طرح ہوئی؟

ان تمام آیات میں سب سے زیادہ قابلِ غور اور مرکزی لفظ "نظر" ہے، جس کے مشتقات "انظروا" "الناظرین" اور "أفلا ینظرون" ہیں۔ "نظر" کے معنی محض دیکھنے کے نہیں ہیں، بلکہ اہلِ لغت اور ائمہ تفسیر کی تصریح کے مطابق غور و فکر کرنے اور "نظرِ غائر" ڈالنے کے ہیں۔

نظرہ: تاملہ بعینہ۔ اس شخص نے (فلاں چیز پر) نظر ڈالی۔ یعنی اپنی آنکھ کے ذریعے اس چیز کا جائزہ لیا[۱]

الجوہری: النظر تأمل الشئ بالعین۔ جوہری نے کہا ہے کہ نظر آنکھ کے ذریعے غور کرنے یا جائزہ لینے کو کہتے ہیں[۲]

امام راغب لکھتے ہیں: نظر کے اصل معنی کسی چیز کو دیکھنے یا اُس (کی اصلیت) کا ادراک کرنے کے لیے آنکھ یا قوتِ فکر کو بار بار حرکت دینے (تقلیب) کا نام ہے۔ اور کبھی "نظر" سے مراد غور و فکر اور

---

[۱] القاموس المحیط، از مجد الدین فیروز آبادی

[۲] لسان العرب، ۵/۲۱۵، طبع جدید، بیروت، ۱۹۶۸ء

کسی چیز کی کھود کرید کرنا (مطالعہ و تحقیق) ہوتا ہے، اور کبھی اس سے مراد وہ معرفت ہوتی ہے جو غور و فکر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے محاورے میں کہا جاتا ہے "نظرت فلم تنظر" تو نے دیکھا مگر غور نہیں کیا۔ ارشادِ باری (قل انظروا ماذا فی السموات) میں انظروا کے معنی ہیں تأملوا ۔ یعنی غور و فکر کرو۔ لفظِ نظر کا استعمال عوام کے نزدیک زیادہ تر "رویتِ بصر" کے لیے ہوتا ہے، جب کہ خواص کے نزدیک اس کا استعمال زیادہ تر بصیرت کے لیے ہوتا ہے۔[۳]

یہ محض ائمہ لغت ہی کی تحقیق نہیں ہے بلکہ مفسرین بھی اس لفظ کے یہی معنی مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ اوپر جو آیات نقل کی گئی ہیں، ان میں سورۃ انعام والی آیت کی تفسیر میں علامہ زمخشری تحریر فرماتے ہیں:

نظر اعتبار و استبصار و استدلال[۴]

عبرت و بصیرت اور استدلال کی نظر سے دیکھو۔

مفسر ابو مسعود تحریر فرماتے ہیں:

أی أنظروا الیہ نظر اعتبار و استبصار اذا أخرج ثمرہ؛[۵]

یعنی جب پھل نمودار ہونے لگے تو اس کو بچشمِ عبرت و بصیرت دیکھو۔

علامہ رشید رضا مصری تحریر فرماتے ہیں:

ای انظروا نظر تأمل و اعتبار[۶]

یعنی غور و فکر اور عبرت کی نظر سے دیکھو۔

اس لحاظ سے "نظر" کے معنی محض سرسری طور پر دیکھنے کے نہیں بلکہ غور سے دیکھنے، غور و فکر کرنے، نظرِ بصیرت ڈالنے اور بچشمِ عبرت معائنہ کرنے کے ہیں۔ اب پچھلی آیتوں کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ "نظر" کا دائرہ عالمِ جمادات، عالمِ نباتات، عالمِ حیوانات اور عالمِ افلاک تک عام مرئی و محسوس چیزوں اور کل موجودات پر محیط ہے۔

یہ قرآنِ حکیم کی ایک زبردست خصوصیت ہے کہ وہ سلبی اور ایجابی دونوں حیثیتوں سے اپنے متبعین

۳۔ مفرداتِ قرآن ۴۔ تفسیر کشاف

۵۔ تفسیر ابو مسعود برحاشیہ تفسیر کبیر ۶۔ تفسیر المنار

کو خصوصاً اور نوعِ انسان کو عموماً موجوداتِ عالم کے مطالعہ و مشاہدہ پر ابھارتا ہے اور ان مظاہر فطرت کی ساخت و پرداخت اور ان کے نظاموں کا منظم مطالعہ کرنے نیز ان اشیا و حوادث کے علل و اسباب کا پتا لگا کر ایک مسبب الاسباب تک پہنچنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ بار بار اتمامِ حجت کی خاطر اس طور پر کہتا ہے:

اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ لا (الاعراف ۱۸۵)

کیا انھوں نے زمین و آسمان کی بادشاہت اور اللہ کی پیدا کردہ مخلوقات میں غور نہیں کیا؟

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا ط وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ط اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ (الانبیاء ۳۰)

کیا انھوں نے مشاہدہ نہیں کیا کہ (پہلے) زمین اور سارے اجرامِ سماوی باہم ملے ہوئے تھے، جن کو ہم نے جدا کر دیا، اور پانی ہی سے ہر زندہ چیز کو بنایا، تو کیا یہ لوگ (پھر بھی) ایمان نہیں لائیں گے؟

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ ثُمَّ یُخْرِجُ بِہٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَجْعَلُہٗ حُطَامًا ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ (الزمر ۲۱)

کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے بلندی سے پانی برسایا، پھر اس کو زمین کے سوتوں میں داخل کر دیا۔ پھر وہ اسی پانی کے ذریعے رنگ برنگی کھیتیاں نکال دیتا ہے۔ پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے جس کو تو زرد ہوتے ہوتے دیکھتا ہے۔ پھر وہ اس کو چورا چورا کر دیتا ہے۔ اس باب میں دانش مندوں کے لیے ایک بڑی چونکا دینے والی (خبر) ہے۔

اوپر دو قسم کی آیات نقل کی گئی ہیں۔ اول قسم عملی سائنس (Practical Science) کی بنیاد ہیں، جن سے سائنسی علوم کی باقاعدہ تدوین عمل میں آتی ہے، اور قسم ثانی منکرین و معاندین کے لیے بطور اتمامِ حجت وارد ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن کی نظر میں اس دعوت فکر و تحقیق کے دو بنیادی مقاصد ہیں جن کی مختصر تشریح اس طرح ہے:

۱۔ اسلام کے بنیادی مقاصد اور اس کے اساسی نظریات و معتقدات خصوصاً توحید، رسالت اور معاد کے اثبات اور ان کی صداقت و حقانیت کے لیے نظامِ کائنات سے دلائل پیش کرنا، تاکہ ان

کی حیثیت پوری طرح کھل کر سامنے آجائے اور کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہ جائے، جیسا کہ دوسرے مواقع پر اس اصول کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (الذاریات: ۲۰-۲۱)

اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں (صحیفۂ فطرت میں) موجود ہیں اور خود تمہاری ہستیوں میں بھی۔ کیا تم کو نظر نہیں آتا؟

۲۔ اہلِ اسلام کو خصوصیت کے ساتھ تسخیرِ موجودات کی طرف راغب کرنا۔ بعض موجوداتِ عالم میں جو طبیعی اور نوعی فوائد ــــ قوانینِ فطرت کے روپ میں ــــ موجود ہیں، ان سے استفادہ کر کے انسانی زندگی کو بہتر بنانے اور دینِ برحق کے غلبہ و دفاع کے لیے فوجی و عسکری حیثیت سے قوت و شوکت حاصل کرنے کی طرف ترغیب دلانا، تاکہ اس سے خلافتِ ارض کے دیگر مقاصد پورے ہوں اور اقوامِ عالم کی اصلاح کا فریضہ بھی انجام پائے۔ بالفاظِ دیگر اہلِ اسلام سائنسی علوم و فنون میں ترقی کر کے اتنی قوت و طاقت بھی حاصل کر لیں کہ ایک حیثیت سے وہ دینِ الٰہی کو تمام ادیان پر ــــ مادی نقطۂ نظر سے ــــ غالب کر سکیں[1] تو دوسری طرف دنیا میں خدائی فوجدار بن کر عدل و انصاف اور اصلاحِ عالم کا فریضہ بھی انجام دے سکیں۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ــــ اسی وجہ سے نوعِ انسانی کو "علم اسما" اور "علم تسخیر" سے بھی نوازا گیا ہے۔

چنانچہ جس وقت حضرت آدم کو خلیفہ بنانے کا اعلان ہوا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں تمام چیزوں اور کل موجودات کا علم دے دیا، وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ــ اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد تمام چیزوں کے اسما اور ان کے خواص و تاثیرات کا علم ہے[2] جس کو بطورِ ایک اصطلاح "علم اسما" کہا جا سکتا ہے۔ اس میں ہمارے لیے سبق یہ ہے کہ زمین میں خلیفہ بننے اور صحیح معنی میں "منصبِ خلافت" پر

---

[1] غلبۂ دین کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو دلیل و استدلال کے ذریعے غالب کرنا اور دوسرے مادی و ظاہری حیثیت سے برتری حاصل کرنا۔ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے یہ دونوں پہلو بہ یک وقت مطلوب ہیں۔ ورنہ خاطر خواہ نتائج نکل نہیں سکتے اور دینِ برحق علمی اعتبار سے برحق ہونے کے باوجود مادی و عسکری حیثیت سے اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔

[2] اس کی تفصیل اور مفسرین کے دلائل پر بحث میں نے ایک دوسرے مقالے میں کی ہے جس کا عنوان ہے "خلافت

فائز ہونے کے لیے "علم اسما" میں دسترس حاصل کرنا ضروری ہے۔[۹] اور "علم اسما" کی جیسی تحقیق و تفتیش موجودہ دَور میں علومِ سائنس کے تحت کی گئی ہے، کسی اور دَور میں نہیں کی گئی۔ چنانچہ علمِ کیمیا (کیمسٹری) طبیعیات (فزکس)، ارضیات (جیالوجی)، علمِ نباتات و حیوانات (بیالوجی) اور فلکیات (اسٹرانمی) میں جتنی بھی چیزوں سے بحث کی جاتی ہے اور ان کے جو جو طبیعی (فزیکل) خواص و تاثیرات بیان کیے جاتے ہیں، وہ سب کے سب حیرت انگیز طور پر "علم اسما" میں سما جاتے ہیں۔ یہ ایک جامع اصطلاح ہے جو کل علوم سائنس پر حاوی ہے۔ لہٰذا "علم اسما" ہماری کھوئی متاع ہے، جس کی تحصیل پر نہ صرف ہماری شان و شوکت موقوف ہے بلکہ دینِ الٰہی کے حقیقی دفاع کا دار و مدار بھی اسی پر ہے جیسا کہ آئندہ سطور سے ظاہر ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ مظاہر کائنات میں ودیعت شدہ فوائد اور ان کی توانائیوں سے مستفید ہونے کے لیے ان علوم کی تحصیل بہت ضروری ہے۔ ان علوم کے بغیر ہم نہ تو مظاہرِ کائنات کا منظم و مربوط مطالعہ (STUDY) کر سکتے ہیں اور نہ عملاً ان میں ودیعت شدہ فوائد و تاثیرات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ (لقمان : ۲۰)

کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے تمھارے لیے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں مسخر کر دیں اور تم پر اپنی ظاہری باطنی نعمتیں پوری کر دیں۔

یہ ظاہری و باطنی نعمتیں کیا ہیں؟ مفسرین نے ان کی کئی توجیہیں کی ہیں، جن میں نسبتاً زیادہ بہتر توجیہ علامہ زمخشری نے کی ہے:

"ظاہری سے مراد وہ نعمت ہے جو مشاہدے میں آسکے اور باطنی سے مراد وہ نعمت ہے جو کسی دلیل سے معلوم ہو سکے یا بالکل ہی نہ معلوم ہو سکے۔ اس لحاظ سے انسان کے بدن میں کتنی ہی ایسی (پوشیدہ) نعمتیں ہیں جن کو انسان نہیں جانتا اور ان کی طرف راہ یاب نہیں ہوتا۔"[۱۰]

---

[۹] یہ فریضہ "وارثینِ علمِ آدم" یا آدمؑ سے حقیقی انتساب رکھنے والوں پر ایک فرضِ کفایہ کے طور پر عائد ہوتا ہے۔

[۱۰] تفسیر کشاف ۳/۲۳۵

میرے نزدیک اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ظاہری نعمتوں سے مراد وہ نوازشاتِ الٰہیہ ہیں جو آفرینشِ آدم سے لے کر عصرِ حاضر تک برابر معلوم و متعارف چلی آرہی ہیں یعنی وہ لوازمِ حیات جن کے استعمال سے ہر دور کا انسان بخوبی واقف رہا ہے اور باطنی نعمتوں سے مراد خاص کر مادہ (MATTER) اور توانائی (ENERGY) کے وہ پوشیدہ اسرار و حقائق ہیں جو علومِ سائنس کی ترقی کی بدولت منکشف ہو سکے ہیں، جن کو موجودہ انسان مسخر کرکے بخوبی فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مثلاً برق، بھاپ، جوہری توانائی[۱۱]، جوہری آئی سوٹوپ اور بے شمار قسم کے کیمیاوی مرکبات (CHEMICAL COMPOUNDS) جو مصنوعی غذاؤں، دواؤں، کھادوں اور دیگر بے شمار مصنوعات سے متعلق ہیں اور اسی طرح مختلف قسم کے ترشے (ACIDS) وغیرہ جن کا استعمال جدید صنعتوں (INDUSTRIES) میں بہت عام ہے۔

ان کیمیاوی چیزوں خصوصاً جوہری توانائی (ATOMIC ENERGY) اور جوہری مرکزہ (ATOMIC - NUCLEUS) کا علم بہت ہی اہم ہے۔ ان تمام چیزوں کے اسرارِ سربستہ کی واقفیت ہی پر جدید صنعتوں کا دار و مدار ہے۔ لہٰذا یہ "کیمیاوی اسرار" گویا کہ صنعت و حرفت کی کنجیاں ہیں۔ اب جو قوم ان "کنجیوں" پر قبضہ کر لیتی ہے وہی صحیح معنی میں زمین پر خلیفہ بن سکتی ہے۔

یہ تمام نعمتیں روزِ ازل ہی سے کائنات میں موجود تھیں۔ مگر ان سے صحیح فائدہ دورِ جدید کا انسان محض علمِ اسما (علومِ سائنس) کی ترقی اور علمِ تسخیر کی قوت کی بدولت اب اٹھا رہا ہے۔

خلافتِ ارض کے لیے علمِ اسما اور علمِ تسخیر (جس کی تعبیر ایک حیثیت سے موجودہ اصطلاحوں کے مطابق ٹکنالوجی سے کی جا سکتی ہے[۱۲]) سے واقفیت لازمی ہے۔ بالفاظِ دیگر سائنس اور ٹکنالوجی کے بغیر خلیفہ ہونا۔

---

[۱۱] جوہری توانائی انسان کے لیے مفید بھی ہے اور مضر بھی۔ مگر اس کے "خدائی نعمت" ہونے کی حیثیت سے اس کا استعمال نوعِ انسان کی بھلائی اور خیر کے سلسلے میں ہونا چاہیے۔ قرآنی نقطۂ نظر سے نوعِ انسانی کی ہلاکت و بربادی کی خاطر اس کا استعمال بہت برا ہے۔ اس قسم کی نعمتوں اور تسخیرِ اشیا کا جہاں کہیں بھی تذکرہ کیا گیا ہے وہاں پر وہ "لکم" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس میں "لام" غایت کے لیے ہے، جو افادیت اور حصولِ منفعت پر دلالت کر رہا ہے۔ لہٰذا قرآنی نقطۂ نظر سے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور نیپام بم وغیرہ کا استعمال ممنوع اور سخت گناہ کا فعل ہے۔

[۱۲] تسخیر کے لغوی معنی کسی کو قابو میں کرنے یا کسی کو جبراً کام میں لگانے کے ہیں۔ موجوداتِ عالم کا اصل مسخر (تسخیر کرنے والا) صرف اللہ تعالیٰ ہے، جس نے تمام مظاہرِ کائنات کو محض اپنے حکمِ ازلی کے تحت مسخر کر رکھا ہے۔ مگر انسان بھی خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ان کو اپنے کام میں لا سکتا ہے اور ان کے فوائد سے مستفید ہو سکتا ہے بلکہ وہ خلاقِ فطرت صفات کا مظہر ہونے کی حیثیت سے ان مظاہر کی تسخیر میں اپنے خالق و مالک کی نقل اتار سکتا ہے۔ اس لحاظ سے موجودہ کاہل اور علوم و فنون سے عاری مسلمانوں کو

خصوصاً عصرِ جدید میں ــــ ایک بے معنی سی بات ہے۔ آج روئے زمین پر جتنی بھی صنعتیں کام کر رہی ہیں، سب کی سب سائنسی علوم اور ٹکنالوجی کی مرہونِ منت ہیں، اور جو قوم آج اس میدان میں پیچھے ہے وہ گویا کہ پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہے، جس کو ترقی یافتہ قومیں کچلتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں، اور اس سائنسی و صنعتی پس ماندگی کی بدولت آج اپنے دین و ایمان کا دفاع بھی مشکل ہوگیا ہے۔ جیسا کہ آج خصوصیت کے ساتھ افغانستان کے حالات شاہد ہیں۔ سائنسی علوم و فنون میں برتری ہی کی بدولت فوجی و عسکری اور سیاسی و بین الاقوامی حیثیت سے بھی برتری حاصل ہوتی ہے اور قرآن حکیم ہم کو اپنے ملک و ملت کے دفاع کے لیے ہر قسم کی فوجی و عسکری تیاری کی تاکید کرتا ہے۔ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ الخ - اور موجودہ دور کے معیار کے مطابق اس تیاری کے لیے تمام سائنسی و صنعتی علوم سے مدد لینا ناگزیر ہے۔ ظاہر ہے کہ آج تیر کمان اور تلواروں کا زمانہ نہیں رہا۔

قرآن حکیم ہماری فکری و عملی زندگی کا محور ہے، وہ ہمیں زندگی کے میدان میں کسی بھی حیثیت سے تنہا نہیں چھوڑتا۔ بلکہ ہر اعتبار سے ہماری پوری پوری رہنمائی کرتا ہے، یہ اور بات ہے کہ ہم محض اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے اس کی ہدایت و رہنمائی سے غافل ہو کر اندھیروں میں بھٹکتے پھریں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن عظیم ہی دنیا کا وہ پہلا صحیفہ ہے جس نے سب سے پہلے ایک انوکھے اور حیرت انگیز اسلوب میں نوعِ انسانی کو جھنجوڑا اور اپنے ابدی حقائق کے اثبات کے لیے عملی سائنس (PRACTICAL SCIENCE) کی بنیاد ڈالی۔ جس سے آج خود مسلمان دُور بھاگ رہے ہیں۔

اسلامی دَور سے پہلے عملی سائنس کا وجود نہیں تھا۔ یونانی فکر اور فلسفے کا جو کچھ بھی سرمایہ تھا وہ محض نظری (THEORETICAL) اور ظنی تھا۔ یونانی فلاسفہ حکمت و دانش کی باتیں تو بڑی اچھی اچھی کہتے تھے مگر انھیں اپنی باتوں کو صداقت کے لیے کسی تجربے یا مشاہدے کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوئی، بلکہ اس کے برعکس وہ عمل یا تجربے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس طرح ایک اعتبار سے وہ گویا "بے عمل" تھے۔ اس کے برعکس جیسا کہ لاتعداد آیاتِ قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے، وہ عمل اور تجربے پر اُبھارتا ہے لہٰذا پورے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام ہی دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے سب سے پہلے موجوداتِ عالم میں غور و فکر اور تحقیق و تجربہ کرنے کی دعوت دی اور عملی سائنس کی بنیاد ڈالی۔ یہ قرآن کی مثبت اور انقلابی دعوتِ فکر ہی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی عہد میں دنیا کے علمی و فکری سرمایہ کو اکٹھا کر کے ان کا ترجمہ کیا

اور ان کی تہذیب و تدوین کی گئی۔ پھر ان علوم میں غور و فکر کر کے نئی راہیں نکالی گئیں اور علم کیمیا، طبیعیات، فلکیات، ارضیات، طب، نباتات اور علم ہندسہ و ریاضی وغیرہ جدید علوم و فنون کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس دور کے مسلم سائنس دانوں میں جابر بن حیان، محمد بن موسیٰ خوارزمی، ابن ہیثم، محمد بن زکریا رازی، ابن سینا، البیرونی، ابن نفیس، ابو حنیفہ دینوری، عمر خیام اور ابو القاسم الزاہراوی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ آٹھویں صدی سے پندرھویں صدی عیسوی تک مسلمانوں نے ان علوم و فنون کو خوب ترقی دی اور اس میدان میں ان کا کوئی ہم سر و مقابل نہیں تھا۔ مگر چند تاریخی و سیاسی اسباب ــــ یا زیادہ صحیح لفظوں میں زوال اُمتِ اسلامیہ ــــ کی بنا پر پندرھویں صدی عیسوی کے بعد علوم و فنون کی شمع مشرق سے مغرب کی طرف منتقل ہوئی اور یورپ کی ذہنی و علمی بیداری کا دور شروع ہوا۔

مگر اس واقعہ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ مغربی قوموں میں ذہنی و فکری بیداری اور علوم و فنون کی ترقی جس رفتار سے ہوتی گئی، مسلمان ــــ جو اس سے قبل اس میدان میں ساری دنیا کے امام تھے ــــ اسی رفتار پر پیچھے ہٹتے گئے، حتیٰ کہ ان علوم ہی سے بے تعلق اور اجنبی بن گئے۔ یہ تدریجی عمل گزشتہ پانچ صدیوں تک برابر جاری رہا، جو مکمل پس ماندگی پر منتہی ہوا۔ آج امتِ مسلمہ کی زبوں حالی کو دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی امت ہے جو کسی دور میں دنیا کی سب سے بہتر اور ترقی یافتہ ملت تھی۔ اب اہلِ اسلام کو دوبارہ ان علوم کی طرف راغب کرنے اور خلافتِ ارض کے فراموش کردہ منصب عظیم کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایک بہت زیادہ مؤثر اور طاقت ور دعوتِ فکر کی ضرورت ہے اور یہ دعوتِ فکر صرف قرآن کریم ہی مہیا کر سکتا ہے، جس کی ابدی آیتوں میں بلا کی تاثیر اور بلا کی قوت کشش ہے اور جو اپنے معجز نما حقائق اور سچائیوں کی بنا پر آج بھی بالکل تازہ اور سدا بہار معلوم ہوتا ہے۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے دو اہم حیثیتوں سے مظاہرِ کائنات کے بیان اور ان کے نظاموں سے تعرض کیا ہے۔ اول یہ کہ فکری و نظری حیثیت سے اس کے بیانات اور اس کے ابدی حقائق کی صداقت و حقانیت ظاہر و باہر ہو جائے اور قرآن حکیم کے معجز نما کلام اور اس کے من جانب اللہ ہونے کی حقیقت کھل کر سامنے آ جائے تاکہ منکرین و معاندین پر اتمامِ حجت ہو سکے، اور دوسرے یہ کہ عملی حیثیت سے خلافتِ ارض کے مقاصد کی تکمیل کی خاطر مظاہرِ کائنات میں ودیعت شدہ فوائد اور ان کی قوتوں سے استفادہ کر کے منشائے الٰہی کو پورا کیا جائے۔ علم اول کا تعلق خصوصیت

کے ساتھ علمائے دین سے تھے اور علم ثانی کا سائنس دانوں سے۔ مگر جو قوم ان دونوں علوم میں — فکری اور عملی اعتبار سے — جامع اور کامل ہوگی وہی صحیح معنی میں "خلیفۃ الارض" ہونے کی مستحق ہو سکے گی۔ کیونکہ علم اول سے فکری و نظری حیثیت سے اقوامِ عالم کی اصلاح وابستہ ہے اور علم ثانی سے مادی حیثیت سے "غلبۂ دین" لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ مطلوب ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ضمنی مقاصد ہیں۔

علمِ کیمیا اور طبیعیات کی اہمیت

اس تمہید کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، اور زیرِ بحث موضوع پر ان دونوں حیثیتوں سے نظر ڈالی جاتی ہے کہ قرآن حکیم کی نظر میں ان علوم و فنون کی فکری و نظری حیثیت سے کیا اہمیت ہے اور عملی حیثیت سے کیا افادیت؟ ان دونوں حیثیتوں سے اس لیے بحث کی جاتی ہے کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ قرآن کی ایک حیثیت کو یکسر نظر انداز کر کے صرف اس کے دوسرے پہلو ہی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ نیز علمی اعتبار سے یہ دونوں پہلو بیک وقت پیشِ نظر رکھنا ضروری بھی ہے تاکہ فکر و نظر میں توازن برقرار رہے۔

اصل بحث شروع کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں نے اس موقع پر سائنسی علوم میں صرف علمِ کیمیا اور طبیعیات کو منتخب کیا ہے۔ کیونکہ یہی وہ دو بنیادی علوم ہیں جن پر دیگر عام سائنسی و صنعتی علوم (ٹکنالوجی) کا مدار ہے۔ یعنی "علمِ تسخیر" یا "تسخیر اشیا" کے لیے جب تک ان دو علوم سے مدد نہ لی جائے کوئی بھی چیز معرضِ وجود میں نہیں آسکتی، اور کسی بھی "مظہرِ قدرت" پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ آج دنیا میں مختلف قسم کی ہزاروں لاکھوں صنعتیں (INDUSTRIES) کام کر رہی ہیں۔ مگر کسی بھی صنعت کو وجود میں لانے اور اس کو چلانے کے لیے عملاً ان دو بنیادی علوم سے صرفِ نظر ممکن نہیں، لہٰذا ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی کھوئی ہوئی شان و شوکت کے حصول اور خلافتِ ارض کی تکمیل (اسلام کی نشاۃ ثانیہ) کے لیے ان علوم کی اہمیت و افادیت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ پھر ہر ممکن طریقے سے امتِ مسلمہ کو ان علوم سے بہرہ ور کر کے خلافتِ ارض کے میدان میں آگے قدم بڑھانے کی تدبیریں سوچی جائیں۔ چونکہ عام طور پر ان علوم کے افادی پہلو نظروں سے اوجھل ہیں اور عوام تو عوام خواص تک کو بھی نہیں معلوم کہ ان علوم کا تعلق قرآن اور خلافتِ ارض سے کیا ہے؟ اس لیے کچھ فنی تفصیلات بھی ضروری معلوم ہوئیں۔

غرض علمِ تسخیر کا تعلق اگرچہ تمام سائنسی اور صنعتی علوم سے بہت گہرا ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ طبیعیات اور کیمیا کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہے۔ ان علوم کی اہمیت ضمناً قرآنِ حکیم سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ یعنی کائنات کے جو ہمہ گیر اصول و ضوابط قرآنِ حکیم میں بیان کیے گئے ہیں اُن کی تنقیح کے ضمن میں اس قسم کے حقائق بھی ثابت ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآنِ حکیم کا بنیادی مقصد اگرچہ فکری و نظریاتی حیثیت سے انسان کے غلط افکار اور اس کے غلط معتقدات کی تنقیح ہے اور اس کی بدعملی کی اصلاح ہے مگر قرآنِ حکیم کی عظیم خصوصیت تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والا) کے مطابق اس میں ایسے ایسے ضمنی حقائق ملتے ہیں جو کسی بھی غلط رویہ اور غلط روش کی اصلاح کے لیے کافی و شافی ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم اس حیثیت سے بھی ہمارے لیے ایک رہنما اور رہبر ہے۔

اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ط (الانعام، ۱۱۴)

تو کیا اللہ کے سوا کسی دوسرے کو حَکَم مان لوں، حالانکہ اس نے اس کتاب کو تمہارے پاس تفصیل کے ساتھ بھیج دیا ہے۔

لہٰذا ان علوم کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے اس سلسلے میں اُصولی اعتبار سے خود قرآنِ حکیم کے چند اشارات اور بنیادی حقائق کی توضیح کی جاتی ہے۔

قوانینِ فطرت اور خدائی منصوبہ

قرآنِ حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ـــــ اور سائنسی تحقیقات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ـــــ کہ یہ عالمِ رنگ و بو اور یہ سارا سلسلۂ وجود مختلف اسباب و علل کے روپ میں رواں دواں ہے۔ نظامِ فطرت کے یہ اسباب و علل اور یہ خواص و تاثیرات اس بات کی علامت ہیں کہ یہ کائنات اور اس کے آثار و مظاہر دفعتاً نمودار نہیں ہوگئے بلکہ طبیعی و فطری اور تدریجی مراحل طے کرکے موجودہ حالت تک پہنچے ہیں۔ اگر خداوندِ عالم چاہتا تو آن کی آن میں اور دفعتاً عالمِ سماوات، عالمِ جمادات اور عالمِ نباتات و حیوانات کے سارے مظاہر لباسِ وجود میں جلوہ گر ہو سکتے تھے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہو سکا بلکہ اس نے ان عام آثار و مظاہر کے لیے کچھ مادی قوانین و ضوابط مقرر کر دیے، جو ان مظاہر کے طبیعی و نوعی ضوابط کہلاتے ہیں۔ مثلاً زمین اور عام اجرامِ سماوی اپنی موجودہ شکل اختیار کرنے سے پہلے ابتداً گیس کی شکل میں تھے جس کی تعبیر قرآنِ حکیم میں "دخان" (دھوئیں) کے لفظ سے کی گئی ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْهًا ط

قَالَتَآ اَتَيۡنَا طَآئِعِيۡنَ ۝ فَقَضٰهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوَاتٍ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ وَاَوۡحٰى فِىۡ كُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَهَا‌ؕ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ ‌ۖ وَحِفۡظًا‌ ؕ ذٰ لِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ ۝ (حٰم السجدہ: ۱۱-۱۲)

پھر وہ متوجہ ہوا آسمان کی طرف جو اس وقت دھوئیں (کی شکل میں) تھا۔ پس اس نے اس سے اور زمین سے کہا کہ تم دونوں آجاؤ، خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے، دونوں نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ پس اس طرح اس نے دو دنوں میں سات آسمان بنا دیے، اور ہر آسمان میں (اس کے فطری احوال کے مطابق) اس کا معاملہ پہنچا دیا۔ اور ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں (ستاروں) سے آراستہ کیا اور (اس کی) حفاظت کی۔ یہ ہے منصوبہ ایک زبردست اور ہمہ داں ہستی کا۔

ان آیاتِ کریمہ کا مطلب سمجھنے سے پہلے یہ اوّلین حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآنِ حکیم کے یہ اور اس قسم کے دیگر تمام بیانات اس دور میں نازل ہوئے ہیں جب کہ سائنٹیفک نقطۂ نظر سے ان چیزوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی اور اس دور کے لوگ اس قسم کے حقائق اور تفصیلات کو سمجھنے کے متحمل نہیں تھے۔ لہٰذا خدائی اسکیم کے مطابق اس قسم کی چیزوں کو اشاروں کنایوں میں اور زیادہ تر تشبیہات و استعارات کے روپ میں بیان کیا گیا ہے۔ بہرحال ان آیات میں جو اشارے کنائے موجود ہیں ان کی قدر و قیمت موجودہ دور کے لحاظ سے بہت اہم اور فکر انگیز ہے، اور جدید سے جدید تر تمام تحقیقات ان اشاروں کنایوں کی اہمیت و افادیت کو مزید اجاگر کرتی جارہی ہیں اور روز بروز ان کی تصدیق و تائید ہوتی جارہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کو ــــ اپنی زبردست قدرت اور زبردست علم کے باوجود ــــ اسباب و علل کے روپ میں ظاہر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اگر وہ چاہتا تو زمین اور ساتوں آسمانوں کو آن کی آن میں جلوہ گر کر سکتا تھا، مگر ایسا کرنے کے بجائے اس نے چند طبیعی قوانین و ضوابط مقرر کیے جن کا بیان دیگر آیات میں موجود ہے)۔ پھر ان طبیعی قوانین کے تحت ارض و سماوات دو دنوں (یا دو ہزار سالوں میں)[۱۳] بتدریج دھوئیں یا گیس (دخان) کی حالت سے نکل کر ٹھوس حالت میں پہنچے۔

---

[۱۳] اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق کہ اس کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ وَاِنَّ يَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّكَ كَاَلۡفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ (الحج: ۴۷)۔ اس سے دراصل ایک لمبی مدت کا اظہار مقصود ہے، تعین ایک ہزار سال کی مقصود نہیں ہے۔ اس سے موجودہ علمِ کائنات (COSMOLOGY) کے نظریات کے درمیان تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم بمرادہ۔

زمین و آسمان سے "خوشی یا ناخوشی چلے آؤ" کہنا بطور تمثیل ہے۔ "ہم خوشی خوشی چلے آتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ ہم تیرے منصوبے کے مطابق تیرے مقرر کردہ قوانین و ضوابط کو قبول کر کے اپنی موجودہ ہیئت یا شکل و صورت کو تبدیل کرنا اور دیگر انواع و اقسام کے مرکبات کیمیاوی (CHEMICAL COMPOUND) کا روپ دھارنا نیز قسم ہا قسم کے انواع حیات کا قالب اختیار کرنا پسند کرتے ہیں۔ تیرے احکام سے سرتابی کی ہم میں مجال نہیں ہے۔ یہ گویا کہ "مادہ" (MATTER) کی اطاعتِ الٰہی کا اعلان کُلی تھا جو آج تک انہی طبیعی قوانین و ضوابط کی شکل میں جاری و ساری ہے۔[۱۴]

ظاہر ہے کہ بصورت دیگر "کرھاً" (زبردستی یا ناخوشی) کا کوڑا حرکت میں آتا اور آن کی آن میں ــــ بغیر طبیعی قوانین و ضوابط اور بغیر اسباب و علل کے ــــ تمام زمین و آسمان، چاند، سورج، ستارے جمادات، نباتات اور حیوانات سب کے سب (ایک معجزے کی طرح) ظاہر ہو جاتے۔[۱۵] اور دو ہزار سالوں کی لمبی مدت کی ضرورت نہ پڑتی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بے مثال حکمت و منصوبہ بندی کے تحت یہاں پر ایک مضبوط سلسلۂ علل و اسباب قائم کر دیا ہے جس میں کہیں بھی کوئی رخنہ یا شگاف نظر نہیں آتا۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ (الملک : ۳)

نظر پھیر کر دیکھو کہیں کوئی رخنہ بھی نظر آتا ہے؟

اسی طرح زمین اور اجرامِ سماوی کی تخلیق کے بعد زمین میں سامانِ معیشت (مختلف نباتات و حیوانات کی شکل میں) بتدریج چار دنوں (یا چار ہزار سال) میں ظہور میں لایا گیا۔

وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ (حٰم السجدہ : ۱۰)

اور اس نے زمین میں برکت رکھی اور سب سامانِ معیشت طلب گاروں کے لیے اعتدال کے ساتھ چار دن میں

---

[۱۴] مادے کے اندر جاری و ساری انہی قوانین و ضوابط (طبیعی و کیمیاوی) کو جاننے اور ان پر عمل پیرائی کے باعث مادی مظاہر و ظواہر کی "تسخیر" عمل میں آتی ہے، جن سے واقفیت حاصل کر کے موجودہ دور کا انسان فائدہ اٹھا رہا ہے۔ خلیفہ بن کر مظاہرِ عالم سے مستفید ہونے کے لیے ان رازوں کا جاننا ضروری ہے جن کو خالقِ ارض و سما نے ان کے سینے میں ودیعت کر دیا ہے۔

[۱۵] اگرچہ یہ فطری اسباب و علل بھی غور کرنے والوں کے لیے ایک معجزے سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو انھیں "معجزاتِ ربوبیت" کہہ سکتے ہیں۔

مقرر کر دیے۔

اسی طرح چھ دنوں (یعنی چھ مدارج) میں عالمِ افلاک، عالمِ جمادات، عالمِ نباتات اور عالمِ حیوانات کے تمام مظاہر و ظواہر کو محض ایک دخانی مادہ (گیس یا دھواں) سے نکال کھڑا کر دیا جو اس کی ربوبیت کا زبردست اور حیران کن کارنامہ ہے اور اس کی اصل کنہ و حقیقت کا ادراک انسان کسی بھی حال میں نہیں کر سکتا، کیونکہ انسان اشیا کی اصل حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا۔ بلکہ اس کا علم ہمیشہ ظاہری اسباب و علل ہی تک محدود رہتا ہے۔

غرض ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی تجویز اور منصوبہ بندی کا تذکرہ بھی موجود ہے کہ یہ ساری کارروائی ایک مقررہ ضابطے اور الٰہی فیصلے کے تحت عمل میں آتی ہے، جس کی تعبیر لفظ "تقدیر" سے کی گئی ہے۔

تقدیر کے معنی اندازہ یا تجویز کرنے کے ہیں۔ یعنی کسی کام کا مفصل ضابطہ یا منصوبہ بنانا۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

قدر اور تقدیر کے معنی کسی چیز کی مقدار کو ظاہر کرنے کے ہیں اور تقدیر کا ایک مطلب طاقت اور قدرت عطا کرنا بھی ہے۔ اس لحاظ سے اشیائے عالم سے متعلق تقدیرِ الٰہی کی دو صورتیں ہیں: (۱) (الٰہی کام کرنے کی) قدرت و طاقت عطا کرنا۔ (۲) ان کو حکمت کے تقاضے کے مطابق ایک مخصوص مقدار اور مخصوص شکل عطا کرنا ـــــ اس لیے کہ فعلِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں: (۱) اوّل یہ کہ کسی چیز کو بالفعل وجود میں لانا۔ یعنی ابتدا ہی میں اس کو کامل وجود اس طرح بخشنا کہ جب تک مشیتِ الٰہی اس کے فنا یا تبدیلی کی نہ ہو اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہو سکے، جیسے سماوات اور ان میں موجود شدہ چیزیں (کہ ان کے نظاموں میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں روزِ اول میں جس طرح پیدا کر دیا تھا اسی کے مطابق وہ جاری و ساری رہیں گے)۔

(۲) دوم یہ کہ کسی چیز کے اصول کو بالفعل اور اس کے اجزا کو بالقوۃ وجود بخشنا، اور اس کے لیے ایسا ضابطہ بنا دیا کہ وہ اس کے خلاف جا نہ سکے۔ جیسے کھجور کی گٹھلی کے متعلق تقدیرِ الٰہی کہ اس سے کھجور کا درخت ہی اُگے نہ کہ سیب یا زیتون کا۔ اور انسان کے مادۂ منویہ کی تقدیر یہ بنائی کہ اس سے انسان ہی پیدا ہو نہ کہ اور قسم کے جانور[۱۱]

(۳) اصول کی وضاحت علامہ سید سلیمان ندوی نے بہت خوبی کے ساتھ کی ہے:

---

[۱۱] مفردات القرآن ـــ قوسین کے درمیان توضیحی الفاظ اور جملے اضافہ شدہ ہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لیے پیدا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی ارادہ و مقصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے اور اس کے خالق نے اس کے روزِ پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے، اس کی تعمیل سے وہ سرِ مو انحراف نہیں کرتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے۔ آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے، اور وہ ہر آن و ہر لمحہ اس میں مصروف ہے۔ زمین کو سرسبزی و شادابی کا کام سپرد ہے، اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے۔ ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے، اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے۔ درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں، حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں وہ بخوشی ان کو کر رہے ہیں۔[۱]

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک متعین ضابطہ اور ایک متعین قانون طبیعی (NATURAL LAW) بنا دیا ہے جس کی خلاف ورزی دنیا کی کوئی نوع اور کوئی مادی شے نہیں کر سکتی۔ اس قانونِ الٰہی کی تفصیل دیگر مقامات میں اس طرح کی گئی ہے:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۝ (الفرقان: ۲)

اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک ضابطہ بنایا۔

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ (الطلاق: ۳)

اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ (پہلے ہی سے) بنا دیا ہے۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ۝ (القمر: ۴۹)

بلاشبہ ہم نے ہر چیز ایک متعین اندازہ سے پیدا کی ہے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ۝ (الرعد: ۸)

اور اس کے پاس ہر چیز ایک متعین مقدار کے ساتھ ہے۔

یہ قرآنِ حکیم کے چند وسیع اور ہمہ گیر کلیات ہیں، جن کا اطلاق عالمِ افلاک، عالمِ جمادات، عالمِ نباتات اور عالمِ حیوانات کی ہر چیز اور ہر مظہرِ قدرت پر ہو سکتا ہے۔ ان میں مادہ کے تمام قوانین: طبیعی (PHY-SICAL)، نوعی، عضویاتی (PHYSIOLOGICAL)، فعلیاتی (MORPHOLOGICAL)، تشریحی

---

[۱] سیرۃ النبی: ۲۰/۴

(ANATOMICAL) طبی (MEDICINAL) ادویاتی (PHARMACEUTICAL) اور کیمیاوی (CHE-
MICAL) - اور مادے میں جاری ہر قسم کی توانائیاں ؛ بھاپ، برق، آواز، روشنی اور مقناطیس سب
کچھ داخل ہیں، جن کا مطالعہ آج سائنسی علوم کے تحت کیا جا رہا ہے۔ چونکہ یہ کلیات مطلقاً مذکور ہیں
اور ان میں کسی قسم کی تقیید نہیں ہے، اس لیے اشیائے کائنات کی جتنی بھی حیثیتیں اور جتنی بھی خصوصیات
ہو سکتی ہیں، سب کی سب مراد ہو سکتی ہیں - مادے اور توانائی کی ان خصوصیات کو ہم قرآنی اصطلاح
کے مطابق "علم المقادیر" یا "مقداروں کا علم" کہہ سکتے ہیں اور یہ ایک بہت جامع اور وسیع اصطلاح ہوگی۔

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ سائنس کسی چیز کو پیدا یا کسی قانون کو وضع نہیں کرتی بلکہ قدرت
کے انہی مخفی قوانین کا پتا چلاتی ہے اور اسرارِ ربوبیت کو وا کرتی ہے۔ تمام سائنسی علوم میں جو مسائل و
مباحث زیرِ بحث آتے ہیں وہ یہی "قوانینِ قدرت" یا "قوانینِ ربوبیت" ہوتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

ارمغانِ حالی - پروفیسر حمید احمد خاں

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی اپنے دور کی عظیم شخصیت تھے۔ ان کی شہرت کا اصل باعث
اگرچہ ان کی نظم کو قرار دیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو نظم و نثر دونوں اصنافِ سخن پر عبور حاصل
تھا۔ چنانچہ نظم کی طرح ان کا حصۂ نثر بھی بڑا جاندار اور بہت سے موضوعات کو محیط ہے۔ وہ سوانح نگار
بھی تھے اور ناقد بھی۔ مفکر بھی تھے اور مصلح بھی۔ انھوں نے اصلاحی، تعمیری، اخلاقی، تعلیمی اور
مسائل سے متعلق عمدہ مضامین سپردِ قلم کیے۔

یہ کتاب جو "ارمغانِ حالی" کے نام سے موسوم ہے۔ ان کے نظم و نثر کا قابلِ مطالعہ انتخاب
ہے۔ کتاب میں حالی کے حالات و سوانح بھی مناسب تفصیل سے تحریر کیے گئے ہیں۔

صفحات ۲۶۱ قیمت ۱۸ روپے

ملنے کا پتا :- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

پروفیسر اختر راہی

سید مناظر احسن گیلانی

وہ وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالکِ اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے۔ وَالغیب عند اللہ۔ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصرِ حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہے۔ اس ایک آدمی نے تنِ تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں۔ ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔[1]

یہ اقتباس مولانا ابوالحسن علی ندوی کے تعزیتی مضمون سے لیا گیا ہے جو انھوں نے مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم کی رحلت پر لکھا تھا۔ مولانا گیلانی مرحوم موجودہ صدی کے ان بلند پایہ علما میں سے تھے جن کے علمی اور تصنیفی کام کا تقاضا ہے کہ ان کی حیات اور خدمات پر تفصیل سے لکھا جائے۔ ان کے نام پر علمی ادارے قائم ہوں اور ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے تقریبات کا اہتمام ہو۔ افسوس ہے کہ مولانا گیلانی مرحوم کی حیات و خدمات پر چند تعزیتی تحریروں کے سوا کوئی ٹھوس چیز نہیں ملتی۔ ہمارے دینی مدارس میں تصنیف و تحقیق کی کوئی مستقل روایت نہیں ہے اور ان اداروں میں مولانا گیلانی ہی نہیں دوسرے علمائے کرام پر بھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ یونیورسٹیوں میں قدرے کام ہوتا ہے مگر پاکستان کی حد تک مولانا گیلانی مرحوم پر کسی یونیورسٹی میں مقالۂ تحقیق نہیں لکھا گیا اور اگر بھارت کی یونیورسٹیوں میں کچھ کام ہوا ہے تو راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔

زیرِ نظر مضمون میں مولانا گیلانی مرحوم کی خدمات و حیات پر روشنی ڈالنے کی ابتدائی سی کوشش کی گئی ہے۔ شاید یہ کسی محقق کے لیے تحریک کا باعث بنے اور وہ اس بے نظیر عالم اور بڑے مصنف پر قلم اٹھائے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم واسطی زیدی سادات کے خاندان سے تھے۔ ان کے اجداد دو ڈھائی

---

[1] پرانے چراغ، ص ۹۴

صدی پہلے عرب سے ایران ہوتے ہوئے برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے تھے۔ اس خاندان میں بڑے بڑے علماء اور ولی پیدا ہوئے۔ سید احمد جاجنیری رحمۃ اللہ علیہ اسی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ اس خانوادے کی ایک شاخ نے ضلع پٹنہ میں بہار شریف سے بارہ میل جانب مشرق ایک بستی کی بنیاد رکھی، جو "گیلانی" کے نام سے موسوم ہوئی۔ آج کل گیلانی کی آبادی چھ سات سو افراد پر مشتمل ہے۔

مولانا گیلانی کا خاندان ہر دور میں ذی وجاہت رہا۔ مالی فارغ البالی کے ساتھ علمی روایت بھی قائم رہی۔ ان کے پردادا داروغہ سید شجاعت علی، سرکار برطانیہ کے ایک معزز عہدے دار تھے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ چند تھانوں کے سرکل انسپکٹر تھے[۲۲] داروغہ سید شجاعت علی کے صاحب زادے سید محمد احسن اپنے دور کے بڑے عالم اور زبردست معقولی مدرس تھے۔

سید محمد احسن گیلانی

سید محمد احسن گیلانی ۱۲۱۲ھ/ ۹۸ - ۱۷۹۷ء میں گیلانی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے شادی بیاہ بلکہ ایک بچے کے باپ بننے کے بعد اسلامی علوم کی تحصیل شروع کی۔ مولانا نعمت اللہ سے مظفرپور میں متوسط درجے کی کتابیں پڑھیں۔ معقولات مفتی واجد علی بنارسی اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے پڑھیں۔ ہیئت و ہندسہ مفتی نعمت اللہ لکھنوی سے پڑھا۔ علم فقہ کی تحصیل مولانا اکبر علی رام پوری اور مولانا عالم علی نگینوی سے کی۔

فارغ التحصیل ہو کر "گیا" کے سرکاری مدرسے میں ملازمت کی اور وہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔ اس کے بعد گیلانی میں سکونت پذیر ہوئے اور علوم دینیہ کی تدریس میں مصروف رہے[۲۳] مولانا سید محمد احسن گیلانی سے استفادے کے لیے نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں حتیٰ کہ سرحد کابل تک کے طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد "گیلانی" جاتی تھی۔ بہار کے بعض جلیل القدر علماء، مثلاً مولانا رفیع الدین شکرانوی، مولانا عبد الغفور رمضان پوری، مولانا حکیم عبد السلام بھاگل پوری، مولانا حکیم دائم علی ٹونکی اور مولانا اسماعیل رمضان پوری، وغیرہ اسی درس گاہ سے اُٹھے تھے[۲۴] مولانا سید محمد احسن گیلانی ۱۳۰۱ھ/ ۸۴ - ۱۸۸۳ء میں فوت ہوئے اور وطنِ مالوف میں دفنائے گئے[۲۵]

---

[۲۲] معارف (اعظم گڑھ) بابت جولائی ۱۹۵۶ء، ص [illegible]

[۲۳] [illegible] کے مطابق مدرسہ عزیزیہ بہار شریف کے مدرس تھے۔

[۲۴] مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، حصہ اوّل، ص ۳۴۷ - ۳۴۸

[۲۵] نزہت الخواطر، جلد ۸ - ص ۴۰۷ - ۴۰۸

مولانا سید عبد الحی رائے بریلوی نے اُن کی تالیفات میں رسالہ در بحث وجود الطبی، حاشیہ علی حاشیہ بحر العلوم اور حل العقود (تصوف) کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا سید محمد احسن گیلانی نے اُردو میں ردِّ عیسائیت میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس رسالے کے آغاز میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

اب او پر دانش مندان خبیر و روشن دلان صافی ضمیر کے پوشیدہ نہ رہے کہ خادم الطلبہ محمد احسن ولد سید شجاعت علی بسنے والا متصل صوبہ بہار کا بارادہ تحصیل علم آوارہ از وطن ہو کر ۱۲۲۶ھ میں وارد شہر بنارس ہوا۔"[۵۶]

مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے ماہنامہ "ندیم" (گیا) بہار نمبر ۱۹۳۳ء میں بطور استفسار اس رسالے کو صوبہ بہار میں اُردو نثر کی پہلی کتاب کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اس موضوع پر تحقیق جاری رہی۔ بعد میں شاہ ظہور اللہ پھلواروی کا ایک مخطوطہ دست یاب ہوا جس میں "راہ نجات" یا "مفتاح الجنۃ" کے انداز سے دینیات کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ شاہ ظہور اللہ پھلواروی کی تالیف کو مولانا سید محمد احسن گیلانی کی تالیف پر تقدمِ زمانی حاصل ہے۔ اس طرح مولانا گیلانی کی تالیف صوبہ بہار میں اردو نثر کی دوسری کتاب ہے[۵۷]۔

مولانا سید محمد احسن گیلانی کی اولاد میں ان کی وفات کے وقت حافظ ابوالخیر کی عمر چودہ سال تھی۔ اس لیے وہ حفظِ قرآن اور فارسی کی تعلیم سے آگے نہ بڑھ سکے، گھر میں زمینداری کی طرف توجہ دی اور زندگی بھر ہل سہلگے کے بندوبست میں لگے رہے۔ یہی حافظ ابوالخیر، مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے والد ماجد تھے۔

اگرچہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے والدِ ماجد زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن اُن کے عم محترم سید ابوالنصر گیلانی درسِ نظامی کے فاضل تھے۔ درس و تدریس کم کرتے تھے، البتہ مطالعہ کتب میں مصروف رہتے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کی ابتدائی زندگی

مولانا سید مناظر احسن ۱۳۱۰ھ/ ۹۳-۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ "مناظر احسن" تاریخی نام ہے۔ انھوں نے مکتبی تعلیم کا آغاز اپنے عم محترم سید ابوالنصر سے کیا۔ اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے اور انگریزی کی

---

[۵۶] بحوالہ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ص ۳۸۳

[۵۷] مولانا سید محمد احسن گیلانی کی اس کتاب کے اہم مسائل اور حقائق پر اجمالی تبصرے کے لیے ملاحظہ ہو: جدید کلام۔ قدیم زبان میں (مناظر احسن گیلانی)، معارف (اعظم گڑھ) بابت جولائی ۱۹۳۵ء۔ ص ۱۲-۲۷، معارف (اعظم گڑھ)، اگست ۱۹۳۵ء

ایک دو ریڈریں پڑھنے کے بعد ٹونک چلے گئے۔ اُس وقت ان کی عمر تیرہ چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ ٹونک میں مولانا برکات احمد بہاری ثم ٹونکی[58] سے استفادہ کیا۔ مولانا ٹونکی سے ان کی رشتہ داری بھی تھی[59]۔
حکیم سید احمد اللہ ندوی کہتے ہیں:

"مولانا برکات احمد بہاری ثم ٹونکی کے والدِ ماجد مولوی حکیم دائم علی صاحب جو موضع گیلانی سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر موضع میر نگر کے رہنے والے تھے، مولانا محمد احسن کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر دولتِ علم سے مالا مال ہو کر ریاست ٹونک تشریف لے گئے اور وہاں معزز خدمت پر بحال ہو گئے۔ اس احسانِ عظیم کا حق ادا کرنے کے لیے مولوی حکیم دائم علی صاحب ... سے گیلانی تشریف لائے اور اپنے ساتھ مولانا مناظر احسن کو جو جوان ہو چکے تھے، ٹونک لے گئے اور اپنے حلقۂ درس میں شریک کر کے متداول درسیاتِ عربیہ سے فارغ کر دیا۔"[60]

مولانا سید مناظر احسن گیلانی، علامہ ٹونکی کے ذہین طلبہ میں شمار ہوتے تھے۔ ٹونک میں نو سال مقیم رہے۔ یہیں سمینہ (ملتان) کے عالم مولانا محمد اشرف[61] سے انھوں نے ادب میں مقاماتِ حریری، دیوانِ متنبی، حماسہ اور سبعہ معلقہ جیسی متداول کتابیں پڑھی تھیں۔ ریاضی، ہیئت اور ہندسہ کی تحصیل بھی ان ہی مولانا محمد اشرف سے کی تھی[62]۔
مولانا گیلانی ٹونک سے اجمیر گئے۔ کچھ عرصہ مولانا معین الدین اجمیری سے مذاکراتی استفادہ کیا اور واپس ٹونک آ گئے۔ دوسرے سال شوال ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء میں دورۂ حدیث کے لیے دارالعلوم دیوبند گئے۔
دارالعلوم دیوبند میں دو سال زیرِ تعلیم رہ کر سندِ فضیلت حاصل کی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن سے صحیح بخاری اور جامع ترمذی کا درس لیا۔ مولانا انور شاہ کاشمیری سے صحیح مسلم پڑھی۔ انھوں نے مولانا کاشمیری کی درسی تقاریر قلم بند کی تھیں جو بعد میں ضائع ہو گئیں۔

---

[58] یہ خیر آبادی سلسلۂ معقولات کے بلند پایہ عالم تھے۔ [59] مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں۔ ص ۴۰
[60] تذکرہ مسلم شعرائے بہار، جلد ۴، ص ۲۱۹
[61] مولانا محمد اشرف نے شاہی مسجد لاہور کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی۔ مولانا غلام محمد گھوٹوی کے تلامذہ میں سے تھے۔ فارغ التحصیل ہو کر مولانا برکات احمد ٹونکی سے فلسفہ و منطق کی بعض کتابیں پڑھی تھیں۔ اپنے علم و نظر کے پیشِ نظر مدرسہ خلیلیہ ... میں باضابطہ مدرس ہو گئے تھے، پڑھتے رہے اور پڑھاتے بھی رہے۔ [62] حیاتِ خود، ص ۳۵ (حاشیہ)، نیز اندازِ سخن، ص ۱۷۶

ملازمت

مولانا گیلانی نے دار العلوم دیوبند سے ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں سندِ فضیلت حاصل کی۔ اسی سا
اوّلین مادرِ علمی " مدرسۂ خلیلیۂ ٹونک " کے کتب خانے کی فہرست مرتب کرنے کی ضرورت محسو
اور اس کام کے لیے مولانا گیلانی سے رابطہ قائم کیا گیا۔ چنانچہ مولانا گیلانی پانچ روپے نواب شا
مشاہرے پر ملازم ہوگئے۔ دو ماہ بعد مدرسے میں مدرسی کی اسامی بھی نکل آئی اور پندرہ رو
پر اُن کا تقرر ہوگیا۔

سفرِ حیدر آباد

ٹونک میں کچھ عرصہ قیام کے بعد قسمت آزمائی کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ حیدر آباد د
مولانا انوار اللہ خان (معین المہام امورِ مذہبی) کے مدرسہ نظامیہ میں مقیم رہے۔ مولانا انوار
کے ہاں ابنِ عربی کی " فتوحاتِ مکیہ " کا درس ہوتا تھا اور حیدر آباد کے وجودی ذوق رکھنے والے
اس حلقے میں شریک ہوتے رہے تھے۔ مولانا گیلانی بھی اس حلقے کے ایک رکن بن گئے۔ ایک
نے مثنوی مولانا روم کے مباحث پر تقریر کی اور اہلِ حیدر آباد ان کی صلاحیتوں سے واقف
یہیں ملا مراد کابلی تاجر کتب (جو مثنوی مولانا روم کے شناسا تھے) سے تعارف ہوا۔ ان کی وساط
مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد سے ملاقات ہوئی۔ مہاراجہ بھی مولانا انوار اللہ خان کی طرح مولانا گیلا
ہوئے اور انھیں مستقلاً حیدر آباد میں قیام کرنے کا مشورہ دیا۔ حیدر آباد کے دو بااثر حضرات
قائم ہوجانے کے باوجود مولانا گیلانی نے حیدر آباد سے جلد نکل آنے کا فیصلہ کیا۔ خود لکھتے ہی

"خیال آتا کہ دین کی تعلیم میں عمر کا اتنا بڑا حصہ جو صرف ہوا۔ سیدنا شیخ الہند اور حضرت الاستاذ الامام
حلقہ ہائے درس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو سننے اور پڑھنے کا آخری انجام میرے۔
کہ ایک غیر مسلم امیر کی مصاحبت اور ندیمی میں اپنی زندگی گزاروں گا۔ یہ خیال میرے سامنے آتا او
دنیا مجھ پر تاریک ہوگئی"[۱۴]

---

[۱۳] ریاست ٹونک کا مقامی سکہ جو انگریزی روپے سے ایک چوتھائی کم تھا۔

[۱۴] دار العلوم (دیوبند)، بابت شعبان ۱۳۷۴ھ۔ ص ۳۴

حیدرآباد سے ایک رفیقِ درس سید مقبول احمد کے ساتھ گجرات کے شہروں، بردولی، راندیر اور احمد آباد کا سفر کرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند پہنچے۔

دارالعلوم دیوبند سے تعلق ملازمت

مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم نے مولانا گیلانی کو دارالعلوم میں تدریسی کام تفویض کیا اور اس کے ساتھ رسالہ "القاسم" اور رسالہ "الرشید" کی ادارت اُن کے ذمے کی۔ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء کی روداد میں انھیں "معین مدرسانِ عربی" کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے۔ ایک ماہ بعد ان کی تنخواہ تیس روپے ماہوار مقرر ہوئی اور ملازمت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ یہ تنخواہ ان کی ضروریات سے بہت کم تھی۔ اس بات کا اظہار انھوں نے مہتمم دارالعلوم سے بھی کیا مگر تنخواہ میں اضافہ کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس زمانے کے ایک خط میں مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

"انشاء اللہ تعالیٰ اس سال دیوبند ہی میں رہوں گا۔ تیس روپے سے زیادہ تنخواہ ملنی ناممکن ہے۔ کھانا بھی اب نہیں ہو سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ملاّؤں کے مدرسوں میں غایت سے غایت پچاس سے آگے نہیں مل سکتا اور میں اتنی تنخواہ کے لیے اپنے آرام کو قربان نہیں کر سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیوبند میں تو میرا جی نہیں لگتا۔"[۵۱]

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

مولانا گیلانی دارالعلوم دیوبند کی ملازمت سے مطمئن نہ تھے اور بہتر معاشی حالات کے لیے تگ و دو کر رہے تھے۔ اسی عرصے میں ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء میں "کلیہ جامعہ عثمانیہ" قائم ہوا۔ مولانا حمید الدین فراہی کے توسط سے "کلیہ جامعہ عثمانیہ" میں "استاد حدیث" کی حیثیت سے مولانا گیلانی کا تقرر ہو گیا۔ دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں نے ان کے حیدرآباد چلے جانے کی تائید کی اور اس طرح ۲۵۰/- روپے ماہانہ مشاہرہ پر وہ حیدرآباد چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد مولانا گیلانی "دینیات لازمی" کے استاد ہو گئے۔ "دینیات لازمی" کے سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ "کلیہ جامعہ عثمانیہ" میں انگریزی کی طرح دینیات بھی ایک لازمی مضمون تھا اور حنفی المسلک طلبہ کے لیے اس میں کامیابی لازمی تھی۔ غیر حنفی اور ہندو طلبہ "دینیات لازمی" کی جگہ "اخلاقیات" کا پرچہ دیتے تھے۔

---

۵۱ مکاتیبِ گیلانی، ص ۸۶

مولانا گیلانی نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ "جامعہ عثمانیہ" میں گزارا۔ آخری زمانے میں صدر شعبہ کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ ۳۱ مارچ ۱۹۴۹ء (بعد ظہر) / ۱۱ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۹ھ کو وظیفۂ حسنِ خدمت (پنشن) حاصل کیا[۱۶]

تقسیم ہند کے بعد حالات خاصے بدل چکے تھے اور سیکولر نظامِ حکومت میں "دینیاتِ لازمی" کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی تھی۔ اس کی جگہ "شعبہ اسلامیات" قائم کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ ۱۹۴۸ء کے پولیس ایکشن کے بعد نواب علی یاور جنگ (م ۱۱ ستمبر ۱۹۷۶ء) دوبارہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے تو انھوں نے "شعبہ دینیات لازمی" کی جگہ "شعبہ تقابل ادیان" قائم کرنے کا منصوبہ پیش کیا اور مولانا کو صدر شعبہ کی حیثیت سے کام کرنے کی پیش کش کی مگر وہ "شعبہ دینیات لازمی" کی موت پر رضامند نہ ہوئے اور سبک دوش ہو جانا ہی مناسب خیال کیا۔ جناب بدر شکیب، مولانا گیلانی کی تدریس کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> (مولانا کی) تفہیم کا طریقہ انتہائی دلکش تھا اور دقیق مسائل ایسے عام فہم انداز میں تشبیہات اور استعاروں کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ ان کی وجہ سے طلبہ میں مذہب سے شیفتگی میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔
>
> جامعہ عثمانیہ کے سارے سنی عقائد رکھنے والے طلبہ کی زندگیوں پر مولانا مناظر احسن گیلانی کی تعلیم اور ان کے خطبات کا بڑا اثر ہے۔ بعض طلبہ نے جنھیں شعبۂ دینیات سے کوئی تعلق نہیں تھا محض مولانا کے فیض صحبت میں دینی علوم میں ایک اونچا معیار حاصل کر لیا۔ مولانا مناظر نے اپنے طلبہ میں مذہبی مسائل پر تحقیقات اور تصنیف و تالیف کا ذوق بھی پیدا کیا۔[۱۷]

مولانا گیلانی جامعہ عثمانیہ کے مقبول استاد تھے۔ یونیورسٹی کی سینٹ ان کے وجود کو قیمتی خیال کرتی تھی اور مدتِ ملازمت میں توسیع کا امکان تھا مگر سقوطِ حیدر آباد کے بعد دنیا بدل گئی اور مولانا بدلے ہوئے حالات میں دل برداشتہ ہو کر مدت کے دن پورے کرتے رہے۔

حیدر آباد کی زندگی

مولانا گیلانی نے ۱۵ جنوری ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں لکھا ہے کہ "یہ کور نصیب گو حیدر آباد میں پیدا نہیں ہوا تھا مگر میرے جسم میں جو کچھ ہے حیدر آباد ہی کا ہے۔ اب بھی حیدر آباد ہی میرے سدِ رمق کا ذریعہ

---

۱۶ مکاتیب گیلانی

۱۷ سرگزشت جامعہ عثمانیہ، ص ۱۸۴

ہے، پھر اپنی محبوب تعلیم گاہ ہے۔ ہماری جامعہ عثمانیہ جس میں میرے دماغ و دل نے آنکھیں کھولیں، اسی کے ماحول میں میری پرورش ہوئی ۱۸

مولانا گیلانی کم و بیش تیئیس سال حیدرآباد میں مقیم رہے تھے۔ اہل علم و فن سے ان کے مراسم تھے اور ان کے عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ مولانا حمید الدین فراہی سے صحبت رہتی تھی اور مطالعۂ قرآن کا ذوق اس ہم نشینی سے راسخ ہوا۔ مولانا گیلانی کے طرزِ فکر اور اعتدال نظر میں فراہی اثر جھلکتا ہے۔ نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان شروانی بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ ان سے اشتراک ذوق تھا اور ہر سال میلاد کی محفلوں کی جان حبیب الرحمٰن خان شروانی اور مولانا گیلانی ہی ہوتے تھے۔ سکندرآباد میں خطبہ جمعہ دیتے تھے اور عید کی نماز بھی وہی پڑھاتے تھے۔

مولانا گیلانی دورانِ طالب علمی میں شیخ الہند مولانا محمود حسن سے بیعت ہوئے تھے مگر تعلیمی مشاغل نے روحانی تربیت کے لیے مواقع نہ دیے اور حضرت شیخ الہند کا انتقال ہوگیا۔ حیدرآباد میں مولانا محمد حسین صاحب ایک صاحب حال و قال بزرگ تھے، اُن سے تعلق ارادت تھا۔ انھوں نے مولانا گیلانی کو اپنا خلیفہ بھی نامزد کر دیا تھا۔ ۱۹ حیدرآباد میں ایک بغدادی بزرگ "حبیب العیدروس" مقیم تھے، اُن سے قادری سلسلے میں تعلق تھا اور حبیب العیدروس نے بھی خلافت کے شرف سے نوازا تھا۔

مولانا تصوف میں شیخ اکبر ابن عربی کے حالاً و قالاً ترجمان تھے۔ اُن کے مضامین اور متصوفانہ تصنیفات میں "فتوحاتِ مکیہ" اور "فصوص الحکم" کی جھلک نظر آتی ہے۔

گیلانی کا زمانۂ قیام

مولانا گیلانی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے الگ ہو کر اپنے وطنِ مالوف میں مقیم ہوئے۔ یہ ان کی "تنہائی" کا دور تھا اس لیے وہ اس زمانۂ زندگی کو "کہفی دور" کہتے تھے۔ ۱۵ فروری ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"حیدرآباد سے نکلنے کے بعد جس کہفی گوشہ میں آخری پیغام کا منتظر بن کر بیٹھ گیا ہوں، وہاں سے باہر جانے کا موقع اس چار پانچ سال کے عرصے میں مشکل ہی سے آیا۔ صرف سید الملت ۲۰ کی خاطر سے ایک دفعہ اعظم گڑھ دارالمصنفین گیا تھا اور

---

۱۸ مکتوب بنام غلام محمد بینات (کراچی)، ج ۳، نمبر ۵، ص ۲۸

۱۹ مکاتیب گیلانی، ص ۲۳۴ ۲۰ سید سلیمان ندوی مرحوم

گزشتہ ماہ جنوری میں ان کے جلسۂ ماتم میں شریک ہونے کے لیے لکھنؤ حاضر ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ ایک اُجڑا گاؤں جہاں چند گنواروں کے سوا کسی شریف صورت پر نظر نہیں پڑتی، پڑا ہوا ہوں۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے لسانی قوت سے محروم ہو چکا ہوں، جہاں تک بس چلتا ہے قلم سے کچھ گھسیٹ لیتا ہوں [۱۲۴]

سید سلیمان ندوی کے جلسۂ ماتم میں شریک ہو کر گیلانی پہنچنے کے دوسرے یا تیسرے روز ان کے مکان پر چوروں نے حملہ کیا اور جو کچھ اسباب لے جا سکتے تھے لے کر روانہ ہوئے اور بقول مولانا گیلانی "صبح کو جب آنکھ کھلی تو آنکھیں کھل گئیں [۱۲۵]

۱۹۵۲ء کے آخر میں مولانا گیلانی کو دل کا دورہ پڑا، مگر فوری علاج معالجے سے افاقہ ہو گیا۔ چند ماہ بعد دوسری بار دورہ پڑا جو اس قدر شدید تھا کہ ڈاکٹروں نے ان کے لکھنے پڑھنے پر کامل پابندی لگا دی۔ اس کے بعد تندرستی اور بیماری میں مسلسل کش مکش چلتی رہی حتیٰ کہ پیام اجل آگیا۔ ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں اپنی صحت کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ نیاز مند مناظر احسن گیلانی علالت کی مختصر منزلوں سے گزرتا ہوا، اب ایک خاص نقطہ پر پہنچ کر ٹھہر گیا ہے۔ نہ بیمار ہی ہے اور نہ تندرست۔ چاہیے تو یہی تھا کہ اپنے پیش روؤں کے ساتھ اب تک شریک ہو جاتا لیکن بقول اکبر مرحوم:

کمزور ہے میری صحت بھی، کمزور ہے میری بیماری
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا، بیمار پڑا تو مر نہ سکا" [۱۲۶]

گیلانی کے زمانۂ قیام میں انھیں یہ شدید احساس تھا کہ وہ "صحبتِ ناجنساں" میں پھنس گئے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ بھی نہیں، زندگی بھر اہلِ علم و دانش کے درمیان رہنے والا شخص ایک ایسے گاؤں میں رہ رہا تھا جہاں نہ کوئی کالج تھا نہ ہائی سکول۔ نہ کوئی پڑھا لکھا شخص تھا اور نہ ہم ذوق۔ تاہم اپنے دیہہ کی ضروریات کی خاطر اپنے حلقۂ احباب سے فرمائشیں کرتے رہتے تھے۔ کبھی کسی کو آموں کی قلمیں منگوا کر دیتے اور کسی کے لیے دوا دارو کا بندوبست کر دیتے۔

---

۱۲۴ مکتوب بنام غلام محمد "بینات" (کراچی)، جلد ۲، نمبر ۵، ص ۲۸۱

۱۲۵ مکتوب بنام غلام دستگیر رشید۔ صحیفہ (لاہور) بابت مئی۔ جون ۱۹۶۹ء، ص ۲۷

۱۲۶ مکتوب بنام غلام محمد۔ بینات (کراچی)۔ جلد ۲، نمبر ۵، ص ۲۸۴

وفات

مولانا گیلانی آخری دنوں میں بہت کمزور ہو گئے تھے۔ جگر، معدہ اور قلب سب ہی ماؤف تھے تاہم قوت ارادی انھیں متحرک رکھے ہوئے تھی۔ ۴ر جون ۱۹۵۶ء کو انھوں نے نہایت پُرمسرت دن گزارا۔ تمام الماریوں کی کتابیں خود سجائیں۔ بچوں کو قصہ کہانی سناتے رہے اور اپنے بھانجے سے فانی بدایونی کی غزل سننے کی فرمائش کی۔ جب یہ شعر پڑھا گیا:

سنے جاتے نہ تھے تم سے میرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ، مری بے زبانی دیکھتے جاؤ

تو ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ بہت روئے اور موت پر باتیں کرتے رہے۔ دوسرے روز صبح چار بجے دل کا دورہ پڑا، افاقہ ہوا، نماز ادا کی اور لیٹ گئے۔ عالم خواب میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

اسی روز ۵ر جون ۱۹۵۶ء/ ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ کو بعد نماز ظہر نماز جنازہ ہوئی اور گیلانی میں دفنائے گئے۔

اولاد

مولانا گیلانی کی اولاد میں ایک صاحب زادے محی الدین اور ایک صاحب زادی ہیں۔ جناب محی الدین گیلانی جدید پڑھے لکھے آدمی ہیں اور پاکستان میں مقیم ہیں۔ صاحب زادی کی شادی، مولانا مرحوم کے بھائی مکارم احسن کے صاحب زادے سے ہوئی تھی۔

تصنیف و تالیف

مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز رسالہ "القاسم" (دیوبند) سے کیا اور آخر مولانا محمد قاسم نانوتوی کی مفصل سوانح حیات کی چوتھی جلد کے لکھتے ہوئے اپنے مولیٰ سے جا ملے۔ برصغیر پاک و ہند کا کوئی وقیع علمی و دینی رسالہ ایسا نہیں جس کے صفحات ان کی قلم کاریوں سے رنگین نہ ہوں۔ دینی موضوعات میں سے کم ہی ایسے ہوں گے جو ان کی جولان گاہ فکر میں نہ تھے۔ انھوں نے حدیث و فقہ، تاریخ و سوانح، معاشیات و سیاسیات، فلسفہ و تصوف اور عقائد و کلام سب ہی موضوعات پر لکھا ہے، اور خوب لکھا ہے۔

مولانا گیلانی نے ہزارہا صفحات لکھے۔ درجن بھر کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں مگر ایک دو کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب انھوں نے باضابطہ طور پر نہیں لکھی۔ ایک خط میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

یہ آپ نے خوب لکھا ہے کہ میں مینہ برسا رہا ہوں۔ سچ عرض کرتا ہوں، لکھنے کے لیے فقیر نے اب تک خود کچھ نہیں لکھا ہے جو کچھ بھی ہوجاتا ہے۔ کوئی سر پر سوار ہو کر لکھوا لیتا ہے یا اسی قسم کی کچھ مجبوریاں پیش آجاتی ہیں[۱۲۴]

مولانا موصوف کو کسی گوشے سے تحریک ہوتی یا ان کے الفاظ میں کوئی "مجبوری" پیش آتی تو لکھنے بیٹھے اور صفحات پر صفحات لکھتے چلے گئے۔ وہ خود اپنے لکھے ہوئے پر نظرِ ثانی نہیں کرتے تھے۔ یہ فریضہ ان کے شاگرد اور مخلص احباب انجام دیتے تھے یا ناشر اپنے طور پر ترتیب و تدوین کرالیتے تھے۔ اپنے اندازِ تحریر کے بارے میں مولانا گیلانی نے لکھا ہے۔

ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھا تو لکھتا چلا گیا۔ اب پھر اس پر نظرِ ثانی، حک و اصلاح میرے لیے مشکل ہے[۱۲۵]

اسی اندازِ تحریر کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں تصنیفی منصوبہ بندی یا ترتیب نہیں پائی جاتی۔ اکثر لکھتے لکھتے موضوع سے ہٹ جاتے ہیں اور درجنوں صفحات ضمنی بحثوں میں چلے جاتے ہیں۔ ایک بات سے دوسری بات نکال لیتے ہیں اور اس پر خامہ فرسائی کرتے کرتے بہت دور نکل جاتے ہیں اور جب کئی صفحات کے بعد دوبارہ اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں تو اس وقت تک قاری عموماً سلسلۂ مضمون بھول چکا ہوتا ہے۔ اسی طرح جملوں کی نشست و برخاست اور تراش خراش کے قائل نہیں بعض اوقات قواعد کو بھی خاطر میں نہیں لاتے جو لفظ قلم سے نکل گیا اُسے کاٹ کر دوسرا نہیں لکھا۔ بعض اوقات عبارت کے درمیان میں جملہ معترضہ شروع کیا اور وہ اتنا طویل ہوا کہ جملے کا باقی حصہ کہیں درمیان ہی میں دم توڑ گیا۔

اندازِ تحریر کی اس ژولیدگی کے باوجود ان کی تحریریں نقطۂ نظر کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ مولانا گیلانی نے بڑا نقطہ آفرین ذہن پایا تھا اور حالات و واقعات سے اخذ و استنباط کی بے پایاں صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ اپنی تالیفات میں جس قدر مواد اکٹھا کر دیتے ہیں وہ کسی دوسری کتاب میں یک جا نہیں ملتا اور اکثر ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جن کی طرف عام آدمی کا ذہن کبھی منعطف نہیں ہو سکتا۔ مولانا عبد الباری ندوی مرحوم نے ان کے اندازِ تحریر و تالیف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

---

۱۲۴ معارف (اعظم گڑھ) جلد ۹۰، نمبر ۴، ص ۲۹۷ — مکاتیب گیلانی، ص ۲۶۸

۱۲۵ مکتوب بنام سید سلیمان ندوی۔ معارف (اعظم گڑھ)، جلد ۹۱، نمبر ۳، ص ۲۲۲/ مکاتیب گیلانی، ص ۲۵۱

"مولانا گیلانی کے پاس ماشاء اللہ خیالات، معلومات اور تعبیرات سب کی اتنی بہتات ہے کہ وہ بارہا خود اس میں کھو جاتے ہیں۔ تاہم ان کے افادات میں استفادہ کا بڑا سرمایہ ہوتا ہے اور بیان کی مستی اور کیف بھی مخاطب پر وجد طاری کیے بغیر نہیں رہتی۔ باقی یہ بہرحال سچ ہے کہ ان کا اسٹائل سائنٹیفک نہیں پھر بھی لوگ پڑھتے رغبت و توجہ سے ہیں۔"[۱۳۵]

---

۱۳۵ اندازِ سخن، ص ۱۸۶، ۱۸۷

تحریر :۔ پروفیسر محمد علم الدین سالک
ترتیب :۔ پروفیسر احسان الٰہی سالک

ہندوستان عہدِ عالمگیری میں

ایک انگریز سیاح کے تاثرات

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں اورنگ زیب عالم گیر کے خلاف غیر مسلم مورخین نے اکثر زہر چکانی کی ہے۔ وہ اسے متعصب، تنگ نظر اور زاہد خشک ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُسے ہندوؤں سے نفرت تھی۔ وہ عیسائیوں کو ایک آنکھ دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ غیر مسلم اہل کاروں کو نکال نکال کر ان کی جگہ مسلمانوں کو بھرتی کرتا تھا۔ اس نے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو بند کیا، مندروں کو توڑا، ہندوؤں پر جزیہ لگایا اور انھیں طرح طرح کی ایذیتیں دے کر ان پر عرصہ حیات تنگ کیا۔ غرض اس قسم کے بیسیوں الزام ہیں جو اورنگ زیب عالم گیر کو بدنام کرنے کے لیے تراشے جاتے ہیں۔

اس معاملے میں مہاراشٹر کا تاریخ کدہ (پونا) سب سے پیش پیش ہے، وہاں سے آئے دن کوئی نہ کوئی نئی بات پیدا ہو جاتی ہے اور اخبارات، سینما اور خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعے سارے ہندوستان میں پھیلادی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اورنگ زیب درحقیقت ایسا ہی تھا جیسا کہ غیر مسلم مورّخ اسے پیش کرتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر یہ غوغا آرائی کیوں ہے؟ کیا یہ ناانصافی نہیں کہ اسے محض اس جرم کی پاداش میں بدنام کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کی پابندی بڑی سختی کے ساتھ کرتا تھا، اور یہ بات دور لامذہبیت کے مورخین کو ہرگز پسند نہیں۔

اورنگ زیب کیسا تھا؟ اس کے عہدِ حکومت میں ملک نے کتنی ترقی کی؟ رعایا کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ ہوتا تھا؟ تجارت، تعلیم، صنعت و حرفت، عدل و انصاف اور عام اخلاقی حالت کا نقشہ کیا تھا؟ ملک کے باشندوں کے باہمی تعلقات کی کیفیت کیا تھی؟ بادشاہ کا سلوک دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ کیا تھا؟ ان سب سوالات کا جواب ہم ایک انگریز سیاح کے سفرنامے سے پیش کرتے ہیں۔

بنیا قوم ۸۵ فرقوں میں منقسم ہے، وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے۔ لیکن باہمی میل جول رکھتے ہیں۔ برہمن ان لوگوں کو اکثر ترغیب دلاتے رہتے ہیں کہ وہ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے بڑی بڑی جائیدادیں دان کریں۔ یہاں پارسی لوگ بھی رہتے ہیں، وہ اپنی مذہبی رسوم زرتشت کے احکام کے مطابق ادا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو گرجے بنانے کی عام اجازت ہے۔ وہ عیسائیت کی تبلیغ بھی کرتے ہیں اور بعض دفعہ اس میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ عیسائیت اختیار کرتے ہیں وہ ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

سورت کو اس زمانے میں وہی درجہ حاصل تھا، جو آج کل بمبئی کو ہے، ہر ملت کے لوگ وہاں پائے جاتے تھے۔ مسلمان حج کے لیے بھی اس بندر سے جاتے تھے۔ کپتان الیگزنڈر ہملٹن اس کے متعلق لکھتا ہے کہ اس شہر میں سو مختلف مذاہب کے پرستار رہتے ہیں۔ ان میں اعتقادات اور طریق عبادت کے اختلاف پر کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ ہر شخص کو پورا پورا حق ہے کہ وہ جس طرح چاہے اور جس طریقے پر چاہے پرستش کرے۔ صرف اختلافِ عقائد کی بنا پر کسی کو تکلیف دینا ان لوگوں میں جائز نہیں ہے۔

یہ اسی رواداری کا نتیجہ تھا کہ تیموری بادشاہوں کا احترام آخری ایام تک ہوتا رہا، یہاں تک کہ جب ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے متفق ہوکر ایسٹ انڈیا کمپنی کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے اتارنا چاہا اور ایک شخص کو اپنا بادشاہ منتخب کرنے کا ارادہ کیا تو سب کی نظریں ابوظفر بہادر شاہ پر پڑیں اور اسے متفقہ طور پر اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔ تیموری متعصب اور تنگ نظر ہوتے تو انھیں ہر دلعزیزی حاصل نہ ہوتی۔

اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان کی تجارت بڑے زوروں پر تھی۔ یہاں کا مال یورپ اور ایشیا کی منڈیوں میں جاکر فروخت ہوتا تھا اور سر جادو ناتھ سرکار کے قول کے بموجب "فقط دہ خیبر سے ۴۴ ہزار اونٹ ہندوستانی مال سے لاد کر ایشیا کی مختلف منڈیوں میں بھیجتے تھے۔" مرفع الحالی تھی۔ کپتان ہملٹن سورت کے ایک سوداگر عبدالغفور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"اس کا سرمایۂ تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرمائے کے برابر تھا۔ وہ ہر سال قریباً بیس جہاز سامان سے بھر کر ہندوستان کے باہر بھیجتا۔ ہر جہاز تین سو سے لے کر آٹھ سو ٹن تک کا ہوتا تھا۔ کسی میں دس ہزار پاؤنڈ، کسی میں پچیس ہزار پونڈ کا مال ہوتا تھا۔ اس قدر مال باہر بھیجنے کے بعد بھی اس کے پاس اتنا سرمایہ بچ رہتا کہ کوئی اس کا مقابلہ نہ کرسکتا۔

ایک اور جگہ لکھتا ہے:

ہندوستان والوں کے پاس بڑے بڑے عمدہ جہاز ہیں، جن پر وہ انگریز ملاحوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دے کر کپتان اور میٹ کی حیثیت سے ملازم رکھتے ہیں۔

اس زمانے میں مالابار میں ایک قوم آباد تھی جو براعظم یورپ کو مچھلیاں بھیجا کرتی تھی۔ لوہا، جواہرات، خوب صورت چھینٹ، مختلف اقسام کے کپڑے اور مکھن بھی عام طور پر ہندوستان سے یورپ کو جاتا تھا۔ کپتان مذکور ہندوستان کے کپڑے کی خاص طور پر تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے:

ہندوستان کا کپڑا اتنا اعلیٰ، نفیس اور عمدہ ہوتا ہے کہ اس کی مانگ نہ صرف یورپ میں ہے، بلکہ پیگو، سماٹرا اور دیگر مقامات میں بھی ہے۔

جنوبی ہند میں بعض راجے اور خود مختار حکمران جہازوں سے خفیف سا ٹیکس وصول کرتے تھے۔ کپتان صاحب نے اس کی شکایت ایک راجے سے کی۔ راجے نے جواب میں اُسے کہا کہ فرض کرو کہ ہمارے ملک کے تاجر ولایت میں تجارت کرنے کے لیے جائیں تو کیا ان سے کوئی ٹیکس وصول نہ کیا جائے گا۔ کپتان صاحب اس پر خاموش رہے۔ راجے نے پھر کہا کہ ہم تمھارے مال اور جان کی حفاظت کرتے ہیں، اگر اس کے صلے میں تھوڑا سا ٹیکس بھی وصول کرلیں تو تمھیں شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

شاہی علاقے سے مسلمان تاجروں سے دو فیصدی اور عیسائی تاجروں سے تین فیصدی ٹیکس لیا جاتا۔ مسلمانوں کو اس کے علاوہ ایک اور ٹیکس بھی دینا پڑتا تھا جو پانچ فیصدی تھا۔ اس ٹیکس کو کپتان ہملٹن "پول ٹیکس" کے نام سے یاد کرتا ہے۔

کپتان ہملٹن کے بیان سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اورنگ زیب کے ابتدائی دورِ حکومت میں بدیشی مالِ تجارت پر ٹیکس اس وقت وصول کیا جاتا تھا، جب وہ مال فروخت ہو جاتا تھا۔ سال کے آخر میں حساب کیا جاتا تھا اور تاجروں کے بیان پر اعتبار کر کے مقررہ شرح سے ٹیکس کی رقوم متعین کرلی جاتی تھیں۔ مگر غیر ملکی تاجروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں کی بددیانتی سے مجبور ہو کر بعد میں ٹیکس وصول کرنے کا وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو بعد میں انگریزی عملداری میں رائج ہوا۔

اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں ہندوستانی تجارت کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور دنیا کا کوئی ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ صرف شہر سورت میں چونگی کی سالانہ آمدنی تیرہ لاکھ روپے

اور احمد آباد کی ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ تھی بنگال کی تجارت [illegible]
چنانچہ کپتان ہملٹن اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں :

ہمارے ہگلی کے کنارے پچاس یا ساٹھ جہاز ہندوستانی مال سے لدے ہوئے بیرونی ممالک [illegible]
کشتیوں کے ذریعے دور دراز علاقوں میں جمع کر لیا جاتا تھا۔ اس مال میں زیادہ تر سرچ ، سوتی ، ریشمی [illegible]
کپڑا ہوتا تھا۔

اس سے باقی ساحلوں کی تجارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

کپتان ہملٹن نے ہندوستانی اشیا کی ارزانی پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا ہے ، وہ لکھتا ہے کہ
"لوگ خوشحال ہیں ، ملک میں امن ہے اور بیف (گائے کا گوشت) تین فارو تنگ (چند کوڑیاں) میں [illegible]
سیر مل جاتا ہے ۔ ایک ٹن نمک ایک کراؤن میں فروخت ہوتا ہے ۔ (کراؤن دو ڈھائی روپے کے برابر ہوتا ہے)
ساحل کارومنڈل پر ساڑھے تین آنے میں بیس پونڈ (دس سیر) مچھلی مل جاتی ہے ۔ یہ مچھلی [illegible]
فراوٹ اور سامن سے کسی صورت میں کم نہیں ۔ خیر کنک نصف سیر مکھن ایک آنے میں ملتا ہے ۔ دو آنے [illegible]
مچھلیاں فروخت ہوتی ہیں ۔ یہ اتنی بڑی بڑی ہوتی ہیں کہ صرف دو مچھلیوں سے ایک آدمی کا پیٹ بھر جاتا ہے [illegible]
میں اناج اور دیگر اشیائے ضرورت بڑی سستی ملتی ہیں ۔ اگر ان کی قیمت بیان کی جائے تو اس پر یقین [illegible]
ملک بے حد آباد ہے ۔ مجھے ایک شخص نے بتایا کہ یہاں پانچ سو اسی پاؤنڈ چاول ایک روپے میں ملتے ہیں ۔ یہ شخص
یہاں ایک موسم سرما بسر کر چکا ہے ۔ ہرن اور بارہ سنگھے بڑی کثرت سے ملتے ہیں اور لوگوں کے گھروں میں بلا
خوف و خطر آجاتے ہیں ۔ احمد آباد بہت بڑا شہر ہے اور دولت و ثروت میں یورپ کے کسی شہر سے کم نہیں ۔
اس کی سالانہ آمدنی ۱۲ لاکھ پچیس ہزار پونڈ ہے جو سورت کی سالانہ آمدنی سے دس گنا زیادہ ہے ۔"

ملک کی خوشحالی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حکومت اپنی توجہ صنعت و حرفت کی طرف مبذول
کر رہی تھی ۔ جب ملک میں امن و امان ہو ، حکومت کی توجہ ترقی کی طرف ہو تو پھر لوگ خوشحال
کیوں نہ ہوں ۔ کپتان ہملٹن نے بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ہندوستانی صنعت و حرفت کی
ترقی کا ذکر کیا ہے ۔ مثلاً وہ ڈھاکہ کی مشہور ململ کے متعلق لکھتا ہے کہ "یہاں [illegible]
کپڑا تیار ہوتا ہے اور بڑی کثرت سے ملتا ہے ۔ ایسے کپڑے کی مثال [illegible]
یہاں سوتی کا ایک ایسا کپڑا تیار ہوتا ہے جو بہت ہی باریک [illegible]

ایک اور رئیس کی خوش اخلاقی کا ذکر کرتے ہوئے کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ: " میں نے کچھ کپڑا ایک قالین، اور دو چھوٹی چھوٹی بندوقیں تحفے کے طور پر اس کی خدمت میں پیش کیں۔ وہ بہت خوش ہوا اور اس نے اپنی کلائی سے اسی وقت ایک زیور جو جواہرات سے مرصع تھا اتار کر مجھے پہنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے اس امر کی اجازت دی کہ میں اس کی ریاست میں جہاں چاہوں جاؤں اور تجارت کروں، میرے لیے کوئی روک نہ ہوگی۔

جب کپتان صاحب ایک قافلے کے ساتھ سورت پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے ان کی آؤ بھگت کی اور جب وہ سورت کے ناظم سے ملنے کے لیے گئے تو اس نے خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا اور ایک گائے، پانچ بھیڑیں، پانچ بکریاں، بیس مرغ، پچاس کبوتر، بہت سی مٹھائی اور پھل دعوت کے طور پر کپتان کی منزل پر بھیج دیے۔

غرض یہ کہ اس قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن کا ذکر کپتان نے کیا ہے۔ ان واقعات سے پتا چلتا ہے کہ اہلِ ہند بے حد مہمان نواز ہیں اور وہ اجنبیوں کی خاطر و مدارات کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔

ہندوستان کی ایک اور خصوصیت جس کا ذکر کپتان صاحب نے خوب مزے لے لے کر کیا ہے وہ یہاں کا امن و امان اور بادشاہ کی انصاف پروری ہے۔ تیموریوں میں یوں تو ہر بادشاہ انصاف پرور اور رعیت نواز ہوا ہے، مگر اورنگ زیب ان سب میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس کی رعایا نوازی اور انصاف پروری کا اعتراف دوست اور دشمن سب نے کیا، وہ بڑا باخبر تھا اور سلطنت کے چھوٹے چھوٹے امور پر نظر رکھتا تھا۔ اس نے جا بجا جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو ہر قسم کی خبریں اسے پہنچاتے تھے۔ کوئی عامل رعایا پر ظلم کرتا تو اُسے جھٹ اطلاع مل جاتی اور وہ اس کی گوشمالی کرتا، کوئی ناظم کسی کو اذیت پہنچاتا یا اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتا تو بادشاہ اس کی سرزنش کرتا۔ کپتان صاحب ان تمام حقیقتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

" اورنگ زیب کے زمانے میں ڈاک کا انتظام اتنا مکمل تھا کہ دور دور کے علاقوں کے خطوط چند یوم میں دہلی پہنچ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ سلطنت کی آخری سرحد کی خبریں اور اطلاعیں آٹھ دن کے اندر اندر پایۂ تخت میں مل جاتیں۔ ہرکارے ہر پانچ میل کے بعد بدل جاتے تھے۔"

کپتان صاحب اپنے اس سفرنامے کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ: "ہندوستان میں عدل وانصاف کا سرچشمہ سکون کے ساتھ جاری ہے اور اس کے صاف وشفاف دھارے کو بعض اوقات رشوت کے خس وخاشاک گدلا کر دیتے ہیں لیکن سیاہ فام ہندوستانیوں میں رشوت ستانی اتنی نہیں جتنی کہ سفید فام یورپینوں میں ہے۔"

پھر ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ: "اس ملک کی رعایا شاہی فرامین کی دل سے اطاعت کرتی ہے۔ یہاں قتل اور ڈاکے کی خبریں بہت کم سننے میں آتی ہیں۔ ایک غیر ملک کا رہنے والا کہیں چلا جائے، اس سے کوئی بھی نہیں پوچھے گا کہ وہ کہاں جاتا اور کیوں جاتا ہے۔"

اورنگ زیب کی امن پروری کے متعلق کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ: "اورنگ زیب کو امن وامان کا بہت خیال تھا۔ جب کبھی کسی علاقہ میں یا مقام پر ڈاکہ زنی کی واردات ہوتی تو وہ اس کی تمام ذمہ داری صوبے کے عامل پر ڈالتا۔ ایک مرتبہ اورنگ زیب کو اطلاع ملی کہ سورت میں ڈاکہ پڑا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ شہر کے گرد فوراً دیوار بنادی جائے۔"

البتہ کپتان صاحب اس بات کی شکایت ضرور کرتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہازوں کے افسر بعض اوقات راہ میں قزاق بن جاتے ہیں اور جو تجارتی مال راستے میں انھیں ملتا ہے لوٹ لیتے ہیں۔

اس سلسلے میں کپتان صاحب نے ایک انگریز کپتان گرین کا ذکر خاص طور پر کیا ہے جو انگلستان سے اتنا مختصر سامان لے کر نکلتا تھا کہ کسی دوسرے آدمی کو اتنے سامان سے سفر کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ راستے میں جو جہاز اسے ملتا وہ اسے لوٹ کر غرق کر دیتا تھا۔ اس کی تجارت اکثر بحری ڈاکوؤں سے تھی، اورنگ زیب نے اس قسم کی وارداتوں کو روکنے کے لیے ڈنڈا راجا پور میں فوجی جہازوں کا ایک بیڑہ متعین کیا، جس کا امیر البحر مہدی خان تھا۔ اس کے ماتحت تیس یا چالیس ہزار آدمی تھے۔

کپتان صاحب کے سفرنامے کا بقیہ حصہ ان واقعات پر مشتمل ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی اور یورپین تاجروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں انھوں نے اورنگ زیب کے اس شریفانہ سلوک کی تعریف کی ہے جو انھوں نے یورپین تاجروں سے روا رکھا اور ساتھ ہی ان بدعہدیوں کا ذکر بھی کیا ہے جو کمپنی والوں نے شاہی عمال سے کیں۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے جس پر اس وقت بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ "ہندو کش، ظالم" اور "ستم گر" اورنگ زیب

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عن المغیرۃ بن شعبۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، قال ان اللہ حرم علیکم عقوق الامھات ومنعا وھات ووأد البنات، وکرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال (صحیح بخاری، کتاب الآداب، باب عقوق الوالدین من الکبائر)

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام قرار دیا ہے، ماؤں کی نافرمانی کو، کسی کو کچھ نہ دینے کو، سوال کرنے کو اور لڑکیاں زندہ دفن کر دینے کو۔ نیز تمہارے لیے اس نے مکروہ ٹھہرا دیا ہے، غیر محتاط طریقے سے باتیں کرنے کو، کثرت سے سوال کرنے کو اور مال ضائع کرنے کو۔!

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی آداب و اخلاق کی چند نہایت ضروری اور بنیادی باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ نے چار چیزیں حرام قرار دے دی ہیں، ان سے بہرحال بچنا چاہیے اور اپنے عمل کو کسی صورت میں بھی اس کے ارتکاب سے ملوث نہیں کرنا چاہیے۔

پہلی بات جس کو اللہ نے انسان پر حرام قرار دیا ہے، ماں کی نافرمانی ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بچپن سے لے کر بڑی عمر تک انسان کی یہ عادت ہوتی ہے کہ والد کی بات کو مانتا ہے، لیکن ماں کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کوئی کام کہے تو اس پر عمل کرنے میں سستی کرتا ہے، حالانکہ حدیث میں ماں کی فضیلت بہت زیادہ بیان فرمائی گئی ہے۔ یوں تو ماں اور باپ دونوں کا اکرام ضروری اور دونوں کے زیر فرمان رہنا لازم ہے لیکن ماں کے بارے میں بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جنت ماں کے قدموں میں ہے، یعنی حصول جنت کا اصل ذریعہ ماں کی خدمت ہے۔

پھر صحیح بخاری کے کتاب الآداب کے باب من احق الناس بحسن الصحبۃ میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یارسول اللہ! میرے لیے

سب سے زیادہ حسنِ سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں! اس نے عرض کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں!! اس نے تیسری دفعہ عرض کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں!!! چوتھی دفعہ عرض کیا پھر کون؟ فرمایا تیرا باپ! یعنی حسنِ سلوک کے بارے میں باپ کی باری ماں کے بعد چوتھے درجے میں آئی، لہٰذا ماں کی کبھی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ عزت اور احترام کا برتاؤ کرنا چاہیے۔

دوسری چیز جس کو اللہ نے انسان پر حرام ٹھہرایا ہے، وہ ہے انسان کا انتہائی بخل سے کام لینا اور جو چیز اس کے اختیار اور قبضے میں ہے، اسے ضرورت مند اور مستحق آدمی کو دینے سے انکار کر دینا۔ یعنی کسی کی ضرورت کا بالکل احساس نہ کرنا اور ہوتے سوتے بھی کسی حق دار کو کچھ نہ دینا۔ بلکہ اگر کوئی اس کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار کرے بھی اور یقین بھی دلائے کہ وہ واقعی محتاج ہے، تو بھی بالکل کوئی چیز نہ دینا۔

تیسری چیز جسے حرام ٹھہرایا گیا ہے، بلاضرورت سوال کرتے اور مانگتے رہنا ہے۔ بعض لوگ مانگنے کو پیشہ بنا لیتے ہیں اور سب کام کاج چھوڑ کر مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ نہایت بُری عادت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیشے کی آمدنی کو حرام فرمایا ہے۔

چوتھی چیز جو حرام ٹھہرائی گئی، یہ ہے کہ انسان اپنی بیٹی کو زندہ درخاک کر دے۔ عربوں میں رواج تھا کہ وہ لڑکی کی پیدائش کو بہت بُرا جانتے تھے اور لڑکی کو پیدائش کے فوراً بعد مار کر یا زندہ ہی دفن کر دیتے تھے۔ قرآن اور حدیث میں ان کے اس فعل قبیح کی نہایت مذمت فرمائی گئی ہے۔ اس حدیث میں بھی اس کی اس درجے قباحت بیان کی گئی ہے کہ اسے حرام کا درجہ دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اس حدیث میں تین چیزیں اور ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی مکروہ ٹھہرایا ہے۔

ان میں ایک یہ ہے کہ انسان ہر وقت اُلٹی سیدھی باتیں کرتا رہے۔ کبھی بے احتیاطی کے ساتھ کسی کی باتیں شروع کر دیں کبھی کسی کی۔ اس کی کوئی پروا نہ کی کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا اور کتنے غلط اثرات ظاہر ہوں گے۔

دوسرے یہ کہ کثرت سے سوال کرتے رہنا۔ ہر معاملے میں دوسرے سے کہنا کہ وہی اس کا کام کرے، وہی اس کے لیے کہیں جائے، وہی اس کی ضرورتوں کی کفالت کرے اور وہی اس کے دینوی کاموں کا ذمہ دار ہو۔

تیسرے یہ کہ اپنا مال و دولت ضائع کرتا پھرے۔ اس میں جائز یا ناجائز میں کوئی تمیز نہ کرے۔

یہ حدیث الفاظ کے لحاظ سے بہت مختصر ہے مگر اپنے اندر معنی و مطلب کی بڑی وسعتیں لیے ہوئے ہے۔

نقد و نظر

رحماء بینھم (حصہ سوم)

تالیف : مولانا محمد رفیع صاحب

ناشر : ادارۂ تصنیف و تالیف، جامعہ محمدی شریف، ضلع جھنگ

صفحات ۲۱۶ - کتابت، کاغذ، طباعت، جلد شاندار - قیمت ۳۵ روپے

بد قسمتی سے بعض لوگ اس کام میں مصروف رہتے ہیں کہ حضراتِ شیعہ اور اہلِ سنت کے درمیان بعض امور میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے، اسے بڑھا چڑھا کر بیان کیا جائے۔ وہ متنازعہ فیہ مسائل کو اس نہج سے موضوعِ بحث بناتے ہیں کہ تلخی کی سی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ روش نہایت غلط ہے - اس قسم کی باتیں کرنا جن سے دونوں فریق ایک دوسرے سے دور ہو جائیں، نہ اسلام کی خدمت ہے اور نہ ملک و ملت کی، بلکہ مذہبی و ملی مصلحتوں کے خلاف اور ملکی و قومی تقاضوں کے منافی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہبی اور مسلکی مسائل پر اظہارِ خیال میں اعتدال سے کام لیا جائے اور کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالی جائے جو اختلاف کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کر دینے کا باعث بن سکے۔ اس سلسلے میں زیرِ تبصرہ کتاب "رحماء بینھم" کے فاضل مصنف مولانا محمد رفیع صاحب کا اسلوبِ تحریر اور اندازِ تحقیق لائقِ ستائش ہے۔ کتاب کا نام انھوں نے بڑا عمدہ تجویز کیا ہے۔ قرآن کا لفظ " رحماء بینھم" یعنی تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم آپس میں انتہائی محبت اور رحم دلی کا برتاؤ کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے اور باہم شفقت فرماتے تھے۔

یہ کتاب فاضل مصنف نے تین حصوں میں مکمل کی ہے۔ پہلے حصے میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی اور تمام اہلِ بیت کے باہمی تعلقات کی وضاحت کی ہے، دوسرے حصے میں حضرت عمر فاروق اور حضرت علی اور ان کے اہلِ خانہ کے مراسم مشفقانہ بیان کیے ہیں۔ (یہ دونوں حصے تبصرہ نگار کی نظر سے نہیں گزرے) اس کے بعد مصنف نے تیسرا حصہ مرتب کیا جو اس وقت پیشِ نگاہ ہے، یہ حصہ حضرت عثمان

اور حضرت علی اور ان کے اعزہ و اقارب کے باہمی تعلقات و مراسم پر مشتمل ہے، جو شفقت و محبت کی عمدہ ترین مثال تھے۔

کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، ہر بات باحوالہ بیان کی ہے، شیعہ سنی اتحاد اور اکابر صحابہ کے باہمی تعلقات کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے مطالعے سے بہت سے نئے گوشے قاری کے علم میں آتے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں سے استفادہ کرنا چاہیے۔

سرگزشت حیات

از :- احمد امین

ترجمہ :- شیخ نذیر حسین

ناشر :- مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور

صفحات ۳۱۴۔ قیمت ۲۰ روپے

ڈاکٹر احمد امین جن کے انتقال پر تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے، مصر کے نامور مصنف اور مشہور ادیب تھے۔ ان کی تصنیفات میں فجر الاسلام، ضحی الاسلام اور ظہر الاسلام وہ کتابیں ہیں، جنھوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ یہ کتابیں اپنے مندرجات و شمولات کے اعتبار سے مصر اور بیرونِ مصر کے علمی حلقوں میں موضوعِ بحث بھی بنی رہیں۔

ڈاکٹر احمد امین مصر کے ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، لیکن نہایت ذہین اور طباع تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کے اہلِ علم میں بلند مرتبے کو پہنچے اور مصری ادیبوں کی صفِ اول میں گردانے گئے۔ ہر حلقے میں انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا، بڑے بڑے مناصب پر فائز رہے اور اپنی مسلسل جدوجہد سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔

ان کی تصنیفات میں ایک کتاب کا نام "حیاتی" ہے، یعنی میری سرگزشت، یہ ان کی خود نوشت سوانح ہے، جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اور بچپن سے لے کر جن حالات سے وہ گزرے اور جس طرح آگے بڑھتے رہے، اس کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ خاندان، والدین، ماحول، بچپن، مکتب، مدرسہ، جامعہ ازہر، ملازمت اور پھر اس سے آگے کی تمام منزلوں کا خوب صورت انداز سے اظہار کیا ہے۔ کتاب بڑی دلچسپ ہے۔ اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ علما و طلبا سب کو کرنا چاہیے تاکہ انھیں زندگی

کے ان نشیب و فراز کا پتا چل سکے، جن سے بعض بلند مرتبت اہلِ علم کو گزرنا پڑا۔
ترجمے کی زبان عمدہ اور سلیس ہے۔ شیخ نذیر حسین کا علمی اور ادبی ذوق بڑا پختہ ہے، اور انھوں نے ترجمے کے مشکل اور نازک مرحلے کو کامیابی سے طے کیا ہے۔ اس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں
کتاب کی طباعت میں مجلس ترقی ادب نے اپنے معیار کو ہر لحاظ سے قائم رکھا ہے۔ عمدہ ٹائپ اور بہترین کاغذ و طباعت۔

برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ :۔ محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر سلطان اورنگ زیب عالم گیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علمِ فقہ سے کس طرح روشناس ہوا، یہاں کے علما و زعما نے کس محنت اور جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دورِ حکومت میں، کتب فقہ مرتب کی گئیں، ان کے عہد اور طریق حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس زمانے کے علمائے کرام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و ربط رکھتے تھے۔ پھر فقہ کی جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کے اہم اقتباسات بھی فاضل مصنف نے درج کتاب کیے ہیں۔ آخر میں فقہ کی ان مشہور اکیاسی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں جن کو مسائل فقہ کے اصل ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے متعلق اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

صفحات ۴۰۸ قیمت ۲۰ روپے

ملنے کا پتا :۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاھور

ارمغان شاہ ولی اللہ :- پروفیسر محمد سرور

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت مصنف تھے۔ انھوں نے تفسیر، حدیث، شروح حدیث، فقہ اور تصوف وغیرہ تمام عنوانات پر کتابیں لکھیں اور احکام شریعت کی حکم و مصالح کی روشنی میں وضاحت کی۔ "ارمغان شاہ ولی اللہ" ان کے افکار و تعلیمات کا بہترین مجموعہ اور ان کی عربی و فارسی کتابوں کا ایک عمدہ انتخاب ہے جو اُردو کے قالب میں ڈھال کر قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں شاہ صاحب اور اُن کے بزرگوں اور مشائخ کے سوانح حیات بھی دیے گئے ہیں۔

صفحات ۵۲۰ قیمت ۳۰ روپے

طب العرب :- ایڈورڈ جی براؤن ۔ ترجمہ :- حکیم سید علی احمد نیر واسطی

فاضل مستشرق ایڈورڈ جی براؤن نے لندن کے رائل کالج آف فزیشنز میں ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء میں طب عربی پر چار فاضلانہ خطبات دیے جو بعد میں عربین میڈیسن کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ پروفیسر براؤن نے اپنے ان چار خطبات کے ذریعے طبی ادب، عربی علم طب اور تاریخ علم طب پر بڑا احسان کیا ہے۔ یہ خطبات علمی دنیا میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے اور یورپ کی کئی زبانوں میں ان کے ترجمے بھی شائع ہوئے۔

حکیم سید علی احمد نیر واسطی نے اس مجموعۂ خطبات کا انگریزی سے سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ کیا اور جابجا اپنی جانب سے مفید تشریحات اور علمی و فنی و تاریخی تنقیدات کا اضافہ کیا۔ اپنی تشریحات و تنقیدات میں فاضل مترجم نے نہایت قابلیت کے ساتھ جابجا پروفیسر براؤن کے بیانات کی محققانہ تشریح و توضیح کی ہے۔

صفحات ۵۵۲ قیمت ۳۰ روپے

علمی رسائل کے مضامین

البلاغ، کراچی — جون ۱۹۸۰

ہندوستان میں چند روز	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی
نیا طوفان اور اس کا مقابلہ (مسلسل)	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
تاریخِ اسلامی میں نظامِ مصطفیٰ کی چند جھلکیاں (مسلسل)	جناب ریاض الحسن نوری
اسلامی معاشرہ اور ذرائع ابلاغ	رازی الفاروقی
تھوڑی دیر علمائے ربانی کی محفل میں	جناب محمد ارشد اعظمی

البلاغ، کراچی — جولائی ۱۹۸۰ء

ہندوستان میں چند روز	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی
نیا طوفان اور اس کا مقابلہ (مسلسل)	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
تاریخِ اسلامی میں نظامِ مصطفیٰ کی چند جھلکیاں	جناب ریاض الحسن نوری
مولانا محمد قاسم نانوتوی	مولانا محمد اسلم شیخوپوری
عظیم مگر متواضع شخصیت	مولانا حامد علی قریشی

بینات، کراچی — اگست ۱۹۸۰

آدابِ رمضان	مولانا محمد یوسف لدھیانوی
مسودہ قانونِ زکوٰۃ پر ایک نظر	مولانا محمد یوسف لدھیانوی

ترجمان الحدیث، لاہور — جولائی ۱۹۸۰

مولانا شمس الحق عظیم آبادی (مسلسل)	مولانا ارشاد الحق اثری
نظامِ زکوٰۃ — فوائد و برکات	عبدالستار گوندل

ترجمان القرآن، لاہور — جولائی ۱۹۸۰

اسلامی انقلاب کی تعمیر	ترجمہ: محمد نصراللہ خاں خازن

حضرت امام مسلمؒ	جناب عبدالرشید عراقی
یورپ ـــ ایک وسیع پاگل خانہ	ریاض الحسن نوری

جامعہ، دہلی ـــ مئی، جون ۱۹۸۰

وفاتِ جوہر پر اقبال کے قطعے کی تضمینیں	ڈاکٹر حنیف نقوی
جین پال سارتر، فکر وفن کی ایک نئی فضا	انور صدیقی
"رسالہ در نظم تمدن و تعاون"	ڈاکٹر شعیب اعظمی
منشی مادھو رام جوہر	ویریندر پرشاد سکسینہ

فاران، کراچی ـــ مارچ تا مئی ۱۹۸۰

علامہ اقبال کا طریقِ ابلاغ	ساجد اللہ نعیمی
درود تاج پر ایک نظر	مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی
ماہر ـــ میرا دوست	مسعود الحسن تابش دہلوی
ایک مخلص دوست	مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی
ماہر میرا دوست	اقبال صفی پوری
یادیں کچھ ایسی ہیں کہ بھلائی نہ جا سکیں	شرف الدین احمد عظیم آبادی
قرآن کا رسم الخط اور اس کا ارتقا	جناب نثار احمد

الفرقان، لکھنؤ ـــ جولائی ۱۹۸۰

مولانا اشرف علی تھانوی کی محفل ارشاد	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی
مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی	مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی

المجیب، پھلواری شریف (انڈیا) ـــ مئی، جون ۱۹۸۰

معراجِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا شاہ عون احمد قادری
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	مولانا محمد شفیع اللہ سہسرامی
سید محمد وارث رسول نما بنارسی	مولانا نصر احمد پھلواروی
اصحاب الفیل	نعمان غنی دیوروی
[illegible]	محمود نیسوی

ستمبر ۱۹۸۰

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف - قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے - بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون نمبر ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۳ | ستمبر ۱۹۸۰ — شوال ۱۴۰۰ | شمارہ ۹

ترتیب

تاثرات

انسان کے معاشرتی نظام کا قصرِ رفیع جن بنیادوں پہ استوار ہے، ان میں اخلاق کو اوّلین اہمیت حاصل ہے۔ اگر اخلاق صحیح ہے اور انسان نے مخلوقِ خدا سے اس کے حسبِ مراتب بہتر تعلقات قائم کرنے اور قائم رکھنے کا طریقہ سیکھ لیا ہے، اور یہ معلوم کر لیا ہے کہ کس سے کس قسم کا برتاؤ کیا جائے تو سمجھ لیجیے کہ اس نے فوز و فلاح کی تمام منزلیں طے کر لی ہیں اور ان مشکلات پہ قابو پالیا ہے، جو اس سلسلے میں پیش آسکتی ہیں۔

حسنِ معاملت، عذوبتِ لسان، شیرینیٔ کلام، بہترین کردار کا اظہار، لین دین کی صفائی، انسانیت کی ہمدردی، لوگوں کی خیر خواہی، بڑے کا احترام، چھوٹے پر شفقت، ایک دوسرے سے مخلصانہ برتاؤ، باہمی معاملات میں دوسرے کے جذبات کا احترام وغیرہ سب چیزیں اخلاقِ حسنہ کہلاتی ہیں۔ اگر ان امور کی انجام دہی میں ٹیڑھ پائی جائے اور آپس کے معاملات میں انسانی خیر خواہی کا فقدان ہو، تو اسے بداخلاقی سے تعبیر کیا جائے گا۔

جس شخص کا معاملاتی پہلو جتنا اونچا ہوگا، اتنا ہی وہ بلند اخلاق ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں سوال ہوا، تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، کان خلقہ القرآن، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق قرآن کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا۔ یعنی آپ کے اخلاق کا پیمانہ انتہائی بلند تھا اور معاملات کے تمام پہلو حکمِ خداوندی کے عین مطابق تھے۔ آپ جو قدم اُٹھاتے، وہ اللہ کے احکام کے تابع ہوتا۔ ذرا بھی اِدھر اُدھر عنانِ توجہ مبذول نہ فرماتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو بھی یہی حکم دیا ہے کہ وہ اخلاقِ حسنہ سے مزیّن ہوں اور ہر معاملے میں احکامِ شریعت کو ملحوظِ خاطر رکھیں۔ کوئی ایسا کام نہ کریں جو اسلام سے ہم آہنگ نہ ہو۔ اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، غرض ہر جُنبش و حرکت میں اسلام کو رہنما مانیں۔

اگر ہم آنحضرتؐ کے ارشاداتِ گرامی پر عمل پیرا ہو جائیں اور انہی اخلاق کو اپنا لیں جن کا اسلام نے حکم دیا ہے تو ہر شعبۂ حیات میں بُرائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسان صاف سُتھری زندگی کا خوگر بن جاتا ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی

دینی اور لادینی علوم

اسلام زندگی کو دینی اور لادینی دو خانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک زندگی کا ہر وہ اسلوب، ہر وہ عمل اور ہر وہ نہج دینی ہے، جس کو رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ٹھہرایا جائے۔ یہ ایک جامع مذہب ہے جس میں ہر وہ تگ و دو اور سعی و کوشش داخل ہے، جو انسانی فکر کو نکھارے، اخلاق و کردار میں حسن و جمال پیدا کرے، انسانی رشتوں میں عدل و انصاف کے پیمانوں کو رائج کرے اور دلوں میں تقویٰ، خدا ترسی اور پاکیزگی کے عوامل کو ابھارے۔ اسلام توحید کا علم بردار ہے، اس لیے قدرتی طور پر اس کا مقصد یہ ہے کہ دین و دنیا کی تفریق زندگی میں ثنویت یا دوئی کو پنپنے کا موقع نہ دے۔ زندگی ایک 'کل' ہے، اس کے اجزا ہو سکتے ہیں اور اس کو مختلف انواع اور شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ انواع اور شاخیں کل کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔ یا اس کے اجزا میں کوئی حقیقی تناقض پایا جاتا ہے۔

علوم چونکہ ہماری فکری و عملی زندگی ہی کا ایک اہم حصہ یا اساس ہیں، اس لیے اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں بھی فرق و امتیاز کی یہ نوعیت کار فرما نہیں کہ ان میں بعض علوم تو دینی ہیں اور بعض لادینی۔ علم روشنی ہے، برکت ہے اور ہدایت و رہنمائی کا ایک سرچشمہ ہے۔ یہ کسی بھی دریچے سے جھانکنے اور کسی بھی ذریعے اور عنوان سے حاصل ہو، روشنی ہی رہے گی اور برکت و ہدایت اس کا خاصا رہے گا۔ عقل و دین لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح وحی و تنزیل کے انوار انسانی زندگی کی تاریکیوں کو اجالوں سے بدل دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اسی طرح عقل کی ضیا افروزیوں سے نہ صرف قلب و ذہن کے اندھیرے دور ہوتے ہیں، بلکہ ان عقائد و تصورات کی تائید و توثیق کا سامان بھی فراہم ہوتا ہے جو ہمارے ایمانیات کی اساس اور بنیاد ہیں۔ دین کے مضمرات میں عقل و خرد کے تقاضے اسی طرح جاری و ساری ہیں، جس طرح جسم میں خون یا گلوں اور پھولوں میں مہک اور خوشبو۔ اور عقل کے تمام تر نتائج و ثمرات بعینہٖ اسی سچائی اور صداقت پر دلالت کناں ہیں جن کی وحی و تنزیل کے ذریعے

نشان دہی کی گئی ہے۔

ان میں فرق و اختلاف یا تناقض و تضاد اُس وقت اُبھرتا ہے جب ان میں کسی ایک کی غلط ترجمانی کی جائے یعنی اگر دین کی صحیح صحیح تعبیر کی جائے اور عقل و خرد کے نتائج و ثمرات کے استنباط میں دیانت داری اور حزم و احتیاط کو پوری ملحوظ رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ ایک دوسرے کی تائید نہ کریں یا ایک دوسرے کے اکتشافات پر مہر تصدیق ثبت نہ کریں۔ علامہ ابن تیمیہ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ نصوص دینی اور تصریحات عقلی ہیں اگر کہیں تصادم رونما ہو تو وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو نصوص کے سمجھنے میں گھپلا ہے اور یا پھر فکر و تعقل کے عمل میں کہیں تعصب، ضد اور جہل نے صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔

عقل و دین میں اس بنا پر ایک ازلی رشتۂ مودت و توافق استوار ہے کہ دونوں کا ماخذ اور سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہے، اس کی حکمت و دانائی کا پرتو انسانی عقل ہے اور اس کی ربوبیت کا فیضان وحی و تنزیل۔

مختلف علوم چونکہ عقل و دانش ہی کے پروردہ ہیں اس لیے دین کے ساتھ ان کی کوئی پرخاش نہیں۔ یہ اپنے موضوع اور غرض و غایت کے لحاظ سے بالکل غیر جانب دار ہیں۔ نہ ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ یکسر دینی ہیں اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ یہ قطعی دین کے خلاف ہیں۔ یہ فلکیات، طبیعیات، حیاتیات، نفسیات اور اجتماعی معارف کے الگ الگ میدانوں میں مصروفِ تحقیق ہیں۔ دین کی تصریحات میں اور ان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں دین نے اپنے دامن میں قطعیات کو سمیٹ رکھا ہے، وہاں ان میں غور و فکر اور مراجعہ کا عمل ابھی جاری ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ عمل کب اور کن نقاط پر جا کر اختتام پذیر ہوگا۔

اس وضاحت کے بعد دینی علوم اور لادینی علوم کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ علوم جو براہِ راست دینی ماخذ سے متعلق ہیں، دینی ہیں اور وہ جن کا دائرۂ کار دین سے الگ اور علیحدہ ہے لادینی ہیں۔

اس سے پہلے کہ دینی علوم و ماخذ سے متعلق ہم اپنی رائے کا اظہار کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہی قدم پر یہ بتا دیں کہ علوم دینی اور غیر دینی علوم میں بعض دانشوروں نے ازراہِ تعصب خواہ مخواہ جو بُعد و تناقض کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں وہ صحیح نہیں تاکہ ہمارا یہ دعویٰ حق بجانب نظر آئے کہ عقل و دین میں دو توام اور سگے بھائی بہنوں کا سا رشتہ ہے لیکن یار لوگوں نے بلاوجہ ان میں بگاڑ پیدا کرنے کی مذموم کوشش کی ہے، ورنہ اصل میں ان دونوں میں پوری طرح یگانگت اور توافق پایا جاتا ہے۔

سرِ دست ہم طبیعیات اور نفسیات کے نتائجِ فکر کا ہلکا پھلکا جائزہ لیں گے اور بتائیں گے کہ یہ دعویٰ درست نہیں کہ ان سے تحقیق و تفحص کے ایسے نتائج اخذ ہوتے ہیں جو دینی مسلمات کے خلاف ہیں۔ یوں تو موجودہ علوم کی ہر ہر شاخ میں لوگوں نے شک و ارتیاب کے رخنے ڈھونڈے ہیں لیکن طبیعیات اور نفسیات چونکہ دو ایسے علم ہیں جنھیں خصوصیت سے دہریت والحاد کی تائید و توثیق کے لیے کام میں لایا جاتا ہے، اس لیے آئیے ان دونوں پر غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ ان سے کہاں تک ملاحدہ کی مطلب برآری ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے آغاز تک طبیعیات کے ماہرین نے اس فن میں وہ حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں اور کائنات کے اسرار و رموز کی اس طرح پردہ کشائی کی کہ جس سے ایک طرف تو ان میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور دوسری طرف ان کے ذہنوں میں یہ خیال ابھرا کہ یہ سارا کارخانہ ہست و بود محض سر رشتۂ علت و معلول کا رہین منت ہے اور مادی عوامل و موثرات ہی دراصل وہ شے ہے جن کے فعل اور ردِ فعل سے، حرکت سے لے کر زندگی تک اور زندگی سے لے کر شعور و ادراک تک کی سب منزلیں آپ سے آپ طے ہوتی چلی جاتی ہیں، اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تصور و عقیدہ کو بیچ میں لائے بغیر اس عالمِ رنگ و بو کی گتھیوں کو سلجھایا جا سکے۔ چنانچہ اس کے بعد طبیعیات کے ماہرین کے حلقوں میں جو کاوشیں ہوئیں وہ اسی مفروضے کو مان کر ہوئیں۔

لیکن یہ کاوشیں یک طرفہ تھیں۔ مشیتِ ایزدی کا تقاضا یہ تھا کہ انسان زیادہ دیر تک گمراہی کے ان اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں نہ مارتا پھرے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اسی منحرف گروہ کی کوششوں سے ایٹمی نظریے کی تفصیلات فکر و نظر کا موضوع بنیں اور تحقیق و تفحص سے معلوم ہوا کہ علّت و معلول کا جو حصار کائنات مادی میں اتنا استوار اور محکم نظر آتا تھا یہاں ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ ایٹم کے دائرے میں جو کہربائیے حرکت کناں ہیں اور جن کی حرکت سے جسمیہ، حیات اور شعور کروٹ لیتا رہا ہے، وہ حرکت بجائے خود کسی علت کی تابع نہیں اور کسی قاعدہ اور قانون کی مرہونِ منت نہیں۔ لہٰذا یا تو یہ مان لیا جائے کہ ایٹم میں تخلیق و آفرینش وجود کی جو صلاحیتیں پائی جاتی ہیں وہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہیں، اور یا پھر یہ کہا جائے کہ ان کو نظم و ارتباط کے سانچوں میں ڈھلنے والی کوئی دوسری ذات ہے، جو بے نظیر علم اور بے مثل حکمت اور بے پناہ قدرت کی حامل ہے۔ ظاہر ہے کہ محض بخت و اتفاق کو اس مربوط اور با مقصد

کائنات کی اساس نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لیے ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کے عقیدے کو نظر انداز کرنا نہ صرف گمراہی ہے بلکہ خود اپنے علم و آگاہی کی تکذیب کے مترادف ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی، آگے چل کر خود علت کے بارے میں یہ حقیقت نکھر کر سامنے آئی کہ یہ کسی ایک عنصر یا حقیقت سے تعبیر نہیں، بلکہ جسے ہم علت کہتے ہیں یہ ارتقاء و تغیر کا ایک طویل اور مسلسل عمل ہے جو اپنے آغوش میں ایسے ناگہانی اور ناقابلِ توجیہ عوارض کو لیے ہوئے ہے جو پہلے سے موجود نہیں ہوتے۔ مثلاً آم ہی کو لیجیے، اس کی شکل و صورت، اس کا مزہ و کیف اور خاص طرح کی عذوبت و شیرینی آم کی گٹھلی یا قلم میں کسی مقدار میں بھی پائی نہیں جاتی اور کوئی باریک سے باریک تجزیہ بھی ان خصوصیات کی نشان دہی نہیں کر پاتا جن کی وجہ سے آم، آم ہے، کھجور نہیں۔ یہ تمام عوارض، اس کے ارتقاء و تغیر اور نشو و نما کے اثنا میں حکمتِ الٰہی سے لاحق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تاآنکہ یہ اس قابل ہو جائے کہ کام و دہن اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ نظامِ کائنات پر اس طرح غور کیجیے گا تو معلوم ہو گا اس میں قدم قدم پر ایسے شواہد پائے جاتے ہیں جو دینی عقائد کی تائید کرتے ہیں۔

طبیعیات کے بارے میں اس مختصر سے لمحۂ فکریہ کے بعد آئیے اب ان شکوک و شبہات پر ایک نظر ڈالتے چلیں جو نفسیات کی راہ سے نہاں خانۂ قلب و ذہن میں جاگزیں ہوتے ہیں۔

نفسیات کا علم ابھی نیا نیا ہے، اس کا موضوع ذہنِ انسانی کا مطالعہ و تحقیق ہے۔ یہ علم یہ جاننا چاہتا ہے کہ انسان کا ارادہ و عمل کن داخلی و خارجی موثرات کے تحت معرضِ ظہور میں آتا ہے۔ نفسیات کے ماہرین نے ذہن کو دو متعین حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک تحت الشعور اور ایک شعور، تحت الشعور خواہشات، تاثرات، جذبات اور ناتمام رجحانات کا ایک غیر مرتب ملغوبہ ہے۔ نفسیات کے بعض علما کی یہ رائے ہے کہ فکر، شعور اور ارادے کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ یہ سب تحت الشعور کا کرشمہ ہے۔ اسی کی کوکھ سے یہ سب حقائق جنم لیتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جسے ہم حریتِ ارادہ اور اختیار کہتے ہیں، یہ محض ہمارا پندار ہے کہ گو ہم جبر و اضطرار کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں تاہم یہی سمجھے جا رہے ہیں کہ ہم اپنے اعمال و ارادے میں آزاد اور خود مختار ہیں۔

سلوکی مدرسۂ فکر کے حامی تو فکر و ارادہ کی جنبشوں کو اس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے کہ یہ محض ذہن کے عوامل داخلی و خارجی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ایک صاحب اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ

فکر و شعور ذہن کا فضلہ ہے، اس سے زیادہ اس کی اور کوئی حیثیت نہیں۔ یعنی انسانی ذہن کا عمل اسی طرح مکانکی اور طبعی ہے جس طرح معدہ، جگر اور قلب کا عمل۔

نفسیات کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ ابھی اس نے باقاعدہ علم یا سائنس کی شکل اختیار نہیں کی، اس لیے اس کے اخذ کردہ نتائج بھی سائنسی حقائق کے دائرے میں نہیں آتے۔ ارادہ و شعور کی حیثیت کا تعین دراصل اس سوال کے جواب پر موقوف ہے کہ ہم تحت الشعور اور شعور میں رشتہ و تعلق کی کس نوعیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ کیا ان میں ٹھیٹھ علت و معلول کا تعلق ہے یا تعلق کی ایسی نوعیت کارفرما ہے جو ایک شاعر اور الفاظ و حروف میں پائی جاتی ہے یا ایک مصور اور اس کے رنگ و روغن اور موقلم کے مابین قائم ہے۔ یعنی شعور، لاشعور سے کچھ چیزیں حاصل تو کرتا ہے، لیکن ان کو اس انداز سے خود ترتیب دیتا ہے کہ فکر و تصور کی رنگینیاں معرضِ ظہور میں آتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک شاعر الفاظ و حروف کو چنتا ہے اور پھر ان کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتا ہے، اور جس طرح ایک مصور رنگ و روغن اور موقلم کا انتخاب کرتا ہے اور ان کی مدد سے ایک حسین و جمیل مرقع تیار کر دیتا ہے، بعینہٖ اسی طرح شعور، تحت الشعور سے جو مواد خام حاصل کرتا ہے اس کو اپنی ہنرمندانہ قوتِ تخلیق سے فکر و اندیشے کی معجز طرازیوں میں بدل دیتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں شعور فعال اور خلاق ہے، جو فلسفہ و علوم اور تہذیب و ثقافت کی بوقلمونیوں کو جنم دیتا ہے، جو قانونِ فطرت کی تسخیر کرتا ہے اور ماہ و مشتری پر فتح و نصرت کے پرچم لہراتا ہے۔ اسے مجہول، بے تاثیر ٹھہرانا اور محض ذہن کا مکانکی اور طبعی عمل قرار دینا علمی زیادتی ہی نہیں انسانی فکر و عظمت کی توہین بھی ہے۔ اس بحث میں مزے کی بات تو یہ ہے کہ مذہب تو انسان کو مکلف، خود مختار اور آزاد مانتا ہے، حالانکہ ان کے خیال میں ہمیشہ یہ رجعت پسندانہ رجحانات کا حامل رہا ہے اور یہ ترقی پسندانہ نفسیات کے ماہرین بیسویں صدی کی روشنی میں اس بات پر تُلے ہوئے ہیں کہ انسان کو مجبورِ محض ثابت کریں۔

یہ صحیح ہے کہ نفسیات کے ماہرین کی اکثریت کا رجحان اسی طرف ہے کہ انسان کو ارادہ و شعور کی حد تک مجبور ہی تصور کیا جائے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ جب علم و تحقیق کی کاوشوں میں ذرا گہرائی اور پختگی آئے گی انھیں ماننا پڑے گا کہ جس طرح مادے کی ادنیٰ سطح ذرہ میں تعلیل و تسبب کا قانون بے کار ہو جاتا ہے، اسی طرح مادے کی اس اعلیٰ سطح ذہنِ انسانی میں بھی یہ قانون چلنے والا نہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم علومِ دینی کی وضاحت کریں حضراتِ علما کو ازراہِ اخلاص مشورہ دیں گے کہ وہ ان تمام علوم کا مطالعہ کریں جن کو لادینی سمجھ کر انھوں نے ترک کر رکھا ہے، اور جہاں جہاں سے ان کو روشنی ملے یا تائید حاصل ہو، اس کو اپنے دامنِ طلب میں سمیٹیں اور دینِ حق کی محکمی و استواری کو ثابت کرنے کے لیے اس سے کام لیں۔

دینی علوم کون کون ہیں؟ اس سوال کا جواب سرکوئی جانتا ہے۔ اسلامی حلقوں میں یہ جانی بوجھی حقیقت ہے کہ علومِ دینی کا براہِ راست تعلق تین چیزوں سے ہے۔ قرآن سے، حدیث سے اور فقہ سے۔

قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کی وہ پہلی و آخری کتاب ہے، جس نے نوعِ انسانی کی فکری و عملی زندگی کے تمام پہلوؤں کو نکھارا اور واضح کیا۔ دین و دنیا کی دوئی کو ختم کیا۔ جس نے رہبانیت کو بدعت ٹھہرایا اور زندگی کے احترام پر زور دیا۔ جس نے توحید کا جیتا جاگتا اور روشن تصور پیش کیا، جس نے علم کا رتبہ بڑھایا، غور و تدبر اور فکر و نظر پر انسان کو آمادہ کیا۔ جس نے عدل کے قیام کو اجتماعی زندگی کا ضروری جز قرار دیا، جس نے علم و آگاہی کے نئے نئے دریچوں کو وا کیا اور معاشرے میں نیکی، تقویٰ اور تعلق باللہ کے فیوض و برکات کا چرچا کیا۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی دنیا کی پہلی اور آخری کتاب ہے کہ جس قدر اس نے انسانی ذہن و فکر کو متاثر کیا ہے اور کوئی کتاب اس بارے میں اس کی حریف نہیں ہو سکتی۔

یہ کتابِ حکیم ۱۱۴ سورتوں پر مشتمل ہے جو مختصر بھی ہیں اور طویل بھی، اور ان میں کی ہر سورۃ اپنے اندر معارف و معانی کا ایک سمندر لیے ہوئے ہے۔ یہ کہنے کو ایک کتاب ہے، لیکن متعدد علوم و فنون پر مشتمل۔ اس میں عقائد بھی ہیں، عبادات بھی ہیں۔ تاریخ اقوام بھی ہے، زندگی کا اسلوب و نہج بھی ہے، اخلاق و سیرت کی تابندگی بھی ہے، کائنات کے بارے میں واضح نظریہ اور تصور بھی ہے۔ اس حقیقت کا بیان بھی ہے کہ زندگی کا قافلہ رواں دواں ہے اور موت کی حیثیت محض ایک وقفے کی ہے۔

اس کا ایک ایک شوشہ اور نقطہ محفوظ ہے، اس کے الفاظ بھی حجیت و استناد کے حامل ہیں اور معانی بھی۔ اس کی بدولت متعدد علوم مدون ہوئے اور ہر دور میں متعدد حضرات نے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ کسی نے اس کی نحو ترتیب دی، کسی نے اس کی آیات کی شانِ نزول پر بحث کی، کسی نے اس کے مفردات الفاظ کی تشریح کی، کسی نے احادیث و روایات کی روشنی میں اس کی تفسیر بیان کی، کسی نے اس کے ادبی اسلوب کو واضح کیا، کسی نے اس کے محکمات و متشابہات پر قلم اٹھایا، کسی نے مکی و مدنی سورتوں

کی تفصیل سے تعرض کیا، کسی نے اس کے اعراب و تشکیل پر بحث کی اور کسی نے اس میں حکم و معارف کی نشاندہی کی اور یہ بتایا کہ یہ کتاب ہدیٰ اپنے جلو میں کن کن نوادر و نکات کو لیے ہوئے ہے۔ غرض اس کی تشریح و تفسیر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر ہمارے اسلاف نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کے باوجود حقائق و معانی کا یہ بحرِ مواج ابھی پایاب نہیں ہوا۔ اس کی تہہ میں اب بھی جواہر و لآلی کا ایک خزینہ پنہاں ہے۔ یہی نہیں اس کے آفاق پر حکمت و فلسفہ کے سینکڑوں آفتاب ایسے ہیں جو ہنوز جلوہ گری کے لیے بے تاب و بے قرار ہیں۔

حدیث، شریعتِ اسلامی کا دوسرا ماخذ و منبع ہے۔ اس کا آغاز اسی وقت سے ہو گیا تھا، جب قرآن حکیم نازل ہونا شروع ہوا۔ آنحضرتؐ چونکہ اللہ کے آخری پیغمبر اور نبی تھے اس لیے ضروری تھا کہ وہ اس پیغام کو لوگوں تک کھول کر پہنچائیں جس پر اسلامی دنیا کی فلاح و نجات کا مدار تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے عمل سے، قول سے اور تقریر سے اس کی تبیین و تفسیر کا فریضہ انجام دیا۔ یہی نہیں، عملاً ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جو قرآنِ حکیم کی تعلیمات پر عمل پیرا تھا۔

حدیث کی باقاعدہ تدوین اگرچہ تیسری صدی میں ہو پائی۔ لیکن خود عصرِ نبوت ہی میں اس کی حفاظت و صیانت کا پورا پورا اہتمام کر لیا گیا تھا۔ آنحضرتؐ کے ایک ایک قول اور فعل کو صحابہ یاد رکھتے تھے، اس پر عمل کرتے تھے اور مختلف مسائل کے حل و کشود کے سلسلے میں اس سے مدد لیتے تھے، آنحضرتؐ کے مقرر کردہ مبلغین اور عمال، مختلف بلادِ اسلامی میں لوگوں کو بتاتے تھے کہ آنحضرتؐ نماز کیونکر پڑھتے تھے مناسکِ حج کیوں کر ادا کرتے تھے۔ زکوٰۃ کے لیے کن احکام و اوامر کی تلقین کرتے تھے۔ تاریخ تدوینِ احادیث سے اس بات کا پتا بھی چلتا ہے کہ حدیثِ رسول پر نہ صرف لوگوں نے عمل کیا، اسے یاد رکھا اور لوگوں تک پہنچایا بلکہ اُسے قلم بند بھی کیا۔ میثاقِ مدینہ اور وہ مکتوباتِ گرامی جو آنحضرتؐ نے اپنے دور کے سلاطین و ملوک کو بھیجے اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔

صحابہ کرام نے احادیث کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی طلب و جستجو کے لیے کیا کیا سختیاں برداشت کیں، کتبِ تاریخ و سیر میں اس کے متعدد شواہد ملتے ہیں۔ چنانچہ ابو ایوب انصاری کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے صرف ایک حدیث معلوم کرنے کے لیے حجاز سے مصر تک کی طویل مسافت طے کی۔ اسی انداز سے تابعین اور تبع تابعین نے اس حرفِ شیریں کو آگے بڑھایا۔ تا آنکہ یہ خزینۂ علم و حکمت بحفاظت تام صحاح ستہ کی شکل میں مدون ہوا۔

جس طرح قرآن حکیم نے نئے نئے علوم کو جنم دیا اسی طرح احادیث کی بدولت علم الاسناد، اسماء الرجال، علل، تطبیق اور مدارج احادیث کی صورت میں بیسیوں علوم معرضِ تدوین میں آئے۔ یہی نہیں محدثین نے احادیث کی جانچ پرکھ کے لیے ایسے پیمانوں کو بھی وضع کیا جو ہر لحاظ سے جامع اور مکمل تھے اور کسی لحاظ سے بھی نقد و تفحص کے ان پیمانوں سے کم درجے کے نہیں تھے جن کو مغرب "تنقیداتِ عالیہ" کے پرشکوہ الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔

فقہ وہ علم ہے جس کی وجہ سے قرآن و سنت کے ذخائر نے ایک مربوط نظامِ حیات کی شکل اختیار کی۔ ائمۂ اجتہاد نے جب یہ دیکھا کہ اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور نئے نئے مسائل رونما ہو رہے ہیں تو انھوں نے نہایت دقتِ نظر سے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس ضرورت کو محسوس کیا کہ قرآن و سنت کو قانون کے نپے تُلے سانچوں میں ڈھالنا چاہیے اور لوگوں کو بتانا چاہیے کہ اسلام کا اسلوبِ زیست، عبادات، مناکحات اور معاملات میں کن کن متعین مسائل و جزئیات کی تشریح کرتا ہے۔

فقہ و تقنین کا یہ عمل دوسری صدی ہجری سے شروع ہوا اور تیسری صدی میں ترتیب و تدوین کے اس مرحلے تک پہنچا کہ جس میں مختلف فقہی مدارس اپنے اپنے حلقوں میں قبولیت و پذیرائی کی نعمت سے بہرہ مند ہوئے۔

اس دور میں تقنین و اجتہاد کی کوششوں میں اگرچہ متعدد فقہا اور ائمہ نے حصہ لیا لیکن جن فقہی مدارس کو محدثین کے علاوہ عالمِ اسلامی میں عموماً فروغ حاصل ہوا، وہ صرف چار ہیں۔ فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی، اور فقہ حنبلی۔

فقہ و تقنین کا یہ ذخیرۂ علمی جو ہمارے اسلاف کے ذریعے ہم تک پہنچا اتنا اہم، قابلِ قدر اور عظیم ہے کہ ہم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ یہ اپنی وسعت اور استواری و محکمی کے اعتبار سے دنیا کے ہر ذخیرۂ قانون سے بہتر اور افضل ہے۔ جہاں تک اصل ماخذِ دینی کا تعلق ہے اس کا اطلاق بغیر کسی اختلافِ رائے کے صرف کتاب و سنت پر ہوتا ہے، فقہ اسلامی کی حیثیت اس مبارک عمل اور جدوجہد کی ہے جو ماضی میں اس بنا پر بروئے کار آئی کہ کتاب و سنت کی نصوص کو حتی المقدور ایک قانونی سلک میں منسلک کیا جائے، اور یہ عملِ انسلاک نہ صرف ہر دور میں جاری رہا بلکہ اس دور میں بھی اس کی ضرورت و اہمیت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ہم اس لائق ہو جائیں گے کہ موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق، فقہ جدید کی تشکیل کریں اور ثابت کر دیں کہ اسلام کا پیغام زمان و مکان کی حد بندیوں سے بے نیاز ہے اور اس میں یہ صلاحیت اور لچک ہے کہ ہر ہر عصر کے اجتماعی، اقتصادی اور عمرانی تقاضوں کا تسلی بخش جواب دے سکے۔

مولانا شہاب الدین ندوی

علم کیمیا اور طبیعیات کی اہمیت

(دوسری قسط)

ایٹم اور قرآن

قرآنِ حکیم خود ربانی انکشاف کے مطابق کائنات کے تمام رازوں کا امین ہے،

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط (الفرقان : ۶)

کہہ دو کہ اس (کتاب) کو اس نے اُتارا ہے جو زمین اور آسمانوں کے (تمام) بھیدوں کا جاننے والا ہے۔

مگر اس کی ایک خاص زبان اور خاص اسلوب ہے جو انسانی زبانوں سے میل نہیں کھاتا۔ اس کا بنیادی مقصد جیسا کہ عرض کیا جا چکا نوعِ انسانی کے غلط علمی تصورات کی اصلاح ہے اور یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ کائنات بغیر ایک خدائی اسکیم و منصوبہ بندی کے یونہی بلا مقصد آپ سے آپ وجود میں نہیں آگئی ہے بلکہ اس کائنات کا ایک ایک ذرہ حتیٰ کہ اس کا ایک ایک ایٹم اور ایک ایک سالمہ (MOLECULE) تک ایک متعین قانون اور ایک مقررہ ضابطے کے تحت بغیر کسی انتشار و بدنظمی کے ایک خالق و ناظم اور برتر ہستی کی نگرانی میں رواں دواں ہے۔ ورنہ اس قدر تحیر خیز نظم و ضبط اور ڈسپلن کی کوئی دوسری توجیہ ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔

وہ ذاتِ برتر اتنی زبردست اور ہمہ دان ہے کہ بڑے بڑے اجرامِ سماوی سے لے کر ایک معمولی اور ننھے سے ایٹم بلکہ اس کے اندرونی اجزا (الیکٹران، پروٹران اور نیوٹران وغیرہ جو انسانی آنکھ کو طاقت ور دوربینوں سے بھی نظر نہیں آتے) تک اس کی نظروں سے غائب نہیں ہو سکتے اور کوئی بھی ذرہ اس کے علم سے باہر نہیں ہو سکتا۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ ۚ لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝ (سبا : ۳)

(وہ) ہر پوشیدہ چیز سے واقف ہے۔ اس کے علم سے کوئی رتی سی چیز بھی ۔۔۔ خواہ وہ آسمانوں میں

ہو یا زمین میں —— غائب نہیں ہوسکتی۔ اور (اس مقدار مذکورہ سے) کوئی چھوٹی یا بڑی چیز بھی (غائب نہیں ہے، ان تمام اجزا کا حساب علمِ الٰہی کی) کھلی کتاب میں موجود ہے۔

قرآن حکیم کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ اس آیتِ کریمہ میں تین قسم کے ذرات کا بیان ہوا ہے۔ (ایک "مثقال ذرہ" دوسرا نسبتاً اس سے چھوٹا اور تیسرا نسبتاً اس سے بڑا) اور بنیادی طور پر کائنات میں تین ہی قسم کے ذرات اور مرکبات پائے جاتے ہیں۔ ایک ایٹم، دوسرے ایٹم کے اندرونی اجزا اور تیسرے ایٹم کے مرکبات (COMPOUND) یہ ایک فلسفیانہ قسم کی تقسیم معلوم ہوتی ہے۔

ان تین قسم کے ذرات و مرکبات میں سے ایک قسم وہ ہے جو ان دونوں کی درمیانی ہونے کے اعتبار سے معیاری اور بطور مثال ہے اور بقیہ دو قسمیں اس معیاری قسم سے محض نسبتی و اضافی تناسب رکھتی ہیں۔ اور یہ معیاری ذرہ یا جزو ہے ایٹم (جوہر)، جس سے کائنات کی تمام چیزیں مرکب ہیں۔ ان کی مختصر تشریح حسبِ ذیل ہے:

مِثْقَالَ ذَرَّةٍ: یہ اس آیتِ کریمہ میں سب سے زیادہ اہم الفاظ ہیں۔ لغوی اعتبار سے اس کا مفہوم ہوگا ہر وہ رتی سی چیز جس میں وزن پایا جاتا ہو۔ عام محاورے کے مطابق اس کا مطلب "ذرہ برابر" سی چیز سمجھی جاتی ہے۔ مگر یہاں پر اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ وہ چیز کتنی رتی یا کتنی مقدار کی ہونی چاہیے۔ لہٰذا ہر اس رتی سی چیز پر "مثقال ذرۃ" کا اطلاق ہو سکتا ہے جو مادے کا حقیر ترین جزو ہو۔ اس لحاظ سے ایٹم پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے جو نہ صرف مادے کا بنیادی جزو ہے بلکہ اس میں وزن بھی پایا جاتا ہے، اگرچہ وہ حقیر ترین سہی۔ واضح رہے کہ مادہ (MATTER) کی بنیادی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ چیز جس میں وزن اور مقدار پائے جائیں۔ ایٹم چونکہ مادے کی اکائی ہے اس لیے یہ دونوں خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں[۱]

---

[۱] جدید سائنس کی یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت ہے کہ وہ کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کے کروڑوں اربوں گنا حصے تک کو صحت اور درستی کے ساتھ ناپ اور تول سکتی ہے۔ چنانچہ ایٹم کا وزن بھی معلوم کرلیا گیا ہے۔ ہائیڈروجن کے ایک ایٹم کا وزن ایک گرام کا ۱.۶۷ ۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ۶ء ویں حصہ ہوتا ہے، جس کو مختصر طور پر اس طرح لکھا جاتا ہے: ۲۴-۱۰×۱.۶۷ — ملاحظہ ہو کتاب:- THE CHEMISTRY OF LIFE, By STEREEN ROSE,

وَلَآ اَصْغَرَ : اس سے چھوٹا۔ یعنی ایٹم سے چھوٹا۔ لفظ "اصغر" اسم تفضیل کا صیغہ ہے، جو یہاں پر ایٹم سے اس کی نسبت ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس موقع پر معنوی اعتبار سے اس لفظ کی وسعت میں وہ تمام ذرات داخل ہو سکتے ہیں جو ایٹم سے نسبتاً چھوٹے ہوں، خواہ وہ الیکٹران پروٹان اور نیوٹران ہوں یا ڈیوٹران (DEUTERON)، پازیٹران (POSITRON)، میسان (MESON) اور فوٹان (PHOTON) وغیرہ۔ نیز آئندہ زمانہ مستقبل میں جتنے بھی نئے نئے ذرات منکشف ہوتے جائیں گے (ایٹم سے چھوٹے) وہ سب کے سب اس دائرے میں آجائیں گے۔ نیز اس میں کائناتی شعاعیں (COSMIC RAYS) وغیرہ بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح الفا شعاعیں، بیٹا شعاعیں اور گاما شعاعیں بھی، جو ایٹموں کے مرکزوں سے خارج ہوتی ہیں۔

وَلَآ اَكْبَرَ : اس سے بڑا، یعنی ایٹم سے بڑا۔ یہ بھی اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور اس کی معنوی وسعت میں ایٹم سے بڑے ذرات و مرکبات خواہ وہ سالمات (MOLECULES) کی شکل میں ہوں یا شہاب ثاقب وغیرہ ذرات اور بڑے بڑے اجزا کی شکل میں، سب کے سب داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ قرآن حکیم کی بلاغت نر اس کا کمال ہے کہ قیامت تک دریافت ہونے والے ہر قسم کے ذرات اور اجزا ـــــ خواہ وہ کتنے ہی

P, 25, PENGUIN BOOKS LONDON, 1977 ـــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے ایک گرام وزن مقدار مادہ (MASS) میں ۱۰^۲۴ ایٹموں کی تعداد ہوتی ہے۔ یعنی عدد ایک کے بعد ۲۴ صفر لگا دینے سے جو عدد بنتا ہے وہ ایٹموں کی تعداد کو ظاہر کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب :- THE KEY TO THE UNIVERSE (A REPORT ON THE NEW PHYSICS), BY NIGEL CALDER, P.17 B.B.C. LONDON, 1977 ـــــ نیز ملاحظہ ہو :- THE ENCYCLOPEDIA OF IGNORANCE, EDITED BY RONALD DUNCAN, P.38, OXFORD, 1968.

اسی طرح ایک ہائیڈروجن ایٹم کی موٹائی یا اس کا قطر ایک سنٹی میٹر کے دس کروڑویں حصے (۱ x ۱۰^-۸) کے برابر ہوتا ہے۔ (کیمسٹری آف لائف، ص ۲۵، حوالہ بالا) ـــــ یہ تو ہائیڈروجن جیسے سادہ ترین ایٹم کی مقدار مادہ کا بیان ہوا، جو بنیادی طور پر ایک الیکٹران اور ایک پروٹان کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اور ایٹم کے اصل وزن میں پروٹان ہی کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جب کہ الیکٹرون کا وزن یا اس کے مقدار مادہ پروٹان کے مقابلے میں ۱۸۳۶ واں حصہ ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو : ASIMOV'S GUID TO SCIENCE, VOL. 1, P. 295, PELICAN BOOKS, LONDON, 1977.

ہی چھوٹے اور کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں ـــــ اس دو حرفی کوزے " وَلَآ اَصۡغَرَ مِنۡ ذٰلِکَ وَلَآ اَکۡبَرَ " میں سما جائیں گے۔ بلکہ " ھَل من مزید " کی صدائیں بھی بلند کرتے رہیں گے۔

نیز یہاں پر سماوات کے تذکرے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اجرامِ سماوی میں بھی اسی قسم کا جوہری (ATOMIC) اور عنصری نظام قائم ہے۔ ان حقائق کے اظہار و انکشاف سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ کائنات کا کوئی بھی بھید اور صحیفۂ فطرت کا کوئی بھی رازِ سربستہ خالقِ کائنات کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے علمِ ازلی کی رو سے ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز حتّٰی کہ ایٹم اور اس کے ذرات تک کا اس کو علم ہے اور ایک ایک ذرے کی تفصیل " کتابِ مبین " میں مذکور ہے۔ اس سے اس کی زبردست حساب دانی اور زبردست علم کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ایٹم اتنی چھوٹی سی چیز ہے کہ صرف ایک قطرۂ آب میں موجود شدہ ایٹموں کی تعداد کو پوری دنیا کے تمام انسان عمر بھر گن نہیں سکتے[۲] اس سے آپ پوری دنیا اور کل کائنات میں موجود شدہ ایٹموں کی تعداد کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ نیز یہاں پر اس حقیقت کا اظہار بھی مقصود ہے کہ تم ایٹم اور اس کے اندرونی اجزا سے موجودہ دور ـــ بیسویں صدی ـــ میں واقفیت حاصل کر سکے ہو مگر ہم ان چیزوں کی اصلیت سے اس وقت سے آگاہ ہیں جب سے کہ یہ سب عنصری نظام کے تحت اس جہان آب و خاک میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان سب کی تخلیق ہم نے ہی کی ہے۔ لہٰذا ان اشیا کی حقیقت و ماہیت کو صحت اور خوبی کے ساتھ جاننے والی ہستی ان کے خالق سے بڑھ کر اور کون ہو سکتی ہے؟

اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ۔

کیا وہ بے خبر رہ سکتا ہے جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ بہت باریک بین اور باخبر ہے۔

ایٹم کا مطالعہ ایک وسیع علم (ایٹمک فزکس) کے تحت کیا جاتا ہے۔ اس کے اسرار و عجائب کی انتہا نہیں ہے۔ مگر یہ محض نظری علم نہیں بلکہ عملی اہمیت کا علم ہے۔ ایٹم کا خالق اور اس کے ضابطوں کو بنانے والا بھی خالقِ ارض و سما ہی ہے وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا۔ ایٹم کا اندرونی

---

[۲] پانی کے ایک قطرے میں تقریباً ۳,۳۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ ایٹم ہوتے ہیں، ملاحظہ ہو کتاب " سائنس کی دنیا " از ولیم ایچ کراوز، مترجم ایم ایم بیگ، ص ۱۶

نظام نہایت درجہ محکم اور محیر العقول ہے جو " صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ "[۹۳] کا نظارہ پیش کرتا ہے، نیز " وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ "[۹۴] کا صحیح نظارہ ہمیں عناصر (ELEMENTS) اور سالمات (MOLECULES) ہی کی دنیا میں نظر آتا ہے۔ عناصر کے مفرد خواص اور اُن کی باہمی ترکیب کیمیاوی سے وجود میں آنے والے نئے نئے خصائص کے مطالعے سے عقلِ انسانی بالکل چکرا جاتی ہے اور رب العالمین کی قدرت و ربوبیت کا اقرار کیے بغیر چارۂ کار نہیں رہتا، سوائے ان لوگوں کے جن کی عقل پہ یا تو پردہ پڑ چکا ہے یا جن کی آنکھیں بے نور ہو گئی ہوں۔

مختلف اشیا میں موجود شدہ عناصر اور سالمات کے اس تفصیلی مطالعہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے، اس کو ہم قرآنی اصطلاح میں "علم المقادیر" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی "مقداروں کا علم"۔ مثلاً فلاں چیز میں کیمیاوی عناصر کس کس مقدار میں اور کس کس تناسب کے ساتھ ہیں۔ یہ علم فکری و عملی دونوں حیثیتوں سے اہم ترین بھی ہے اور مفید ترین بھی۔ قرآنِ حکیم کی مختلف آیات میں اس عالمِ آب و خاک میں پائے جانے والے ان اجزا و عناصر کا تذکرہ بطور اشارہ اس طرح کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ (المومنون : ۱۲)

اور یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا ہے۔

اس بلیغ حقیقت کی صداقت جدید ترین تحقیقات کی رو سے اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ موجودہ دریافت شدہ ۱۰۴ عناصر میں سے انسان اور دیگر اکثر موجوداتِ عالم کی تخلیق صرف ۱۴ عناصر: ہائیڈروجن، نائیٹروجن، کاربن، آکسیجن، کلورین، سوڈیم، میگنیشیم، سلیکون، فاسفورس، پوٹاشیم اور کیلشیم سے ہوئی ہے۔ انسانوں اور دیگر حیوانات کے علاوہ نباتات میں بھی یہی چودہ بنیادی اجزا یا "مٹی کا خلاصہ" (سُلٰلَة من طين) پائے جاتے ہیں۔ اصل میں یہ خمیر مایہ یا پروٹوپلازم (PROTOPLASM) کے بنیادی عناصر ہیں جو دنیا بھر کے تمام حیوانات و نباتات میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے حسبِ ذیل آیتِ کریمہ حد درجہ بلیغ اور معنی خیز ہے:

---

۹۳ یہ اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط و مستحکم بنایا ہے۔ (النمل : ۸۸)

۹۴ اور ہر چیز اس کے پاس ایک خاص مقدار کے ساتھ ہوتی ہے۔ (الرعد : ۸)

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ (نوح : ۱۷)

اور اللہ نے تم کو زمین سے نباتات کی طرح اُگایا ہے۔

یہ بڑی بلیغ اور حقیقت افروز تشبیہ ہے۔ اس کا مطلب دورِ قدیم میں جو کچھ بھی سمجھا گیا ہو، ظاہر ہے کہ اس سے مراد انسانوں اور نباتات کے عناصر کے اتحاد کی طرف اشارہ ہے۔ مگر صاحب تفسیر کبیر کی داد دینی پڑے گی کہ انھوں نے صدیوں قبل اس کی حسبِ ذیل تشریح کرکے اپنی علمی بصیرت اور دُور بینی کا ثبوت پیش کیا ہے:[۵]

انما یخلقنا من النطف وھی متولدۃ من الاغذیۃ من النبات المتولد من الارض؛

اللہ ہم کو ان نطفوں سے پیدا کرتا ہے جو غذا کی پیداوار ہیں، اور غذا نباتات کی پیداوار ہے، اور نباتات زمین کی پیداوار ہیں۔

نباتات کے مختلف اجزا و عناصر سے مرکب ہونے کی طرف اشارہ حسبِ ذیل آیت کریمہ سے بھی واضح ہوتا ہے:

وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ۝ (الحجر: ۱۹)

اور ہم نے زمین میں ہر چیز وزن کی ہوئی اُگائی ہے۔

یہ عالمِ نباتات کے لیے ایک بہت بڑا کلیہ اور ہمہ گیر اصول ہے کہ اس کی ہر چیز "موزون" ہوتی ہے۔ یہ لفظ "وزن" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں "تولی ہوئی چیز"۔ یہاں قرآنی بلاغت ملاحظہ ہو، یہ نہیں فرمایا کہ ہم نباتات تول تول کر پیدا کر رہے ہیں، بلکہ یہ فرمایا کہ عالمِ نباتات سے تعلق رکھنے والی ہر چیز تول کر یعنی ایک متعین مقدار اور متعین حساب کے تحت پیدا کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے نہ صرف کسی بھی پیڑ پودے کی ایک ایک پتی، ایک ایک گل بوٹا اور ڈالی ڈالی متعین مقدار اور نپی تلی ہوئی بطنِ ارض سے نمودار ہوتی ہے بلکہ اس کے ثمرات و حاصلات میں کارفرما ان کے اندرونی غذائی مانے تک مثلاً موادِ لحمیہ (PROTIENS)، موادِ نشاستیہ (CARBOHYDRATES)، موادِ شحمیہ (FATS)، معدنی نمکیات (MINERAL SALTS) اور مختلف قسم کے حیاتین (VITAMINS) وغیرہ تمام اجزا ـــ انسانی و حیوانی جسم کو نشو و نما دینے اور ان کی صحت و تندرستی کو برقرار رکھنے والے

---

[۵] تفسیر کبیر ۸/ ۲۱۷

ضروری اجزا و عناصر ـــــ سب کے سب متعین مقدار اور بالکل نپے تُلے انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان غذائی مواد کے جو سالمات اور مرکبات بنتے ہیں کیا مجال ہے کہ ان کے نظام میں کبھی ایک ایٹم یا ایک جوہر کی بھی تبدیلی یا ہیر پھیر واقع ہو جائے۔ جس چیز کے سالمے[۷] میں جتنے عناصر سیکڑوں ہزاروں سال پہلے ہوا کرتے تھے، آج بھی ان سالموں اتنے ہی ایٹم اسی ترتیب و تنظیم سے نمودار ہو رہے ہیں۔ زمانے کی تبدیلیوں، زمین کے مختلف خطوں، آب و ہوا کے تغیرات کا ان نظاموں پر کبھی کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیا یہ ایک حیرت انگیز نظام نہیں ہے؟ کیا ایسا حکیمانہ، منصوبہ بند اور محکم نظام محض بخت و اتفاق کے طور پر وجود میں آسکتا ہے یا محض بخت و اتفاق کے سہارے قائم و دائم رہ سکتا ہے؟

اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے "حیاتیاتی کیمیا" (BIOCHEMISTRY) "سالماتی حیاتیات" (MOLECULER BIOLOGY)، "خرد بینی حیاتیات" (MICRO BIOLOGY) "کیمیائی خرد بینی حیاتیات" (CHEMICAL MICROBIOLOGY) وغیرہ علوم کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ سب حیاتیات کی شاخیں ہیں اور وسعتِ مباحث کی بنا پر مستقل علوم شمار ہوتے ہیں۔ ان علوم کے مطالعہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و ربوبیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نباتاتی اور حیوانی زندگی کا ایک ایک ایٹم اور ایک ایک سالمہ تک حیرت ناک حد تک ایک پوشیدہ اور ان دیکھی تنظیم کی جلوہ افروزیوں کا مظہر نظر آتا ہے۔ ان آثار و مظاہر میں "شعور" اور "حساب دانی" کے بے شمار جلوے نظر آتے ہیں، جن کی تعبیر کے لیے خدا کو نہ ماننے والے سائنس داں ایک ہمہ گیر "ریاضیاتی ذہن" یا "ذہنی مادہ" وغیرہ قسم کی اصطلاحیں تراشتے ہیں۔ حالانکہ مادی اعتبار سے ان مظاہر کے اس قدر منظم و مربوط عمل اور عجیب و غریب کرشموں کی ـــ جو معجزاتِ ربوبیت کہلا سکتے ہیں ـــ کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی، بلکہ مجبوراً ایک زبردست ریاضی دان اور ذہین ترین ہستی کے وجود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

---

[۷] کسی چیز کا سالمہ (مالیکیول) دو یا دو سے زیادہ عناصر کے مجموعے کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً پانی کا ایک سالمہ ہائیڈروجن کے دو ایٹموں اور آکسیجن کے ایک ایٹم کا مجموعہ ہوتا ہے اور اس قاعدے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی حال دیگر تمام اشیا کا بھی ہے، جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے۔

قرآن اور بعض طبیعیاتی مظاہر

قرآن حکیم اصلاً علوم و فنون کی کتاب نہیں ہے۔ مگر ضمناً اس میں تمام علوم و فنون کا تذکرہ مل جاتا ہے۔ پچھلے باب میں "باطنی نعمتوں" کے تحت مادہ کے پوشیدہ اسرار بلکہ ایٹمی قوت تک کا تذکرہ ـــ معنوی اعتبار سے ـــ موجود ہونے کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اسی طرح پچھلے صفحات میں مذکورہ "مقدار" "قدر" اور "تقدیر" وغیرہ کے تحت ہر قسم کے مادی اسرار اور مادی قوتیں (برق، بھاپ، روشنی اور مقناطیس وغیرہ) بھی آجاتی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے ازل ہی سے ایک متعین ضابطے کے تحت مادے میں جاری و ساری کر رکھا ہے۔

طبیعیات (PHYSICS) کے ان مظاہر میں سے قرآن مجید میں آگ کا تذکرہ خصوصی حیثیت سے کیا گیا ہے، جو قدیم زمانے سے تمام انسانوں کے لیے یکساں طور پر قابلِ استفادہ رہی ہے۔ آگ اس حیثیت سے بھی اہم ہے کہ وہ ہماری گھریلو اور تمدنی ضروریات کے علاوہ بھاپ اور روشنی کا بھی ایک ماخذ ہے۔ آگ کی اسی تمدنی اہمیت کی بنا پر اس کا تذکرہ بطور ایک نعمتِ خداوندی ایک اعجازی انداز میں کیا گیا ہے:

أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ۝

(الواقعہ ۷۱، ۷۲)

اچھا ذرا بتلاؤ تو سہی جس آگ کو تم سلگاتے ہو، اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا (اس کو) ہم پیدا کرنے والے ہیں؟

قرآن حکیم ایک زندۂ جاوید کلام ہے، جس میں اشاروں ہی اشاروں میں ایسی آفاقی صداقتیں بیان کردی جاتی ہیں جو ہر دور کے احوال و کوائف پر صادق آسکتی ہوں۔ چنانچہ یہاں پر بھی مذکورۂ بالا آیت کریمہ کے بعد متصلاً ارشاد ہوتا ہے:

نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝ (الواقعہ ۷۳، ۷۴)

ہم نے اس آگ کو (ہر قسم کے) مسافروں[۵] کے لیے ایک یادگار اور فائدہ بخش چیز بنا دیا ہے۔ لہٰذا تم اپنے زبردست رب کے گن گاؤ۔

---

[۵] یہاں پر لفظ "مقوین" بہت اہم ہے۔ مفسرین نے اس کے دو معنی بیان کیے ہیں: (۱) "مستفعین" یا

آگ زمانۂ قدیم میں جس طرح ایک مفید شے اور ایک اہم تمدنی ضرورت تھی، دورِ جدید میں وہ اس سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ بلکہ ایک ایسی اہم ترین اور بنیادی شے جس کے بغیر آج ہم کسی سفر یا سواری کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے یہ ایک بہت بڑی پیش گوئی کی تھی جو آج پوری ہو چکی ہے اور آئندہ بھی ہر دور میں پوری ہوتی رہے گی۔ فرمایا یہ جارہا ہے کہ "آگ سفر کرنے والوں کے لیے ایک یادگار اور نفع بخش چیز ہے۔" اس کلیے کی صداقت جس طرح دورِ قدیم میں صادق آتی تھی (گرمی اور روشنی پہنچانے میں) اسی طرح وہ آج بھی صادق آرہی ہے اور بھاپ اور پٹرول وغیرہ کی صورت میں ہر قسم کی سواریوں کو چلا رہی ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ سواریوں میں کام آنے والا ایندھن خواہ وہ لکڑی اور کوئلے کی شکل میں ہو یا پٹرول اور ڈیزل وغیرہ کی شکل میں، سب کا سب کاربن کہلاتا ہے جو نباتات میں سے حاصل ہوتا ہے۔ پٹرول بھی کاربن ہی ہے جو ایک نظریے کے مطابق قرن ہا قرن پہلے درختوں سے بھرے ہوئے جنگلات کے زمین میں دب جانے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

ان آیاتِ کریمہ کی بلاغت ملاحظہ ہو کہ اس موقع پر یہ نہیں فرمایا جارہا ہے کہ تم لکڑیاں جلارہے ہو یا

"مستمتعین" - یعنی فائدہ اٹھانے والے۔ اس صورت میں مسافر یا مقیم کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ یہ سب کے لیے عام ہے۔ ملاحظہ ہو:-

تفسیر ابن کثیر ۴/۲۹۷

تفسیر مجاہد، مرتبہ عبدالرحمان طاہر سورتی، ص ۶۰۱، مطبوعہ قطر

تفسیر تیسیر الکریم الرحمان، از عبدالرحمان بن ناصر، ۸/۷۲، مطبوعہ مکہ مکرمہ

(۲) مسافر لوگ۔ صاحب کشاف اور دیگر مفسرین نے اس کی توجیہ اس طرح کی ہے: المقوین، الذین ینزلون القواء وھی القفر۔ یعنی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بیابان میں پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ (تفسیر کشاف و جلالین و تفسیر ابن کثیر وغیرہ) - یہ اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے جس کو وسعت دے کر ہر قسم کے مسافرین کے لیے بولا جاسکتا ہے۔ یا پھر قولِ اول کے مطابق اس کا مفہوم عام ہی رکھا جاسکتا ہے اور معنی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ مطلب یہ کہ آگ یا آگ کے ماخذ سے فائدہ اٹھانا تو ایک عام بات ہوتی مگر مسافرین کے لیے اس میں ایک درجہ تخصیص ہے۔ اس طرح ایک لحاظ سے یہ عام ہے اور ایک لحاظ سے خاص۔

کوئلہ، پٹرول جلا رہے ہو یا کوئی دوسرا سیال ایندھن۔ بلکہ یہ فرمایا جا رہا ہے کہ " وہ آگ جو تم جلاتے ہو "۔ اس کلیے میں ہر قسم کا جدید سے جدید تر آتش گیر مادہ اور شعلہ پذیر ایندھن داخل ہو سکتا ہے اور اس طرح قیامت تک ایجاد ہونے والے ہر قسم کے نئے نئے ایندھنوں کا بھی بخوبی احاطہ ہو سکتا ہے، جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے نباتات سے ہو۔ اس حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ گویا کہ نئی نئی ایجاد ہونے والی سواریوں کی طرف بھی اشارہ اور بہت بلیغ پیش گوئی ہے، جس کی وسعت میں راکٹ اور خلائی جہاز وغیرہ سب داخل ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسری آیتِ کریمہ میں بھی نئی نئی سواریوں کے وجود میں آنے کی خبر چودہ سو سال پہلے ہی دی جا چکی ہے:

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ٥ (نحل: ۸)

اور اس نے گھوڑے، خچر اور گدھے بھی پیدا کیے، تمھاری سواری اور زینت کی خاطر۔ اور وہ (آئندہ) ایسی (سواریاں) پیدا کرے گا جن کو تم (اس وقت) نہیں جانتے۔

دورِ قدیم میں سواریوں کا دار و مدار گھوڑوں، گدھوں اور خچروں پر ہی تھا، اور یہ سواریاں اس دور میں بہت معزز اور قابلِ فخر سمجھی جاتی تھیں۔ جیسا کہ اس موقع پر لفظ " زینۃ " کے استعمال سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کا تذکرہ کرنے کے بعد اصولاً بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ مستقبل میں نئی نئی سواریاں وجود میں لائے گا۔[۵] یہاں پر فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ تمدنی ہنگاموں کی اصل بھاگ دوڑ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے اور یہ سارے ہنگامہ ہائے حیات اس کے ازلی منشا و منصوبے کے ماتحت رواں دواں ہیں۔

غرض آگ دراصل کاربن اور کاربونک اشیا کے جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ عنصر (ELEMENT) ہماری زندگی میں بہت اہم مقام رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ ہماری زمین کے پرت کا صرف ۰.۰۳ فی صد حصہ ہے لیکن پھر بھی یہ اہم ترین عناصر میں سے ایک ہے۔ پودوں، جانوروں اور تمام جانداروں کے جسم میں یہ

۵؎ اور اس میں برقی و بھاپ اور ایٹمی قوت اور سیال ایندھن وغیرہ ہر قسم کی قوتوں سے چلنے والے موٹر، ٹرین، ہوائی جہاز، اسٹیمر اور خلائی جہاز وغیرہ سب کے سب شامل ہو سکتے ہیں۔

عنصر موجود رہتا ہے۔ قدرت میں یہ عنصر کوئلے، پٹرولیم، کھریا اور چونے کے پتھروں جیسے مرکبوں کی شکل میں پایا جاتا ہے[۹]

آگ اور کاربن کی یہ اہمیت وافادیت بہت ہی اہم ہے، جو نباتات کی دین ہے۔ دیگر جانداروں میں بھی کاربن نباتات کے ذریعے منتقل ہوتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے کارخانہ قدرت میں ایک حیرت انگیز تناسب قائم رہتا ہے۔

بہرحال کاربن کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر درختوں کی لکڑی دھڑا دھڑ جلنے اور آگ پکڑنے لگتی ہے، جس کا تذکرہ اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے:

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ٥ (یٰس، ۸۰)

وہی ہے جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کر دی، جس کو تم سلگاتے ہو۔

شیخ طنطاوی جوہری نے لکھا ہے کہ "مرخ" اور "عفار" نامی درختوں کی کچی شاخوں کو رگڑنے سے آگ نکلتی ہے[۱۰] مگر اس سے آیت کریمہ کا مفہوم بہت محدود ہو جاتا ہے۔ اصل مفہوم وہی معلوم ہوتا ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا۔ نباتات کی جسامت کی بڑی مقدار کاربن پر مشتمل ہوتی ہے۔ خشک درختوں کے وزن کا ۴۵ ٪ بلکہ اس سے زیادہ حصہ کاربن کا ہوتا ہے۔ کاربن نامیاتی مرکبات (ORGANIC COMPOUND) کا غالب حصہ ہوتا ہے۔ اگرچہ فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار صرف ۰۳.۰ ٪ ہے مگر یہی جزو نباتات کے کاربن حاصل کرنے کا واحد ماخذ ہے[۱۱] اور کاربن ڈائی آکسائڈ صرف انہی چیزوں کے جلنے سے حاصل ہوتی ہے جن میں کیمیاوی عنصر کاربن موجود ہو[۱۲] یہ دراصل ربوبیت کے معجزات میں سے ہے کہ سبز درختوں میں کاربن جیسا عنصر شامل کر کے انھیں جلنے کے قابل بنا دیا گیا۔ اصل میں عناصر کی یہ نیرنگیاں اور کارفرمائیاں بڑی ہی عجیب وغریب اور حیرت انگیز ہیں، جو انسانی فہم و

۹ے علم کیمیا، جلد دوم

۱۰ے تفسیر الجواہر، ۷/۱۵۴

۱۱ے A class book of Botany, by A.C. Dutta, p.229, Oxford University press, 1978.

۱۲ے علم کیمیا، حصہ دوم ص ۱۱۴

دانش سے بالاتر معلوم ہوتی ہیں، جیساکہ تفصیلات گزر چکیں انسان کا علم ہمیشہ "ظاہری آثار و مظاہر" ہی تک محدود رہتا ہے اور حقیقت حال تک رسائی کسی حال میں بھی نہیں ہو سکتی۔

خدائی نعمتوں کا فلسفہ

قرآنِ حکیم میں یہ اور اس قسم کی دیگر آیات کا تذکرہ بنیادی طور پر بگڑے ہوئے عقائد و نظریات کی اصلاح کے طور پر کیا گیا ہے۔ نیز نوعِ انسانی پر خداوندکریم کی مختلف نعمتوں کا ذکر کرکے اس کے جذبۂ احسان شناسی کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان خدا کے ساتھ باغیانہ رویہ ترک کرکے اس کے ساتھ وفاداری کی روش اختیار کرے۔

یہ ہوا ان علوم کا دینی و علمی اور فکری و نظریاتی پہلو، جو تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ اور اس کا دوسرا رُخ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان علوم کی ترقی سے بہت سے دنیوی فوائد ـــ معاشی، تمدنی، فوجی اور سیاسی وغیرہ ـــ بھی مقصود ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کائنات اور نظامِ کائنات میں سطحی غور و فکر اور سطحی مطالعہ سے کوئی ٹھوس، پائیدار اور استقرائی نتیجہ نکل نہیں سکتا، جب تک کہ منظم طور پر مشاہدہ و تجربہ نہ کیا جائے۔ یہ منظم مشاہدہ و تجربہ ـــ جو استقرا کی جان ہے ـــ عملی سائنس کی بنیاد بھی ہے۔ اس طرح عملی سائنس کے ظہور کے ساتھ ہی مختلف قسم کے آلات و اوزار وجود میں آتے ہیں، جن کے لیے نئی نئی صنعتیں جنم لیتی ہیں، نئی نئی راہیں کھلتی ہیں، نئے نئے اکتشافات ظہور پذیر ہوتے ہیں، مادے کے پوشیدہ حقائق ـــ قوانینِ فطرت ـــ ظاہر ہوتے ہیں۔ اس طرح ان علوم کی ترقی کے نتیجے میں لازمی طور پر مختلف نعمتوں کا ظہور ہونے لگتا ہے اور تمدن بھی آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگتا ہے۔ اس حیثیت سے دنیا کی تمام چیزیں اور تمام نعمتیں قابلِ استفادہ ہیں، جو اُن علوم کی ترقی کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہیں:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ق (بقرہ: ۲۹)

وہی ہے جس نے زمین کی ساری چیزیں تمھارے لیے پیدا کیں۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ ط (ملک: ۱۵)

وہی ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے رام کر دیا کہ اس کے کندھوں پر چلو پھرو اور اللہ کا رزق کھاؤ۔

غور فرمائیے یہ نعمتیں کیا ہیں اور ان کا فلسفہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ کائنات میں غور و فکر کے نتیجے

میں قدرت کے جو اسرار ظاہر ہوتے ہیں اور پھر اُن اسرار کے ظہور کے نتیجے میں جو دلائل خدا پرستی کے حق میں مدوّن ہوتے ہیں، ان کا صلہ اور انعام ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب اسکیم ہے کہ نظامِ کائنات کے سربستہ رازوں کی نقاب کشائی سے اس کی توحید، قدرت و ربوبیت اور حکمت و منصوبہ بندی وغیرہ کے جو دلائل بے نقاب ہوجاتے ہیں، خواہ ان اسرارِ سربستہ کی نقاب کشائی فرماں بردار لوگ کریں یا نافرمان لوگ۔ مگر جو بھی یہ کام کرے گا وہ انعام واکرام کے طور پر ان نعمتوں کا مستحق بنے گا۔ جو اس علمی و فکری عمل کے لازمی نتائج و ثمرات کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

دنیوی نعمتوں کی اس تقسیم میں اگرچہ فرماں برداروں اور نافرمانوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے مگر قانونِ فطرت کے مطابق جو قوم اس میدان میں آگے بڑھتی ہے وہ گویا کہ ان دنیوی نعمتوں کی حق دار بن جاتی ہے اور جو قوم ان نعمتوں کے بٹورنے میں پیچھے رہ جاتی ہے وہ قانونِ فطرت کے مطابق دنیا کے اسٹیج سے اتار دی جاتی ہے یا خلافتِ ارض کے میدان میں پیچھے ڈال کر دیگر اقوام کی غلامی یا حاشیہ بردار بنا دی جاتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی   جو بڑھ کر خود اُٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

تاریخِ اسلام شاہد ہے کہ مسلم قومیں جب تک سائنسی علوم کو سینے سے لگائے تسخیرِ موجودات میں منہمک رہیں وہ بڑی آن بان کے ساتھ سریر آرائے سلطنت رہیں اور دیگر قوموں پر ان کی دھاک بیٹھی رہی۔ جس طرح کہ آج یورپ اور امریکہ کی دھاک دیگر اقوام پر بیٹھی ہوئی ہے۔ مگر جیسے ہی انھوں نے اس وظیفے کو ترک کیا وہ مغلوب و مقہور ہوگئیں۔ حتیٰ کہ پوری پانچ صدیاں گزر جانے کے باوجود آج تک ان کی ذلّت و مسکنت کا یہی حال ہے، جب کہ آج عددی اعتبار سے پورے چالیس ممالک ان کے قبضے میں ہیں اور یہ ذلت و مسکنت اس وقت تک باقی و برقرار رہے گی جب تک کہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر پھر سے اپنا "وظیفۂ حیات" جاری نہ کردیں اور پھر سے "میراثِ آدم" پر قابض نہ ہوجائیں۔ آج "علم آدم" اور "علم اسما" پکار پکار کر ہیں "خلافتِ ارض" کی طرف پھر سے متوجہ ہونے کی دعوت دے رہے ہیں **فھل من مدّکر؟**

ایک دوسرے نقطۂ نظر سے غور کیجیے۔ پچھلے صفحات میں قرآن کے جو عظیم اور ہمہ گیر کلیات (علم قادیہ کے طور پر) بیان کیے گئے ہیں، ان کی صداقت کا صحیح حال مادی علوم کے تفصیلی مطالعے کے

بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، اور یہ تفصیلی مطالعہ اسی وقت عمل میں آسکتا ہے جب کہ یہ علوم پوری طرح ترقی کر چکے ہوں۔ لہٰذا قرآنی نقطۂ نظر سے ان علوم کی ترقی مطلوب ہے، اور اس سے دوہرے دینی و دنیوی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اگر مسلمان قوم میں قرونِ وسطیٰ کی طرح موجودہ دور میں بھی ان علوم و فنون میں امام ہوتیں اور جدید تحقیقات میں ان کا بھی حصہ ہوتا تو ان علوم کی غلط اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے تشریح و توجیہہ کے باعث جو عالمگیر فکری بے راہ روی اس وقت پائی جا رہی ہے وہ ہرگز رونما نہ ہوتی۔ اور اس نقطۂ نظر کے موجودہ تمدن میں جو غلط اور مضر رجحانات ـــــ خدا بیزاری اور آخرت فراموشی کی وجہ سے ـــــ پیدا ہو گئے ان کا سدِّ باب ہوتا، اور عالمِ انسان جن ہلاکت خیزیوں سے اس وقت دوچار ہے، اُن سے وہ محفوظ رہتا۔ اس طرح اُمتِ مُسلمہ کے اس میدان میں پیچھے رہ جانے کے باعث عالمِ انسانی کو دوہرے اور عظیم نقصانات سے دوچار ہونا پڑا ہے، جس کی تلافی بہت مشکل سے ہوسکے گی۔

علمِ کیمیا اور طبیعیات کی تفصیلات

واضح ہوگیا کہ خدائی نعمتوں کو بٹورنے کے لیے سائنسی علوم و فنون یا علمِ اسما یا اور زیادہ صحیح معنوں میں "علمِ آدم" کی ضرورت ہے جو قوم یا ملّت ان علوم سے بے بہرہ رہے گی وہ نہ تو خدائی نعمتوں کی مستحق بن سکے گی اور نہ ہی صحیح معنی میں خلیفہ کہلا سکے گی۔ یہ علوم دراصل وہ "چابیاں" ہیں جن سے "خلافتِ ارض" کے تمام بند دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہ کوئی جادو یا طلسم یا "خفیہ منتر" نہیں بلکہ خدا کے مقرر کردہ مادی قوانین و ضوابط ہیں جن کا علم نظری اعتبار سے حضرت آدم کو دیا گیا تھا اور عملی اعتبار سے تمام بنی آدم کو سونپا گیا ہے۔

ان علوم کی اس بنیادی اہمیت کے پیشِ نظر طبیعیات و کیمیا کی ـــــ جو ان میں سب سے زیادہ اہم ہیں ـــــ تھوڑی سی تفصیل بیان کرکے ان کی اہمیت و افادیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ اندازہ ہوسکے کہ خلافتِ ارض کی تکمیل کی راہ میں ان علوم کی کتنی اہمیت ہے اور ان علوم سے غافل ہو کر آج ہم اس میدان میں کس قدر پیچھے ہو گئے ہیں۔

علمِ کیمیا اور طبیعیات کو طبیعی علوم (PHYSICAL SCIENCES) بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی تعریف اور شاخیں حسبِ ذیل ہیں:

طبیعیات (PHYSICS) : وہ سائنس ہے جس میں مادہ (کل اشیائے عالم) میں پائی جانے والی قوتوں: (۱) حرارت (۲) برق (۳) مقناطیس (۴) روشنی (۵) اور آواز کے اصولوں سے بحث کی جاتی ہے، اور ان قوتوں (ENERGIES) کے اثرات مادے پر دکھائے جاتے ہیں۔

طبیعیات کی حسبِ ذیل شاخیں ہیں:

۱۔ حرارت	HEAT AND THERMODYNOMICS
۲۔ آواز	SOUND
۳۔ روشنی	LIGHT
۴۔ برق	ELECTRICITY
۵۔ مقناطیسیت	MAGNATISM
۶۔ جوہری طبیعیات	ATOMIC PHYSICS

کیمیا (CHEMISTRY) : وہ سائنس ہے جس میں دنیا کی تمام مادی اشیا کی بناوٹ، ان کی ساخت پرداخت اور ان کے کیمیاوی تغیرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یعنی کوئی شے کن کن عناصر سے مرکب ہے اور اس کے خواص و تاثیرات کیا ہیں؟ نیز یہ کہ مختلف عناصر یا مادوں کو ملا کر کس طرح نئے نئے مرکبات اور نئی نئی مصنوعات پیدا کی جاسکتی ہیں وغیرہ۔ مختصر الفاظ میں علمِ کیمیا نام ہے اشیا کی خصوصیات اور ان کی تبدیلیوں کو متعین کرنے کا۔

علمِ کیمیا کی اہم شاخیں یہ ہیں :

۱۔ غیر نامیاتی کیمیا	INORGANIC CHEMISTRY
۲۔ نامیاتی کیمیا	ORGANIC CHEMISTRY
۳۔ حیاتیاتی کیمیا	BIOCHEMISTRY
۴۔ ارضیاتی کیمیا	GEOCHEMISTRY
۵۔ معدنیاتی کیمیا	MINERAL CHEMISTRY
۶۔ طبیعیاتی کیمسٹری	PHYSICAL CHEMISTRY

علمِ کیمیا اور طبیعیات کے یہ تمام علوم اگرچہ بہت اہم اور بنیادی ہیں اور ان کا ایک دوسرے کے

ساتھ بہت گہرا باہمی تعلق بھی ہے۔ مگر ان میں نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا، حرارت، برق اور جوہری طبیعیات سب سے زیادہ اہم اور عظیم افادیت کے حامل ہیں۔ موجودہ تمدن میں کیمیاوی مصنوعات، برقی آلات (ELECTRONICS)، جوہری توانائی (ATOMIC ENERGY) اور جوہری آئی سوٹوپ (ISOTOPE) وغیرہ کی جو کرشمہ سازیاں نمودار ہو رہی ہیں، وہ انہی علوم کی بنا پر ہے۔ جوہری طبیعیات کا علم اب اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ اب اس کے مرکزہ کا علم "مرکزائی طبیعیات" (NUCLEUR PHYSICS) کے نام سے الگ ہو گیا ہے۔

اسی طرح آج الیکٹرونکس اور ٹیلی کمیونیکیشن بھی اپنی وسعتِ مباحث کے اعتبار سے "برق" سے الگ مستقل علوم بن گئے ہیں۔ اور ان موضوعات پر اتنا لٹریچر منظر عام پر آ گیا ہے کہ ان سب کو پڑھنا ہی دشوار ہو گیا ہے۔ یہ علوم محض نظری نہیں ہیں بلکہ عملی اہمیت کے حامل ہیں اور آج صرف برقیات (الیکٹرونکس) کی ہزاروں صنعتیں (INDUSTRIES) کام کر رہی ہیں۔ مثلاً بجلی کے بلب، گھنٹیاں، مختلف قسم کے میٹر، پنکھے، ہیٹر، ریفریجیریٹر، گھڑیاں (الیکٹرونک)، ریڈیو، ٹرانسسٹر، ٹیپ ریکارڈ، ٹیلی وژن، ٹیلی فون، ٹیلکس، ٹیلی پرنٹر اور راڈر وغیرہ وغیرہ ہزاروں قسم کی چیزیں جن کا شمار بھی مشکل ہے، سب الیکٹرونکس ہی کی صنعتیں ہیں۔ صرف آپ کے مکان کی بجلی کے نظام میں استعمال ہونے والی چیزوں (مثلاً وائر، پلاسٹک پائپ، سیلنگ روز، ہولڈر اور سوئچ وغیرہ وغیرہ) ہی کو دیکھ لیجیے کہ اس کی صنعت اور انڈسٹری کتنی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

یوں تو آج دنیا میں مجموعی اعتبار سے لاکھوں صنعتیں کام کر رہی ہیں مثلاً بجلی اور بھاپ سے چلنے والی ہزاروں قسم کی مشینیں، موٹر، ٹرین اور ہوائی جہاز وغیرہ، اسی طرح فنِ زراعت میں استعمال ہونے والے جدید آلات، مشینیں اور کیمیاوی کھادیں وغیرہ، طب جدید میں استعمال ہونے والے بے شمار آلات، مشینیں اور ادویات وغیرہ، لوہے اور فولاد کی ہزاروں صنعتیں، پلاسٹک کی ہزاروں صنعتیں، ربر کی ہزاروں صنعتیں، پٹرولیم کی ہزاروں صنعتیں اور فوجی و عسکری آلات کی ہزاروں صنعتیں کام کر رہی ہیں۔ مگر ان تمام صنعتوں میں علمِ کیمیا اور طبیعیات کا عمل دخل بنیادی ہے۔ ان دو علوم کی کارفرمائی کے بغیر ان میں سے کوئی بھی صنعت وجود میں نہیں آ سکتی۔ اس اعتبار سے یہ علوم کسی بھی قسم کی صنعت و ٹکنالوجی کے لیے "منتر" کا کام کرتے ہیں۔ ان کے بغیر جدید صنعت و حرفت کا تصور بھی مشکل ہے۔

کوئی بھی کارخانہ قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے فنی اعتبار سے واقفیت حاصل کرنا اور متعلقہ صنعت کا فارمولا اور اس کے دیگر مسائل کا حل ان علوم کی روشنی میں نکالنا پڑتا ہے۔ اب جو لوگ ان علوم میں جس قدر زیادہ ماہر ہوں گے وہ اسی قدر خوبی اور حسنِ تدبیر سے اس کام کو نپٹا سکیں گے۔

ان علوم اور ان کے فوائد سے قطع نظر صرف معاشی نقطۂ نظر سے غور کیجیے کہ قوموں کی ترقی اور خوش حالی کے اعتبار سے یہ صنعتیں کتنی اہم ہیں۔ اس وقت روئے زمین پر لاکھوں صنعتیں کام کر رہی ہیں اور دنیا کی قوموں کے درمیان اس سلسلے میں سخت مقابلہ چل رہا ہے۔ آج قوموں کی زندگی صحیح معنوں میں صنعتوں سے وابستہ ہوگئی ہے اور جو قوم آج "بے صنعت" ہے وہ گویا کہ فقیر اور کنگال ہے، جو یا تو ترقی یافتہ قوموں کی محتاج اور غلام بنی رہے گی یا ان کا لقمۂ تر۔ اس کے علاوہ اور کوئی تیسری شکل نہیں ہے۔

غرض ان علوم کا ایک بنیادی خاکہ اور تصور ذہن نشین کر لینے کے بعد ان کے چند مزید اصول و کلیات کی تھوڑی سی تفصیل بیان کی جاتی ہے تاکہ ان کے اہم متعلقات و مباحث کا ایک جامع نقشہ سامنے آجائے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے ایٹم اور اس کے متعلقات کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے، جو علمِ طبیعیات و کیمیا کی جان اور دورِ جدید کی تمام ترقیوں کی گویا بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید طبیعیات اور کیمیا کا تعلق ایٹمی سائنس یا عناصر کے علم سے بہت گہرا ہے۔ علومِ طبیعی کا بیان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ عناصر کا بیان نہ کیا جائے اور ان عناصر کی مختلف مادوں اور مرکباتِ کیمیاوی کے ساتھ مطابقت نہ دکھائی جائے۔ (باقی آئندہ)

پروفیسر اختر راہی

سیّد مناظر احسن گیلانی

(آخری قسط)

قرآنیات

۱۔ تدوین قرآن :۔۔۔ پروفیسر محمد اجمل خان نے "جمع و تدوین قرآن" کے موضوع پر اخبار مدینہ (بجنور) میں ایک مقالہ لکھا جو نولڈیکی اور دیگر مستشرقین کی تحقیقات پر مبنی تھا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا جس سے قرآن مجید کی موجودہ جمع و ترتیب بلکہ اس کی حفاظت کے بارے میں شکوک پیدا ہوتے تھے۔

مولانا گیلانی نے پروفیسر محمد اجمل کے مقالے پر نقد و تبصرہ لکھا جو ایک کتاب بن گیا۔ یہ سلسلۂ مضامین کتاب کی صورت میں شائع نہ ہو سکا۔ اسی عرصے میں مولانا گیلانی کے ایک شاگرد نے "تدوین قرآن" کے موضوع پر ایم۔ اے (تفسیر) کے لیے مقالہ لکھا۔ مقالہ نگار مولوی غلام ربانی نے علامہ جلال الدین سیوطی کی "اتقان" اور الجزائری کی "تبیان" سے استفادے کے ساتھ ساتھ مولانا گیلانی کی درسی امالی سے استفادہ کیا نیز مولانا گیلانی کی غیر مطبوعہ کتاب کا جوہری خلاصہ تیار کیا اور مختصر سا تعارف لکھ دیا۔

"تدوین قرآن" خیالات اور انداز بحث و نظر کے اعتبار سے مولانا گیلانی کی تالیف ہے مگر ترتیب و تدوین مولوی غلام ربانی صاحب ہی کی ہے۔

۲۔ تفسیر سورۂ کہف :۔۔۔ مشہور حدیث نبویؐ ہے کہ دجال کے فتنے سے جو محفوظ رہنا چاہتا ہے، اس کو سورۂ کہف کی ابتدائی یا خاتمے کی آیات تلاوت کرنی چاہیے۔ اسی حدیث کے حوالے سے دجالی فتنے کا سورۂ کہف سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ مولانا گیلانی نے "دجالی فتنہ اور سورۂ کہف" کے زیر عنوان ایک طویل مضمون لکھا جو ماہنامہ "الفرقان" (لکھنؤ) میں ۱۲ قسطوں میں طبع ہوا[۱]۔ دوبارہ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

---

[۱] ذی الحجہ ۶۸ھ تا جمادی الاخریٰ ۷۱ھ

کی ترتیب و تدوین سے الفرقان (افادات گیلانی نمبر) میں شائع ہوا۔ غالباً حیدر آباد دکن سے کتابی صورت میں بھی چھپ چکا ہے۔

۳۔ ادبِ قرآنی :— مختصر سی کتاب ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد قرآن مجید کا ترجمہ بآسانی پڑھایا جا سکتا ہے۔

حدیث

۴۔ امالی صحیح مُسلم از افادات مولانا انور شاہ کاشمیری :— مولانا گیلانی نے اپنے استادِ گرامی مولانا انور شاہ کاشمیری کے صحیح مُسلم سے متعلق درسی افادات قلم بند کیے تھے مگر یہ افادات ضائع ہو گئے۔ ان درسی افادات کے بارے میں مولانا گیلانی نے لکھا ہے :

حضرت الامام الکشمیری کی تقریروں کے قلم بند کرنے کا ارادہ شاید اس فقیر سے پہلے کسی صاحب نے نہیں کیا تھا۔ یوں بھی عربی زبان میں حدیث کی تقریروں کی تعبیر کی روایت مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس فقیر کے بعد اس سے کہیں زیادہ لائق و فائق، قابل و فاضل، مستعد اور جفاکش محنتی طلبہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے گرد جمع ہو گئے، جنھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ قرار دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، معارف انوریہ کے اس بحرِ بیکراں کو قیدِ تحریر میں لانے کی کوشش کی جائے۔[۴]

۵۔ تدوینِ حدیث :— تدوینِ حدیث کے موضوع پر مولانا گیلانی نے لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلے کا پہلا لیکچر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے تحقیقی مجلہ میں طبع ہوا۔ اس لیکچر میں انھوں نے مذاق زمانہ کے مطابق علمِ حدیث کی تعریف، علمِ حدیث کی اہمیت، اس کی تاریخ اور اس کی محققانہ تدوین پر روشنی ڈالی۔ یہ لیکچر سیّد سلیمان ندوی صاحب کے مقدمے کے ساتھ ادارہ دعوت الحق حیدر آباد نے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ مولانا گیلانی کو یہ ایڈیشن پسند نہ آیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"تدوینِ حدیث کا یہ بالکل ابتدائی حصہ ایک پرچے میں شائع ہوا تھا۔ ایک صاحب نے اشاعت کی اجازت چاہی، میں نے کارِ خیر خیال کر کے اجازت دے دی۔ اب انھوں نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے تو آپ ہی بتائیں کہ اس میں فقیر کا کیا قصور ہے۔ کتاب انشاء اللہ تین چار سو صفحات پر ختم ہوگی۔ ابھی مکمل نہیں ہوئی، دوسرے کام درمیان میں آجاتے ہیں۔"[۵]

---

[۴] حیاتِ انور، ص ۵۱ [۵] اندازِ سخن، ص ۱۷۶۔ خط مکتوبہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۶ء۔

اس کے بعد مولانا گیلانی "تدوینِ حدیث" کے موضوع پر کام کرتے رہے اور ان کے مضامین رسائل میں طبع ہوتے رہے - اس سلسلے کے چار مضامین مولوی غلام محمد حیدر آبادی کی ترتیب و تدوین کے ساتھ مجلسِ علمی کراچی نے شائع کیے ہیں -

"تدوینِ حدیث" اپنے موضوع پر جامع کتاب ہے - مولانا گیلانی اسماء الرجال پر ایک باب لکھنا چاہتے تھے مگر زندگی نے وفا نہ کی -

سیرت و سوانح

۶- النبی الخاتم :- جناب عبدالمجید قرشی مدیر اخبار "ایمان" نے تحریکِ سیرت شروع کی تو ہر سال ۱۲ ربیع الاوّل کو سیرت کے جلسوں کے اہتمام کے ساتھ سیرت شناسی کے پمفلٹ اور کتابیں شائع کرتے تھے - قرشی صاحب نے سیرت کے موضوع پر برّ صغیر اور مصر و شام کے بہت سے اہلِ قلم سے مضامین لکھوائے اور انھیں عام کیا - اسی سلسلے میں مولانا مناظر احسن گیلانی سے ایک طویل مقالہ "النبی الخاتم" لکھوایا -

مولانا گیلانی نے اپنے مقالے میں سیرتِ رسول میں سوانحی ترتیب کا لحاظ نہیں برتا بلکہ ایک "داعیانہ رجز" کا انداز اختیار کیا ہے - "النبی الخاتم" اپنی اوّلیں صورت میں ایک مسلسل مضمون تھا - دوسرے ایڈیشن میں مولانا گیلانی نے ضمنی عنوانات دیے اور بعض رموز و کنایات کی کسی قدر وضاحت کی -

مؤلف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکّی اور مدنی زندگی کے بارے میں یہ نقطہ پیدا کیا ہے کہ مکّی زندگی، دل کی زندگی اور مدنی دورِ حیات، دماغ کی زندگی تھی - مؤلف نے کتاب میں غیر مسلم ملقوں کے اعتراضات بھی پیشِ نظر رکھے ہیں، چنانچہ انھوں نے اثباتِ نبوت پر تورات، اناجیل، بدھ کی تعلیمات اور ویدوں کے اقتباسات سے یہ واضح کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیشرو معلمینِ اخلاق پیش گوئی کرتے چلے آئے ہیں - اسی طرح اختصار سے اسلام کی دعوت اور پیش رفت کی تاریخ بیان کی ہے -

النبی الخاتم کا اندازِ بیان والہانہ اور البیلا ہے - الفاظ کے چناؤ اور فقروں کے دروبست پر مولانا نے خاصی محنت کی ہے - چھوٹے چھوٹے فقروں میں تاریخ کے طویل ادوار سمیٹ لیے گئے ہیں - قرشی صاحب نے "النبی الخاتم" کی ان ہی خصوصیات کے پیشِ نظر یہ رائے دی ہے کہ سیرت کی لائبریریاں

میں اس قسم کی کوئی دوسری کتاب موجود نہیں ہے۔ "النبی الخاتم" کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے ان گنت ایڈیشن طبع ہوئے اور مسلسل طبع ہو رہے ہیں۔

۷۔ ظہورِ نو یا نیا میلاد نامہ:—— سیرت کے موضوع پر یہ رسالہ اسلامک سوسائٹی پبلی کیشنز حیدر آباد نے شائع کیا ہے۔

۸۔ ابوذر غفاریؓ:—— صحابی رسولؐ حضرت ابوذر غفاریؓ کی دلچسپ سوانح حیات ہے۔ مولانا گیلانی کی اولین باضابطہ کتاب ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے یہی کتاب دیکھ کر فرمایا تھا کہ اس کتاب کا مولف آئندہ چل کر ایک عظیم محقق ثابت ہوگا۔ یہ کتاب چند بار ہندوستان و پاکستان میں طبع ہوئی ہے۔

۹۔ امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی:—— امام ابو حنیفہ اپنے فقہی کارنامے کے پیشِ نظر مؤلفین کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ان پر بیسیوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مولانا گیلانی نے ان کے زمانے کے سیاسی حالات اور ان حالات میں امام ابو حنیفہ کے کردار پر یہ ضخیم کتاب ترتیب دی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے الفاظ میں "اس میں اپنے موضوع پر جملہ متعلقہ مواد تو جمع کر دیا گیا ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ دیگر معلومات کا بھی ضمناً آجانا ممنوع رہا ہو۔ اس میں معلومات کا انبار ہے۔ لطیف استنباطات کی بھرمار ہے اور صبر سے اور بار بار پڑھنے والے کو ہر قدم پر اور ہر دفعہ نئی نئی چیزیں ملتی ہیں۔" یہ کتاب پہلی بار نفیس اکیڈمی حیدر آباد سے ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر حمید اللہ کے تعارف کے ساتھ شائع ہوئی۔

۱۰۔ تذکرۂ شاہ ولی اللہ:—— ۱۹۲۵ء میں ماہنامہ "الفرقان" (لکھنؤ) کا تاریخی شاہ ولی اللہ نمبر شائع ہوا۔ اس نمبر میں مولانا گیلانی نے ایک طویل مقالہ لکھا۔ یہی مقالہ "تذکرۂ شاہ ولی اللہ" کے نام سے طبع ہوتا رہا ہے۔ مولانا گیلانی نے اس مقالے میں شاہ ولی اللہ کے دور کے سیاسی حالات، ان میں شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی اور ان کے خانوادے کی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی علمی زندگی کا جامع جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالے میں بھی ان کا معروف اندازِ ترتیب پایا جاتا ہے۔ اکثر ضمنی باتوں پر کئی کئی صفحات لکھے ہیں مگر فائدے سے خالی نہیں۔

۱۱۔ سوانح قاسمی (تین جلدیں):—— مولانا محمد قاسم نانوتوی کی جامع سوانح حیات ہے۔ یہ مولانا گیلانی کی آخری تالیف ہے جو انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کی فرمائش پر قلم بند کی۔ تین

جلدوں میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔ چوتھی جلد شروع کی تھی جس میں مولانا نانوتویؒ کے علمی کارناموں کا جائزہ لینا مقصود تھا مگر ابھی چند صفحات ہی لکھے تھے کہ داعی اجل کا بلاوا آگیا۔

مولانا گیلانی آخری زمانۂ حیات میں یہ کتاب ترتیب دیتے ہوئے اکثر اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ ان کی علمی و تصنیفی زندگی کا آغاز "القاسم" سے ہوا اور شاید انتہا بھی القاسم (سوانح محمد قاسم نانوتویؒ) پر ہو جائے چنانچہ ان کی یہ بات درست ثابت ہوئی۔

معاشیات

۱۲۔ اسلامی معاشیات :۔ مولانا گیلانی برصغیر پاک و ہند کے ان چند گنے چنے علما میں سے ہیں جنھوں نے اسلام کے نظامِ معیشت پر قلم اٹھایا۔ مولانا گیلانی کے ایک شاگرد ڈاکٹر یوسف الدین صاحب نے "اسلام کے معاشی نظریے" کے زیرِ عنوان اپنا تحقیقی مقالہ لکھا۔ مولانا گیلانی نے ان کی رہنمائی کے لیے معاشیات کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا اور اسلام کے نظامِ معیشت پر غور و فکر کیا۔ اسی مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔ "اسلامی معاشیات" اپنے موضوع پر اوّلین کتابوں میں سے ایک ہے۔ ۱۹۴۷ء میں پہلی بار حیدرآباد سے طبع ہوئی۔

۱۳۔ اسلام اور نظامِ جاگیرداری و زمینداری :۔ مولانا گیلانی کا یہ مقالہ ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ) بابت دسمبر ۱۹۵۲ء اور جنوری ۱۹۵۳ء میں طبع ہوا۔ مولانا گیلانی اسے کتابی صورت میں چھپوانا چاہتے تھے۔ اسی مقصد کے لیے نظرثانی کے بعد انھوں نے یہ مقالہ مولانا ابوالخیر مودودی مرحوم کے حوالے کر دیا۔ آخر یہ مقالہ محکمہ اوقاف پنجاب (پاکستان) تک پہنچا۔ محکمہ اوقاف پنجاب کی جانب سے جناب محمد یوسف گورایہ صاحب نے تصحیح و تحشیہ کا فریضہ انجام دیا اور یہ مقالہ ۱۹۷۵ء میں کتابی صورت میں چھپ گیا۔ گورایہ صاحب اپنی تصحیح و تحشیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"زیرِ نظر مسودے پر کافی محنت کرنی پڑی۔ فقہائے اسلام کی قدیم، مبسوط اور مفصل کتب کے بے شمار حوالے دیے گئے ہیں ... ... مسودے کے تمام حوالوں کا اصل کتب سے مقابلہ کیا گیا۔ بعض حوالے مولانا مرحوم نے قدیم ایڈیشنوں سے لیے تھے اب وہ ایڈیشن بازار میں یا لائبریریوں میں موجود نہیں ہیں۔ ان کی جگہ نئے ایڈیشنوں نے لے لی ہے۔ ان حوالوں کو صحیح کیا گیا۔ مسودے میں ذیلی عنوانات نہ تھے مسلسل عبارت تھی۔ قارئین کی سہولت کے لیے ذیلی عنوانات قائم کیے گئے اور ان کی فہرست بنائی گئی ہے"[۴۹]

فقہ

۱۴۔ مقدمہ تدوینِ فقہ :۔۔۔ ۱۹۴۴ء میں مولانا گیلانی نے "تدوینِ فقہ" پر ایک مضمون پڑھا۔ دوبارہ اس کو مرتب کرنے بیٹھے تو کتاب کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کے ابتدائی سو صفحات جامعہ عثمانیہ کے تحقیقی مجلے میں طبع ہوئے، بعد میں ماہنامہ "برہان" (دہلی) بابت جنوری تا ستمبر ۱۹۴۵ء میں بقیہ حصہ طبع ہوا۔ مولانا گیلانی یہ کتاب مکمل نہ کر سکے۔ البتہ کتاب کے مقدمے میں انھوں نے فقہی اختلافات کی نوعیت کو تاریخی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا گیلانی کے یہ مضامین ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کی تصحیح و تحشیہ اور مناسب تدوین سے مکتبۂ رشیدیہ لاہور نے "مقدمہ تدوینِ فقہ" کے نام سے شائع کیے ہیں۔

تصوف و علم کلام

۱۵۔ رسالہ کائناتِ روحانی :۔۔۔ رسالے کا موضوع نام سے واضح ہے۔ مولانا گیلانی کی ابتدائی کاوشوں میں سے ہے۔ ابتداءً ماہنامہ "القاسم" (دیوبند) میں طبع ہوا، بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوتا رہا۔

۱۶۔ الدین القیم :۔۔۔ علمِ کلام پر مولانا گیلانی کے چند لیکچروں کا مجموعہ ہے۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں اہلِ عقل و فلسفہ کے اعترافِ عجز کا بیان ہے جو انھوں نے مسئلہ کائنات کے حل میں اپنی ناکامی کے بعد کیا ہے۔ دوسرے حصے میں متصوفانہ انداز سے مسئلہ کائنات کا حل پیش کیا گیا ہے۔ اسی حوالے سے ذاتِ باری تعالیٰ، صفاتِ باری تعالیٰ، رسالت و نبوت، معجزات و خوارقِ عادت، خیر و شر، قضا و قدر اور حقیقتِ زمانہ وغیرہ مسائل زیرِ بحث آئے ہیں۔

"الدین القیم" پہلی بار ۱۹۴۴ء میں طبع ہوئی تھی، اس کے بعد چند بار شائع ہوئی ہے۔

۱۷۔ مقالاتِ احسانی :۔۔۔ مولانا گیلانی کے مقالات کا یہ مجموعہ مولوی غلام محمد حیدر آبادی نے مرتب کیا اور مجلسِ علمی۔ کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعۂ مقالات میں مشہور طرقِ تصوف، طریقہ غزالیہ، طریقہ اشتغالِ مطلقہ نیز مثنوی معنوی اور فتوحاتِ مکیہ کے بعض مقالات کی تشریح شامل ہے۔

۱۸۔ اردو ترجمہ "عبقات" :۔۔۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ نے عربی زبان میں تصوف کے موضوع پر عبقات کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو طبع ہو چکی ہے۔ مولانا گیلانی نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو

اللجنۃ العلمیہ حیدرآباد نے شائع کیا۔

تعلیم

۱۹۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (دو جلد) :۔ مولانا گیلانی کی یہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت جامع ہے جس میں اسلام کے نظریۂ تعلیم، احیائے اسلام کے لیے مسلمانوں کی کوششیں، کتب خانے، کتب خانوں کا انتظام، مدارس کا قیام، علما کی حیرت انگیز خدمات اور کارنامے سب ہی کچھ زیرِ بحث آیا ہے۔ مکتبۂ برہان دہلی نے دو حصوں میں شائع کی ہے۔ حال ہی میں کتاب کا پہلا حصہ مناسب تدوین و تبویب اور ذیلی سرخیوں کے ساتھ دوبارہ چھپا ہے۔

متفرقات

۲۰۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ :۔ اس مقالے میں مولانا گیلانی نے اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ الملل والنحل قسم کی کتابوں میں مسلمانوں کے بھانت بھانت کے فرقوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ مگر ان فرقوں کا آج دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ مسلمانوں میں صرف دو ہی قابلِ ذکر گروہ ہیں اور یہ گروہ سنی اور شیعہ ہیں۔ مولانا گیلانی نے مسلمانوں میں فرقہ بندی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے معتزلہ، جبریہ اور جہمیہ وغیرہ فرقوں کا ذکر کیا ہے۔

۲۱۔ ہزار سال پہلے :۔ برصغیر پاک و ہند کے بارے میں مسلمان سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں جو مشاہدات و تاثرات بیان کیے ہیں، مولانا گیلانی نے مناسب تشریح کے ساتھ ان کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب سے ہزار سال پہلے کے ہندوستان کے بارے میں قابلِ قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

۲۲۔ مکاتیب گیلانی :۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کا حلقۂ اثر خاصا وسیع تھا۔ ان سے دینی و علمی معاملات پر اہلِ علم خط و کتابت کرتے تھے اور طلبہ اُن سے رہنمائی کے لیے مراسلت رکھتے تھے۔ مولانا گیلانی خط کا جواب دینے میں نہایت مستعد تھے۔ بلا مبالغہ انھوں نے ہزاروں خطوط لکھے ہوں گے اور ان کا بڑا حصہ محفوظ ہوگا۔

مولانا گیلانی کی رحلت کے فوراً بعد مولانا منت اللہ رحمانی نے ان کے مکاتیب جمع کرنے کی مہم شروع کر دی تھی اور وہ اکثر اہلِ علم سے اُن کے نام مولانا گیلانی کے خطوط حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مولانا رحمانی نے مناسب حواشی کے ساتھ خطوط مرتب کیے اور ۱۹۷۲ء میں

"مکاتیبِ گیلانی" کی پہلی جلد منظرِ عام پر آگئی۔ اس جلد میں ۸۷ خطوط شامل ہیں۔ مکتوب الیہم میں مولانا عبد الباری ندوی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولوی محمد یعقوب، مولانا محمد زکریا محمودی، حکیم یوسف حسن خان شامل ہیں۔ اس مجموعۂ خطوط پر مولانا عبد الباری نے مقدمہ لکھا ہے جس میں مولانا گیلانی کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس مجموعۂ مکاتیب کے علاوہ رسائل و جرائد میں مولانا گیلانی کے درجنوں خطوط نظر سے گزرے ہیں، اگر یہ خطوط بھی یک جا کر لیے جائیں تو ایک بڑی علمی خدمت ہوگی۔

متذکرۃ الصدر مطبوعات کے علاوہ مولانا گیلانی کے سینکڑوں دینی، سوانحی اور تعلیمی مقالات ہیں جو تا حال یک جا نہیں ہوتے۔ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے ان کی رحلت پر ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ میں طبع شدہ مضامین کا ایک انتخاب "افاداتِ گیلانی نمبر" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ مگر "الفرقان" کا یہ خصوصی شمارہ جلد ہی کمیاب ہوگیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ "مقالاتِ شبلی" کی طرز پر مولانا گیلانی کے جملہ مضامین مرتب کیے جائیں۔

علمی اداروں سے وابستگی

مولانا گیلانی برصغیر کی کئی علمی مجالس کے اعزازی رکن تھے۔ ندوۃ المصنفین دہلی کے رکن رہے۔ ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۶۷ھ تک سترہ سال دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ میں شامل رہے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے اربابِ اختیار ان سے مشورہ لیتے تھے۔ ماہنامہ "الفرقان" (لکھنؤ) کے اعزازی مدیر کی حیثیت سے ایک سال کام کیا۔ پاکستان میں اسلامی دستور کی ترتیب و تدوین کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے علما کی ایک مجلس بلائی تو مولانا گیلانی بطورِ خاص کراچی آئے اور مسودۂ دستور (مجوزہ از طرف علمائے پاکستان) مرتب کرنے میں حصہ لیا۔

شاعری

مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، اس میں شعر و سخن کے چرچے تھے۔ ان کے عمِ محترم اور استاد سید ابو نصر شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مولانا گیلانی نے تقریباً تیس سال بلدۃ البلاد حیدر آباد میں گزارے جہاں شعر و سخن کی محفلیں جمتی تھیں اور علم و ادب کی داستانیں چھیڑی جاتی تھیں۔ وہ سخن فہم اور سخن شناس تو تھے ہی سخن سرا بھی ہوگئے۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے

قدیم شعری سرمائے پر ان کی نظر تھی۔ بیسیوں اشعار یاد تھے اور بڑی خوبی سے اپنی تحریروں میں جڑتے تھے۔ جب بھی خارجی حالات محرک ہوتے اور اس کے ساتھ طبیعت حاضر ہوتی تو اپنے جذبات و احساسات کا اظہار موزوں الفاظ میں کر دیتے تھے۔ بہاری ہندی (ہندی نما اردو) میں انھوں نے وجد انگیز اور کیف پرور نعتیں لکھیں۔ ان نعتوں میں "دھرمی" تخلص کیا ہے۔ یہ نعتیں ان کے "البیلے پن" کی وجہ سے خاصے کی چیز ہیں۔ ایک نعت کا شعر ہے:

تجھ سے توڑوں توکس سے جوڑوں　　　تیری گل کی خاک بٹوروں

مولانا گیلانی اپنی نعتیں ترنم سے سناتے تھے اور بقول مولانا علی میاں "اہلِ مجلس کو کیف و سرور کا وہ بادۂ دوشینہ پلاتے کہ مدینہ طیبہ کی فضائیں آنکھوں میں لہرا جاتی تھیں"[۵۵] مولانا گیلانی نے احباب کی رحلت پر اپنے احساسات بہ شکل نظم ادا کیے۔ سید سلیمان ندویؒ کی وفات پر مرثیہ کہا۔ چند شعر یہ ہیں:

گرچہ تو تنہا گیا ہے پر دلاتا ہوں یقین　　　آگے پیچھے آرہے ہیں سب ترے احباب و یار
اپنی تحریروں میں خود مری نظر تجھ پر رہی　　　رائے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار
راہ میں آئے لکھنؤ اور دریا باد کبھی　　　ہیں جہاں تھامے کلیجے تیرے کچھ یارانِ غار

خطابت

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی طلاقتِ لسانی اور خطابت کی روانی مشہور ہے۔ وہ کئی کئی گھنٹے مسلسل تقریر کرتے اور سامعین ہمہ تن گوش ہو کر سنتے۔ وہ واعظانہ باتیں ہی نہ کہتے بلکہ علمی مسائل بھی اس سادگی اور شستگی سے بیان کرتے تھے کہ عامی بھی ان کی تقریر سے کچھ حاصل کر کے ہی اٹھتا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ اپنے دور کے منجھے ہوئے خطیب تھے، مولانا گیلانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"گو کبھی زانوئے تلمذ آپ کے سامنے تہہ کرنے کی عزت حاصل نہیں کی لیکن تقریر و خطابت میں ہمیشہ آپ کو اپنا امام سمجھتا ہوں"[۵۶]

مولانا گیلانی نے خطابت کا آغاز جنگ بلقان (۱۹۱۳ء) کے زمانے میں کیا۔ ٹونک میں ندوہ کے

---

۵۵ پرانے چراغ　　　۵۶ مکاتیب بہادر یار جنگ، ص ۱۹۷

ایک عالم چندہ کی غرض سے پہنچے۔ انھوں نے بہت سر مارا مگر ان کی کوششیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں، ان حالات میں مولانا گیلانی نے اہلِ شہر کو خطاب کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس تقریر کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ٹونک کی تاریخ میں وہ یادگار دن تھا۔ جامع مسجد بھری ہوئی تھی۔ وامتازوا الیوم ایھا المجرمون کے ساتھ میری کڑکتی ہوئی تقریر کا آغاز ہوا۔ جو جہاں تھا تھرا کر رہ گیا۔ پھر مجھے خود نہیں معلوم کہ کیا کہا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد ہوش آیا تو دیکھتا ہوں کہ خود رو رہا ہوں اور ساری مسجد میں کہرام برپا ہے۔ روپیہ کا ڈھیر میرے قدموں کے سامنے ہے۔ لوگ واقعۃً کپڑے پھاڑ رہے تھے۔ بال نوچتے تھے، منہ پر تھپیڑ مارتے تھے۔ ساری مسجد دیوانی ہو رہی تھی۔ میں خود حیران تھا کہ قصہ کیا ہے؟ اور آج تک اس کی توجیہ میری سمجھ سے خارج ہے۔ شاید میرے دبے دبائے جذبات یکایک اُبھر پڑے یا کیا؟ میں تقریر بھی کر سکتا ہوں نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود مجھے پہلی دفعہ اس کا علم ہوا۔"[۵۹]

اس کے بعد مولانا گیلانی تقاریر کرتے ہی رہے اور سیاسی و دینی اجتماعات کو خطاب کرتے رہے۔ ان کے ایک ہم جماعت دوست مولانا عبدالرحمٰن (سابق مفتی محکمہ امورِ مذہبی۔ ریاست بہاول پور) اُن کی یاد میں لکھتے ہیں:

"ٹونک کی طالب علمی اور بالکل اوائل عمری کی بات ہے کہ جنگ طرابلس میں جب اٹلی اور اس کے ساتھیوں نے ترکی اور وہاں کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور بے پناہ مظالم ڈھائے تو اس وقت اس بربریت سے متاثر ہو کر ایک قطعہ بند نظم لکھی اور اجمیر میں ایک بڑے اجتماع کے موقع پر درگاہ خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر اس کو عجیب درد انگیز اور رقت انگیز لہجہ سے سنایا کہ تمام مجمع مسحور اور بے خود ہو گیا تھا۔ نظم بلا کی آتش بار تھی اور شروع یہاں سے ہوتی تھی۔

بے طرح درد سے دل آج بھرا آتا ہے — خون بن کر جگر آنکھوں میں چلا آتا ہے
- - - - - - - — لب پہ شکوے چلے آتے ہیں گلا آتا ہے

دل میں جب ضبط نہیں، بندشِ لب بھی نہ سہی — مہرِ تاباں جو نہیں انجمِ شب بھی نہ سہی
جس طرح اور نہیں ایک ادب بھی نہ سہی — آج تک کون سے اچھے تھے ہم، اب بھی نہ سہی

..... یہ نظم بصورت رسالہ چھپ بھی گئی تھی مگر پھر وہ ضبط ہو گئی اور اسی وقت سے نایاب ہے۔ اجتماع کے برخاست

---

۵۹ مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں، ص ۴۵، ۴۶

ہونے کے بعد مرحوم کی تلاش میں انجینئر و پولیس نے دوڑ دھوپ شروع کر دی کہ یہ نو عمر لڑکا کون تھا؟ کہاں کا تھا، کدھر گیا؟ مگر وہ فوراً ہی لونک جا چکے تھے[58]

اخلاق و عادات

مولانا مناظر احسن گیلانی اپنے علمی مرتبے اور وجاہت کے باوجود ہنس مکھ تھے۔ گفتگو اور نجی تحریروں میں مخاطب کی اس طرح چٹکی لیتے تھے کہ دوسرے ہی نہیں خود وہ بھی جس کی چٹکی لی جاتی تھی، مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

مولانا گیلانی کے مزاج کا دوسرا جزو خاکساری اور انکسار تھا۔ ہر موقع پر اپنی ہیچ میرزی کا سبب پیدا کر لیتے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے بارے میں ہمیشہ یہی لکھا کہ ان میں کیا رکھا ہے؟ مگر اہل علم جانتے ہیں کہ مولانا نے ہر موضوع پر معلومات کے انبار لگائے ہیں۔ ایک خط میں حکیم محمد نصیر الدین ندوی صاحب کو لکھتے ہیں:

"میرے پراگندہ خیالات اور علمی ہفوات کا آپ نے ذکر فرمایا ہے۔ کیا واقعی آپ ان کو پسند فرماتے ہیں۔ میں تو جبراً لوگوں کی خاطر سے لکھ دیتا ہوں"[59]

مولانا گیلانی کے ہاں سادگی، ضمیر کی سچائی، کم سے کم اسباب زندگی پر قناعت اور محض اللہ کے لیے دوستی و دشمنی نظر آتی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی ۲۵ برس کی جلاوطنی کے بعد آئے تو ان مرحوم نے ایسے خیالات کا اظہار شروع کیا جن میں توازن کی از حد کمی تھی۔ یہ خیالات غلطیوں اور غلط فہمیوں کا سبب بن رہے تھے۔ حلقۂ علما میں سے بعض حضرات نے دبے لفظوں میں مولانا سندھی کے خیالات سے برأت کا اظہار کیا مگر چند اہل قلم نے مولانا سندھی کے الجھے ہوئے خیالات کی وکالت شروع کر دی۔ اس موقع پر مولانا گیلانی نے واشگاف انداز میں مولانا سندھی اور ان کے ہم نواؤں پر گرفت کی[60]۔ انھوں نے اپنے ہم مسلک علما کی ناراضگی کی بھی کوئی پروا نہ کی۔

---

۵۸ دارالعلوم (دیوبند) اگست ۱۹۵۶ء، ص ۴۵-۴۶

۵۹ ماہنامہ "ریاض" (کراچی) اگست ۱۹۵۳ء، ص ۴۸

۶۰ ملاحظہ ہو مکاتیب گیلانی، ص ۳۲۱-۳۲۵؛ الفرقان (لکھنؤ) افادات گیلانی نمبر، ص ۳۲، ۳۳

مولانا گیلانی کی تحریروں سے ان کی وسعتِ مطالعہ عیاں ہے۔ نادر و نایاب کتابیں خریدتے رہتے تھے اور احباب سے کتابوں کے بارے میں استفسار کرتے رہتے تھے۔ گیلانی کے زمانۂ قیام میں وہ علمی سہولتیں حاصل نہ تھیں جو حیدر آباد میں موجود تھیں۔ علما سے رابطے کا ذریعہ صرف مراسلت تھی چنانچہ اس دور کے خطوط میں کتابوں کا ذکر اور اشتیاق کچھ زیادہ ہی ہے۔ مولوی غلام محمد حیدر آبادی (حال مقیم پاکستان) کو لکھتے ہیں:

"ہاں صاحب! ایک بات جسے بار بار پوچھنا چاہتا ہوں مگر عین وقت پر بھول جاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ پاکستان مغربی کے شہروں کراچی، لاہور، حیدر آباد، پشاور وغیرہ میں عربی کتابوں کا بھی کوئی تجارتی کارخانہ ہے؟ ایک خاص ضرورت سے یہ سوال کر رہا ہوں۔ کاش آپ اس کو یاد رکھیں یا کسی بڑے مولوی صاحب سے جو کتابوں کا ذوق رکھتے ہوں، ان سے دریافت فرمایئے۔ . . . . . فلمیات، کوکبیات اور عصری سیاسیات کے سوا ٹھوس علمی و اسلامی موضوع پر بھی کوئی رسالہ کہیں سے نکلتا ہے؟ عربی ممالک کے سفارت خانوں میں اپنے اپنے ملک کے رسائل و مجلات آتے ہوں گے۔ کیا اُن کی فہرست مل سکتی ہے؟"[۱۱۵]

۱۹۵۶ء میں مولانا ابوالحسن علی ندوی دمشق میں تھے۔ وہاں سے مولانا ابوالحسن علی نے مولانا گیلانی کو یاد کیا۔ مولانا گیلانی نے اپنے جوابی خط میں دمشق کے حوالے سے اہلِ علم اور کتابوں کا ذکر چھیڑ دیا، لکھتے ہیں:

"سب سے زیادہ تڑپ دل میں ان کتابوں کی پیدا ہو رہی ہے جن سے شام کے کتب خانے پٹے پڑے ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ و ابن قیمؒ، علامہ ذہبی و السبکی و آلہ کے وطن میں جو کچھ مل رہا ہے اسے ملنا ہی چاہیے۔ یوم المؤتمر کے بعد تو ہفتہ بھر آپ کا ان چیزوں کی سیر و تماشا میں بسر ہوتا ہوگا۔ معلوم نہیں کہ دول الاسلام ذہبی کا مکمل نسخہ اور مرآۃ الزمان ابن الجوزی کی السبط کی طباعت کا انتظام کیا گیا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے کم از کم دونوں کتابوں کے مطالعہ کا موقع مل جاتا۔ ابنِ عساکر کی تاریخِ دمشق خدا جانے مکمل ہو کر بازار میں آ گئی یا نہیں، میرے پاس تو صرف ابن بدران کی تلخیص کی ساتویں جلد تک ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ دو مختلف وادیوں کے شیخ یعنی شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور الشیخ الاکبر ابن عربی دونوں کے لیے دمشق کے آغوش میں جگہ نکل آئی۔ اس زمانے میں شیخ الاسلام کے عقیدت مندوں کی تو کافی جماعت ہوگی۔ کیا بے چارے شیخ الاکبر کی اکبریت کو باقی رکھنے کے لیے بھی کوئی کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ابن تیمیہ اور

---

۱۱۵ ماہنامہ "بینات" (کراچی) ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ، ص ۲۹۷ - ۲۹۸

ان کے تلامذۂ راشدین کی کوئی غیر مطبوعہ نادر کتاب آپ کی پسند کی کیا ملی ؟ ان بزرگوں کے لیے تو یورپ کے عصری مذاق کی رو سے چاہیے تھا کہ الگ الگ سوسائٹیاں شام میں بن جاتیں جو اُن کی اصل کتابوں کو بھی شائع کرتیں اور ان کے علمی و نظری اختراعات و تخلیقات پر کام کرتیں [۱۲]

مولانا گیلانی کی کتاب دوستی کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی مؤلف کی عمدہ کتاب کا مسودہ دیکھا تو اس کی اشاعت کے لیے کوشاں ہو گئے ۔ انھیں اپنی تالیف "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" کے سلسلے میں علما و مشائخ کے مفصل حالات کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے مولانا سید عبدالحی رائے بریلوی کی تالیف "نزہتہ الخواطر" کا مسودہ دیکھا ۔ وہ اس کتاب سے متاثر ہوئے اور اس کی اشاعت کے پُر جوش داعی بن گئے ۔

مولانا گیلانی نے حیدر آباد میں کتاب چھپوانے کی تحریک کی اور ایک میمورنڈم تیار کیا جس پر برصغیر کے چوٹی کے علما کے دستخط لے کر نواب حیدر نواز جنگ سر اکبر حیدری (صدر اعظم حیدر آباد) کی خدمت میں پیش کیا ۔ ان کا یہ میمورنڈم ضائع نہ گیا اور نزہتہ الخواطر کا پہلا حصہ ۱۹۴۷ء میں چھپ کر اہلِ علم تک پہنچ گیا ۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے نزہتہ الخواطر کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی اشاعت میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی مساعی جمیلہ کا بہت بڑا حصہ ہے [۱۳]۔"

ماخذ

(مولانا مناظر احسن گیلانی کی تالیفات کے علاوہ حسبِ ذیل کتب اور رسائل سے استفادہ کیا گیا ہے)

ابوالحسن علی ندوی	حیاتِ عبدالحی	ندوۃ المصنفین ۔ دہلی (۱۹۷۰ء)
"	پرانے چراغ	مجلس نشریاتِ اسلام ۔ کراچی (۱۹۷۵ء)
حکیم سید احمد اللہ ندوی	تذکرۂ مسلم شعرائے بہار جلد ۴	مؤلف ۔ کراچی (۱۹۶۸ء)
اختر اورینوی	بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا	پٹنہ (۱۹۵۷ء)
بدر شکیب	سرگزشت جامعہ عثمانیہ	بزم طلبا قدیم نظام کالج ۔ کراچی (۱۹۷۱ء)
بہادر یار جنگ	مکاتیب بہادر یار جنگ	بہادر یار جنگ اکادمی ۔ کراچی (۱۹۶۸ء)

---

۱۲ پرانے چراغ ، ص ۹۳ ۔ ۱۳ حیاتِ عبدالحی ، ص ۲۶۹

سید عبدالحی رائے بریلوی	نزہۃ الخواطر جلد ۸	نور محمد اصح المطابع۔ کراچی (۱۹۷۶ء)
منشی عبدالرحمان خان	اندازِ سخن	تخلیق مرکز۔ لاہور (۱۹۷۳ء)
عمران خان	مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں	مطبع معارف اعظم گڑھ (س۔ن)
سید محمد ازہر شاہ قیصر	حیاتِ انور	دیوبند (۱۹۵۵ء)
منت اللہ رحمانی	مکاتیبِ گیلانی جلد اوّل	دارالاشاعت رحمانی۔ خانقاہ مونگیر (۱۹۷۲ء)

مولانا نظام الدین احمد کاظمی رام پوری

حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری

اور ان کی تصنیفات

مولانا شیخ حسام الدین مانک پوری (متوفی ۸۵۲ھ) ابن مولانا خواجہ ابن مولانا جلال الدین، ایک جید عالمِ دین اور ممتاز شیخ طریقت تھے۔ آپ کا شمار سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے بلند پایہ مشائخ میں ہوتا ہے۔ آپ نے قطب العالم شیخ نورالدین بن شیخ علاؤالدین پنڈوی سے خلافت پائی اور حضرت شیخ علاؤالدین کے پیرِ طریقت شیخ نورالدین بنگالی تھے جن کو سلطان المشائخ، محبوبِ الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین محمد بدایونی ثم الدہلوی سے شرف بیعت و خلافت حاصل تھا۔ حضرت شیخ مانک پوری پیرومرشد سے اجازت و خلافت ملنے کے بعد اپنے وطنِ مالوف مانک پور واپس آئے اور ۸۰۴ھ میں جون پور تشریف لے گئے۔ ۸۵۲ھ تک جو آپ کا سال وفات ہے تقریباً ۴۸ برس جون پور میں قیام رہا، اس زمانے میں جون پور شاہانِ شرقی کی وسیع قلم رو میں شامل تھا۔ ابراہیم شاہ، محمود شاہ اور محمد شاہ شرقی سریر آرائے سلطنت تھے۔ شمالی ہند میں شاہانِ شرقی کا دورِ حکومت علم و حکمت اور شریعت و طریقت کے عروج کا عہدِ زریں تھا۔ اسی بابرکت دور میں قطب العالم شیخ نورالدین، سید جہاں گیر اشرف سمنانی (متوفی ۸۰۸ھ) اور خواجہ سید محمد گیسو دراز (متوفی ۸۲۵ھ) کی قیادت میں شیخ حسام الدین مانک پوری نے شریعت و طریقت کے نخلِ بارآور کی آبیاری کی اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی مقدس تعلیمات کو ایسے مؤثر اور دلکش انداز میں پیش کیا کہ ہزاروں بندگانِ خدا آپ کے دائرۂ عقیدت و ارادت میں داخل ہو کر اس سلسلۂ عالیہ کے فیوض و برکات سے مستفید ہوئے۔ پھر آپ کے کثیر التعداد خلفا نے سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے شیوع و فروغ کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔

حقیقت طلبی اور خدا شناسی کی راہ میں اتباعِ کتاب و سنت کے ساتھ ساتھ مشائخ کرام کی تعلیمات بنی نوعِ انسان کے لیے ہمیشہ دلیلِ راہ ثابت ہوئی ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے ان کے ملفوظات

مکتوبات کی اہمیت و افادیت تسلیم شدہ ہے سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے جن مشائخ کرام کے ملفوظات و مکتوبات آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں مرتب ہوئے، ان میں حضرت مخدوم شیخ نصیر الدین محمود "روشن چراغ"۔ حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز، میر سید محمد بن جعفر مکی، میر سید اشرف جہانگیر سمنانی اور شیخ حسام الدین مانک پوری کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اوّل الذکر چار حضرات کے ملفوظات اور مکتوبات کی اشاعت و طباعت ہو چکی ہے لیکن شیخ مانک پوری کے ملفوظات و مکتوبات تاحال پردۂ خفا میں ہیں۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اپنی مشہور کتاب "اخبار الاخیار" میں صرف ملفوظات کا ذکر کیا ہے۔ شیخ حسام الدین مانک پوری کی دوسری تصنیفات اور مکتوبات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبد الحق کو ان کی تصنیفات کا علم نہیں تھا۔ مجموعۂ ملفوظات "رفیق العارفین" کا بھی کوئی مکمل و مرتب نسخہ ان کے پیشِ نظر نہ تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ملفوظات کے مؤلف کا نام "اخبار الاخیار" میں مذکور نہیں" اور تحریر فرماتے ہیں کہ یہ ملفوظات ان کے بعض مریدوں نے جمع کیے ہیں۔ شیخ مانک پوری اور ان کے ملفوظات کے بارے میں صاحبِ "اخبار الاخیار" کا مختصر بیان درج ذیل ہے:

"شیخ حسام الدین مانک پوری مرید و خلیفۂ شیخ نور قطبِ عالم از اعیانِ مشائخ وقتِ خود بود، عالم بود بعلم طریقت و شریعت۔ او را ملفوظات است مسمیٰ بہ رفیق العارفین کہ بعضے از مریدانِ وے جمع کردہ است"[1]

مندرجۂ بالا عبارت کے بعد حضرت شیخ مانک پوری کے چند ملفوظات نقل کیے گئے ہیں۔ دوسری تصنیفات کا ذکر "اخبار الاخیار" میں نہیں ہے۔

"رفیق العارفین" کا جو مکمل قلمی نسخہ راقم الحروف کے پیشِ نظر ہے اندازاً بارھویں صدی ہجری کا مخطوطہ ہے اور ۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاتب کا نام اور سنِ کتابت درج نہیں ہے۔ دیباچے میں مؤلفِ ملفوظات نے اپنا نام فرید، باپ کا نام سالار، دادا کا نام محمد، اور پردادا کا نام محمود عراقی لکھا ہے۔ یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری کا خادم اور مرید ہے اور ملفوظات کے

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۰، مطبع مجتبائی دہلی

مجموعے کا پورا نام "رفیق العارفین علیٰ ارشاد الطرق و مقصد العاشقین" ہے۔ یہ مجموعہ چالیس فصلوں پر منقسم ہے اور ہر فصل میں الگ الگ عنوان کے تحت تصوف و سلوک کے اہم مسائل کو عمدہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ مجموعۂ ملفوظات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ صاحبِ ملفوظات کی حیات میں مرتب کیا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان کی نظرِ فیض اثر اور حسنِ قبول سے بھی مشرف ہوا ہو۔ رفیق العارفین کی درج ذیل عبارت سے ان امور کی تصدیق ہوتی ہے۔

"و بعدہٗ می گوید فقیر حقیر الراجی الیٰ رحمۃ اللہ المعبود الباقی فرید بن سالار بن محمد ابن محمود العراقی چوں این فقیر در سلسلۂ پیر دستگیر حضرت باعظمت قطب الزماں غوث الانسان، استاد الطریقہ، مرشد الحقیقہ، شیخ الاسلام والمسلمین شیخ حسام الحق والحقیقۃ والشرع والدین المانک پوری متع اللہ المسلمین بطول بقائہ و نور قلوب المومنین بلقائہ کہ جمالِ ظاہر او را غایتے نہ و حسنِ باطن اُو را نہایتے نہ۔ آویخت و در سلکِ سکانِ خاص منسلک شد، درمیانِ خدامِ عام اقامہ یافت، کلمات دربار و دلآویز حضرت باعظمت کہ محیطِ عذب بے ساحل است بہوشِ جاں می شنید و بگوشِ دل جامی گرد۔ چند دُرِ گراں مایہ و گوہر قیمتی ازاں جمع کردہ برائے زیورِ خاص و عام در سلک در آوردہ و آں را "رفیق العارفین علیٰ ارشاد الطرق و مقصد العاشقین" نام نہادہ و بہ نظم تحریر منظم گردانیدہ و بہ چہل فصل مرتب گشت تا سالکان را ... واصلان کوئے حقیقت رفیق ساختہ بر طریق روند و طالبانِ صادق را بعد علم و عمل با حضورِ دل رُشد حاصل شود و آراستگیِ ظاہر و باطن پدید آید و حسنِ محبوب در دلِ شاں بہ جلوہ گری در آید، شاہدِ مطلوب کہ مقصودِ طالبان است روئے نماید بفضل اللہ عزّ و جل و کمال کرمہ بحرمۃ النبی و آلہ و اصحابہ اجمعین۔

ملفوظات کے عنوانات اور فصول کی تفصیل و ترتیب حسبِ ذیل ہے:

فصل اوّل در توبہ۔ فصل دوم در ارادت۔ فصل سوم در خلوت۔ فصل چہارم در ذکر۔ فصل پنجم در منازل سلوک۔ فصل ششم در مراقبہ۔ فصل ہفتم در عشق و شوق۔ فصل ہشتم در مشاہدہ۔ فصل نہم در توحید۔ فصل دہم در سماع۔ فصل یازدہم در یقین۔ فصل دوازدہم در توکل۔ فصل سیزدہم در قناعت۔ فصل چہاردہم در انفاق۔ فصل پانزدہم در ایقان بالقدر۔ فصل شانزدہم در ترک۔ فصل ہفدہم در انکسارِ نفس۔ فصل ہشدہم در ایمان۔ فصل نوزدہم در خوف و رجا۔ فصل بستم در غربت۔ فصل بست

و یکم در زندہ داشتن شب۔ فصل بست و دوم در تقویٰ۔ فصل بست و سوم در صوم۔ فصل بست و چہارم در اوراد۔ فصل بست و پنجم در نمازِ شبِ جمعہ۔ فصل بست و ششم در نماز و دعا برائے قضائے حاجات و کفایتِ مہمات۔ فصل بست و ہفتم در نماز معکوس۔ فصل بست و ہشتم در سترِ عورت۔ فصل بست و نہم در تحمل و تواضع۔ فصل سی ام در محبت و مدارات۔ فصل سی و یکم در لباس۔ فصل سی و دوم در نفس راندن۔ فصل سی و سوم در فتوح۔ فصل سی و چہارم در اعراس۔ فصل سی و پنجم در صدقہ۔ فصل سی و ششم در رضا و تسلیم۔ فصل سی و ہفتم در اُنس۔ فصل سی و ہشتم در وصال۔ فصل سی و نہم در آداب۔ فصل چہلم در فوائد متفرقہ۔

حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری کے ملفوظات کی ترتیب و تالیف سے متعلق مندرجہ بالا معلومات صرف "رفیق العارفین" کے مطالعے سے حاصل ہوئی ہیں۔ مشائخ اور علما کے تذکروں کی مشہور کتابیں ان تفصیلات سے خالی ہیں۔

"اخبار الاخیار" کی تحریر و تالیف کا سلسلہ شیخ مانک پوری کی وفات کے ایک سو چالیس[۱۴۰] سال کے بعد ۹۹۳ھ سے شروع ہو کر ۹۹۹ھ تک جاری رہا۔ غالباً یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں پہلی مرتبہ شیخ حسام الدین کے مجموعۂ ملفوظات کا اس کے نام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ذکر اگرچہ مجمل و مبہم ہے لیکن اسے اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ اخبار الاخیار کے بعد شیخ محمد غوثی شطاری گجراتی، مانڈوی (متوفی ۱۰۲۵ھ) نے اپنی کتاب "تذکرہ گلزار ابرار" میں شیخ حسام الدین مانک پوری کا ذکر خیر قدرے تفصیل سے کیا ہے اور "رفیق العارفین" کے تذکرے سے پہلے آپ کے مجموعۂ مکتوبات کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"شیخ شہاب الدین مانک پوری آپ کے بزرگ خلفا میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے پیر کے تمام مکتوبات کو فراہم کر کے ایک جلد بنائی تھی جو پیر نے اپنے فرزندوں اور خلفا کے نام لکھے تھے۔ تعدادِ مکتوبات ایک سو اکیس[۱۴۱] ہے۔ ان مکتوبات میں زیادہ حصہ ان مکتوبات کا ہے جو مولانا نے اپنے بڑے اور عزیز ترین فرزند شیخ فیض اللہ کے نام لکھے تھے۔ شیخ فیض اللہ قاضی شاہ کے نام سے نامزد ہیں۔ چند خطوط اپنے دوسرے بیٹے شیخ احمد کے نام بھیجے تھے۔ شیخ احمد کو آپ شیخ بڈھا، نور دیدہ اور دیدۂ نور کہا کرتے تھے۔ بعض خطوط شیخ نعمت اللہ کے نام ہیں، شیخ نعمت اللہ لوگوں میں شیخ نتھو کے نام سے مشہور ہیں اور کچھ حصہ خطوں کا ایسا ہے جو شیخ زاہد، شیخ اکمل، شیخ راجن اور شیخ اخوند عالم مشہور بہ

عاشق کے نام بھی لکھے ہیں۔ یہ سب شیخ نور قطب عالم کے نواسے ہیں۔ ان سب کو خطوں اور پیغاموں کے ذریعے سے تلقین فرماتی ہے۔ سلوکِ طریقت میں عالی مقامات تک پہنچایا، خلافت کا خلعت پہنایا۔ ہدایت پائی اور ہدایت دہی کا مرتبہ عطا کیا۔ لیکن سجادہ نشینی بڑے بیٹے شیخ فیض اللہ ہی کو عطا ہوئی۔ علیٰ ہذا القیاس آج تک شیخ فیض اللہ کے فرزند درجہ بدرجہ اپنے دادا کی جگہ سجادہ نشین ہوتے چلے آئے ہیں۔ تمام بنگالہ والے متفق اللفظ کہتے ہیں کہ مخدوم حسام کے ایک سو بیس[۱۲۰] خلیفہ تھے جو صاحبِ کمال تھے۔ ان میں سے (۱) سید مسعود بن سید ظہیر الدین فتح پوری جو شیخ سیدن کے نام سے مشہور ہیں (۲) سید حامد شاہ بن سید راجہ شاہ مانک پوری (۳) سید محمد امیر بدھا جن کا لقب سید صوفی ہے (۴) مولانا کمال الدین اعزہ اللہ (۵) مولانا شہر اللہ ابوالقاسم ملتانی لکھنوری (۶) شیخ نصیر الدین بن شہر اللہ لکھنوری (۷) مولانا فرید الدین سالار عراقی (۸) شیخ احمد قنوجی (۹) معین الاسلام اودھی۔ (۱۰) مولانا منہاج الدین بہاری (۱۱) مولانا جمال الدین حسن فخر (۱۲) شیخ ضیاء الدین یوسف ابن داؤد کُردی (۱۳) مولانا سوندھو کُردی (۱۴) مولانا محمد علا کُردی (۱۵) شیخ تاج شہاب مانک پوری جن کا لقب ارزانی شاہ ہے۔ یہ تمام صدر الذکر اصحاب اکابرِ زمانہ کے پیشوا تھے، بعض اہلِ باطن تھے اور بعض اہلِ ظاہر اور رہ بیان تھے، قدس اللہ اسرارہم۔ ایک رسالہ ہے "رفیق العارفین" نام جس میں آپ کے ایک مرید نے آپ کی دلچسپ باتیں فراہم کی ہیں۔[۵۲]

شیخ محمد غوثی شطاری، حضرت شیخ عبدالحق کے معاصر اور خواجہ تاش تھے۔ علامہ شیخ وجیہ الدین گجراتی سے انھیں شرفِ تلمذ اور فیضِ باطنی حاصل تھا۔ اپنے زمانے کے اہل اللہ اور اہلِ علم میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ فارسی شعر و ادب کے مزاج داں اور ادا شناس تھے۔ ان کا اندازِ بیان عارفانہ اور طرزِ تحریر عالمانہ ہے۔ یہ بات بے خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ "گلزارِ ابرار" کا معیار کسی اعتبار سے "اخبار الاخیار" سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ تذکرۂ گلزارِ ابرار اگرچہ تا حال طبع نہیں ہوا لیکن اس کا اردو ترجمہ "اذکارِ ابرار" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس ترجمے کی منقولہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ حضرت شیخ مانک پوری کے مکتوبات آپ کے ایک خلیفہ شیخ شہاب الدین مانک پوری

---

۵۲ منقول از اذکارِ ابرار ترجمہ گلزارِ ابرار فارسی، صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷ مطبوعہ لاہور۔

نے فراہم کرکے نام بنام کتابی شکل میں مرتب کیے۔ راقم السطور کے نزدیک شیخ شطاری پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے شیخ مانک پوری کے مکتوبات اور اُن کو مرتب کرنے والے کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائیں۔ مکتوبات کا تعارف شیخ شطاری نے جس عالمانہ انداز میں کرایا ہے، اس سے ان کی بالغ النظری کا ثبوت ملتا ہے اور مکتوبات کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ شیخ حسام الدین مانک پوری قدس سرہٗ کے ایک سو اکیس[۱۲۱] مکتوبات کا یہ نادر قلمی مجموعہ بھی ان کے ملفوظات کی طرح "انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز" تغلق آباد۔ دہلی ۱۱۰۰۶۲ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کے مطالعہ سے اُن توضیحات کی تصدیق ہوتی ہے جو صاحب "گلزارِ ابرار" نے حضرت شیخ مانک پوری کے مکتوبات کے ضمن میں بیان کی ہیں۔

مجموعۂ مکتوبات کے دیباچے کی فارسی عبارت شیخ شطاری کے بیان کی توثیق کے لیے ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

"حمدِ متواتر و وافر و ثنائی متکاثر مر صانعی را کہ جمیع مصنوعات بخطابِ واحد از کشورِ عدم در عالمِ وجود آورد و خاکِ ضعیف کہ در پائے ہر کسی و ناکسی افتادہ بود، بر آورد و بر ہمہ برگزید و تاج معرفت و دواجِ عصمت بر سرش نہاد و تحفۂ درود بروحِ مطہر سیدِ عالم، خلاصۂ اولاد آدم احمد مجتبیٰ و محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم و بر آل و بر اصحابِ او نثار باد۔ می گوید خاکروبِ آستانۂ علیا، بندگی قطب الاولیا، تاج الاتقیا، برہان الاصفیا۔ سلطان العاشقین، شیخ الاسلام والمسلمین شیخ حسام الحق والحقیقۃ والشرع والدین متع اللہ المسلمین بطول بقائہ، ارزانی شہاب کہ یکی از خاکروبانِ زمرۂ سُکانِ آنحضرت عالی و خانقاہِ متعالی ہست چوں عمرے زیر پایگاہِ سُکانِ آں درگاہ بر آمد خواست کہ الفاظِ دُر ربار و کلمات گوہر نثار بندگی شیخ الاسلام والمسلمین چیزے جمع کند و بسلکِ صحیفہ منسلک گرداند۔ نخست شروع کرد در جمع مکتوبات کہ اسرارِ معانی و مقصودِ روحانی دراں ظہور یافتہ، و مندرج گشتہ تا ہر صاحب دولتی کہ آنرا بنظرِ تحقیق و بدیدۂ توفیق مطالعہ کند و برآں عمل نماید از خوابِ غفلت بیدار گردد و از کارِ لایعنی و پریشانی ہوشیار شود و چیز یکہ مقصودِ سالکان و مطلوبِ عالمیان است بدست آرد۔" واللہ اعلم الموفق باتمام۔

دیباچے کی مندرجۂ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ جامع مکتوبات شیخ شہاب الدین ارزانی ہیں اور مکتوبات کا یہ مجموعہ جو ایک سو اکیس[۱۲۱] مکاتیب پر مشتمل ہے، انھوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری

کی حیات میں مرتب کر لیا تھا۔" متع اللہ المسلمین بطول بقائہ (اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت عطا فرماتے اور مسلمان ان کی حیاتِ طیبہ سے متمتع اور مستفید ہوتے رہیں) سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

اخبار الاخیار اور گلزار ابرار کے بعد شیخ عبدالرحمٰن چشتی نے اپنی کتاب "مرآۃ الاسرار" میں حضرت شیخ مانک پوری اور اُن کے خلیفہ راجی سید حامد شاہ کا ذکر بہت عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ۱۰۵۲ھ میں حضرت سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کے باطنی ارشاد کی تعمیل میں نہایت شوق و ذوق کے ساتھ دونوں بزرگوں کے مزار پر حاضر ہوئے اور فیوضِ باطنی حاصل کیے، ضمناً شیخ مانک پوری کی تصنیفات کا ذکر بھی کیا ہے۔ سنداً مرآۃ الاسرار کی اصل عبارت کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

" فقیر کاتب حروف عبدالرحمٰن چشتی بارہا بہ شرف زیارت حضرت شیخ حسام الدین و راجی سید حامد شہ مشرف سعادت و ذوق ہا حاصل کردہ است و در سنہ یک ہزار و پنجاہ و دو ہجری (۱۰۵۲ھ) کہ بجہت دریافت سعادت زیارت پیران دہلی رفتہ بود و وقت برگشتن حضرت سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ درمعاملہ فرمود اوّل زیارتِ شیخ حسام الدین مانک پوری کردہ بعد ازاں بخانہ خود خواہی رفت۔ پس ایں نیازمند بموجب اجازت از دہلی بہ مانک پور رسید و بشرف زیارت آں آفتابِ ولایت و ماہتاب سیادت یعنی مخدوم شیخ حسام الدین و راجی سید حامد شہ مشرف گردید و دریں مرتبہ ذوقی و احوالِ عجیب معائنہ افتاد و نعمتِ عظمٰی درحق ایں عاصی عطا فرمودند کہ قلم از تحریر آں عاجز است ــــ و از تصنیفات خوبست یکی انیس العاشقین۔ دوم رسالۂ محبوبہ۔ سوم یک صد و بست و یک مکتوبات کہ بہ اسم صفا خود نوشتہ۔ اکثر در بیانِ عشق و محبت و در ذوقِ فنا مطلق واقع شدہ اند[۵۳]"

مرآۃ الاسرار کی محررۂ بالا عبارت میں ملفوظات کو چھوڑ کر شیخ حسام الدین مانک پوری کی تین تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے "مکتوبات کا ذکر" گلزار ابرار کے حوالے سے اس مضمون میں ہو چکا۔ ملفوظات کا بیان اگرچہ شیخ عبدالرحمٰن نے نہیں کیا لیکن ان کا کتابی صورت میں "رفیق العارفین" کے نام سے موجود ہونا ثابت ہے۔ البتہ "انیس العاشقین" اور "رسالۂ محبوبہ" کا نام دوسرے تذکروں میں نہیں ملتا۔ تاہم انیس العاشقین کا ایک جدید الکتابت اور کثیر الاغلاط نسخہ بھی دستیاب

---

[۵۳] نسخۂ خطی کتاب "مرآۃ الاسرار" مکتوبہ ۱۱۳۲ھ

ہوگیا جس کے مطالعے سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی کہ وہ مخدوم شیخ حسام الدین مانک پوری کی پہلی اور اہم تصنیف ہے۔ فرماتے ہیں :

" چوں فقیر حقیر خاک پائے کبیر و صغیر حسام الدین کہ یکے از خاکر دبانِ آستانہ حضرت قطب العالمین، ماحی البدعۃ والضلالۃ محی السنۃ والجماعۃ ـــــ ابقاہ اللہ تعالیٰ دید کہ اکثر طالبانِ دین و صوفیانِ اہلِ یقین در طلبِ معرفت و محبتِ رب العالمین چست و چالاک خاستند و قبائے توفیق بر تنہائے ایشاں رفیق کردند۔ پس در دلِ ایں شرمسار اندک کردار، بسیار گفتار باعث پیدا شد کہ یک رسالہ از بہر طالبان حضرتِ خالق در بیانِ معرفتِ تصوف و حقیقتِ آں باید نوشت کہ تصوف از کجاست و اوّل صوفی درجہاں کہ شد و خرقہ و مقراض از سنتِ کیست و عشق چیست و عاشق کیست و سرِ یکے را بہ دلائل صحیح از لسانِ فصیح خواجۂ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم و از اقوالِ مشائخ کبار و عارفانِ اہلِ اسرار بفیض و فضل رحمٰن و بعنایتِ حضرتِ مستعان بہ چہار فصل نبشتہ شد و ایں رسالہ را " انیس العاشقین" نام نہادہ آمد (۱) فصلِ اوّل در بیان معرفتِ تصوف (۲) فصل دوم در بیانِ عشق و ماہیتِ آں (۳) فصل سوم در بیان صفتِ عاشق و سیر آں (۴) فصلِ چہارم در بیان وصول الی اللہ و طریقِ آں۔"

انیس العاشقین اگرچہ مختصر رسالہ ہے اور کل چار فصلوں پر مشتمل ہے لیکن حقیقت و معرفت، سلوک و تصوف، عشق و محبت اور وصول الی اللہ کے جو آداب اور طریقے اس میں بیان کیے گئے ہیں وہ سالکانِ طریقت اور رہ نوردانِ معرفت کے لیے دلیلِ راہ اور مشعلِ ہدایت ہیں۔ مخدوم شیخ حسام الدین مانک پوری کی مذکورۂ بالا تصنیفات صحت و اہتمام کے ساتھ طبع ہوکر منصۂ شہود پر آجائیں تو یہ کام برصغیر میں اسلامی تصوف کی اشاعت و تبلیغ کے لیے بہت مفید ہوگا اور اس طرح مشائخِ چشتیہ نظامیہ کے متہم بالشان تبلیغی اور اصلاحی کاموں کا مفصل و مکمل لائحۂ عمل سامنے آجائے گا۔

(بشکریہ " برہان " دہلی۔ جولائی ۱۹۷۹)

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الغادر یرفع لہ لواء یوم القیامۃ یقال ھذہ غدرۃ فلان بن فلان۔ (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب یدعی الناس بآبائھم)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ سے روایت ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا وعدہ خلافی کرنے والے کے لیے قیامت کے روز ایک جھنڈا اٹھایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں شخص کی وعدہ خلافی ہے۔

معاشرتی برائیوں میں وعدہ خلافی بہت بڑی برائی ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ وعدہ خلافی منافق کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔

اسلامی معاشرے میں وہ شخص انتہائی قابلِ احترام اور لائق تعظیم ہے جو وعدے کا پکا ہے اور جس شخص سے جو بات کرتا ہے، اس پر پورا اُترتا ہے۔

قرآن مجید میں بھی ایفائے عہد کی تلقین فرمائی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ وعدہ ہر حال میں پورا کرو۔ ارشادِ خداوندی ہے:

واوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا ۝ (بنی اسرائیل: ۳۴)

یعنی جب تم کسی سے وعدہ کرو، تو پورا کرو، وعدے کے بارے میں تم سے اللہ کی بارگاہ میں باز پرس ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے کوئی وعدہ کر لیتے تو اس کو ہر حال میں ایفا کرتے، اس کے لیے خواہ کتنی تکلیف ہوتی، اسے برداشت فرماتے، لیکن وعدے کی خلاف ورزی ہرگز نہ کرتے۔

اس قسم کے واقعات بھی احادیث میں ملتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے وعدہ کیا اور فرمایا کہ میں تیرے انتظار میں یہاں کھڑا ہوں، لیکن وہ شخص بھول گیا کہ حضور اس کے انتظار میں فلاں جگہ کھڑے ہیں، آپ کافی عرصے تک، بلکہ ایک روایت کے مطابق تین دن وہاں کھڑے اس کا

انتظار فرماتے رہے، اس کے بعد وہ شخص آیا تو اس نے اپنی بھول یا کوتاہی پر آپ سے معذرت کی اور اس شدید غلطی پر معافی کا خواستگار ہوا۔

ایفائے عہد کرنا نہایت ضروری ہے، جس شخص سے کوئی چیز لینے یا کوئی چیز اس کو دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے تو وہ اس کا منتظر رہتا ہے اور وعدے کے مطابق اپنا ایک منصوبہ تیار کر لیتا ہے، لیکن اگر وعدے پر اسے شے موعودہ نہ ملے تو اسے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ممکن ہے، اس نے اس وعدے کی روشنی میں کسی اور سے کوئی وعدہ کر رکھا ہو، اور اقرار کیا ہو کہ فلاں شے، فلاں دن اسے دے گا، لیکن جب خود اسے ہی نہیں ملی تو وہ آگے کیوں کر دے گا، اس طرح جس سے وعدہ کیا گیا ہے، وہ بھی وقت موعودہ پر چیز نہ ملنے کی وجہ سے وعدہ پورا نہ کر سکا، اور اس وعدہ خلافی کے غلط اثرات کو وسیع کرنے کا باعث بنا۔

وعدہ خلافی کرنے والے کا معاشرے میں کوئی اثر نہیں رہتا اور کسی حلقے میں بھی اس کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ نہ کاروباری لوگ اس پر اعتماد کرتے ہیں اور نہ عام آدمی اس کو لائقِ اعتنا گردانتے ہیں۔

دنیا کے تمام چھوٹے بڑے کام وعدے پر چلتے ہیں، اگر وعدہ صحیح ہو، اور اسے ہر قیمت پر پورا کیا جائے تو سب معاملات ٹھیک رہتے ہیں، اور اگر وعدے کے ایفا کا خیال نہ رکھا جائے تو معاملے کا کوئی پہلو بھی درست نہیں رہتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ گفتگو میں یا لین دین میں کسی کو دھوکے میں نہ رکھا جائے، اور وعدہ پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ کیوں کہ معاشرتی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے ایفائے عہد کو اوّلین حیثیت حاصل ہے۔

مطالعۂ حدیث :۔ مولانا محمد حنیف ندوی

گولڈزیہر (GOLDZAHIR) اور اس قبیل کے دوسرے استشراق زدہ حضرات نے حدیث و سنت کے بارے میں اس ہرزہ سرائی کو علمی و تحقیقی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی تدوین و تسوید تیسری صدی ہجری میں محض تاریخی عوامل کی بنا پر معرضِ ظہور میں آئی۔ مولانا ندوی نے اس کتاب میں اس اعتراض کا مثبت انداز میں جواب دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ حدیث نبوی کی اشاعت و فروغ اور حفظ و صیانت کا سلسلہ عہدِ نبوی سے لے کر صحاح ستہ کی تدوین تک ایک خاص قسم کا تسلسل لیے ہوئے ہے، جس میں شک و ارتیاب کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ علاوہ ازیں اس میں مولانا نے حدیث کے علوم و معارف پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ ایک مکمل سائنس ہے، جس میں نہ صرف رجال و رواۃ کی جانچ پرکھ کے پیمانوں کی تشریح کا اہتمام کیا گیا ہے بلکہ ان اصولوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن سے محدثین نے متن کی صحت و استواری کا تعین کیا ہے۔ اسلام میں حدیث و سنت کا کیا درجہ ہے، اس نے کب اور کس طرح تدوین و تصنیف کے محنت طلب مرحلے طے کیے اور کن موثق علمی ذرائع سے ہم تک اس کی برکات پہنچیں، یا یہ کہ یہ اپنے آغوش میں تحقیق و تفحص کے کن معیاروں کو سمیٹے ہوئے ہے؟ ان سوالات کے تحقیقی جواب کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔

صفحات ۲۲۸   قیمت ۲۵ روپے

اسلام ۔۔ دینِ آسان :۔ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

جو لوگ اسلام کے احکام کو بہت دشوار اور ناممکن العمل سمجھتے ہیں، انھیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کو ہماری تنگ نظری اور غلط فہمیوں نے دشوار بنا دیا ہے، ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق دین آسان ہے۔ اس کتاب میں ایسے متعدد مسائل پر تفصیل سے عقلی روشنی ڈالی گئی ہے جو بہت اُلجھے ہوئے سمجھے جاتے ہیں۔

صفحات ۳۶۸   قیمت ۱۲ روپے

ملنے کا پتا :۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

نقد و نظر

محرم راز

مصنف:- بذلِ حق محمود

ملنے کا پتا:- مکتبۂ فارس، ۱- حق سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

صفحات ۱۲۸- کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ - قیمت اٹھارہ روپے پچاس پیسے

مرحوم بذلِ حق محمود، پاکستان کے مشہور اور نامور ادیب تھے- کافی عرصے سے ریڈیو پاکستان سے وابستہ تھے، لاہور کے ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا اسمِ گرامی قاضی فضل حق تھا، جو اپنے عہد کے جیّد علما میں سے تھے۔ بذلِ حق نے اپنے والد کی طرح اپنے خاندان کی علمی روایات کو برقرار رکھا- صرف پچاس سال کی عمر پاکر ۳۰ جون ۱۹۷۹ کو فوت ہوئے۔

بذلِ حق محمود کو فارسی ادبیات سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ اس زبان کے علمی و ادبی پہلوؤں پر عبور رکھتے تھے- ایران کے رسائل و جرائد میں جو تحقیقی مقالے اور ادبی مضامین شائع ہوتے، ان کو نہایت اہتمام کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھالتے- چنانچہ ۱۹۷۰ میں انھوں نے ایرانی افسانہ نگار صادق ہدایت کے افسانوں کا ترجمہ "سگِ آوارہ" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا- اس ترجمے کی وجہ سے بذلِ حق محمود نے بڑی شہرت حاصل کی۔

مرحوم کی زیرِ نظر کتاب کا نام "محرم راز" ہے، یہ بھی ایران کے مختلف مشہور ادیبوں کے بہترین افسانوں کا اردو ترجمہ ہے- ترجمے کی زبان بڑی عمدہ ہے- یہ بارہ افسانوں کا دلآویز مجموعہ ہے، جن کے عنوان یہ ہیں:

اذان ــ چھان، بورا، بوتل ــ دمِ واپسیں ــ محلل ــ پرایا بچہ ــ مقدس بیل ــ وطن آخر وطن ہے ــ طوقِ لعنت ــ عاشق صادق ــ سیل تمدن ــ محرم راز ــ ماں۔

اس دلچسپ افسانوی مجموعے پر پیش لفظ ملک کے جیّد عالم ڈاکٹر سید عبداللہ نے تحریر فرمایا ہے، جس میں سیّد صاحب ممدوح نے ایران کے علم و ادب کے بارے میں ضروری تفصیلات بیان کی

ہیں اور بدل حق کے بارے بتایا ہے کہ وہ ان کے "عزیز شاگردوں میں تھے، پڑھنے لکھنے سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں ان کی تخلیقات، تراجم اور تنقیدی نگارشات خاصی مقبولیت حاصل کر چکی تھیں۔ اسی زمانے میں ان کی تحریریں اخبارات و رسائل میں شائع ہونے لگی تھیں۔ مرور ایام کے ساتھ ساتھ ایک مصنف اور مترجم کی حیثیت سے ان کی شخصیت روز بروز نکھرتی چلی گئی۔"

پاکستان کے ممتاز ادیب میرزا ادیب نے بھی آغازِ کتاب میں بدل حق کی ذات اور ان کے وسعتِ معلومات کے بارے میں اپنے بہترین تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ "محرم راز" ظاہری شان و شوکت سے بھی مزین ہے۔ علم و ادب سے تعلق رکھنے والے حضرات کو اس کے مطالعے سے ایران کے ادیبوں اور ان کے اسلوبِ افسانہ نویسی کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکیں گی۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی نظامِ حکومت

از :- مولانا سید محمد متین ہاشمی

شائع کردہ :- منظور الٰہی، نمبر ۱۔ ایف بلاک، ماڈل ٹاؤن، لاہور

صفحات ۳۲ - قیمت درج نہیں

پاکستان میں نظامِ حکومت کا موضوع بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس پر مختلف حضرات نے اخبارات و رسائل میں بہت سے مضامین لکھے ہیں اور ان میں ہر اہل قلم نے اپنا اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر مولانا سید محمد متین ہاشمی (ریسرچ ایڈوائیزر، دیال سنگھ لائبریری، لاہور) نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔

ہاشمی صاحب نے اس موضوع سے متعلق ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے، جو اس وقت پیش نگاہ ہے اور "مغربی جمہوریت اور اسلامی نظامِ حکومت" کے نام سے موسوم ہے۔ اس رسالے میں انھوں نے مغربی جمہوریت کو ہدفِ تنقید ٹھہرایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ نظام ہمارے ملک کے لیے موزوں نہیں۔

نظامِ حکومت کا مسئلہ ہر ملک کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور جو نظام جس ملک کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو، اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔ اس میں ایک سے زائد رائیں ہو سکتی ہیں اور ہر شخص اپنے علم و مطالعہ کی روشنی میں رائے قائم کر سکتا ہے لیکن پاکستان کے نظامِ حکومت کے بارے میں جب کوئی رائے دی جائے گی تو اس کے لیے لازم ہوگا کہ اسلام کو ہر صورت میں ملحوظِ خاطر رکھا جائے، کیوں کہ اس کے قیام کا بنیادی محرک اسلام تھا۔ ہاشمی صاحب نے بھی اسلامی نقطۂ فکر کو سامنے رکھا ہے اور اسی کو بنیاد قرار دے کر یہ رسالہ تصنیف کیا ہے۔

علمی رسائل کے مضامین

البلاغ، کراچی — اگست ۱۹۸۰ء

زکوٰۃ و عشر آرڈیننس — مولانا محمد تقی عثمانی

نیا طوفان اور اس کا مقابلہ (مسلسل) — مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

جامعہ، دہلی — جولائی ۱۹۸۰ء

انتخاب دواوین — ڈاکٹر تنویر احمد علوی

محمد علی اور ہندو مسلم سوال — ایک تاریخی جائزہ ۱۹۱۵ء-۱۹۲۵ء — ایلین دوڑے — تلخیص و ترجمہ: **انور صدیقی**

مسافر حیات — جناب محمد دست گیر خاں

محمد علی اور جواہر لال نہرو — ڈاکٹر سلیم قدوائی

پنڈت لچھمن نرائن دراب کا دیوان — دیویندر پرشاد سکسینہ

الحق، اکوڑہ خٹک — جون ۱۹۸۰ء

احسان و تصوف کی حقیقت اور مقصد — مولانا عبدالرشید

حرق مصاحف اور حضرت عثمان — مولانا سید سعید اللہ

سیدنا ابوبکر صدیق اور لسانِ وحی — مولانا حافظ محمد ابراہیم فانی

یہ انسانیت کے نام نہاد غم خوار — ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

پشتو ادب کی ایک پرانی فقہی کتاب — جناب وحید الرحمٰن شاہ

الرشید، ساہیوال — رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ

نفاذِ شریعت — سید ہدایت حسین

دارالعلوم کیوں قائم ہوا؟ — ڈاکٹر سید عبداللہ

حضرت ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ — مولانا عبدالرحمٰن سنجری

سب رس، کراچی — جون ۱۹۸۰ء

سراج اورنگ آبادی	شفقت رضوی

فکر و نظر، اسلام آباد — جولائی ۱۹۸۰ء

ابو جعفر محمد بن جریر طبری	ڈاکٹر سعید اللہ قاضی
لسان العصر اکبر اور جدید ذہن	ڈاکٹر غلام حسین ذو الفقار
مولانا حمید الدین فراہی کا ایک نادر غیر مطبوعہ خط	ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی
قرآن میں ناسخ و منسوخ کا مسئلہ	خلیل الرحمٰن
مولانائے روم کے مکاتیب	ڈاکٹر محمد ریاض

محدث، لاہور — جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ ۱۴۰۰ھ

کیا مسلمان اور ذمی کی دیت یکساں ہے؟	جناب برق التوحیدی
پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی عملی تدابیر	حافظ منظور احمد ایم۔اے
جہاد کی حقیقت	ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی

معارف، اعظم گڑھ — جولائی ۱۹۸۰

اسلامی ریاست کا تصور	سید صباح الدین عبد الرحمٰن
قرآن کریم اور اس کی نسبت سے بعض علوم کی ایجاد و ترقی (مسلسل)	ڈاکٹر نذیر احمد (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)
کشمیر میں اسلام کی اشاعت	محمد فاروق بخاری (امر سنگھ کالج، کشمیر)
حضرت اخی سراج کی آرام گاہ سعد اللہ پور	جناب اکمل یزدانی ایم۔اے (پورنیہ، بہار)

اکتوبر ۱۹۸۰ء

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون ۵۲۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۳ | اکتوبر ۱۹۸۰ ذی قعدہ ۱۴۰۰ | شمارہ ۱۰

ترتیب

تاثرات

۲۱، ۲۲ اگست ۱۹۸۰ کو اسلام آباد میں علما کنونشن ہوا، جس میں پاکستان کے تمام مسالکِ فکر کے علمائے کرام نے وسیع تعداد میں شرکت کی۔ حنفی، اہلِ حدیث، شیعہ علما نے ملک وقوم کے مشترکہ مسائل پر غور کیا اور ملک کی علمی ودینی ترقی کے بنیادی مسئلے کو ہدفِ فکر ٹھہرایا۔ علما کا یہ اجتماع کامیاب اجتماع تھا، جس میں مثبت انداز سے اجتماعی مسائل کو موضوعِ بحث بنایا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر علمائے دین صدقِ دل سے اکٹھے ہو جائیں اور منفی اسلوب ترک کر کے مثبت صورت میں مسائل پر غور کریں تو حالات یکسر بدل سکتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں جو اثر و رسوخ علما کو حاصل ہے اور کام کے جو مواقع انھیں میسر ہیں، اس میں دوسرا کوئی طبقہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہر محلے، ہر گاؤں، ہر قصبے اور ہر شہر میں ان کے مدارس اور تبلیغی مراکز قائم ہیں۔ مسجدیں ہیں، جو اصلاحِ معاشرہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، ان کے حلقے نہایت مضبوط ہیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں ان کا محتاج اور ان کے دروازے پر دستک دینے پہ مجبور ہے، اگر یہ اپنے حلقوں اور مرکزوں میں مثبت طریقے سے اسلام کی تبلیغ اور دین کی اشاعت کا بھرپور سلسلہ شروع کر دیں تو معاشرے میں جو برائیاں پائی جاتی ہیں، وہ اگر کلیتہً ختم نہ بھی ہوں تو ان میں بہت حد تک کمی ضرور واقع ہو سکتی ہے۔

اسلام کی نشر و اشاعت کا بنیادی کام ہمیشہ مسجدوں، دینی مدرسوں اور علما و صوفیا کی مجلسوں میں ہوتا رہا ہے۔ اب بھی اگر خلوصِ دل سے اس طرف توجہ کی جائے اور یہ تہیہ کر لیا جائے کہ کسی کی دل آزاری نہیں کی جائے گی، کسی کے فقہی مسلک کو نشانۂ تنقید نہیں بنایا جائے گا اور محض نقطۂ نظر کے اختلاف کی بنا پر کسی پر کیچڑ نہیں اچھالا جائے گا تو لازماً اس سے حالات میں تبدیلی واقع ہو گی اور معاشرتی اصلاح کے لیے فضا سازگار ہو گی۔

ہم علمائے کرام سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو اسی طرح نبھائیں گے جس طرح ہمارے اسلافِ کرام نبھاتے رہے ہیں اور آپس کے اختلافات کے اظہار میں جہاں تک ممکن ہو گا، احتیاط سے کام لیں گے۔ علما کا شیوہ اتحاد کی طرف گام زن ہونا اور اتفاق کی راہوں کی نشان دہی کرنا ہے، ان کے منصب کا تقاضا یہی ہے کہ وہ انتشار و افتراق سے دامن کشاں رہیں اور لوگوں کو وحدت و یگانگت کا درس دیں۔

از:- پروفیسر لطف اللہ بدوی مرحوم
مترجم:- رحمت فرخ آبادی ایم۔ اے

سندھ کا شہر شکارپور، دُرانیوں کے عہد میں

(۱۷۷۳ء تا ۱۸۲۴ء)

سندھ کے مشہور شہر شکارپور میں داؤدپوتروں کا اقتدار ختم ہونے کے بعد میاں نور محمد کلہوڑہ کی حکومت قائم ہوگئی۔ لیکن اسی دوران نادر شاہ کو باغیوں نے مشہد میں قتل کر دیا اور اس طرح نادر شاہی سلطنت پارہ پارہ ہوگئی۔ چنانچہ افغانستان پر نادر شاہ کے ایک افغان جنرل احمد خان ابدالی نے قبضہ کر لیا جس نے اپنے وطن کو ایرانی تسلط سے آزاد کرانے کے بعد "دولتِ درانیہ" کا اقتدار قائم کیا۔ احمد شاہ ابدالی اپنے دور کا ایک بلند اقبال حکمران تھا۔ اپنی حکومت و اقتدار کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے بعد، اس نے اپنے پیش روؤں کی طرح ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۱۶۱ھ میں سندھ کے کلہوڑہ حاکم میاں نور محمد نے نئے تاجدار سے عقیدت کا اظہار کیا، جس کے صلے میں اسے سندھ پر حکومت کرنے کا پروانہ ملا اور ساتھ ہی اُسے شاہ نواز خان کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ ۱۱۶۲ھ میں احمد شاہ ابدالی درۂ بولان کے راستے سندھ آیا۔ اس کی آمد کی اطلاع پاکر میاں نور محمد نے اپنے مشیر دیوان گدومل کو اس کی خدمت میں اظہارِ عقیدت و وفاداری کے لیے روانہ کیا۔ دیوان گدومل سکھر میں شاہی کیمپ آیا لیکن بدقسمتی سے وہ احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں باریابی حاصل نہ کر سکا۔ جب اس واقعے کی اطلاع میاں نور محمد کو ملی تو وہ احمد شاہ ابدالی کے غیظ و غضب سے بچنے کے لیے جیسلمیر کے علاقے میں روپوش ہوگیا۔ دیوان گدومل نے نوشہرو فیروز میں احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں باریابی حاصل کی۔ اس اطلاع پر میاں نور محمد جیسلمیر سے دوبارہ واپس چلا لیکن اس کی حیاتِ مستعار کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، اس لیے راستے ہی میں انتقال کر گیا۔ میاں نور محمد کے انتقال کے بعد احمد شاہ ابدالی نے سندھ کا نظمِ حکومت اپنے ہاتھ میں مکمل طور پر لے لیا اور سندھ کا مالیہ جمع کرنے کا کام اپنے کارندوں کے حوالے کر دیا۔ اس تمام عرصے میں دیوان گدومل احمد شاہ ابدالی کو راضی کرنے کی فکر میں لگا رہا اور آخر کار وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوگیا۔

اس طرح احمد شاہ ابدالی نے میاں نور محمد کے بڑے لڑکے میاں محمد مرادیاب خاں کو سربلند خان کا خطاب دے کر سندھ پر حکومت کرنے کا پروانہ عطا کیا اور شکارپور کے علاقے کو اپنی حدودِ سلطنت میں شامل کر کے اور خراج وصول کر کے دہلی کی طرف کوچ کر گیا۔ اس طرح ۱۷۵۵ء سے ۱۸۲۵ء تک شکارپور افغانستان کی حکومت کے تحت رہا۔ کیپٹن ایف، جی گولڈسمڈ نے اپنی کتاب "شکارپور کی تاریخی یادداشت" کی توضیحات میں درانی حکومت کی طرف سے شکارپر مقرر کردہ نوابوں کی مکمل فہرست دی ہے۔ یہ تفصیل تاریخی لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے۔ سطور ذیل میں ہم اسی کا ذکر کریں گے۔ احمد شاہ ابدالی کے دورِ اقتدار (۱۷۵۵ء تا ۱۷۷۳ء) میں مندرجہ ذیل نواب یا گورنروں نے شکارپور پر حکومت کی۔

۱۔ بوغرا خاں نورزئی :۔ یہ احمد شاہ ابدالی کے مقربین میں سے تھا۔ یہ ایک اچھا سیاست دان اور بہادر سپاہی تھا۔ یہ ساٹھ سال کی عمر میں شکارپور کا نواب مقرر ہو کر آیا تھا۔ اس نے آتے ہی شہر میں مکمل طور پر لاقانونیت کا خاتمہ کیا اور امن و امان بحال کیا۔ اس نے شکارپور پر تقریباً پانچ سال حکومت کی تھی۔

۲۔ رحمٰن خاں نورزئی :۔ اس کے دور میں شکارپور میں لاقانونیت کا بازار بُری طرح گرم تھا۔ یہ انصاف اور سول انتظام کی طرف سے مکمل طور پر بے پروا تھا۔ یہ بھی صرف پانچ سال ہی اپنے عہدے پر فائز رہا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے عبدالرحیم خان بامزئی اور محراب خان سدوزئی نواب مقرر ہوتے لیکن یہ بھی کامیاب حکمران ثابت نہ ہو سکے۔

احمد شاہ ابدالی کے بعد اس کا لڑکا تیمور شاہ تخت کا حق دار تھا لیکن احمد شاہ ابدالی کے وزیر شاہ ولی خان کے بغض و حسد کی بنا پر بسترِ مرگ پر ابدالی اپنے بیٹے کا چہرہ تک نہ دیکھ سکا۔ شاہ ولی خان کی خواہش تھی کہ دولتِ درانیہ کے تخت پر تیمور شاہ کے بجائے اس کے چھوٹے بھائی سلیمان کا قبضہ ہو، جو اس کا ایک ہم مشرب شخص تھا۔ ان حالات کے تحت تیمور شاہ، ولی خان اور سلیمان کی مشترکہ فوج سے مقابلہ کرنے کے لیے قندھار کی طرف روانہ ہوا، اور ایک خوں ریز جنگ کے بعد شاہ ولی خان مارا گیا، اور تیمور کے چھوٹے بھائی سلیمان نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد تیمور شاہ نے بیس سال تک نہایت امن و چین سے حکومت کی۔ تیمور شاہ کے دور میں سندھ کے حکمران میاں عبدالنبی کلہوڑے کی امداد کے لیے کئی افغان سردار سندھ آئے جن کا

تفصیلی تذکرہ "فتح نامہ" میں دیا گیا ہے۔ تیمور شاہ کے دربار سے مندرجہ ذیل افراد سندھ کے گورنر مقرر ہو کر آئے۔

۱۔ غلام صدیق خان :۔ یہ ۱۷۷۳ء سے ۱۷۸۲ء تک شکارپور کا گورنر رہا۔ یہ ایک دانا اور ہوشیار حکمران تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ علم دوست اور شاعر بھی تھا۔ افسوس ہے کہ اب اس کا نمونہ کلام کہیں دست یاب نہیں ہے۔ وہ صاحب ڈنو صاحب کے کلام کا نہایت ذوق و شوق سے مطالعہ کرتا تھا۔ اس نے علاقے کی زرعی ترقی کی طرف خاص توجہ دی۔ گڑھی یاسین، محمد باغ اور بختیاور پور کے علاقے میں کئی نہریں کھدوائیں اور اس طرح زمین کی سرسبزی و سیرابی کے لیے پانی کافی وافر مقدار میں پھیل گیا۔ شکارپور قلعے کے شمال کی طرف اس نے ایک بہت بڑی حویلی تعمیر کرائی۔ یہ محلہ اب بھی "صدیق حویلی" کے نام سے منسوب ہے۔ شکارپور میں اپنا عرصۂ اقتدار مقبول کرنے کے بعد وہ بکھر کا نواب مقرر ہوا، جہاں اسے شکارپور کے خزانے سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔

۲۔ صادق خاں ولد مرزا خان :۔ ۱۷۸۲ء سے ۱۷۹۳ء تک شکارپور کا گورنر رہا۔ اس کا والد مرزا خان، کشمیر میں ڈیرہ جات کا گورنر تھا۔ اس کے دورِ اقتدار میں اناج کے گوداموں میں اناج خراب ہو جانے کی وجہ سے بہت سخت قحط پڑا جس کی وجہ سے اہلِ شکارپور کو سخت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

اس دور میں سندھ ایک انقلابی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ نور محمد کلہوڑہ کی وفات کے بعد اس کا بڑا لڑکا میاں مرادیاب خان گدی نشین ہوا تھا، جسے بعد میں معزول کر دیا گیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد میاں غلام شاہ اور میاں عطر خاں کے درمیان جو دونوں بھائی تھے، باہمی خلفشار نے سر اٹھایا جس نے سندھ کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ اس باہمی خلفشار میں آخر کار میاں غلام شاہ کامیاب و کامران ہوا، اور کلہوڑا اقتدار کی گدی پر رونق افروز ہوا۔ میاں غلام شاہ سندھ کے کلہوڑہ حکمرانوں میں سب سے زیادہ کامیاب و کامران حکمران ثابت ہوا، اس کا دورِ اقتدار سندھ کی تاریخ کا عہدِ زریں کہلاتا ہے۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا میاں محمد سرفراز خاں تخت نشین ہوا۔ یہ ایک ادیب اور عالم شخص تھا، لیکن اصولِ حکمرانی و سیاست سے پوری طرح واقف نہ تھا، یہی وجہ تھی کہ اپنے دور کی سیاست کے پیچ و خم میں پھنس کر وہ اپنا اقتدار تک گنوا بیٹھا۔ میاں محمد سرفراز خاں کے بعد کلہوڑہ دورِ اقتدار کا زوال

شروع ہوگیا۔ میاں سرفراز خان کے بعد میاں عبدالنبی تخت نشین ہوا، جس کے دور میں سندھ اپنے مشکل ترین دور سے گزر رہا تھا۔ کافی عرصے سے تیمور شاہ کے دربار میں ایک عباسی شہزادہ عزت یار خان سندھ کی گدی کا دعوے دار بنا ہوا تھا، اور دوسری طرف کلہوڑہ حکمرانوں نے کافی عرصے سے سالانہ خراج بھی شاہی خزانے میں جمع نہ کرایا تھا۔ ان حالات میں تیمور شاہ نے عزت یار خان کو اپنے ایک سردار محفوظ خان کے ہمراہ سندھ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس فوج نے شکارپور میں قیام کیا۔ ان حالات میں میر بجار کلہوڑہ فوج کو لے کر عزت یار خان کے مقابلے کے لیے نکلا اور بکھر کے قریب کشتیوں کے پل کے ذریعے دریائے سندھ عبور کر کے شکارپور آیا۔ شکارپور کے قلعے کے پاس دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا، جس میں میر بجار کو فتح نصیب ہوئی۔ اس وقت شکارپور کا گورنر صادق خان تھا۔ اس نے بھاگ کر شکارپور کے قلعے میں پناہ لی لیکن میر بجار نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور اس طرح ایک معمولی مقابلے کے بعد شکارپور کے قلعے پر بھی میر بجار کا قبضہ ہوگیا۔ قلعے پر قبضے کے بعد میر بجار نے اپنی فوج کو لوٹ مار کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا اور یہ اعلان بھی کرا دیا تھا کہ "یہ شہر بادشاہ کا ہے اور ہم سب اس کے خادم ہیں"۔ اس کامیابی کے بعد میر بجار نے ہر ایک افغان سردار کو خلعت اور گھوڑا دے کر رخصت کیا۔ تیمور شاہ کو اپنے سردار محفوظ خاں کی میر بجار کے ہاتھوں شکست کا حال سن کر سخت غصہ آیا، چنانچہ وہ ایک زبردست لشکر کے ساتھ میر بجار کو سزا دینے کے لیے قندھار سے روانہ ہوا۔ جب تیمور شاہ شکارپور سے ایک منزل کے فاصلے پر تھا تو میر بجار کا سفیر اس کے سامنے میر بجار کی طرف سے نذرانے لے کر حاضر ہوا، اسی دوران میر بجار خاں بھی تیمور شاہ کی قدم بوسی کے لیے آگیا اور اس نے تیمور شاہ کو اپنے حق میں ہموار کر لیا۔ اس طرح تیمور شاہ میر بجار کو معاف کرنے کے فوراً بعد قندھار واپس چلا گیا اور میر بجار شکارپور خالی کر کے خدا آباد کی طرف روانہ ہوگیا۔ لیکن جلد ہی میر بجار اور کلہوڑہ حکمران میاں عبدالنبی خان کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا اور اس طرح یہ بہادر سردار میاں عبدالنبی خان کے منصوبے کے مطابق کان میں ایک بات سننے کے بہانے جیسلمیر کے دو اجنبی باشندوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ میر بجار کی شہادت نے تالپور میروں اور میاں عبدالنبی کے درمیان ایک نیا تنازع پیدا کر دیا اور اس طرح سندھ ایک مرتبہ پھر افغان فوج کی لوٹ مار اور کشت و خون کی نذر ہوگیا۔ لیکن شکارپور چونکہ درانی سلطنت کا ایک حصہ

تھا، اس لیے وہ ان کی دست برد سے محفوظ رہا۔ مددخاں کی طاقت کے سامنے میروں کو جھکنا پڑا۔ اور اس طرح میاں عبدالنبی ایک مرتبہ پھر سندھ کا حاکم بن گیا، لیکن افسوس کہ میاں عبدالنبی اب بھی اپنی غلط حرکتوں سے باز نہ آیا اور میر عبداللہ جو اس وقت تالپور میروں کا مہندار تھا، اس کی سازش سے قتل کر دیا گیا۔ چنانچہ تالپوروں نے میر فتح علی خان کی سرداری میں میاں عبدالنبی سے انتقام لینے کا عزم کیا اور اس کے مقابلے کے لیے نکلے اور جنگ ہالانی میں میاں عبدالنبی اپنے تخت و تاج سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا اور اب سندھ پر تالپور میروں کا قبضہ ہو گیا۔

۱۷۹۲ میں تیمور شاہ نے اپنے مشہور جنرل پائندہ خان کو سندھ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس حملے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ تالپور میروں نے اپنی نوزائیدہ حکومت کے لیے نہ تو تیمور شاہ سے حکومت کرنے کا پروانہ حاصل کیا تھا اور نہ انھوں نے مقررہ خراج درانی خزانے میں داخل کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس حملے میں میاں عبدالنبی کا بھی کچھ ہاتھ ہو جو تیمور شاہ کے دربار میں تالپور میروں کے خلاف فریاد لے کر گیا تھا۔ پائندہ خاں ایک لشکر جرار لے کر آیا اور شکارپور میں منزل انداز ہوا۔ جب اس کی اطلاع میر فتح علی خان کو ملی تو وہ خدا آباد سے پائندہ خاں سے ملاقات کرنے شکارپور آیا اور اس سے عقیدت و محبت کا اظہار کیا اور پھر کافی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ سندھ پر حکومت کرنے کی سند تالپور میروں کو عطا کی جائے اور یہ کہ تالپور سردار، کلہوڑہ حکمرانوں کی طرح خراج شاہی خزانے میں داخل کرتے رہیں گے۔ دولتِ درانیہ کا مصنف اس معاہدے کو 'عہد نامہ شکارپور' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس معاہدے کے بعد پائندہ خاں قندھار واپس چلا گیا اور میر فتح علی خاں نے اپنے مشیر دیوان جسپت رائے کو بے بہا تحائف کے ساتھ شکارپور سے تیمور شاہ کی خدمت میں بطور سفیر روانہ کیا۔ تیمور شاہ کا انتقال ۱۷۹۳ میں ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بڑا لڑکا زمان شاہ کافی چپقلش کے بعد گدی نشین ہوا۔ اس کے دور میں مندرجہ ذیل گورنروں نے شکارپور پر حکومت کی۔

۱۔ شیر خان پوپلزئی ۱۷۹۳ سے ۱۷۹۵ تک

۲۔ رحمت اللہ خاں قلندری ۱۷۹۵ سے ۱۷۹۷ تک

۳۔ شربت خاں پوپلزئی ۱۷۹۷ سے ۱۷۹۹ تک

۴۔ دوست محمد خان پوپلزئی ۱۷۹۹ سے ۱۸۰۱ تک

زمان شاہ کے اقتدار کے آخری دور میں اس کے بھائیوں ہمایوں اور محمود نے بغاوتیں کیں ہمایوں کو گرفتار کر کے زمان شاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا جس نے اس کی آنکھیں نکلوا کر اندھا کر دیا، لیکن محمود اپنی بغاوت میں کامیاب رہا۔ اس کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ زمان شاہ اپنے سپہ سالار اور وزیر پائندہ خان بارکزئی سے بدگمان ہو گیا تھا اور اسی لیے اس نے بعد میں پائندہ خان کو قتل کرا دیا تھا اور پائندہ خاں کا لڑکا فتح خاں سے مل گیا۔ اس پُرآشوب وقت میں جب کہ زمان شاہ پنجاب آیا ہوا تھا اپنے لیے میدان صاف دیکھ کر محمود خان نے بغاوت کی اور بڑی آسانی سے کابل پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ محمود خان کی بغاوت کا سن کر زمان شاہ پنجاب کو رنجیت سنگھ کے حوالے کر کے فوراً افغانستان واپس ہوا، لیکن درۂ خیبر کے نزدیک زمان شاہ اور محمود شاہ کی فوجوں میں مقابلہ ہوا، جس میں محمود شاہ کو کامیابی ہوئی اور زمان شاہ شکست کھا کر قید ہوا۔ چنانچہ اب محمود شاہ نے اپنے سگے بھائی ہمایوں کے قصاص میں افغانستان کے بدقسمت حکمران زمان شاہ کی بھی آنکھیں نکلوا دیں۔ محمود شاہ افغانستان پر صرف تین سال حکومت کر سکا۔ اس کے دور میں شکارپور پر مندرجہ ذیل گورنروں نے حکومت کی۔

۱۔ شاہ سرور خان بارکزئی :۔ کہتے ہیں کہ یہ کافی بوڑھا آدمی تھا، صرف چھ ماہ شکارپور کا گورنر رہا۔

۲۔ امام بخش مغل :۔ یہ شیعہ تھا، محرم کے موقع پر اس نے لوگوں کو تابوت بنانے کے لیے اُکسایا جس پر علما نے اس کی بہت سخت مخالفت کی، اس کی مخالفت میں حضرت حفیظ اللہ علوی پیش پیش تھے۔ علما نے نواب پر حملہ کیا اور تابوت بنانے والوں کو قتل کر دیا اور تابوتوں کو توڑ دیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک درخواست محمود شاہ کے دربار میں روانہ کی چنانچہ محمود شاہ نے اسے ہاتھی کے پیروں سے کچلوا کر مروا ڈالا۔

۳۔ سردار محمد اعظم خاں :۔ یہ ایک بہادر، نیک اور انصاف پسند حکمران تھا۔ اپنے عہدے پر تقریباً ایک سال تک فائز رہا۔

۴۔ بڈھل خاں مغل :۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق شکارپور ہی سے تھا، یہ نرم مزاج اور سخی طبیعت حکمران تھا۔

۵۔ دیوان سکو سنگھ :۔ یہ ایک چالاک مگر اچھا حکمران تھا۔ افغان حکومت میں ایک ہندو کا اس اہم ترین عہدے پر فائز ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ اس دور میں بھی مسلمانوں کا اقلیت کے ساتھ کتنا اچھا سلوک تھا۔

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ درانی خاندان نے کس طرح اپنا اتحاد و اتفاق ختم کر کے خود کو مصائب میں مبتلا کیا۔ اس پُر آشوب دور میں محمود شاہ بھی ہمیشہ اقتدار پر قابض رہنے والی شخصیت نہیں تھی۔ اس کی کمزور پالیسی ہی رنگ لائی۔ شاہ شجاع الملک اور محمود شاہ کے درمیان کش مکش جاری رہی۔ فتح خان نے اپنی سی بہت کوشش کی لیکن عوام بگڑ چکے تھے، آخر محمود شاہ کی حیثیت ایک قیدی کی سی بن گئی اور شاہ شجاع الملک آخر کار تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ شاہ شجاع الملک کے دور میں شکارپور پر مندرجہ ذیل گورنروں نے حکومت کی۔

۱۔ پوپلزئی :۔ ۱۸۰۲ء سے ۱۸۰۵ء تک

۲۔ نواب مدد خان پوپلزئی :۔ یہ ایک علم دوست اور انصاف پسند حکمران تھا۔ شکارپور کی اناج منڈی میں اس کی تیار کردہ مسجد آج تک موجود ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا آخری دور برطانوی حکومت کے زیرِ سایہ پٹے دار کی حیثیت سے گزارا۔

۳۔ بڈھل خاں مغل :۔ یہ دوسری دفعہ شکارپور کا گورنر مقرر ہوا تھا۔

۴۔ جہانگیر خاں مغل :۔ ۱۸۰۷ء سے ۱۸۰۸ء تک

۵۔ پایندہ خان پوپلزئی :۔ ۱۸۰۸ء سے ۱۸۰۹ء تک

۶۔ محمد رضا خان مغل :۔ ۱۸۰۹ء سے ۱۸۱۰ء تک

اسی دوران شاہ شجاع اپنی خود فریبیوں کا شکار ہو گیا اور اس نے وہ فاش غلطیاں کیں جن کی وجہ سے اس کی حکومت مشکلات میں گھر گئی۔ اس کی پہلی غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنی بہترین تجربکار اور آزمودہ فوج کشمیر پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی جہاں اسے بڑی طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف اس نے میر واعظ نامی ایک درویش کو اپنے ہاتھوں قتل کیا، میر واعظ کا افغان پر کافی اثر تھا، اس کے اس اقدام سے اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ اس دوران قندھار میں شاہ شجاع کے بھتیجے قیصر مرزا نے محمود کے سپہ سالار فتح خان کو گرفتار کر کے اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کر دیا۔ اس نازک دور میں

جبکہ افغانستان میں اس کے خلاف بُری طرح بغاوت پھیلی ہوئی تھی، شاہ شجاع سندھ پر حملے کی غرض سے بڑھا۔ اس کے فوجی مہندار شیر محمد نے اسے اس اقدام سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ پیش نہ گئی۔ اسی دوران محمود شاہ بالاحصار سے بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ شیر محمد شاہ شجاع کی غلط حرکتوں کی وجہ سے پہلے ہی اس سے بہت نالاں تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شجاع الملک کی جگہ قیصر مرزا کو بادشاہ بنا دیا۔ یہ تمام اطلاعات شاہ شجاع کو ملتی رہی تھیں۔ قیصر مرزا اور شیر محمد اب پشاور کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے کہ یہیں شاہ شجاع سے مقابلہ ہوا، جس میں شیر محمد مارا گیا۔ ۱۸۰۹ میں شاہ شجاع اور محمود کی افواج میں مقابلہ ہوا، جس میں شاہ شجاع کو بُری طرح شکست ہوئی اور وہ پہاڑی علاقے میں روپوش ہو گیا۔ اس طرح تخت پر محمود شاہ کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ محمود شاہ کے اقتدار کے اس دوسرے دور میں شکارپور پر مندرجہ ذیل گورنروں نے حکومت کی۔

۱۔ سید عبداللہ خاں ۔ ۱۸۱۰ سے ۱۸۱۴ تک

۲۔ نصیر خاں ۔ ۱۸۱۴ سے ۱۸۱۸ تک

۳۔ سردار عبدالصمد۔ ۱۸۱۸ سے ۱۸۲۰ تک

۴۔ محمد رضا خاں ۱۸۲۰ سے ۱۸۲۱ تک۔ اُسے ڈیرہ غازی خان کے نواب نے گرفتار کر کے اپنی قید میں رکھا تھا۔

محمد رضا خان کے بعد جن نوابوں نے شکارپور پر حکومت کی، ان کا عرصۂ اقتدار بہت ہی کم ہے۔ مثلاً کسی کا اقتدار دو ماہ رہا اور کسی کا اقتدار چار ماہ رہا۔ اسی دوران محمود شاہ اپنے وزیر اعظم فتح خان سے ناراض ہو گیا اور اس کی آنکھیں نکلوا کر اسے اندھا کر دیا جس کی بنا پر اس کے بھائی امیر دوست محمد نے محمود شاہ پر حملہ کیا لیکن شکست کھا کر ایران کی طرف بھاگ جانے پر مجبور ہوا اور وہیں ۱۸۲۱ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

شاہ شجاع اپنا تاج و تخت گنوا کر بھی خاموش نہ رہا اور کافی عرصے تک اس نے دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی۔ ۱۸۱۵ء میں وہ اپنا کوہ نور ہیرا گنوا کر راجہ رنجیت سنگھ کی قید سے بھاگ نکلا اور کشمیر کے راستے حیدرآباد آیا۔ تالپور میروں کو جب اس کی آمد کا پتا چلا تو وہ اس کے استقبال کے لیے آئے اور اس کی خدمت میں تحفے پیش کیے۔ وہاں سے وہ شکارپور کی طرف آیا جہاں

اس وقت شہزادہ محمود تیمور شاہ سندھ میں نواب تھا۔ اس نے بھی شاہ شجاع کو خوش آمدید کہا اور شکارپور اس کے حوالے کر دیا۔ شاہ شجاع شکارپور میں ایک سال نہایت آرام و سکون سے رہا۔ غالباً اسی زمانے میں شاہ شجاع نے بیشمبل نامی ایک دولت مند ہندو کی بہن سے شادی کر کے اسے اپنے حرم میں داخل کیا تھا۔ جب محمود شاہ کو شاہ شجاع کی شکارپور میں موجودگی کی اطلاع ملی تو اس نے فتح خان کے بھائی سردار محمد اعظم خان کو شکارپور پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اعظم خاں کی آمد کی اطلاع پا کر شاہ شجاع حیدرآباد روانہ ہو گیا اور اس نے شہزادہ تیمور شاہ کو معزول کر کے اس کی جگہ ملا محمد خان غلزئی کو شکارپور کا گورنر مقرر کیا۔ شہزادہ تیمور شاہ کا لڑکا شہزادہ پیر محمد انگریزوں کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے شکارپور میں انتقال کر گیا تھا۔ محمود شاہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد کچھ عرصہ افغانستان پر بارکزئی برادران قابض رہے۔ اس زمانے میں شکارپور کا نواب منصور خان تھا جو رحمدل بارکزئی کا بھانجا تھا۔ رحمدل بارکزئی نے اپنی موجودگی میں منصور خاں کو شکارپور کا گورنر مقرر کیا تھا اور پھر اپنے بھائیوں شیردل خاں اور ببر دل خان کے بلانے پر وہ قندھار روانہ ہو گیا تھا کیونکہ وہاں اس کے یہ دونوں بھائی امیر دوست محمد خان کے خلاف جنگ میں مصروف تھے۔ افغان حکومت کی کمزور حالت کو دیکھ کر میر کرم علی خان کے دل میں جو اس وقت حیدرآباد کا امیر تھا، شکارپور کو فتح کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اسی دوران راجہ رنجیت سنگھ نے بھی شکارپور پر قبضہ کر کے اپنے دائرۂ اقتدار میں توسیع کرنا چاہی چنانچہ راجہ رنجیت سنگھ کا مشہور جرنل وینتورا، ڈیرہ غازی خاں تک آ گیا تھا۔ تالپور امیر رنجیت سنگھ کے اس منصوبے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ موقع سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے میر کرم علی خان نے نواب ولی محمد خان لغاری کو ایک کثیر فوج کے ساتھ شکارپور پر حملہ اور قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ نواب ولی محمد خان نے شاہی باغ میں اپنا فوجی کیمپ قائم کیا اور پھر نواب منصور خان کو ایک خط کے ذریعے کل حقیقت بیان کر دی، جس کے مطابق شکارپور پر تالپور امیروں کا قبضہ نہایت ہی ضروری تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سکھوں کے دباؤ اور اثر سے بچنے کے لیے صرف یہی تجویز کارگر نظر آتی تھی۔ خط روانہ کرنے کے بعد نواب ولی محمد خان نے نواب منصور خان کے ایک معتمد جمعہ خان کو حکمت عملی سے اپنے ساتھ کر لیا۔ جمعہ خان کے مشورے نے نواب منصور خان کو اس امر کے لیے قائل کر دیا کہ وہ شکارپور

کا قبضہ تالپور میروں کو دے دے۔ جون ۱۸۲۴ میں نواب ولی محمد خان کی فوج کا ایک سردار دلاور خدمت گار ایک مختصر فوجی دستے کے ساتھ شکارپور شہر میں داخل ہوا اور میلارام ہندو کی بیٹھک کو اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ اسی شام نواب منصور خاں شاہی باغ میں نواب ولی محمد خاں لغاری سے ملا اور شکارپور شہر کے آٹھوں دروازوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں، اس کام سے فارغ ہو کر منصور خاں گڑھی یاسین چلا گیا۔ ایک ہفتے کے بعد اسے نواب ولی محمد خاں کا یہ حکم ملا کہ وہ گڑھی یاسین سے بھی چلا جائے، چنانچہ منصور خاں نے اس حکم کی تعمیل کی اور قندھار چلا گیا اور اس طرح شکارپور سے درانیوں کے قبضۂ اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

درانیوں کے دورِ حکومت میں شکارپور نے بہت ترقی کی۔ اس دور میں یہاں کی آبادی کم و بیش تیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور یہاں کے لوگ بہت خوش حال اور سال دار تھے، یہاں کے ہندو اس زمانے میں بہت دولت مند سمجھے جاتے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ درانیوں نے شکارپور پر کم و بیش پچاس سال حکومت کی۔ یہ تمام دور شکارپور کے لیے امن و سلامتی کا دور تھا کیونکہ یہاں پر افغان اقتدار قائم ہونے کی وجہ سے بیرونی طاقتوں کو اس علاقے پر حملے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اگرچہ اس عرصے میں افغانستان میں کئی انقلاب آئے مگر ان کا کسی طور پر بھی شکارپور پر کوئی اثر نہ پڑا۔

ارمغان شاہ ولی اللہؒ ۔ پروفیسر محمد سرور

حضرت ولی اللہ محدث دہلوی جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت مصنف تھے۔ انھوں نے تفسیر، حدیث، شروحِ حدیث، فقہ اور تصوف وغیرہ تمام عنوانات پر کتابیں لکھیں اور احکامِ شریعت کی حکم و مصالح کی روشنی میں وضاحت کی۔ "ارمغان شاہ ولی اللہ" ان کے افکار و تعلیمات کا بہترین مجموعہ اور ان کی عربی و فارسی کتابوں کا ایک عمدہ انتخاب ہے جو اردو کے قالب میں ڈھال کر قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں شاہ صاحب اور ان کے بزرگوں اور مشائخ کے سوانح حیات بھی دیے گئے ہیں۔

صفحات ۵۲۰   قیمت ۳۰ روپے

ملنے کا پتا:۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

مولانا شہاب الدین ندوی

علمِ کیمیا اور طبیعیات کی اہمیت

(تیسری اور آخری قسط)

ایٹم کا حیرت انگیز نظام

آج دنیا میں، اب تک کی دریافت کے مطابق ایک سو چار (۱۰۴) عناصر (ان میں بعض غیر قدرتی بھی شامل ہیں) پائے جاتے ہیں۔ دنیا کی تمام چیزیں —— خواہ وہ جمادات سے ہوں یا نباتات وحیوانات سے —— انھی عناصر سے مرکب ہیں۔ یعنی اگر کسی چیز کا کیمیاوی مَعمل (لیبورٹری) میں تجزیہ کیا جائے تو ان میں یہی اجزا نکلتے ہیں۔ اصل میں جس "دخانی مادے" سے اس جہانِ رنگ وبو کی تخلیق ہوئی تھی اس مادے کی "وحدت" تمام آثار ومظاہر میں دکھائی دیتی ہے۔ ان عناصر میں کچھ ہلکے ہیں تو کچھ بھاری، کچھ کم یاب ہیں تو کچھ وافر مقدار میں پائے جانے والے ہیں۔ ان میں کچھ دھاتیں ہیں اور کچھ غیر دھاتیں۔ مگر سب میں بنیادی طور پر ایک ہی نظامِ وحدانیت کارفرما ہے۔ وہ یہ کہ ہر ایک میں "الکٹرانی" اور "مرکزائی" نظام پایا جاتا ہے۔ کسی میں الکٹرانوں کی تعداد کم ہوتی ہے تو کسی میں زیادہ۔ اسی طرح مرکزے میں پروٹانوں اور نیوٹرانوں کا نظام کارفرما ہے۔ سب سے ہلکا عنصر وہ ہے جس کے مرکزے میں صرف ایک پروٹان ہو اور اس کے گرد ایک الیکٹران چکر لگا رہا ہو۔ اس کو ہائیڈروجن کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی شکل یوں ہے:
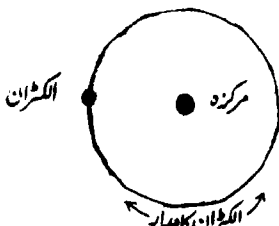
ہائیڈروجن کے جوہر کی شکل جس کے مرکزے میں صرف ایک پروٹان ہوتا ہے اور اس کے گرد ایک الکٹران چکر لگاتا ہے۔

ہائیڈروجن کے بعد کا عنصر وہ ہے جس کے مرکزے میں دو نیوٹران اور دو پروٹان (باہم جڑے

ہوئے) ہوتے ہیں اور ان کے گرد دو الکٹران گردش کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کو ہیلیم (HELIUM) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسی طرح لیتھیم (LITHIUM) کے مرکزے میں ۳+۴، بیری لیئم (BERYLIUM) کے مرکزے میں ۴+۵، بورون (BORON) میں ۵+۵، کاربن (CARBON) میں ۶+۶، نائیٹروجن (NITROGEN) میں ۷+۷، آکسیجن (OXYGEN) میں ۸+۸ پروٹان اور نیوٹران بالترتیب پائے جاتے ہیں، اور قدرتی عناصر میں سب سے بھاری عنصر یورینیم (URANIUM) ہے، جس کے مرکزے میں ۹۲ پروٹان اور ۱۴۶ نیوٹران ہوتے ہیں، اور اس کے مرکزے کے گرد ۹۲ الکٹران مختلف مداروں میں (ایک مکمل نظامِ شمسی سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز طور پر) گردش کرتے ہیں۔ کارخانۂ قدرت میں یہ ایک نفیس ترین نظام ہے کہ کسی عنصر کے مرکزے میں جتنے پروٹان (مثبت چارج والے برقی ذرات) ہوتے ہیں، اس کے مرکزے کے گرد اتنے ہی الکٹران (منفی برقی چارج والے ذرات) گردش کر رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً لوہے کے مرکزے میں ۲۶ پروٹان ہوتے ہیں تو اس کے گرد گردش کرنے والے الکٹران بھی ۲۶ ہی ہوتے ہیں۔ ریڈیم کے مرکزے میں ۸۸ پروٹان ہوتے ہیں تو الکٹران بھی ۸۸ ہی ہوتے ہیں۔ جوہری اجزا کے اس ہیر پھیر سے ہمیں چند اصول معلوم ہوتے ہیں، جن کی مختصر تفصیل یہ ہے:

۱۔ کارخانۂ قدرت میں تمام عناصر — پروٹانوں کی تعداد کے لحاظ سے — ترتیب وار ملتے ہیں، اور اس ترتیب سے ان کو سلسلہ وار نمبر دیے گئے ہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن کا ایٹمی نمبر ۱ ہے، ہیلیم کا ۲، کاربن کا ۶، فاسفورس کا ۱۵، لوہے کا ۲۶، تانبے کا ۲۹، چاندی کا ۴۷، سونے کا ۷۹، ریڈیم کا ۸۸ اور یورینیم کا ۹۲۔ (اختصار کے خیال سے درمیان والے عناصر کے نام اور نمبر چھوڑ دیے گئے ہیں)۔ اس طرح کارخانۂ قدرت میں ایک سے بانوے (۹۲) تک تمام درمیانی عناصر مل جاتے ہیں اور کوئی بھی عنصر چھوٹ نہیں سکا۔ بالفاظِ دیگر اس خدائی نظام میں کہیں بھی رخنہ یا انتشار نہیں ہے۔

۲۔ کسی مرکزے میں موجود شدہ پروٹانوں اور نیوٹرانوں (بے چارج والے ذرات) کی مجموعی تعداد کے لحاظ سے اس عنصر کا ایٹمی وزن ظاہر کیا جاتا ہے، مثلاً ہائیڈروجن کا ایٹمی وزن ایک ہے، ہیلیم کا ۴، کاربن کا ۱۲، آکسیجن کا ۱۶، کوبالٹ کا ۵۹، پلاٹینیم کا ۱۹۵ اور یورینیم کا ۲۳۸۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عناصر بالترتیب ہائیڈروجن کے ایٹم سے نسبتاً ۴ گنا، ۱۲ گنا، ۱۶ گنا، ۵۹ گنا، ۱۹۵ گنا اور

۲۳۸ گنا بھاری ہیں۔

۲۔ کسی عنصر کی خاصیت کا اعتبار اس عنصر کے مرکزے میں موجود شدہ پروٹانوں کی تعداد پر منحصر ہے، ورنہ محض ایک پروٹان کی کمی بیشی سے اس عنصر کی خاصیت بدل جائے گی۔ مثلاً سونے جیسی قیمتی دھات اور پارے جیسی حقیر چیز کے مرکزوں میں صرف ایک پروٹان (اور صرف ان کے گرد چکر لگانے والے الکٹرانوں کی تعداد میں صرف ایک الکٹران) کا فرق ہوتا ہے۔ اگر سونے کے مرکزے میں ایک پروٹان داخل کر دیا جائے تو وہ پارہ بن جائے گا۔ اسی طرح اگر پارے کے مرکزے سے ایک پروٹان نکال دیا جائے تو وہ سونا بن جائے گا۔ ریڈیم کا ایٹمی نمبر ۸۸ اور ایٹمی وزن ۲۲۶ ہے۔ اگر مصنوعی تابکاری کے ذریعے اس کے مرکزے سے ۶ پروٹان خارج کر دیے جائیں تو وہ سیسے کا جوہر بن جائے گا، جس کا ایٹمی نمبر ۸۲ اور ایٹمی وزن ۲۰۷ ہے۔

ان عناصر میں بعض کم یاب اور بعض بہت ہی کم یاب ہیں۔ مثلاً یورینیم (جس سے ایٹم بم تیار ہوتا ہے) اور ریڈیم وغیرہ۔ اور بعض بہت افراط کے ساتھ پائے جاتے ہیں، جیسے ہائیڈروجن، آکسیجن، نائیٹروجن اور کاربن وغیرہ۔ ویسے کہنے کو تو اس عالمِ رنگ و بو میں قدرتی عناصر ۹۲ پائے جاتے ہیں، مگر دنیا کی اکثر چیزیں صرف ۱۴ عناصر سے مرکب ہیں جو وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں ہائیڈروجن، آکسیجن، نائیٹروجن، کاربن، کلورین گیس، سوڈیم، میگنیشیم، ایلومینیم، سلیکون، فاسفورس، پوٹاشیم، کیلشیم اور لوہے جیسے ٹھوس مادے شامل ہیں۔ حیواناتی اور نباتاتی پروٹوپلازم میں بھی یہی اجزا پائے جاتے ہیں، جو پوری حیاتیاتی زندگی کا بنیادی مادہ ہے۔

ایٹم کا یہ پورا انتظام بہت ہی گہری سوجھ بوجھ اور حیرت انگیز نظم و ضبط کا پابند ہے جو ہر اعتبار سے "وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ" (اور اس کے ہاں ہر چیز ایک خاص مقدار کے ساتھ ہے) کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ آپ کسی بھی حیثیت سے غور کیجیے، یہ عظیم ترین ربانی اصول ہر طرح سے صادق آئے گا۔ خدائی باتوں میں تبدیلی واقع نہ ہونے کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ انسانی علوم و نظریات خواہ کتنے ہی بدل جائیں، خدائی اقوال میں کوئی تبدیلی یا کسی قسم کی ترمیم کبھی واقع نہیں ہو سکتی، بلکہ ہر نئی سے نئی تحقیق کی بدولت اس کے ابدی بیانات میں مزید نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ ضمن یہ کہ علمِ مقداروں یا پیمانوں کا علم، تمام علوم کا حاصل اور خصوصاً علمِ کیمیا کی جان ہے۔

مرکبات کے جلوے

یہ قدرتی عناصر ـــ جو تعداد میں ۹۲ ہیں، حروفِ تہجی کی طرح ـــ مفرد عناصر کہلاتے ہیں۔ یہ کائنات کی بنیادی اینٹیں ہیں، جن سے اس جہانِ آب و گِل کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہی مفرد عناصر جب دو یا دو سے زیادہ تعداد میں کیمیاوی طور پر باہم ملتے ہیں تو اس کے نتیجے میں سالمات یا مرکبات وجود میں آتے ہیں۔ (جس طرح حروفِ تہجی سے الفاظ و کلمات بنتے ہیں)۔ مثلاً ہائڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کا ایک ایٹم جب کیمیاوی طور پر ملتے ہیں تو ان سے پانی کا ایک سالمہ (MOLECULE) وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح سوڈیم کے ایک ایٹم اور کلورین کے ایک ایٹم کے کیمیاوی ملاپ سے نمک طعام کا ایک سالمہ بنتا ہے۔ کاربن کے ایک جوہر اور آکسیجن کے دو جوہروں کے تعاملِ باہمی سے کاربن ڈائی اکسائیڈ کا ایک سالمہ نمودار ہوتا ہے جس کو ہم سانس کے ذریعے خارج کرتے رہتے ہیں۔

یہ بعض سادہ قسم کے سالمات کی مثالیں ہیں۔ پیچیدہ قسم کے سالموں میں مختلف عناصر کے سیکڑوں ہزاروں جوہر (ایٹم) ہوتے ہیں۔ مثلاً کلوروفل (درختوں کا سبز مادہ) کے ایک سالمے میں کاربن کے ۵۵، ہائیڈروجن کے ۷۰، آکسیجن کے ۵، نائیٹروجن کے ۴ اور میگنیشیم کا ایک ایٹم ہوتا ہے، جس کا فارمولا بطور مخفف اس طرح لکھا جاتا ہے:

$C_{55}H_{70}O_5N_4MG$
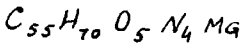
گلوکوز کے ایک سالمے میں کاربن کے ۶، ہائیڈروجن کے ۱۲ اور آکسیجن کے ۶ جواہر ہوتے ہیں۔

($C_6H_{12}O_6$)
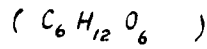
پروٹین کے ایک سالمے میں مختلف عناصر کے ہزاروں جواہر (ایٹم) پائے جاتے ہیں، اور یہ قدرتی سالموں میں سب سے زیادہ پیچیدہ سالمہ کہلاتا ہے، جس کی صحیح ساخت اور ایٹموں کی صحیح تعداد کو سائنس دان اب تک پوری طرح سمجھ نہیں پائے ہیں۔

غرض یہ سالمات و مرکبات دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ نامیاتی مرکبات:۔ وہ سالمات (MOLECULES) یا مختلف عناصر کے مرکبات ـــ دو یا دو سے زیادہ کی تعداد میں ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ کیمیاوی اتصال پانے والے ـــ جن میں عنصر کاربن (CARBON) پایا جاتا ہو، نامیاتی مرکبات (ORGANIC COMPOUNDS) کہلاتے

ہیں۔ بالفاظِ دیگر کاربن کے تمام مرکبات عموماً نامیاتی مرکبات کہلاتے ہیں۔[1]

۲۔ غیر نامیاتی مرکبات: کاربن کے علاوہ دیگر تمام عناصر کے مرکبات غیر نامیاتی مرکبات (INORGANIC COMPOUNDS) کہلاتے ہیں۔ یوں ان میں کاربن کے بھی کچھ مرکبات — استثنائی طور پر — پائے جاتے ہیں۔ (اگرچہ زیادہ تر کاربن نامیاتی مرکبات کا جزء ہوتا ہے)۔

نامیاتی مرکبات میں اکثر کاربن اور ہائیڈروجن کے عناصر ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ نیز ان کے علاوہ آکسیجن اور نائیٹروجن وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک "نامیاتی مرکبات" کا مطلب ذیلیٔ حیوانات و نباتات سے حاصل ہونے والے مرکبات سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ کاربن کی اشیا قدرتی طور پر انہی چیزوں میں پائی جاتی ہیں۔ نامیاتی مرکبات کو "کاربونک مرکبات" بھی کہا جاتا ہے۔ نامیاتی مرکبات میں تیل، چربی، نشاستہ، مختلف غذائی اشیا، لکڑی، کوئلہ، پلاسٹک، پٹرولیم، ربڑ، اسپرٹ، روئی، اون، صابن اور ہائیڈروکاربن گیسیں (GASES) وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام چیزوں میں دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ کاربن پایا جاتا ہے۔ آج کل صنعتی اور تجارتی پیمانوں پر اُن مرکبات کو مصنوعی طور پر بنایا جا رہا ہے۔ ان مرکبات کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آج ان مرکبات (نامیاتی مرکبات) کی جملہ تعداد چالیس لاکھ کے لگ بھگ ہے اور غیر نامیاتی مرکبات کی تعداد دو لاکھ کے قریب۔

نامیاتی مرکبات کو — اپنی بنیادی جوہری ساخت اور ترتیب کے اعتبار سے — کئی گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کا مطالعہ بہت دلچسپ، مفید اور بہت اہم ہے۔[2] نیز اس سے خلاقِ فطرت

---

[1] لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر وہ مرکب جس میں کاربن پایا جاتا ہو، لازمی طور پر "نامیاتی مرکب" کہلائے۔ کیونکہ بعض غیر نامیاتی مرکبات بھی ایسے پائے جاتے ہیں جن میں کاربن ہوتا ہے۔ مثلاً کاربن کے آکسائیڈ، دھاتوں کے کاربونیٹ، مایو نوجن اور اس کے متعلقہ مرکبات وغیرہ۔

[2] ان تمام کی تفصیل اس موقع پر غیر ضروری ہے اور طوالت کا باعث بھی، جس سے عام ناظرین کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ مگر اس موقعے پر صرف ایک مثال بیان کی جائے گا۔

نامیاتی مرکبات میں سب سے زیادہ سادہ مرکب میتھین (METHANE) گیس (پکوان وغیرہ کے کام میں آنے والی)

کی حکمت تخلیق کا حال بھی پوری طرح آشکارا ہو جاتا ہے۔ عناصر کا "جوہری نظام" جس قدر حیرت خیز ہے اس سے زیادہ ان کا "مرکباتی نظام" فکری و نظریاتی اعتبار سے عجیب و غریب اور عملی و افادی حیثیت سے نہایت اہم ہے۔ ان جوہری اور مرکباتی نظاموں میں کارفرما قوانین اس قدر منظم و منضبط ہیں کہ ان کے تفصیلی مطالعے کے لیے بہت سے علوم سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے مگر اس کے باوجود یہ تمام علوم ان قوانینِ ربّانیہ کی مکمل تشریح و توجیہ کے لیے ناکافی سمجھے جاتے ہیں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ (الکہف: ۱۰۹)

کہہ دو اگر سمندر روشنائی بن جائے میرے رب کی باتوں کے لکھنے جانے) کے لیے تب بھی میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے گا، اگرچہ ہم اس کی مدد کے لیے اسی جیسا ایک اور سمندر لے آئیں۔

سالمات و مرکبات کے تعامل باہمی کے اصول بڑے منضبط اور حیرت انگیز ہیں، جو بہت سے رازہائے ربوبیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان قدرتی قوانین میں سے چند قانون "گرفت" VALENCY، "مماثلت" ISOMERISM، "کھلے سلسلوں کے مرکبات" OPEN CHAIN COMPOUNDS اور "حلقہ دار سلسلوں

ہے۔ جس کا فارمولا CH_4 ہے یعنی کاربن کا ایک ایٹم اور ہائیڈروجن کے چار ایٹم، جس کی ترتیب یوں ہے:

یعنی درمیان میں کاربن کا ایٹم ہوتا ہے اور اس کے اطراف ہائیڈروجن کے ۴ ایٹم مضبوطی سے اس کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

```
     H
     |
H — C — H
     |
     H
```

تفصیل کے لیے "نامیاتی کیمیا" کی کوئی بھی کتاب (ٹیکسٹ بک) کا مطالعہ فرمائیے جو اس موضوع پر بکثرت دستیاب ہیں۔ افسوس ہے کہ اردو زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب موجود نہیں ہے، سوائے ترقی اردو بورڈ کی کتاب "علم کیمیا" کے جس میں ضمناً نامیاتی کیمیا کے صرف چند ابتدائی مباحث ملتے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس وقت میرے پیشِ نظر اس موضوع پر خصوصیت کے ساتھ حسب ذیل دو کتابیں ہیں:

1. Organic Chemistry, by Brewster and Mcewen.

یہ ایک امریکی کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن ہے جو نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے)۔

2. Modern Principles of Organic Chemistry, by Kice and Marvell.

یہ بھی ایک امریکی کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن ہے جو نئی دہلی سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی ہے۔

کے مرکبات "CLOSED CHAIN COMPOUND" وغیرہ ہیں، جن کا مطالعہ بڑا حیران کن ہے۔ ان سب کی فنی تفصیلات اس موقعے پر طوالت کا باعث ہوں گی۔ مختصر یہ کہ مختلف عناصر کے درمیان "کیمیاوی تعامل" کی قوت عناصر کے الیکٹرانوں کی تعداد کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر عنصر (ELEMENT) اپنی ایک مخصوص "تعاملی خصوصیت" رکھتا ہے، جس کے باعث وہ دوسرے عنصر سے جڑتا ہے یا اس سے مضبوطی کے ساتھ چمٹ کر کوئی سالمہ یا مرکب بناتا ہے۔ جس طرح کہ مفرد حروف تہجی باہم جڑ کر چند با معنی الفاظ و کلمات بناتے ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک ہی عنصر کے دو یا دو سے زیادہ جوہر (ایٹم) مل کر ایک سالمے کی تشکیل کرتے ہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن گیس کا سالمہ اس کے دو ایٹموں پر مشتمل ہوتا ہے، اور آکسیجن گیس کا سالمہ اس کے دو جوہروں سے مرکب ہوتا ہے۔ سہولت کی خاطر انہیں مختصر طور پر اسی طرح ظاہر کیا جاتا ہے:

ہائیڈروجن گیس کا سالمہ : H_2 (H سے مراد ہائیڈروجن اور ۲ سے مراد دو ایٹم)

آکسیجن گیس کا سالمہ : O_2 (O سے مراد آکسیجن اور ۲ سے مراد دو ایٹم)

علم کیمیا میں "ایٹمی وزن" اور "سالماتی وزن" کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ پچھلے صفحات میں عناصر کے ایٹمی اوزان کی تفصیل لکھی جا چکی ہے۔ یعنی ہر عنصر کے مرکزے میں جتنے پروٹان ہوتے ہیں، اسی نسبت سے ان کا ایٹمی وزن مقرر ہے۔ اب رہا سالماتی اوزان کا مسئلہ تو اس کی غرض یہ ہے کہ کسی سالمے میں موجود شدہ عناصر اور ان کے جوہروں کا مجموعی وزن کیا ہے؟ تو اس کو ظاہر کرنے کے لیے بھی ہائیڈروجن ایٹم ہی کو بطور معیار ـــ اس کے سب سے زیادہ ہلکے ہونے کی بنا پر ـــ مانا جاتا ہے۔ مثلاً ہم کو یہ معلوم کرنا ہے کہ پانی کا سالماتی وزن (MOLECULAR WEIGHT) کیا ہے؟ تو ہم پانی کے سالمے کو کیمیاوی تحلیل کر کے اس میں پائے جانے والے عناصر اور ان کے مجموعی وزن کو ہائیڈروجن ایٹم کے وزن کے اعتبار سے ظاہر کریں گے۔ جیسے پانی کا سالمہ = H_2O

اس کا مطلب یہ ہوا ہائیڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کا ایک ایٹم۔ لہٰذا ہائیڈروجن کے دو ایٹموں کا مجموعی وزن ہوا ۲، اور آکسیجن کے ایک ایٹم کا وزن ہوا ۱۶ (کیونکہ اس کے مرکزے میں ۱۶ پروٹان اور نیوٹران پائے جاتے ہیں)۔ اس طرح پانی کے ایک سالمے کا "سالماتی وزن" ہوا: ۱۸ (۲ + ۱۶ = ۱۸)
اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سالمہ ہائیڈروجن کے واحد ایٹم کے مقابلے میں ۱۸ گنا بھاری ہے۔ اسی

طرح نمک طعام کے ایک سالمے کا سالماتی وزن (مالیکیولی ویٹ) ۵۸ اور گلوکوز شکر کے ایک سالمے کا سالماتی وزن ۱۸۰ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے پروٹین کے بعض سالمے (پروٹین کے سالموں کی بہت سی قسمیں ہیں) دس لاکھ گنا یا اس سے بھی زیادہ بھاری ہوتے ہیں[۳]۔

۱۸۴۷ء سے پہلے سائنس دانوں کا سالمات (مالیکیولس) کی ساخت و پرداخت اور ان کی متعین شکل کے بارے میں کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ بلکہ وہ انہی عناصر کا ایک غیر مرتب اور غیر منضبط ڈھیر تصور کرتے تھے[۴] اور خود سالمات کی حقیقت سب سے پہلے ۱۸۲۷ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک ماہر نباتات رابرٹ براؤن کے ذریعے ایک تجربے کے ضمن میں منکشف ہوئی[۵]۔ یہ سالمات جن عناصر سے مرکب ہیں۔ جن کی تعداد آج ۱۰۴ بلکہ ۱۰۵ تک جا پہنچی ہے — ان کے انکشافات اور ان کی تشریح و تنقیح بھی انیسویں اور بیسویں صدی کے تجربات کے دوران عمل میں آسکی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جان ڈالٹن نے انیسویں صدی کے شروع میں نظریہ جوہر (ATOMIC THEORY) — عناصر کے جوہروں کی خصوصیات اور ان کی پہچان کے لحاظ سے — پیش کیا اور عناصر کی سب سے پہلی قابل لحاظ درجہ بندی ۱۸۲۹ء میں ایک ماہر ڈابیرنیر DOBEREINER کے ذریعے عمل میں آئی[۶]۔ مگر عناصر کی مکمل درجہ بندی کی سب سے کامیاب کوشش روسی سائنس دان منڈیلیف (MENDE LEEV) کی قرار دی گئی ہے۔ اور اس کے پیش کردہ قواعد کی بنیاد پر موجودہ تمام معلوم شدہ عناصر کو ترتیب دیا گیا ہے[۷]۔

مگر عناصر کی اس دریافت اور ان کی درجہ بندی کے باوجود ایٹم کی اندرونی ساخت اور ان کے

۳۔ THE CHEMISTRY OF LIFE, P 20

۴۔ A TEXT BOOK OF INORGANIC CHEMISTRY, BY P.B. JANARCHAN, P. 306, OXFORD & IBH PUBLISHING CO, 1978.

۵۔ ASIMOV'S GUIDE TO SCIENCE, VOL. 1, P 232

۶۔ A TEXT BOOK OF INORGANIC CHEMISTRY, P 46.

۷۔ ASIMOV'S GUIDE TO SCIENCE, VOL. 1, P. 236.

اجزا کے بارے میں بیسویں صدی کے شروع تک دنیائے سائنس کو کوئی علم نہیں تھا۔ الکٹران، پروٹان اور نیوٹران وغیرہ تمام اجزا بیسویں صدی کی دریافت ہیں۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں یونانی نظریات کے زیرِ اثر صرف چار عناصر مٹی، پانی، ہوا اور آگ[۵۸] تسلیم کیے جاتے تھے، اسے تاریک دور میں قرآنِ عظیم نے کائنات کے تمام اجزا و عناصر کو اصولی طور پر "تین قسموں" میں تقسیم کرکے ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے، جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ اس لحاظ سے یہ سارے سالمات و مرکبات قرآنی نقطۂ نظر سے محض اس کے ایک اعجازی اور حیرت انگیز لفظ" ولا اکبر" (ایٹم سے بڑا جزو) کے تحت آجاتے ہیں۔ اور تمام کیمیاوی علوم " مثقال ذرۃ فی الارض ولا فی السماء ولا اصغر من ذلك ولا اکبر" کے ہمہ گیر کلیے میں اصولی طور پر سما جاتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ تمام علوم نہ صرف بصیرت افروز ہیں بلکہ عملاً بہت اہم اور مفید بھی ہیں۔

ایٹم کو طاقت ور سے طاقت ور خوردبین کے ذریعے دیکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ابھی حال ہی میں ایک نئی انتہائی طاقت ور اور جدید ترین خوردبین ایجاد ہوئی ہے، جس کے ذریعے پہلی مرتبہ ایک تنہا ایٹم کو دیکھنا اور کیمیاوی طور پر اس کو شناخت کرنا ـــ دیگر عناصر سے ـــ ممکن ہو سکا۔ اس نئی خوردبین کو "جوہری تفتیش کی میدانی اون خوردبین" (ATOM PROBE FIELD ION MICROSCOPE) کا نام دیا گیا ہے۔ جس کے ذریعے کسی چیز کو بیس لاکھ سے لے کر پچاس لاکھ گنا تک بڑا کرکے دکھایا جاتا ہے[۵۹]۔

علم کیمیا کا یہ سارا مطالعہ بادی النظر میں بہت بڑا گورکھ دھندا معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ سب درحقیقت عملی تجربوں (EXPERIMENTS) سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے اکثر مسائل دو اور دو چار کی طرح بالکل واضح ہیں۔ سائنسی لیبورٹریوں میں ان علوم اور ان مادوں ـــ سالمات و مرکبات ـــ پر مسلسل تجربات ہو رہے ہیں، جس کے نتیجے میں نئے نئے مرکبات معرضِ وجود میں آ رہے ہیں اور اسی اعتبار سے نئی نئی صنعتیں جنم لے رہی ہیں۔ آج کل ایسی بہت سی صنعتیں وجود میں آچکی ہیں جن کا دار و مدار

---

۵۸ ایک پانچواں عنصر " ایتھر" بھی مانا جاتا تھا۔

۵۹ ملاحظہ ہو رسالہ " کاروانِ سائنس"، جلد چہارم، شمارہ سوم و چہارم صفحہ ۱۱۳۔ نیز دیکھیے:
ASIMOV'S GUIDE TO SCIENCE, VOL 1, P. 233.

نامیاتی مرکبات پر ہے۔ مثلاً مختلف قسم کی طبی ادویات[۱۰]، پلاسٹک کی مصنوعات، ڈیٹرجنٹس (DETERGENTS) صابن اور صفائی کے کام میں استعمال ہونے والے قسم ہا قسم کی مصنوعات)، پارچہ بافی، رنگ سازی اور دیگر بہت سی صنعتیں، جن میں کاربن یا کاربونک اشیا استعمال کی جاتی ہیں۔ صرف پٹرولیم اور کوئلے سے ــــ یہ دونوں بھی کاربن گروپ ہی سے تعلق رکھتے ہیں ـــــ کئی ہزار قسم کی صنعتیں چل رہی ہیں، جن کی تفصیلات کے ملاحظے سے حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً پٹرولیم کی بعض صنعتیں (INDUSTRIES) یہ ہیں: پلاسٹک، مصنوعی ربر (جن سے موٹروں کے ٹائر وغیرہ بنائے جاتے ہیں)، دھماکہ خیز مادے (جنگوں میں کام آنے والی اشیا)، مصنوعی ریشے (دھاگے وغیرہ)، خوشبویات، وارنش، مختلف قسم کے رنگ، موم، الکحل (اسپرٹ اور دیگر سیال مادے)، رقیق ایندھن، پکوان کی گیس، تارکول، چکنائی والے مادے (مثلاً گلیسرین وغیرہ)، پٹرولیم کی ان مصنوعات کو PETROCHEMICALS کہا جاتا ہے۔ مغربی ممالک عربوں سے سستا تیل حاصل کر کے محض اپنی فنی مہارت کی بنا پر یہ مصنوعات تیار کرتے ہیں اور اربوں روپے کماتے ہیں۔

اسی طرح کوئلے جیسی معمولی سی چیز سے بھی پلاسٹک، دھماکہ خیز مادے، رنگ، ایندھنی گیس، تارکول، رقیق ایندھن، دوائیں، سرکہ، بینزین، الیسی ٹیلین، فینائل، امونیا اور کیمیاوی کھادیں وغیرہ وغیرہ بے شمار صنعتیں وجود میں آ چکی ہیں، جن کو دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سب کی سب کوئلے جیسی معمولی اور حقیر چیز سے وجود میں آ سکتی ہیں۔

یہ کیمیا کی جادوگری کا ایک مختصر سا نقشہ ہے۔ ان علوم کی اسی اہمیت کی بنا پر ایک نیا علم "صنعتی خوردبینی حیاتیات" (INDUSTRIAL MICROBIOLOGY) کے نام سے جنم لے چکا ہے۔ جس کے ذریعے اس سلسلے کے رازہائے ربوبیت کا پتا چلانے میں مدد ملتی ہے۔

یہ نامیاتی کیمیا کا حال تھا۔ اب غیر نامیاتی کیمیا کا ایک مختصر سا نقشہ ذہن میں رکھیے۔ غیر نامیاتی یا غیر کاربونک مرکبات کی اہم قسمیں یہ ہیں: آکسائیڈ (OXIDE)، تیزاب (ACID)، کھار (BASE)

---

[۱۰] جدید طبی علوم (MEDICAL SCIENCES) اور علم دواسازی نے انہی "کیمیاوی اسرار" سے واقف ہو کر محیر العقول ترقی کی ہے۔ مثلاً مشہور دوا "پنسلین" محض ایک معمولی سی چیز پھپھوندی سے تیار کی جاتی ہے۔

اور نمک (SALT) یہ دو یا دو سے زیادہ عناصر کے مجموعے ہیں، جن کے تعامل سے ہزاروں قسم کے تیزابی اور غیر تیزابی محلولات بنتے ہیں، اور جدید صنعتوں میں ان کا استعمال بہت عام اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

اسی طرح دریافت شدہ ۱۰۴ ـــــ قدرتی و غیر قدرتی ـــــ کیمیاوی عناصر میں تقریباً ۸۴٪ دھاتیں ہیں، جن سے ان کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ دھاتیں اپنی مختلف طبیعی خصوصیات کی بنا پر کئی زمروں میں تقسیم کی گئی ہیں۔ لوہا، تانبا، المونیم، میگنیشیم، میگینیز، کیلشیم، پوٹاشیم، سونا، چاندی، زنک، سیسہ، ٹین، کانسی، پیتل، کرومیم، نکل، سوڈیم اور پلاٹینیم وغیرہ سب کی سب دھاتیں ہیں۔ دھاتوں سے بہت سے طبیعی اور کیمیاوی فوائد حاصل کیے جاتے ہیں اور دو یا دو سے زیادہ دھاتوں کو ملا کر کوئی بہت ہی مضبوط دھات بھی بنائی جاتی ہے۔ سائنسی لیبورٹریوں میں دن رات ان چیزوں پر تجربات ہو رہے ہیں۔ نئے نئے حقائق ظہور میں آ رہے ہیں اور ساتھ ہی نئے نئے مرکبات بھی۔

غرض کارخانۂ قدرت کے یہ مفردات اور مرکبات بے شمار فوائد کے حامل ہیں۔ ان کا تفصیلی علم حاصل کر کے آج انسان بر و بحر کی تسخیر کر رہا ہے اور خلاؤں میں تانک جھانک کر کے افلاک پر ڈورے ڈال رہا ہے۔

میں نے اس موقعہ پر کوشش کی ہے کہ علم کیمیا اور خصوصیت کے ساتھ نامیاتی مرکبات کے چند بنیادی اصولوں کو ذہن نشین کرا دوں۔ یہ تمام اصول و ضوابط ہمہ گیر قانونِ الٰہی "و کل شیءٍ عندہ بمقدار" (اور ہر چیز اس کے پاس ایک خاص مقدار کے ساتھ ہے) کے تحت آتے ہیں۔

قومی معیشت بلکہ خلافتِ ارض کے نقطۂ نظر سے عناصر اور ان کا تفصیلی علم بہت ضروری ہے۔ خوش قسمتی سے یہ علم آج ہمارے سامنے نہایت درجے مدوّن اور محقق شکل میں موجود ہے۔ آج ہم کو اس کی تحقیق و تدوین کی نہیں بلکہ صرف تحصیل کی ضرورت ہے۔ مگر اس سے زیادہ بد قسمتی اور کیا ہوگی کہ آج ہم اس انتہائی ضروری اور مفید علم سے غافل ہو کر آنکھیں موند لیں اور اپنی حرماں نصیبی میں بدستور اضافہ کرتے رہیں۔

کیمیا کی جادوگری

عناصر اور مرکبات سے متعلق ان بنیادی معلومات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد[1] اب حسب ذیل ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے، جس میں علم کیمیا اور جدید صنعتوں کے بہت سے راز پوری طرح فاش کر دیے گئے ہیں اور اسرارِ سربستہ کو بے نقاب کر دیا گیا ہے۔

"پٹرولیم اور ایندھن کی صنعت، صابن اور شیشے کی صنعت، کھادوں کی تیاری، دوسری صنعتی شاخوں اور کھیتی کے لیے کام آنے والی چیزوں کے بنانے میں تیزاب، کھار اور نمک بہت بڑی مقدار استعمال کیے جاتے ہیں۔

پٹرولیم اور کولتار کو خالص کرنا، دھاتوں کا خالص حالت میں حاصل کرنا، یہ اور اس طرح کی بہت سی اہم چیزیں بنانا سلفیورک ایسڈ اور اس کے نمکوں کے بغیر ناممکن ہے۔

نائیٹروجن کھادیں، دھماکہ خیز مادے اور بہت سی دوائیں بنانے کے لیے نائیٹرک ایسڈ اور اس کے نمکوں کا استعمال لازمی ہے۔

صابن اور شیشے کی صنعت میں، پٹرولیم سے حاصل شدہ چیزوں (پٹرول اور مٹی کا تیل وغیرہ) کو خالص کرنے میں، کپڑے کی رنگائی میں، نان فیرس دھاتوں[2] خاص طور پر المونیم کی پیداوار میں کھار اور سوڈے کا استعمال بہت ضروری ہے۔

آج کل بالکل ہی نئی خصوصیات والی چیزیں بنانے کی بھی بہت اہمیت ہو گئی ہے۔ جدید

---

[1] ان علوم کی اہمیت کے ساتھ ساتھ فن ریاضی (MATHAMITICS) کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ بغیر ریاضی میں کمال حاصل کیے ان علوم سے فائدہ اٹھانے کا تصور بھی مشکل ہے۔ مثلاً کسی چیز (لوہا، تانبا یا پیتل وغیرہ) کے ایک گرام مقدار مادہ (MASS) کو پگھلانے کے لیے جب اتنی حرارت یا توانائی کی مقدار درکار ہو گی تو اسی چیز کے ایک ہزار ٹن مقدار مادے کو پگھلانے کے لیے کس قدر توانائی درکار ہو گی اور عملاً اس پر کتنا خرچ آئے گا؟ نیز اس طرح مختلف دھاتیں کتنے درجۂ حرارت پر پگھلتی ہیں اور ان کی نوعی خصوصیات کیا ہیں؟ اس قسم کے سیکڑوں فنی سوالات پیدا ہوتے ہیں جنھیں ریاضی کی مدد سے حل کر کے ہر کام کا پہلے سے منصوبہ بنا لیا جاتا ہے۔ بغیر ریاضی اور حساب کے کسی صنعت یا کارخانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

[2] لوہا اور اس جیسی کالی دھاتوں کو "فیرس دھاتیں" کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، تانبہ، المونیم اور ٹین وغیرہ قسم کی رنگین دھاتوں کو "نان فیرس دھاتیں" کہتے ہیں۔

صنعت کو ایسے مادوں کی ضرورت ہوتی ہے جو نہ صرف سخت اور مضبوط ہوں بلکہ ساتھ ہی ساتھ ہلکے اور زنگ مزاحم بھی ہوں اور ان کو کم اور زیادہ دونوں درجہ حرارت پہ استعمال بھی کیا جاسکتا ہو۔ ان تمام خصوصیات کے علاوہ یہ چیزیں سستی اور آسانی کے ساتھ حاصل بھی ہوسکتی ہوں ۔ دھات، لکڑی اور پتھر میں ایسی انوکھی خصوصیتوں کا ہونا ممکن نہیں ہے ۔ علم کیمیا ہی نے ہمیں ایسی بہت سی چیزیں عطا کی ہیں جن میں یہ انوکھی خصوصیتیں ہوتی ہیں ۔

(پلاسٹک کی بنی ہوئی چیزوں سے ہر ایک واقف ہے) ۔گھروں میں استعمال ہونے والی چیزوں کے علاوہ موٹر کار، ریل گاڑی، ورکشاپ اور کھیتی میں پلاسٹک کی چیزوں کا کافی استعمال ہوتا ہے۔ یہ زیادہ مولیکیولی وزن والی چیزیں (پولیمر) جنھیں پلاسٹک کہتے ہیں، کارک سے زیادہ ہلکی اور فولاد سے زیادہ سخت ہوسکتی ہیں ۔ یہ "تیزاب مزاحم" اور شفاف یا غیر شفاف بھی ہوسکتی ہیں۔ آج کل قومی معیشت کا ایسا کوئی حصہ نہیں ہے جس میں پلاسٹک کا استعمال نہ ہوتا ہو۔ مشینوں کے پرزے، نل، جہاز، موٹر کار، ہوائی جہاز اور دیگر چیزوں کے بنانے میں پلاسٹک کی بڑی اہمیت ہے۔ پلاسٹک دھاتوں سے ہلکی ہوتی ہے اور اس وجہ سے دھات کی مقدار کے مقابلے میں اتنے ہی وزن کی پلاسٹک سے زیادہ چیزیں بنائی جاسکتی ہیں ۔ مثال کے طور پہ ۵ ٹن نان فیرس دھات کی جگہ صرف ایک ٹن پلاسٹک سے کام چل سکتا ہے ۔ پلاسٹک اور اس سے بنی ہوئی چیزوں کی پیداوار دھاتوں اور ان سے بنی ہوئی چیزوں کی پیداوار کے مقابلے میں سستی ہوتی ہیں ۔

آج کل کیمیائی صنعتی کارخانوں میں مختلف قسم کی ہزاروں چیزیں بنائی جارہی ہیں، جن کے استعمال سے صنعت کو کروڑوں روپے کی آمدنی ہوتی ہے ۔

خوب صورت پلاسٹک کے بنانے میں کوئلہ، پٹرولیم، قدرتی گیس، چونے کا پتھر، کھانے کا نمک اور لکڑی وغیرہ بطور خام مال استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ پودوں اور کھیتوں سے حاصل ہونے والی بے کار چیزیں (جیسے بھوسہ اور پودوں کے ڈنٹھل) بھی پلاسٹک بنانے کے کام آتے ہیں۔

قدرتی چیزوں کی جگہ ویسی ہی یا ان گنت خصوصیتوں والی مصنوعی چیزیں بنانے میں علم کیمیا نے ہماری بڑی مدد کی ہے ۔ مثلاً ربڑ پیڑوں سے حاصل کیا جاتا ہے ۔ بھارت، سری لنکا، ملیشیا اور سنگاپور ان ملکوں میں سے ہیں جہاں ربڑ کی صنعت بڑی ترقی پر ہے۔ لیکن سائنس دانوں نے مصنوعی

ربڑ ایجاد کر لیا ہے۔ آج کل دنیا میں کئی قسم کے مصنوعی ربڑ پائے جاتے ہیں۔ مصنوعی ربڑ کی پیداوار کی وجہ سے قدرتی ربڑ کی تجارت پر بڑا اثر پڑ رہا ہے۔ ربڑ سے تقریباً چالیس ہزار مختلف قسم کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔

نئے ریشے بنانے میں بھی علم کیمیا کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آج کل سیلولوز (لکڑی کے ریشے) سے بہت مضبوط اور خوبصورت کپڑا بنایا جا رہا ہے۔ ایک ٹن لکڑی سے ڈیڑھ ہزار میٹر مصنوعی ریشم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اتنا ہی قدرتی ریشم حاصل کرنے کے لیے ہم کو تقریباً پانچ لاکھ ریشم کے کیڑے پالنے ہوں گے۔

پٹرولیم، کوئلے اور قدرتی گیس سے ہم مصنوعی اُون اور "فر" (سمور) حاصل کر سکتے ہیں۔ مصنوعی ریشے قدرتی ریشوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اور ٹکاؤ والے ہوتے ہیں اور ان میں کیڑا بھی نہیں لگتا۔ صابن بنانے میں ہزاروں ٹن چربی اور تیل استعمال ہوتا ہے۔ پٹرولیم سے بنائے جانے والے "ڈیٹرجینٹ" (جو صابن سے زیادہ اثر کرنے والے ہیں) حاصل ہو جانے سے اس کام کے لیے استعمال ہونے والی چربی اور تیل کھانے کے کام آ جاتے ہیں، جس سے کسی حد تک خوراک کا مسئلہ حل ہونے میں مدد ملتی ہے۔

ابھی تک مصنوعی ربڑ صرف الکوحل سے بنایا جاتا تھا اور یہ الکوحل خود اناج یا گڑ سے حاصل ہوتا ہے، جو کہ اہم غذائی چیزیں ہیں۔ پٹرولیم کی گیس اب الکوحل کی جگہ استعمال کی جانے لگی ہے۔ اس لیے یہ غذائی چیزیں کھانے کے کام میں آ سکتی ہیں۔

کھیتی میں بھی علم کیمیا نے ہماری زبردست مدد کی ہے۔ مثلاً کیمیائی کارخانوں میں مختلف طرح کی کیمیائی کھادیں بنائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ کیمیائی صنعتوں میں جراثیم کش دوائیں، پودوں کی نشوونما کے لیے مرکب، پیڑوں کو بیماریوں سے بچانے اور ان کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کو مارنے کے لیے اور بھی بہت سی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ اناج کی پیداوار بڑھانے میں کیمیائی چیزوں کی بڑی اہمیت ہے۔

عمارتیں بنانے کے شعبے میں بھی علم کیمیا کا بڑا اہم کردار ہے۔ اس کے ذریعے عمارتیں بنانے میں کام آنے والی چیزیں جیسے چونا، سیمنٹ، اینٹ اور رنگ وغیرہ حاصل ہوتے ہیں۔ عمارتیں بنانے میں اب پلاسٹک کا استعمال بھی ہونے لگا ہے۔ مثال کے طور پر "فوم پلاسٹک" بہت ہلکی، مضبوط اور حرارت مزاحم چیز ہے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے فریم وغیرہ بنانے میں بھی کئی طرح کا پلاسٹک کام

میں آتا ہے۔

کپڑے کی صنعت، اناج کی پیداوار، شیشے کی صنعت اور کاغذ وغیرہ کی صنعت میں علم کیمیا کا ایک اہم مقام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم کیمیا قومی معیشت کے تمام شعبوں کی ترقی میں ایک بہت ہی اہم مقام رکھتا ہے[۱۱۳]

جوہری توانائی اور آئی سوٹوپ کے کرشمے

یہ طبیعیات اور کیمیا اور ان کی کارفرمائیوں کی محض ایک جھلک تھی۔ اب نکلنے کے طور پر ایٹمی توانائی اور اس سے حاصل ہونے والے محیر العقول فوائد کا بھی تھوڑا سا حال سن لیجیے تاکہ موجودہ علوم کی ترقی اور جدید تمدنی فوائد کی پوری تصویر سامنے آجائے۔

جوہری توانائی بیسویں صدی کی سب سے مشہور اور اہم دریافت ہے جس نے عصر جدید میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ اسی وجہ سے ایٹم کے مرکزے (NUCLEUS) کو اب بہت اہمیت حاصل ہوگئی ہے اور یہ ایک مستقل اور بہت ہی اہم بلکہ اہم ترین علم بن گیا ہے اور اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں[۱۱۴]۔ اس علم کو "مرکزائی طبیعیات" (نیوکلیر فزکس) کہا جاتا ہے۔ ایٹم اور اس کا مرکزہ ناقابل قیاس حد تک ننھی سی چیز ہے۔ مگر اس میں موجود شدہ پوشیدہ توانائی کو دیکھتے ہوئے اس کو "تباہ کارانہ حد تک بڑی چیز" کہا جا سکتا ہے۔ اس پوشیدہ اور دیو ہیکل طاقت کو

---

[۱۱۳] ملخص از علم کیمیا، حصہ دوم، ص ۲۰۱، ۲۰۵، مطبوعہ ترقی اردو بورڈ (بعض مقامات پر خفیف رد و بدل کے ساتھ)

[۱۱۴] مگر بد قسمتی سے اردو زبان کا دائرہ اس سلسلے میں بہت تنگ ہے اور اب تک میری نظر میں صرف یہ چند کتابیں گزری ہیں۔

۱۔ ایٹم آپ کا خادم، مطبوعہ انڈین اکیڈمی، نئی دہلی

۲۔ ایٹم کی کہانی، مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی

۳۔ طبیعیات کے بنیادی تصورات، مطبوعہ ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی

(اس میں ضمناً ایٹم اور اس کے مرکزے کا بیان بھی موجود ہے)۔

مگر انگریزی زبان سے واقفیت رکھنے والوں کے لیے پورا ذخیرہ موجود ہے۔ مسلم معاشرے میں علوم و فنون کو مروج کرنے اور انھیں ترقی دینے کے لیے ضروری ہے کہ تمام علوم و فنون کا ترجمہ قومی زبانوں میں کثرت کے ساتھ کیا جائے۔

اس کی فوجی اور عسکری اہمیت کی بنا پر ——— حاصل کرنے کے لیے آج دنیا کا ہر ملک بے چین نظر آ رہا ہے اور اس کی وجہ سے ترقی یافتہ قوموں کے درمیان رقابت اور کش مکش کا ایک طویل اور نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

ایٹم ایک انتہائی درجہ ننھا سا ذرہ ہے۔ اس قدر ننھا کہ خالی آنکھ سے نظر آنے والے کسی چیز کے چھوٹے سے ذرے میں تقریباً ایک ارب ایٹم ہوتے ہیں۔ خالص ریڈیم کے ایک گرام وزن میں تقریباً چالیس ارب ایٹم ہر سیکنڈ منتشر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نصف گرام ریڈیم کے ایٹموں کو منتشر ہونے میں ۱۶۲۰ سال کا عرصہ لگ جاتا ہے اور یہ عرصہ ریڈیم کی نصف زندگی کہلاتا ہے۔[۱۵]

شاید آپ اس ہوش ربا اعداد پر یقین نہ کریں، مگر عملی تجربات کے پیشِ نظر آپ کو یقین کیے بغیر چارۂ کار نہیں ہے۔ کوئی عقل مند آدمی کم از کم ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے وجود کا انکار تو نہیں کر سکے گا، جو انہی ناقابلِ قیاس حد تک چھوٹے چھوٹے اجزا کی کارستانی ہے اور جس سے آج پوری دنیا خائف اور لرزاں و ترساں ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ طاقت کیا ہے اور کیسے حاصل ہو جاتی ہے؟ تو بات دراصل یہ ہے ——— جیسا کہ تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکیں ——— کہ ہر ایٹم کا مرکزہ (NUCLEUS) جو مزید چند ننھے ننھے ذرات کا مجموعہ ہوتا ہے (جن کو پروٹان اور نیوٹران کہتے ہیں) وہ ایک زبردست کششِ اتصال کی بدولت باہم بڑی سختی کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان ذرات کو جب بزور الگ کیا جاتا ہے تو وہ اتنی ہی زبردست قوت و طاقت سے الگ ہوتے ہیں جتنی زبردست قوت و طاقت کے ذریعے وہ باہم جڑے ہوئے تھے، اور ان کی راہ میں جو چیز بھی حائل ہو جاتی ہے وہ اس کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں، حتیٰ کہ پہاڑ تک سرمہ بن جاتا ہے۔
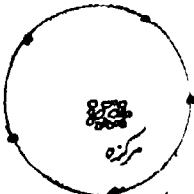
(شکل) ایٹم کا مرکزہ جس میں چند پروٹان اور نیوٹران باہم جڑے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

یہ حیرت ناک اور دیوزاد توانائی حاصل کرنے کے لیے ایٹم کے مرکزے کو بڑی زبردست قوت کے

---

[۱۵] ملاحظہ ہو ایٹم آپ کا خادم، ص ۲۳

ساتھ توڑنا پڑتا ہے، جس کو عمل فژن (FISSION) کہتے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک گلاس پانی میں اتنی ایٹمی قوت ہوتی ہے جو ایک بڑے سے بڑے اسٹیمر کو بحراٹلانٹک پار کرا سکتی ہے۔

آئین اسٹائن کے فارمولے : $E = MC^2$ کے مطابق ایک پونڈ یورنیم کے مکمل فژن کے ذریعے اتنی قوت حاصل ہوگی جتنی کہ پندرہ سو ٹن کوئلے کو جلانے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

یہ جوہری توانائی یا ایٹمی قوت تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو رکھتی ہے۔ انسان اگر چاہے تو اس کے ذریعے مفید مطلب کام لے کر کائنات ارضی کو گل و گلزار میں تبدیل کر سکتا ہے یا اس کے مضر اور خوف ناک روپ کا مظاہرہ کر کے اس کو جہنم زار بھی بنا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے مفید پہلوؤں کے مطابق آج انسان اس قوت کے ذریعے گھروں اور کارخانوں کو روشن کرنے اور بڑی بڑی مشینوں کو چلانے کے لیے بجلی پیدا کر رہا ہے (جس کو ایٹمی بجلی کہتے ہیں)۔ اس قوت کے ذریعے بحری جہازوں اور آبدوزوں کو چلا رہا ہے، اور مستقبل کے ہوائی جہازوں اور ٹرینوں کو چلانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔

اس کے علاوہ طب، کاشت کاری اور صنعت و حرفت کے مختلف میدانوں میں بھی اس پوشیدہ قوت کے ذریعے انسان حیران کن فوائد حاصل کر رہا ہے، جس کی بدولت وقت اور پیسہ دونوں کی بچت ہو رہی ہے۔ چنانچہ تابکار آئی سوٹوپ (RADIO ISOTOPE) یا ٹریسر (TRACER) کی مدد سے آج زراعت کے وسائل کو بہتر سے بہتر بنایا جا رہا ہے۔ اس کے ذریعے پودوں میں کھاد کی نقل و حرکت کا پتا لگایا جاتا ہے، پودوں کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے مختلف محرکات کا پتا لگایا جاتا ہے، پودوں کو کمزور کرنے والے اور بیماریاں پھیلانے والے حشرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے، کسی قطعۂ ارض کی پیداواری صلاحیت کا کھوج لگایا جاتا ہے، اس طرح فصلوں کو بہتر سے بہتر بنانے اور زرعی پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور ایک حیران کن بات یہ ہے کہ اس آئی سوٹوپ کے ذریعے سائنس دان پچیس ہزار سال تک کے پرانے پودوں اور حیوانات کی صحیح صحیح عمر کا پتا چلانے کے قابل ہو گئے ہیں۔

اسی طرح "آئی سوٹوپ" کی طبی نقطۂ نظر سے اتنی اہمیت ہے کہ آج یہ ہسپتالوں میں "ڈاکٹری سامان" کا ایک ضروری جز سمجھا جاتا ہے، جس کی بدولت ڈاکٹروں کو مختلف بیماریوں کا پتا چلانے میں مدد ملتی ہے اور اس کے ذریعے ڈاکٹر مریض کے جسم کے اندرونی حصوں کو اس طرح دیکھ سکتے ہیں جیسے وہ کوئی

شفاف تجرباتی ٹیوب ہو۔ اس کے ذریعے سے کینسر کا پتا چلایا جاتا ہے، دفاعی رسولیوں کی کیفیت معلوم کی جاتی ہے اور دورانِ خون کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

یہ اس تاب کاری آئی سوٹوپ کا کارنامہ ہے کہ آج اس کے ذریعے برف باری کی پیمائش کی جا رہی ہے، برف پوش کوہساروں سے آب پاشی کے لیے حاصل ہونے والے پانی کی مقدار کا صحیح اندازہ کیا جا رہا ہے، موسم کے تغیرات پر ریسرچ ہو رہی ہے، جس کی بدولت ماہرینِ موسمیات موسمی حالات کے متعلق کسی حد تک قبل از وقت پیش گوئیاں کر سکتے ہیں۔ یہ اسی آئی سوٹوپ کا کرشمہ ہے جس کی وجہ سے جراثیم کشی کی جا رہی ہے اور غذائی اجناس کو عرصۂ دراز تک محفوظ رکھنے کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ اس طرح صنعت و حرفت کے مختلف شعبوں میں آئی سوٹوپ کی اہمیت و افادیت مسلّم ہو چکی ہے جس کی تفصیل طوالت کا باعث ہوگی۔

یہ تاب کاری (RADIO ACTIVITY) بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی اور زبردست نعمت ہے (جو باطنی نعمتوں کی فہرست میں آتی ہے) اور اس نعمت سے انسان آج زندگی کے ہر شعبے میں فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کی اہمیت کا حال اب یہ ہو گیا ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ ممالک اس کے بغیر زندگی محال تصور کرتے ہیں[۲۱]۔

یہ نعمتیں کس کے لیے ہیں؟

یہ ہے "علم اسما" کا فائدہ اور علمِ تسخیر کی معجز نمائیاں جو ان دونوں چیزوں سے عاری قوموں کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ یہ علم اسما اور علمِ تسخیر کی محض ایک جھلک ہے مکمل تصویر نہیں۔ مکمل داستان سرائی کے لیے شاید عمرِ خضر بھی ناکافی ہو۔ آپ کسی اچھی لائبریری کے شعبۂ سائنس میں چلے جایئے اور مختلف سائنسی علوم کے ذخیرے پر نگاہ ڈالیے، تب آپ کو ان چیزوں کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ سائنس، صنعت اور ٹکنالوجی اور انجنیئرنگ وغیرہ کے موضوعات پر لکھی ہوئی اگر تمام کتابوں کو ـــــ مختلف زبانوں کی ـــــ اکٹھا کر دیا جائے تو یقین ہے کہ ایک بہت بڑی اور عظیم الشان

---

[۲۱] جوہری توانائی اور آئی سوٹوپ سے متعلق یہ ساری معلومات زیادہ تر کتاب "ایٹم آپ کا خادم" کی مدد سے فراہم کی گئی ہیں۔ یہ امریکہ کے دو مصنفین کی کتاب " ATOMS AT YOUR SERVICE " کا اردو ترجمہ ہے۔

لائبریری بن جائے گی ۔

غور فرمایئے کہ یہ تمام چیزیں اور یہ تمام مصنوعات کیا ہیں ؟ کیا یہ سب ظاہری و باطنی نعمتیں اور نوازشاتِ الٰہیہ نہیں ہیں ؟

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ (لقمان : ۲۰)

کیا تم اس حقیقت سے واقف نہیں ہو کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزوں کو تمھارے کام میں لگا دیا اور تم پر اپنی ظاہری و باطنی تمام نعمتیں پوری کر دیں ! اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر واقفیت، بغیر دلیل اور بغیر کسی کتاب روشن کے جھگڑنے لگ جاتے ہیں ۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ (ابراہیم : ۳۴)

اور اس نے تم کو وہ سب کچھ دے دیا جس کو (تمھاری فطرت نے) مانگا۔ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو نہ کر سکو گے ۔ یقیناً انسان بڑا ہی ناحق کوش اور ناشکرا ہے (جو ان نعمتوں سے مستفید ہونے کے باوجود کفر و معصیت کی راہ اختیار کرتا ہے)۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النحل : ۱۸)

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو کبھی نہ گن سکو گے ۔ واقعی اللہ بڑا ہی مغفرت والا اور بڑا ہی رحم دل ہے (جو انسان کی ناحق کوشی اور ناشکری کے باوجود ان نعمتوں کا سلسلہ منقطع نہیں کرتا، بلکہ اپنی نوازش ہائے کرم سے تمام انسانوں کو برابر نوازے چلے جا رہا ہے)۔

ان آیاتِ کریمہ میں جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس مادی دنیا میں ودیعت شدہ فوائد سے مستفید ہونے کی راہ میں اپنی جن صلاحیتوں اور دماغ سوزیوں کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کی بنا پر وہ اکثر مغرور ہو جاتا ہے اور اس کے دماغ میں یہ جراثیم سرایت کرنے لگ جاتے ہیں کہ یہ سب میری اپنی صلاحیتوں اور ہنرمندیوں کا نتیجہ و ثمرہ ہے اور اس میں مجھے کسی اعلیٰ و برتر ذات یا کسی فوق الطبیعی قوت کے اقرار و اعتراف کی ضرورت نہیں ۔ حالانکہ اگر وہ غور کرے تو اس کو دو اور دو چار کی طرح صاف

دکھائی دے گا کہ وہ جن مادی قوتوں اور جن مادی ضوابط سے مستفید ہو رہا ہے وہ خود خالق ارض و سما ہی کے ازل ہی سے مقرر کردہ فطری و طبیعی قوانین ہیں۔ اگر یہ کائنات بخت و اتفاق کا نتیجہ ہوتی تو پھر ناممکن تھا کہ ان مادی اشیا کے تعامل سے ہمیشہ یکساں قسم کے نتائج ظاہر ہوتے۔ یہ انتہائی درجہ نظم و ضبط اللہ تعالیٰ ہی نے اپنی اس مادی کائنات میں اس لیے رکھا ہے کہ انسان اس میں ودیعت شدہ فوائد سے منظم و منضبط طور پر ــــ بطور نوازشاتِ الٰہیہ ــــ مستفید ہو اور کفر و معصیت کی راہ ترک کر کے اس کا ممنون و مشکور ہو۔

اس نقطۂ نظر سے ان لوگوں کے غلط رویے کی بھی اصلاح مقصود ہے جو ایک خالق و مدبر ہستی کے وجود کا اعتراف کیے بغیر محض مادے ہی کو سب کچھ تصور کر کے ان علوم و فنون میں منہمک و بدمست اور خداوندِ کریم سے غافل ہو گئے ہیں۔

مگر اس موقع پر دو سوال حاشیۂ ذہن میں اُبھرتے ہیں: (۱) یہ نعمتیں کس کے لیے ہیں اور اُن کا حق دار کون ہے؟ کیا صرف غیر مسلم یا مسلمان بھی؟ (۲) ان نعمتوں کا (بلکہ علم تسخیر کا) خلافتِ ارض سے کیا تعلق ہے؟ تو پہلے سوال کا ایک جواب ــــ جیسا کہ پچھلے صفحات میں دیا جا چکا ــــ یہ ہے کہ خدائی نعمتوں کا فلسفہ اصلاً یہ ہے کہ جو اس میدان میں کام کرتا ہے وہی اس کا مستحق بنتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ان آیات میں دراصل امتِ مسلمہ کو تسخیرِ فطرت (موجوداتِ عالم سے منظم و منضبط طور پر استفادے) کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ ان آیات میں خطاب اگرچہ عام دکھائی دیتا ہے مگر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں امتِ مسلمہ کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے۔ کیونکہ نہ صرف وہی اس عالمِ کون و فساد کی اصلاح کی اصل ذمے دار اور صحیح معنی میں خلیفہ ہونے کی مستحق ہے بلکہ قرآنِ مجید کی اوّلین مخاطب بھی وہی ہے۔ لہٰذا قومِ مسلم کا فرض ہے کہ وہ تسخیرِ اشیا سے کام لے کر زمین کی پوشیدہ دولت اور اس کے پوشیدہ خزانوں سے استفادہ کر کے خداوندِ کریم کی طرف سے ان اشیا میں ودیعت شدہ باطنی نعمتوں کو منظرِ عام پر لائے۔ جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ق (البقرہ، ۲۹)

وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ بھی ہے سب تمھارے ہی لیے پیدا کیا ہے۔

کیا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے کہ قرآنی تصریحات کے مطابق "مقداروں کا علم" حاصل کر کے

زمین کو کام میں لائیں اور ان سے بھرپور فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی کو ہر حیثیت سے گل و گلزار بنائیں؟ قوم مسلم اس ضروری علم اور قانونِ فطرت سے آخر کس بنیاد پر غفلت برت سکی ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ ارشاد نہیں فرمایا اور یہ خوش خبری نہیں سنائی کہ ان نعمتوں کے مستحق دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں اہلِ ایمان ہوں گے؟

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (الاعراف : ۳۲)

کہہ دو کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی اس زینت کو جس کو اس نے اپنے بندوں کے لیے بنایا ہے اور کھانے پینے کی پاک اور ستھری چیزوں کو کس نے حرام کر دیا ہے؟ کہہ دو کہ یہ (تمام) چیزیں دنیا میں اہلِ ایمان کے لیے (بنائی گئی) ہیں اور قیامت کے دن تو خاص انہی کے لیے ہیں۔ سمجھداروں کے لیے ہم اپنی آیتوں کو اسی طرح تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

ان آیاتِ کریمہ کی رو سے امتِ مسلمہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کے قائم کردہ حدود میں رہ کر سارے جہان کی نعمتوں اور زمین کی تمام اشیا سے استفادہ کرے اور فائدہ اٹھائے۔ ان سے بڑھ کر صاف اور صریح احکام اور کیا ہو سکتے ہیں؟

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِىَ فِى الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ (ابراہیم : ۳۲ تا ۳۴)

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے پانی برسایا۔ پھر اس پانی سے تمہاری روزی کی خاطر (طرح طرح کے) میوے نکالے۔ اور کشتیوں کو تمہارے قابو میں کیا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلتی رہیں۔ (تاکہ تم جہاں چاہو بآسانی سفر کر سکو)۔ اور دریاؤں کو مسخر کیا (کہ حسبِ منشا ان پر بند باندھو اور ان کا رُخ موڑ لو) اور تمہارے لیے آفتاب و ماہتاب کو مسخر کیا (کہ ان کی توانائیوں سے تم خاطر خواہ مستفید ہو سکو) اور تمہارے لیے رات اور دن کو کام میں لگایا (تاکہ تمہارے کام کرنے اور راحت پانے کے اوقات متعین ہو سکیں) اور اس نے (اس طرح) تمہارے (تمام فطری) مطالبات پورے کر دیے۔

اور دوسرے سوال کا جواب — جیساکہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاچکا — یہ ہے کہ خلافت اور علمِ تسخیر میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ محض معاشی اور تمدنی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ دینی، فوجی اور عسکری لحاظ سے بھی، جس کے نتیجے میں سیاسی اور بین الاقوامی اغراض و مقاصد بھی پورے ہوتے ہیں۔ علمِ تسخیر یا صنعت و ٹکنالوجی فوجی و عسکری نقطۂ نظر سے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ معاشی اور تمدنی حیثیت سے۔ لہٰذا ان علوم و فنون کو معمولی اور حقیر سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان علوم و فنون سے عاری رہ کر کوئی قوم صفحۂ ارض پر ہرگز زندہ نہیں سکتی، اس کا خلیفہ ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ جیساکہ آج بین الاقوامی صورت حال سے ظاہر ہو رہا ہے۔ پھر ان نعمتوں کا صحیح حق دار بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس راہ میں خود سے محنت و مشقت کرنا بھی جانتا ہو۔ ورنہ کوئی آرام پسند قوم تو ان "نعمتوں" کی — جو سامانِ معیشت اور مظاہر تمدن کی شکل میں پھیلی ہوئی ہیں — حفاظت بھی نہیں کر سکے گی، جو بغیر کسی محنت و مشقت کے محض روپیہ کے بل بوتے پر جمع کر لی گئی ہوں۔

ایک لمحۂ فکریہ

غرض تکمیلِ خلافت اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ان علوم و فنون سے واقفیت اور ان میں کمال حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ ہمارے ایک ہاتھ میں قرآن اور حدیث ہوں تو دوسرے ہاتھ میں علوم و فنون بھی ہوں۔ اور ہم کو ان دونوں میں ایک توازن قائم کر کے زندگی، خلافت اور نشاۃِ ثانیہ کے میدان میں آگے بڑھنا چاہیے۔ ورنہ ہم موجودہ طوفانی بھنور سے قیامت تک نہیں نکل سکتے۔ یہ دنیا مادی اسباب و وسائل کی دنیا ہے، جن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کے جو قوانین و ضوابط بنا دیے ہیں وہ ضرور پورے ہو کر رہتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ہمت ہارے بغیر نئے عزم و حوصلے سے ایک راہِ عمل متعین کر کے اسلامی تاریخ کے موجودہ سب سے بڑے معرکے کو سر کرنا اور ایک نئی تاریخ بنانا ہے اور زندہ و بہادر قوموں کی صف میں اپنے آپ کو شامل کرنا ہے۔

پھر ہمارا مقصد محض خود کو طاقت ور اور خود کفیل بنانا ہی نہیں بلکہ ہمیں موجودہ بگڑے ہوئے انسانی معاشرے اور اس کے غلط علوم اور فلسفوں، اس کی مضر و ہلاکت خیز تہذیبی اقدار، اس کے غلط رجحانات، اس کی غیر صالح صنعتیں خصوصاً تباہ کن آلات و ہتھیار وغیرہ سب کی اصلاح بحیثیت "امت خیر" ہونے کے کرنی ہے۔ یہ ہمارا ایک اہم ملی اور انسانی فریضہ ہے اور ہماری اجتماعی زندگی

کا ایک اہم شعبہ بھی، جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ سارے فوائد و نتائج اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ ہم مادی میدان میں بھی دیگر قوموں سے برتر نہیں تو کم از کم ان کے برابر ضرور ہو جائیں۔ ورنہ کوئی کمزور اور مفلس قوم ان فرائض منصبی کو صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتی اور دنیا کی طاقت ور قومیں ایسی کمزور قوم کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ لہٰذا مادی حیثیت سے اپنے آپ کو طاقت ور بنانا گویا کہ درحقیقت اپنے دین و ایمان کو طاقت ور بنانا ہے۔ اس طرح ہم اپنے دین برحق اور اس کی صالح اقدار کو بھی غالب کر سکیں گے جو عند اللہ مطلوب و مقصود ہے۔

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ

مسلم ثقافت ہندوستان میں :- مولانا عبد المجید سالک

اس کتاب میں بڑی وضاحت اور خوش اسلوبی کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے برصغیر پاک و ہند کو گزشتہ ایک ہزار سال کی مدت میں کن برکات سے آشنا کیا اور اس قدیم ملک کی تہذیب و ثقافت پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا۔ مسلم ثقافت کی بنیادیں کن اصول و عقائد اور اقدار و معیارات پر قائم تھیں اور قدیم ہند کی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح میں ان اصول و اقدار نے کتنا حصہ لیا۔ مسلم حکومتوں نے علم و تعلیم، صنعت و حرفت اور فنون لطیفہ کی سرپرستی میں کس قدر دریا دلی سے کام لیا اور ان کے عہد میں تہذیب و ثقافت کو کتنا فروغ ہوا۔ ہندو دھرم کے بنیادی عقائد کو اسلام نے کس طرح متاثر کیا اور ان اثرات کی پیدا کردہ اصلاحی تحریکوں نے عوامی زندگی اور مقامی معاشرے پر کیا اثر ڈالا۔ مسلمانوں کا دور عروج ختم ہونے کے بعد تجدید و اصلاح کے لیے کیا کیا کوششیں کی گئیں۔ شاہ ولی اللہ اور سید احمد خاں کی تحریکوں کے کیا کیا نتائج نکلے؟ اقبال نے مسلمانان ہند میں دینی و سیاسی بیداری پیدا کر کے کس منزل کی طرف ان کی رہنمائی کی اور قائد اعظم نے کس طرح مسلمانوں کو متحد و منظم کیا اور تحریک پاکستان کو کامیاب بنا کر مسلم ثقافت کی تاریخ میں ایک نئے اور درخشاں باب کا آغاز کیا۔

صفحات ۱۱۷ قیمت ۲۵ روپے

ملنے کا پتا :- ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

سید غلام حسن شاہ کاظمی

چند فارسی شعرا اور معاشرے کا محاسبہ

م۔ حکیم ناصر خسرو علوی قبادیانی کا سالِ وفات ۴۸۱ھ کے لگ بھگ ہے۔ ناصر خسرو علوی کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ عالم و فاضل، حکیم و محقق، شاعر و فیلسوف، ادیب و نقاد اور مبلغ و داعی تھے۔ اپنے نظریات و معتقدات میں ممتاز اور معمولات و معاملات میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ جہاں جاتے عام طور پر کچھ پڑھے لکھے لوگ ان کے خلاف ہو جاتے، کیونکہ وہ ان لوگوں کے قدم بہ قدم چلنے کے خوگر نہ تھے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ناصر خسرو نے اپنے ماحول پر جو نقد و احتساب کیا ہے، اس کا کیا انداز ہے۔ پروردگار عالم کے حضور میں اپنے معتقدات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

بنالم بتو اے قدیم و قدیر	ز اہلِ خراسان صغیر و کبیر
چہ کردم کہ از من رمیدہ شدند	ہمہ خویش و بیگانہ خیر و خبیر
مقرم بفرمانِ پیغمبرست	نہ انباز گفتم ترا نہ نظیر
بامت رسانیم پیغامِ تو	محمد رسولت بشیر و نذیر
قرآن را بہ پیغمبرت ناورید	مگر جبریل آن مبارک سفیر
مقرم بحشر و بمرگ و حساب	کتابت ز بر دارم اندر ضمیر

ناصر کے اصل مخاطب تو اہلِ خراسان ہیں لیکن وہ نسلِ انسانی اور بالخصوص پوری امتِ مسلمہ کے سامنے اپنے معتقدات پیش کرتے ہیں اور مشرق و مغرب کے تمام اہلِ اسلام کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بحث و جدل کی گرم بازاری اور مکابرہ و مناظرہ کا مبالغہ انگیز طور طریق عام ہو چکا تھا اور فکر و ذہن کو ان مبالغہ انگیزیوں کے اثرات نے زہر آلود کر ڈالا تھا، لیکن ناصر خسرو علوی اپنے فکر و ذہن کو تبدیل کرنے کے لیے تیار نہ تھا، اس لیے اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا پڑتا تھا، اور مجادلین تھے کہ وہ اپنی کامیابی اسی میں سمجھتے تھے کہ پروپیگنڈے کی مہم کو

بہرصورت جاری رکھیں۔ ناصر خسرو حکیم و ذہنی تھا، اس لیے حکمت و فلسفے کے موتی رولتا رہتا۔ ایک مقام پر لکھتا ہے:

پروردگان دایۂ اقدس ا۔ د۔ قدم	گوہر نیند گرچہ باوصاف گوہر اند
بے بال در مشیت سفلی نشاده بال	بے پر بر آشیانۂ علوی ہمی پرند
از نور تا بظلمت و از اوج تا حضیض	از باختر بخاور و از بحر تا برند
ہستند و نیستند و نہ۔ نند و آشکار	ہم بے تو اند و با تو بیک خانہ اندرند
بے دانشان اگرچہ نہ۔ ہش کنند شان	آخر مدبران سپہر مدوّر اند

ناصر خسرو علوی اپنے عہد کے ماحول اور معاشرے کو سامنے رکھ کر اپنے مشاہدات اور تجربات کو بے کم و کاست لباس شعر سے آراستہ کرتے ہوئے ایسا نقد و تبصرہ اور تنقیح و تحقیق پیش کرتا ہے کہ آج کا معاشرہ اس دور کے معاشرے سے ہم دوش و ہم کنار نظر آتا ہے:

گوئی مرا کہ جوہر دیوان ز آتش است	دیوان این زمان ہمہ از گل مخمر ند
جز آدمی نزاد ز آدم درین جہاں	اینہا ز آدم ند چرا جملگی خرند
دعوی کنن آنکہ براہیم زادہ ایم	چو لنیک بنگری ہمہ شاگرد آزرند
در بزم گاہ الک در طوف زبانی اند	این ابلہان کہ در طلب حوض کوثرند
خویشے کہ ادد کہ دران جا برادران	از بہر لقمہ ہمہ خصم برادرند
آن سنیان کہ سرشان بغض حیدر است	حقا کہ دشمنان ابوبکرؓ و عمرؓ اند
و آنانکہ نیستند محبان اہل بیت	مومن مخوان شان کہ بکافر برابرند
گر عاقلی ز ہر دو جماعت سخن مگو	بگذار شان بہم کہ نہ سلطان نہ جنزند
ہان تا ازان گروہ نباشی کہ در جہاں	چو گاو میخورند و چو گرگاں ہمی درند
نہ کافرے بقاعدہ نہ مؤمنی بشرط	ہمسائیگانِ من نہ مسلماں نہ کافرند

یہ ایک عظیم علمی، ادبی، شعری، فلسفی اور مبصر شخصیت کا تبصرہ و محاکمہ ہے۔ یہ اس کے تجربات و مشاہدات ہیں، اور لوگوں سے عام میل جول کے نتائج ہیں۔ آپ چاہیں تو آج کے معاشرے کو اس دور کے معاشرے کے بالمقابل کھڑا کر دیں۔ لباس و پوشاک اور شکل و صورت کا اختلاف تو نظر

آئے گا لیکن امر واقعہ اور حقیقتِ حال وہی دکھائی دے گی جو اس وقت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مشرق کی شاعری فقط گل و بلبل اور فحاشی و ہوس رانی کی شاعری ہے۔ لیکن مشرق کی شاعری پر اس قسم کے اکثر الزامات محض تعصب اور سیاسی وجوہ کی بنا پر لگائے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ تبصرہ مذہبی سا نظر آتا ہے، لیکن مذہب معاشرے سے الگ بھی کہاں ہے؟ مذہب اسلام تو معاشرے کو محاسن سے آراستہ کرتا ہے اور یہی محاسن امن و امان اور نظم و ضبط کی کفالت کرتے ہیں۔ اس بنا پر جہاں بات مذہبی ہے وہیں معاشری و سیاسی بھی ہے۔ یہ معاشرے کے ان لوگوں کو سرزنش اور تنبیہ کی گئی ہے جو انسانیت کے لیے ناسور بن گئے ہیں۔ عام معاشرہ ان ہی لوگوں کو دیکھ کر بے راہ روی اختیار کرتا ہے۔

● رشید وطواط، جن کا پورا نام رشید الدین محمد بن عبدالجلیل کاتب العمری ہے، ابتداءً بلخی ہیں، پھر خوارزم میں بس گئے تھے۔ رشید کا سال وفات امیر دولت شاہ سمرقندی نے ۵۷۸ھ بتایا ہے۔ رشید وطواط فاضل، ادیب اور شاعر تھے۔ سرکار دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ بادشاہ خوارزم شاہ کی مدح میں انھوں نے قصیدہ کہا اور مدح و ثنا کی حد کردی۔ لیکن اسی قصیدے میں بادشاہ کے حضور میں عام صورتِ حالات، ماحول کی ملمع کاری اور معاشرے کی ابتری و بدحالی ایسے بلاغتِ بیان سے ادا کی کہ بادشاہ ناراضی کے بجائے خوش گوار تاثرات لینے پر مجبور ہوگیا۔ رشید وطواط کا تجزیہ ملاحظہ ہو:

فریاد ازیں جہاں کہ خردمند ازو ۔۔۔ بہرہ بجز نوریب و حرماں نمی رسد
جہّال در تنعّم و ارباب فضل را ۔۔۔ بے صد ہزار غصہ یکے نان نمی رسد
جاہل بمسند اندر و عالم بروں در ۔۔۔ جوید بحیلہ راہ بدربان نمی رسد
آزردہ شد بحرصِ درم جانِ عالماں ۔۔۔ وین خواری از گزاف بدیشاں نمی رسد
درد او حسرتا! کہ بپایان رسید عمر ۔۔۔ وین حرصِ مردہ ریگ بپایان نمی رسد
منت خدائے را کہ مرا در پناہ تو ۔۔۔ آسیب و حادثہ بدل و جان نمی رسد

ان اشعار سے پہلے بادشاہ کی مدح کے اشعار ہیں اور ان کے بعد کے اشعار بھی بادشاہ کی ثناگستری میں ہیں۔ سلطان و شاہ کے دربار شخصی دربار ہوتے تھے۔ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہنا موت سے دوچار ہونا تھا۔ رشید وطواط نے بڑی عقل مندی اور سلیقہ شعاری سے

عمدہ پیرائے میں مزاجِ سلطانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو باتیں اس کے نزدیک ضروری تھیں، کہہ ڈالی ہیں۔ ایک موقع پر اس نے ایک بادشاہ کی مدح کی، دوسرے موقع پر ایک دوسرے بادشاہ کی توصیف کر دی۔ کہیں حمایت کہیں مخالفت۔ اس کے مخالف بادشاہ نے قسم کھائی کہ رشید گرفتار ہو کر آیا تو اس کے سات ٹکڑے کر دیے جائیں گے۔ وہ گرفتار ہو کر آیا، حکم جاری ہوا، رشید وطواط کا ایک شناسا دوست سرکار دربار میں باریاب تھا۔ اس نے مجلسِ شاہ میں عرض کیا، اور تھا وہ بادشاہ کا مزاج دان! کہ حضور! وطواط بہت ضعیف اور چھوٹی سی شے ہے، اس کے سات ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے، اجازت ہو تو کسی نہ کسی طرح دو ٹکڑے کر دیے جائیں۔ بادشاہ ہنس پڑا اور حکم دیا کہ اسے رہا کر دیا جائے۔

● عبید زاکانی کا عہد بہ حدود ۷۴۷ھ ہے۔ یہ بہت بڑا فاضل اور ظریف تھا، اور شاعر و ادیب تھا۔ اس کی چند تصنیفات یادگار ہیں جن میں ایک مثنوی موش و گربہ بھی ہے۔ یہ مثنوی حکمران اور معاشرے پر طنز و تعریض کا سرمایہ ہے۔ میرے کتب خانے میں اس مثنوی کی ایک نقل محفوظ ہے۔ چند سال پیشتر عبید زاکانی پر ایک سیر حاصل مقالہ لکھا تھا، وہ بھی اشاعت کا منتظر ہے۔

عبید زاکانی کی شاعری بڑی دلچسپ اور پُر از معانی ہے۔ وہ معاشرے کی عکاسی اور نقش گری بڑی قادر الکلامی سے کرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے، اور قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید کا مصداق ہے۔ بعض نے اسے مسخرہ اور ہزل گو سمجھا ہے اور اس کے ادیبانہ و شاعرانہ اندازِ بیان کے مبصرانہ پہلو کو نظر انداز کر ڈالا ہے۔ حالانکہ یہ بے انصافی ہے۔ یہاں عبید زاکانی کی شوخی، برجستگی، ندرتِ بیان اور قدرتِ اظہار دیکھیے:

در علم و ہنر چو من مشو صاحب فن   تا نزدِ عزیزان نشوی خوار چو من
خواہی کہ شوی قبولِ اربابِ زمن   کنگ آور و کنگری کن و کنگرہ زن

یعنی میں علم و ہنر میں صاحبِ فن ہوں، تو نہ ہو، کہیں خویش و اقارب میں میری طرح ذلت و خواری سے دوچار نہ ہو جائے۔ تو چاہے کہ اکابرِ عہد تجھے پسند کریں، تو بس نغمہ گوئی، طبلہ نوازی اور سارنگی کا پیشہ اختیار کر لے۔

اس کے ماحول اور معاشرے کی ستم ظریفی، خیرہ ذوقی، بے کیفی اور علمی بے مائگی کی اس سے بہتر

کیا نقش گری اور نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ وہ خود اس معاشرے کا فرد ہے اور اس میں چل پھر رہا ہے، لیکن اس کے جذبات اور احساسات مجروح اور خون آلود ہیں۔

عبید زاکانی کی ہم عصر ایک شاعرہ اور ادیبہ جہاں خاتون تھی۔ معاش و مصارف نے تنگ کیا تو وہ اس کے ہاں گیا۔ لیکن بدقسمتی سے اس رئیس خاتون کی وزیر سلطنت سے شادی ہوگئی۔ یہاں خاتون کی نسبت اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

گر غزل ہائے "جہاں" روزے بہندوستاں فتد ۔۔۔ روح خسرو با حسن گوید کہ این ... گفتہ است

اس شعر نے اس کی معلومات کا بازار سجا دیا ہے۔ پہلے مصرعے کے آخری لفظ "فتد" کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ عبید کوئی اور لفظ بھی لا سکتا تھا۔ "جہاں" کا لفظ بھی ملحوظ رہے۔ یہاں "فتد" کے ذریعے جہاں خاتون کی تضحیک و تحقیر کو اُبھارا ہے۔ دوسرے مصرعے میں جہاں میں نے نقطے لگا دیے ہیں، اس جگہ لفظ ذرا عریاں ہے۔ جب اس نے اس کی شادی کا حال سُنا تو مایوسی سے دوچار ہوا۔ چنانچہ چار مصرعوں میں جہاں خاتون کی توہین و تحقیر کر دی ہے:

وزیرا! جہاں قحبۂ بے وفاست ۔۔۔ ترا از چنیں قحبۂ ننگ نیست
برو ... فراخی دگر را بخواہ ۔۔۔ خدائے جہاں را جہاں تنگ نیست

(یہاں بھی عریاں سا لفظ ہے۔ میں نے نقطے لگا دیے ہیں)۔

عبید زاکانی بڑا تنگ دست تھا اور قرض میں ڈوب گیا تھا۔ اس نے اپنے مقروض ہونے کے موضوع پر ایک غزل کہی ہے۔ یہ غزل کیا ہے۔ ماحول اور معاشرے کی ستم رانیوں، تغافل کیشیوں، علم دشمنیوں اور ادب ناشناسیوں پر احتجاج کا مرقع ہے:

مردم بعیش خوش دل و من مبتلائے قرض ۔۔۔ ہر کس بعیش شغلی و من در بلائے قرض
فرض خدائے و قرض خلائق بگردنم ۔۔۔ آیا ادائے فرض کنم یا ادائے قرض؟
در کوچہ قرض دارم و اندر محلہ قرض ۔۔۔ در شہر قرض دارم و اندر سرائے قرض
غرقہ کنم بقلزم و اتیل و جیحون خویش ۔۔۔ گر بشنوم دہ ہند بشہرے سرائے قرض
عرضم چو آبروئے گدایان بباد رفت ۔۔۔ از بسکہ خورستم زدر ہر گدائے قرض
گر خواجہ تربیت نہ کند عبید را ۔۔۔ مسکین چگونہ باز رہد از جفائے قرض

امیر دولت شاہ سمرقندی نے تذکرۃ الشعراء میں یہ غزل نقل کی ہے اور پھر اپنی نسبت اس سے موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" بجلال و قدر ذوالجلال وکفی باللہ شہیدا! کہ از روزگار عبید گزشتہ ایں دمندے چوں ایں مظلوم کہ مؤلف ایں تذکرہ است ۔ ہیچ کس را در نیافتہ ۔ از یک طرف بفلاکت رعیتی مبتلا است ۔ وطرفے دیگر از ہجوم قرض خواہان در بلاست ۔ عبید از یں عبد (امیر دولت شاہ سمرقندی) سبکسار تر بود ۔ چہ اگر قرض داشت محصل نداشت ۔ اگر جد از ونمی خریدند بہزل مشغول می بود ، واز سفرہ بزرگان نانے می ربود ۔ ایں دعاگو کہ از آغاز تباشیر صبح سعادت ایں خانوادہ دولت را بندہ زادہ بودہ باشند ۔ واجداد ایں مستمند دریں دولت جاں سپاری ونیکو بندگی کردہ باشند ۔ الیوم بذلت خاک شوری نانے حاصل سازد و محصلان شدید و علم داران پلید ایں لقمہ را از و در ربانیدو ایں بندہ ملک پدری وموروثی روز بروز بفروشد و از درخانہائے بدگمانان قرض کند و از نہب محصل روز چوں خفاش در سوراخی شود وشب در بدر خانہائے علمداران داد خواہی نماید ۔ یمکن اگر وقوف یا بند ارباب حکم وفرمان ایں مذلت درحق ایں خاکسار نہ پسندند "[1]

یعنی اللہ بزرگ و برتر کے جلال کی قسم اور وہ اس پر بہت بڑا گواہ ہے کہ عبید سمرقندی زاکانی کے عہد سے گزر کر اس تذکرہ (امیر دولت شاہ سمرقندی) کے حال زار کو دیکھیے کہ یہ اس سے کہیں زیادہ مظلوم ہے ، اور اپنے حال کے مطابق کسی اور کو نہیں پاتا ۔ ایک طرف مفلوک الحال رعیت کا غم لاحق ہے ، دوسری طرف قرض خواہوں کا ہجوم بلا ہے ۔ عبید بےچارا ان بلاؤں سے سبک دوش تھا ۔ اگر عبید پر قرض تھا تو مالیہ کی ادائیگی سے آزاد تھا ۔ اگر اس کی کسی چیز کا کوئی خریدار نہ تھا تو وہ ہزل گوئی کا شغل اختیار کر لیتا اور اکابر کے دسترخوان پر جا بیٹھتا تھا ۔ میں تو بچپن سے حکمران کا خاندانی نیاز مند اور خدمت گزار رہا ہوں ۔ میرے آبا و اجداد نے حکمران خاندان کی خیر خواہی اور چاکری میں عمریں گزار دی ہیں ۔ آج بڑی ذلت سے لبوں تک نان کا کوئی ٹکڑا پہنچتا ہے ۔ تحصیلدار سخت گیر اور نمبردار پلید خصلت ہیں ، اور وہ اس لقمے کو بھی چھیننے کے درپے ہیں ۔ میں اپنا پدری موروثی ملک بیچتا ہوں ، قرض خواہوں کو دیتا ہوں اور قرض خواہوں کے خوف سے دن کو چمگادڑوں کی طرح چھپ جاتا ہوں اور رات کو

---

[1] تذکرۃ الشعرا دولت شاہ سمرقندی ، ص ۱۴۷

نمبرداروں کے ہاں انصاف ڈھونڈتا ہوں۔ ممکن ہے کہ سرکاری حکم جاری ہو جاتے اور خاکسار کی یہ ذلت سرکار کو پسند نہ ہو۔

● بابا سودائی ابیورد ایران کے رہنے والے تھے۔ پہلے ان کا تخلص خاوری تھا۔ امیر دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرۃ الشعرا میں شعرا کے طبقۂ ششم میں ان کا نام رقم کیا ہے۔ بابا سودائی ابیورد کے گاؤں سگان میں رہتے تھے۔ وہیں ان کا مدفن بھی ہے۔ ابیورد کے لوگوں کو جانی قربان نام قبیلے کے لوگ سخت تکلیف دیتے اور تنگ کرتے تھے۔ حکام تک ان کا رسوخ تھا۔ ان کے خلاف کچھ کہنا کارگر نہ ہوتا تھا۔ جانی قربان لوگوں نے مالیہ کی وصولی میں سگان کی تاراجی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بابا سودائی نے بادشاہ کی مدح میں قصیدہ کہا اور اسی قصیدے میں "مردم جانی قربان" کی شکایت بھی کی۔ سلطان نے آگاہ ہو کر ان لوگوں کی جائدادیں بحق سرکار ضبط کر لیں اور انھیں مرو اور طوس میں آبادکاری کے لیے بھیج دیا۔

قصیدے کی نوک پلک ملاحظہ فرمایئے۔ بابا سودائی کی عرض گزاری، جرأت اور بے باکی کے کیا کہنے:

ملک ویران شود از جانقی "جانی قربان" وز قرلتائے بد میر محمد تو قان
چشم ظالم ز پئے بے سر و پا گرہ دون کردہ دزدی و دغا پیشۂ بے نام و نشان
در دماغ ہمہ شان فکر کلاب و خراسان در خیال ہمہ شان ذکر خروج و طغیان
نائب دست چپ از نیست بگو سعد الملک بردم اسپ گرہ از چہ زند تا بستان
ہست دانا و دلیل ہمہ مولا قاسم خوش دلیلیست "اذا کان غرابا" برخوان
پادشاہا! بکن ایں قوم مخالف را دور یا بکن کوہ کلات چو فلک را ویران

اس مدح نامے کا آخری شعر تو پوری شکایت کی روح ہے:

نیک خواہان ترا "دولت بلا سی باد" بد سگالان ترا محنت "جانی قربان"

بابا سودائی کے عہد میں عجب اتفاق ہوا کہ ان کے معاصرین میں چار منصب دار تھے (۱) قاضی ابوسعید خر (۲) خواجہ جلال استر (جانی قربان) (۳) صدر الدین سگ داروغہ اور (۴) محمد کلہ گاؤ

باباسودائی کی طبعِ رواں اس پر رواں ہوگئی اور کہا :

با در دلستان اسیائی است	چرخش ہمہ غصہ است و غم ناد
داروغہ سگ ست و قاضیش خر	عامل شتر و محصلش گاد
زینہا چہ بود نصیب رعیت	لت خوردن و زر شمردن و داد

ماحول اور معاشرے کا، لسانِ شاعر اور کیا اور کس طرح جائزہ لے؟ احساسات وجذبات اس سے بہتر طریق پر کیسے اُجاگر کیے جائیں۔ بادشاہ اور حکام تک صاف بات پہنچا دینا شاعری کے کمالات سے بھی ہے اور احساسات سے بھی۔

باباسودائی کے رگ و ریشے میں دینِ اسلام رچا بسا ہوا تھا۔ حضور علیہ السلام کے حضور میں عربی شاعری جس طرح عقیدت وارادت کا اظہار کرتی اور مسرت و ابتہاج کے نغمے الاپتی ہے، وہی تسلسل وتواتر، وہی اخلاص ومحبت، وہی عشق و فدویت اور فراست وبصیرت باباسودائی کے کلام میں ملتی ہے۔ فرمایا :

بر لوحِ سیم صبح بکلکِ زر آفتاب	بنوشتہ نامِ احمدؐ والقابِ بوتراب
یعنی دو بُود اسم و مسمّیٰ ہماں یکے	احول دو دید شان و یکے بود در حساب
برخوان حدیث "لحمک ولحمی" و سر بپیچ	بشنو رموزِ "دمک دمی" و رخ متاب
ازخیلِ انبیا نبی اللہؐ ہاشمی	وز جمعِ اولیا اسد اللہ بوتراب

باباسودائی کا سالِ وفات ۸۵۳ھ ہے۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے، کیا سماں باندھا ہے؟

مولانا ابو البیان

علامہ مرتضیٰ الزبیدی

دینی شخصیتوں میں نمایاں حیثیت ایسے حضرات کی ہے جو علم کے مختلف شعبوں پر عبور رکھتے تھے۔ ایسے اصحاب میں سے ایک علامہ مرتضیٰ الزبیدی تھے جو بیک وقت فقیہہ بھی تھے اور محدث بھی، نحوی بھی تھے اور اصولی بھی۔ نثر نگار بھی تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ احادیث اور علم الانساب میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور علم لغت کے تو امام تھے۔

ان کا پورا نام محب الدین ابو الفیض محمد بن عبد الرزاق المعروف بہ سید مرتضیٰ الحسینی الزبیدی تھا۔ ۱۱۴۵ھ میں ہندوستان کے مشہور شہر بلگرام میں پیدا ہوئے۔ اسی وجہ سے بلگرامی بھی کہلائے۔

بلگرام ہندوستان کے ضلع ہردوئی (یوپی) کا ایک بہت پرانا قصبہ ہے۔ اس شہر نے بہت سی عظیم شخصیتیں پیدا کی ہیں اور دینی شخصیتوں کے اعتبار سے تو یہ قصبہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہ چکا ہے۔ ابو الفضل نے لکھا ہے کہ یہاں کے باشندے زیادہ تر ذہین اور موسیقی کے بڑے اچھے مبصر ہیں۔

پہلے پہل یہاں ٹھٹیرے آباد تھے جنھیں قنوج کے حملہ آور راجپوتوں نے نکال باہر کیا۔ مغل دورِ حکومت میں بھی بلگرام، قنوج کی سرکار کا ایک پرگنہ تھا۔ ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے دوران ۴۰۹ھ (۱۰۱۸ء) میں قاضی محمد یوسف العثمانی المدنی الکازرونی نے اس شہر کو فتح کیا۔ غزنوی سلطنت کے زوال کے بعد مقامی ہندوؤں نے بلگرام کے مسلمان حکمران کو مار بھگایا اور قصبے پر دوبارہ قبضہ کر لیا لیکن سلطان شمس الدین التمش کے دورِ حکومت میں ابو الفرح واسطی کے ایک سربراہ راست جانشین سید محمد صغریٰ نے ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں ایک مضبوط شاہی دستے کے ساتھ بلگرام پر حملہ کیا اور راجہ سری کو شکست دی جس کے نام پر یہ قصبہ سری نگر کہلانے لگا تھا اور اس شہر پر مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ ہوا۔ ۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) میں یہاں ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی فوجوں کے درمیان ایک زبردست معرکہ ہوا جس میں ہمایوں کی فوجوں نے شکست کھائی۔ ۱۰۰۲ھ میں اکبر نے شراب اور دیگر منشیات کی فروخت کو ایک فرمان کے ذریعے ممنوع قرار دیا۔

ساداتِ بلگرام نے جو اپنے حریف عثمانی اور فرشوری شیوخ پر ہر میدان میں سبقت لے گئے تھے، تاریخ میں مصنفین، علما، شعرا اور مدبرین کی حیثیت سے ناموری حاصل کی۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات زیادہ مشہور ہیں:

۱۔ عبدالواحد بلگرامی، مصنف سبع سنابل

۲۔ عبدالجلیل بلگرامی۔ ان کا بیٹا محمد جو مشہور عالم تھا۔

۳۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ)۔ مصنف (۱) خزانہ عامرہ (بہ زبان فارسی) اس میں شعرا فارسی کے حالات ہیں۔ (۲) مآثر الکرام (فارسی) علما اور صوفیا کے تراجم ہیں۔ ان کے علاوہ قصائد غرا اور سبحۃ المرجان آپ کی تصنیفات ہیں۔

۴۔ امیر حیدر آزاد بلگرامی کے پوتے اور سوانح اکبری کے مصنف ہیں۔

۵۔ سید علی بلگرامی جنھوں نے مشہور فرانسیسی محقق ڈاکٹر لی بان کی عالمانہ کتاب کا ترجمہ "تمدن عرب" کیا ہے۔

۶۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی کے برادر اکبر۔ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جنھیں ۱۹۰۷ء میں سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کی کونسل کا ممبر نامزد کیا گیا[۱]

علامہ مرتضیٰ کے آبا و اجداد عراق کے مشہور شہر واسط کے رہنے والے تھے۔ آپ نے چونکہ کافی عرصہ زبید (یمن) میں گزارا، اس لیے الزبیدی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ زبید، تہامہ یمن کا ایک شہر ہے۔ یہ اس شاہ راہ پر واقع ہے جو یمن کے مرتفع علاقوں اور بحرِ احمر کے مابین ساحلِ سمندر سے کچھ دور ہٹ کر مکے سے عدن کو جاتی ہے۔ اس حصے میں چونکہ پانی کی بہم رسانی زیادہ بہتر ہے، لہٰذا ملک کا یہ حصہ کاشت کے لیے موزوں ہے۔

خود زبید شہر کے متصل دو وادیاں (ندیاں) بہتی ہیں۔ یعنی شمال میں وادی رما اور جنوب میں وادیِ زبید جس سے اس شہر کا نام ماخوذ ہے۔ اس کا پہلا نام الحصیب تھا۔ تہامہ کے باقی حصوں کے برعکس یہ علاقہ کھجور کے باغوں کے لیے مشہور ہے۔ یہاں تھوڑا بہت اناج، نیل اور مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ زبید کی کھالیں بھی مشہور ہیں۔ بیت الفقیہہ اور دوسرے چھوٹے چھوٹے مقامات کے ساتھ یہ شہر پارچہ بافی کا بھی اہم مرکز ہے۔ اہلِ علم و فضل کا گہوارہ اور قدیم تعلیمی مرکز ہے[۲]

---

[۱] دائرۂ معارف اسلامیہ، ج ۴، ص ۸۴۳ [۲] ایضاً، ج دہم، ص ۴۴۸

آپ مسلکاً حنفی تھے۔ بلکہ حنفی مسلک کے پرزور حامی اور وکیل تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں بلگرام میں حاصل کی اور افضل المتاخرین شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) اور علامہ محمد فاخر بن یحییٰ الٰہ آبادی المتخلص بہ زائر ۱۱۶۴ھ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

مزید علم حاصل کرنے کے لیے مختلف سفر کیے۔ تقریباً تین سو اساتذہ سے استفادہ کیا جن کے نام برنامجہ میں مذکور ہیں۔ کئی مرتبہ حج کیا، جہاں شیخ عبداللہ ابن محمد السندی (م ۱۱۹۴ھ)، شیخ عمر ابن احمد بن عقیل المکی اور عبداللہ السقاف وغیرہ علما سے ملاقات ہوئی۔ ۱۱۶۳ھ میں غالباً پہلی مرتبہ آپ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو وہاں سید عبدالرحمٰن العیدروس (م ۱۱۹۲ھ) اور شیخ عبداللہ میر غنی الطائفی (م ۱۲۰۷ھ) سے ملاقات ہوئی۔ وجیہہ الدین ابوالمراحم سید عبدالرحمٰن العیدروس سے علم حاصل کیا۔ کافی مدت آپ کے ہاں قیام کیا۔ آپ نے علامہ کو خرقہ پہنایا۔ مرویات اور مسموعات کی اجازت بھی دی۔

ایک مرتبہ شیخ نے مصر کے علما، امرا اور ادبا کی ایسی تعریف کی کہ جس سے علامہ کے دل میں مصر جانے کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ ۹ صفر ۱۱۶۷ھ کو رختِ سفر باندھ کر مصر تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر "خان الصاغۃ" میں اقامت اختیار کی۔ مصر کے علما میں سے سید علی المقدسی الحنفی پہلے عالم ہیں جن سے آپ نے فیض حاصل کیا۔ نیز اس وقت کے چیدہ چیدہ علما کے درسی حلقوں میں شرکت کی۔ مثلاً شیخ احمد الملوی (م ۱۱۸۱ھ)، احمد بن الحسن الجوہری (م ۱۱۸۲ھ) شمس الدین الحفنی (م ۱۱۷۶ھ) محمد بن عمر البلیدی (م ۱۱۷۶ھ) حسن ابن علی مشہور بہ المدابغی (م ۱۱۷۰ھ) وغیرہم، ان سے اجازت حاصل کی۔ نیز ان سب حضرات نے آپ کے تبحر علمی، حاضر دماغی اور فصاحت کا اعتراف کیا۔ عوام و خواص میں خوب شہرت حاصل کی اور رجاہ و عزت پیدا کی۔

تین مرتبہ صعید کا سفر کیا۔ وہاں کے علما کی زیارت کی۔ شیخ العرب ہمام نے آپ کا خوب اکرام کیا۔ دمیاط، رشید اور المنصورہ بھی تشریف لے گئے۔ وہاں کے علما اور مشائخ نے بھی خوب آؤ بھگت کی۔ قرب و جوار کے جتنے علما اور اہل سلوک تھے، ان کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ قبیلہ اور بحریہ کے علاقوں کا سفر کیا اور ان اسفار کے متعلق کچھ سفر نامے لکھے جو نظم و نثر میں لطائف، محاورات اور مدائح پر مشتمل ہیں۔

۱۱۸۹ھ کے اوائل میں قاہرہ کے علاقہ سویقۃ اللالہ میں سکونت اختیار کی۔ وہاں کے علما نے خوب اکرام کیا، ہدیے اور نذرانے پیش کیے۔ یہاں پر آپ نے وعظ کا سلسلہ شروع کیا اور بہت جلد اس علاقے میں آپ کا چرچا ہونے لگا۔ چاروں طرف سے عوام اور خواص آپ کی زیارت کے لیے آنے شروع ہوئے۔ چونکہ

آپ پردیسی تھے اور وضع قطع مصری علما کی نہیں تھی۔ نیز ترکی، فارسی اور کرجی زبان بھی جانتے تھے، اس لیے لوگوں نے آپ کی دل کھول کر مالی اعانت کی۔

لوگ آپ سے حدیث کا درس لینے لگے۔ آپ حدیث مسلسل بالاولیّتہ سنا کر اس کی سند حاضرین کا سماع لکھ کر تحریری اجازت دیتے تھے۔ ایک مرتبہ علمائے ازہر میں سے چند علما آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اجازت طلب کی۔ آپ نے فرمایا "بنیادی کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے" چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ آپ سے تنہائی میں صحیح بخاری پڑھیں۔ اس درس میں بہت سے علما مثلاً شیخ موسیٰ الشبخونی جو مسجد کے اور کتابوں کے انچارج تھے، بھی شریک ہوتے تھے۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ ازہر کے علما اور خصوصاً شیخ احمد السجاعی (م ۱۱۹۷ھ) شیخ مصطفیٰ الطائی (م ۱۱۹۲ھ) اور شیخ سلیمان الحریشی معروف بہ الاکراشی (م ۱۱۹۹ھ) نے بھی آپ سے استفادہ کرنا شروع کیا ہے تو آپ کی عزت اور شہرت میں اور بھی اضافہ ہوگیا اور گرد و نواح کے لوگ آپ کے ہاں جمع ہونے لگے اور معانی کی تشریح آپ سے کروانے لگے۔ پس آپ روایت سے درایت کی طرف آگئے اور مجمع میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آپ درس میں شریک ہونے والوں کو صحیح بخاری کا کچھ حصہ روایت کرکے اور سند کے رواۃ یا زبانی دہرایا کرتے تھے۔ اور اس کے بعد ابیات بھی موضوع سے متعلق سنایا کرتے تھے۔ لوگ حیران ہوتے اور کہا کرتے تھے کہ ایسی علمی باتیں تو ہم نے اس سے پہلے مصری مدرسین سے کبھی نہیں سنیں۔

اس درس کے علاوہ مسجد حنفی میں ایک اور درس کا بھی اہتمام کیا اور مقررہ دنوں کے علاوہ دوسرے دنوں میں بعد از نماز عصر "الشمائل" پڑھانے لگے جس کی وجہ سے شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ پڑھانے کا طریقہ چونکہ نرالا تھا اور مصری علما کے مروجہ طرز پر نہیں تھا، اس لیے لوگ بڑی تعداد میں شرکت کرنے اور خوب دلچسپی لیتے تھے۔ علاقے کے متموّل اور مشہور لوگ آپ کو اپنے گھروں میں درس دینے کے لیے بلاتے تھے۔ جب آپ کسی کی قیام گاہ پر درس دینے کے لیے تشریف لے جاتے تو ساتھ چند خاص طلبا، مقری اور کاتب لے جاتے۔ درس کے وقت آپ کے سامنے عنبر، عود اور لوبان کے جلانے کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ درس کے آخر میں حسب قاعدہ درود شریف پڑھتے اور تمام سامعین حتّٰی کہ معصوم بچے اور بچیوں تک کے نام دن اور تاریخ لکھتے اور نیچے اپنا دستخط ثبت کرتے۔

۱۱۹۱ھ میں عبدالرزاق آفندی روم سے مصر تشریف لائے۔ یہ اپنے علاقے کے بڑے رئیس تھے۔

جب انھوں نے آپ کی تعریف سنی تو ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ آپ سے اجازت لی اور مقاماتِ حریری کا درس آپ سے لینے لگے۔ آپ مقامات کے لغوی معنی سمجھاتے تھے۔

ایک مرتبہ محمد پاشا آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پہلی ہی ملاقات میں آپ سے بے حد متاثر ہوئے اور آپ کی کفالت کا ذمہ لیا۔ آپ کے تبحر علمی کا اب بین الاقوامی سطح پر چرچا ہونے لگا اور دور دراز ممالک میں بھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مختلف ممالک سے خطوط آنے شروع ہوئے۔ تحفے تحائف اور قیمتی سامان سے بھرے ہوئے صندوق آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ ترک، حجاز، ہند، یمن، شام، بصرہ، عراق، سوڈان، فزان اور الجزائر کے سربراہوں کی طرف سے خطوط اور وفود آنے شروع ہوئے اور ہر ملک والے نے اپنے ملک کی خاص چیز تحفۃً پیش کی۔ حاکم فزان نے ایک عجیب چیز جس کی شکل بھیڑ کی طرح اور سر بچھڑے کا تھا، آپ کی خدمت میں بھیجا، جس کو آپ نے سلطان عبدالحمید کی اولاد کو ہدیہ کر دیا۔

اہلِ مغرب میں تو آپ کی شہرت اتنی پھیلی کہ پورے مغرب میں یہ بات ہر ایک کی زبان پر تھی کہ جو حج کرنے گیا اور مرتضیٰ الزبیدی کی زیارت نہ کی تو گویا اس کا سفرِ حج ادھورا رہا۔ چنانچہ ایامِ حج میں آپ کی قیام گاہ کے سامنے لوگوں کا ایک بڑا ہجوم رہتا تھا اور ہر ایک کے پاس ایک خط ہوتا۔ جس آدمی کو خط کا جواب تحریری شکل میں ملتا تو وہ اس کا تعویذ بنا کر اپنے پاس محفوظ رکھتا اور اسے اپنے سفرِ حج کی نشانی سمجھتا۔ نیز یہ بھی اعتقاد رکھتا تھا کہ میرا خاتمہ حسنِ ایمان کے ساتھ ہوگا اور جسے جواب نہ ملتا تو وہ تادمِ زیست حسرت اور افسوس کرتا تھا اور لوگ اسے ملامت کرتے تھے۔

۱۱۹۴ھ میں آپ کی رفیقۂ حیات فوت ہوگئی۔ آپ نے اس کی جدائی میں اشعار بھی لکھے۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

مضت فمضت عنی بہا کل لذۃ	تقربہا عینای فانقطعا معاً
لقد شربت کاساً سنشرب کلنا	کما شربت لم یجد عن ذاک مدفعاً
فمن مبلغ عنی بمکۃ انّنی	بکیت فلم اترک لعینی مدمعاً

وہ چلی گئی تو اس کے ساتھ ہی ساری لذتیں ختم ہوگئیں۔

اس نے موت کا پیالہ پی لیا اور ہم سب عنقریب اسے پییں گے جیسا کہ اس نے پی لیا اور اس سے کوئی مخلص نہیں۔

پھر میرے ساتھیوں میں سے کسی نے یہ پیغام پہنچانے تک میں اتنا رویا کہ آنکھوں میں ایک قطرہ آنسو نہ رہا۔

غالباً اس صدمے کا آپ پر اتنا اثر ہوا کہ آپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے معتکف ہو گئے اور تحفے تحائف کا سلسلہ بھی بند کر دیا۔

شعبان ۱۲۰۵ھ میں بعد از نماز جمعہ آپ پر طاعون کا ایسا شدید حملہ ہوا جس کی وجہ سے اتوار کے دن آپ اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

آپ کا جسم کمزور۔ سنہری رنگ، گھنی داڑھی اور بار یک تھی۔ ہمیشہ عمدہ کپڑے پہنتے تھے اور ہشاش بشاش رہتے تھے۔

آپ کی تصانیف ایک سو سے زیادہ ہیں۔ لیکن بقول بروکلمن صرف تیس کتابیں دست یاب ہیں۔ ان میں سے بعض مخطوطے ہیں اور بعض مطبوعہ۔

۱۔ اتحاف السادۃ المتقین بشرح اسرار احیاء علوم الدین۔ مطبوعہ۔ مطبع ایمنیہ قاہرہ نے ۱۳۱۱ھ میں دس ضخیم جلدوں میں شائع کی ہے اور فاس (مراکش) میں (۳۰۲-۱۳۰۴) تک تیرہ جلدوں میں طبع کی ہے۔

۲۔ تاج العروس فی شرح القاموس۔ فن لغت میں ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ دس ضخیم جلدوں میں ہے۔ ۱۳۰۶ھ میں پہلی مرتبہ بولاق (مصر) میں چھپی ہے۔ چودہ سال اور دو مہینے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

یوسف الیان سرکیس نے معجم المطبوعات العربیہ جلد دوم ص ۷۲۶ پر لکھا ہے کہ پہلی پانچ جلدیں مطبع الوہبیہ نے ۱۲۸۶-۷ میں شائع کیں۔ پھر مکمل طور پر دس جلدوں میں مطبع الخیریہ نے ۱۳۰۶-۷ھ میں شائع کی۔

مندرجہ ذیل علماء نے نظم و نثر میں اس پر تقاریظ لکھی ہیں۔

(۱) شیخ عبد الرحمٰن العیدروس ۱۱۹۲ھ (۲) شیخ حسن الجبرتی ۱۲۰۲ھ (۳) شیخ عطیہ الاجہوری ۱۱۹۰ھ (۴) شیخ عیسٰی البراوی ۱۱۸۲ھ (۵) شیخ محمد بن ابراہیم العوفی ۱۱۹۱ھ (۶) شیخ حسن الہواری ۱۲۱۰ھ (۷) شیخ علی بن الصالح الشافعی ۱۱۸۵ھ (۸) شیخ محمد الجربتاوی ۱۲۰۷ھ (۹) شیخ علی صعیدی ۱۱۸۹ھ (۱۰) شیخ احمد الدردیر ۱۲۰۱ھ (۱۱) شیخ علی العقناوی ۱۱۹۵ھ (۱۲) شیخ محمد البغدادی مشہور بہ السویدی وغیرہم۔

۳۔ عقود الجواہر المنیفہ فی ادلۃ مذہب الامام ابی حنیفہ۔ مطبوعہ مصر ۱۲۹۲ھ مذہب امام ابو حنیفہ

کے مسائل کی حدیثوں سے تائید کی گئی ہے۔ احناف کے نزدیک یہ ایک لاجواب کتاب ہے اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ایمانیات اور دوسرے حصے عبادات ہیں۔ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں ایک نسخہ موجود ہے۔

۴۔ تنبیہ المعارف البصیر علی اسرار حزب الکبیر۔ یہ ابوالحسن الشاذلی کے حزب البر کی شرح ہے، مصر میں شائع ہوئی۔

۵۔ نشوۃ الارتیاح فی بیان حقیقۃ المیسر والقداح۔ مطبوعہ ۱۳۰۲ھ لیدن۔

۶۔ بلغۃ الاریب فی مصطلح آثار الحبیب۔ مطبوعہ مصر ۱۳۲۶ھ

۷۔ کشف اللثام عن آداب الایمان والاسلام۔

۸۔ الفیۃ السند مخطوطہ

۹۔ مختصر العین مخطوطہ لغت کے بارے میں ہے۔

۱۰۔ التکملۃ والصلۃ۔ مخطوطہ دو ضخیم جلدوں میں ہے۔

۱۱۔ ایضاح المدارک بالافصاح عن العواتک۔ مخطوطہ

۱۲۔ عقد الجمال فی بیان شعب الایمان

۱۳۔ تحفۃ القاعیل۔ مخطوطہ۔ شیخ العرب اسماعیل کی مدح میں لکھا ہے۔ قاہرہ میں موجود ہے۔

۱۴۔ تحقیق الوسائل لمعرفۃ المکاتبات والرسائل۔ مخطوطہ

۱۵۔ جذوۃ الاقتباس فی نسب بنی عباس۔ مخطوطہ

۱۶۔ حکمت الاشراق الی کتاب الآفاق۔ مخطوطہ۔ قاہرہ میں موجود ہے۔

۱۷۔ الروض المعطار فی نسب السادات آل جعفر الطیار۔ مخطوطہ قاہرہ میں موجود ہے۔

۱۸۔ مزیل نقاب الخفا عن کنی سادتنا بنی الوفا۔ مخطوطہ۔ قاہرہ میں موجود ہے۔

۱۹۔ سفینۃ النجات المحتویہ علی بضاعۃ مزجاۃ من الفوائد المنتقاۃ مخطوطہ۔

۲۰۔ غایۃ الابتہاج لمقتفی اسانید مسلم بن الحجاج۔ مخطوطہ۔

۲۱۔ عقد اللآلی المتناثرۃ فی حفظ الاحادیث المتواترۃ۔ مخطوطہ

۲۲۔ العقد المکل بالجواہر الثمین۔

۲۳۔ شرح الصدر فی شرح اسماء اہل بدر
۲۴۔ زہر الاکمام المنشق عن جیوب الالہام بشرح صیغۃ سیدی عبد السلام
۲۵۔ رشفۃ المدام المختوم البکری۔
۲۶۔ قول المبثوت فی تحقیق لفظ التابوت
۲۷۔ معجم شیوخہ۔ مخطوطہ
۲۸۔ دفع الشکوی وترویح القلوب فی ذکر ملوک بنی ایوب
۲۹۔ معدیۃ الاخوان فی شجرۃ الدخان
۳۰۔ لقط اللآلی من جوہر الغالی۔ یہ استاد الحفنی کی اسانید ہیں، جس کی اجازت ۱۱۶۷ھ میں ملی جب کہ اسی سال آپ مصر آئے تھے۔
۳۱۔ المربی الکابلی فیمن روی عن الشمس البابلی۔ قاہرہ میں یہ نسخہ موجود ہے۔
۳۲۔ المقاعد المندیہ فی المشاہد النقشبندیہ۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل پانچ کتابیں آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہیں۔
(۱) برنامجہ (۲) اسانید الطرق الثلاثہ (۳) الامالی الحنفیہ ایک جلد میں (۴) الامالی الشیخونیہ۔ دو جلدوں میں (۵) تخریج احادیث خیر الانام۔

مآخذ

۱۔ تاریخ کامل لابن اثیر الجزری۔ حاشیہ عبدالرحمٰن الجبوتی جلد پنجم ص ۱۰۰
۲۔ الاعلام۔ خیر الدین الزرکلی جلد ہفتم ص ۲۹۷
۳۔ بروکلمن ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۹۸ : ۲ : ۶ : ۳۷۱ : ۲
۴۔ فہرست الخزانۃ التیموریہ ۳ : ۱۱۸
۵۔ معجم المطبوعات العربیۃ المعربہ۔ یوسف الیان سرکیس جلد دہم ص ۱۷۲۶
۶۔ تاج العروس جلد دہم آخری صفحہ
۷۔ تذکرہ علمائے ہند۔ رحمان علی
۸۔ المعجم العربی۔ ڈاکٹر حسین نصار

("الحق" اکوڑہ خٹک)

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَیِّبٍ، وَلَا یَقْبَلُ اللّٰهُ اِلَّا الطَّیِّبَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتَقَبَّلُهَا بِیَمِیْنِهٖ ثُمَّ یُرَبِّیْهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا یُرَبِّیْ اَحَدُكُمْ فَلُوَّهٗ حَتّٰى تَكُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ۔

(صحیح بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب الصدقۃ من کسب الطیب)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ کرے، لیکن شرط یہ ہے کہ اپنی پاکیزہ کمائی سے کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ وہ صدقہ قبول ہی نہیں کرتا جس میں پاکیزگی نہ پائی جاتی ہو۔ تو اللہ اس صدقے کو حسنِ قبولیت بخشتا ہے، پھر اس کو صدقہ کرنے والے کے لیے بڑھاتا جاتا ہے۔ جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص گھوڑے کے بچے کی پرورش کرکے اسے پالتا رہتا ہے۔ یہاں تک وہ صدقہ پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔

اسلام نے حسنِ نیت، عملِ صالح اور کسبِ حلال پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور بار بار تاکید فرمائی ہے کہ جو عمل کیا جائے، اس میں ان امور کو بہر حال ملحوظ رکھا جائے۔ یہ وہ اقدار ہیں، جن کو کسی حالت اور کسی وقت میں بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ کے نزدیک انسان کا وہی عمل درجۂ قبولیت کو پہنچتا ہے، جس میں نیت صحیح ہو اور حلال و حرام کے ان پیمانوں کو جو شریعت نے مقرر کر دیے ہیں، سامنے رکھا جائے۔

صدقات و خیرات کو لیجیے، اس کا قرآن و حدیث میں متعدد مقامات پر حکم دیا گیا ہے اور مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ مستحق لوگوں کی مدد کریں، غریبوں اور مسکینوں کو اپنے مال و دولت سے جتنا کچھ آسانی سے دے سکتے ہوں، دیں۔ وہ یہ خیال رکھیں کہ ان کے پڑوس میں کوئی بھوکا تو نہیں، کوئی حاجت مند تو نہیں، کوئی مفلس اور غریب تو نہیں۔ اگر انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص یا فلاں خاندان، غربت و افلاس میں مبتلا ہے اور

رات کو بھوکا سویا ہے تو شرعی اعتبار سے ان پر فرض ہو جاتا ہے کہ اس افلاس زدہ اور بھوک سے نڈھال شخص یا خاندان کی امداد کو پہنچیں اور اپنی استطاعت کے مطابق اپنے مال سے ان کو مناسب حصہ ادا کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی شریعت نے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ مستحقین کو جو کچھ دیا جائے، حلال اور پاکیزہ مال سے دیا جائے۔ اس کمائی سے دیا جائے جو طیب ہو، جائز ہو اور بہتر ذرائع سے حاصل کی گئی ہو، جس میں حرام کی کوئی آمیزش نہ ہو۔

اس حدیث میں جو اوپر درج کی گئی ہے، اسی بات کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ حدیث کے الفاظ بالکل واضح ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر کوئی شخص کھجور کے برابر بھی کسی کو بطور صدقہ اور خیرات کے کچھ دے تو اللہ تعالیٰ اس کے صدقے کو نہایت خوشی کے ساتھ قبول فرماتا ہے، اور انتہائی مسرت کے ساتھ اس کے اجر و ثواب میں اضافہ کرتا ہے، اور اسے یہاں تک بڑھاتا چلا جاتا ہے کہ وہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال آنحضرتؐ نے اپنے مخاطبین کو سمجھانے کے لیے گھوڑے کے بچے سے دی کہ جس طرح مالک انتہائی شوق اور خوشی سے اس کی پرورش کرتا اور دل کھول کر اسے کھلاتا پلاتا ہے، پھر وہ بڑا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اس چھوٹے سے صدقے کو جو حلال اور جائز کمائی سے کیا جائے اور خالصتہً اللہ کی رضامندی کے حصول کے لیے کیا جائے، اس کو اجر و ثواب کے لحاظ سے بڑھاتا رہتا ہے، اور پھر وہ ایک پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔

لیکن اس کے لیے یہ شرط ضروری ہے کہ صدقہ حلال، طیب اور پاکیزہ کمائی سے کیا جائے۔ اگر صدقہ حلال اور پاکیزہ آمدنی سے نہیں کیا جائے گا تو اللہ اسے قبول نہیں فرمائے گا، گویا کہ قبولیت کے لیے اس کے نزدیک اصل معیار اور بنیادی پیمانہ یہی ہے — چوری، ڈاکے، سمگلنگ اور دیگر غلط ذرائع سے حاصل کیے گئے مال سے اللہ تعالیٰ صدقات قبول نہیں کرتا۔

نقد و نظر

البہائیۃ ــــ نقد و تحلیل

مصنف :- علامہ احسان الٰہی ظہیر

ناشر :- ادارہ ترجمان السنۃ، ۵۔۲۷م شادمان، لاہور

کاغذ اعلیٰ ۔ [illegible] صفحات ۳۰۰ ۔ قیمت درج نہیں

علامہ احسان الٰہی ظہیر نامور خطیب اور مصنف ہیں۔ ان کی عربی اور اردو کی متعدد کتابیں اہل علم کے مطالعہ میں آ چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "البہائیۃ" ان کی تازہ تصنیف ہے جو عربی زبان میں ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے فرقہ بہائیہ کے تمام پہلوؤں پر بحث کی ہے اور اس کے ہر گوشے کو نقد و تبصرہ کی زد میں لایا ہے ـــ یہ فرقہ کس طرح عالم وجود میں آیا، اس کا بانی کون تھا اور اس نے اس فرقے کی کیسے اور کب بنیاد رکھی۔ اس کی زندگی کے تمام حالات اور افکار و عقائد کی پوری تفصیل اس کتاب میں بیان کر دی گئی ہے۔ پھر اس کے معاصرین و رفقا اور ان کے ساتھ اس کے تعلقات و مراسم کی نوعیت کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ بہائیت کی تعلیم، اس کے مذہبی رجحانات اور اس کی شریعت وغیرہ تمام امور کو فاضل مصنف نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرقہ بہائیہ کے زعماء اکابر اور ان کے باہمی اختلافات کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اسلام، نبوت اور تعلیمات اسلامی کی ان لوگوں نے جہاں جہاں مخالفت کی اور جس انداز سے اس کو ہدف تنقید ٹھہرایا، جس شکل میں اپنے باطل و غلط افکار کی ترویج کے لیے کوششیں کیں، حوالوں میں جہاں جہاں ٹھوکر کھائی یا بدنیتی سے کام لیا، اس کی تمام تر تفصیل کتاب میں مذکور ہے۔

کتاب کا ہر مقالہ پُر تحقیق ہے اور ہر مقالہ بہت سی معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب کی تصنیف میں بڑی محنت کی ہے اور عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی متعدد کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ عربی سے تعلق رکھنے والے حضرات کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس موضوع پر عربی زبان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔

علمی رسائل کے مضامین

البلاغ، بمبئی — جولائی ۱۹۸۰

مطالعات و تعلیقات	قاضی اطہر مبارک پوری
تمباکو نوشی اور اس کے مضر اثرات	محمد عبدالعزیز الشبان۔ (ترجمہ)
شیخ محمد بن عیسیٰ تاج جون پوری	مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

البلاغ، کراچی — ستمبر ۱۹۸۰

مولانا احتشام الحق تھانوی	حافظ محمد اکبر شاہ بخاری
مولانا محمد اسرائیل	مولانا روح اللہ

ترجمان القرآن، لاہور — اگست ۱۹۸۰

اسلامی انقلاب کی نفیر	جناب محمد نصر اللہ خاں خازن
مغربی تہذیب کا بحران	جناب ریاض الحسن نوری

جامعہ، دہلی — اگست ۱۹۸۰

ترقی پذیر ممالک کی دفاعی سرگرمیاں — ایک اقتصادی جائزہ	سید اطہر رضا بلگرامی
تلسی داس	جناب مجیب رضوی
ایرانی ادبیات کی خدمت میں پارسانِ ہند کا حصہ	فرہاد آبادانی۔ ترجمہ: ڈاکٹر شعیب اعظمی
منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی	ویریندر پرشاد سکسینہ

الحق، اکوڑہ خٹک — جولائی ۱۹۸۰

اسلام دشمن تحریکیں — فری میسن، صیہونیت، اشتراکیت	ڈاکٹر [illegible] (ترجمہ)
ہمارا جسم خدا کی شہادت دے رہا ہے	ڈاکٹر [illegible]
مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ردِّ تثلیث	مولانا محمد [illegible] قاسمی

سب رس، کراچی — جولائی ۱۹۸۰

کتب خانہ حکیم محمد سعید کی چند نادر مطبوعات	فضل اللہ فاروقی ندوی
انسانی طرزِ عمل کے محرکات	غیاث الدین احمد
افشائے بے بدل	جلیل قدوائی
سراج اورنگ آبادی	شفقت رضوی

العلم، کراچی — اپریل تا جون ۱۹۸۰

سخنورانِ کاکوری — ایک خصوصی تبصرہ	نواب سید شمس الحسن
مغل حکمرانوں کی بحریہ	مرزا اسد ہمایوں
کراچی کے چند دینی مدارس	پروفیسر محمود حسین
مولانا سید جمیل احمد سوانی	سید محمود احمد
ذوقی کی غزلوں کے چند گوشے	جناب رازی الفاروقی
سندھی علم وادب کی ترقی میں سندھ مدرسۃ الاسلام کا حصہ	جناب ممتاز حسن بخاری — ترجمہ/ جناب رحمت فرخ آبادی
وفا راشدی اور ان کی چند تصانیف	جناب رشید الزمان خلش
جی۔ اے مدنی مرحوم	سید عبدالرحمٰن (علیگ)
مشرقی افریقہ میں اردو	سید آفاق حسین آفاق دہلوی
حیرت شملوی	پروفیسر جلیل احمد قدوائی

فاران، کراچی — جون، جولائی ۱۹۸۰

ماہر القادری کے سفر جنوبی افریقہ کا ایک دلچسپ واقعہ	جناب فاروق متبر ڈابن (جنوبی افریقہ)
اقبال۔ بعض تنقیدی تسامحات	جناب اسلوب انصاری
بہادر یار جنگ	جناب محمد احمد خاں
خرقِ عادت یا غرقِ عادت	مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواری

نومبر ۱۹۸۰

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون نمبر :- ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۳ | نومبر ۱۹۸۰ ذوالحجہ ۱۴۰۰ | شمارہ ۱۱

ترتیب

تاثرات

مولانا مفتی محمود ۱۴ر اکتوبر ۱۹۸۰ کو دل کی حرکت بند ہو جانے سے کراچی میں انتقال کر گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۶۱ برس تھی۔

مولانا مفتی محمود پاکستان کے نامور عالمِ دین، صفِ اوّل کے سیاسی رہنما اور مشہور مذہبی قائد تھے۔ وہ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے حجاز مقدس جاتے ہوئے کچھ دنوں سے کراچی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ۱۴ اکتوبر کو مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم کی مسجد میں چند علمائے کرام سے بعض مذہبی مسائل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ دوپہر ساڑھے بارہ بجے کے قریب اچانک دل کا شدید دورہ پڑا۔ ان کو فوری طور پر طبی امداد کے لیے جناح ہسپتال پہنچایا گیا، لیکن ہسپتال پہنچنے سے قبل ہی ان کی روح جسدِ خاکی سے پرواز کر گئی۔ دوسرے دن ۱۵ اکتوبر کو ان کی میت ان کے آبائی گاؤں عبدالخیل (ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں) پہنچائی گئی، جہاں انھیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مفتی صاحب مرحوم نے اپنی زندگی کا آغاز ملتان کے مدرسہ قاسم العلوم کی تدریس سے کیا۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علومِ دینیہ پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ ۱۹۶۲ء میں وہ ملکی سیاسیات کے میدان میں اُترے، جب کہ ڈیرہ اسماعیل خاں سے انھیں قومی اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد ان کی شہرت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔

مرحوم، مرضِ ذیابیطس کے پرانے مریض تھے، لیکن نہایت باہمت، جفاکش، محنتی اور مستعد تھے۔ بیماری کی پروا کیے بغیر علمی اور سیاسی سرگرمیاں جاری رکھتے تھے۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، بود و باش اور رہن سہن میں تکلفات سے دور رہتے تھے۔ بڑے زیرک اور با اصول رہنما تھے۔ گزشتہ چند سالوں میں ملکی سیاسیات اور قومی معاملات میں ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے مختلف الخیال ہونے کے باوجود ان کی قیادت و رہنمائی کو قبول کیا۔ وہ جو بات کہتے تھے، تمام حلقے اس کو مانتے تھے۔ ان کی موت سے پاکستان ایک سلجھے ہوئے عالمِ دین، با اثر سیاست دان اور مخلص قومی رہنما سے محروم ہو گیا ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کے حسنات میں اضافہ فرمائے اور انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

برصغیر میں سہروردی سلسلۂ تصوف کا آغاز و ارتقا

تصوف کے چار مشہور سلسلے (۱) سہروردی (۲) چشتی (۳) قادری (۴) نقشبندی ہیں۔ ان چاروں سلاسل کے صوفیائے کرام نے برصغیر پاک و ہند میں تبلیغ اسلام اور اصلاح معاشرہ کی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں ــــ یہاں ہم سہروردی سلسلے کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالتے ہیں۔

سہروردی سلسلے کے بانی شیخ شہاب الدین سہروردی ہیں جو عراقِ عجم کے قصبہ سہرورد میں پیدا ہوئے اور بغداد میں اپنے چچا عبد القاہر کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ نامور علما و فضلا سے علومِ مروجہ حاصل کیے۔ حدیث، فقہ، کلام اور علوم ادبیہ میں مہارتِ کاملہ رکھتے تھے۔ تصوف اور زہد و اتقا میں اپنی نظیر آپ تھے۔ خلفائے بغداد اور بہت سے امرا و سلاطین شیخ سہروردی کا نہایت احترام کرتے تھے[۱] سنت کے حد درجہ متبع تھے اور شافعی مسلک رکھتے تھے۔ فقہ میں اجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ انھوں نے غرہ محرم ۶۳۲ھ/ ۱۲۳۴ء میں بغداد میں انتقال کیا۔ شیخ سہروردی کثیر تصانیف کے مصنف تھے۔ بروکلمان نے اپنی مشہور عربی ادب کی تاریخ میں شیخ کی اکیس کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری نے ان میں سے دس کا مفصل تعارف کرایا ہے[۲]۔ سب سے اہم کتاب عوارف المعارف ہے جو تصوف کی نہایت مقبول اور خاص کتاب سمجھی جاتی ہے۔ صوفیا کے حلقوں میں اس کا باقاعدہ درس ہوتا تھا[۳]۔ پاکستان اور ہندوستان کے ممتاز علما اور مصنفین نے عوارف المعارف پر شروح و حواشی لکھے ہیں اور مختلف

---

[۱] الامام العارف شیخ شہاب الدین سہروردی از حکیم شمس اللہ قادری، ص ۱۲-۱۲ [۲] ایضاً، ص ۲۱-۲۳

[۳] حضرت بابا فرید الدین گنج شکر سے شیخ نظام الدین اولیا بدایونی نے عوارف کے پانچ باب پڑھے تھے۔ ملاحظہ ہو فوائد الفواد۔ امیر حسن سجزی (اردو ترجمہ) اللہ والے کی قومی دکان، لاہور ۱۹۵۷ء، ص ۶۱

زبانوں فارسی، ترکی اور اردو میں اس کے ترجمے ہوئے ہیں [۵۴]

شیخ شہاب الدین سہروردی اجلّ صوفیائے کرام میں ہیں۔ لوگ مختلف دیار و امصار سے بغداد میں آکر شیخ سے فیض حاصل کرتے تھے۔ ان کے نامور خلفا میں قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ نور الدین مبارک غزنوی اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کے ذریعے پاک و ہند میں سہروردی سلسلے کی اشاعت ہوئی۔

شیخ حمید الدین ناگوری (ف ۶۴۱ھ / ۱۲۴۳ء) التتمش کے عہد کے نامور شیخ تھے۔ انھوں نے سیر و سیاحت خوب کی تھی۔ خواجہ بختیار کاکی سے گہرے تعلقات تھے۔ تصوف پر کئی کتابیں لکھیں، جن میں لوائح شموس سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کتاب میں باری تعالیٰ کے ننانوے ناموں کی صوفیانہ انداز میں شرح کی ہے [۵۵] شیخ ناگوری سماع کے بہت دلدادہ تھے۔ شمالی ہند کے قدیم شہر بدایوں میں شیخ ناگوری کے خلفا میں شیخ شاہی رسن تاب اور شیخ احمد نہروالی مشہور ہیں۔

شیخ شاہی بڑے صاحبِ مرتبہ بزرگ تھے۔ رسیاں بٹ کر حلال روزی کماتے تھے۔ ان کے دو بھائی خواجہ بدر الدین موئے تاب اور خواجہ عثمان بھی صاحبِ نسبت بزرگ تھے اور اپنے بھائی شیخ شاہی کے مرید و خلیفہ تھے۔ خواجہ بدر الدین بالوں کی رسیاں بٹا کرتے تھے [۵۶] یہی نفوسِ قدسیہ تھے جن کے ذریعے کٹھیر میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ شیخ نظام الدین اولیا بدایونی ان کے متعلق فرماتے ہیں۔

در بداؤں دو برادر بودند یکے شیخ شاہی روشن ضمیر دوئم ابوبکر موئے تاب، ابوبکر موئے تاب را دیدہ ام و شیخ شاہی را ندیدہ ام [۵۷]

---

[۵۴] اردو زبان میں سب سے پہلے عوارف المعارف کا ترجمہ مولوی ابوالحسن فرید آبادی نے کیا تھا جو ۱۸۹۲ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا ـــــ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے بھی عوارف کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ عوارف کے خلاصہ مفتاح الہدایہ و مفتاح الکافیہ کا انگریزی ترجمہ کرنل ایچ۔ ڈبلو کلارک نے ۱۸۹۱ء میں لندن سے شائع کیا۔

[۵۵] قاضی حمید الدین ناگوری کے حالات کے لیے دیکھیے تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۶۹۔۱۷۰ ـــ اخبار الاخیار، ص ۳۷، ۴۴

[۵۶] شیخ شاہی رسن تاب و خواجہ بدر الدین موئے تاب کے حالات کے لیے دیکھیے اخبار الاخیار، ص ۴۹۔ تذکرۃ الواصلین ص ۴۲-۴۳

[۵۷] فوائد الفواد بحوالہ تذکرۃ الواصلین، ص ۴۴۔

بداؤں میں دو بھائی تھے ایک شیخ شاہی روشن ضمیر اور دوسرے ابو بکر موئے تاب، ابو بکر موئے تاب کو میں نے دیکھا ہے، شیخ شاہی کو نہیں دیکھا۔

شیخ احمد نہروالی بھی بڑے پایہ کے صوفی تھے۔ خود شیخ حمید الدین ناگوری ان سے ملنے بدایوں آئے، حضرت شیخ ناگوری اپنے مرید احمد نہروالی کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

اگر مشغولی احمد سنجند، مایۂ دہ صوفی باشد[۸]

اگر احمد کے ریاضت و مجاہدہ کو وزن کریں تو دس صوفیوں کے برابر ہوگا۔

جس مسجد میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کا وصال ہوا تھا، اس میں شیخ احمد موجود تھے۔ پارچہ بافی ذریعۂ معاش تھا[۹] ۶۸۱ھ / ۱۲۸۲ء میں بدایوں میں وصال ہوا۔

شیخ نور الدین مبارک غزنوی، التتمش کے عہد میں دہلی کے شیخ الاسلام رہے اور "میر دہلی" کے لقب سے معروف تھے۔ اکثر وعظ کہتے تھے اور رسوم دربار پر بھی تنقید کرتے تھے۔ ۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ء میں وصال ہوا۔[۱۰]

اس سلسلے میں شیخ جلال الدین تبریزی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ وہ شیخ ابو سعید تبریزی کے مرید ہیں مگر ایک مدت تک حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی صحبت میں رہ کر فیوض و برکات حاصل کیے تھے۔ شمس الدین التتمش کے عہد میں دہلی آئے۔ جب شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ سے اختلاف ہوا تو دہلی سے بدایوں ہوتے ہوئے بنگال روانہ ہوگئے۔ بدایوں کے قیام میں حضرت تبریزی کی نورانی صورت دیکھ کر ایک دہی بیچنے والا بہت متاثر ہوا۔ وہ بدایوں کے قریب کے ایک گاؤں کا باشندہ تھا اور اس گاؤں کے اکثر لوگ ڈاکہ زنی کیا کرتے تھے۔ وہ شخص حضرت تبریزی کے دست مبارک پر مسلمان

---

۸ فوائد الفواد، ص ۱۴۱۔ اخبار الاخیار، ص ۴۷

۹ اخبار الاخیار میں منقول ہے کہ شیخ احمد نہروالی نے اپنے پیر قاضی حمید الدین ناگوری سے ہندی زبان میں گفتگو کی تھی، افسوس کہ حضرت کے وہ اقوال محفوظ نہ رہ سکے، ورنہ اردو زبان کے خزانے کے قیمتی جواہر ریزے ہوتے۔ شیخ احمد نہروالی کی اس گفتگو اور ذریعۂ معاش سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اصل و نسل کے اعتبار سے برصغیر پاک و ہند کے باشندے تھے۔

۱۰ ملاحظہ ہو اخبار الاخیار، ص ۳۸۔۳۹۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۱۰۹۔۱۱۰

ہوگیا اور علی نام مقرر ہوا۔ وہ بدایوں کے بڑے صاحب باطن بزرگ ہیں[۱۱]

جب حضرت جلال الدین تبریزی بنگال پہنچے تو وہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ برپا کر دیا۔ خانقاہ اور مسجد تعمیر کی اور لنگر جاری کر دیا۔ بہت سے مسلمان حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور خاص طور سے وہ ہندو اور بودھ جو نہایت پستی کی حالت میں زندگی گزار رہے تھے، حضرت تبریزی کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے[۱۲] ۶۴۲ھ/ ۱۲۴۳ء میں بنگال میں انتقال ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ دیوتلہ (دیوگل) میں رشد و ہدایت کے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس شاخ میں خواجہ بدرالدین فردوسی (ف ۷۱۶ھ/ ۱۳۱۶ء) ایسے شخص ہیں جو پاکستان و ہندوستان میں آئے۔ اس سلسلے کے درخشندہ ستارے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (ف ۷۸۲ھ/ ۱۳۸۰ء) ہیں جو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں[۱۳]

سہروردی سلسلے کے ان شیوخ کا جنھوں نے مشرقی علاقوں میں اپنا اثر ڈالا، مختصر حال لکھنے کے بعد اب ہم سہروردی سلسلے کے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا مختصر ذکر کرتے ہیں کہ جو برصغیر میں اس سلسلے کے بانی مبانی ہیں۔

بہاء الدین زکریا ملتانی

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ۵۶۶ھ/ ۱۱۷۲ء میں قصبہ کوٹ کروڑ میں پیدا ہوئے، بارہ سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ خراسان اور بخارا میں علوم متداولہ کی تحصیل کی، پھر حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ بغداد پہنچ کر شیخ شہاب الدین سہروردی کے حلقۂ ارادت میں منسلک ہوگئے، بہت قلیل عرصے میں اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے اور مرشد کے حکم کے مطابق ملتان کو رشد و ہدایت کا مرکز بنایا۔ حضرت زکریا ملتانی کی بدولت سہروردی سلسلے کی

---

[۱۱] خیال یہ ہے کہ یہ بزرگ "نگری جماعت" کے رکن تھے، ممکن ہے کہ ان ہی بزرگ کی تبلیغ و تحریک سے بدایوں کے دیہات کے "نگری" مسلمان ہوتے ہوں۔ خواجہ علی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۱۰۸۔ اخبار الاخیار ص ۴۴ و تذکرۃ الواصلین ج ۲۔

[۱۲] ملاحظہ ہو عجائب الاسفار ابن بطوطہ (اردو ترجمہ از مولوی محمد حسین ۱۹۱۳ء) ص ۲۵۸ - ۲۶۱

[۱۳] سلسلۂ سہروردیہ فردوسیہ کے مفصل حالات معین الدین دردائی نے "تاریخ سلسلہ فردوسیہ" کے نام سے لکھے۔ یہ کتاب بہار شریف پٹنہ سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی ہے۔

نشر و اشاعت اور تبلیغ ہوئی۔ ہزارہا اشخاص حلقۂ ارادت میں منسلک ہوئے اور بہت سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مغربی پاکستان کے اکثر قبیلے حضرت زکریا ملتانی کی تعلیم و تلقین سے مسلمان ہو گئے[۱۴]۔ کمبوہ برادری حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئی۔ شاہ حمزہ مارہروی (ف ۱۱۹۸) لکھتے ہیں :

ایں فریق کنبویاں از قدیم در ملتان وآں حدود توطن داشتہ اند و از آنجا منشعب شدہ در مکانہائے مختلف قرار گرفتہ اند و وطن پیدا کردہ اند چنانچہ در شہر میرٹھ و شاہجہان آباد و سنبھل و بریلی و کول و مارہرہ و دھول پور و گوالیار وغیرہ آباد ہستند گروہے در ابتدا از آں فریق بردست مخدوم بہاء الدین زکریا سہروردی و پسر ایشاں صدر الدین قدس سرہما بشرف اسلام مشرف شدند و تا حال در ملتان کنبوہے ہندو نیز ہستند[۱۵]۔

کمبوہوں کی یہ جماعت قدیم سے ملتان اور اس اطراف میں رہتی تھی، وہاں سے گروہ گروہ ہو کر مختلف مقامات پر چلی گئی اور سکونت اختیار کر لی ہے چنانچہ یہ لوگ شہر میرٹھ، دہلی، سنبھل، بریلی، علی گڑھ، مارہرہ، دھول پور اور گوالیار وغیرہ میں آباد ہیں۔ ابتدا میں اس برادری کی ایک جماعت مخدوم بہاء الدین زکریا سہروردی اور ان کے صاحبزادے صدر الدین کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئی اور ملتان میں اب تک ہندو کمبوہ بھی ہیں۔

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے تربیت یافتہ درویشوں کی جماعتیں ملتان و سندھ اور اس کے گرد و نواح میں مسلسل دورے کرتیں اور اس سے بہت مفید نتائج نکلتے۔

سلطان شمس الدین التتمش اور بہاء الدین زکریا ملتانی کے آپس میں بہت اچھے تعلقات تھے۔ اوچ و ملتان میں اگرچہ اس وقت ناصر الدین قباچہ کی حکومت تھی مگر شیخ زکریا ملتانی سلطان التتمش سے ہمدردی رکھتے تھے اور انھوں نے کھل کر التتمش کا ساتھ دیا۔ قباچہ کے استیصال کے بعد یہ تعلقات اور بھی استوار ہو گئے۔ التتمش نے شیخ زکریا ملتانی کو شیخ الاسلام کے منصب پر فائز کیا[۱۶]۔

---

۱۴ دعوت اسلام، ص ۳۰۰

۱۵ کاشف الاستار از شاہ حمزہ مارہروی (قلمی) ورق ۲۴۲ ب (مملوکہ محمد ایوب قادری)

۱۶ ملتان کے سہروردی مشائخ کے سلاطین سے تعلقات اور ان کی سیاسی سرگرمیوں پر پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ایک مفصل تحقیقی مقالہ لکھا ہے جو میڈیول انڈیا کوارٹرلی علی گڑھ جلد سوم شمارہ نمبر اول و دوم میں شائع ہوا ہے۔

۶۶۵ھ/ ۱۲۶۶ء میں اس عظیم المرتبت صوفی شیخ کا ملتان میں انتقال ہوا[۱۷]

صدر الدین عارف

ان کے نامور فرزند اور سجادہ نشین صدر الدین عارف تھے جو ۶۲۱ھ/ ۱۲۲۴ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد بزرگوار شیخ زکریا ملتانی کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی۔ قرآن کریم سے بڑا شغف رکھتے تھے اسی لیے عارف مشہور ہوئے۔[۱۸] اپنے والد کے وصال کے بعد رشد و ہدایت کی مسند پر متمکن ہوئے[۱۹] ترکے میں سات لاکھ درہم نقد ملے تھے مگر سخاوت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ ایک ہی دن میں ساری دولت فقرا اور مساکین میں تقسیم کر دی[۲۰] مگر اس جود و سخا کے باوجود ان کے یہاں دولت کی فراوانی تھی۔ ایک مرتبہ شیخ رکن الدین فردوسی (ف ۷۲۴ھ/ ۱۳۲۴ء) ملتان پہنچے اور حضرت صدر الدین عارف کے مہمان ہوئے تو ایسا پر تکلف دستر خوان بچھا جیسا کہ بادشاہوں کے یہاں ہوا کرتا تھا۔ حضرت شیخ عارف کے آگے طرح طرح کے کھانے اور حلوے تھے[۲۱]

شیخ عارف مسندِ رشد و ہدایت کے صدر نشین ہونے کے ساتھ ساتھ مسندِ درس کو بھی زینت بخشتے تھے۔ ہر مبتدی و منتہی کو درس دیتے تھے یہاں تک کہ علمِ صرف کے طلبا کو بھی محروم نہ فرماتے تھے۔ تصریفِ جدولی شیخ عارف کی تصنیف ہے[۲۲] شیخ اکرام لکھتے ہیں[۲۳] کہ ہندوستان کے مشائخ میں سب سے پہلے آپ تھے جنھیں شیخ ابن العربی کے نظریات اور تصنیفات کے متعلق شیخ فخر الدین عراقی (ف ۶۸۸ھ/ ۱۲۸۹ء) کے ذریعے معلومات حاصل ہوئیں۔ شیخ عراقی، شیخ عارف

---

۱۷ بہاء الدین زکریا کے مفصل حالات مولوی نور احمد خاں فریدی نے بڑے دلچسپ انداز میں "تذکرہ بہاء الدین زکریا ملتانی" کے نام سے لکھے ہیں جو ۱۹۵۸ء میں جگووالہ (ضلع ملتان) میں شائع ہوئے تھے اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن علما اکیڈیمی لاہور نے شائع کیا ہے۔

۱۸ سیر العارفین، ص ۲۸

۱۹ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ غالباً شمالی ہند میں موروثی سجادہ نشینی کی یہ پہلی رسم ہے، بعد میں اس پر اوچ کے بخاری پیروں نے بھی عمل کیا۔ (آب کوثر، ص ۲۰۱)

۲۰ سیر العارفین، ص ۱۲۱، بزم صوفیہ، ص ۱۰۷، ۱۰۸

۲۱ تذکرہ صدر الدین عارف جلد اول، ص ۴۹

۲۲ ایضاً، ص ۴۹

۲۳ آب کوثر، ص ۳۰۲ — سیر العارفین، ص ۱۳۹، ۱۴۰

کے بہنوئی اور حضرت زکریا ملتانی کے خاص مرید تھے۔[24] حضرت عارف کے زمانے میں سہروردیہ بہائیہ سلسلے کی وسعت سندھ اور ملتان سے شمالی ہند تک پہنچ گئی، بدایوں میں شیخ حسام الدین معروف بہ جمال ملتانی (ف ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء) مشہور صاحب نسبت بزرگ تھے جو شیخ عارف کے خلیفہ تھے۔[25] بدایوں میں حضرت عارف کے ایک دوسرے مرید و خلیفہ شیخ احمد معشوق (ف ۷۲۳ھ/۱۳۲۲ء) بھی کچھ دنوں رہے۔[26] ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء میں صدرالدین عارف کا انتقال ہوا۔ ان کے ملفوظات کنوز الفوائد کے نام سے ان کے مرید ضیاءالدین نے جمع کیے تھے۔ شیخ عارف کے خلفا میں اوچ کی دو ممتاز شخصیتیں سید احمد کبیر اور شیخ جمال خنداں رو ہیں۔

شیخ رکن الدین ابوالفتح

شیخ رکن الدین ابوالفتح ۶۴۹ھ/۱۲۵۱ء میں پیدا ہوئے، وہ اپنے جد امجد کے براہ راست مرید اور اپنے والد شیخ صدرالدین عارف کے خلیفہ تھے، انھیں اپنے زمانے میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ سلطان علاءالدین خلجی ان کا بڑا معتقد تھا۔ حضرت اس کی زندگی میں دو مرتبہ دہلی گئے۔ سلطان نے بڑی عقیدت سے استقبال کیا اور رخصت کے وقت کئی لاکھ تنکے نذر کیے مگر انھوں نے سب مستحقین و فقرا میں تقسیم کر دیے۔ قطب الدین مبارک شاہ، حضرت شیخ نظام الدین اولیا سے خصومت رکھتا تھا، اس لیے اس نے حضرت رکن الدین ملتانی کو دہلی بلایا اور چاہا کہ شیخ دہلی میں قیام کریں۔[27] جب حضرت شیخ ملتانی دہلی پہنچے تو حضرت شیخ المشائخ نے ان کا استقبال کیا اور یہ شیخین السعیدین آپس میں بڑے خلوص و محبت سے ملے، بادشاہ نے حضرت ملتانی سے ملاقات کے دوران پوچھا کہ سب سے پہلے آپ کا کس نے استقبال کیا تو فرمایا کہ:

---

[24] شیخ عراقی کے حالات کے لیے دیکھیے بزم صوفیہ، ص ۱۵۳ - ۱۷۰

[25] حاجی جمال ملتانی کے حالات کے لیے دیکھیے اخبار الاخیار، ص ۷۸ - سیر العارفین، ص ۱۲۸، ۱۲۹ - تذکرۃ الواصلین ص ۳۷ - ۴۰

[26] شیخ احمد معشوق کے لیے دیکھیے فوائد الفواد، ص ۲۰۹ - سیر العارفین، ص ۱۲۹، ۱۳۰ و تجلیات اولیائے سہروردیہ از مولانا ضیاء القادری بدایونی، ص ۲۷ (مشمولہ آستانۂ زکریا ملتان، جنوری ۱۹۵۸ء)

[27] حضرت شیخ رکن الدین سے سلاطین دہلی سے تعلقات کے سلسلے میں دیکھیے بزم صوفیہ، ص ۲۶۳ - ۲۷۳

کسے کہ بہترین اہلِ شہر است ![۲۸]

شہر کے لوگوں میں جو سب سے بہتر ہے۔

جب ملتان میں کشلو خاں نے بغاوت کی اور محمد تغلق نے اس کو شکست دے کر اہلِ ملتان کے خون کی ندیاں بہانے کا حکم دیا اور اس پر عمل بھی شروع ہو گیا تو حضرت رکن الدین ابوالفتح ننگے پاؤں بادشاہ کے پاس سفارش کے لیے گئے اور اہلِ شہر کو معافی دلائی۔ عصامی لکھتے ہیں:

یکے آتشِ کینہ را بر فروخت | وزاں آتش اقصائے ملتان بسوخت
چو بشنید در شہر طوفانِ خون | برہنہ سر و پائے آمد بروں
کشادہ زبان شفاعت گری | ہمی گفت شاہا! جہاں پروری
بر اہلِ گناہ نزد اہلِ صفا | پسندیدہ تر ہست عفو از جزا
چوں بشنید آں شاہ آفاق گیر | شد از شیخ مشفق شفاعت پذیر[۲۹]

۷۳۵ھ/۱۳۳۵ء میں حضرت کا انتقال ہوا۔ ملتان میں حضرت رکن الدین کا عالی شان مقبرہ ہے جو دنیا کی مشہور عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ خلفا میں شیخ وجیہ الدین سنامی (ف ۷۳۸ھ/۱۳۳۸ء) حمید الدین حاکم اور حضرت جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت وغیرہ مشہور ہیں۔

ملتان کے بعد اوچ سہروردی مشائخ کا خاص مرکز رہا ہے۔ بخاری سادات کے ذریعے اس سلسلے کو بہت وسعت ہوئی اور سندھ و گجرات و دکن تک سہروردی سلسلہ پھیلا۔ ہم بخاری مشائخ سہروردیہ سے پہلے اوچ کے ایک نامور سہروردی بزرگ شیخ جمال خنداں رو کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔

شیخ جمال خنداں رو

شیخ جمال نامور محدث، متورع عالم اور صاحبِ نسبت درویش اور صدر الدین عارف کے خلیفہ تھے۔ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی نے بچپن ہی میں ان کی جبین منور سے ان کے علم و فضل اور

---

۲۸ سیر الاولیا، ص ۱۳۶

۲۹ فتوح السلاطین، ص ۴۴۳

صلاح و تقویٰ کا اندازہ لگا لیا تھا[۵۳۰] اور حضرت عارف کو وصیت فرمائی تھی کہ جب جمال اوچی تمھارے پاس پہنچیں تو خاص طریقے سے تعلیم و تربیت فرمانا اور نصف تبرکات و آثار ان کے سپرد کر دینا چنانچہ اسی طرح عمل میں آیا۔[۵۳۱]

شیخ جمال محدث اپنے مرشد کے حضور سے باطنی نعمتوں سے مالا مال ہو کر اوچ واپس آئے، وہاں ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور مدرسے میں خود حدیث کا درس دیتے تھے۔ حضرت مخدوم جہانیاں نے شیخ جمال محدث سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ شیخ جمال محدث کی خانقاہ اوچ کی مشہور خانقاہ تھی۔[۵۳۲] وہ بڑے حلیم، بردبار، صاحبِ اخلاق درویش اور عالم تھے۔ ایک مرتبہ قلندروں نے ان کے ساتھ زیادتی کی مگر انھوں نے حلم و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔[۵۳۳] ظاہر میں مخلوق کے ساتھ بڑی محبت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور باطن میں خالق سے انس و رغبت رکھتے تھے۔[۵۳۴] آخر زمانے میں ان کے مدرسے اور خانقاہ کے لیے بادشاہِ وقت کی طرف سے معافی و وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا۔ شیخ جمال محدث کی شہرت حدودِ ہند سے باہر دنیائے اسلام میں بھی تھی اور وہاں کے اکابر علما و مشائخ ان سے متعارف تھے۔[۵۳۵]

شیخ جمال محدث اتباعِ سنت کا بڑا خیال رکھتے تھے، اسی لیے موٹا کپڑا زیبِ تن فرماتے تھے۔ بازار سے ایک تنکے کی چادر منگواتے اور اس میں تینوں کپڑے پگڑی کرتا اور ازار بنا لیتے تھے۔[۵۳۶] شیخ جمال کا صحیح سالِ وفات معلوم نہ ہو سکا۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کا انتقال آٹھویں صدی ہجری کے ربع اوّل کے اختتام پر ہوا ہے۔ صحیح سالِ وفات کا تعین دشوار ہے۔ شیخ جمال کا مزار اوچ موضع میں ہے۔[۵۳۷] اسی وجہ سے اس حصے کو اوچ جمالی بھی کہتے ہیں۔

---

۵۳۰ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ شیخ جمال حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے مرید تھے۔ اردو ایڈیشن، ص

۵۳۱ سیر العارفین، ص ۱۲۹ — خزینۃ الاصفیا جلد دوم، ص ۲۶-۲۷

۵۳۲ الدر المنظوم، ص ۳۴ ۵۳۳ ایضاً، ص ۴۰۲، ۴۰۴، ۴۲۲، ۴۲۹

۵۳۴ ایضاً، ص ۴۰۳، ۴۰۴ ۵۳۵ ایضاً ۵۳۶ ایضاً، ص ۱۵۱، ۲۰۶

۵۳۷ خزینۃ الاصفیا جلد دوم، ص ۲۷

شیخ جمال خنداں رو کے بعد ان کے جانشین ان کے عالم و فاضل فرزند شیخ رضی الدین گنج علم ہوئے۔ ان کو ظاہری علم و فضل کے ساتھ نعمتِ باطنی سے بھی بہرہ وافر ملا تھا۔ حضرت گنج علم نے اپنے والد کے بعد مدرسے اور خانقاہ کا خوب انتظام کیا۔ ذکر کرام میں تحریر ہے کہ شیخ رضی الدین گنج علم ۶۶۷ھ/ ۱۲۶۸ء میں پیدا ہوئے اور ۷۰۰ھ/ ۱۳۹۸ء میں انتقال ہوا[۳۸]

حضرت جلال سرخ بخاری

حضرت جلال سرخ بخاری، اپنے دور کے نامور شیخ طریقت ہیں۔ یہ وہ شخص ہیں جن کو بخارا سے ہندوستان آنے پر سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ پہلے ملتان پہنچے اور پھر کچھ عرصہ بعد بھکر کا رُخ کیا، وہاں کے ایک رئیس بدر الدین بن صدر الدین خطیب کی بیٹی سے عقد کیا حضرت جلال سرخ بھکر سے ملتان منتقل ہو گئے۔ اس انتقالِ سکونت کی وجہ یہ تھی کہ بعض اہلِ قرابت اور برادری کے لوگوں سے نزاع ہو گیا تھا[۳۹]

حضرت بخاری تیس سال کامل اپنے مرشد شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کے پاس مقیم رہے اور ان کے فیوض و برکات سے مستفیض و مستفید ہوئے۔ حضرت جلال بخاری ظاہری علوم میں ماہر، ولیِ کامل اور مشہور سیاح معرفت تھے اور شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کے یارانِ باصفا اور مریدانِ باوفا سے تھے۔ خرقہ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت فرماتے ہیں کہ "دادا دعاگو (مخدوم جہانیاں) کے حضرت جلال الدین خلیفہ شیخ کبیر (بہاء الدین زکریا ملتانی) کے تھے۔" تاریخ فرشتہ میں ہے کہ ایک مرتبہ جلال سرخ بخاری اپنے مرشد شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کی خانقاہ ملتان میں مقیم تھے۔ ان دنوں گرمی کا موسم تھا، سخت لو چل رہی تھی۔ اس وقت ان کو بخارا کی برف یاد آئی۔ حضرت شیخ الاسلام نے صفائے باطن سے معلوم کر لیا۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ تھوڑی دیر میں ابر آیا، اولے پڑے اور حضرت جلال سرخ اپنی مراد کو پہنچے[۴۰]

۳۸ھ تاریخ اوچ، ص ۴۹ و تذکرہ صدر الدین عارف، ص ۵۵

۳۹ھ سیر العارفین، ص ۱۵۵ — اخبار الاخیار، ص ۶۱ — خزینۃ الاصفیا جلد دوم، ص ۳۵

۴۰ھ تاریخ فرشتہ جلد دوم، ص ۷۷۵

حضرت جلال سُرخ اپنے مرشد شیخ الاسلام بہاءالدین زکریا ملتانی کے انتقال کے بعد کچھ دنوں اور ملتان میں رہے اور پھر اپنے مرشد زادہ شیخ صدرالدین عارف کی اجازت و حکم سے اوچ میں قیام کے بعد اصلاح و تبلیغ کا کام پوری مستعدی سے شروع کر دیا۔ علاقہ اوچ کی اقوام چدھر، ڈھر، سیال اور وارم وغیرہ نے حضرت کی ہدایت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔[۴۱] مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں :

ہزارہا مخلوقِ خدا بہدایتِ ہادیٔ حقیقی براہ راست آورد و شہر جھنگ سیالاں کہ در پنجاب مشہور و معروف است بنا فرمود[۴۲]

ہزارہا مخلوقِ خدا کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے راہِ راست پر لائے اور شہر جھنگ سیالاں کی جو پنجاب میں مشہور و معروف ہے، بنیاد ڈالی۔

اس علاقے کا ایک راجا گھلو بھی حضرت جلال سرخ کے دست حق پرست پر مسلمان ہوا جس کی اولاد ٹھٹہ گھلواں، اوبارہ، جھنڈ میانی، بیٹو واہی، چوٹالہ، خانواہ، ملک پور، صبراہ، کرم علی والا اور سعد اللہ پور ضلع ملتان کے مواضعات میں پھیلی ہوئی ہے۔[۴۳]

تقریباً پچانوے سال کی عمر میں ۱۹ جمادی الاولیٰ ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء کو حضرت جلال سرخ بخاری کا وصال ہوا اور سنِ وصال لفظ "مخدوم" سے برآمد ہوتا ہے۔

احمد کبیر سہروردی

احمد کبیر سہروردی، حضرت جلال سرخ کے فرزند، شیخ صدرالدین عارف کے مرید، بڑے عارف، ذاکر اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔[۴۴] ہر وقت خشیتِ الٰہی کا غلبہ رہتا تھا۔ حضرت مخدوم فرماتے ہیں کہ وہ کسی وقت خوف کی وجہ سے بستر پر نہیں سوتے تھے۔ سردی اور گرمی میں صرف ایک کپڑا اوڑھ لیا کرتے تھے۔[۴۵] روزانہ دو قرآن کریم ختم کیا کرتے تھے۔[۴۶] ایک دن میں اور دوسرا رات میں ۔

---

۴۱ تاریخ اوچ، ص ۹۸، بہاول پور گزیٹیر، ص ۱۶۰، ۱۶۱

۴۲ خزینۃ الاصفیا جلد دوم، ص ۳۶

۴۳ تذکرہ صدرالدین عارف، ص ۱۷۱

۴۴ الدر المنظوم، ص ۴۰۲

۴۵ ایضاً

۴۶ ایضاً، ص ۲۳۸

قرآن کریم سے بڑا شغف رکھتے تھے، جس وقت وہ کوئی آیت تلاوت فرماتے تو معلوم ہوتا کہ گویا سینۂ مبارک سے نعرے نکال رہے ہیں[۴۷]

حضرت شیخ جمال خنداں رو حضرت احمد کبیر کی حفاظت اور رعایت فرماتے تھے۔ ان پر غلبہ اور کشف کا یہ عالم ہوتا تھا کہ فرض اور نفل نماز میں بھی نعرہ مارتے اور زار زار روتے تھے[۴۸] ان کی خانقاہ میں دور و نزدیک کے اکثر مسافر، مشائخ اور سیاح آکر مقیم ہوا کرتے تھے[۴۹]۔ احمد کبیر کا اوچ میں انتقال ہوا۔ سنِ وفات معلوم نہ ہو سکا۔

حضرت احمد کبیر کے بہت سے مرید تھے۔ ان کے خلفا میں شیخ جلال مجرد سلہٹی خاص طور سے مشہور ہیں جنھوں نے بنگال و سلہٹ میں اسلام کی شمع روشن کی اور ان ہی کی کوششوں سے اس دور دراز کفرستان میں شمع اسلام روشن ہوئی۔ مشہور ہے کہ وہ احمد کبیر کے بھانجے تھے۔ زمانۂ حال کے بعض مورخین کا خیال ہے کہ ابنِ بطوطہ کامروپ شیخ جلال مجرد سلہٹی سے ملا تھا[۵۰]

مخدوم جہانیاں جہاں گشت

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، احمد کبیر کے بڑے صاحب زادے، مشہور صوفی شیخ اور نامور سیاحِ معرفت ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۴ شعبان ۷۰۷ھ کو اوچ میں ہوئی۔ حضرت مخدوم کا نام ان کے جدِ امجد کے اسمِ گرامی پر جلال الدین رکھا گیا لیکن عام طور پر "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" کے لقب سے معروف ہیں۔ "مخدوم جہانیاں" بھی لقب ہے۔ مخدوم نے سیر و سیاحت خوب فرمائی تھی، اس لیے "جہاں گشت" مشہور ہوئے۔

حضرت مخدوم کی ابتدائی تعلیم اوچ میں شیخ بہاء الدین قاضی اوچ اور شیخ جمال خنداں رو کے پاس ہوئی، پھر حضرت مخدوم ملتان پہنچے اور حضرت رکن الدین ابوالفتح کے زیرِ نگرانی تعلیم پائی حضرت رکن الدین، مخدوم پر بہت شفقت فرماتے تھے۔

حضرت مخدوم شیخ رکن الدین ابوالفتح کے سہروردی سلسلے میں مرید ہوئے اور خلافت پائی چشتی

---

۴۷ الدر المنظوم، ص ۵۴۶ ۴۸ ایضاً، ص ۵۵۰ ۴۹ ایضاً، ص ۲۱۰، ۲۰۳

۵۰ شیخ جلال سلہٹی کے حالات کے لیے دیکھیے، ص ۱۷۴ - ۱۸۹

سلسلے میں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے خلیفے تھے۔ حضرت مخدوم کو سیوستان کی چالیس خانقاہوں کا انتظام سپرد کر کے محمد تغلق نے شیخ الاسلام مقرر کیا مگر مخدوم نے اس منصب کو چھوڑ کر مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کی۔ حضرت مخدوم نے حرمین شریفین کی زیارت کی۔ سات سال مکہ مکرمہ میں اور دو سال مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ وہاں کے مشائخ سے علوم دینیہ تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ پڑھے۔ ان کے مشائخ میں عبداللہ مطری اور عبداللہ یافعی بہت مشہور ہیں۔

دہلی کے بادشاہ فیروز شاہ سے حضرت مخدوم کے تعلقات خوب استوار تھے۔ جب فیروز شاہ نے ٹھٹھے پر تاخت کی تو اول مرتبہ ناکامی ہوئی اور دوسری مرتبہ حضرت مخدوم کی کوششوں سے امیران ٹھٹھہ نے اطاعت قبول کر لی۔ مخدوم کئی مرتبہ دہلی تشریف لے گئے اور وہاں کے عمائدین، امرا، وزرا، شہزادوں اور بادشاہ سے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ حضرت مخدوم باقاعدہ درس دیتے تھے۔ ان کا ایک اچھا کتب خانہ تھا۔ مسلک حنفی کے متبع اور صحابہ کی محبت سے سرشار تھے۔ علم حدیث پر گہری نظر تھی۔ مریدوں کی تربیت خاص طور سے فرماتے تھے۔ حضرت مخدوم کے ذریعے سے بہت سے لوگ داخل اسلام ہوئے۔ وہ مقامی زبانوں میں رشد و ہدایت اور تبلیغ و تذکیر کے فرائض انجام دیتے تھے۔

حضرت مخدوم کی خدمت میں مشہور سیاح ابن بطوطہ حاضر ہوا۔ ان کے تعلقات اس زمانے کے مشہور درویش و شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور خواجہ گیسو دراز سے بہت اچھے تھے۔ حضرت مخدوم کی عمر اٹھتر سال کی ہوئی۔ سال وفات ۷۸۵ھ/۱۳۸۴ء ہے۔ ۱۰ ذی الحجہ عید قربان چہار شنبہ کا دن تھا۔ نماز دوگانہ ادا کرنے کے بعد طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور غروب آفتاب کے ساتھ ہی رشد و ہدایت، فلاح و خیر اور علم و فضل کا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ مدفن اوچ (ضلع بہاولپور) ہے۔

حضرت مخدوم کے بہت سے مریدین و طالبین خانقاہ میں رہ کر سلوک کے منازل طے کرتے اور ایک معینہ مدت کے بعد خرقہ خلافت حاصل کر کے سلسلے کی اشاعت میں مشغول ہو جاتے۔ اس طرح حضرت مخدوم کے ذریعے سے سہروردی سلسلہ تمام برصغیر پاک و ہند میں خوب پھیلا۔ حضرت مخدوم کے خلفا اور خلفا کے خلفا پنجاب، سندھ، یو۔پی، بہار، گجرات، بنگال، کاٹھیاواڑ، دکن، مدراس وغیرہ میں پھیل گئے اور ان علاقوں کے اکثر مقامات پر حضرت مخدوم کی اولاد امجاد کا سلسلہ بھی پھیلا۔

سید عارف نوشاہی

محمد ہاشم ایمن آبادی اور ان کی تصانیف

کتاب خانۂ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، راولپنڈی اس اعتبار سے پاکستان کا ایک اہم کتب خانہ ہے کہ یہاں مخطوطات کا ایک معتدبہ ذخیرہ موجود ہے[1] اور ان مخطوطات کی فہرست بھی بتدریج شائع ہو رہی ہے[2]۔ جو دانشور راور مصنفین پاکستان کی سیاسی، علمی، مذہبی اور روحانی تاریخ مرتب کر رہے ہیں ہمارے خیال میں اُن کا کام ادھورا رہے گا اگر وہ مرکز تحقیقات میں فارسی میں جمع شدہ مسودات اور مخطوطات سے اعتنا اور استفادہ نہیں کرتے۔ اس کتب خانے میں مشہور مصنفین کی گم نام تصانیف اور گم نام لوگوں کی اہم کتب موجود ہیں۔ چنانچہ آج ہم مرکز مذکور کے مخزن مخطوطات سے پنجاب کے ایک ایسے ہی گم نام مصنف کی تصانیف کا تعارف پیش کر رہے ہیں۔

تعارفِ مخطوطہ

کتب خانے کا مخطوطہ نمبر ۴۷۵۴ تین کتابوں کا مجموعہ ہے جو ایک ہی کاتب اور قلم سے لکھا ہوا ہے۔

۱۔ صلوٰۃ ہاشمی (عربی)۔ صفحہ ۲ تا ۲۸

۲۔ خصائل ابرار (فارسی مثنوی)۔ صفحہ ۳۰ تا ۲۲۴۔ (ہم زیر نظر مضمون میں اس کے اپنے مستقل صفحات کے نمبروں کا حوالہ دیں گے، مجموعے کے صفحات کا نہیں)

۳۔ صلوٰۃ ہاشمی، مکرر۔ (عربی) صفحہ ۲۲۶-۲۳۲

---

[1] مرکز تحقیقاتِ فارسی ۱۹۷۱ء میں قائم ہوا۔ اس کے کتب خانے میں ۱۰۲۰۰ مجلد مخطوطات ہیں۔ مرکز کی دیگر علمی واشاعتی سرگرمیوں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "نخستین کارنامہ" از سید مہدی غروی۔ نشر مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ۱۹۷۹ء

[2] پہلی دفعہ "فہرست نسخہ ہائے خطی کتاب خانۂ گنج بخش" محمد حسین تسبیحی نے مرتب کی، جس کی تین جلدیں علی الترتیب ۱۹۷۱، ۱۹۷۴ اور ۱۹۷۶ء میں بترتیب حروف تہجی شائع ہوئیں۔ ان تین مجلدات میں ۱ تا ۱۰۰۰ شماروں کے مخطوطات کا تعارف ہے۔ دوسری دفعہ احمد منزوی نے موضوعی ترتیب سے "فہرست نسخہ ہائے خطی کتاب خانۂ گنج بخش" مرتب کی۔ اس کی دو جلدیں ۱۹۷۹ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ بقیہ فہرست زیر طبع ہے۔

اس مجموعۂ کتب کی بیرونی تقطیع ۲۱ × ۱۱ سنٹی میٹر اور اندرونی تقطیع ۱۷ × ۶ سنٹی میٹر ہے۔ عربی اور فارسی دونوں متون بخطِ نستعلیق ہیں۔ البتہ فارسی متن (خصائلِ ابرار) بعض جگہوں پر شکستہ مائل بھی ہو جاتا ہے۔ خصایل ابرار کے اختتام پر تاریخ کتابت ۱۳ رمضان ۱۱۳۶ھ موجود ہے۔ ہر صفحے کی ۱۹ سطور ہیں۔ مثنوی کے صفحہ ۲ پر ایک مہر "گل محمد قادری ۱۱۸۱ھ" اور صفحہ ۱۰۲ پر دوسری مہر "دارد امید شفاعت محمد خالو ۱۱۲۲" ثبت ہے۔

احوالِ مصنف

مذکورہ مجموعۂ کتب کے مصنف کا نام محمد ہاشم اور ان کی سکونت ایمن آباد[۵۳]، مثنوی "خصایل ابرار" سے ثابت ہے۔ جہاں وہ کہتے ہیں:

خاکِ اقدام جملۂ عالم	بلک ازاں کم محمد ہاشم
ساکنِ قصبۂ نکو بنیاد	حاوی علم و فضل، امن آباد
ازمضافاتِ صوبۂ لاہور	صانہا اللہ عن الجفا والجور[۵۴]

۱۱۳۵ھ میں وہ بقیدِ حیات تھے۔ اس سال میں انھوں نے "خصایلِ ابرار" منظوم کی تھی۔

محمد ہاشم کے بارے میں مزید بدیہی معلومات کسی خارجی ماخذ سے (ابھی ہمیں) دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم زیرِ بحث نگارشات و تصانیف کی روشنی میں ان کی شخصیت کے بعض معنوی پہلو متعین کیے جا سکتے ہیں، مثلاً:

۱۔ وہ عربی زبان پر اچھی دست رس رکھتے تھے۔ بطور حوالہ ان کی عربی تصنیف "صلوٰۃِ ہاشمی" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ نیز ان کی فارسی مثنوی "خصائل ابرار" عربی سے براہِ راست مترجم ہے، جو ان کی عربی پر گرفت اور ترجمہ کرنے کی اہلیت کو ثابت کرتی ہے۔

۲۔ وہ فارسی کے بھی پختہ شاعر تھے۔ "خصایلِ ابرار" سے نعت النبیؐ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بعد حمد خدا است نعتِ رسول	کز طفیلش شود جہاں مقبول
اشرفِ خلق و سرورِ کونین	عین انسان و ہم بانساں عین

۵۳۔ پنجاب میں ضلع گوجرانوالہ کا ایک قدیم قصبہ
۵۴۔ خصایل ابرار، ص ۱۰

[illegible] فائی جہاں ذاتش	خلق ناجی ز فیضِ برکاتش
دل کہ چوں غنچہ در نقاب عدم	بود در مہد وصل حق خورم
چوں گرفت از وجود آرایش	شد پریشاں چو گل ورق ہایش
بود آشفتہ سر ز ہجرت یار	کردہ جانش فراق یار افکار
گشت از نور طلعتش روشن	مہ وخورشید باکسافت تن
بود بے سایہ، سایہ از حق داشت	اندراں سایہ خوش علم افراشت
چوں خدایش بخواند سایۂ خویش	سایہ بے سایہ باشد اے حق کیش
باد زلفش بشش جہات نسیم	داد چوں ہفت نجم را تقویم
حق تنش را ز نور خویش سرشت	از عذارش گلیست ہشت بہشت[۵]

۳- محمد ہاشم کی مجلسی زندگی کے بارے میں ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے علم دوست لوگوں کے ساتھ تعلقات استوار تھے اور اس حلقے میں ان کی علمی شخصیت قابلِ احترام تھی۔ جیسا کہ ایک جماعت کا ان کے پاس آنا اور ایک عربی کتاب کو ان کے لیئے فارسی میں ترجمہ کرنے کی درخواست سے معلوم ہوتا ہے۔ (تفصیل مثنوی "خصایل ابرار" کے تعارف میں آئے گی)

۴- محمد ہاشم کے مذہبی رجحانات اور اعتقادات کے بارے میں ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ سنی العقیدہ تھے۔ خصایلِ ابرار میں سنی اکابر کی تعریفات و حکایات موجود ہیں۔ اس کے مقدمات میں مترجم کے جو اپنے اشعار ہیں اور ان کا اصل عربی کتاب سے جس کا خصایلِ ابرار ترجمہ ہے، کوئی تعلق نہیں، وہ بھی محمد ہاشم کے سُنّی ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ تاہم وہ معتدل اور غیر متعصب شخص تھے۔ خلفائے راشدین اور ائمہ اربعہ کے ساتھ ساتھ وہ اہلِ بیت اور ائمہ اثنی عشریہ کی بھی بہت تعریف کرتے ہیں۔ مثلاً :

چار یار رسول محرم راز	ہر کہ ایں خلیفہ نہ مساز
پیروی شاں ہر آنکہ شد رہ یافت	گشت گمرہ کہ رو از ایشاں تافت

---

[۵] خصایل ابرار، ص ۴ تا ۶۔ منتخب اشعار

صد ہزاراں درود و نیز سلام　　از حق و از جمیع خلق دوام[۵۶]

آگے لکھتے ہیں

یا الٰہی بحرمتِ پاکاں　　شاد کن اندرونِ غمناکاں
بحق احمد آن رسولِ خدا　　کہ شدہ تابع رضاش قضا
باد گر چار جملہ پنج تن اند　　پاک ادراک و پاک پیرہن اند
بخدیجہ رفیق پاک رسول　　دیگر ازواج ہم بنات قبول
ہم بآلِ بتول پاک نژاد　　کہ دگر ش شان زمانہ نزاد
بدہ و دو امام پاک ایجاد　　کہ از آنہا شود بحشر امداد
ہم بپاکی چار دہ معصوم　　کہ از آنہا است کار دیں منظوم
ہم با اہل اجتہاد چار امام　　کہ از آنہا جہاں گرفت آرام[۵۷]

۵۔ مصنف کی روحانی وابستگی یا میلان غالباً سلسلۂ چشتیہ کی طرف تھا۔ مشائخ چشت پر ان کا مدحیہ شعر:

خواجگان شریف ساکن چشت　　کہ بود حب شان کلید بہشت[۵۸]

اور ان مشائخ کے حالات پر مصنف کی مستقل کتاب "طریقِ اخیار" ہمیں اسی قیاس کی طرف لے جاتی ہے۔

آثارِ مصنف

فی الوقت محمد ہاشم کی مندرجہ ذیل تصانیف معلوم و مکشوف ہیں۔

۱۔ صلوٰۃِ ہاشمی (عربی): اس کے متن یا زیرِ نظر مخطوطے کے ترقیمے میں کہیں بھی مصنف کا نام بتصریح نہیں آیا، لیکن دو وجوہ کی بنا پر ہم اسے محمد ہاشم کی تصنیف قرار دے رہے ہیں۔ اوّلاً اس کے نام کی ترکیب "صلوٰۃِ ہاشمی" میں اضافت "ہاشمی"، محمد ہاشم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ثانیاً اس کا محمد ہاشم کی دوسری تالیف "خصایلِ ابرار" کے ساتھ ہونا اور دونوں متون کے یک ساں خط کا قرینہ بھی ہمارے گمان کی تائید کرتا ہے۔

---

۵۶ خصایلِ ابرار، ص ۷۶　　۵۷ ایضاً، ص ۷　　۵۸ ایضاً، ص ۱۱

زیر نظر مخطوطے میں "صلوٰۃ ہاشمی" نام سے دو درود موجود ہیں :

اوّل (ص ۲-۲۸) : مخطوطے کے آخر میں کتاب کا نام یوں آیا ہے

" تمت بفضلہ وکرمہ صلوٰۃ للآخر المسمی بالہاشمی "[۹]

ابتدا : ہمارے نسخے کا پہلا ورق ایک طرف سے پھٹا ہوا ہے۔ ناقص طور پر جو عبارت پڑھی جاتی ہے وہ یوں ہے :

الحمد للہ رب العالمین الرحیم مالک ــــ نعبد و ایاک نستعین الصلوٰۃ والسلام علی ــــ رسول اللہ وجمیع مخلوقاتہ بعد د ــــ من الازل الی الابد فی کل لمحۃ و لحظۃ بکمال[۱۰]

دوم (ص ۲۲۶ - ۲۳۲) : اس کے پہلے صفحہ (۲۲۵) پر بھی سیاہ روشنائی سے " صلوٰۃ الہاشمی " لکھا ہوا ہے۔ اور یہ ناقص الآخر ہے۔

ابتدا : اللھم صل وسلم علی سید نا محمد و الہ بعدد کل ذرۃ تھنائۃ الف الف مرۃ الذی قلت فی شانہ ما ضل صاحبکم وما غوی واعطنی بحرمۃ کمال محبت خلوص ذاتک وکمال شوق قلبی[۱۱]

اس درود میں " بحرمۃ کمال محبت خلوص ذاتک ــــ وکمال شوق قلبی " کی بکثرت تکرار موجود ہے۔

۲۔ طریق اخیار : مشائخ چشت کے حالات پر مبنی یہ کتاب بذاتہ ہمیں دست یاب نہیں ہے بلکہ اس کا ذکر " خصایل ابرار " کے مقدمے میں ہوا ہے۔ جب ایک جماعت محمد ہاشم کے پاس " خصایل ابرار " کی تالیف کی درخواست لے کر آئی تو انھوں نے اس کام سے معذوری ظاہر کی، کیونکہ اس وقت وہ " طریق اخیار " کی تصنیف میں مشغول تھے :

بود تحریر نسخہ بمیاں	مشعر حال پاک اہل جناں
خواجگان شریف ساکن چشت	کہ بود حُبّ شان کلید بہشت
عُذر کردم کہ کلک عجز ارقام	ہست اندر سواد حال کرام
چوں شود خامہ را فراغ ازان	برنگارم کہ امر شد زاخوان

---

[۹] صفحہ مجموعہ مخطوطہ ۲۸

[۱۰] صلوٰۃ ہاشمی، ص ۲

[۱۱] صلوٰۃ ہاشمی صفحہ مجموعہ ۲۲۶

شد چو اتمام نسخۂ اخبار   کہ مسمی شدہ "طریقِ اخیار"[۱۲]

بعید نہیں کہ "طریقِ اخیار" تاریخی نام ہو۔ اس مادے سے ۱۱۳۱ برآمد ہوتا ہے اور یہ "خصایلِ ابرار" کی تاریخ تصنیف ۱۱۳۵ھ سے قریب تر بھی ہے۔

۳۔ خصایلِ ابرار (ص ۳۰۔ ۲۲۴ در مجموعہ) : ہمارے مضمون کا اصل محور یہی فارسی مثنوی ہے۔ کتاب کا نام تاریخی ہے اور اس کے مطابق یہ ۱۱۳۵ھ میں تالیف (ترجمہ) ہوئی:

گشت نامش خصایلِ ابرار   سالِ تصنیف ہم زنام برآر[۱۳]

اس مثنوی کے اشعار کی مجموعی تعداد تقریباً تین ہزار پانچ سو باون (۳۵۵۲) ہے۔

خصایلِ ابرار کا سببِ تالیف (ترجمہ) یوں ہے کہ صلحا کی حکایات پر مبنی ایک عربی کتاب تھی جس سے عجمی لوگ کماحقہٗ استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ فارسی خوان لوگوں کا ایک وفد محمد ہاشم کے پاس آیا اور اس عربی کتاب کے فارسی ترجمے کی درخواست کی۔ لیکن مصنف ان دنوں سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ کا تذکرہ "طریقِ اخیار" لکھ رہے تھے لہٰذا اس وفد سے معذرت چاہی۔ لیکن جب "طریقِ اخیار" کی تالیف سے فراغت پائی تو دوستوں کی خواہش کی تکمیل کی اور اس عربی کتاب کا "خصایلِ ابرار" کی صورت میں منظوم فارسی ترجمہ کیا:

بود تازی زباں کتابی نغز   پیش اہلِ نظر سراپا مغز
مشتمل بر حکایتِ صلحا   حاوی حالِ اکثر عرفا
اصدقا را بصدق خواہش ازو   اشقیا را تمام کاہش ازو
لیک چوں بود در زبانِ عرب   عجمی دور ماندی از مطلب
آں جماعت کہ پارسی خواں بود   ہمہ بر ترجمانش خواہاں بود
جمع گشتند بہ نزد ایں احقر   بر سیدند دوستاں یکسر
التجایم بہ ترجماں کردند   پارسی نظم ازاں زباں کردند
بود تحریر نسخۂ بمیاں   مشعر حال پاک اہل جناں

---

[۱۲] خصایلِ ابرار، ص ۱۰، ۱۱   [۱۳] ایضاً، ص ۱۱۔ یہ شعر حاشیے پر درج ہے۔

شد چو اتمام نسخۂ اخبار — کہ مسمی شدہ "طریق اخیار"
باز تکلیف درمیان آمد — زاں محبانِ اہل دین و خرد
لاجرم زاں زباں بوجہ صواب — ترجمہ کردم از پے احباب
تا ازاں نفع برتمام رسد — فیض آن نظم با عوام رسد
منتفع زو شوند جملہ شتاب — چہ بزرگ و چہ خرد و شیخ و چہ شاب
گشت نامش "خصایل ابرار" — سال تصنیف ہم زنام برار[14]

محمد ہاشم نے اسے سترہ ابواب میں تقسیم کیا :

گشت جملہ کتاب ہفدہ باب — فارسی نظم ازاں کتاب شتاب[15]

ان ابواب کی ترتیب و تفصیل اس طرح ہے :

۱۔ در طلب روزی حلال کہ مہین رکن خداپرستی و ہمین وظیفۂ حق شناسی و دینداری است۔[19]
اس باب میں آٹھ حکایات ہیں۔

۲۔ ریاضت نفس کافرکیش و رہزن مردان خدا اندیش[17] اس باب میں بھی آٹھ حکایات ہیں

۳۔ طاعت و عبادت معبود حقیقی و رازق تحقیقی[18] یہ باب دس حکایتوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ خوف خدا[19]۔ نو حکایات پر مشتمل ہے۔

۵۔ فوائد حفظ زبان از فضولات[20] اس باب میں کل نو حکائتیں ہیں۔

۶۔ ذکر تائبان و قبول شدن توبہ آنہا[21] آٹھ حکایات پر مبنی ہے۔

۷۔ ذکر کرامت اولیاء اللہ تعالیٰ[22] اس باب میں سات حکایات ہیں۔

۸۔ سرعت اجابت دعاہای صالحان[23] چودہ حکایات پر مشتمل ہے۔

۹۔ نیت صالحان و زہد و فراست ایشان[24] اس باب میں پانچ حکائتیں ہیں۔

---

[14] خصایل ابرار، ص ۱۰-۱۱ — [15] ایضاً، ص ۱۱ — [16] ایضاً، ص ۱۲
[17] ایضاً، ص ۲۲ — [18] ایضاً، ص ۳۰ — [19] ایضاً، ص ۳۷ — [20] ایضاً، ص ۰
[21] ایضاً، ص ۵۹ — [22] ایضاً، ص ۸۳ — [23] ایضاً، ص ۹۱ — [24] ایضاً، ص ۰۶

۱۰۔ توکل[۲۵]۔ یہ باب آٹھ حکایتوں پر مبنی ہے۔

۱۱۔ سخاوت کہ برات نجات است از عذاب . . . و مخاطب است بحبیب الرحمان[۲۶]۔ آٹھ حکایات

۱۲۔ زہد امرا کہ در حقیقت پادشاہان دین و صدر نشینان چار بالش صدق و یقین اند[۲۷]۔ اس
باب میں نو حکایتیں ہیں۔

۱۳۔ (زہد نسوان)، ذکر ہودج نشینان عصمت و دین داری و پردگیان عفت و بزرگواری[۲۸]۔
حکایات ہیں، منقسم ہے۔

۱۴۔ طاعات صبیان[۲۹]۔ یہ باب سات حکایات پر مشتمل ہے۔

۱۵۔ زہد عبید (غلامان) و کنیزان زاہد[۳۰]۔ یہ باب بھی سات حکایات پر مبنی ہے۔

۱۶۔ ذکر احوال ضعفا و فقرای باب اللہ[۳۱]۔ اس باب میں سب سے زیادہ یعنی سترہ حکایات ہیں۔

۱۷۔ سرگزشت مضطرین کہ بجناب حق تعالیٰ دعائے آنہا مقبول گشتہ[۳۲]۔ اس باب میں سب سے
کم یعنی دو حکایتیں ہیں۔

آغازِ مثنوی: افتتاح کلام و عظ انجام | کہ زکلکم گرفتہ رنگ نظام
می سزد نام پاک خاص خدا | کہ بحکمش بود سما بہ پا[۳۳]

اختتامِ مثنوی: شکر اللہ کہ ختم گشت کتاب | کہ شدہ نظم از پے احباب
آنچہ موعود بود گشت تمام | از کرم ہای واجب الاکرام[۳۴]

خصایل ابرار کا ترقیمہ یوں ہے

"تمت نقلہ بفضل اللہ و کرمہ یوم الثلثا فی تاریخ ثلثہ و عشر من رمضان المبارک
ہجری مقدسہ فی قصبہ خیر البلاد امن آباد حفظہا اللہ تعالیٰ من شر الزمان والفساد
بحرمۃ الرسول والاصفیاد"[۳۵]

---

[۲۵] خصایل ابرار، ص ۱۱۰ [۲۶] ایضاً، ص ۱۱۹ [۲۷] ایضاً، ص ۱۳۰
[۲۸] ایضاً، ص ۱۴۱ [۲۹] ایضاً، ص ۱۵۲ [۳۰] ایضاً، ص ۱۶۵ [۳۱] ایضاً، ص ۱۷۹
[۳۲] ایضاً، ص ۱۹۶ [۳۳] ایضاً، ص ۲ [۳۴] ایضاً، ص ۲۰۰ [۳۵] ایضاً، ص ۲۰۰

گویا زیر نظر مخطوطہ دو لحاظ سے اہم ہے۔ اولاً یہ سال تصنیف (ترجمہ) سے صرف ایک سال بعد کتابت ہوا۔ ثانیاً اس کا مقام کتابت "ایمن آباد" ہے جہاں ہمارا مصنف مقیم تھا۔ عین ممکن ہے یہ نسخہ مصنف کا خود نوشت ہو۔ اس امکان کی تائید اُن اضافات اور تصحیحات سے بھی ہوتی ہے جو حواشی پر یا بین السطور موجود ہیں۔

اصل متن کا سراغ

ہمیں حیرت ہے کہ محمد ہاشم نے بڑے اہتمام سے ایک عربی کتاب کا ترجمہ تو کیا مگر اس کا نام نہیں بتایا۔ تاہم جب ہم نے مترجم کے دیے گئے اشارے "مشتمل بر حکایت صلحا" کی روشنی میں اصل متن کی جستجو کی تو پتا چلا یہ "حکایات الصالحین" نامی کتاب کا ترجمہ ہے جس کا مصنف معلوم نہیں اور وہ بیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں سات سے دس تک حکایات درج ہیں۔ حکایات الصالحین کی ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے۔

"الحمد للہ الذی فضل اولیا علی کافتہ الناس ... امابعد فہذا کتاب یقال لہ حکایات الصالحین الذین یکون ذکرھم

اور اس کے بیس ابواب کی موضوعی فہرست یوں ہے:

۱۔ فی استبراھم القوت الحلال واجتنابھم من الشبہات۔ ۲۔ فی ریاضتہ النفس۔ ۳۔ فی المجاھدہ۔ ۴۔ فی خشیتہ اللہ والبکاء۔ ۵۔ فی حفظ اللسان و ترک الاذی۔ ۶۔ فی التائبین و سبب توبتھم۔ ۷۔ فی کرامتہ الاولیا۔ ۸۔ فی دعاء الصالحین و سرعتہ اجابتہ۔ ۹۔ فی صدق بنات الصالحین۔ ۱۰۔ فی التوکل علی اللہ۔ ۱۱۔ فی ذکر سخاوۃ الاولیاء۔ ۱۲۔ فی ذکر زہد الامراء۔ ۱۳۔ فی حکایات زہد النساء۔ ۱۴۔ فی ذکر طاعتہ الفتیان۔ ۱۵۔ فی ورع العبید۔ ۱۶۔ فی حکایتہ الفقراء والضعفاء۔ ۱۷۔ فی حکایتہ المضطرین۔ ۱۸۔ فی وفات الاولیاء۔ ۱۹۔ فی رؤیاء الصالحین بعد وفاتھم۔ ۲۰۔ حکایات المتفرقہ [۳۶]

---

[۳۶] A. MINGANA : CATALOGUE OF THE ARABIC MANUSCRIPTS IN THE JOHN RYLANDS LIBRARY, MANCHESTER, (1934), PAGE: 826-27.

اس فہرست کے پیشِ نظر معلوم ہوتا ہے کہ محمد ہاشم نے "خصایلِ ابرار" میں اصل متن کے آخری تین الواب کو "شتاب" میں شاملِ ترجمہ نہیں کیا۔ ممکن ہے ان کے پیشِ نظر جو عربی نسخہ تھا وہ نامکمل ہو۔

حکایات الصالحین کے دیگر فارسی تراجم

"خصایلِ ابرار" حکایات الصالحین کا پہلا فارسی ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی اس کے چند تراجم ہو چکے تھے۔ اس وقت تک مندرجہ ذیل تین مختلف ترجمے ہمارے علم میں ہیں۔

۱۔ اس ترجمے کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری لندن میں ذیل شمارہ OR ۲۲۰۷ موجود ہے۔ الحاقی خط سے اس کی تاریخ کتابت ربیع الاوّل ۷۹۶ھ لکھی گئی ہے۔

برٹش میوزیم لائبریری کے فاضل فہرست نگار چارلس ریونے اس بابت کوئی وضاحت نہیں کی کہ یہ مجموعہ حکایات عربی سے ترجمہ شدہ ہے۔ وہ اس ترجمے کے مصنف (ہمارے خیال کے مطابق عربی متن کے مصنف) کو پانچویں صدی ہجری کا ایک سُنّی العقیدہ شخص بتاتے ہیں۔ کیونکہ اس مجموعے میں جن بزرگانِ اسلام کی حکایات درج ہوئی ہیں ان میں سے متاخرترین شخص ابوسعید خرگوشی (م ۴۰۷ھ) ہے۔ ریونے اس ترجمے کی جو ابتدائی عبارت اور فہرستِ الواب نقل کی ہے، اس میں "ر" کو منقوط "ز" میں لکھا گیا ہے، جو البتہ متن (ترجمہ) کی قدامت کی ایک دلیل ہے۔

یہ ترجمہ بھی بیس الواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں دس حکایات درج ہیں۔

ابتدا:۔ الحمد للّٰہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین۔ ثنا و ستایش مر خدایرا کہ افرینندگار جہانست و افرینندگار ہمہ جانوران است۔

فہرست الواب:۔ ۱۔ اندر خوردن حلال و نگاہ داشتن قوت خویش۔ ۲۔ در ریاضت و نفس راقہر کردن۔ ۳۔ اندر رنج بردن و جہد کردن بر طاعتِ حق تعالیٰ۔ ۴۔ اندر ترسیدن از خدای تعالیٰ۔ ۵۔ اندر نگاہ داشتن زبان۔ ۶۔ اندر حکایات تایبان و سبب توبۂ ایشان۔ ۷۔ اندر کرامات اولیائی خدای تعالیٰ۔ ۸۔ اندر دعا کہ کردند و در وقت مستجاب شد۔ ۹۔ اندر صدق اولیا و خبر دادن بر یک دیگر۔ ۱۰۔ اندر توکل بر خدی تعالیٰ در ہمہ حال۔ ۱۱۔ سخا۔ ۱۲۔ ورع امرا۔ ۱۳۔ زہد النسا۔ ۱۴۔ کرامات صبیان۔ ۱۵۔ کرامات اکابر۔ ۱۶۔ کراماتِ فقرا۔ ۱۷۔ اعانۃ خدای تعالیٰ بر متحیران را۔ ۱۸۔ اتقات اولیا و کرامات ایشان۔ ۱۹۔ خوابہا کہ دیدہ اند

بزرگان را از پس مرگ۔ ۲۰۔ حکایات پراگندہ از ہر نوع[۳۷]

۲۔ دوسرے ترجمے کا مترجم بھی معلوم نہیں، البتہ تاریخ ترجمہ ۱۰۶۰ھ ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ ترجمہ بھی "خصایل ابرار" کی طرح عربی سے ناواقف لوگوں کی درخواست پر کیا گیا، جیسا کہ اس کی مندرجہ ذیل ابتدائی عبارت سے ظاہر ہے:

"سپاس بے قیاس مرحضرت صمدیت را کہ عشاق خود را بہ محبت ذاتیہ بر تمام مخلوقات برگزیدہ، اما بعد التماس نمود جماعت مشتاقان کہ از اکتساب زبان عربی بے مایہ بودند"

اس منثور ترجمے کے ابواب کی تعداد بھی بیس ہے اور موضوعات بھی وہی ہیں۔ اس کا قلمی نسخہ بخط نستعلیق، بقلم غلام محی الدین بن شیخ عبداللہ مفتی، کتب خانہ ضیاء العلوم، موضع سرمہ دانی، تحصیل فیروز والا ضلع شیخوپورہ میں موجود ہے[۳۸]۔

۳۔ تیسرا ترجمہ شیخ عثمان بن عمر الکہف کا ہے جو بیس ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں دس حکایات مندرج ہیں[۳۹]۔

---

[۳۷] CHARLES RIEU : SUPPLEMENT TO THE CATALOUGE OF THE PERSIAN MANUSCRIPTS IN THE BRITISH MUSEUM, 1895, A.D. PAGE: 248

[۳۸] فہرست جامع مخطوطات فارسی در پاکستان (زیر تالیف و ترتیب) از احمد منزوی، مسودہ مخزونہ کتب خانہ گنج بخش، راولپنڈی۔

[۳۹] حاجی خلیفہ، مصطفی بن عبداللہ: کشف الظنون عن اسامی الکتب و الفنون، طبع استنبول، ۱۹۷۱ء، جلد ۲، ص ۷۶۴۔

ڈاکٹر محمد ریاض

سنائی اور حالی کی مماثلتِ فکر

حکیم ابو المجد مجدود آدم سنائی غزنوی (م ۵۲۵ھ) اور خواجہ الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴ء) کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو اجتماعی حالات کے شعور اور معاصر معاشرے سے بھرپور اور تلخ انتقاد کے لحاظ سے ان کے ہاں عجیب مماثلت نظر آتی ہے۔ حالی نے عربی اور فارسی ادب کو خوب کھنگالا تھا۔ مرزا غالب کے مرثیے میں مثالاً انھوں نے جن فارسی شعرا کے نام لیے ان میں سنائی بھی شامل ہیں،

بات بگڑی رہی سہی، افسوس   آج خاقانی و سنائی کی

گو اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انھوں نے تصانیف سنائی کو بغور پڑھا تھا، مگر اس ثبوت کی ضرورت بھی نہیں۔ فارسی کے ادبِ تصوف و اخلاق میں سنائی معروف ہی نہیں پیشرو بھی ہیں۔ حالی کو اخلاقیات سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ۱۸۸۲ء میں حکیم ناصر خسرو علوی (م ۴۸۱ھ) کا سفرنامہ مرتب کیا اور ایک متوسط ضخامت کے فارسی مقدمے کے ساتھ، جس میں ناصر خسرو کے حالاتِ زندگی شامل ہیں، اسے دہلی سے شائع کروایا تھا، اس وقت تک ناصر خسرو کا سفرنامہ کہیں بھی شائع نہ ہوا تھا۔ اخلاق سے ان کی دلچسپی نے اسی پر اکتفا نہ کیا اور چار سال بعد ۱۸۸۶ء میں انھوں نے "حیاتِ سعدی" نام کی کتاب تالیف کی جس میں شیخ سعدی کے حالاتِ زندگی اور ان کی اخلاق آموز تصانیف پر نقد و تبصرہ ہے۔ بہرحال قرائن سے واضح ہے کہ حالی نے تصانیفِ سنائی کا مطالعہ کیا ہوگا اور کیا عجب کہ ان کا اثر بھی قبول کیا ہو۔ تصانیفِ سنائی ایک دیوان اور چھ مثنویوں پر مشتمل ہیں۔

حکیم سنائی سلطان مسعود بن ابراہیم غزنوی (۴۹۲ - ۵۰۸ھ) کے دربار سے وابستہ رہے۔ اس کے والد ابراہیم غزنوی کی شان میں بھی ان کے قصائد ملتے ہیں۔ بعد میں کچھ عرصہ وہ سلطان بہرام غزنوی (۵۱۱ - ۵۵۲ھ) سے بھی منسلک رہے مگر جلد ہی انھوں نے ترکِ دربار کر دیا۔ وہ سیرو

سلوک کی طرف متوجہ ہوتے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ صوفیانہ شاعری میں رومی کے پیش روؤں میں ایک وہ ہیں اور دوسرے شیخ عطار نیشاپوری (م ۶۱۸ھ)۔

حکیم سنائی کا تعلق غزنوی بادشاہوں کے پُرآشوب اور انحطاط پذیر عصر سے تھا۔ غوری اور سلجوقی قبائل نے غزنویوں کو پریشان کر رکھا تھا اور وہ بیشتر برصغیر کے اپنے مقبوضات میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ سنائی کی وفات کو نصف صدی نہ گزری تھی کہ ۵۸۲ھ میں غوریوں کے ہاتھوں غزنوی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ خلافتِ عباسیہ بھی اس وقت ضعف و اضمحلال سے دوچار تھی۔ خلفائے عباسیہ کے فرامین کو اکثر مسلمان سلاطین قابلِ اعتنا نہ جانتے تھے اور پورا عالم بالعموم انتشار سے دوچار تھا۔ ان حالات میں مسلمانوں کے شخصی حالات اور انفرادی کردار بھی دگرگوں ہو گئے تھے۔ سنائی کی تصانیف میں مختلف عنوانات کے تحت احوالِ زمانہ اور مسلمانوں کی بدحالی و بداخلاقی پر انتقادات ملتے ہیں۔

مولانا حالی کے عصر (۱۸۳۷۔ ۱۹۱۴ء) کی پُرآشوبی واضح ہے۔ ان کے زمانے میں انگریزی عمل داری مستحکم ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی بظاہر ناکام جنگِ آزادی کے بعد آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو معزول اور رنگون میں قید کر دیا گیا جہاں ۱۸۶۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ انیسویں صدی کے آخری تقریباً ربع حصے میں سید احمد خان (۱۸۱۷۔ ۱۸۹۸ء) کی عظیم تعلیمی اور اصلاحی تحریک جاری رہی۔ حالی اس تحریک سے معنوی طور پر منسلک تھے۔ ان کی مسدس مدوجزرِ اسلام (۱۸۷۹ء)، شکوۂ ہند (۱۸۸۸ء) اور علی گڑھ کالج میگزین نیز تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے والے متعدد مضامین، تحریک سید احمد خان سے ان کی وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ حالی کو قومی مصنف اور شاعر کہا جاتا ہے جس سے ان کا وظیفہ حیات واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی انھوں نے برصغیر بلکہ پورے عالمِ اسلام کے مسلمانوں کے مسائل پر توجہ کی اور بعض امور کے بارے میں نقد و احتساب، تبصرہ اور اظہار رائے کیا ہے۔ سنائی اور حالی کی اہم ترمشترک اقدار یہی ہیں کہ دونوں نے اپنے معاصر حالات پر غور و فکر کیا اور واضح طور پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ مگر اصل چیز، جیسا کہ ابتدا میں ذکر ہوا، ان کے نقطۂ نظر کی مطابقت اور مماثلت ہے۔ سنائی نے کئی امور بزبانِ فارسی اس طرح بیان فرمائے تھے جس طرح حالی نے انھیں اُردو میں بیان کیا ہے۔ ہم یہاں دونوں کی شاعری کے ایک حصّے

کی مماثلت کا ذکر کر رہے ہیں، گو حالی کی منثور کتابوں میں بھی سنائی سے مماثل باتیں موجود ہیں۔

مسلمانوں کی حالتِ زار

سنائی نے اپنے دیوان میں کئی جگہ معاصر مسلمانوں کی بدحالی اور بداخلاقی پر زوردار انداز میں انتقاد کیا ہے۔ ان کے ایک مشہور قصیدے کے بعض اشعار یوں ہیں اور ان میں جہاں وہ حقیقی اسلام کو جملہ امراض و علل کا دافع بتاتے ہیں، وہاں وہ اکثر معاصر مسلمانوں کے دعویِ اسلام کو خاطر میں نہیں لاتے،

مسلماناں مسلماناں مسلمانی مسلمانی ازیں آئینِ بیدیناں، پشیمانی پشیمانی
مسلمانی کنوں اسمیت بر عرفی و نادانی دریغا کو مسلمانی، دریغا کو مسلمانی
جہاں یکسر ہمہ پر دیو و پر غول اند و امت را کہ یارد جز اسلام و جز سنت نگہبانی

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سنائی دینِ اسلام کو مسلمانوں کی بداعمالی کی وجہ سے "آئینِ بے دیناں" قرار دے رہے ہیں۔ ایک شہر آشوب نما قطعے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ یہاں وہ صوفیوں اور زاہدوں کی بداعمالی اور بدسیرتی کا شکوہ کر رہے ہیں:

مردِ ہشیار دریں عہد کم است ور کسے ہست بہ دینِ متہم است
از یکے در نگری تا بہزار ہمہ را عشق درام و درم است
صوفیاں را نہ پے راندنِ کام قبلۂ شاں، شاہد و شمع و شکم است
زاہداں را از برائے زہ و زر قل ہو اللہ احد و دم است

اس قبیل کے انتقادات حالی کے ہاں بھی نظر آتے ہیں مگر انھیں نقل کرنے سے قبل سنائی کا دردِ دل مزید دیکھ لیں۔ اپنے ایک قصیدے کو سنائی نے شہر پُر آشوب کا رنگ دیا اور مسلمان معاشرے کے کئی طبقات جیسے علما، فلسفیوں، امیروں اور شاعروں کو ان کی بدعملی اور بدعتوں پر متنبہ کیا ہے:

اے مسلماناں، خلائق حالِ دیگر کردہ اند از سرِ بیحرمتی، معروف منکر کردہ اند
کار و جاہِ سروران شرع در پائے اوفتاد زانکہ اہلِ فسق از ہر گوشہ سر بر کردہ اند
شرع را یکسر نہادستند اندر خیر و شر قولِ بطلیموس و جالینوس باور کردہ اند
گاہ وصافے برائے وقف و ادرارِ عمل باعمر در عدل ظالم را برابر کردہ اند

مال داران توانگر کیسۂ درویش دل	در جفا درویش را از غم توانگر کردہ اند
سیم زکبر و بخل برگردون اخضر بردہ اند	مال خود بر سائلاں کبریت احمر کردہ اند
زیں یکے مشت کبوتر باز چوں شاہین ظلم	عالمے بر خلق چوں چشم کبوتر کردہ اند
شاعران شہر ہا از بہر فرزند و کمال	شخص خود را ہمچو کلکے زرد و لاغر کردہ اند
خرقہ پوشان مزوّر سیرت سالوس درز	خویشتن را سخرۂ قیماز و قیصر کردہ اند
گاہ خلوت صوفیان وقت باموے چو شیر	در دِ خود ذکرِ برنج و سیر و شکر کردہ اند
از برائے حرصِ سیم و طمع در مالِ یتیم	حاکماں، حکم شریعت را مبتّر کردہ اند
مصحفِ یزداں دریں ایام کس می ننگرد	چنگ و بربط را بہا اکنوں فزونتر کردہ اند
خون چشم بیوگان است آنکہ در وقت صبوح	مہتران دولت اندر جام و ساغر کردہ اند

سنائی کے جس قصیدے کے اشعار ہم نے نقل کیے، اس کا عنوان " در انقلاب حالِ مومان و تغییرِ دورِ زمان " (یعنی لوگوں کے حالات اور زمانے کی رو کی تبدیلی کے بارے میں) ہے اور جیسا کہ اشعار سے واضح ہے، سنائی کے انتقادات کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

۱۔ مسلمانوں نے احکام شریعت کی پروا نہ کرتے ہوئے پسندیدہ کاموں (معروف) کو غیر پسندیدہ اور ممنوع کاموں (منکر) کی طرح ترک کر رکھا ہے۔ شرعی امور پر فلسفیانہ افکار قابلِ ترجیح ہو رہے ہیں۔

۲۔ امرا سنگ دل ہو کر یتیموں اور بیواؤں کی مدد و اعانت سے غافل ہی نہیں، ان کے آزار کے بھی درپے نظر آتے ہیں ۔ شاعر مبالغہ آمیز توصیفات و تعریفات کے ذریعے اپنی آبرو خاک میں ملا رہے ہیں۔

اس سے قبل معاصر علما اور صوفیا پر انتقاد کے بارے میں اشعار نقل ہو چکے ۔ ان اشعار کے سیاق و سباق کی خاطر دیوان حکیم سنائی غزنوی مرتبہ پروفیسر مدرس رضوی تہران ۱۹۵۱ کے مندرجہ ذیل صفحات بالترتیب دیکھے جا سکتے ہیں: ۵۰۷ ، ۵۰۸ ، ۵۷ اور ۱۳۸ تا ۱۴۰۔ اب ان امور کو اسی رنگ اور ترتیب میں " مسدس حالی " میں ملاحظہ فرمائیں ۔ صفحات " مسدس حالی " مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ (لاہور) کے ہیں جو کئی بار شائع ہوتی رہی ہے ۔

حامیانِ فلسفہ

وہ تقویم پارینہ یونانیوں کی	وہ حکمت کہ ہے ایک دھوکے کی ٹٹی

یقیں جس کو ٹھہرا چکا ہے نکمی عمل نے جسے کر دیا آ کے ردّی
اسے وحی سے سمجھے ہیں ہم زیادہ کوئی بات اس میں نہیں کم زیادہ (ص ۶۷)
اب اس فلسفے پر جو ہیں مرنے والے شفا اور مجسطی کے دم بھرنے والے
ارسطو کی چوکھٹ پہ سر دھرنے والے فلاطون کی اقتدا کرنے والے
وہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں (ص ۶۸)

علمائے سو

وہ علمِ شریعت کے ماہر کدھر ہیں وہ اخبارِ دین کے مبصر کدھر ہیں
اصولی کدھر ہیں، مناظر کدھر ہیں محدّث کہاں ہیں، مفسّر کدھر ہیں
وہ مجلس جو کل سر بسر تھی چراغاں چراغ اب کہیں ٹمٹماتا نہیں واں (ص ۵۴)
مدارس وہ تعلیمِ دیں کے کہاں ہیں مراحل وہ علم و یقیں کے کہاں ہیں
وہ ارکان، شرعِ متیں کے کہاں ہیں وہ وارثِ رسولِ امیںؐ کے کہاں ہیں
رہا کوئی امت کا ملجا نہ ماوےٰ نہ قاضی نہ مفتی نہ صوفی نہ ملّا (ص ۵۵)

صوفیا اور پیر

بہت لوگ پیروں کی اولاد بن کر نہیں ذاتِ والا میں کچھ جن کے جوہر
بڑا فخر ہے جن کو لے دے کے اس پر کہ تھے ان کے اسلاف مقبولِ داور
کرشمے ہیں جا جا کے جھوٹے دکھاتے مریدوں کو ہیں لوٹتے اور کھاتے (ص ۵۵)
یہ ہیں جادہ پیمائے راہِ طریقت مقام ان کا ہے ماورائے شریعت
انھیں پر ہے ختم آج کشف و کرامت انھیں کے ہے قبضہ میں بندوں کی قسمت
یہی ہیں مراد اور یہیں ہیں مرید اب یہی ہیں جنید اور یہی بایزید اب (ص ۵۶)
سدا اہلِ تحقیق سے دل میں بل ہے حدیثوں پہ چلنے میں دیں کا خلل ہے
فتاووں پہ بالکل مدارِ عمل ہے ہر اک رائے قرآں کا نعم البدل ہے
کتاب اور سنت کا ہے نام باقی خدا اور نبیؐ سے نہیں کام باقی (ص ۵۸)
وہ دیں جس سے توحید پھیلی جہاں میں ہوا جلوہ گر حق زمین و زماں میں

رہا شرک باقی نہ وہم و گماں میں — وہ بدلا گیا آ کے ہندوستاں میں
ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں — وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں (ص ۵۹)

امرائے سنگ دل اور عیاش

امیروں کا عالم نہ پوچھو کہ کیا ہے — خمیر ان کا اور ان کی طینت جدا ہے
سزاوار ہے ان کو جو ناسزا ہے — روا ہے انھیں سب کہ جو ناروا ہے
شریعت ہوئی ہے نکونام ان سے — بہت فخر کرتا ہے اسلام ان سے (ص ۴۸)
سمجھتے ہیں سب عیب جن عادتوں کو — بہائم سے نسبت ہے جن سیرتوں کو
چھپاتے ہیں اوباش جن خصلتوں کو — نہیں کرتے اجلاف جن حرکتوں کو
وہ یاں اہلِ دولت کو ہیں شیرِ مادر — نہ خوفِ خدا ہے نہ شرمِ پیمبرؐ (ص ۴۹)
کسی قوم کا جب الٹتا ہے دفتر — تو ہوتے ہیں مسخ ان میں پہلے تونگر
کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر — نہ عقل ان کی ہادی نہ دین ان کا رہبر
نہ دنیا میں ذلت نہ عزت کی پروا — نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا (ص ۵۰)
یہ ہو سکتے ہیں ان کے ہم جنس کیونکر — نہیں چین جن کو زمانے سے دم بھر
سواری کو گھوڑا نہ خدمت کو نوکر — نہ رہنے کو گھر اور نہ سونے کو بستر
پہننے کو کپڑا نہ کھانے کو روٹی — جو تدبیر الٹی تو تقدیر کھوٹی (ص ۵۱)
غنی ہم میں ہیں اربابِ ہمت — مسلّم ہے عالم میں جن کی سخاوت
اگر ہے مشائخ سے ان کو عقیدت — تو ہے پیرزادوں پہ وقف ان کی دولت
نکمے ہیں دن رات واں عیش کرتے — یہ نوکر ہیں جتنے وہ بھوکے ہیں مرتے
عمل واعظوں کے اگر قول پر ہے — تو بخشش کی امید بے صرفِ زر ہے
نماز اور روزہ کی عادت اگر ہے — تو روزِ حساب اُن کو پھر کس کا ڈر ہے
اگر شہر میں کوئی مسجد بنا دی — تو فردوس میں نیو اپنی جما دی (ص ۵۲)

شعرا

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا وہ علموں میں علمِ ادب ہے ہمارا (ص۱۷)

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے عجب جھوٹ بکنا گر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے (ص۲۰)

عرب جو تھے دنیا میں اس فن کے بانی نہ تھا کوئی آفاق میں جن کا ثانی
زمانہ نے جن کی فصاحت تھی مانی مٹا دی عزیزوں نے ان کی نشانی
سب ان کے ہنر اور کمالات کھو کر رہے شاعری کو بھی آخر ڈبو کر (ص۲۰)

خلف ان کے یاں جو کہ جادو بیاں ہیں فصاحت میں مقبول پیر و جواں ہیں
بلاغت میں مشہورِ ہندوستاں ہیں وہ کچھ ہیں تو لے دے کے اس گوں کے یاں ہیں
کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں تو بھانڈ ان کی غزلیں مجالس میں گائیں (ص۴۳)

اگر شش جہت میں کوئی دل رُبا ہے تو دل کا نادیدہ اس پہ فدا ہے
اگر خواب میں کچھ نظر آگیا ہے تو یاد اس کی دن رات نامِ خدا ہے
بھری سب کی وحشت سے روداد ہے یاں جسے دیکھیے قیس و فرہاد ہے یاں (ص۴۴)

مسلمانوں کی غربت اور بدحالی

فلاکت جسے کہیے اُمّ الجرائم نہیں رہتے ایماں پہ دل جس سے قائم
بناتی ہے انساں کو جو بہائم مصلّی ہیں دل جمع جس سے نہ صائم
وہ یوں اہلِ اسلام پر چھا رہی ہے کہ مسلم کی گویا نشانی یہی ہے (ص۴۴)

بہت آپ کو کہہ کے مسجد کے بانی بہت بن کے خود سیّدِ خاندانی
بہت سیکھ کر نوحہ و سوز خوانی بہت مدح میں کرکے رنگیں بیانی
بہت آستانوں کے خدام بن کر پڑے مانگتے کھاتے پھرتے ہیں دردر

مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں ہنر اور پیشہ کو جو خوار سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں فرنگی کے پیسے کو مردار سمجھیں

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی   وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی (ص ۴۴)

قارئین ان مختصر نمونوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں کہ سنائی نے جو باتیں چھٹی صدی ہجری بارہویں صدی عیسوی میں کہی تھیں، مولانا حالی نے گزشتہ صدی کے اواخر میں اپنے عصر کے تقاضوں کے مطابق ذرا شرح و بسط اور صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ :

ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال

یہاں اس امر کی صراحت بھی ضروری ہے کہ فارسی فہمی کی دشواریوں کے پیشِ نظر ہم نے مسدس حالی کے مقابلے میں دیوانِ سنائی کے اشعار کم نقل کیے ہیں۔

(بقیہ از صفحہ ۴۹)

قائم کیا اور موسیقی کا ایک خاص ساز بھی ایجاد کیا اور تیسرے ابن سینا جو موسیقی میں نظری اور عملی دونوں اعتبار سے ماہر تھا۔ اس نے ہم آہنگی (ہارمونی) کی اولین صورتیں بیان کیں اور اس کے ساتھ ساتھ مقداری موسیقی پر بھی روشنی ڈالی۔ اپنے نظریات میں وہ الفارابی کا پیرو تھا۔

برق اور مقناطیسیت کے باب میں ہمیں الکندی، ابن سینا، ابن رشد، ابن باجہ وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ان میں سے الکندی اور ابن سینا اہم ہیں۔ الکندی نے بجلی کی کڑک اور چمک کے اسباب کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے نزدیک ایسا بادلوں کی باہم رگڑ سے ہوتا ہے۔ ابن سینا نے اس پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ برق اور گرج بیک وقت پیدا ہوتے ہیں لیکن برق کی چمک کو ہم پہلے اس لیے دیکھ لیتے ہیں کہ آواز کے مقابلے میں روشنی کی رفتار خاصی تیز ہوتی ہے۔

مختصراً یہ کہ طبیعیات کے میدان میں مسلمانوں نے قابلِ قدر کام کیا اور اس میں خاطر خواہ اضافے کیے — مثلاً حرکت کے باب میں ابن سینا کا نظریہ، کششِ ثقل کے باب میں رازی اور ابن مسکویہ کی تصریحات، کثافتِ اضافی کے ضمن میں سند بن علی اور البیرونی کی معلومات، البیرونی اور ابن سینا کا نظریۂ خلا، مادے کے خواص میں رازی کا نظریۂ جوہر، بصریات میں ابن سینا کا نظریۂ امواج و رفتارِ نور، ابن الہیثم کے قوانین اور ابن رشد و شیرازی کی تحقیقات، آواز کے ضمن میں مسلمانوں کا علم موسیقی وغیرہ ایسے ٹھوس اضافے ہیں، جن کی مستند مورخین اور تاریخ سائنس کے ماہرین نے تصدیق کی ہے اور جو طبیعیات کی تاریخ میں اہم اور بنیادی مقام رکھتے ہیں۔ یہی چیز مسلمانوں کے اس دور کو ممتاز کرتی ہے۔

محمد اسحاق بھٹی

مناسکِ حج، شاہ ولی اللہ کے نقطۂ فکر سے

اسلامی احکام و عبادات اور دینی اوامر و نواہی کے بارے میں امتِ مسلمہ میں دو بزرگوں نے فلسفہ و فکر کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ ایک امام غزالی نے اور دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے۔! مگر ان دونوں کے طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان میں نمایاں فرق ہے۔ اپنی شہرہ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب نے دیگر ارکانِ اسلام کے علاوہ حج اور مناسکِ حج کے موضوع پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے، جس کے ایک حصے کی تلخیص اور ترجمہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

حج بیت اللہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک رکن ہے۔ اس کی ادائیگی ہر ذی استطاعت اور صاحبِ حیثیت مسلمان پر فرض ہے۔ حج کے موقع پر دنیا کے ہر گوشے سے لاکھوں مسلمان اللھم لبیك، لبیك، لا شریك لك لبیك، ان الحمد والنعمۃ لك والملك لا شریك لك۔ کے نغمے الاپتے اور اللہ کی حمد و ثنا کے ترانے گاتے ہوئے سرزمینِ حجاز میں وارد ہوتے ہیں۔ سال میں چند روز کے لیے یہ وادیٔ غیر ذی زرع اور سرزمینِ بے آب و گیاہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا مرکز قرار پا جاتی ہے۔ اس میں کالے اور گورے، غریب اور امیر، غلام اور آقا کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ خوش قسمت اور بلند بخت لوگ دعائیں کرتے اور رحمتِ خداوندی سے اپنے دامنِ طلب کو بھر لیتے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کے فیوض و برکات کی بارش ہوتی ہے اور اس کا ابرِ کرم انسانوں کے لیے ایک عظیم ہجوم پر سایہ فگن ہو جاتا ہے۔

بیت اللہ شریف، اللہ کی رحمتوں کا بہت بڑا مرکز اور اس کے شعائر میں سے ایک پُر عظمت شعار ہے۔ اس کی تعظیم کرنا اور اسے مقدس جاننا ایمان کا بنیادی جز ہے۔ حج اس کی تقدیس و تعظیم بیان کرنے کا عظیم الشان ذریعہ ہے۔ اس ذریعے سے دور دراز کے مسلمانوں میں باہمی تعلقات پیدا ہوتے اور اسلام کی عالمگیر برادری میں وحدت کے جذبات ابھرتے ہیں، اور یہ سنتِ ابراہیمی کی دنیوی شان و شکوہ اور روحانی عظمت و برتری کا بہت بڑا نشان ہے۔

حج کی تقریب بہت پرانی تقریب ہے۔ عہدِ جاہلیت میں بھی عرب کے لوگ کعبے کے بیتِ عتیق میں حج کے لیے جایا کرتے تھے، لیکن اس میں انھوں نے بعض ایسے امور شامل کر لیے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ماثور و منقول نہ تھے۔ مثلاً وہ اس موقع پر بعض بتوں کی تعظیم بجالاتے اور ان کے نام پر احرام باندھتے تھے۔ انھوں نے تلبیہ میں ایسے الفاظ شامل کر لیے تھے جن میں شرک کی آمیزش پائی جاتی تھی۔ قبیلۂ قریش کے لوگوں نے اس قسم کی من گھڑت اور مخترع چیزوں کو اپنا لیا تھا، جن سے انھیں اپنی برتری اور فضیلت کا اظہار اور تعلی و غرور کا اعلان مقصود تھا۔ وہ اس نوع کے اعمال کا مظاہرہ کرتے تھے جن کا مفاد یہ تھا کہ وہ اللہ سے کوئی خاص وابستگی اور گہرا رابطہ رکھتے ہیں اور ان کا اللہ سے علاقہ (نعوذ باللہ) اس کے اہلِ بیت اور حرم کا سا ہے۔ مناسکِ حج میں وہ اپنا مقام و وقوف بھی عام لوگوں سے علیحدہ رکھتے تھے۔ اسلام نے ان کے ان خود ساختہ ممیزات و مستثنیات کو بالکل ختم کر دیا اور فرمایا:

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ (البقرہ: ۱۹۹)

تم وہیں سے لوٹو جہاں سے عام لوگ لوٹتے ہیں۔

اسی طرح جب وہ لوگ منیٰ کے مقام میں جمع ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر و شغل سے بے نیاز ہو کر اپنے آباو اجداد اور خاندان کے فخر و مباہات کے قصے بیان کرنا شروع کر دیتے اور اپنی بسالت و شجاعت کے افسانے بلند آہنگی سے سناتے۔ قرآنِ مجید نے ان کو پورے زور سے ان حرکات سے روک دیا اور فرمایا:

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (البقرہ: ۲۰۰)

یعنی جب تم مناسکِ حج ادا کر چکو اور منیٰ میں لوٹ آؤ تو اللہ تعالیٰ کو اسی طرح یاد کرو، جس طرح اپنے آبا و اجداد کو یاد کرتے ہو، بلکہ اللہ کا ذکر اس سے بھی بڑھ کر کرو۔

قریشِ مکہ نے بدعات و رسوم کو مناسکِ حج میں اس اہتمام سے داخل کر لیا تھا کہ ظہورِ اسلام کے بعد خود مسلمان بھی بعض مناسک کی ادائیگی میں شبہے کا شکار ہو گئے اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کو بھی انھوں نے مشرکین ہی کی ایک رسم سمجھ لیا۔ یہ شبہ اس لیے پیدا ہوا کہ عہدِ جاہلیت میں مشرکین نے صفا اور مروہ (دو پہاڑیوں) پر دو بت نصب کر رکھے تھے، ایک بت کا نام "اساف"

تھا اور دوسرے کا نام نائلہ"۔ جب مشرکینِ عرب صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے تو ان بتوں کا استلام بھی کرتے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ یہ سعی محض دورِ جاہلیت کی ایک رسم ہے۔ قرآنِ مجید نے مسلمانوں کے اس شبہے کا ازالہ کیا اور فرمایا:

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ (البقرہ: ۱۵۸)

یعنی اس سلسلے میں کسی قسم کے شک اور شبہے میں مبتلا نہ ہو جاؤ، صفا اور مروہ کے درمیان سعی تو اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں مشرکین نے اور بھی بہت سی چیزیں رسومِ حج میں شریک کر لی تھیں اور ان پر عمل کو ضروری قرار دے لیا تھا۔ لیکن یہ چیزیں چونکہ ذہنی، روحانی اور جسمانی طور پر اذیت رساں اور تکلیف دہ تھیں، اس لیے اسلام نے پوری سختی سے ان کو ختم کر دیا۔ مثلاً ان کا یہ نقطۂ نظر تھا کہ جب کوئی شخص حج کا احرام باندھ لے، اور پھر کسی ضروری کام سے گھر جانا چاہے تو سیدھے دروازے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا، اسے دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہونا چاہیے۔ اسلام نے اس نقطۂ نظر کا ابطال کیا اور فرمایا:

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا (البقرہ: ۱۸۹)

یعنی یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم گھروں کے پیچھے کی طرف سے دیواریں پھاند کر اندر آؤ۔

ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ حج کے دوران میں خرید و فروخت اور تجارتی کاروبار کلیتہً حرام ہے، اس سے نیکی کا داعیہ مجروح ہوتا ہے اور جذبۂ اخلاص پر ضرب پڑتی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ عملِ حج کو دنیوی امور سے ہرگز ملوث نہ کیا جائے ـــــ لیکن اس صورتِ حال سے چوں کہ کاروبار بند ہو جاتے تھے اور حوائجِ انسانیہ کے حصول میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی، اس لیے شریعتِ اسلامی نے مشرکین کے اس نقطۂ نظر کا بھی خاتمہ کر دیا اور صاف لفظوں میں فرمایا:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (البقرہ: ۱۹۸)

یعنی اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم ایامِ حج میں تجارت کرو، تلاشِ رزق تو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ اس سے کیوں رکتے ہو۔

اسی طرح مشرکینِ عرب سفرِ حج میں زادِ راہ ساتھ لے کر جانے کو خلافِ تقویٰ سمجھتے تھے اور

حج میں تہی دامن رہنے کو بہت بڑی نیکی تصور کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ دورانِ حج میں بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو جاتے اور ضروریات کے حصول میں سخت تکلیفوں سے دوچار ہو جاتے۔ پھر بات یہاں تک پہنچ جاتی کہ وہ باشندگانِ مکہ کے سامنے دست سوال دراز کرتے اور اپنی ضروریات کے حصول کے لیے ان کے دروازوں پر دستک دیتے۔ اس بھیک مانگنے سے ان کو شریعتِ اسلامی نے روک دیا اور حکم جاری فرمایا کہ زادِ راہ نہایت ضروری ہے۔ ارشاد ہوا:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی ز (البقرہ: ۱۹۷)

یعنی حج کو جاؤ تو زادِ راہ اور سفر خرچ ساتھ لے کر چلو۔ بلاشبہ اچھا سفر خرچ یہی ہے کہ آدمی سوال کرنے سے بچ جائے۔

اس قسم کی متعدد رسوم و عوائد کو مشرکینِ عرب نے حج میں شامل کر رکھا تھا، لیکن شریعتِ اسلامی نے مسلمانوں کو ان سے پوری شدت سے منع فرمایا اور جو عقائدِ باطلہ ان کے اندر راسخ ہو چکے تھے، ان سے قطعاً روک دیا۔

شریعت نے مسلمان کے آرام و آسائش کا حد درجہ خیال رکھا ہے۔ حج کی فرضیت بھی اس لیے زندگی بھر میں ایک ہی دفعہ قرار دی ہے۔ اس لیے کہ بار بار سفر کرنا اور دور دراز کی مسافت طے کرنا، جنگلوں اور پہاڑوں کو قطع کرنا، سمندروں کو عبور کرنا اور بحر و بر میں چلنا انتہائی دشوار ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا حج ہر سال کرنا چاہیے؟ آنحضرتؐ خاموش رہے۔ صحابی نے تین مرتبہ اس سوال کو دہرایا، آنحضرتؐ نے فرمایا، اگر میں تمھارے سوال کے جواب میں "ہاں" کہہ دیتا تو تم پر ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا اور تم اس فرض کی ادائیگی سے عہدہ برآ نہ ہو سکتے۔

حج کی فضیلت میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ تمام اعمال سے افضل عمل کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانا۔ اس نے عرض کیا، اس کے بعد؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا اللہ کے دین کی حمایت و نصرت میں جہاد کرنا۔ اس نے کہا اس کے

بعد ؟ آپ نے فرمایا۔ حج مبرور

اس حدیث میں حج کو تیسرا درجہ دیا گیا ہے، جب کہ بعض احادیث میں اسے افضل الاعمال ٹھہرایا گیا ہے۔ اس پر یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اس مسئلے میں تضاد یا تخالف ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اختلافِ مواقع اور اختلافِ حیثیت سے احکامِ شریعت بھی متاثر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایک عمل اوّلین درجے میں آجاتا ہے اور بعض اوقات اس کی حیثیت ثانوی ہوجاتی ہے، اور ایک کا ترک اور دوسرے کا ارتکاب، اختلافِ ماحول اور اختلافِ موقع وحیثیت کے مطابق لازمی اور ضروری ہوجاتا ہے۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عمداً کسی امرِ دین کا ترک اور رکنِ اسلام کی عدم ادائیگی اللہ کے نزدیک قابلِ مواخذہ ہے اور یہ بات دائرۂ اسلام سے خروج کا باعث بن سکتی ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص صاحبِ نصاب ہو، لیکن حج نہ کرے اور مر جائے، اس کی موت اور ایک یہودی اور عیسائی کی موت میں کوئی فرق نہیں۔

حج کا مطلب یہ ہے کہ انسان نفسانی لذات کو ترک کردے، تجمل و آرائش کے سروسامان کو تیاگ دے اور فقط اللہ کی خوشنودی و رضا جوئی اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور اطاعت شعاری میں منہمک ہوجائے۔ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور اس حالت میں پیش کرے کہ احرام باندھے ہوئے ہے، زبان سے تحمید و تلبیہ کا وِرد جاری ہے، لباس اتنا مختصر ہے کہ جس سے سترِ عورت ہی ہوسکے، برہنہ سر ہے، دنیوی جاہ و جلال اور مادی شان و شکوہ سے قطعاً بے نیاز ہے۔ مشاغل و تفریحات سے دور اور خواہشاتِ نفسانیہ سے بے زار ہے۔ یہاں تک کہ کُرتا اور پاجامہ بھی نہیں پہنا ہے۔ صرف ایک چادر ہے جس سے احرام باندھ رکھا ہے۔

ایک مسلمان کی یہ کیفیت اللہ کے نزدیک خشوع و خضوع، تذلل و انکسار اور انقیاد و تواضع کی آخری دلیل ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر موزے پہنے ہوئے تھے تو اتار دیے ہیں، خوشبو لگائی ہوئی تھی تو تین مرتبہ دھو ڈالی ہے، تاکہ اس کا ادنیٰ نشان بھی باقی نہ رہے، اگر جُبّہ پہنا ہوا تھا تو اتار دیا ہے۔ غرض سب لوگ ایک ہی لباس، ایک ہی زبان اور ایک ہی ہیئت میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا

اور تلبیہ میں مشغول اور مناسکِ حج ادا کرنے میں مصروف ہیں ــــ غور فرمایئے اس سے زیادہ مسلمانوں میں وحدت و مرکزیت پیدا کرنے اور اتحادِ فکر و عمل کی دعوت دینے کا اور کیا مؤثر ذریعہ ہو سکتا ہے۔

حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں مختلف رنگوں، نسلوں اور ملکوں کے لوگوں کا عظیم مجمع ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ ایک ہی طرف کا رخ کرتے ہیں اور جدھر کو جانا ہوتا ہے، ایک ہی وضع اور ایک ہی شکل و ہیئت میں سب لوگ چل دیتے ہیں۔ تاکہ اللہ کے احکام کی بجا آوری اور اس کے اوامر کی انجام دہی میں سرمو فرق نہ آئے ــــ یہ دنیا کے مختلف اطراف و اکناف سے آئے ہوئے لوگ اپنے اپنے میقاتِ حج سے احرام باندھ کر آئے ہیں۔ یہ عرفات میں جاتے ہیں، منیٰ میں اترتے ہیں، صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں، بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، حجرِ اسود کی تقبیل کرتے ہیں اور ہر جگہ بارگاہِ خداوندی میں اطاعت شعاری کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ بندگانِ خدا ہر قسم کے فخر و مباہات سے پاک اور دنیوی شان و اعزاز کے تمام جذبات سے مبرّہ اور بالا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر ان کا محبوب مشغلہ اور اس کی عظمت و جلالت کا اظہار ان کا مطمحِ نظر ہے

تہافۃ الفلاسفہ

تلخیص و تفہیم :- مولانا محمد حنیف ندوی

امام غزالی کی مشہور کتاب تہافۃ الفلاسفہ اور اس کے جواب میں ابن رُشد کی تہافۃ التہافہ کو اسلامی عقائد و افکار میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ مولانا ندوی نے ایک تو تہافۃ الفلاسفہ کی اس تلخیص و تفہیم میں غزالی کے تنقیدی شاہ کار و افکار کو شگفتہ اور رواں دواں اردو میں پیش کیا ہے، دوسرے ایک طویل مقدمہ سپردِ قلم کیا ہے جس میں غزالی اور ابنِ رُشد کے خیالات و افکار کا جچا تلا محاکمہ کیا گیا ہے۔ اسلامی فلسفے کے موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک نہایت قیمتی دستاویز ہے۔

صفحات ۲۲۸ قیمت ۲۰ روپے

ملنے کا پتا :- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

جناب عطش درانی

طبیعیات میں مسلمانوں کے اضافے

تاریخ سائنس کے ایک عام قاری کے نزدیک آج یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سائنس کو تحقیقی و تجربی بنیادوں پر استوار کرنے کا کام سب سے پہلے مسلمان سائنس دانوں ہی نے انجام دیا تھا اور یوں سائنس کی ترقی میں بہت اہم حصہ لیا تھا۔ جارج سارٹن نے جسے تاریخ سائنس کے بانی کی حیثیت حاصل ہے، مسلمانوں کی ان خدمات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ۱۵ جولائی ۱۹۶۱ء کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں تاریخ سائنس پر ایک اہم مذاکرہ منعقد ہوا تھا، جس میں دنیا بھر کے ماہرین علوم نے جمع ہو کر مقالات پڑھے۔ خصوصاً یروشلم کی عبرانی یونیورسٹی کے پروفیسر ایس پائنز کا مقالہ "عربی سائنس میں کیا شے اصلی ہے" بے حد اہمیت اختیار کر گیا، جس میں انھوں نے تجربی طریق کا ماخذ مسلمان سائنس دانوں کو قرار دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ جدید سائنس خصوصاً طبیعیات کی بنیاد تجربی طریق پر رکھی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید سائنس کی بنیادیں مسلمان سائنس دانوں ہی نے رکھی تھیں۔

اگر ہم تاریخ کی روشنی میں دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ قدیم بابل اور مصر کی سائنس اوہام اور دیومالا کی بھینٹ چڑھ گئی تھی اور قدیم یونانیوں کے ہاں سائنس فلسفے کا ایک حصہ بنی رہی تھی۔ حتیٰ کہ افلاطون اور فیثاغورس جیسے مفکرین تو قدیم اوہام اور مذہبی تصورات سے بھی پیچھا نہ چھڑا سکے تھے اور ارسطو "طبیعیات" کی کتاب لکھ کر فارغ ہو گیا تھا لیکن اس نے تجربہ ایک بھی نہ کیا تھا۔

پوری یونانی تاریخ میں بیس دو سے زیادہ تجربات نہیں ملتے، وہ بھی خصوصاً طبیعیات کے میدان میں ہیں، ایک تو فیثاغورس کا تجربہ جس میں تانت کی تھرتھراہٹ معلوم کی گئی، دوسرے بطلیموس کا انعطاف نور کا پتا چلانے کا طریقہ۔

یونانیوں کی علمی تگ و دو صرف نتائج اخذ کرنے اور نظریاتی طریقے معلوم کرنے تک محدود

تھی۔ تحقیق کے صحیح طریقے، معلومات کی معروضی فراہمی، تفصیلی اور دیرپا مشاہدات اور تجرباتی طریق یونانی مزاج کے منافی تھا۔

طبیعیات کے میدان میں مسلمانوں کی خدمات کا پتا چلانے سے قبل ہمیں ایک نظر قدیم طبیعیات اور اس کی تاریخ پر ڈالنا لازم ہے تاکہ تقابلی جائزہ لینے میں آسانی رہے۔

قدیم انسان نے سب سے پہلا طبعی تجربہ جو کیا تھا وہ چقماق کے ذریعے آگ پیدا کرنا تھا۔ لیکن وہ اس کی علت کا ادراک حاصل نہ کر سکا تھا۔ چنانچہ طبعی میدان میں سب سے پہلے یونان کا ایک طبیعیات دان انکسی مینس ہمارے سامنے آتا ہے، جس نے کچھ کام کیا، لیکن ان کا تفصیلی جائزہ ہمارے سامنے نہیں۔ اس کے بعد فیثاغورس آتا ہے، جس نے تار کی تھرتھراہٹ اور لچک میں تعلق ظاہر کیا۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں ایک یونانی مفکر اینکساغورس نے پہلی بار قانون بقائے مادہ پیش کیا۔ اسی دور میں ایک اور مفکر ڈیمقراطیس نے کائنات کی تعمیر میں جوہریت کا نظریہ پیش کیا، اس کے نزدیک مادہ چھوٹے چھوٹے ذرات "ایٹم" سے مل کر بنا ہے جو ناقابل تقسیم ہیں۔ فیثاغورس کے نظریے کو آگے بڑھانے میں افلاطون نے خاصا کردار ادا کیا۔ اس نے آواز پیدا ہونے کا سبب ہوا میں لہروں کا بننا قرار دیا جو کان کے پردے پر اسی طرح تھرتھراہٹ پیدا کرتی ہیں، جس طرح ہوا کا منبع ہوا میں پیدا کرتا ہے۔

ارسطو کی طبیعیات دانی کا یہ حال تھا کہ وہ خلا کے وجود سے انکار کرتا رہا۔ اس نے میکانیات کے میدان میں حرکت اور قوت کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے نزدیک کسی جسم کی رفتار اس پر لگائی گئی قوت کے متناسب اور اس واسطے کی مزاحمت کا معکوس ہوتی ہے، جس میں جسم حرکت کر رہا ہو۔ گویا اگر واسطے کی مزاحمت صفر ہو تو رفتار لامحدود ہوگی، مگر ارسطو کے خیال میں کسی جسم کی رفتار لامحدود نہیں ہو سکتی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بھی واسطہ عنصر مزاحمت سے پاک نہیں ہو سکتا، یعنی خلا کا وجود نہیں ہے۔ اس سے ایک سوال پیدا ہوا تھا کہ جب کوئی شے پھینکی جاتی ہے تو وہ ایک عرصے تک حرکت میں کیوں کر رہتی ہے، جب کہ اسے حرکت کے لیے مسلسل قوت کی ضرورت ہے۔ ارسطو نے اس کا جواب یوں دیا کہ شے کے حرکت کرنے میں ہوا مزاحم ہوتی ہے لیکن فوراً کٹ کر پیچھے آجاتی ہے اور شے کو آگے کی طرف دھکیلتی ہے۔ یہ تھی دنیا کے اس سب

سے بڑے سائنس داں کی طبیعیات دانی۔

یونانیوں کے بعد اہلِ روما کے ہاں صرف ایک سائنس داں ارشمیدس ہی ایسا سامنے آتا ہے، جسے حقیقی طبیعیات داں کہا جا سکتا ہے۔ اس نے طبیعیات کے نئے نئے قوانین وضع کیے اور چند اہم ایجادیں بھی کیں۔ اس نے سکون و حرکت اور آب پیمائی کے علوم کی بنیادیں رکھیں۔ لیور کے اصول، کثافت کا اصول، وزن مخصوص کا تصور وغیرہ پیش کیے اور پانی کھینچنے کا ایک پمپ ایجاد کیا جسے ارشمیدس کا پیچ کہتے ہیں۔ ارشمیدس کا اصولِ کثافت کہ پانی میں کسی شے کا وزن اس کے حجم کے برابر پانی کے وزن کے برابر کم ہو جاتا ہے، آج بھی مستعمل ہے

اسلامی دَور کے آغاز تک طبیعیات نے صرف یہاں تک ترقی کی تھی۔ عملی تجربات کی عدم موجودگی اور میکانیات جیسے موضوع کو کم تر سمجھے جانے کے باعث طبیعیات آگے نہ بڑھ سکی۔ جب مسلمانوں نے تجربی علم کا آغاز کیا اور مشاہدے اور تجربے کو کسوٹی قرار دیا تو طبیعیات کو بھی فروغ حاصل ہوا اور اس میں کماحقہٗ اضافے ہوئے۔

مسلمان سائنس دانوں میں ہمیں سند بن علی، محمد بن موسیٰ بن شاکر، یعقوب الکندی، ابو نصر فارابی، ابن زکریا رازی، ابن سینا، ابن الہیثم، البیرونی، ابن رشد، الخزینی، ابوالبرکات البغدادی، مظفر بن اسماعیل الفزاری اور ابن باجہ جیسے ممتاز طبیعیات داں ملتے ہیں، جنھوں نے طبیعیات کی مختلف شاخوں پر اس قدر کام کیا کہ آج کل بھی طبیعیات کے میدان میں ان کے وضع کردہ اصول بہت کم رد و بدل کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان سائنس دانوں نے میکانیات، ساکنیات، مادے کے خواص، وزنِ مخصوص، کثافتِ اضافی، خلائیات، حرارت، روشنی، آواز، برق اور مقناطیسیت کے میدانوں کے بیش قابلِ فخر اضافے کیے۔

میکانیات پر کام کرنے والے مسلمان سائنس دانوں کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں، لیکن انھوں نے جس قدر کام کیا، وہ تاریخ سائنس میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اسلامی دور کا یہ علم محض یونانی میراث نہیں تھا۔ بلکہ نظریات کے ساتھ ایجادات و اختراعات کے میدان میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ ۹۰۰ء کے بعد سے نظریاتی اور عملی میکانیات میں خاصی ترقی ہوئی۔ اس کے نتیجے میں پہیے، گھرے، پھرکی، لیور، دندانہ دار پہیے اور پن چکی پر بہت زیادہ اور مفید کام ہوا۔

قوت اور حرکت کے باب میں ابن سینا کے نظریات بہت اہم ہیں - وہ پہلا شخص ہے، جس نے حرکت و قوت پر باقاعدہ تجرباتی تحقیق کی۔ اس کے نزدیک قوت ایک قسم کی توانائی ہے جو عارضی طور پر کسی متحرک جسم کے اندر منتقل ہوتی ہے - اگر کوئی جسم ایک بار حرکت میں آجائے تو پھر وہ لامتناہی طور پر حرکت میں رہے گا۔ بشرطیکہ اس کی راہ میں کوئی مزاحمت موجود نہ ہو۔ وہ حرکت کا مقداری تعلق یا رابطہ کمیت بھی تلاش کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی جسم ایک مفید قوت سے حرکت میں آئے گا تو اس کی سرعت اس کے میل قسری یعنی وزن سے معکوس نسبت کی حامل ہوگی اور ایسے جسم کی طے کردہ مسافت جو مقرر اور مستقل سرعت سے حرکت کر رہی ہو، براہِ راست اپنے وزن کے ساتھ متناسب ہوگی۔ ابن سینا کا میلِ قسری وہی شے ہے جیسے دورِ جدید میں مومینٹم کہا جاتا ہے۔

ابن سینا کے نظریے کو اس کے معاصر ابوالبرکات البغدادی نے مزید واضح کیا اور تجربہ گاہ میں دیگر مبتدل عناصر پر بھی نگاہ رکھنے کے لیے کہا جو کسی بھی علت میں شامل ہوتے ہیں۔

ابنِ باجہ حرکت کے باب میں ایک اور ہی نظریہ پیش کرتا ہے - ای سی کرد بھی لکھتا ہے کہ اس کے نزدیک کوئی بھی جسم ایک وقت میں لامتناہی رفتار حاصل نہیں کر سکتا خواہ وہاں کوئی مزاحمت بالکل ہی معدوم ہو۔ کیونکہ جسم کو ایک فاصلہ طے کرنا ہوتا ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ جسم کسی معینہ رفتار ہی سے حرکت کرے گا۔

کشش ثقل کا نظریہ سب سے پہلے ہمارے سامنے ابوبکر زکریا الرازی پیش کرتا ہے۔ اپنی کتاب "رسالۃ فی غروب الشمس و حرکت الارض" میں رازی بتاتا ہے کہ ساری کائنات ایک خاص ترکیب سے قائم ہے - اس نے بتایا کہ فضا میں زمین کشش باہمی کے سہارے معلق ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ابنِ مسکویہ نے بھی عالمگیر کشش باہمی کے اس نظریے کو دہرایا۔ نیز اس نے سمندر میں مدوجزر کی توجیہہ کرتے ہوئے کہا کہ ایسا چاند کی کشش سے ہوتا ہے۔

میکانیات کے موضوع پر سب سے اہم کتاب احمد بن موسیٰ کی "فرسطون" ہے، جو اپنے بھائیوں حسن اور محمد بن موسیٰ وغیرہ کے ساتھ مامون الرشید کے عہد کا ایک اہم انجینئر تھا۔ ابنِ ندیم اور سارٹن نے "فرسطون" کی کتاب کو تمام بھائیوں کی تصنیف ظاہر کیا ہے، لیکن گمان غالب ہے کہ

یہ صرف احمد بن موسیٰ کی لکھی ہوئی تھی۔ کیونکہ میزان اور میکانیات صرف اسی کا موضوع تھا اور دوسرے بھائیوں حسن بن موسیٰ کو جیومیٹری اور محمد بن موسیٰ کو اقلیدس اور منطق سے شغف تھا۔ اس موضوع پر ایک اور کتاب الخزینی کی "المیزان" ہے، جو میکانیات کے ساتھ ساتھ ماسکونیات (ہائیڈرو سٹیٹکس) کے موضوع کا احاطہ بھی کرتی تھی۔

ماسکونیات کے میدان میں ہمارے سامنے سب سے پہلے سند بن علی آتے ہیں، جنھوں نے پانی کو معیار مقرر کر کے نہایت صحیح طریقے پر ہر دھات کے متعلق معلوم کیا کہ وہ کتنے گنا بھاری ہے یعنی اس کی کثافتِ اضافی یا وزنِ مخصوص معلوم کیا۔ بنو موسیٰ میں سے محمد بن موسیٰ کو اس موضوع سے خصوصی دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس نے انتہائی حساس اور صحیح وزن کرنے والا ماسکونی ترازو ایجاد کیا تھا۔ سارٹن لکھتا ہے کہ ابوبکر زکریا الرازی نے بھی ایک ماسکونی میزان کی مدد سے جسے وہ خود میزان الطبیعی کا نام دیتا ہے، وزن مخصوص میں کچھ تحقیقات کی تھیں۔ اس روایت کو البیرونی نے برقرار رکھا اور ۱۸ جواہرات و فلزات کی کثافت کا اندازہ کمالِ صحت سے کیا۔ ان کی آج تک تردید نہیں ہو سکی۔ البیرونی ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ پانی ہمیشہ اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔ اسی نے پہلی بار بتایا کہ قدرتی چشمے اور شہری نلیوں میں پانی عام سطح سے زیادہ کیوں چڑھ آتا ہے۔ البیرونی نے مائعات کی کثافت اضافی بھی معلوم کی تھی، نیز ان کی تپش کا اندازہ بذریعہ آب پیما کیا۔ نیز اس نے یہ بھی بتایا کہ گہرائی کے ساتھ ساتھ پانی کا دباؤ بھی بڑھتا ہے۔ الخزینی جیسے سائنس دان نے بھی صحیح وزن معلوم کرنے، کثافتوں کے تعین، زمین پیمائی کے اصول اور تیرنے کے اصول بیان کیے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ وزن کرتے وقت درجہ حرارت کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا اثر وزن مخصوص پر پڑتا ہے۔ مظفر اسفرازی نے بھی ایک ماسکونی ترازو تیار کیا تھا، جس کے ذریعے سونے کی اشیا میں ملاوٹ کا پتا چل جاتا تھا۔ اس کے ذریعے کسی شے کا عام وزن اور پانی میں وزن بھی معلوم کیا جاتا تھا۔

مادے کے خواص پر مسلمان سائنس دانوں نے خاصا کام کیا۔ جابر بن حیان پہلا مسلمان سائنس دان ہے جس نے مادے کو عناصر اربعہ کے نظریے سے نکالا۔ اس کا نظریہ تھا کہ مادی دنیا میں ایک ضابطہ کارفرما ہے۔ اس کی کتاب "الموازین" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جدید جوہری نظریے کا قائل تھا۔ اس نے خاصیتوں کے لحاظ سے مادے کو تین گروہوں ٹھوس، مائع اور گیس میں تقسیم کیا

تھا۔ "اخوان الصفا" کے گروہ نے اشیا کو دو اہم گروہوں اجسام اور ارواح میں تقسیم کر رکھا تھا۔ زکریا الرازی کے نزدیک مادہ جوہروں پر مشتمل ہے۔ یہ جوہر مختلف تعداد اور انداز میں باہم مل کر مختلف عناصر کی تشکیل کرتے ہیں۔ گویا وہ دورِ جدید کے پروٹون اور نیوٹرون وغیرہ کی پیش بینی کر رہا تھا۔

خلائیات کے ضمن میں ابن سینا اور البیرونی بے حد اہم ہیں۔ انھوں نے ارسطو کے نظریے کی تردید کرتے ہوئے خلا کے وجود کا اثبات کیا۔ ابن سینا نے اپنے نظریۂ حرکت کے ضمن میں خلا کے وجود کو ثابت کیا تھا اور البیرونی نے ریاضیاتی اور تجربی طریق کے باہم استعمال کے بعد خلا کے وجود کو ناگزیر قرار دیا تھا۔ بعد ازاں فخر الدین رازی اور نصیر الدین محقق طوسی نے اس موضوع پر مزید تحقیقات کیں، جن کا بالاستیعاب مطالعہ ضروری ہے۔

روشنی یا بصریات پر مسلمان سائنس دانوں نے بہت کام کیا۔ ابن سینا نے روشنی کی ماہیت کا ذکر کرتے ہوئے اسے ایسے ذروں پر مشتمل قرار دیا جو نور افشاں ذروں سے نکلتے ہیں۔ اس کے نزدیک روشنی ایک طرح کی توانائی ہے جو حرارت سے مشابہ ہے۔ وہ نظریۂ امواجِ نور کا بھی قائل تھا۔ اس کے نزدیک روشنی کی ایک خاص رفتار ہے جو متعین اور یکساں ہے۔ نظریۂ بصر اور تشریحِ چشم کے وقت وہ بیان کرتا ہے کہ روشنی باہر سے آنکھ میں آتی ہے اور اسی وقت روشنی دینے والی شے کے رخ ایک نفسیاتی عمل ظہور میں آتا ہے۔ ای سی کروجی نے ابن سینا کو جدید بصریات کا پیش رو ٹھہرایا ہے۔

البیرونی نے بھی روشنی کے موضوع پر قابلِ قدر تحقیقات کیں۔ سارٹن لکھتا ہے کہ البیرونی اس امر کا مشاہدہ کر چکا تھا کہ روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے تیز تر ہوتی ہے۔ اتنی تیز کہ دونوں کا باہم کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ نیز اس نے گرہن کی صحیح ترین توجیہہ بھی کی۔ اس عمل کا ذکر ہمیں امام غزالی کی "احیاء العلوم" میں بھی ملتا ہے۔ مولانا شبلی نے اس کا ذکر کیا ہے کہ امام غزالی اس قسم کی تحقیقات کے حامی تھے۔

بصریات کے باوا آدم کے طور پر ابن الہیثم ہمارے سامنے آتا ہے۔ مسلمان سائنس دانوں میں اس نے سب سے زیادہ اس موضوع پر کام کیا۔ اس کے بنائے ہوئے اصول آج بھی اسی طرح موجود

ہیں جنھیں دورِ جدید میں ہالینڈ کے سنیل سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

ابن الہیثم کے نزدیک نورافشاں یا روشن جسم وہ ہوتا ہے جو خود روشنی مہیا کر رہا ہو۔ ایسے جسام کی مثال میں وہ سورج، ستاروں اور چراغ کا نام لیتا ہے۔ روشنی وصول کرنے والی اشیا کی وہ تین اقسام بیان کرتا ہے۔ (۱) شفاف (۲) نیم شفاف (۳) غیر شفاف۔ ان میں شفاف وہ شے ہے جس میں سے روشنی بآسانی گزر سکے اور دوسری طرف کے اجسام بخوبی نظر آسکیں۔ مثلاً ہوا، پانی اور شیشہ۔ اور نیم شفاف وہ شے ہے، جس میں سے کچھ روشنی گزر سکے اور کچھ رک جائے مثلاً باریک کپڑا۔ غیر شفاف شے کی تعریف وہ یوں کرتا ہے کہ جس شے میں سے روشنی بالکل نہ گزر سکے اور دوسری طرف کا کوئی جسم اس میں سے بالکل نظر نہ آئے۔

روشنی کی شعاع کی تعریف کرتے ہوئے ابن الہیثم بیان کرتا ہے کہ وہ جو ایک خط کی صورت میں ہو۔ اس کے بعد وہ بتاتا ہے کہ روشنی ہمیشہ خطِ مستقیم میں چلتی ہے بشرطیکہ اس کا واسطہ ایک ہو۔

ابن الہیثم سوئی چھید کیمرے کے عمل سے بھی واقف تھا۔ اس کے نزدیک روشنی کی شعاعیں جب ایک سوراخ میں سے گزرتی ہیں تو دوسری طرف رکھے ہوئے پردے پر اُلٹا اثر ڈالتی ہیں۔ اس ضمن میں وہ شمع کے شعلے کا تجربہ بیان کرتا ہے۔

بصریات اور تشریحِ چشم کے ضمن میں وہ لکھتا ہے کہ جب روشنی کسی جسیم شے پر پڑنے کے بعد منعکس ہو کر آنکھ کی پتلی پر پڑتی ہے تو وہ شے ہمیں نظر آتی ہے۔ اس کے نزدیک آنکھ کے اندر سوئی چھید کیمرے کا عمل ہوتا ہے۔ روشنی کی شعاعیں آنکھ کے اندر ایک نقطے پر پڑتی ہیں جہاں شے کا عکس بنتا ہے جو اُلٹا ہوتا ہے۔ اس عکس کو دماغ محسوس کر لیتا ہے، اس کے نزدیک آنکھوں کی دونوں پتلیاں ایک ہی تناسب میں واقع ہوئی ہیں، اس لیے دو آنکھوں میں بننے والے دو عکسوں کے باوجود دماغ ایک ہی تصور قائم کرتا ہے۔

انعکاسِ نور کے باب میں ابن الہیثم بتاتا ہے کہ جب روشنی کی شعاعیں کسی شفاف سطح پر پڑتی ہیں تو وہ منعکس ہو کر واپس پلٹ آتی ہیں۔ اس سلسلے میں اس نے مشہورِ زمانہ دو قوانین وضع کیے۔ پہلا قانون یہ ہے کہ شعاعِ وقوع، شعاعِ انعکاس اور ان کے مرکزِ ملاپ پر گرائے جانے والا عمودی خط ایک ہی سطح میں پائے جاتے ہیں۔ دوسرا قانون یہ ہے کہ زاویہ وقوع اور زاویہ انعکاس

آپس میں برابر ہوتے ہیں۔ ان اصولوں کے لیے اس نے تجربہ بھی پیش کیا۔

انعطافِ نور کے بارے میں ابن الہیثم کے قوانین بھی آج تک ہمارے نصاب میں شامل ہیں۔ ابن الہیثم لکھتا ہے کہ جب روشنی کسی لطیف شے مثلاً ہوا سے کسی کثیف شے مثلاً پانی میں داخل ہوتی ہے تو وہ اپنی راہ سے ہٹ جاتی ہے اور عمود کے نچلے حصے کی طرف مڑ جاتی ہے۔ اسی طرح جب روشنی کثیف واسطے سے لطیف واسطے میں داخل ہوتی ہے تو عمود سے پرے ہٹ جاتی ہے۔ ان دونوں شعاعوں اور عمودی خط کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ تینوں ایک ہی سطح میں پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ ہوا اور پانی کو دو واسطے ٹھہراتا ہے۔ اگر روشنی ہوا سے پانی میں داخل ہو تو اس کے نزدیک:

۱۔ ہوا کے اندر زاویۂ وقوع پانی کے اندر زاویۂ انعطاف سے بڑا ہوتا ہے۔

۲۔ جب زاویۂ وقوع زیادہ بڑا نہ ہو تو زاویۂ وقوع اور زاویۂ انعطاف کی باہمی نسبت برابر ہوتی ہے۔ ہوا اور پانی کی یہ نسبت $\frac{1}{3}$ ۱ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

۳۔ اگر زاویۂ وقوع ایک حد سے بڑا ہو تو پھر زاویۂ وقوع اور زاویۂ انعطاف کی باہمی نسبت $\frac{1}{3}$ ۱ کے برابر نہیں رہتی۔

ابن الہیثم کا اہم کام کروی آئینوں کے متعلق ہے چنانچہ وہ بیان کرتا ہے کہ جب روشنی کی متوازی شعاعیں کسی مقعر آئینے پر پڑتی ہیں تو وہ منعکس ہو کر ایک خاص نقطۂ ماسکہ (فوکس) میں سے گزرتی ہیں۔ مقعر آئینے میں نقطۂ ماسکہ سے پرے اگر ایک روشن جسم رکھ دیا جائے تو اس کا ایک اُلٹا عکس مقعر آئینے کے سامنے بنتا ہے، جسے پردے پر لیا جا سکتا ہے۔ ابن الہیثم نے شعاعوں کے خطوط کھینچ کر اس عمل کی تشریح بھی کی۔

ابن الہیثم نے مکافی (پیرابولک) آئینے کا ذکر بھی کیا ہے اور اس میں شعاعوں کے منعکس ہونے اور منور جسم کے عکس بننے کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ ان آئینوں کے ضمن میں ابن الہیثم نے یہ بھی بتایا کہ نقطۂ ماسکہ میں سے گزرنے والی شعاعوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی، اتنی ہی زیادہ حرارت نقطے پر پیدا ہوگی۔ ذیل کا مسئلہ ابن الہیثم کے نام سے مشہور ہے۔

" ایک منور نقطہ اور آنکھ کا محل معین ہو تو کروی، سطوانہ نمائی (سلنڈریکل)، یا مخروطی (کونیکل)

آئینے پر ایسا نقطہ دریافت کرنا، جہاں سے انعکاس واقع ہوتا ہے۔

انعطافِ نور کے اصول کی مدد سے ابن الہیثم نے بتایا کہ افق کے قریب اجرامِ سماوی بڑے کیوں نظر آتے ہیں؟ اس نے بتایا کہ کرۂ ارض کے گرد ہوا زمین کے قریب کثیف تر ہے اور اوپر کی فضاؤں میں لطیف تر ہے۔ اس طرح شعاعوں کی راہ میں کئی واسطے پیدا ہوجاتے ہیں، جس سے وہ منعطف ہوجاتی ہیں۔ ابن الہیثم نے یہ بھی بتایا کہ اصل غروبِ آفتاب بہت پہلے ہوجاتا ہے لیکن انعطافِ نور کی وجہ سے سورج ہمیں کچھ دیر تک دکھائی دیتا رہتا ہے۔ اسی طرح سورج اصلی طلوع سے پہلے نظر آنا شروع ہوجاتا ہے۔

اس نے محدب عدسے کا ذکر بھی کیا۔ اس کے نزدیک آنکھ میں پتلی کے پیچھے ایک محدب عدسہ پایا جاتا ہے، جو عکس کو اُلٹا کردیتا ہے۔ محدب عدسے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ اشیا کو بڑا کرکے دکھاتا ہے۔

ابن الہیثم کے بعد ابن رُشد نے روشنی پر قابلِ قدر کام کیا۔ اس نے گرہن کے وقت سورج پر آگ کے بڑے بڑے شعلوں کے مشاہدے اور سطحِ سورج پر بڑے بڑے سیاہ دھبوں کا ذکر کیا اور اُن کی توجیہہ بھی کی۔ تشریحِ چشم کے ضمن میں اس نے پہلی بار ہمیں یہ بتایا کہ آنکھ کے اندر کسی شے کا عکس پتلی پر نہیں بنتا بلکہ اس کے اندر ایک پردۂ شبکیہ ہوتا ہے۔ وہاں یہ عکس اُلٹ بنتا ہے جسے بصری اعصاب سیدھا متصور کرلیتے ہیں۔

روشنی سات رنگوں پر مشتمل ہے، اس کا مشاہدہ تو زمانہ قدیم ہی سے بہت سے سائنس دانوں کو ہوچکا تھا۔ لیکن قوسِ قزح کے عمل کی صحیح ترین توجیہہ تیرھویں صدی میں قطب الدین شیرازی نے کی۔ اس نے بتایا کہ دراصل یہ سورج کی روشنی کے ساتوں رنگوں کا طیف ہے جو آبی بخارات میں سے نظر آتا ہے۔

آواز کے ضمن میں مسلمانوں نے زیادہ تر کام موسیقی کے باب میں کیا۔ یعقوب الکندی پہلا شخص ہے جس نے موسیقی پر سائنسی نقطۂ نظر سے بحث کی۔ موسیقی میں مختلف سُروں کے امتزاج سے نغمے پیدا کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر سُر کا ایک خاص درجہ (Pitch) ہوتا ہے، چنانچہ جس سُر کا درجہ کم ہو وہ کانوں کو بھاری اور جس کا درجہ زیادہ ہو، وہ تیز لگتی ہے۔ کسی سُر کا یہ درجہ اس کے تعدادِ ارتعاش پر منحصر ہوتا ہے یعنی یہ ارتعاش فی سیکنڈ کس قدر ہوتا ہے۔ یعقوب کندی نے ہر سُر کا یہ تعداد بھی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ دوسرا بڑا سائنس دان الفارابی تھا، جس نے سُر اور تال کا باہمی تعلق

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَعِدَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمِنْبَرَ فَنَادٰی بِصَوْتٍ رَفِیْعٍ یَا مَعْشَرَ مَنْ قَدْ اَسْلَمَ بِلِسَانِہٖ وَلَمْ یُفْضِ الْاِیْمَانُ اِلٰی قَلْبِہٖ لَا تُؤْذُوا الْمُسْلِمِیْنَ وَلَا تُعَیِّرُوْھُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِھِمْ فَاِنَّہٗ مَنْ تَتَبَّعَ عَوْرَۃَ اَخِیْہِ الْمُسْلِمِ یَتَتَبَّعُ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ وَمَنْ یَّتَتَبَّعِ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ یَفْضَحْہُ وَلَوْ فِیْ جَوْفِ رَحْلِہٖ ۔ (جامع ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء فی تعظیم المومن)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے اور بلند آواز سے پکارا۔ اے وہ لوگو جو زبان سے ایمان لاتے ہو اور ان کے دلوں میں ابھی پوری طرح ایمان نہیں اترا ہے ـــــ (یہ باتیں یاد رکھو) مسلمانوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ، ان کو کسی معاملے میں عار دلا کر شرم سار نہ کرو، ان کے چھپے ہوئے عیبوں کے پیچھے نہ پڑو۔ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے پوشیدہ عیبوں [illegible] کا اور اس کو بدنام اور رسوا کرنے کی کوشش کرے گا، اللہ اس کے عیبوں کے پیچھے پڑے گا، اور جس شخص کے عیبوں کے پیچھے اللہ پڑ جائے، وہ اس کو ذلیل اور رسوا کرے گا، اگرچہ اس کی یہ رسوائی اپنے گھر کے اندر ہی ہو ـــــ!

انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے سوا دنیا میں کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو اور جو لغزشوں سے پاک ہو۔ صرف انبیا علیہم السلام کا وہ مقدس گروہ ہے جو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک، تمام تر معصیتوں سے منزہ اور ہر نوع کی خطاؤں سے مبرہ ہے۔ انبیا کے علاوہ دنیا کے کسی شخص کو معصوم قرار نہیں دیا جا سکتا، خطا و لغزش کے ارتکاب سے کوئی بھی محفوظ نہیں۔

لیکن گناہ گاروں اور معصیت و خطا کے مرتکبین کے الگ الگ مدارج ہیں۔ کچھ لوگ تو وہ ہیں جنھوں نے گناہ کیے اور ان پر نہ اڑ گئے، ان سے رکنے کے بجائے مزید مبتلائے معاصی ہوتے

گئے۔ یہ دنیا کے سب سے بُرے لوگ ہیں، انھیں اشرار الناس کہنا چاہیے۔ ان کا احساس مر چکا ہے، ان کے قلب وضمیر کے ہر گوشے سے افسوس وندامت کی رمق کلیتہً ختم ہوگئی ہے، گناہ ان کی طبیعتوں میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ اس کے ارتکاب سے انھیں قطعاً کوئی احساسِ ندامت نہیں ہوتا۔ بلکہ جب تک وہ گناہ نہ کریں انھیں تسلی نہیں ہوتی۔

کچھ لوگ وہ ہیں جن سے بہ تقاضائے بشریت گناہوں کا صدور تو ہوجاتا ہے لیکن وہ ان پر اصرار اور مداومت نہیں کرتے، بلکہ اپنے دل کو ہدفِ ملامت ٹھہراتے اور افسوس و ندامت کے آنسو بہاتے ہیں۔ ان لوگوں کو گناہ سے شدید نفرت ہے اور اُسے وہ نہایت مکروہ شے سمجھتے ہیں۔ جب تک اس کی تلافی نہ ہوجائے اور وہ اس سے توبہ نہ کرلیں، انھیں قرار نہیں آتا۔ گناہ ان کے دل کے سکون کو درہم برہم کردیتے ہیں اور ان کے ذہن وضمیر کا اطمینان اس سے معطل ہوکر رہ جاتا ہے۔ انہی خوش قسمت لوگوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ۔ (اوکما قال)

کہ گناہ گاروں میں سے وہ بہترین لوگ ہیں، جو اپنے گناہوں پر ندامت کے آنسو بہاتے اور اُن سے تائب ہوجاتے ہیں۔

پھر گناہوں کی بھی کوئی حد نہیں ہے، انسان کے چاروں طرف جہاں لاتعداد نیکیاں پھیلی ہوئی ہیں، وہاں گناہوں اور معصیتوں کا بھی شمار نہیں، کسی کو اذیت پہنچانا، بے جا طنز کرنا، اس کے عیوب و نقائص کی ٹوہ میں رہنا اور پھر اُسے بدنام کرنے کی کوشش کرنا، یہ سب باتیں گناہوں کی طویل فہرست میں شامل ہیں۔ لیکن افسوس ہے یہ چیزیں ہماری روزمرہ کی ایک عادت بن گئی ہیں اور بدقسمتی سے ہم بالکل خیال نہیں کرتے کہ ان سے بچ کر رہنا چاہیے۔

اس حدیث میں جو اوپر درج کی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور سے منبر پر چڑھ کر ان تین چیزوں سے سختی کے ساتھ منع فرمایا:

۱۔ مسلمانوں کو ستانے اور تکلیف پہنچانے سے

۲۔ ان کو عار دلانے اور شرمسار کرنے سے —— اور

۴۔ ان کے چھپے ہوئے عیبوں کی ٹوہ لگا کر ان کو فاش کرنے سے

فرمایا یہ قانونِ خداوندی ہے اور کوئی شخص اس کے دائرے سے باہر نہیں کہ جو شخص کسی مسلمان بھائی کے چھپے ہوئے عیبوں کی تلاش میں رہے گا اور اس کو رسوا اور بدنام کرنے کے لیے کوشاں ہوگا، خود اللہ تعالیٰ لوگوں پر اس کے عیوب ظاہر کر دے گا اور کسی کی بدنامی کرنے والا خود ہی بدنام ہو جائے گا، اگرچہ اس کی بدنامی اور رسوائی کا دائرہ محدود ہو اور گھر کی چار دیواری تک ہی ہو، مگر وہ بدنام اور رسوا بہر حال ہوگا۔

یہ قدرتی بات ہے کہ جس شخص کے دل میں ایمان کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں اور وہ اس کے قلب و ضمیر کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے، وہ شخص تمام عیوب اور ہر چھوٹے بڑے گناہ کے ارتکاب سے محفوظ رہنے کی سعی کرتا ہے۔ ایسا شخص دوسروں سے متعلق اظہارِ رائے میں محتاط ہو جاتا ہے اور اس کی نظر صرف اپنے ہی عیبوں کو تلاش کرتی ہے، دوسرے کے عیب کی طرف اس کی نگاہ مرتکز نہیں ہوتی۔ وہ اس حقیقت کو پا لیتا ہے کہ جس قدر اس کا اپنا آئینۂ دل صاف ہوگا اسی قدر اس کی زبان میں اثر، اس کے قلب میں پاکیزگی اور اس کی باتوں میں تاثیر و جاذبیت کی کیفیتیں رونما ہوں گی۔ وہ دوسروں کو بدنام اور ذلیل و رسوا کرنے کے بجائے خود اپنے آپ کو گناہوں سے مجتنب رکھنے کی فکر میں رہے گا۔

اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو ذلیل و شرمندہ کرے گا اور اس کے چھپے ہوئے عیب لوگوں پر ظاہر کرنے کی کوشش میں رہے گا تو اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا کر دے گا کہ وہ خود ہی بدنام ہو اور اس کے عیوب و نقائص عوام کے سامنے آئیں، یعنی جن ہتھیاروں سے وہ دوسروں کو زخمی کرنا چاہتا ہے، خود ہی ان کی زد میں آ جائے گا۔

یہ حدیث معاشرتی اصلاح کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ معاشرتی برائیاں دوسروں کی عیب جوئی کرنے، ان کو روحانی اور جسمانی اذیتوں میں مبتلا کرنے اور ان کو کسی معاملے میں مطعون ٹھہرانے اور شرمسار کرنے ہی سے پیدا ہوتی اور پھیلتی ہیں۔ ایک شخص دوسرے پر الزام لگاتا ہے تو دوسرا اس کے عیبوں کی تلاش میں مصروف ہو جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں فریق آپس میں دشمنی پر اتر آتے ہیں اور باہمی بگاڑ کی ایک واضح شکل سامنے آ جاتی ہے اور پھر روز بروز اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس

[illegible] اور آپس میں اتفاق و اتحاد کی تاکید فرمائی [illegible]

نقد و نظر

امداد الاحکام (جلد اوّل)

تالیف : مولانا ظفر احمد عثمانی و مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلوی

ناشر : مکتبہ دار العلوم، کراچی ۱۴

صفحات ۷۷۴۔ قیمت ساٹھ روپے

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے فتاوے کا مجموعہ "امداد الفتاویٰ" کے نام سے چھ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے جو اصحابِ علم اور اربابِ فتویٰ میں مقبول و متداول ہے۔ زیرِ نظر فتاوے کا مجموعہ بھی جو "امداد الاحکام" کے نام سے موسوم ہے، مولانا تھانوی ہی کے فتاوے پر مشتمل ہے۔ یہ تمام فتاوے خود مولانا تھانوی کی نگرانی میں ان کے دو نیاز مند علمائے دین مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلوی نے تالیف فرمائے۔ اس کتاب کو درحقیقت "امداد الفتاویٰ" کے ضمیمے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ فتاوے کئی رجسٹروں میں تاریخ وار ترتیب سے درج تھے لیکن ان کی فقہی ابواب کے مطابق تبویب نہیں کی گئی تھی۔ نامور عالمِ دین مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم نے مختلف اہلِ علم سے اپنی نگرانی میں ان کی تبویب کرائی۔ اب مولانا تھانوی کے فتاوے کا یہ مجموعہ "امداد الاحکام" کے نام سے دو جلدوں میں مکمل ہے۔ اس کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے اور اس وقت پیشِ نگاہ ہے۔ دوسری جلد کتابت کے مرحلے میں ہے، ان شاء اللہ جلد ہی شائقین کے مطالعہ میں آجائے گی۔ فتاوے کے اس مجموعے کے علاوہ مولانا تھانوی کے اور بھی بہت سے فتوے غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہیں، ان کی طباعت کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔

امداد الاحکام کی جلد اوّل کے شروع میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم کے فرزندِ ارجمند مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی نے ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جس میں اس مجموعے کے بارے میں ضروری تفصیلات بیان کی ہیں، نیز اس کے مؤلفینِ کرام ـــــ مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا مفتی

عبد الکریم گمتھلوی ـــــ کے مختصر سوانح حیات لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ مولانا تھانوی سے یہ حضرات کس قدر قریب تھے اور مولانا ان پر کتنی شفقت فرماتے تھے۔ اس مقدمے میں کتاب کی ترتیب و تصنیف کا پورا پس منظر قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

"امداد الاحکام" ایک شاندار فقہی خدمت ہے۔ اس میں جن مسائل پر بحث کی گئی ہے، وہ یہ ہیں۔

(۱) ایمان و عقائد۔ اس سلسلے میں متعدد ضروری باتیں سوال اور جواب کی صورت میں بیان کی گئی ہیں ـــــ تقلید اور اجتہاد ـــــ سنت اور بدعت ـــــ علم اور اس کے بارے میں بنیادی تفصیلات ـــــ تفسیر ـــــ حدیث اور سنت سے متعلق اہم مباحث ـــــ سلوک و تصوف ذکر، دعا اور تعویذات ـــــ مسائل طہارت ـــــ نماز اور اس کے احکام و مسائل ـــــ نماز جنازہ اور اس کے ضروری مسائل۔

بہرحال "امداد الاحکام" اپنے مباحث و مشمولات کے اعتبار سے ایک اہم فقہی کتاب ہے جو بہت سے فتووں کو اپنے دامنِ صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ فاضل مصنفین نے حوالوں کا باقاعدہ التزام کیا ہے۔ اس قسم کی علمی اور فقہی کتابوں کا مطالعہ معلومات میں اضافے کا موجب ہوتا ہے۔

کتابت، طباعت، کاغذ، جلد عمدہ

انتخابِ حدیث

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

یہ کتاب ان احادیث کا مجموعہ ہے جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے فقہ کی تشکیلِ جدید میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ہر حدیث کی الگ سُرخی قائم کی گئی ہے اور اس کا سلیس ترجمہ بھی درج ہے۔ یہ مجموعہ حدیث کی چودہ کتابوں کا خلاصہ اور بے مثل انتخاب ہے۔

صفحات ۶۸۴ قیمت ۴۵ روپے

ملنے کا پتا:۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

علمی رسائل کے مضامین

البلاغ، بمبئی — اگست، ستمبر ۱۹۸۰ء

زائرینِ حرم — قاضی اطہر مبارک پوری
اسلام اور تجارت — مفتی محمد یٰسین
ہمارا نظامِ تعلیم و تربیت اور اس کے مسائل — مولانا نظام الدین اسیر

البلاغ، کراچی — اکتوبر ۱۹۸۰

بیمہ اور اسلام — حافظ محمد لطیف
حضرت مولانا اسعد اللہ — ایک بلند پایہ ادیب — عتیق احمد قاسمی

ترجمان الحدیث، لاہور — اکتوبر ۱۹۸۰

فریضۂ حج حدیث کے آئینے میں — عبدالستار گوندل
حضرت مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ (مسلسل) — مولانا ارشاد الحق اثری
حضرت مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوریؒ — جناب عبدالرشید عراقی

الحق، اکوڑہ خٹک — اگست ۱۹۸۰

حضرت مجدد الف ثانی اور مارکسی مورخین — ڈاکٹر محمد جمال صدیقی
حضرت عمر فاروقؓ کی عدالت — امام ابوالفرج ابن جوزی۔ ترجمہ: شاہ حسن عطا
وصیتِ امام ابوحنیفہ — اخوند زادہ عبدالکریم
سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طبی ہدایات — حکیم آفتاب احمد قرشی
اصلاح و تزکیۂ نفس — مشائخ و اکابرِ امت کے ملفوظات — مولانا عبدالرشید
یادوں کے چراغ جگمگاتے ہیں — خان غازی کابلی

سب رس، کراچی — اگست ۱۹۸۰

ڈاکٹر سید سجاد کا سوانحی خاکہ — سید شاکر سجاد

فکر و نظر، اسلام آباد — ستمبر ۱۹۸۰

معارف، اعظم گڑھ — ستمبر ۱۹۸۰

دسمبر ۱۹۸۰ء

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف - قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے - بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمہ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقام اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ، لاہور	دین محمدی پریس، لاہور

فون : ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۳ | دسمبر ۱۹۸۰ محرم الحرام ۱۴۰۱ | شمارہ ۱۲

ترتیب

محمد اسحاق بھٹی

تاثرات

گردش لیل و نہار سے ۳۰ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ کو چودھویں صدی ہجری اختتام کو پہنچی اور یکم محرم ۱۴۰۱ھ سے پندرھویں صدی ہجری کا آغاز ہوا۔ ! چودھویں صدی کو اب گزشتہ صدی ہجری ہی کہا جائے گا۔

اس صدی میں اس عالم تغیر و انقلاب کو بے انتہا تخریب سے بھی واسطہ پڑا، اور بے پناہ تعمیر سے بھی آشنا ہونے کے مواقع میسر آئے۔ اس میں دو عظیم جنگیں ہوئیں، جن میں دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں نے پوری طاقت سے حصہ لیا اور اپنی تمام قوتیں ان میں جھونک دیں۔ پہلی جنگ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک چار سال تک جاری رہی۔ اس طویل عرصے میں پورا عالم انسانیت تباہی سے ہم کنار رہا، کئی لاکھ آدمی مارے گئے اور شہروں کے شہر تباہ ہو گئے۔ اس جنگ سے پہلے بھی ایشیا اور افریقہ کے کئی ملک برطانیہ اور فرانس کے قبضے میں تھے، اس کے ختم ہونے کے بعد ان پر مزید مصیبتوں کی یلغار ہوئی اور بعض اور ملک بھی اپنی آزادی کھو بیٹھے اور ان کے حلقۂ غلامی میں آ گئے۔ عالم اسلام کے لیے یہ جنگ بالخصوص کئی قسم کے مصائب کا باعث بنی۔

اسی طرح دوسری جنگ عظیم بھی جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک چھ سال دنیا پر آگ اور خون برساتی رہی، بے حد بربادی کا باعث بنی۔ یہ جنگ بڑی وحشت ناک اور ہولناک تھی۔ اس نے بہت سے آباد علاقوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا، بے شمار شہروں اور قصبوں کو نیست و نابود کر دیا اور اس میں جو انسانی خون بہا اس کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

ان دو عظیم اور عالم گیر جنگوں کے علاوہ اس صدی میں مختلف ملکوں اور علاقوں میں اور بھی کئی جنگیں لڑی گئیں اور دنیا کو وحشت و بربریت کا شکار ہونا پڑا۔ ان تمام جنگوں میں انسانی حرمت و توقیر کو بری طرح پامال کیا گیا، اخلاقی قدروں کی دل کھول کر توہین کی گئی اور جنگ جو قوموں نے ان تمام حربوں سے کام لیا جو کسی صورت میں بھی اپنے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے والوں کی تذلیل و اہانت کا موجب ہو سکے۔

لیکن ان جنگوں کے بعد دنیا میں بے پناہ تعمیری کام بھی ہوا، اور ہر میدان میں ترقی کی نئی سے نئی راہیں وا ہوئیں۔ انسان نے فضا میں اُڑنا سیکھا، چاند تک رسائی حاصل کی، ستاروں پر کمندیں ڈالیں، سورج کی شعاعوں کو مسخر کیا، سمندر کی تسخیر کی اور اس کی تہہ تک پہنچ گیا۔ غرض ترقی کی رفتار نے پوری دنیا کو ایک شہر بنا دیا، اور علومِ گوناگوں کی فتوحات نے انسان کو آسمان تک اچھال دیا۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد زنجیرِ عبودیت تیزی سے ٹوٹنے لگی اور بہت سے ملک انگریزوں اور فرانسیسیوں کی غلامی سے آزاد ہوئے، جن میں افریقہ اور شرقِ اوسط کے ممالک کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ آزادی کی نعمت سے آشنا ہونے والے ان ملکوں میں اسلامی ملک سرِفہرست ہیں۔ چنانچہ اس وقت اسلامی ملکوں کی تعداد چالیس کے قریب ہے، بے شک ان میں بعض ملک آبادی کے لحاظ سے بہت چھوٹے ہیں، مگر اپنی جگہ بہرحال ان کی ایک حیثیت ہے۔

اس صدی میں یہ افسوس ناک حادثہ بھی رونما ہوا کہ برطانیہ اور امریکہ وغیرہ کی سازش سے شرقِ اوسط کے بعض بڑے ملکوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ان کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ یہ دوسروں کے مقابلے میں کمزور ہو جائیں اور آپس میں کسی مسئلے پر متفق نہ ہو سکیں۔

عالمِ اسلام پر ایک بہت بڑا ظلم یہ کیا گیا کہ اس کے عین قلب میں اسرائیل کی حکومت قائم کر دی گئی اور اس کی اس درجے حمایت و اعانت کی گئی کہ اب مسلمانوں کا قبلۂ اول بیت المقدس بھی اس کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ یہ اس صدی کا انتہائی الم ناک حادثہ ہے۔

اسی صدی میں اسلامی ملکوں کو تیل کی دولت بھی میسّر آئی۔ جن ملکوں کے باشندے افلاس اور غربت کی زندگی بسر کرتے تھے، اب وہ سیم و زر سے کھیلنے لگے ہیں۔ ان کی زمین کی تہہ سے زرِ سیال اچھلنے لگا ہے، اور ان کے تپتے ہوئے صحرا سونا اُگل رہے ہیں، ان کی دولت کی فراوانی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ بڑے بڑے ترقی یافتہ ملکوں کے بعض بینک صرف انہی کے سرمائے سے قائم ہیں۔ اگر وہ ان بینکوں سے اپنا سرمایہ نکال لیں تو یہ بینک دیوالیہ ہو جائیں۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ چودھویں صدی کے شروع میں پوری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد سات آٹھ کروڑ سے زیادہ نہ ہوگی، لیکن صدی کے اختتام پر اُن کی تعداد کم و بیش نوّے کروڑ کو پہنچ گئی ہے اور دنیا کے ہر خطے میں ان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بلاشبہ ان میں بعض کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں اور

وہ کمزوریاں بڑی تکلیف دہ اور اذیت رساں بھی ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی ایک موثر آواز ہے۔ ایک عظیم حیثیت ہے اور عالمی سیاست میں ان کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔

اسی صدی میں اقوامِ متحدہ کا وجود عمل میں آیا، جہاں تمام چھوٹے بڑے ملکوں کے نمائندے جمع ہوتے اور بین الاقوامی مسائل پر غور و فکر کے لیے سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں، قراردادیں منظور کرتے ہیں، ایک دوسرے سے مشورے لیتے ہیں اور کسی نہ کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ بلاشبہ ان کی بعض قراردادیں بعض ملک ماننے سے انکار بھی کر دیتے ہیں اور وہ غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہیں، لیکن ایک جگہ بیٹھنا اور اپنے آرا و اختلافات کو بیان کرنا بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ جو ملک کل غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے، آج وہ انہی ملکوں کے برابر بیٹھتے اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں، جن کے وہ غلام تھے۔

اسی صدی میں انگریز کی غلامی سے ہندوستان آزاد ہوا، اور پاکستان کی عظیم اسلامی مملکت معرضِ وجود میں آئی۔ پاکستان کو بحمد اللہ پورے عالمِ اسلام میں عظیم حیثیت حاصل ہے اور وہ ایک خاص نظریے کا حامل ہے، جو دنیا کے تمام نظریوں سے ارفع و اعلیٰ نظریہ ہے، اور وہ ہے، اسلام کا نظریہ۔!

اس صدی میں پوری دنیا میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے سلسلے میں بھی بے حد کام ہوا۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم کی مختلف علمائے کرام نے بڑھ چڑھ کر خدمت کی۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور دنیا میں اس کی نشر و اشاعت کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیا۔ برصغیر پاک و ہند کے علما و فضلا نے اس صدی میں بالخصوص علومِ اسلامی کو مرکزِ تحقیق قرار دیا اور اس موضوع پر تصنیفات کا انبار لگا دیا۔

بہر حال یہ صدی ہمارے لیے بے شمار یادیں اپنے پیچھے چھوڑ کر رخصت ہوئی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ پندرھویں صدی ہجری کو ہم سب کے لیے برکت و سعادت کا ذریعہ بنائے۔

سید افتخار حسین شاہ

اُردو میں کتبِ سیرت

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

یعنی اے ایمان والو! تمھارے لیے پیغمبرِ خدا کی ذاتِ گرامی میں ایک اچھا نمونہ موجود ہے۔

سورۂ احزاب کے جو الفاظ پیش کیے گئے ہیں، میرے خیال میں ان کی حیثیت راہنما خطوط یا نشانِ منزل کی ہے۔ یہ الفاظ تمام مسلمانوں سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ہم یہ بات معلوم کریں کہ رسولِ خدا نے وہ کون سا نمونہ پیش کیا تھا، جسے قرآنِ حکیم میں "اسوۂ حسنہ" قرار دیا گیا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور اُسے پورا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ جس محسنِ انسانیت کے خد و خال خالقِ کائنات نے خود کلامِ پاک میں بیان فرمائے ہیں، اس کا کوئی ایسا مرقع تیار کرنا جو ہر اعتبار سے کامل و اکمل ہو، انسانی عزم و ہمت کے لیے مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ مولانا شبلی نے اسی لیے فرمایا تھا:

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حالِ سرورِ عالم | دبیرِ چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہِ عالمِ قدس سے آئی | کہ ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

تاریخ شاہد ہے کہ راہ دشوار ہونے کے باوجود ایمان والے ہی نہیں، ایمان کی دولت سے محروم بھی اسوۂ حسنہ کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے پیغمبر شناسی کی راہ پر چل نکلے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق یہ کوشش کی کہ ہادیِ برحق کی ایک ایک بات، ان کی ایک ایک ادا، اور ان کے حُلیہ مبارک کا ایک ایک خد و خال دلوں کے علاوہ لفظوں میں بھی محفوظ کر لیا جائے۔ نتیجۃً علمِ حدیث، علمِ مغازی، علمِ رجال، علمِ سیرت جیسے گراں مایہ علوم کا قابلِ فخر سرمایہ جمع ہو گیا۔ ان علوم کی نوعیت اُن مختلف دائروں کی ہے جو ایک ہی مرکز کے گرد گھومتے ہیں۔

ان مساعیِ جمیلہ کی وجہ سے اب صورت یہ ہے کہ دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو، جس میں

سیرتِ مبارکہ سے متعلق کوئی کتاب نہ ہو۔ موتمر عالم اسلامی کے ڈائریکٹر اور ممتاز محقق مولانا عبدالقدوس
کے بیان کے مطابق "رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پر پہلی کتاب چینی زبان میں لکھی گئی۔
یہ کتاب ۶۱۲ اور ۶۱۸ عیسوی کے درمیان لکڑی کے بلاکوں میں شائع کی گئی اور اس کے دو صفحات
اب بھی چین میں پرنسپل سعد الدین کے پاس موجود ہیں[1]
کتبِ سیرت کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ڈینور میں قائم American
Institute of Islamic Studies جیسے وسائل کے اعتبار سے مالا مال
ادارے کو بھی اسلام اور بانیِ اسلام کے متعلق کتب کی اپنی ایک وضاحتی فہرست میں آج سے
چار سال پہلے یہ لکھنا پڑا کہ:

"On the writing of biographies on the life of the Prophet Muhammad there is no end, and probably there will never be an end. No complete listing of these hundreds of biographies has as yet been attempted, even only for those in western languages"

کتبِ سیرت کی فہرستوں کی نایابی یا کم یابی کی یہی صورت دنیا کی تقریباً سب زبانوں میں ملتی
ہے۔ اردو کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں بہ طریقِ احسن اس کام کا آغاز ہو چکا ہے۔
اسلامیہ کالج، لاہور کو اس سلسلے میں تقدم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کالج میں ۱۹۶۳ء میں پاکستان
میں موجود کتبِ سیرت کی جو نمائش منعقد ہوئی تھی، اس میں شامل کتب کی فہرست شائع کر دی گئی۔
اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں انجمن ترقیِ اردو، کراچی نے قاموس الکتب کی جو پہلی جلد شائع کی، اس
میں اُردو کی سیرت کی کتابوں کے لیے بھی ایک حصہ مخصوص تھا۔ نیشنل بک سنٹر آف پاکستان نے
۱۹۷۳ء میں اُردو کی ان کتبِ سیرت کی فہرست شائع کی جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۲ء تک پاکستان میں
شائع ہوئی تھیں۔ ۱۹۷۹ء میں ڈائریکٹر کتب خانہ جات، محکمہ تعلیم، حکومتِ پاکستان، کراچی

---

[1] بیان مطبوعہ روزنامہ "امروز" ملتان بتاریخ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۹ء

نیشنل میوزیم لائبریری اور لیاقت میموریل لائبریری، کراچی میں موجود اسلام اور فقہ کے متعلق کتابوں کی جو فہرست شائع کی تھی، اس میں سیرت سے متعلق اردو کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ ان فہرستوں میں سے صرف اسلامیہ کالج کی شائع کردہ فہرست جزوی صورت میں وضاحتی ہے۔ راقم السطور بھی آج کل بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان کے تعاون سے اردو اور دوسری زبانوں کی سیرت کے متعلق تقریباً چھ سو کتابوں کے بارے میں وضاحتی (Annotated) فہرست اور دو ہزار کتابوں کے متعلق عام فہرست شائع کرنے کا اہتمام کر رہا ہے۔ ان فہرستوں کے متعلق بھی میں مکمل ہونے کا دعویٰ کرنے سے قاصر ہوں، کیوں کہ اس بات کا بہت امکان ہے کہ بہت سی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کتابیں میرے علم میں نہ آسکی ہوں۔ برصغیر میں سیکڑوں ذاتی اور پبلک کتب خانے ایسے ہیں، جن میں موجود کتابوں کی اب تک نہ تو فہرستیں بن سکی ہیں اور نہ ان تک رسائی ممکن تھی۔ بہرصورت گزشتہ ایک سال کے عرصے میں اردو میں سیرت یا اس کے کسی ایک پہلو سے متعلق جو کتابیں یا کتابچے میرے سامنے آئے ہیں، ان سب کا تعارف اس مضمون میں چونکہ ممکن نہیں، اس لیے صرف ان چند اہم کتابوں کا مختصراً ذکر کروں گا، جن کے حوالے کے بغیر اردو میں سیرت نگاری کی کوئی تاریخ مکمل قرار نہیں دی جاسکتی۔

حکیم الامت علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے

اردو میں سیرت نگاری کے آغاز کے محرکات کا جائزہ لینے سے بھی کچھ ایسی ہی صورت سامنے آتی ہے۔ یو۔پی کے لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور کی کتاب Life of Mohammad جب ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی تو اس نے سر سید احمد خاں کو اتنا متاثر کیا کہ لندن میں قیام کے دنوں میں یعنی ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۰ء میں انھوں نے نواب مہدی علی خاں کو یہ لکھنا ضروری سمجھا کہ "ولیم صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہوجائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہوجاؤں تو بلا سے۔"

اس شدید احساس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سر سید نے سیرت کے متعلق مستشرقین کے اعتراضات۔ کے

مدلل جوابات دیتے ہوئے اپنے مضامین کا ایک مجموعہ انگریزی میں ترجمہ کرا کے ۱۸۷۰ء میں لندن میں ہی شائع کرایا اور ۱۸۸۷ء میں سیرت کے متعلق اپنے بارہ تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ خطبات احمدیہ کے نام سے اردو میں شائع کیا۔ اس کتاب میں چوں کہ حیات طیبہ کے جملہ پہلو پیش نہیں کیے گئے ہیں صرف چند پہلوؤں کا بیان ہے، غالباً اسی لیے سرسید نے اسے سیرت کی بجائے خطبات احمدیہ کے نام سے پیش کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ کتاب اس لیے اہم ہے کہ اردو میں اس سے پہلے اس انداز کی کوئی دوسری کتاب نہیں ملتی، مولد نامے اور وفات نامے ملتے ہیں۔ دوسرے اس میں پہلی بار سیرت نگاری کے فن پر اور سیرت کی کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسی بنا پر ڈاکٹر سید شاہ علی اپنی مشہور تصنیف " اردو میں سوانح نگاری" میں یہ لکھتے ہیں کہ " سرسید فن تنقید سیرت کے اماموں میں سے ہیں "

دوسرے قابل ذکر سیرت نگار قاضی محمد سلیمان منصور پوری ہیں، جن کی تصنیف رحمۃ للعالمین کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب جامعہ عثمانیہ دکن، جامعہ عباسیہ بہاولپور اور دارالعلوم دیوبند جیسے بلند پایہ علمی اور دینی اداروں کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے جو روایت جہاں سے لی ہے، اس کا پورا حوالہ درج کیا ہے۔ تمام واقعات جو سیرت سے متعلق ہیں، تاریخی ترتیب سے لکھے ہیں۔ بائیبل سے ہر جگہ استناد کر کے اہل کتاب پر حجت قائم کی ہے۔ اس کی زبان بقول حسن مثنیٰ ندوی " ہر جگہ معیاری تو نہیں لیکن لب و لہجہ پر اثر ہے۔ مناظرانہ اور متشددانہ انداز سے پرہیز کیا گیا ہے "[۱۲]

رحمۃ للعالمین تین جلدوں میں ہے۔ اس کی پہلی جلد پہلی بار ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی تھی، دوسری اور تیسری جلدیں بعد میں شائع ہوئیں۔ اب تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اس سلسلے کی تیسری اہم کڑی مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی ہیں، جنھوں نے سیرت النبیؐ چھ پر مشتمل جلدوں میں شائع کر کے سیرت نگاری کو انفرادی کوشش کے محدود دائرے سے نکال کر ایک وسیع اجتماعی ادارے کی صورت بخشی اور ایک تحریک بنا دیا۔ سیرت النبیؐ کی پہلی دو جلدیں شبلی کے زور قلم

---

[۱۲] مولانا شاہ محمد جعفر کی تصنیف " پیغمبر انسانیت " میں شامل مضمون بعنوان " پاکستان و ہندوستان کے علماء اور سیرت "

۱۰ ۰ ۰ ۰۰، ۰۰ مہ

کا نتیجہ ہیں اور باقی چار سید سلیمان ندوی کی محنتِ شاقہ کا ثمر ہیں۔ پہلی جلد پہلی بار ۱۹۱۸ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔ سب جلدوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب تک کئی بار شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب وسعتِ مضامین و کثرتِ معلومات اور جامعیتِ مسائلِ حیات کے لحاظ سے ایک اسلامی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ یہ مقامِ بالا اس تصنیف کو شبلی کی شعوری کوشش سے حاصل ہوا ہے۔ انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو ایک خط میں لکھا تھا:

"چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مباحث سیرت میں آجائیں یعنی تمام مہماتِ مسائل پر ریویو، قرآنِ مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلو پیڈیا اور نام "دائرۃ المعارف النبویہ" موزوں ہوگا، گو لمبا ہے۔"

یہی پہلو کتاب کو غیر معمولی اہمیت بخشتا ہے اور سیرت کا محدود فنی تصور رکھنے والوں کو کھٹکتا بھی ہے۔ بہرصورت اس میں شک نہیں کہ اس معرکۃ الآرا تصنیف کا اب تک کوئی شخص جواب پیش نہیں کر سکا۔ گو کوششیں ہوتی رہی ہیں اور قابلِ قدر بھی۔ مثلاً سید اولاد حیدر بلگرامی نے اسوۂ رسولؐ پانچ جلدوں میں شائع کی تھی۔ پہلی جلد ۱۹۲۵ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس مجموعے میں معلومات کی فراوانی تو ہے، بالخصوص اثنا عشری نقطۂ نظر سے، لیکن سیرت النبیؐ جیسی ادبی شان اور محققانہ آن نہیں۔

اس کے بعد اصح السیر کی صورت میں ایک بلند پایہ عالمانہ کتاب ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری کی ملتی ہے، جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی دور میں مشہور ناول نگار مولانا شررؔ نے "جویائے حق" کے نام سے سیرتِ رسولِ پاکؐ کو ناول کی صورت میں پیش کیا تھا۔ اس کے تین حصے ہیں اور سلمان فارسیؓ کے خطوط کے کیارے ناول کا پلاٹ تیار کیا گیا ہے۔

انھی ایام میں مصورِ غم راشد الخیری نے "آمنہ کا لال" اس خیال سے لکھی کہ "مسلمان لڑکیوں کے واسطے ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو رطب و یابس سے بالکل پاک ہو اور نہ صرف ان ہی کو مطمئن کر سکے بلکہ وہ اپنی مجلسوں میں غیر مسلموں کے سامنے بھی اپنے رسول کو پیش کر سکیں۔"

ان نئے تجربات کے ساتھ ساتھ روایتی عالمانہ انداز میں بھی سیرت نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے تین جلدوں میں سیرۃ المصطفیٰ شائع کی۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے "سیرتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" اور "حبیبِ خدا" کی صورت میں دو کتابیں پیش کیں، جن میں سیرتِ مبارکہ

کے تمام پہلوؤں کا موثر اور دلنشین بیان ہے۔

یہ تذکرہ ان دو سیرت نگاروں کے خصوصی ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔ جنھوں نے شروع میں سیرت کی کوئی باقاعدہ کتاب لکھنے کے خیال سے سیرت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مضامین نہیں لکھے تھے لیکن بعد میں ان مضامین کی اہمیت اور افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کتب سیرت کی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ اس سلسلے کے پہلے سیرت نگار مولانا ابوالکلام آزاد ہیں اور ان کا خاص طور پر قابلِ ذکر مجموعہ "رسولِ رحمت" ہے جو مولانا غلام رسول مہر کا مرتبہ ہے۔ دوسرے سیرت نگار مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں، جن کی تحریریں "سیرت سرورِ عالم" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی جلد کے مرتبین مولانا نعیم صدیقی اور عبدالوکیل علوی تھے اور دوسری جلد کے مضامین کو مولانا مرحوم نے خود ترمیم و اضافے کے ساتھ کتابِ سیرت کے خیال سے مسلسل اور مربوط بنایا تھا۔ دوسری جلد ہجرت کے بیان پر ختم ہوئی تھی۔ مولانا کا ارادہ مدنی دور شروع کرنے کا تھا لیکن مشیتِ ایزدی کو یہ منظور نہ تھا۔ ۱۹۷۹ء میں مولانا کے انتقال سے یہ منصوبہ نامکمل رہ گیا۔ ان دونوں سیرت نگاروں کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ اگر یہ سیاست کے میدانِ عمل کے شاہسوار نہ بنتے تو سیرت نگاری میں شبلی کے ہم سر بن سکتے تھے لیکن اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ ضرورت کے مطابق اس فن کے تقاضے پورے نہ کر سکے اور نہ محنت ہی کر سکے۔ اس کے علاوہ وہ سیرتِ رسول کے متعلق قلم اٹھاتے ہوئے بھی اپنی سیاسی تحریکوں کے اثرات سے آزاد نہ رہ سکے۔ اس وجہ سے ان کے سیاسی معتقدین کی نظروں میں تو ان کے مضامین سیرت کی اہمیت بڑھ گئی لیکن عام قارئین کی نظر میں کم ہو گئی۔ اسی باعث ان دونوں کے سیرتی منصوبوں کی تکمیل کے لیے ان کو سید سلیمان ندوی جیسے جانشین ملنے کی توقع بھی بہت کم ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ چند دوسری کتابیں بھی قابلِ توجہ ہیں، مثلاً میرزا حیرت دہلوی کی سیرۃ الرسول ــ ابوسلیم محمد عبدالحی کی حیاتِ طیبہ ــ چوہدری افضل حق کی محبوبِ خدا ــ احسان بی اے کی ننھے حضور ــ ابوالحسن ندوی کی نبی رحمت ــ آغا اشرف کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ــ گوردت سنگھ دارا کی رسولِ عربی ــ محمد علی لاہوری کی سیرتِ خیر البشر ــ محمد کریم بخش کی ذکر الرسول ــ مناظر احسن گیلانی کی النبی الخاتم ــ نواب علی بیگ کی سیرتِ رسول اللہ ــ مولانا احمد سعید کاظمی کی حیات النبی ــ خواجہ کمال الدین کی [illegible] کامل نبی ــ باری علیگ کی محمد عربی ــ برکت اللہ پادری کی محمد عربی ــ پرکاش دیو جی شرمے

کی سوانح عمری حضرت محمد صاحب بانیِ اسلام — بشیر احمد مرزا کی سیرت خاتم النبیین — احمد یار خاں مفتی کی شانِ حبیب الرحمٰن من آیات القرآن — شان الحق حقی کی سیرت پاک — ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی رسولِ اکرم کی سیاسی زندگی — میجر جنرل اکبر خان کی حدیثِ دفاع — کرنل ڈاکٹر ایوب خاں کی حیاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم — خورشید احمد انور کی محمدِ عربی — پروفیسر حمید احمد خاں کی اُسوۂ حسنہ — عابد نظامی کی ہمارے حضور — چراغ حسن حسرت کی سرکارِ مدینہ — شاہ محمد جعفر پھلواروی کی پیغمبرِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم — حکیم محمد سعید کی تذکارِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — فقیر سید وحید الدین کی محسنِ اعظم اور محمد شریف راجہ کی حیاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم — شاہ عبدالحی قادری کی جنان السیر (منظوم) — حفیظ جالندھری کی شاہ نامہ اسلام (منظوم) — عبدالحی ناز کی اسوۂ حسنہ (منظوم) اور مختار رسول نگری کی فخرِ کونین —

ان مصنفین میں سے بعض نے ایک سے زیادہ کتبِ سیرت تحریر کی ہیں لیکن اختصار کے پیشِ نظر صرف ایک ایک کتاب کے حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ طبع زاد ہیں یا ماخوذ۔ اردو میں تراجم کا سرمایہ بھی قابلِ فخر ہے۔ مختلف زبانوں کی سیرت کی نمایاں ترین کتابوں کے اردو میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً ابنِ سعد کی طبقات کا، ابنِ ہشام کی سیرت کا، ابن قیم کی زاد المعاد کا، واقدی کی المغازی کا، طبری کی تاریخ کا، ابوالنصر کی نبی اُمّی کا، توفیق الحکم کی محمد رسول اللہ کا، قاضی عیاض کی الشفا کا، یوسف بن اسماعیل النبہانی کی شمائلِ رسول کا اور عبدالرحمٰن بک عزام کی تاجدارِ دو عالم کا، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مدارج النبوت کا، ٹالسٹائی کی پیغمبرِ اسلام کا، آر۔ وی۔ سی۔ باڈلے کی The Messenger کا، جان ڈیون پورٹ کی Apology for Mohammad and Quran کا، گاڈفری ہگنز کی Apology for Mohammad کا اور سید امیر علی کی Spirit of Islam کا۔

ترجمہ کرنے والوں میں سے قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا عبداللہ العمادی، محمد عادل قدسی گنگوہی، رئیس احمد جعفری، مولانا عبدالرزاق، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد احمد پانی پتی اور عطیہ خلیل عرب کے نام نمایاں ہیں۔

مجموعی صورت میں ان کتابوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں سیرت نگاروں نے گلہائے رنگارنگ کا جو گلدستہ سجایا ہے، اس میں شامل ہر گل کی اہمیت کے لیے تمام قارئین کا یہ احساس ہی کافی ہے کہ:

ا گلدستہ خو[illegible] م تو لائے کے داری

ڈاکٹر محمد ریاض

قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر

مولانائے رومؔ کی زبان سے

(مولانا جلال الدین محمد رومیؔ (۶۰۴ – ۶۷۲ھ) کے ۱۴۵ عربی و فارسی "مکتوبات" اور فارسی کے سات مواعظ (مجالس سبعہ) کو ان کے ایک خلفِ محترم ڈاکٹر محمد فریدون نافذ بک نے ۱۹۲۷ء میں ترکی سے شائع کروایا تھا اور بعد میں یہ ایران سے بھی دوبارہ شائع ہوتے۔ ان کتابوں کا انداز بھی "فیہ مافیہ" اور "دیوان کبیر" کی یاد دلاتا ہے، مگر مثنوی رومی کا اسلوب ان سے زیادہ قریب ہے۔ داستان در داستان، تمثیلات، آیات اور احادیث اور اشعار سے استناد یہاں بھی اسی طرح نظر آتا ہے۔ مجلس اول کی بحث کے دوران سورہ ۳۹ کی آیت ۵۳ کی تفسیر کرتے ہوئے رومیؔ نے حسب معمول دلچسپ واعظانہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ قارئینِ کرام ان تاریخی اور داستانی امور کے کئی حصوں میں خود حدفاصل قائم کرلیں گے۔ شمس الدین افلاکی نے "مناقب العارفین" میں لکھا ہے کہ رومیؔ ایک شیریں سخن واعظ اور مدرس تھے مگر انھوں نے ۶۲۸ھ تا ۶۲۹ھ اور ۶۳۸ تا ۶۴۲ھ کے عرصے میں ہی وعظ کہا اور درس دیا ہے۔ ۶۲۸ھ میں انھوں نے اپنے والد کی مسند ارشاد سنبھالی، مگر ۶۲۹ھ میں اسے سید برہان الدین محقق ترمذی (م ۶۳۸ھ) کے حوالے کرکے خود مزید تحصیل علم میں لگ گئے۔ جیساکہ سب جانتے ہیں، شمس تبریزیؒ کی ملاقات (۶۴۲ھ) کے بعد رومیؔ نے درس و وعظ سے بالعموم کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ پس مولانا کی یہ تقریر اور سب "مجالسِ سبعہ" ان کے دورِ جوانی سے مربوط ہیں۔ وہ ابھی چالیس سال سے کم تھے۔ اب آیہ مبارکہ کی توضیح کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔ مترجم)

... ملک القرا کے دسترخوان سے "ربیّ الاعلیٰ" کے کلام کی حلاوت ملی کہ "قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللّٰہ"۔ اسی کلام کی تفسیر عرض کردوں۔

اللہ تعالیٰ جو دانائے جزو و کل، حکیم مطلق، قادر نہائی، مالکِ ملک اور پادشاہ عالمین ہے "مردہ دل انسانوں کو معنوی طور پر زندہ کرنے اور انھیں عہدِ بندگی یاد دلانے کی خاطر 'یا عبادی' (اے میرے بندو) کے کلمات سے یاد فرماتا ہے۔ فرماتا ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرا حال اور قال ایک ہے اور تیرے قال کا جلال مجھ سے ہے۔

حکما را بود بخوانِ جلال   نغمہ و نطق و سحر ہر سہ حلال

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کو "عبادی" پکار۔ ان سے کہہ کہ اے راہِ راست سے دور جا پڑنے والو، شیطان کے وساوس کے اسیر و اور گم گشتہ کاروان کی طرح حیران لوگو! اپنی اصلی راہ دیکھو اور راہِ راست سے اِدھر اُدھر قدم نہ رکھو۔ تم گم گشتہ کارواں میں شامل نہ ہو۔ اس بانگِ درا اور صدائے جرس پر کان دھرو جو تمھیں صحیح راستے پر چلنے والوں کی طرف سے سنائی دے رہی ہے۔ غولِ بیابانی اور راہزنوں کی صدا سے آگاہ رہو، مبادا گمراہی کے بیابانوں میں ہی تلف ہو جاؤ۔ غول کی صدا پُر فتنہ ہے۔ کئی کاروان اس صدا کے فریفتہ ہوتے ہیں اور صدا دینے والے کو اپنا ناصحِ مشفق جانتے ہیں لیکن اس صدا کے درپے جانے میں انھیں حیرت اور اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کافی آگے چل کر جب گم گشتہ راہ کارواں واپس ہونے لگتا ہے تو راہزن اس پر آ جھپٹتے ہیں۔ ان راہزنانِ انس و جن میں گھرے ہوئے اہلِ کارواں کی عجیب حالت ہوتی ہے۔ کوئی غم خوار نما آوازوں کو سن کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ اگر کوئی غم خوار راہنما ہوتا تو خالی صدائیں کیوں دیتا اب تک نظر آ گیا ہوتا اور ہمیں بھٹکنے سے باز رکھتا۔ لیکن ایک تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اب جائے ماندن ہے نہ پائے رفتن۔ وہ اپنے گم گشتہ راہ ہونے کا اعتراف کر کے خدائے تعالیٰ سے استعانت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "ربنا ظلمنا"۔ اپنی گم راہی کو وہ خود ظلم قرار دیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی ندامت قبول ہوتی ہے۔ فرشتۂ وحی نے جو نبیِّ معصوم کو "الذین اسرفوا" کے کلمات سے ایک خاص گروہ افراد کی طرف اشارہ کیا، وہ ایسے ہی لوگ ہیں جو کاروانِ زیست میں بھٹک گئے مگر انھیں اپنے بھٹکنے کا اعتراف بھی ہے۔

ربّ العزت فرماتا ہے کہ اے اپنے آپ پر زیادتی کرنے والو اور راہِ ہدایت سے دور جا پڑنے والو! باقی رہ جانے والی فرصتِ حیات کی قدر کرو۔ گندم کے کھلیان فضول خرچ کر ڈالو اور رقم بے تحاشا اڑا دو، تو یہ چیزیں پھر بھی ہاتھ لگ سکتی ہیں مگر متاعِ حیات کا اسراف اور وقتِ عزیز کا اتلاف حماقت اور نادانی ہے۔ عمرِ عزیز کا ایک لمحہ لاکھوں دینار ادا کر کے بھی کہاں مل سکتا ہے؟ قولِ معروف ہے کہ وقت کے ساتھ یاقوت خریدے جا سکتے ہیں مگر یاقوتوں کے ساتھ وقت نہیں خریدا جا سکتا۔ فرصتِ حیات میسر ہو تو یاقوت اور موتی خریدنا آسان ہے مگر لاکھوں یاقوت اور مروارید مہلتِ زندگی میں ایک

اس کا بھی اضافہ نہیں کر سکتے۔ —

فرمایا " علی انفسہم " یعنی ان گناہ گاروں نے گناہ اور گم راہی کے ذریعے ظلم تو اپنے آپ پر کیا، مگر اس حسن ظن میں مبتلا ہیں کہ وہ محفوظ و مامون ہیں اور ظلم دوسروں پر ہوا ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ دوسروں پر کیا ہوا ظلم اپنے اوپر پلٹتا ہے۔ کتنی نادانی ہے کہ انھوں نے اپنی دکان کو آگ لگائی اور اپنی متاع جلائی مگر خوش ہیں کہ دشمنوں کی دکان اور ان کا سامان جلا ہے۔ انھیں خبر نہیں کہ "چاہ کن را چاہ در پیش است۔"

ظالم کہ کباب از دلِ درویش خورد   چون درنگری ز پہلوی خویش خورد

حکایت

کہتے ہیں کہ ایک قصاب نے ایک طفل محرّر رکھا ہوا تھا اور گوشت اُدھار بیچا کرتا تھا۔ وہ اس بچے کو بتایا کرتا تھا کہ فلاں نے اتنا گوشت لیا اور فلاں کے ذمے اتنی رقم بن گئی، اور بچہ لکھ دیتا تھا۔ ایک دن ایک مُردار خور پرندہ آ جھپٹا اور گوشت کا ایک ٹکڑا لے اُڑا۔ قصاب نے حسبِ عادت بچے سے کہا کہ انداز اً پاؤ بھر گوشت فلاں مردار خوار پرندے کے حساب میں لکھ دے۔ دوسرے دن پرندے نے پھر حملہ کیا مگر قصاب نے اس کا بندوبست کر رکھا تھا۔ پرندہ اسیر ہو گیا اور قصاب نے اس کا سر کاٹ کر اسے گوشت لٹکانے والی لکڑی پر ڈال دیا تاکہ دوسرے مُردار خوار پرندوں کو عبرت اور ہیبت ہو۔ اب لکھنے والا لڑکا بولا: 'استاد' پرندے کے نام آپ کا حساب لکھا ہوا ہے مگر اب بتایے کہ آپ کے نام اس پرندے کا کتنا حساب لکھوں؟" اسرفوا علی انفسہم " کا کیا عمدہ نکتہ تھا۔ قصاب اس پر تڑپ اٹھا کہ اگر سر کے بدلے سر طلب کیا گیا تو کیا کرے گا؟

شہادتِ حمزہؓ

آیتِ مبارکہ میں آگے ارشاد ہے کہ " لا تقنطوا " مقصد یہ ہے کہ بحرِ معاصی میں غرقاب ہونے کے باوجود مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت حمزہؓ اسلام لانے سے قبل شیر غار تھے اور اسلام لا کر اللہ کے شیر بن گئے۔ آپ غزا و جہاد میں زرہ نہ پہنتے۔ لوگ کہتے: آپ جوانی کی انتہائی توانائی میں زرہ پہنتے تھے، اب کیوں ترک کر دی؟ پہلے آپ خود پہنتے تھے، اب وہ بھی چھوڑ دیا۔ اے شیرِ عرب، یہ

عریاں جنگ آزمائی کیسی ہے؟ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اسلام سے قبل کی میری دلیری شیر کی سی جیسی دلیری تھی۔ اس دلیری میں حیات و ممات کا خیال نہ تھا۔ اس میں جنگ جویانہ حلاوت ملتی تھی۔ یہ ایسی حلاوت تھی جیسی پروانے کو شمع پہ جلتے ہوئے ملتی ہے مگر اس میں خوف ہلاکت بھی مضمر ہوتا ہے۔ پروانے کو نورِ ابراہیمی میسر نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھے۔ پیاسا شخص پانی کے لیے کس قدر بے تاب ہوتا ہے؟ وہ پانی کے حصول کے لیے موت کو بھی خاطر میں نہیں لاتے گا۔ میں بھی دورِ قبل از اسلام میں شجاعت اور جنگجوئی کے لیے پروانہ تھا یا پیاسا۔ میری جنگ آزمائی از روئے سرشت تھی اور اس میں احتیاط کیا کرتا تھا۔ اب میں نورِ ایمان سے بہرہ مند ہوں اور میری ظلمتِ سرشت مغلوب ہے۔ مجھے اب یقین ہے کہ موت کے بعد ایک اور خاتمہ ناپذیر زندگی ہے شہادت پانے والوں کی ارواح کے مراتبِ بلند کا جان کر موت سے خوف کیسا اور آدابِ حرب کی پابندی کیسی؟ ارشادِ خداوندی ہے: ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم، ارواحِ شہدا کے بارے میں فرماتا ہے: یرزقون فرحین۔ یعنی وہ ارواح بے معدہ و شکم، بے تن و بے دندان اور بے حرکتِ لب کھاتے پیتے اور کیف کرتے ہیں۔ ارواحِ مجرد کے خورد و خواب کی عیش کسے میسر ہوگی؟ نا امیدی کی قبور میں پڑنے والو، تمھیں اس خورد و خواب کی کیا خبر ہے؟ قبرِ تنگ میں گرفتار ہونے والوں کو طیرانِ ارواح کا کیا علم ہے؟ اندھی قبر! تو شہدا کو گھور گھور کر کیا دیکھ رہی ہے؟ انھیں موت کا ہاتھ چھو نہیں سکتا؟ تو کافروں کو دیکھتی رہ جو ءاذا متنا وکنا ترابا ذلک رجع بعید کا ورد کیا کرتے تھے۔ قبر کو اپنی منزل نہائی جاننے والے کی سکت کیا ہے؟ اس کا قبلۂ نظر قبر ہی ہے۔ لیکن شہادت اور جانِ پاک (روح مطہر) پر توجہ رکھنے والے کو وحشتِ قبر کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔

آدمی دیدست باقی گوشت و پوست   ہر چہ چشمش دیدہ است آن خیر اوست

یہ مطمحِ نظر کا فرق ہے کہ آدمی خود کو پاک جانے یا ناپاک خاکی خیال کرے یا غیر خاکی۔ باتیں حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب کی ہو رہی تھیں اور بیچ میں جملہ ہائے معترضہ آگئے۔ اپنے جواب میں آپ نے فرمایا، میں اسلام لانے سے قبل زرہ اس لیے پہنتا تھا کہ میرا رخ موت، زخمی ہونے اور دوسروں کو [illegible] کرنے کی طرف تھا۔ مجھے موت کی طرف بے زرہ جانے کی راہنمائی نہ ملی تھی۔ اب نورِ ایمان نے مجھے یہ

...دی اور میں جنگ وغزا میں جاتے وقت موت اور زخموں کو نہیں بلکہ زندگی کو سامنے رکھتا ہوں۔

وحشی، ایک عجمی بزرگ زادی کا غلام تھا۔ اس عورت کا ایک عزیز حضرت حمزہؓ کا مقابلہ کرتا ہوا میدان جنگ میں کام آیا تھا، اس لیے اسے آپ سے دشمنی تھی۔ اس نے وحشی کو کہا کہ اگر وہ جناب حمزہؓ کو قتل کر دے تو اسے آزاد کر دے گی اور کافی مال و منال بھی دے گی۔ حضرت حمزہؓ کے کئی اور دشمن بھی تھے۔ وہ بھی وحشی کو ان کے قتل پر اکسا رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ اسے گھوڑا انعام دے گا۔ کوئی کنیز کا لالچ دلا رہا تھا۔ مال و دولت جادوگروں کی طرح انسانوں کی آنکھیں بند کر دیتے ہیں۔ لالچ اور رشوت آدمی کو ایسا اندھا کر دیتے ہیں کہ اسے روز روشن میں ظالم اور مظلوم کی شناخت نہیں ہو سکتی۔ حضرت علیؓ نے اسی لیے اپنے ایک خطبے میں فرمایا ہے کہ: "اس دھوکا دینے والی مکار، حیلہ ساز اور زرق برق دنیا سے بچو"

رابعہ بصریؒ کے بارے میں ایک حکایت مشہور ہے۔ کہتے ہیں ایک دن ان کے خادم نے کھانے کے وقت انھیں دو درہم دیے۔ انھوں نے ایک دائیں ہاتھ میں رکھ لیا اور دوسرا بائیں میں۔ لوگوں نے کھانے کا کہا تو کہنے لگیں، دونوں ہاتھ مشغول ہوگئے، کیسے کھاؤں؟ لوگوں نے کہا: ایک ہاتھ میں درہم رکھیے اور دوسرے سے کھایے۔ بولیں: معاذ اللہ، ان دو جادوگروں کو ایک ساتھ کر دوں؟ یہ دونوں مل جائیں تو فتنہ برپا کر دیں گے۔ ان کی جدائی بہتر ہے ورنہ یہ دوسروں کے درمیان جدائی ڈالیں گے: فیتعلمون منہما ما یفرقون بہ بین المرء و زوجہ۔ اہل ظاہر اپنی تفسیروں میں لکھتے ہیں کہ یہ جادوگر مرد و زن کے درمیان جدائی ڈالتے تھے مگر اہل باطن کے نزدیک یہ روح و جسم کی جدائی تھی۔ روح قدیم ہے اور اس کا اپنا مقصد صدق ہے۔ اسے وہاں سے جدا کرنا کتنا الم ناک کام ہے۔

ملاقات اور اتصال سے دو، تین، چار یا زیادہ چیزیں تولید ہوتی ہیں مگر ایک دوسری ملاقات تولید کی خاطر نہیں وحدت کے لیے ہے۔ مثلاً روح بدن کے ساتھ ملتی ہے تو سارے اجزائے بدن ایک وحدت کے طور پر کام کرتے ہیں۔ اور روح کی جدائی کے بعد یہ سب بے کار ہو جاتے ہیں۔ اب آنکھ آنکھ نہ رہی اور کان کان نہ رہا اور سب اجزائے متحد، متفرق ہو کر بے کار ہوگئے۔ ایک روح نے سب کو متحد کر رکھا تھا۔ وہ گئی اور یہ بھی رخصت ہوتے۔

غرض وحشی مال و دولت پر فریفتہ ہوگیا اور حضرت حمزہؓ کو قتل کرنے کا اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔

وحشی حضرت حمزہؓ کو قتل کرنے کے موقعے کی تلاش میں تھا۔ غزوۂ اُحد کے دوران مسلمانوں نے پہلے

کفار کو مار بھگایا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تیر اندازوں کو مامور کیا تھا کہ کفار کی مکمل پسپائی تک وہ حساس مقاماتِ جنگ کی نگرانی کریں کہ کفار کہیں دوبارہ حملہ نہ کر دیں۔ مگر مسلمان جنگ کے فوراً بعد کفار کے اونٹوں، خچروں، غلاموں اور دیگر اموالِ غنائم کو تقسیم کرنے لگے۔ تیر اندازوں نے سوچا کہ وہ بھی اس تقسیم میں شرکت کریں۔ ان میں سے بعض کہہ رہے تھے کہ اموالِ غنائم کی تقسیم جنگ کے خاتمے کا اعلان ہے۔ اب پہرہ داری کس لیے کریں؟ لیکن ایک گروہ کے خیالات اس کے برعکس تھے۔ مگر آخر کار جملہ تیر انداز اور پہرہ دار مالِ غنیمت لینے آ حاضر ہوتے۔ ابوسفیان اور اس کا لشکر گھات میں تھے۔ اس نے مسلمانوں کو غافل پا کر حملہ کر دیا۔ صحابہ کرام میں ایک شخصیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت مشابہ تھی۔ وہ ہتھیار پہن کر جب سوار ہوتے تو پیغامبرِ اسلام کے بہت مشابہ ہوتے۔ وہ اس حملے میں شہید ہو گئے۔ مگر کتنے تھے جوان کو دیکھ کر سوچتے سنتے کہ غالکم بدہن، نبی اکرمؐ حملۂ کفار کا نشانہ بنے ہیں۔ یہ منظر دیکھنے والے راہِ گریز اختیار کرتے تھے۔

نبی اکرمؐ انھیں پے درپے صدا بھی دے رہے تھے مگر اس وقت کا منظر کچھ اور ہی تھا: اذ تصعدون ولا تلوون علی احد والرسول یدعوکم فی اخراکم۔ روایت ہے کہ اس وقت لوگوں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ ہتھیار پھینکے ہوئے بیٹھے ہیں۔ بعض صحابہؓ نے کہا، آپ لڑتے یا راہِ گریز اختیار کرتے، یہ بیٹھنا کیسا؟ فرمایا: جس ہستی کے لیے میں کرّوفر کرتا تھا، اس کا انجام دیکھ لیا۔ اب کس کے لیے لڑوں یا بھاگوں؟ حضرت حمزہؓ کا حال مگر دوسرا تھا۔ وہ ایک شیرِ ژیان کی طرح لشکرِ کفار سے نبرد آزما تھے اور کفار کے جنگجوؤں کو دو نیم کرتے جا رہے تھے۔ کفار قسمیں کھا رہے تھے کہ اس شخص کا ضرور کام تمام کریں گے مگر مقابلہ کرنے کی کسی میں بھی ہمت نہ تھی۔ وحشی تاک رہا تھا مگر سامنے کیسے آتا؟ وہاں تو کفار کے سروں کے انبار تھے۔ حضرت حمزہؓ کی پشت کی طرف ایک پتھر کے نیچے وہ بدبخت چھپا اور موقع پاتے ہی پیچھے سے ان پر حملہ کیا۔ حضرت حمزہؓ بے زرہ تو تھے ہی۔ نیزہ ان کے بدن میں پیوست ہو گیا۔ انھوں نے نیزہ کھینچ کر نکال لیا اور وحشی کا کچھ تعاقب بھی کیا، مگر خون زیادہ بہہ چکا تھا اس لیے بے رمق ہو گئے۔ اس حالت میں آپ نے تین بار فرمایا: الحمدللہ کہ دینِ اسلام پر ہوں۔ پھر وحشی کی سمت رخ کر کے فرمایا: ہمارے لیے ہمارا دین اور تمھارے لیے تمھاری دنیا اور دینار کہ نحن قسمنا بینھم۔ فرمایا: ہمیں اپنے نصیب پر بے حد خوشی ہے۔ غرض اس طرح آپ نے جان، جانِ آفرین

کے حوالے کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نبی اکرمؐ کو جنگ احد میں پنڈلی مبارک پر زخم آیا اور آپ کے دندان مبارک بھی شہید ہوتے تھے۔ آپ کو کئی صحابہؓ کے شہید ہو جانے کا رنج تھا مگر حضرت حمزہؓ کی شہادت پر آپ نے دیگر تمام رنج بھلا دیے۔ آپؐ نے حضرت حمزہؓ کا سر اپنی گود میں رکھا اور آپ کے چہرے کو گرد و غبار سے صاف کر کے فرمایا: خدا کی قسم میں اس کے بدلے کفار کے بے حد و حساب اشخاص قتل کرواؤں گا، مگر بعد میں ایک وحی کے ذریعے نبی اکرمؐ کو انتقامی کارروائی سے منع کیا گیا کیونکہ آپ کا کام عفو و درگزر اور رأفت رحمت تھا۔

کہتے ہیں کہ بعد میں وحشی اپنی حرکت پر بے حد روتا تھا۔ کہتا تھا کہ ابلیس اور اولادِ ابلیس کی توبہ تو شاید قبول ہو جائے مگر میری توبہ قبول نہیں ہو سکتی۔ میں نے خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر رنجیدہ خاطر کر دیا ہے۔ میری بخشش کیسے ہوگی؟ مجھے حضرت نوحؑ سے دس گنا عمر ملے اور اس میں حضرت ایوبؑ کا سا صابر بھی رہوں تو بھی میری توبہ قبول نہ ہوگی اور میرا یہ گناہ نابخشودہ ہی رہے گا۔ وہ کہتا: میں نے ایک ایسا کام کیا ہے جو روئے زمین کے ماتموں اور تعزیتوں سے زیادہ الم ناک ہے اور ناقابل توبہ و بخشش ہے۔ کہتے ہیں کہ وحشی کی ندامت اور گریہ وزاری دور دور تک لوگوں کو معلوم تھی۔ بعد میں یہ آیت نازل ہوئی: ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء۔ یعنی خدائے بے فرزند و زن اور بے کفو و عدیل کا اگر کوئی کسی دوسرے کو شریک و سہیم بنائے تو یہ ناقابل معافی ہے مگر بقیہ گناہ صادقانہ توبہ سے معاف ہو سکتے ہیں۔ بعض مسلمانوں کے ذریعے اس وحشی کو اس آیت کا علم ہوا اور وہ نہایت رقت سے زار و قطار روتے ہوئے توبہ کرنے لگا۔ اس موقع پر قسامِ ازل کے دریائے رحمت و مغفرت نے جوش مارا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل فرمائی جو زیر بحث ہے کہ: قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا۔ ارشاد باری ہے کہ اے میرے سوختہ دل و جان، زندانِ ندامت کے اسیر اور آتشِ پشیمانی کے سوزاں بندو! میری رحمت سے نومید نہ ہونا۔ میرے عفو و بخشش کی کوئی انتہا نہیں کہ: ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا، اوپر منقول آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ شرک کے علاوہ تمام گناہ قابل توبہ و بخشش ہیں اور زیر بحث آیت میں بھی یہی نوید دی گئی ہے۔ اس نوید سے وحشی ایسے گناہ گاروں کی تقویت خاطر ہوئی۔ وحشی سوچتا تھا کہ وہ ستر آگ بھری خندقوں کے نیچے جائے گا۔ اس کا گناہ ایسے گندھک کے

ذخیرے کا سا تھا کہ ذرا سی آگ سے وہ شعلہ ور ہو سکتا تھا۔

باخودی از اثیر چون گزری؟ ہیز می، از سعیر چون گذری!

مگر اللہ تعالیٰ کے الطاف عمیم اور اس کے دریائے رحمت کی امواج بھی بے حد و حساب ہیں۔ وہ حضرت ابراہیم پر ہی آتشِ سوزاں کو گلزار نہیں کرتا اور اس میں ہی گل، شگوفے، یاسمین اور ریحان نہیں اگاتا، نادم اور توبہ گیر گناہ گاروں کے گناہوں کی آگ پر بھی پانی بھیجتا ہے کہ: اُولٰئِکَ یبدل اللہ سیئاتھم حسنات۔ قصہ مختصر، وحشی نے جب سنا کہ ہر قسم کے گناہ بجز شرک قابلِ عفو ہیں، تو وہ نہایت تیزی سے روتا ہوا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور نہایت رقت و سوز کے ساتھ طالبِ عفو ہوا۔ بولا، اے بہترین خلائق، اس بدترین خلائق کی طرف التفات کیجیے۔ آپ اولین اور آخرین انسانوں کے شفیع ہیں۔ آپ سلطانِ حقائق اور زبدۂ افلاک و زمین ہیں۔ میں ایک گناہ کی سوزش سے مدتوں سے ناراحت اور پریشان ہوں۔ آپ سے ذکر کرتے خجالت مانع رہی مگر اب کس دوسرے کے در کا رخ کرتا؟ آپ مجھے رب لایزال کی رحمت کا سزاوار بنایے۔

در دولت تو سیہ گلیمی گر سود کند زیان ندارد

میرے گناہ تو آپ ہی معاف کروا سکتے ہیں۔ اس ناقابلِ معافی گناہ کو بے پایاں رحمت والے کے دامن میں ہی پناہ مل سکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کے نفس سے مردے زندہ ہو سکتے تھے، حضرت داؤد کے ہاتھ میں لوہا موم ہو سکتا تھا اور حضرت سلیمان کے لیے جن و شیطان اور ہوائیں مسخر تھیں، مگر آپ داؤد، سلیمان اور مسیح کا بھی افتخار ہیں۔ مجھے اس پریشانی سے نجات دلایے۔ مجھے وہ کلمۂ شہادت پڑھوایے جو ناپاک کو پاک بنانے والا اور عرش و کرسی سے بھی زیادہ محترم اور مکرم ہے۔ مجھے اس کلمے کی برکت سے ان لاکھوں پریشانیوں سے نجات دلوایے۔ نبی اکرمؐ نے اسے کلمۂ شہادت پڑھوایا کہ اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ - اس وقت وحشی کی حالت اس چوزے کی سی تھی جسے مرغی ایک ایک دانہ چگوا رہی ہو اور وہ ذوق و شوق کے ساتھ منہ کھولے چگنے میں مصروف ہو اور کوشش کر رہا ہو کہ کئی دانے ایک ساتھ چگ لے:

چون رو بہ من شدی تو از شیر مترس چون دولت تو منم ز ادبیر مترس
از چرخ چو آن ماہ بتو ہمراہ است گر روز بہ گاہ ہست و اگر دیر مترس

بلکہ وحشی کی حالت پرندوں کے ان نوزاد بچوں کی سی تھی جو آشیانوں میں ہوتے ہیں اور ان کی ماں دور دراز پرواز کرکے ان کے لیے دانہ ڈُھونڈ لاتی ہے۔ کبھی کبھی دانہ لینے میں ماں کو دیر ہوجاتی ہے اور نوزاد بچے بھوک اور انتظار سے دوچار ہوتے ہیں۔ پس ماں کے دانہ ڈُھونڈ کا دیتے وقت وہ کس قدر خوش ہوتے ہیں اور کتنے زور سے چیں چیں کرتے ہیں۔ مگر ماں بیچاری کا دل دھڑکتا رہتا ہے کہ مبادا دانہ لینے جائے اور گرفتارِ دام ہوجائے اور اس کے بچے تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔

اے نفسِ حریص تو دانے کے لیے تگ و دو کرنے والے اور مبتلائے دام ہونے والے پرندے سے کم نہیں ہے۔ پرندے نے سارے دانے کہاں چگے اور اس کے معدے نے ہر دانے کو کہاں قبول کیا مگر حرصِ دانہ بے چارے کو پابندِ دام بنا کے چھوڑتی ہے۔ جب معدے میں تکلیف ہوتی ہے تو پرندہ کہتا ہے کہ تلاشِ دانہ سے تو دام بہتر ہے۔ پرندے! حرص ترک کردے اور بقدرِ ضرورت دانہ وہاں سے لے جہاں مبتلائے دام ہونے کا خطرہ نہ ہو۔ چالاک پرندہ وہ ہے جو ہمیشہ اپنے اردگرد دیکھ رہا ہو مبادا کوئی مردار خوار پرندہ اس کا دامن گیر نہ ہوجائے۔ چور اسی کے پیچھے لگتا ہے جس کے ہاتھوں گرفتار ہونے کا اسے خدشہ نہ ہو۔ جسے احمق دیکھیں، لوگ اس کی ہنسی اڑاتے ہیں:

بر سرِ دانہ مرغکی صد بار	بنگرد پیش و پس، یمین و یسار
جان او بہر آن بد اندیش است	کش غم جان ز عشق نان بیش است

کہاں ہے وہ دوست جو اپنے کھائے ہوئے دانے کو بھی احتیاط سے دیکھے کہ نفس کے مردار خوار نے اس میں حرام نہ ملا دیا ہو، ہوسِ شیطانی کی بلّی نے اس میں منہ نہ مار دیا ہو یا قہرِ حق کا دام اس کے پیچھے پوشیدہ نہ ہو؟ دانے کے دو رُخ اجنبی عورت کے دو گال جانیے۔ خوش بخت وہ ہے جسے اس زیبا رو کے گال پر توجہ نہ ہو اور اس کے خمارِ چشم کا فریفتہ نہ ہو۔ بلکہ متنبہ ہو کہ یہ غیبی جاسوس اُسے گرفتار کرنے نہ آیا ہو:

منگر اندر بتان کہ آخر کار	نگرستن گرستن آرد بار
اوّل آن یک نظر نماید خرد	بعد آن مرغ جنت دانہ ببرد

ڈاکٹر محمد حنیف

شیخ سعدی لاہوریؒ

(متوفّی ۱۱۰۸ھ بمطابق ۱۶۹۶ء)

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح اس خطۂ ارض میں بھی دینِ اسلام کی اشاعت و حفاظت کا سہرا علما و مشائخ کرام کے سر ہے کیوں کہ ہر دور میں مذہب و سیاست دونوں کے میدان میں قیادت انھی حضرات نے فراہم کی ہے اور خصوصاً طریقۂ نقشبندیہ کے اکابر نے تو اس سلسلے میں بڑی اہم اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

طریقۂ نقشبندیہ کے بانی حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ (متوفی ۷۹۱ھ بمطابق ۱۳۸۸ء) اگرچہ بخارا میں مقیم تھے مگر وہیں سے اپنے مریدین و متوسلین کے ذریعے ساری دنیا پر ضیا پاشی کرتے رہے، جہاں تک برصغیر کا تعلق ہے یہاں ناشر الطریقۃ النقشبندیہ فی الہند حضرت خواجہ باقی باللہؒ (المتوفی ۱۰۱۲ھ بمطابق ۱۶۰۳ء) نے اس سلسلے کی بنیاد رکھی اور آپ کے بعد آپ کے بے شمار بالواسطہ اور بلاواسطہ مریدین نے اس طریقے کو بے حد مقبولِ عام بنایا۔

تاریخ کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ جب بھی یہاں خدمتِ اسلام کی کوئی تحریک اٹھی اس کی پشت پر انھی بوریا نشین حضرات کا سوزِ دروں کارفرما رہا، اور جب بھی گلشنِ اسلام کو تاراج کرنے کی کوئی سازش کی گئی تو یہی بندگانِ خدا سینہ سپر ہو کر میدان میں کود پڑے ہیں۔

اکبر کے دور میں جب الحاد و لادینیت کا سیلاب اُمنڈ آیا تو اس کا رُخ پھیرنے کے لیے بھی علمائے دین اور مشائخ کرام ہی میدان میں اترے، جنھوں نے اپنے اپنے انداز میں بے حد خدمات انجام دیں۔ حضرت خواجہ باقی باللہ اور ان کے مریدِ خاص حضرت مجدد الف ثانی نے نہایت عمدہ اور موثر طریقے سے تبلیغ اسلام کا سلسلہ شروع فرمایا۔ پھر حضرت مجدد کے خلیفہ سید آدم بنوری (متوفی ۱۰۵۳ھ مطابق ۱۶۴۱ء) نے ارشاد و ہدایت کی مسند بچھائی اور اپنی دعوت و تبلیغ سے بے شمار حضرات کو متاثر کیا۔

ان حضرات میں سے ایک بزرگ حضرت شیخ سعدی لاہوری بھی ہیں جنھیں حضرت سید آدم بنوری کے خلفا میں نہایت بلند اور نمایاں مقام حاصل ہے۔

آپ کا نام سعدی، کنیت ابو علیٰ اور والد بزرگوار کا نام ابدال ہے۔ ۱۰۳۳ھ بمطابق ۱۶۲۳ء میں ایمن آباد[1] کے قریب ادی[2] کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن پنجاب اور آبائی پیشہ کاشت کاری تھا۔[3]

---

[1] ایمن آباد گوجرانوالہ کے جنوب مشرق میں آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور ایمن آباد ریلوے اسٹیشن سے بجانب مشرق صرف دو میل دور ہے۔ اس کو سیالکوٹ کے ایک مشہور راجپوت راجہ نے آباد کیا تھا۔ اصل قدیم سید پور کے نام سے مشہور تھا جو سولھویں صدی عیسوی میں شیر شاہ افغان کے ہاتھوں ویران ہوا اور اس کی جگہ شیرگڑھ کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا گیا۔ بعد میں ہمایوں کے ایک جرنیل ایمن بیگ نے شیرگڑھ کو منہدم کر کے موجودہ شہر ایمن آباد تعمیر کرایا۔ اس شہر کی ایک مشہور تاریخی یادگار روڑی صاحب کا گوردوارہ ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہاں سکھوں کے رہنما گورو نانک نے پتھروں کی روڑی کے ایک چبوترے پر اپنا بچھونا بچھایا تھا۔ یہاں ہر سال اپریل کے مہینے میں بیساکھی کا مشہور میلہ لگتا ہے اور اس موقعے پر سکھ زائرین کثیر تعداد میں ہندوستان سے پاکستان آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:
Destrict Sensas of Gujranwala 1961, Chapter III

[2] ظواہر السرائر کا جو نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں موجود ہے اس کے ص ۱۴۲ پر اس گاؤں کا نام "آوی" لکھا ہے جب کہ اس کتاب کے ایک دوسرے دستیاب نسخے میں یہ نام "ادی" تحریر کیا گیا ہے مگر چونکہ پنجاب گزیٹیر اور ضلع گوجرانوالہ کی مردم شماری رپورٹ میں اس نام کا کوئی گاؤں موجود نہیں اور نہ کسی دوسرے ذریعے اس کی تائید ہو سکی لہٰذا وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ اس گاؤں کے نام کا اصل تلفظ کیا ہے، ممکن ہے دور زمانہ کے ساتھ ساتھ بہت سے شہروں اور مقامات کی طرح اس گاؤں کا نام بھی بدل کر کوئی دوسرا نام رکھا گیا ہو یا تغیرات و انقلابات زمانہ کا شکار ہو کر اس کا نام و نشان ہی مٹ چکا ہو۔

[3] ملاحظہ ہو ظواہر السرائر (کتب خانہ شہر کوہاٹ) ص ۲۱۸۔ جناب عبدالحلیم اثر نے اپنی کتاب روحانی رابطہ کے صفحہ ۲۴۸ پر حضرت سعدی کا مقام پیدائش سرہند اور سن پیدائش ۱۰۰۲ھ بتایا ہے مگر شیخ سعدی کے مرید حضرت محمد عمر چکنی (المتوفی ۱۱۹۰ھ) کے فرق الذکر بیان سے مولف موصوف کی دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

آپ کی ولادت کے بارے میں دو صاحبانِ کشف و کرامت فقرا کی پیشین گوئی

سعدی لاہوری کی زندگی عجیب و غریب واقعات کی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ آپ کے والد ماجد کا بیان ہے کہ ایک زمانے میں میں دولت مند تھا۔ مگر چونکہ گھر میں نرینہ اولاد نہ تھی اس لیے ہر وقت دل میں بیٹے کی تمنا موجزن رہتی تھی۔ اس سلسلے میں ہمیشہ علما و فقرا سے دعا کی درخواست کیا کرتا تھا۔ فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک صاحب کرامت درویش آیا۔ میں اس کو عزت و احترام سے اپنے گھر لے گیا۔ حتی المقدور اس کی خدمت اور مہمان داری کے حقوق ادا کیے۔ جب وہ جانے لگا تو اس سے بیٹے کے لیے دعا کی التجا کی۔ یہ سن کر اس بزرگ کے چہرے پر بشاشت و مسرت کے آثار نمودار ہوئے اور ایک باکمال و سعادت مند فرزند کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا کہ "اللہ کی توفیق و تائید سے تیرے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوگا جو اپنے آئینۂ سر کو اخلاق ذمیمہ کی برائیوں سے پاک کرے گا اور اپنے چہرۂ روح کو صفاتِ حمیدہ کے زیور سے آراستہ کرے گا تا آنکہ حدِ استقامت کے قریب ہو جائے گا اور اس کمال کے حصول سے صراطِ مستقیم پر چلنے کو اپنے لیے آسان کرے گا اور اوصافِ کمال جو فضائل اخلاق انسانی کے اصول ہیں وہ دس ہیں، اور تمام اچھی صفات کی شاخیں انہی سے نکلتی ہیں۔ وہ دس اصول یہ ہیں — علم، حلم، حیا، سخاوت، تقویٰ، شجاعت، عدل، صبر، صدق اور یقین — ان صفات کا کمال ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور میں نہیں پایا جاتا۔ انبیا، صلحا اور علمائے دین میں سے ہر ایک کو ان حقائق کی مقدار حصول کی نسبت سے روحانیتِ احمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رابطہ قائم ہوتا ہے۔ تیرا بیٹا ان حضرات میں سے ایک ہوگا جو ان صفات کے حقائق سے متصف ہوگا، وہ اللہ کا منظورِ نظر ہوگا۔ وہ اپنے دور میں بے مثل اور دنیا والوں کا رہبر ہوگا۔ طہارت و صفائی، محبت و شوق اور رضا و توحید کی صفات اس پر غالب ہوں گی اور ان صفاتِ کاملہ کے آثار اس پر واضح ہوں گے۔ مشرق و مغرب اس کی دعوت و ارشاد سے منور ہو جائیں گے اور اس کی ذات دنیا والوں کے لیے غنیمت ہوگی۔ اس کا نام "محمد صادق" یا "سعدی" رکھنا اور اس سے محبت رکھنا۔"[1]

فرماتے ہیں کہ جب سعدی حکمِ ایزدی سے ماں کے پیٹ میں قرار پائے اور ابھی چند ماہ کے تھے کہ ایک اور

---

[1] ظواہر السرائر۔ کتب خانہ کوہاٹ۔ ص ۱۶۵

صاحب حال فقیر آیا۔ اس کو بھی اپنے ہاں ٹھہرایا اور اس کی خدمت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، میں نے اس سے بھی بیٹے کے لیے دعا کی درخواست کی۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اور مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا!

" سعدی مبارک ہو اور یہ ایک بیٹا ہے جو آپ کے ہاں پیدا ہوگا، جو بساط رضا و شکر میں ملازم اور کفر و شر کے آثار کو مٹانے والا ہوگا۔ اگرچہ وہ جہلا کی نظر میں حقیر و بے مقدار ہوگا مگر درگاہِ الٰہی میں بہت بڑا اور بزرگوار ہوگا۔ فیوض ربانی کو پھیلانے کے لحاظ سے ایک پورا جہان ہوگا۔ اس کے اچھے اخلاق و افعال کی متابعت اہلِ زمانہ کے لیے حصول ثواب کا سبب ہوگی اور اس کے آثار اہلِ زمانہ کے لیے رشد و ہدایت کی دلیل ہوں گے۔ تیرا دہ بیٹا عالم علوم اور اساطینِ اربابِ طریقت میں سے ہوگا۔ اس کا نام سعدی رکھنا، اس کی سعادت مندی کا آفتاب ساری دنیا میں چمکے گا" [۵۵]

اللہ کی شان دیکھیے! ان دو درویشوں کی پیش گوئی حرف بحرف سچ ثابت ہوئی اور دنیا نے دیکھا کہ خدائے ذوالجلال نے واقعی آپ کو جلال و جمال کے تمام اوصاف سے مزین فرمایا تھا۔

رہتاس میں آمد اور جن ولی کا ظہور

خداوند کریم نے شیخ سعدی لاہوری کو نہایت تیز حافظہ عنایت فرمایا تھا۔ ابتدا سے لے کر آخر تک اپنی زندگی کے تمام حالات خود بیان کیے ہیں۔ چنانچہ اپنے زمانۂ طفولیت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سفر کشمیر کے دوران جب سلطان جہانگیر (المتوفی ۱۰۳۷ھ بمطابق ۱۶۲۷ء) کا انتقال ہوگیا اور لوگ اس کی لاش کو لاہور لے جارہے تھے، ہمارے گاؤں سے بہت سے آدمی اس کی لاش اور لاؤ لشکر کو دیکھنے کے لیے چل پڑے۔ میرے والد ماجد بھی مجھے کندھے پر بٹھا کر اس راستے کی طرف نکل آئے، اس وقت میری عمر تقریباً تین برس کی تھی [۵۶]

سعدی فرماتے ہیں کہ میرے نانا رہتاس میں رہتے تھے اور میری نانی صوم و صلوٰۃ کی پابند ایک زاہدہ و عابدہ اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ میں پانچ برس کا تھا کہ وہ مجھے رہتاس [۵۷] لے گئیں اور جب میں

---

[۵۵] ظواہر السرائر، ورق ۲۱۸ [۵۶] ظواہر السرائر (کوہات)، ص ۲۲۳

[۵۷] رہتاس (یا روتاس) ایک مشہور قلعہ ہے جس کا بانی شیر شاہ سوری ہے اور جہلم سے مغرب کی جانب دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ (تاریخ سلطانی، ص ۴۶ - اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۵۵۷۔

بچپن میں ہم سن بچوں کے ساتھ محلہ رہتاس سے باہر آتا تھا تو میری نانی فرماتیں کہ قلعے کے دروازے کی جانب ایک لال برج ہے وہاں ایک جن ولی رہتا ہے اس طرف ہرگز نہ جانا ایسا نہ ہو وہ تجھ پر ظاہر ہو جائے اور تجھے اس کے دیکھنے کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے نقصان پہنچ جائے۔ سعدی فرماتے ہیں کہ اس وجہ سے میں اس طرف جانے سے احتراز کرتا تھا۔ اتفاقاً ایک رات میں پڑوس کے لڑکوں کے ساتھ قلعے سے باہر آیا۔ جب رات کا کچھ حصہ گزر چکا تو تمام لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور میں تنہا ایک پتھر پر بیٹھا رہ گیا۔ دریں اثنا میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر وہ جن ولی، جو اس برج میں رہتا ہے اور میری نانی اکثر اوقات مجھے اس کے متعلق بتاتی ہیں اور اس طرف جانے سے روکتی ہیں، ظاہر ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ یہ خیال آتے ہی اس برج سے روشنی نمودار ہوئی اور ساتھ ہی نقارہ بجنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ میں عصا لیے ہوئے، دستار باندھے ہوئے، سفید لباس میں ملبوس ایک معمر بارعب بزرگ ظاہر ہوا۔ وہ نہایت وقار و تمکنت سے آگے بڑھتا ہوا میرے بہت قریب آپہنچا۔ میں نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی اور اپنے کام میں لگا رہا۔ وہ میرے پاس بہت دیر تک کھڑا رہا، میں سمجھ گیا کہ وہ میرے حال کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ اس لال برج کی جانب روانہ ہوا اور روشنی غائب ہو گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اپنی خبر نہ رہی۔

جب آپ کی نانی نماز تہجد کے لیے اٹھیں اور آپ کو بستر میں نہ پایا تو نہایت اضطرار و اضطراب کی حالت میں تمام گھر والوں کو بیدار کر کے آپ کی تلاش شروع کی۔ بہت جستجو کے بعد ایک پتھر پر آپ کو استغراق کی حالت میں پایا اور وہاں سے اٹھا کر گھر لے گئے۔

اس واقعے کے بعد آپ پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ ہر وقت مستغرق رہتے اور اپنی اور دوسروں کی قطعاً خبر نہ رہتی۔ جب دو تین روز کے بعد ہوش میں آتے تو فوراً صحرا کی طرف چل کر وہاں کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جاتے۔ کھانے پینے سے قطعاً لاتعلق رہتے اور شدید گرمی کے موسم میں مراقبے میں ایسے مستغرق ہوتے کہ سورج نصف النہار پر ہوتا لیکن آپ شدت گرمی سے بے خبر ہوتے تھے۔

ایمن آباد میں واپسی

آپ کی نانی اماں حتی المقدور آپ کو گھر سے باہر نہیں جانے دیتی تھیں مگر آپ موقع پا کر صحرا کی جانب نکل جاتے اور وہاں مراقبے میں مشغول ہو جاتے۔ اکثر و بیشتر رات وہیں گزارتے۔ یہ حالت دیکھ کر

آپ کی نانی پریشان ہوئیں لہٰذا آپ کو لاکر والدین کے سپرد کر دیا، وہاں بھی یہی دستور رہا۔ لوگوں سے کنارہ کش ہوکر صحرا میں چلے جاتے۔ ایک بار آپ حسبِ معمول صحرا میں تشریف لے گئے، آپ کے والد ماجد تحقیقِ احوال کی خاطر آپ کے پیچھے چلے گئے اور کچھ فاصلے پر دور بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگے۔ اتنے میں ایک بڑا سانپ آیا اور آپ کے والد ماجد کی پشت پر چڑھ گیا اور اپنا سر ان کی گردن کے برابر سے نکالا۔ یہ دیکھ کر ان پر ہیبت طاری ہوگئی اور بے اختیار ہوکر زور زور سے چلائے۔ حضرت سعدی نے مراقبے سے سر اٹھاکر پیچھے دیکھا اور جوں ہی آپ نے نگاہ ڈالی، وہ سانپ اُتر کر صحرا کی جانب چل دیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر آپ کے والد بزرگوار نے معذرت چاہی اور کہا کہ میرے دل میں جو خدشہ پیدا ہوگیا تھا اب وہ جاتا رہا اور معلوم ہوا کہ تجھ پر جذبۂ شوقِ الٰہی کا غلبہ ہوگیا ہے سو جہاں چاہو رہو، تمھارے ذمے جو میرے حقوق تھے وہ میں نے معاف کر دیئے [۵۸]

ایمن آباد سے آٹھ میل کے فاصلے پر ایک گنجان جنگل واقع تھا، جہاں جنگلی جانور اور درندے بکثرت رہتے تھے۔ جب آپ کی عمر سات برس کی ہوئی تو اسی جنگل میں جاکر مسلسل کئی کئی دن اور راتیں گزارتے تھے۔ سانپ آتے اور آپ کے سر اور بازوؤں سے لپٹ جاتے اور جنگلی جانور آپ کے گرد حلقہ باندھ کر جمع رہتے۔ آپ کے والد کا بیان ہے کہ جب چند دن گزر جاتے اور آپ گھر نہ آتے تو مجبور ہوکر میں اس پُرخطر جنگل میں چلا جاتا۔ وہاں جاکر دیکھتا کہ جنگلی جانور اور درندے سعدی کے گرد حلقہ باندھے ہوئے ہیں اور وہ ان کے درمیان یادِ الٰہی میں مصروف اپنے خالق و مالک کے ساتھ لو لگائے ہوئے بیٹھے ہیں جب مراقبے سے سر اٹھاتے اور مجھ پر نظر پڑتی تو آدابِ فرزندانہ بجالاکر بہت زیادہ منع کرتے اور فرماتے کہ:

درچنیں محل مہیب و ہولناک نمی آمدہ باشید مبادا از ایں سباع و وحوش شمارا آسیبی و گزندی رسد [۵۹]

یعنی ایسی خوف ناک و ہولناک جگہ میں نہیں آنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ درندوں اور جانوروں سے آپ کو کوئی گزند پہنچ جائے۔

سعد اللہ وزیر آبادی کی معیت میں سید آدم بنوریؒ کی خدمت میں پہلی بار حاضری

حضرت سعدی لاہوری کو کم عمری میں حضرت سید آدم بنوری کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا شرف

---

۵۸ جواہر اسرار (مخطوطہ)، ص ۱۷۳، ۱۷۴
۵۹ ایضاً، ص ۱۷۴، ۱۷۵

حاصل ہوا۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ میری عمر آٹھ یا نو برس کی تھی کہ ایک روز میں جنگل سے باہر آیا اور گاؤں کے قریب ایک کنوئیں کے کنارے وضو کرنے لگا۔ اتنے میں مولانا سعد اللہ وزیر آبادی، سید آدم بنوریؒ کی ملاقات کی غرض سے فقرا کی ایک جماعت کے ہمراہ اس راستے سے گزرے۔ جب مجھ کو وضو کرتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور اپنے احباب و رفقا سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "اس کم عمری میں یہ بچہ کتنی احتیاط کے ساتھ وضو کر رہا ہے، اس کے بعد مجھ سے پوچھا کہ یہیں رہتے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں۔ آپ چل پڑے تو میں نے سید موصوف کے بعض دوستوں سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سعد اللہ وزیر آبادی ہیں اور اپنے پیر کے حضور میں بنور جا رہے ہیں۔ بنور کا نام میرے ذہن میں پہلے سے موجود تھا۔ چنانچہ چند دن گزرنے کے بعد جذبۂ شوقِ الٰہی اور محبتِ باطنی نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔ لہٰذا میں بھی بنور کی جانب روانہ ہوا۔ دریائے لدھیانہ کے قریب حاجی سعد اللہ کی جماعت سے جا ملا۔ بنور پہنچ کر سید آدم بنوری کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ سید آدم بنوری نے سعد اللہ وزیر آبادی سے ہر فقیر کے متعلق علیحدہ علیحدہ دریافت کیا۔ آخر میں میری باری آئی تو پوچھا یہ لڑکا کون ہے؟ مولانا سعد اللہ نے فرمایا کہ یہ بچہ بھی ہمارے ہمراہ آیا ہے اور عجیب و غریب احوال و معاش کا مالک ہے۔ راستے میں نہ تو کہیں کھانے پینے کی طرف رغبت ظاہر کی نہ فقرا کے ساتھ میل جول رکھا، ہمہ وقت ذکر و فکر میں مشغول رہتا ہے۔ یہ سن کر حضرت سید آدم بنوریؒ نے مولانا موصوف سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ،

"مگوئید کہ ایں پسر ہمراہ من آمدہ است بلکہ گوئید کہ ما ہمراہ ایں پسر آمدہ ایم و ایں پسر سعادت مند ازلیست و مقبول لم یزلی اگر بروز حشر و نشر حق سبحانہٗ شما را بخشد بہ طفیل بہ خواہد بود کہ چنیں مردی بہ رفاقت شما در ینجا رسیدہ است [۱۰]

یعنی یہ مت کہو کہ لڑکا ہمارے ہمراہ آیا ہے بلکہ یہ کہو کہ ہم اس لڑکے کے ہمراہ آئے ہیں۔ یہ لڑکا ازل سے سعادت مند اور خدا وند لم یزل کی درگاہ میں مقبول ہے۔ اگر قیامت کے دن خدا تم کو بخش دے تو اس بچے کے طفیل سے بخشے گا کہ ایسا آدمی تمھاری رفاقت میں یہاں آیا ہے۔

---

[۱۰] ظواہر السرائر (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) ص ۲۳۰

شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ حضرت سید آدم بنوری نے مجھے بلا کر پوچھا۔ "تیرا نام کیا ہے"۔ میں نے کہا "سعدی"۔ یہ سن کر مبارک باد دی اور فرمایا۔ جہاں کہیں بھی رہو تم سعدی ہو اور جہاں کہیں بھی جاؤ تم سعدی ہو اور پھر مکرر فرمایا۔ سعدی! سعدی!! سعدی!!! جس کسی کو ازل نے سعادت مند بنایا ہے وہ ہر وقت اور ہر گھڑی سعادت مند ہے۔

اس گفتگو کے بعد حضرت سید آدم بنوری نے آپ کے ساتھ نہایت محبت و شفقت کا اظہار کیا، ذکر باطنی کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ مند کیا اور بعد ازاں اپنے حرم محترم میں لے جا کر نوازشات بے غایات سے سرفراز فرمایا۔ حضرت سعدی اس ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

پس غایت ہائے بے شمار و تلطفات بسیار کردہ و ہمراہ خود بہ حرم محترم بردہ و بہ اہل حرم ہم مخاطب شدہ فرمودہ کہ امروز کودک خرد سال صالح، سعادت مند ازلی رسیدہ است کہ بہ غایت نیکو می نمایند و دریں اوان طفولیت و خرد سالی بہ صحبت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مشرف و معزز و مکرم است و حضرت فاطمۃ الزہرا وی را بہ فرزندی قبول کردہ است و کار او بہ غایت عجیب و معاملہ غریب است [۱۱]

پس بہت زیادہ لطف و کرم فرمایا اور اپنے حرم محترم میں اپنے ساتھ لے گئے اور اہل خانہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آج ایک صالح سعادت مند ازلی چھوٹا بچہ پہنچا ہے کہ بہت ہی اچھا معلوم ہوا ہے اور اس بچپن کے زمانے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے مشرف ہے اور حضرت فاطمۃ الزہرا نے ان کو اپنی فرزندی میں قبول کیا ہے اور اس کا کام اور معاملہ بہت ہی عجیب و غریب ہے۔

شیخ اسد اللہ لاہوریؒ کے ہمراہ حضرت سید آدم بنوریؒ کی خدمت میں حاضری

سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد حضرت سعدی لاہوری نے نوکری اختیار فرمائی [۱۲]۔ ایک دن اپنے

---

[۱۱] ظواہر السرائر (لاہور)، ص ۲۴۱

[۱۲] شیخ سعدی نے نوکری کس کے ہاں اختیار کی تھی۔ اس بارے میں مستند معلومات دستیاب نہ ہو سکیں۔ ظواہر السرائر اس سلسلے میں خاموش ہے اور نتائج الحرمین میں نوکری کا ذکر کیا گیا ہے، مگر آقا کا نام نہیں بتایا گیا ہے۔ شیخ اسد اللہ نے بھی اپنے بیان میں صرف آقا کا لفظ استعمال کیا ہے۔ خزینۃ الاصفیا میں نوکری کا ذکر موجود نہیں،

آقا کے ہمراہ شیخ اسداللہ لاہوری[۱۱۳] کی خدمت میں حاضری دی۔ شیخ اسداللہ فرماتے ہیں کہ پہلے سعدی کے آقا نے طریقۂ مروجہ کے مطابق سلوک وطریقت میں تلقین حاصل کی۔ اس کے بعد کہا کہ میرے نوکر کو بھی اس طریقے کی تلقین کیجیے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ تلقین کے بعد وہ بے شعور رہا اور چند روز تک استغراق میں مست پڑا رہا، جب میں اس پر متصرف ہونے سے قاصر رہا تو مجبوراً اسے حضرت سید آدم بنوری کی خدمت میں لے گیا اور اسی روز سے آپ مستقلاً حضرت آدم بنوری کی صحبت و تربیت میں رہ کر ترقی کی منازل طے کرتے رہے۔

شیخ اسداللہ لاہوری کی زبانی یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"چوں حال او بہ کمال ترقی گرفتہ بود و در خود قوت آں نہ دیدم کہ براحت صرف شوم ناچار پیش مرشدی خلیفہ الزمان آوردم ایشان چون مریدان مرا دیدند ہر یک را احوال پرسی کردند و شیخ سعدی را ہیچ نہ گفتند روزی فرمودند یا اسداللہ در یاران تو ایں پسر خوب صاحب استعداد است و تربیت او بر ما ست ازاں او در تربیت آنحضرت بودہ و روز بروز ترقی میکرد۔"[۱۱۴]

چوں کہ اس کا حال ترقی کی منزل تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے اپنے اندر وہ طاقت نہ پائی کہ ان پر متصرف ہو جاتا۔ مجبوراً اپنے پیر و مرشد خلیفۃ الزمان (حضرت سید آدم بنوریؒ) کے پاس لے آیا۔ آپ نے میرے مریدوں کو دیکھا تو ہر ایک کا حال پوچھا اور شیخ سعدی کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ ایک دن مجھے فرمایا کہ اے اسداللہ! تیرے دوستوں میں یہ لڑکا بہت صاحب استعداد ہے اور اس کی تربیت ہمارے ذمے ہے (اور) اسی روز سے وہ (سعدی) ان کی

(بقیہ حاشیہ[۱۱۲]) البتہ صاحب تحقیقات چشتی نے شیخ سعدی کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ "آپ ابتدا میں شاہ جہان کی فوج میں ملازم تھے۔ کسی دوسرے مستند ذریعے سے اس کی تائید نہ ہو سکی لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ آپ شاہ جہان کی فوج میں ملازم رہے، کیوں کہ زمانہ ایک ہے اور تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ شاہ جہان اور اورنگ زیب کی فوج میں بڑے بڑے اصحاب طریقت بزرگ ملازم رہے ہیں۔ واللہ اعلم

[۱۱۳] شیخ اسداللہ لاہوری، حضرت سید آدم بنوری کے محبوب مقبول احباب میں سے تھے اور اپنے دور کے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔ نتائج الحرمین (قلمی) مولانا محمد امین چشتی ۱۱۴۱ھ، ص ۱۹۹، ۲۰۳

[۱۱۴] ملاحظہ ہو نتائج الحرمین از مولانا محمد امین چشتی، ص ۱۹۹، ۲۰۳۔

تربیت میں رہ کر روز بروز ترقی کرتے رہے۔

سید آدم بنوری سے بیعت

حضرت سعدی کو خداوند کریم نے بے حد عنایات و نوازشات سے سرفراز فرمایا تھا اور ایسی استعداد بخشی تھی کہ ان کو تربیت و تلقین کی بھی ضرورت نہ رہی تھی۔ حضرت سید آدم بنوریؒ نے ایک بار ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ :

بہ رب المعبود جل سلطانہٗ قسم است کہ اللہ تعالیٰ بہ ارادۂ ازلی استعداد ترا چنان آفریدہ است وفطرت تو چنان خلقت کردہ است کہ خود بخود کار تو جاری است و ہیچ موقوف بہ تلقین و تربیت من نیست۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔[۱۵]

خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادۂ ازلی سے تیری استعداد ایسی پیدا فرمائی ہے اور تیری فطرت ایسی بنائی ہے کہ تیرا کام خود بخود رواں دواں ہے اور میری تلقین و تربیت پر کچھ منحصر نہیں۔

مگر چوں کہ راہِ سلوک کی جادہ پیمائی میں کسی رہبر کامل کی ضرورت ہے اس لیے آپ حضرت سید آدم بنوریؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔

"فقیر ولی مادرزادم اما دریں راہ از پیر ناگزیر است لہٰذا بر دست پیر کامل بیعت کردم کہ جامع مقامات حضرت بزرگ خود است۔"

فقیر مادرزاد ولی ہے ... مگر اس راہ میں پیر کا ہونا ضروری ہے پس پیر کامل کے ہاتھ پر بیعت کی کہ وہ پیر کامل جامع مقامات حضرت بزرگ خود (سید آدم بنوریؒ) ہیں۔

حضرت سید آدم بنوری کے خلفا میں سعدی کا مقام

حضرت سعدی لاہوری کا شمار سید آدم بنوری کے جلیل القدر خلفا میں ہوتا ہے اور آپ کے مریدین میں ان کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ حضرت مولانا سید محمد قطب[۱۶] فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ آرزو

---

[۱۵] ظواہر السرائر (کوہاٹ)، ص ۱۵۸

[۱۶] حضرت مولانا سید محمد قطبؒ، حضرت سید آدم بنوری کے صاحب زادے سید خواجہ محمد کے فرزند اور حضرت شیخ سعدی لاہوری کے منظور نظر مرید و رفیق تھے۔ ۱۰۵۲ھ بمطابق ۱۶۴۲ء میں بنوڑ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ۱۱۰۸ھ مطابق ۱۶۹۶ء [illegible] ملاحظہ ہو ظواہر السرائر (لاہور) ۵۴۹ - ۵۵۱

تھی کہ حضرت سید آدم بنوری کے خلفا و اصحاب کی نسبت[17] مجھ پر عیاں ہو جائے لہٰذا اپنے پیر و مرشد حضرت سعدی کی خدمت میں درخواست کی جس کے بعد آپ نے رضامندی کا اظہار کر کے وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت میاں صاحب چمکنی ان کی زبانی یہ واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" التفات خاطر شریف بہ من گماشتند و نسبت جمیع اصحاب و خلفا حضرت بزرگ خود بہ من نمودند و ظاہر ساختند۔ نسبت حضرت ایشان را مون ماہ شب چہاردہ دیدم کہ نوروی محیط تمام عالم بودہ و نسبت ہائی دیگر اصحاب و خلفا حضرت بزرگ خود در جنب نسبت آنحضرت چون ستارہ گان می درخشند و می تابند"[18]

(آپ) میری طرف متوجہ ہوتے اور حضرت خود (سید آدم بنوریؒ) کے تمام اصحاب و خلفا کی نسبت مجھ پر ظاہر کر دی۔ میں نے دیکھا کہ حضرت ایشان (سعدی) کی نسبت چودھویں چاند کے مانند روشن ہے اور سید آدم بنوری کے دوسرے اصحاب کی نسبتیں آپ کے گرد ستاروں کی طرح روشن تھیں۔

سفرِ حجاز

آپ پہلی بار ۱۰۵۲ھ بمطابق ۱۶۴۲ء میں اور دوسری بار ۱۰۷۶ھ بمطابق ۱۶۶۵ء میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ۱۰۵۲ھ کا واقعہ ہے کہ حضرت سید آدم بنوری اپنے متعدد مریدین و معتقدین کی معیت میں لاہور تشریف لائے۔ آپ کے معاندین نے بادشاہِ وقت شاہجہان کو خبر پہنچائی کہ سید آدم بنوری کے ہمراہ اتنے زیادہ لوگ ہیں کہ وہ کسی وقت بھی حکومت کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ یہ سن کر بادشاہ نے اپنے وزیر سعد اللہ خان کو تحقیق حال کی خاطر ان کے پاس بھیجا۔ حضرت سید آدم بنوری اس کے ساتھ نہایت بے توجہی سے پیش آئے۔ کافی دیر تک تو ہم کلام نہ ہوتے اور جب کلام کیا تو وہ بھی حُبِ دنیا کے ترک کرنے کی نصیحت فرمائی۔ نواب سعد اللہ خان آپ کے اس طرزِ عمل سے رنجیدہ خاطر ہوئے، لہٰذا بادشاہ کے پاس جا کر اس خبر کی تصدیق کر دی اور شدہ رہ

---

[17] اشتغال بالذکر سے قلب میں ایک کیفیت غ یبہ لذیذہ پیدا ہو جاتی ہے اور مواظبت سے اس میں رسوخ ہو جاتا ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں اس کو نسبت (کیفیت باطنی) کہتے ہیں۔ (التکشف عن مہمات التصوف از مولانا اشرف علی تھانوی مطبع لاہور ۱۹۶۰ء، ص ۲۹۱

[18] ظواہر السرائر (لاہور)، ص ۵۲۹

دیا کہ سید آدم بنوری کو کسی بہانے یہاں سے رخصت کیا جائے۔ چنانچہ شاہجہان نے سرزمینِ ہند سے آپ کے اخراج کا حکم صادر کر دیا۔ جب ولی عہد دارا شکوہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو بہت خفا ہوئے اور بادشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"باچنیں بزرگان چنان سلوک بادشاہان را نقصان کلی دارد وسعادت ما و شما بود کہ ملک ہند ہمچو نادر الوجود آمد و شما بہ گفتہ حاسدان ایشان را از ملک خود اخراج فرمودید نمی دانید کہ علمائے ظواہر ہمیشہ با بزرگان دین معاند و حاسد بودہ اند و حتی المقدور در آزار و تصدیع اہل اللہ کوشیدہ اند"[۹]

ایسے بزرگوں کے ساتھ بادشاہوں کا اس قسم کا سلوک سراسر موجب نقصان ہے۔ میری اور آپ کی نیک بختی یہ تھی کہ سرزمینِ ہند میں ایسی نادر الوجود ہستی آئی ہے اور آپ نے حاسدوں کے کہنے پر ان کو اپنے ملک سے نکال دیا۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ علمائے ظاہر ہمیشہ سے بزرگانِ دین کے مخالف رہے ہیں۔

دارا شکوہ کا بیان سن کر بادشاہ کا سر ندامت سے جھک گیا اور فوراً اپنے ایک امیر میر منصور بدخشی کو خلعتِ شاہانہ دے کر سید آدم بنوری کی خدمت میں بنور بھیجا۔ مگر اس کے آنے سے پہلے آپ حج کی نیت سے وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ شیخ سعدی کو اس سفر میں حضرت آدم بنوری کی رفاقت نصیب نہیں ہوئی کیوں کہ اس موقعہ پر آپ کے والد آپ کی ملاقات کے لیے لاہور آئے تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ سعدی بھی سید آدم بنوری کے ہمراہ سفر حج کا ارادہ رکھتے ہیں تو ان سے چند دنوں کی اجازت چاہی تاکہ اس فرصت میں وہ اپنی والدہ سے ملاقات کر سکیں۔ حضرت سید آدم بنوری نے یہ درخواست منظور کی اور سعدی کو رخصت ہونے سے پہلے مجاز و ماذون کر کے کلاہِ خلافت سے سرفراز فرمایا۔

حضرت سعدی والدہ سے ملاقات کے بعد واپس لاہور آئے تو معلوم ہوا کہ میر منصور بدخشی بادشاہ کے حکم سے بنور جا رہا ہے۔ آپ ان کے ہمراہ بنور روانہ ہوئے مگر ان کے پہنچنے سے پہلے سید آدم بنوری وہاں سے حجاز کی جانب چل پڑے تھے۔ آپ میر منعم بدخشی اور چند دیگر رفقا کے ساتھ ان کے تعاقب میں روانہ ہو کر مکہ مکرمہ پہنچ گئے مگر چونکہ ایامِ حج گزر چکے تھے۔ اس لیے اس سال حج کی سعادت

---

[۹] ظواہر السرائر (کو ہاٹ)، ص ۱۹۶ - ۱۹۷

نصیب نہ ہوئی۔

حضرت سید آدم بنوریؒ نے حج کے بعد مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا ارادہ فرمایا، مگر شدتِ گرمی کی بنا پر خود کچھ وقت تک اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور حضرت سعدی کو اپنا نائب مقرر کر کے احباب و رفقا کے ساتھ مدینہ منورہ رخصت فرمایا۔[۲۰]

گرمی کا موسم ختم ہوا تو حضرت سید آدم بنوریؒ بھی مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ مگر وہاں بیمار پڑ گئے اور ۱۳ شوال جمعہ کی صبح کو ۱۰۵۳ھ بمطابق ۱۶۴۳ء میں مدینہ میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔[۲۱]

حضرت سعدی فرماتے ہیں کہ جب حضرت سید آدم بنوریؒ کی زندگی کے آخری لمحات تھے، مجھے اپنے پاس بلایا اور تنہائی میں بے حد نوازشات کر کے اپنے سینۂ بے کینہ کے کمالاتِ لانہایت سے مشرف کیا اور اسم اعظم عطا فرمایا۔[۲۲]

مولانا یار محمد لاہوری کی صاحب زادی کے ساتھ نکاح

سید آدم بنوری کی وفات کے بعد شیخ سعدی وطن کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں شمس الدین خان قصوری کی التماس پر قصور میں چند دن قیام فرمایا۔ قصور سے رخصت ہو کر لاہور آئے اور چند دنوں کے بعد شمس الدین خان قصوری، شیخ بایزید اور بعض دیگر مخلص رفقا کی تحریک پر مولانا یار محمد لاہوری کی صاحب زادی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔[۲۳]

۲۰ھ ظواہر السرائر (کوہاٹ)، ص ۲۰۲ - ۲۰۴

۲۱ھ ظواہر السرائر (لاہور)، ص ۱۷۹ - ۱۸۰۔ جناب اعجاز الحق قدوسی نے اپنی کتاب "تذکرہ صوفیائے پنجاب" میں شیخ سعدی کے حالات کے ذیل میں سید آدم بنوری کی تاریخ وفات ۱۳ شوال کی جگہ ۲۳ شوال لکھی ہے، جس کی کسی دوسرے ذریعے سے تائید نہ ہو سکی۔ حضرت میاں صاحب چمکنی نے تاریخ وفات ۱۳ شوال بتائی ہے اس لیے قریب واقعہ ہونے کے سبب حضرت میاں صاحب کے قول کو ترجیح حاصل ہے۔ واللہ اعلم

۲۲ھ ظواہر السرائر (کوہاٹ)، ص ۲۱۱ - ۲۱۲

۲۳ھ ایضاً، ص ۲۱۲ - ۲۱۳ — مولوی نور احمد چشتی، شیخ سعدی کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ

لاہور میں پورے ۵۵ سال تک مخلوقِ خدا کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ بے شمار طالبانِ حق آپ کے چشمۂ فیض سے فیض یاب ہوئے اور بالآخر ۱۱۰۸ھ بمطابق ۱۶۹۶ء بدھ کے دن ۳ ربیع الثانی کو دینی علوم کا یہ آفتابِ درخشندہ غروب ہوگیا۔

حضرت سعدی اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت سعدی سچے عاشقِ رسول تھے اور آپ کے دل میں ہر وقت روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار میں ایام زندگی گزارنے اور مقاماتِ مقدسہ میں موت نصیب ہونے کی تمنا رہتی تھی جو بالآخر پوری ہوئی۔

فقر و تجرد کا حال

آپ ایک درویش منش بزرگ تھے۔ ابتدائے حال کے زمانے میں تقریباً ۲۵ برس تک نہایت

(بقیہ حاشیہ ۱۳۳) جب شیخ آدم بنوری بیت اللہ شریف کے سفر پر روانہ ہوتے تو اس وقت شیخ سعدی کو خلقِ خدا کے ارشاد و ہدایت کی خاطر لاہور میں چھوڑ گئے تھے۔ محمد دین کلیم نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ (لاہور میں اولیائے نقشبند کی سرگرمیاں از محمد دین کلیم، ص ۱۳۴) مگر راقم الحروف کو اس کے ساتھ اتفاق نہیں ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ حضرت آدم بنوری نے اس موقعہ پر اگرچہ حضرت سعدی کو خلافت سے نوازا تھا اور شیخ سعدی کے والد کی درخواست پر والدہ سے ملاقات کے لیے چند دنوں کی اجازت دے دی تھی لیکن ملاقات کے فوراً بعد وہ سید آدم بنوری کی رفاقت اختیار کرنے کے لیے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ مکہ میں ان سے ملے۔ مدینہ منورہ کے سفر میں ان کی نیابت کا فریضہ انجام دیا اور ان کی وفات تک مدینہ منورہ ہی قیام پذیر رہے۔ شیخ سعدی خود فرماتے ہیں کہ:

در وقت احتضار حضرت بزرگ خود من حاضر بودم۔ در وقت انقطاع نفس مبارک اشک از دیدہ حق بین جاری بود و چون نفس مبارک منقطع شد ہمچنان قطرات اشک از چشمان می رفت تا بوقتیکہ ایشان را غسل دادند قطرات اشک منقطع شدند۔ ظواہر السرائر (کوہاٹ)، ص ۱۹۶ - ۱۹۷

یعنی میں حضرت بزرگ خود (سید آدم بنوری) کے نزع کے وقت حاضر تھا۔ انقطاع نفس کے وقت آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ روح منقطع ہو جانے کے بعد بھی آنسو کے قطرات جاری رہے تا وقتیکہ ان کو غسل دیا گیا۔ اس کے بعد آنسو رک گئے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ سید آدم بنوری کی وفات کے بعد لاہور تشریف لاتے ہیں۔

فقر و فاقہ کی زندگی گزاری۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات کھانے کے لیے کچھ میسر نہ آتا تھا۔ یہ حال بیان کرتے ہوئے آپ خود فرماتے ہیں کہ جب بھوک کا غلبہ ہو جاتا تو میں دریا کی جانب نکل جاتا اور ریت کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتا تھا، جس سے بدن میں کچھ قوت پیدا ہو جاتی تھی[۲۴]

شادی (۵۳-۱۰۵۱ھ) کے بعد بھی کچھ مدت تک یہی کیفیت رہی یہاں تک کہ دس دس روز تک کھانے کے لیے کچھ نہیں ملا۔ حضرت سعدی فرماتے ہیں کہ شادی کے بعد میرے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی مگر گھر میں ایک بھی پیسہ نہ تھا جس سے بچی اور اس کی ماں کے لیے کھانے پینے اور دوا کا بندوبست ہو سکے۔ چنانچہ بھوک کی شدت کے باعث بچی کی ماں کے پستانوں میں دودھ خشک ہو گیا۔ بچی اکثر روتی رہتی جس کی وجہ سے اس کا جسم نہایت کمزور ہو گیا۔ یہ حالت دیکھ کر ایک دن اس کی جدۂ ماجدہ کو اس پر رحم آیا۔ گود میں اٹھا کر میرے پاس لے آئیں اور مجھے مخاطب ہو کر کہا کہ اس بچی پر رحم کرو۔ میں نے جواب میں کہا کہ حق تعالےٰ اس بچی پر ہم سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

خدا کا احسان تھا کہ رفیقۂ حیات بھی موافق حال ملی تھی۔ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے بیوی سے کہا کہ اپنے والدین کے ہاں چلی جاؤ، وہاں سامانِ زندگی موجود ہے۔ چند دن آرام ملے گا۔ بیوی نے جواب میں کہا:

مردن و زیستن بہ اختیار حضرت حق لایموت است جل شانہٗ۔

اس کے چند دن بعد وہ بچی خدا کو پیاری ہو گئی[۲۵]۔ بعد میں اگرچہ آپ کو ہر قسم کا سامانِ زندگی حاصل رہا مگر آپ ہمیشہ عیش و عشرت کی زندگی سے گریزاں رہے یہاں تک کہ سفر و حضر دونوں میں نرم بستر کے استعمال کرنے سے بھی اجتناب کرتے رہے۔

حضرت میاں صاحب چمکنی فرماتے ہیں کہ ۱۱۰۶ھ بمطابق ۱۶۹۴ء میں جب حضرت سعدی دوسری بار پشاور تشریف لائے تو اس وقت بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے نہایت ضعیف و نحیف ہو چکے تھے۔ مگر اس حالت میں بھی صرف ایک کھدری اور موٹی اونی قبا رات کے وقت بطور بچھونا استعمال کرتے تھے[۲۶]۔ آپ فخر و مباہات اور نام و نمود کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے لہٰذا اپنے احباب و اصحاب کو نصیحت

۲۴ظواہر السرائر (کوہاٹ)، ص ۲۲۹ ۲۵ ایضاً، ص ۱۴۶-۲۲۳ ۲۶ ایضاً، ص ۲۲۰

کرتے ہوئے یہ تاکید فرمایا کرتے تھے :

"اگر بعد از ما یاد کنید نہ گوئید کہ قطب بود یا غوث بود یا امام وخلیفہ بود۔ گوئید فقیر بود و بندہ بودہ از بندگان خدا تعالےٰ کہ خدا را یاد می کرد و اگر چیزی برین زیادہ کنید گوئید کہ بندہ بود از بندگان خدا تعالےٰ کہ خدا را یاد میکرد و ہر کہ برائے طلب حق پیش وی آمد اورا بہ خدائے تعالےٰ آشنا می کرد"[۲۷]

اگر مجھ کو میرے مرنے کے بعد تم یاد کرو تو یہ نہ کہا کرو کہ قطب تھا یا غوث تھا یا امام یا خلیفہ تھا۔ کہنا کہ خدا کے بندوں میں ایک بندہ تھا جو خدا کو یاد کرتا تھا اور اگر تم اس پر کوئی اضافہ کرو تو کہنا کہ ایک بندہ تھا خدا کے بندوں میں جو خدا کو یاد کیا کرتا تھا اور جو کوئی طلب حق کی خاطر اس کے پاس آتا اسے خدا سے آشنا کرتا تھا۔

اس شانِ فقیری کے باوجود نہایت بارعب اور پُر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی مجالسِ ارشاد میں ہر وقت سنجیدگی اور وقار کا سماں رہتا اور آپ کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوتی۔ حضرت میاں صاحب چمکنیؒ ان کی ایک مجلس کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" در صحبت با بہجت آنحضرت جمیع اکابر علما و مشائخ و اعالی و ادانی شہر پشاور و سواد ان حاضر بودند و خیلے صحبتِ گرم بود و باہیبت و ارادت آراستہ و بہ تمکین و وقار براستہ و کسے را دران محل مجال دم زدن و سخن گفتن نہ بود من نیز بہ ہمان شیفتگی در مجلس شریف حاضر شدم دیدم کہ آنحضرت در میان حقائق و معارف چوں ابر گراں مایہ نیسانے می جوشند و نکات عجیبہ و لآلی رموزات غریبہ در صدف گوش مستمعان می رسند"[۲۸]

آپ کی مسرت بخش صحبت میں شہر پشاور کے تمام اکابر علما و مشائخ اور اعلیٰ و ادنیٰ سب موجود تھے اور مجلس خوب گرم تھی۔ آپ ہیبت و ارادت اور وقار و تمکنت سے آراستہ تھے اور کسی میں دم مارنے اور کلام کرنے کی جرأت نہ تھی۔ میں بھی اس شیفتگی کے ساتھ مجلس میں آیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کا گراں مایہ ابر بہاری جوش مار رہا ہے اور عجیب و غریب نکات اور اسرار و رموز کے موتی سامعین تک پہنچا رہے ہیں۔

---

۲۷ ظواہر السرائر (کوہاٹ)، ص ۲۶۲

۲۸ ظواہر السرائر (لاہور)، ص ۶۰۶ - ۶۰۷

خودداری اور شان استغنا

آپ بے انتہا منکسر، مستغنی المزاج اور خود دار شخصیت کے مالک تھے اور دنیا دار قسم کے سلاطین و حکام سے میل جول اور اختلاط سے حتی الوسع احتراز فرماتے۔ کہتے ہیں کہ سلطان **محمد معظم** جب اپنے باپ اورنگ زیب عالمگیر کی قید سے رہا ہوا تو دکن سے لاہور آیا اور حضرت سعدی کی خدمت میں اپنا آدمی بھیج کر ملاقات کی درخواست کی۔ آپ نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ:

دیدن فقرا محض برائے خدمت متضمن منافع دینی و دنیوی است، اگر چنین بہ خاطر است باک نہ دارد و اگر غرض آلود باشد و استدعا سلطنت و دیگر مطالب دنیوی درمیان آرد آمدن ویرا نمی خواہم [۲۹]

فقرا کے ساتھ ملاقات صرف خدمت و عقیدت کے خیال سے بہت سے دینی و دنیاوی منافع پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر یہی خیال ہے تو کوئی حرج نہیں اور اگر خود غرضی پر مبنی ہو اور سلطنت کی استدعا یا دوسرے دنیاوی مقاصد کی خواہش ہے تو اس کے لیے میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں آؤ۔

اسی طرح ایک بار سلطان اورنگ زیب واقعہ خیبر سے فارغ ہو کر لاہور واپس آیا تو ایک قاصد حضرت سعدی کے پاس بھیجا اور ملاقات کی التماس کی مگر ادھر سے حسب معمول بے نیازی اور استغنا کا مظاہرہ ہوا اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ:

باعث دیدن یک دیگر خالی از وجوہ نیست غرض استدعا ہست یا استفادۂ حق یا افادہ اگر مراد شما استدعا ہست بس ما بہ ایں امر موریم کہ ہمیشہ شمارا دعا میکنیم احتیاج آمدن و دیدن و گفتن نیست۔ [۳۰]

ایک دوسرے کے ساتھ ملاقات چند وجوہ سے خالی نہیں ہوتی یا تو مقصود استدعا ہوتی ہے یا استفادہ یا افادہ۔ اگر تمہارا مطلب استدعا ہے تو ہم اس پر تیار ہیں کہ ہمیشہ تمھیں دعا دیتے رہیں۔ لہٰذا یہاں آنے، ملاقات کرنے اور بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

فیوض و برکات

آپ اپنے دور کے ایک کامل، نافع اور نافع الخلق روحانی پیشوا گزرے ہیں۔ آپ کے فیوض و

---

[۲۹] ظواہر السرائر کوہاٹ، ص ۲۶۹ [۳۰] ایضاً [۳۱] نتائج الحرمین، ص ۲۲۰

برکات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور آپ کے خلفا و مریدین کی تعداد بے شمار تھی۔ آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ :

مریدان ما مانند ستارہ ہای آسمان از حیطۂ شمار خارج اند و منجملہ آنہا بہ تکمیل کمال بہ رتبۂ اجازت وارشاد رسیدند[۱۲۲]

ہمارے مرید آسمان کے ستاروں کی مانند بے شمار ہیں اور ان میں سے ایسے بھی (بہت سے مرید) ہیں جو مرتبۂ کمال پر پہنچ کر اجازت وارشاد کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

حضرت سعدی کی دینی خدمات کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپ نے اپنے فیوض سے نہ صرف سرزمینِ پنجاب کو منور کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ شمال مغربی سرحدی صوبہ اس کے ملحقہ قبائلی علاقوں میں بھی لوگوں کی اصلاح کے لیے زبردست مہم چلائی جس کے نتیجے میں حضرت شیخ محمد یحییٰ (حضرت جی اٹک) اور حضرت میاں محمد عمر چمکنی جیسے نامور اور جلیل القدر مرید پیدا ہوئے جنھوں نے سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی احیا واشاعت کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان حضرت کی مخلصانہ تگ ودو کے نتیجے میں دینِ حق کو بے حد تقویت ملی اور طریقۂ نقشبندیہ کو اس علاقے میں زبردست فروغ حاصل ہوا۔

کشوف وکرامات

اولیاء اللہ کی اصل کرامت، کتاب وسنت کا اتباع اور خلافِ اولیٰ امور سے اجتناب ہوتا ہے۔ تاہم خداوند تعالیٰ اپنے فضل واحسان سے بعض اوقات ان کو کرامت حسی بھی عطا فرماتا ہے۔ حضرت سعدی ایک صاحب کشف وکرامت اور مستجاب الدعوات ولی تھے اور خداوند تعالیٰ نے آپ کو کرامت کے نہایت اعلیٰ مراتب پر سرفراز فرمایا تھا۔ مولانا محمد امین بدخشی اور میاں صاحب چمکنی نے آپ کی کرامات کے بے شمار واقعات قلم بند کیے ہیں، جن کی تفصیل میں جانا باعثِ طوالت ہوگا البتہ "مشتے نمونہ از خروارے" کے مصداق ایک واقعہ درج ذیل ہے۔

کہتے ہیں کہ جب شاہ جہان نے ہندوستان سے سید آدم بنوری کے اخراج کا حکم صادر کیا تو یہ سن کر حضرت سعدی بہت غضب ناک ہوئے۔ یہاں تک کہ ہاتھ میں غیبی تلوار لے کر بادشاہ کا سر قلم کرنے

---

[۱۲۲] خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۶۵۲

کا ارادہ کرلیا۔ دریں اثنا حضرت سید آدم بنوریؒ ظاہر ہوئے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:

از بادشاہ اسلام تحمل لازم است و نیک خواہی او واجب زنہار بدی او نہ خواہی کہ وجودش سبب امن وامان است بدی او بدی بہ تمام عالم است[۳۳]

بادشاہ اسلام کے بارے میں تحمل لازم ہے اور اس کی خیر خواہی واجب۔ خبردار! اس کی برائی مت چاہو کیونکہ بادشاہ کا وجود امن وامان کا موجب ہے اور اس سے برائی کرنا تمام نوع انسانی سے برائی کرنے کے مترادف ہے۔

مدفن

آپ شہر لاہور کے جس حصے میں مدفون ہیں۔ ابتدا میں یہ مقام پیر مزنگ کے نام سے موسوم تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کا نام موضع مزنگ مشہور ہوا۔ جس احاطے میں آپ آرام فرما ہیں وہ آپ کے نام کی مناسبت سے سعدی پارک کہلاتا ہے۔ یہاں تقریباً دس فٹ اونچی چار دیواری کے اندر ایک اونچے چبوترے پر آپ کی قبر ہے جس پر آپ کی وصیت کے مطابق گنبد تعمیر نہیں کیا گیا ہے۔ چار دیواری کے مشرقی کونے میں ایک اور قبر بھی موجود ہے۔

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں حضرت سعدیؒ کا احاطۂ قبر ایک وسیع باغ میں گھرا ہوا تھا اور اس باغ کی آبیاری کے لیے دو کنوئیں تعمیر کیے گئے تھے۔ سکھوں کے دور میں وہ باغ اور کنواں سکھ گردی کی نذر ہو کر اُجڑ گیا۔ بعد کے زمانے میں ہدایت خان بلوچ ساکن مزنگ باغ کے قطعۂ زمین پر قابض ہوا اور اب تک یہ زمین اس کی اولاد کے قبضے میں ہے[۳۴]

اولاد

سعدی لاہوری کے چار صاحب زادے تھے اور ہر ایک زہد و تقوے اور علم و عمل میں اپنے بزرگوار کا سچا جانشین تھا۔ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

ہر چہار ستون دینِ متین بودند و بہ دست گیری عالی قدر آنچنان بہ کمالاتِ ظاہری و باطنی رسیدند کہ از ہمہ مشائخ متاخرین گوئے سبقت بردند[۳۵]

---

۳۳ نتائج الحرمین، ورق ۲۲ – ظواہر السرائر، ص ۱۱۵، ۱۱۶

۳۴ لاہور میں اولیائے نقشبند کی سرگرمیاں از محمد دین کلیم، ص ۱۳۱، ۱۳۲

۳۵ خزینۃ الاصفیا، ص ۶۵۲

چاروں (صاحب زادے) حبل متین کے ستون تھے اور سب اپنے عالی قدر باپ کے ظاہری و باطنی کمالات کے حامل تھے اور متاخرین مشائخ پر سبقت لے گئے تھے۔

ان کے مختصر حال حسب ذیل ہیں :

۱۔ خواجہ محمد سلیم : خواجہ محمد سلیم آپ کے فرزند اکبر تھے۔ وہ یار محمد لاہوری کی صاحب زادی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے[۳۶] آپ جملہ انسانی کمالات سے متصف اور تمام امور میں اپنے والد کے نقش قدم پر گامزن تھے۔ خدا نے آپ کا سینہ حفظ قرآن کے شرف عظیم سے مشرف فرمایا تھا۔ تلاوت کلام پر اتنی مداومت کرتے کہ خواب و بیداری دونوں حالتوں میں بے اختیار کلام ربانی آپ کی زبان پر جاری ہوتا تھا[۳۷]

۲۔ خواجہ عیلے : خواجہ محمد عیلے، حضرت سعدیؒ کے نہایت محبوب اور چہیتے بیٹے تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ سلطان معظم کا زمانہ پایا۔ آپ کے والد بزرگوار نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ان کو اپنا قائم مقام بنا کر طالبان حق کی تربیت وارشاد کے لیے مجاز و مرخص فرمایا تھا[۳۸] بہت نیک، متقی اور متوکل علی اللہ تھے[۳۹]

بہادر شاہ سلطان معظم نے خواجہ موصوف کی عزت افزائی کی خاطر ان کو بڑا منصب عطا فرمایا تھا۔ مگر جب حضرت سعدیؒ کا انتقال ہو گیا تو اپنے منصب کو چھوڑ کر لاہور آئے اور مخلوق خدا کے ارشاد و ہدایت میں مصروف ہو گئے۔

حضرت میاں صاحب چمکنی کے ساتھ بہت گہرے مراسم تھے اور حضرت میاں صاحب کی بے حد تعظیم کرتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک بار خواجہ محمد عیلے اٹک تشریف لائے اور مجھے مخاطب ہو کر فرمایا

۳۶ظواہر السرائر (کوہاٹ)، ص ۱۸۵۔ یہاں یہ بات قابل ہے کہ حضرت میاں صاحب چمکنی نے خواجہ موصوف کے حالات کے ضمن میں ان کی والدہ ماجدہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "خواجہ محمد سلیم فرزند کلان آنحضرت است و از صلبیہ شریفہ مولانا یار محمد لاہوری است" دوسرے صاحب زادوں کے حالات بیان کرتے وقت اس امر کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے جس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ایک سے زیادہ عورتیں سعدی کے عقد نکاح میں تھیں۔ واللہ اعلم۔

۳۷ظواہر السرائر (لاہور)، ص ۵۱۴ ۳۸ایضاً (کوہاٹ)، ص ۴۲۳ ۳۹ایضاً (لاہور)، ص ۵۱۶

کی تمہاری کشش تھی کہ یہاں چند دن قیام کیا ورنہ دو تین دن سے زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ نہیں تھا۔[۵۵]

حضرت خواجہ بیگ کو اللہ تعالیٰ نے دو فرزند۔ خواجہ غلام محمد اور خواجہ محمد صادق۔ عطا فرمائے۔

۳۔ خواجہ محمد یوسف: خواجہ محمد یوسف آپ کے تیسرے فرزند تھے اور بڑے عالم و فاضل اور باکمال صوفی تھے۔ اپنے والد بزرگوار کے علاوہ حضرت محمد یحییٰؒ سے روحانی فیض حاصل کیا۔ بڑے عابد و زاہد اور مخلص بزرگ تھے۔ شب بیدار تھے اور نماز تہجد کے پابند۔

۴۔ خواجہ محمد عارف: آپ حضرت سعدی کے فرزند اصغر تھے، ان کے ساتھ بے حد پیار و محبت کرتے۔ آپ کی نظرِ تربیت باطنی ہمیشہ ان کے شاملِ حال رہی۔ حضرت سعدی فرمایا کرتے تھے کہ: عارف اسم بامسمّٰی اور عارف سلطان العارفین ہوگا۔ عارف ہمارے آخری وقت کا نتیجہ ہے۔ بہت سے کمالات کا حامل ہے اور بلند مناصب پر فائز ہوگا۔

---

[۵۵] ظواہر السرائر (لاہور)، ص ۵۰۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

حضرت سید احمد شہید کی اُردو تالیفات

سید احمد شہید[1]، تحریکِ جہاد کے قائد اور رہنما تھے۔ انھوں نے اپنے رفقا کے ساتھ اصلاحِ معاشرہ کے لیے سخت جد و جہد کی۔ ان کے ہاتھ پر بہت سے علما نے بیعت کی اور تبلیغ و تذکیر کے فرائض بڑے پیمانے پر انجام دیے۔ سید احمد کے رفقا نے اظہارِ خیال کا ذریعہ اردو زبان کو بنایا۔ خود سید احمد شہید کے اردو زبان میں دو رسالے (۱) تفسیر سورہ الحمد اور (۲) رسالہ حقیقت الصلوٰۃ یادگار ہیں۔

سید احمد بن محمد عرفان، تکیہ رائے بریلی (اودھ) میں ۶ رصفر ۱۲۰۱ھ (۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء) کو پیدا ہوئے۔ کافیہ تک تعلیم ہوئی۔ حصن حصین بھی پڑھی تھی۔ خطوط پڑھ اور لکھ بھی لیتے تھے[2]۔ شاہ عبد القادر دہلوی سے تعلیم و تربیت فرمائی۔ شاہ عبد العزیز کے مرید اور خلیفہ ہوئے۔ سات سال تک امیر خان کے لشکر سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد دہلی آئے اور بیعت و ارشاد کا سلسلہ شروع کر دیا۔ شاہ اسماعیل اور مولوی عبد الحی ایسے علما ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد دوآبہ کا دورہ کیا۔ شعبان ۱۲۳۹ھ (اپریل ۱۸۲۴ء) میں حج سے فارغ ہو کر آئے۔ جمادی الاُخریٰ ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ء) میں جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کو بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کیا۔

سید صاحب کے یہ دونوں رسالے ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئے تھے اور ان رسائل کے خاتمۃ الطبع میں بالصراحت یہ بات بتائی گئی ہے کہ یہ دونوں رسالے سید احمد شہید کے افکارِ عالیہ ہیں[3]۔

---

[1] سید احمد شہید کے حالات اور تحریک پر کئی وقیع کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں غلام رسول مہر کی "سید احمد شہید" کتاب منزل لاہور ۱۹۵۲ء۔ اور مولانا ابو الحسن ندوی کی "سیرت سید احمد شہید" کراچی ۱۹۷۵ء خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

[2] صیانۃ الاناس عن وسوسۃ الخناس۔ از مولوی حیدر علی رامپوری (قلمی) ورق ۲۶ الف (مخزونہ رضا لائبریری رام پور)

[3] سید احمد شہید نے ایک مرتبہ اپنے مرید مولوی محمد اشرف (المتوفی ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء) بن قاضی نعمت اللہ کے سامنے بھی سورہ الحمد کی تفسیر بیان کی تھی (ملاحظہ ہو مقالاتِ طریقت معروف بہ فضائل عزیزیہ از عبد الرحیم ضیا، مطبع متین حیدرآباد دکن ۱۲۹۲ھ ص ۱۶۱)

تتمۃ الطبع کی عبارت درج ذیل ہے[۴]

"الحمد للہ کہ تفسیر الحمد کی ہندی زبان میں جو حضرت رئیس المومنین امام العارفین سید المسلمین قدوۃ السالکین پیر و مرشد حضرت سید احمد صاحب، نفع پہنچائے اللہ ہم کو اور ہم سب مسلمان بھائیوں کو ان کی بقا سے اور تذکرے فیض اور ارشاد ان کا۔ آپ اپنی زبان سے فیض ہدایت ترجمان سے فرما کے جامع علوم ظاہری و باطنی جناب مولانا عبدالحی صاحب دام فیضہ سے تحریر کروائی اور حقیقت صلوٰۃ کی جو نماز پنجگانہ ہے اور نئی فائدوں کے ساتھ جسے ایک فاضل کامل نے حضرت پیر و مرشد کے مریدوں میں سے حضرت کی زبان قدس سے سن کے ہندی زبان میں لکھا ہے۔ اہتمام سے عاصی بنیر خاں اور وارث علی کے جناب مولوی مدعلی صاحب کی تصحیح سے مولوی بدر علی صاحب کے چھاپے خانے میں خاص و عام کے فائدے کے لیے چھاپا ہوئی تھی۔ اب اگر عالی ہمت کسی مقام پر عبارت محاورے کی مخالف پاویں تو زبان طعنے کی دراز نہ کریں۔"

مندرجہ بالا عبارت سے درج ذیل امور واضح ہوئے۔

۱۔ یہ رسالے سید احمد شہید اور مولوی عبدالحی کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔

۲۔ سورہ الحمد کی تفسیر سید احمد شہید نے اپنی زبان سے مولوی عبدالحی کو تحریر کروائی۔

۳۔ رسالہ حقیقت الصلوٰۃ، سید احمد شہید کی زبان سے سن کر ان کے کسی "فاضل کامل" مرید نے قلم بند کیا۔ ان فاضل کا نام نہیں بتایا گیا۔

مولوی عبدالحلیم چشتی صاحب کے سامنے ان رسائل کا جو مطبوعہ نسخہ رہا ہے اس میں سنہ طبع بھی دیا ہے جیسا کہ درج ذیل عبارت سے واضح ہے[۵]

"کیونکہ مقصود چھاپنے سے محض خیر خواہی جماعت مسلمین کی اور بہتری خواص و عام مومنین کی ہے نہ آرائش الفاظ کی۔ لہٰذا جو قلمی مولوی صاحب ممدوح کا تھا۔ اگرچہ بعض مقام پر خلاف محاورہ ہوئے بعینہ جمادی الاخرہ کی بائیسویں تاریخ ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۲ء) میں علی ہاجرہ والصلوٰۃ والسلام طبع ہوا[۶]"

---

[۴] ایک مجموعہ رسائل۔ ۱۔ حقیقت الصلوٰۃ (۲) تفسیر سورہ الحمد (۳) رسالہ اہل سنت کے عقائد (۴) راہ نجات۔ ناقص الاول ہمارے پیش نظر ہے اس کے ص ۴۱، ۴۲ سے یہ عبارت نقل کی ہے۔ یہ مجموعہ مولوی بدر علی کے چھاپہ خانہ کلکتہ میں طبع ہوا۔

[۵] تفسیر سورۂ فاتحہ از حضرت سید احمد شہید (مقالہ مولوی عبدالحلیم چشتی مطبوعہ الرحیم حیدرآباد سندھ ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۲۶۵)

[۶] اٹھارہ انیس برس کے بعد یہ دونوں رسالے (حقیقت الصلوٰۃ و تفسیر سورہ الحمد) محمد مصطفیٰ خان (ابن محمد شفیع)

(باقی اگلے صفحہ)

تفسیر سورہ الحمد

سورہ الحمد کی تفسیر کے شروع میں ایک مقدمہ سا لکھا ہے جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے[۵۴]

اس سورے میں اللہ تعالیٰ نے دعا کی طرح بتلائی ہے اور اللہ کے بتلائے برابر سب کا بتلایا نہیں ہوتا اس واسطے یہ سورت بڑی بزرگی رکھتی ہے۔ اور دعا میں دستور یوں ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ جب کوئی آدمی محتاج بے مقدور ہیں پر سوال کرنے میں جو آدمی سخی، کریم، باہمت اور بامقدور ہوتا ہے اسی سے مانگتے ہیں۔ جتنا تفاوت آدمیوں میں اوصاف سے ہوتا ہے اتنا ہی سوال کرنے میں فرق پڑتا ہے۔ جس میں سخاوت نہ ہو اس سے نہیں مانگتے۔ اور جو سخاوت ہو پر ترش روئی بھی ہو تو اس سے بھی مانگنے میں پرہیز کرتے ہیں۔ اور جو ترش رو بھی نہ ہو بہت خلیق ہو۔ پر دینے کے پیچھے اتراوے جتلاوے، منت رکھے۔ اس سے بھی مانگنا اچھے آدمیوں کو سخت بھاری ہوتا ہے اور جب بے مقدور ہو تو اس سے مانگنا ہی نہیں ہو سکتا اور جتنے یہ اوصاف پر کمال ہوں اتنا مانگنا اس سے خوب ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مانگنا عزت ہو جاتا ہے۔ جب کوئی بڑا ہی کریم، باہمت، پرلے درجے کا سخی ہو کہ وہ اپنی خوبیوں کے سبب مانگنے والے کا ہر طرح پاس کرے اور اس سے مانگنا عزت ہو جاتی ہے اور سوال کرنے میں آدمی اول وہ صفتیں اور خوبیاں بیان کرتا ہے کہ جس سے سوال رد نہ ہو۔ اور ایسا کہتا ہے کہ جس سے سوال کرے وہ بھی مان لے اور اقرار کرے کہ ہاں میں ایسا ہی ہوں اور تیرا کہنا سچ ہے تو بھی دل کے اعتقاد سے کہتا ہے جب یہ سب ہو کر سوال ہوتا ہے تو ہرگز وہ سوال رد نہیں ہوتا بلکہ سوال کرنا واجب ضرور ہو جاتا ہے۔

"مالک یوم الدین" کی تفسیر بطور نمونہ ملاحظہ ہو[۵۵]

مالک ہے جزا کے دن کا ـــــ جزا کا دن قیامت ہے اور اللہ کی مالکیت ہمیشہ ہے دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ مگر ان دونوں میں اتنا فرق ہے کہ دنیا میں بظاہر اور بھی مالک کہلاتے ہیں۔ گو وہ ما

(بقیہ حاشیہ ص۴۳) المتوفی ۱۲۶۹ھ۔ ۵۳۔ ۱۸۵۲ء نے مطبع مصطفائی لکھنؤ سے ۱۲۵۵ھ ۱۸۳۹ء میں چھاپ کر شائع کیے۔ (سید احمد شہید کی تحریک کا اثر اردو ادب پر از مولوی عبدالحلیم چشتی مطبوعہ "الرحیم" حیدرآباد سندھ، ص ۲۵، فروری ۱۹۶۶ء)

۵۴ سورہ الحمد (شمولہ مجموعہ رسائل مطبوعہ) ص ۲۴، ۲۵   ۵۵ ایضاً، ص ۳۲، ۳۳

عاریت ہونا پایدار ہے کیونکہ اصل مالک اللہ ہی ہے لیکن قیامت میں یہ عاریت کی مالکیت بھی اٹھ جاوے گی۔ جیسے کوئی شخص کہ کسی زمیندار کی زمین میں رہتا ہے اور اوس کی رعیتی ہو اور وہ شخص اس زمیندار کے غائبانہ باقی رعیت کے سامنے اپنے تئیں اس زمین کا مالک کہتا ہو۔ تو وہ شخص جب زمیندار کے پاس جاوے گا تو تب آپ کو ہرگز مالک نہ کہوے گا اور وہ زمین اپنی نہ بتلاوے گا بلکہ اس زمیندار کے روبرو یوں کہنے لگا کہ میرا جان و مال اور جورو اور لڑکے سب تمھارے ہی ہیں اور یہی حال ہوگا اوس زمیندار کا وہاں کے راجہ کے سامنے اور اس راجہ کا کسی نواب کے روبرو اور اوس نواب کا کسی بادشاہ کے سامنے، قیامت کو سب کا حال اس سے زیادہ ہوگا مالک حقیقی کے سامنے۔ سو اس طرح اللہ کی مالکیت اور بادشاہی اوس دن آشکارا ہوگی اور سب پر کھلے گی۔ سب اس کی مالکیت کا اقرار کریں گے کیونکہ اوس کے حضور ہوں گے اور ہر بات پر اللہ کی طرف سے جواب ہوتا ہے۔

تفسیر سورۂ الحمد کا اختتام اس طرح ہوا ہے[۹]

"یعنی کافر ہر چند اون سے بھی کبھی کوئی کام اللہ کی رضامندی کا ہو جاوے پر اون کی راہ بھی ہرگز نہیں مانگنا اون کے نصیب میں وہ رضامندی نہیں جو آخرت میں فائدہ دے۔"

زبان و بیان ـــ چند اسمائے صفت

حضوری: بندے کے دل میں حضوری اور بڑی محبت بہت چمک جاوے۔ (ص ۲۷)

مالکیت: اللہ کی مالکیت اور بادشاہی اوس دن آشکارا ہوگی۔ (ص ۳۴)

پچھتانا سے حاصل مصدر

پچھتاؤ۔ کبھی پشیمانی اور پچھتاؤ ہوتا ہے۔ (ص ۳۸)

نری بمعنی صرف۔ نری۔ عبادت نری اللہ کی ہے۔ (ص ۳۳)

کرکر۔ کا استعمال۔ کرکر۔ جب اللہ کی ثنا صفت کرکے یہ کہتا ہے (ص ۳۶)

اُنے بجائے اُس نے۔ اُنے۔ اُنے اپنے بندے کو ایک تعریف کی چیز دی ہے۔ (ص ۲۹)

اِتّا بجائے اتنا۔ اِتّا۔ ان دونوں میں اتنا فرق ہے۔ (ص ۳۲)

۹۔ تفسیر سورۂ الحمد (مشمولہ مجموعہ رسائل مطبوعہ)، ص ۳۲، ۳۳

کِتا بجائے کتنا۔ کِتا۔ ایسے غلام پہ مالک کِتا ہی سنگ دل، بخیل ہو۔ (ص ۳۶)
مضارع "وے" کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ جیسے اتراوے۔ جتلاوے۔ پاوے (ص ۲۵)
سورۃ الحمد کی تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحلیم چشتی لکھتے ہیں:[۱۰]

"سید احمد شہید نے بالکل بول چال کی زبان استعمال کی ہے اور روزمرہ کو نہیں چھوڑا ہے۔ اس میں تصنع اور لفاظی نہیں ہے۔ ہندی کے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو عام فہم ہیں اور اس دور میں محاورے میں رچ بس گئے تھے۔ یہ تفسیر موضوع اور اندازِ بیان دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔"

یہاں ہم ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ رسالہ حقیقت الصلوٰۃ میں جو ترجمہ سورہ الحمد کا دیا گیا ہے وہ شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمہ ہے حالانکہ سید احمد شہید تفسیر الحمد میں ترجمہ مستقل طور سے کر چکے تھے اور یہ دونوں رسالے ایک ساتھ ان کی زندگی ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۲ء) میں طبع ہوئے تھے۔ سورہ الحمد کے دونوں ترجمے درج ذیل ہیں:

سورہ الحمد کا ترجمہ جو تفسیر الحمد میں دیا گیا ہے	سورہ الحمد کا ترجمہ جو رسالہ حقیقت الصلوٰۃ میں دیا گیا ہے وہ شاہ عبدالقادر دہلوی کا ہے
سب حمد اللہ ہی کو ہے، پرورش کرنے والا ہے سارے جہانوں کا۔ بہت رحم والا۔ ہمیشہ کو رحم کرتا ہے۔ مالک ہے جزا کے دن کا۔ تجھی کو پوجتے ہیں ہم اور تجھی سے اعانت چاہتے ہیں ہم۔ بتلا ہم کو راہ سیدھی۔ اور ان کی جن پر فضل کیا تو نے نہ وے جن پر غصہ کیا اور نہ گمراہ۔	سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہاں کا ہے بہت مہربان نہایت رحم والا۔ مالک انصاف کے دن کا۔ تجھی کو ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں، چلا ہم کو راہ سیدھی، راہ اون لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا نہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بھٹکنے والوں کی۔

حقیقت الصلوٰۃ

سید احمد شہید نے نماز کی حقیقت اور اس کے اسرار و رموز پر یہ مختصر سا رسالہ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں اپنے ایک فاضل مرید کو املا کرایا تھا۔ یہ رسالہ سید صاحب کی زندگی میں ۱۲۳۷ھ۔ (۱۸۲۲ء) میں کلکتہ میں مولوی بدر علی کے چھاپے خانے میں چھپا تھا۔ مؤلف مخزن احمدی نے بھی اس کی

---

[۱۰] تفسیر سورہ فاتحہ از حضرت سید احمد شہید: مقالہ مولوی عبدالحلیم چشتی۔ مطبوعہ الرحیم سندھ حیدرآباد۔ ستمبر ۱۹۶۵ء ص ۲۶۸

طرف اشارہ کیا ہے[۱۱]

امام المجاہدین کیفیت الصلوٰۃ بہ نہج کہ در رسالہ موسومہ بحقیقت الصلوٰۃ کہ مصنفہ آنحضرت است بیان فرمودہ۔

امام المجاہدین (سید احمد) نے نماز کی کیفیت ایک انداز سے حقیقت الصلوٰۃ نام کے رسالہ میں کہ جو حضرت (سید احمد) کا تصنیف کردہ ہے، بیان فرمائی ہے۔

حقیقت الصلوٰۃ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔[۱۲]

"الٰہی شکر تیرے احسان کا کہ تونے ہمارے دل کو روشن اور زبان کو گویا کیا۔ اور ایسے نبی مقبول کو خلق اللہ کی ہدایت کے واسطے بھیجا کہ جس کی ادنیٰ شفاعت سے دونوں جہان کی نعمت پاویں اور اوس کی ہدایت سے عرفان کی لذت اٹھاویں۔ پس درود و سلام اوس نبی مختار اور اس کے آلِ اطہار اور اصحابِ کبار پر کہ جس نے بشر کو ضلالت و گمراہی سے باز رکھا اور علما کو زیور علم و دانش سے آراستہ کیا۔ پیچھے حمد خدا اور نعتِ رسولؐ کے اربابِ دانش پر ظاہر ہو جیو کہ مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے رب کو پہچانے اور اس کی صفات کو جانے اور اوس کے حکم معلوم کرے اور مرضی نامرضی اوس کی تحقیق کرے کہ بغیر اوس کے بندگی نہیں اور جو بندگی بجا نہ لاوے سو بندہ نہیں اور بڑی بندگی نماز ہے کہ بدوں اس کے کوئی بندگی قبول نہیں۔ کیونکہ سرا سب بندگیوں کا اور سب بُرے کاموں سے بچنے کا یہی ہے۔[۱۳]

"حضوری بغیر تاثیرِ دل کے میسر نہیں اور تاثیرِ دل کے بدوں دانست معانی الفاظ کے حاصل نہیں اس واسطے جو کچھ نماز میں ہے معنی اس کے ہندی زبان میں محاورے کے موافق کہے ہیں کہ اکثر غریب لوگ کہ جو ان معنوں سے مطلق بے خبر ہیں سمجھ کے حضورِ دل سے نماز گزاریں اور بہت سی حلاوت پاویں اور ایک فائدہ اور ہے کہ اگر معنی الفاظ کے جانیں تو سب بُرے کاموں سے کہ جن سے نقصان ایمان کا ہے بچیں اور معلوم کریں کہ جو اقرار اپنے رب کے سامنے کیا ہے اوس پر قائم رہیں"

ایک اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ ہو:[۱۴]

"جاننا چاہیے کہ جو یہ بندہ پانچ وقت بیچ دربار ایسے بادشاہ عالی جاہ کے بے منت اور احسان کسی

۱۱؎ مخزن احمدی از سید محمد علی (مطبع مفید عام آکبر آباد ۱۲۹۹ھ)، ص ۳۴، ۳۵

۱۲؎ رسالہ حقیقت الصلوٰۃ (مشمولہ مجموعہ رسائل مطبوعہ)، ص ۲ ۱۳؎ ایضاً، ص ۳، ۴ ۱۴؎ ایضاً، ص ۲

دوسرے کے حاضر ہوکے سرفراز ہو تو پھر لازم ہے کہ جو اپنے مالک کے سامنے اقرار کر آیا اوس پر قائم رہے یہ نہیں کہ پانچ وقت پروردگار کے سامنے "ایاک نعبد وایاک نستعین" کہہ آئے بعد اوس کے اور کو پوجے اور وقتِ مصیبت کسی اور کو پکارے اور مدد چاہے اور لازم ہے کہ جو خدا سے دعا کرے کہ "اھدنا الصراط المستقیم" تو اوس کو تحقیق کرے کہ صراطِ مستقیم کہ راہ رضامندی حق تبارک تعالیٰ کی ہے کیا ہے۔ اور کمال شفقت سے اوس بندے کے واسطے پروردگار نے تین رکعت نماز وتر مقرر فرمائی کہ جس کے ادا کرنے سے بندہ اپنے خالق کے سامنے عزیز ہوتا ہے اور نماز وتر واجب ہے۔ اوپر قول صحیح کے اور دعائے قنوت پڑھنا تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے قرآت کے پیچھے واجب ہے۔"

کتاب کا اختتام اس طرح ہوا ہے[۱۵]

"اب بندہ مومن کو چاہیے کہ اپنے دل کی طرف ذرا انصاف سے رجوع کرے کہ یہ سب اقرار کہ جو ایسے حضور کے وقت میں سامنے اپنے مالک کے کرے اور موافق اس اقرار کے عمل میں نہ لاوے پھر روز جزا کے کون سا منہ لگا کے اوس قہار کے سامنے جاوے گا۔ ایمان نام فقط اقرار ہی کا نہیں ہے بلکہ اقرار ساتھ یقین کے چاہیے کہ ثمر اوس کا عمل ہے اور عوام جو اس بات سے بے خبر ہیں۔ خواص کو واجب ہے کہ اون کو آگاہ کریں کہ جو منہ سے اقرار کریں اوس کو عمل میں لاویں۔"

زبان و بیان۔ چند الفاظ کا استعمال

ارواح بمعنی جن۔ نہ ارواح نہ فرشتے۔ (ص ۱۲)

چیلا۔ خاص چیلا سرکاری ہے۔ (ص ۱۲)

حضوری۔ نماز میں حضوری دل کی شرط ہے۔ (ص ۱۳)

نامرضی۔ مرضی نامرضی اوس کی تحقیق کرے۔ (ص ۱۴)

بے چونی۔ بے چونی اور بڑائی اوس اللہ کی اس سورہ میں باختصار خوب ہے۔ (ص ۱۹)

پاچپی۔ خدمت پاچپی کی اوس پر لازم ہے۔ (ص ۱۷)

مضاف، مضاف الیہ سے پہلے۔ شکر تیرے احسان کا۔ (ص ۱۲)

---

[۱۵] رسالہ حقیقت الصلوٰۃ (مشمولہ مجموعہ رسائل مطبوعہ)، ص ۲۳، ۲۴

نماز درخت اور عمارات کی (ص ۱۲) - دفع کرنا شیطان کا (ص ۱۳) - حضوری دل کی (ص ۱۲) نقص ایمان کا (ص ۱۱)
حرف جار، مجرور سے مقدم - بدوں اوس کے (ص ۱۲) - پیچھے حمد خدا کے (ص ۱۲) - بغیر اوس کے (ص ۱۲)
جونسی کا استعمال بجائے جو - جونسی سورت پڑھے (ص ۱۲)
"وے" کا استعمال - وے، واسطے خاص کے ہیں - (ص ۱۳)
اللہ صاحب کا استعمال عام ہے -
چند مرکب مصادر - خلیفہ کرنا، حکم دینا - خلیفہ کر کے سب پر اوس کو حکم دیا - (ص ۱۲)
پاکیزگی کرنا - پہلے طہارت اور پاکیزگی کرے - (ص ۱۳)
جمع - طرف کی طرفوں (ص ۵)
سستی کی جمع سستیوں - مشقت میں ڈالنا نفس کا اوس کی سستیوں کے اوقات میں - (ص ۱۳)

حقیقت الصلوٰۃ میں الحاق

حقیقت الصلوٰۃ کا جو نسخہ ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۲ء) میں سید احمد شہید کی زندگی میں مولوی بدر علی کے چھاپے خانے میں کلکتہ میں اور بعد ازاں اس کی نقل مطبع مصطفائی لکھنؤ میں ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) اور ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) میں شائع ہوئی ہے - ان مطبوعہ نسخوں میں یہ رسالہ دعائے قنوت پر ختم ہو جاتا ہے - مگر بعد میں اس رسالے میں اضافہ ہوتا رہا ہے - رجب ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) کا مکتوبہ نسخہ ہمارے پیش نظر ہے اس میں مندرجہ ذیل عنوانوں کا اضافہ ہے
(۱) آیۃ الکرسی (۲) اذان (۳) پانچ کلمے (۴) ایمان مجمل (۵) ایمان مفصل (۶) درود اور دعائیں
رسالہ حقیقت الصلوٰۃ مختلف مطابع میں مصنف کے نام کی صراحت کے بغیر چھپتا رہا ہے - اس وقت تین نسخے مطبوعہ (۱) مطبع الطافی کانپور (۱۲۸۰ھ) باہتمام مولوی مسیح الزمان
(۲) مطبع افتخار دہلی ۱۳۰۸ھ
(۳) محمود المطابع دہلی (بغیر سال طباعت) باہتمام مرزا عالم بیگ خان
(۴) پرکاش اسٹیم پریس لاہور (۱۳۴۰ھ) باہتمام ابو محمد جمیل
پیش نظر ہیں - ان نسخوں میں الحاقی مواد کے علاوہ نماز جنازہ اور دعائے سید الاستغفار کا بھی اضافہ ہے [۲۶]

---

[۲۶] پہلے تین نسخوں کے ساتھ منظوم رسالہ بے نمازاں (اسماعیل شہید) اور آخر الذکر کے ساتھ مثنوی سلک نور (اسماعیل شہید) شامل ہے۔

حقیقت الصلوٰۃ کا ایک خطی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس کا عنوان "رسالہ نماز و روزہ" ہے۔ کاتب نے اس رسالے کو شاہ عبدالقادر کی تالیف بتایا ہے[۲۵] مولانا امتیاز علی عرشی نے فہرست میں بھی اسی عنوان سے نقل کیا ہے۔ اس رسالے کے شروع میں "تھانیسری" کی ایک مثنوی ہے۔ اس کے علاوہ اردو فارسی اور عربی کے چند اشعار ہیں۔ بعد ازاں عربی ادعیہ اور مارواڑی زبان کی دو چھوٹی چھوٹی حمد و نعت پر مشتمل نظمیں ہیں۔

رام پور کے خطی نسخے میں عبارت میں کہیں کہیں معمولی سا فرق بھی ہے۔ اب ہم رام پور کے خطی نسخے "رسالہ نماز و روزہ" اور مطبوعہ حقیقت الصلوٰۃ کی عبارات دو مقامات سے بطور مقابلہ نقل کر رہے ہیں۔

اقتباس از حقیقت الصلوٰۃ	اقتباس از رسالہ نماز و ر
الٰہی شکر تیرے احسان کا کہ تو نے ہمارے دل کو روشن اور زبان کو گویا کیا اور ایسے نبی مقبول کو خلق اللہ کی ہدایت کے واسطے بھیجا کہ جس کی ادنیٰ شفاعت سے دونوں جہان کی نعمت پاویں اور اوس کی رہنمائی سے عرفان کی لذت اٹھاویں۔	الٰہی شکر تیرے احسان کا ادا کروں کس زبان سے کہ ہماری زبان گویا کی اپنے نام کر اور دل کو روشنی دی اپنے کلام کر اور امت میں کیا اپنے رسول مقبول کی کہ جو اشرف انبیا اور نبی رحمت جن کی شفاعت سے امیدوار ہیں کہ پاویں دونوں جہان کی نعمتیں۔
مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے رب کو پہچانے اور اوس کی صفات جانے اور اوس کے حکم کو معلوم کرے اور مرضی اوس کی تحقیق کرے کہ بغیر اوس کے بندگی نہیں اور جو بندگی بجا نہ لاوے بندہ نہیں اور بڑی بندگی نماز ہے کہ بدوں اوس کے کوئی بندگی قبول نہیں کہ سرا سب بندگیوں اور بُرے کاموں سے بچنے کا یہی ہے۔	سب مسلمانوں کو لازم ہے کہ اپنے رب کو پہچانیں اور اس کی صفات جانیں اور اوس کے حکم معلوم کریں کہ بغیر اوس کے بندگی نہیں اور بندہ بندگی بجا نہ لاوے وہ بندہ نہیں اور بڑی بندگی نماز ہے کہ بدوں اوس کے کوئی بندگی مقبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ سرا سب بندگیوں کا نماز ہے۔

[۲۵] رسالہ حقیقت الصلوٰۃ میں سورۂ فاتحہ کا جو اُردو ترجمہ نقل ہوا ہے وہ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ہے۔ ممکن ہے اسی بنیاد پر اس رسالے کو شاہ عبدالقادر کی تالیف قرار دے دیا گیا ہو۔

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیْسَ الْمِسْکِیْنُ الَّذِیْ یَطُوْفُ عَلَی النَّاسِ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ وَلٰکِنَّ الْمِسْکِیْنَ الَّذِیْ لَا یَجِدُ غِنًی یُغْنِیْهِ وَلَا یُفْطَنُ بِهٖ فَیُتَصَدَّقُ عَلَیْهِ وَلَا یَقُوْمُ فَیَسْاَلَ النَّاسَ۔

(صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ ۔ باب قول اللہ تعالیٰ لا یسئلون الناس الحافا)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسکین وہ نہیں جو لوگوں کے دروازوں کے چکر لگاتا ہے اور روٹی کے ایک یا دو لقموں یا دو ایک کھجوروں کا لالچ اسے اِدھر سے اُدھر گھماتا رہتا ہے، بلکہ مسکین وہ ہے جو اپنے پاس کوئی ایسی چیز نہیں رکھتا جو اسے غنی کر دے، نہ کسی کو اس کی مالی حالت کا علم ہے کہ اس کو صدقہ دیا جائے اور نہ مانگنے کی غرض سے لوگوں کے پاس کھڑا ہوتا ہے۔

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ مسکین کسے کہا جاتا ہے اور اس لفظ کا اطلاق شرعی نقطۂ نظر سے کس شخص پر ہوتا ہے۔ عام طور پر ہر مانگنے والے کو اور کاسۂ گدائی ہاتھ میں لے کر ہر شخص کے آگے کر دینے والے کو اور لوگوں کے دروازوں پر جا کر دستِ سوال دراز کرنے والے کو "مسکین" کہا جاتا ہے۔ کسی نے روٹی کا ٹکڑا دے دیا، کسی نے کشکول میں آٹا ڈال دیا، اور کسی نے آنہ دو آنے دے دیے، کیوں کہ ان کے نزدیک یہ مسکین ہے، غربت کا مارا ہوا ہے اور اس کی امداد کرنا ضروری ہے۔ حالاں کہ حدیث کی رو سے یہ مسکین نہیں ہے، پیشہ ور گداگر ہے، اس کو صدقہ دینا اور مستحق امداد سمجھ کر اس کی مالی مدد کرنا جائز نہیں۔ اسی لیے مشکوٰۃ میں یہ حدیث "باب من لا تحل لہ الصدقہ" میں درج کی گئی ہے، یعنی ایسے شخص کا شمار ان لوگوں میں کیا گیا ہے جو صدقے کا استحقاق نہیں رکھتے۔ ان لوگوں نے مانگنے کو آمدنی کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کو کچھ دینے سے گداگری کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اجب کہ معاشرتی طور سے اس کو ختم کرنا ضروری ہے۔ گداگروں کا گروہ معاشرے پر بوجھ ہے اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے ہر شخص اچھی خاصی رقم کا مالک ہوتا ہے۔ ان کے لیے کسی صورت میں "مسکین" کا

لفظ استعمال نہیں جاسکتا۔

اس کے برعکس شرعی لحاظ سے مسکین، اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو، جو اس کی ضروریات کے لیے کفایت کرسکے، اور جو اس کو تنگ دستی کے دائرے سے نکال کر فراخ دستی اور مالی وسعت کے دائرے میں داخل کرنے کا ذریعہ بن سکے۔ اس کی خودداریِ نفس کا یہ عالم ہے کہ اس کی غربت و مسکنت اور مالی کمزوری کا کسی کو علم نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی مالی امداد کرسکے اور اس کو صدقات و خیرات کا مستحق سمجھ کر اُسے کوئی چیز بطور صدقہ دے سکے۔ یہ شخص اس قدر صابر و شاکر ہے کہ ہر حال میں اللہ پر توکل کرتا ہے اور کسی وقت بھی کسی کے سامنے دستِ طلب دراز نہیں کرتا، کسی سے کچھ نہیں مانگتا اور جو کچھ اللہ نے دے رکھا ہے، گزر اوقات کے لیے اسی کو کافی سمجھتا ہے۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے لوگوں کی طرف نہیں دیکھتا، وہ اس نیت سے کسی کے پاس نہیں جاتا کہ اس کی مدد کی جائے۔ اس کی غیرت، اس کو کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانے دیتی وہ غریب اور مستحق ہونے کے باوجود اپنی غربت کا اظہار نہیں کرتا، اس لیے لوگ اسے غریب نہیں سمجھتے اور وہ بے چارہ اپنی خودداری اور ظاہری رکھ رکھاؤ کی وجہ سے روز بروز مالی کمزوری کا شکار ہوتا جاتا ہے۔

قرآن اور حدیث کی رُو سے اصحابِ ثروت کا فرض ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی تلاش میں رہیں، ان کی مدد کریں اور ان کو مالی پریشانیوں سے نجات دلائیں۔ وہ صرف انہی لوگوں کو صدقے کا مستحق نہ قرار دیں، جو اُن کا چلنا پھرنا دوبھر کر دیتے ہیں اور گھیرے میں لے کر ایک دوسرے سے آگے بڑھ بڑھ کر اپنا کشکول اس کے سامنے کرتے ہیں، بلکہ صدقے کے اصل مستحق وہ ہیں جو بے کاری کا شکار ہیں اور بھوک سے نڈھال ہیں، لیکن خاموشی کے ساتھ گھر میں بیٹھے ہیں اور مارے شرم کے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔

نقد و نظر

تذکرہ امیرِ تبلیغ

تصنیف : مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری

ناشر : ذوالنورین اکادمی۔ بھیرہ، ضلع سرگودھا

ملنے کا پتا : مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور

صفحات ۲۷۲ ۔ جلد، کتابت، طباعت شان دار۔ قیمت ۲۴ روپے

یہ کتاب مولانا محمد یوسف دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔ مولانا مرحوم، اس برصغیر کے نامور اور ممتاز عالمِ دین حضرت مولانا محمد الیاس مرحوم کے فرزندِ گرامی قدر تھے۔ یہ وہی مولانا محمد الیاس ہیں، جنھوں نے آج سے کم و بیش ساٹھ سال پہلے دہلی کے ایک علاقے بستی نظام الدین کی ایک مسجد کو تبلیغِ اسلام کا مرکز بنایا تھا اور میوات کے علاقے میں اسلام کی صاف ستھری دعوت کا آغاز کیا تھا۔ علاقہ میوات کے مسلمان، اسلامی تعلیمات سے بہرہ مند نہ تھے اسی لیے ہندوانہ رسوم و عوائد ان میں رواج پاگئی تھیں۔ مولانا محمد الیاس نے ان کو احکامِ اسلام سے روشناس کرانے کا عزم کیا اور عام فہم اور آسان طریقے سے ان میں اسلام کی دعوت پھیلائی۔ مولانا مرحوم اس انداز اور اسلوب سے تبلیغ کرتے کہ اسلام کی حقانیت اور دین کی صداقت لوگوں کے دل میں اُترتی جاتی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا علاقہ راہِ راست پر آگیا اور اسلامی احکام کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے لگا۔ مولانا مرحوم کو نہ کسی کی سیاست سے کوئی تعلق تھا اور نہ وہ اختلافی نوعیت کی کوئی بات کرتے تھے۔

مولانا محمد الیاس کی وفات کے بعد ان کے سعادت مند بیٹے مولانا محمد یوسف مرحوم نے باپ کی مسند کو سنبھالا اور تبلیغ کا وہی طریقہ جاری رکھا جو اپنے جلیل القدر باپ سے سیکھا تھا۔ اب یہ سلسلہ تبلیغ پاکستان یا ہندوستان تک محدود نہیں رہا بلکہ وسیع پیمانے پر دنیا کے اکثر حصوں میں پھیل گیا ہے۔ لوگ ان مخلص مبلغین کو "تبلیغی جماعت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان میں خوبی یہ ہے کہ نہ یہ سیاسیات میں

اُلجھتے ہیں، نہ فقہی نوعیت کے اختلافی مسائل کا ذکر کرتے ہیں، نہ کسی سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ ہر ایک سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں اور نہایت دھیمے طریقے سے دعوتِ اسلام میں مصروف ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں مولانا محمد یوسف مرحوم کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اور ان کے اخلاق و عادات، علم و فضل اور طریقِ کار کی پوری وضاحت کی گئی ہے۔

یہ کتاب بظاہر اگرچہ ایک شخص کے حالات میں ہے، مگر درحقیقت یہ بہت ہی جلیل القدر شخصیتوں اور ان کے فضل و کمال کو محیط ہے۔ مبلغین اسلام اور داعیانِ دین کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ دعوتِ اسلام کا طریقہ کیا ہے؟ اور دینِ حق کی اشاعت کے کیا تقاضے ہیں۔

ارشاداتِ حضرت علی

انتخاب و ترجمہ : سید جمیل احمد رضوی

ناشر : جعفریہ کتب خانہ، امام بارگاہ گامے شاہ، بیرون بھاٹی دروازہ۔ لاہور

صفحات ۹۲ ۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ ۔ قیمت چار روپے

خلیفۂ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبات و کلمات کئی کتابوں میں مندرج ہیں اور علمی اور ادبی کمالات کے حامل ہیں۔ ان میں ایک کتاب "غرر الحکم و درر الکلم" ہے، جو عبدالواحد بن محمد تمیمی آمدی (متوفی ۵۱۰ھ) کی تصنیف ہے۔ اس کی شرح جمال الدین محمد خوانساری (متوفی ۱۱۲۱ھ) نے فارسی میں لکھی ہے۔ اس کے بعض حصوں کا انتخاب اور اردو ترجمہ اس وقت پیشِ نگاہ ہے، جو سید جمیل احمد رضوی (پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور) کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جن ارشادات و اقوال کا ترجمہ کیا گیا ہے، ان کے عنوانات یہ ہیں:۔ علم، عقل ایمان، مومن، دین، فکر، عمل، تقویٰ، صبر، توکل، شکر، امانت، خاموشی، جود و سخا، کذب۔!

یہ عنوانات بڑے اہم ہیں۔ جو اقوال تشریح طلب ہیں، ان کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ کتاب کے آغاز میں فاضل مترجم نے "غرر الحکم و درر الکلم" کے مصنف اور شارح کا تعارف بھی کرایا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات و فرمودات کی ادبی اور علمی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

علمی رسائل کے مضامین

غ، بمبئی ۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء

مطالعات و تعلیقات	قاضی اطہر مبارک پوری
عرب کی بولی	ادارہ
حاجیوں کی باتیں	محی الدین منیری

غ، کراچی ۔ دسمبر ۱۹۸۰

بیمہ اور اسلام	حافظ محمد لطیف
مولانا مفتی محمود (مرحوم)	مفتی محمد تقی عثمانی

ات، کراچی ۔ اکتوبر ۱۹۸۰

مجدد اسلام حضرت سید احمد شہیدؒ	سید نفیس الحسینی
امام ابو حنیفہ محدثین کی نظر میں (مسلسل)	محمد جنید چاٹگامی

ات، کراچی ۔ نومبر ۱۹۸۰

امام ابو حنیفہ محدثین کی نظر میں (مسلسل)	محمد جنید چاٹگامی
اعجاز قرآن عددی پہلو سے	ڈاکٹر عبدالرزاق نوفل ۔ ترجمہ: محمد شریف

معہ، دہلی ۔ اکتوبر ۱۹۸۰

تحقیق تنقید	ڈاکٹر تنویر احمد علوی
بدھ دھرم ۔ ایک تاریخی جائزہ	ڈاکٹر سید محمد عزیز الدین حسین
مرزا محمد خاں قزوینی ۔ ایک تعارف	محترمہ شوکت نہال
منشی مہاراج بہادر برق دہلوی	ویریندر پرشاد سکسینہ

الحق، اکوڑہ خٹک ۔ ستمبر ۱۹۸۰

مجدد الف ثانی اور مارکسی مورخین (مسلسل)	جمال احمد صدیقی

انقلابِ ایران ـ اسباب و نتائج — جناب احمد عبداللہ
خوش حال خاں خٹک اور بایزید — مولانا مدار اللہ مدرار

الفرقان، لکھنؤ - اگست، ستمبر ۱۹۸۰

قاضی محمد عدیل عباسی کی تصنیف "تحریک خلافت" کی تلخیص — مولانا عتیق الرحمن سنبھلی
قاضی محمد عدیل عباسی — مولانا ضیاء الدین اصلاحی
قاضی محمد عدیل عباسی کا عظیم کارنامہ — مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

الفرقان، لکھنؤ - اکتوبر، نومبر ۱۹۸۰

مولانا تھانوی کی محفل ارشاد — مولانا نسیم احمد فریدی امروہی
دار العلوم دیوبند ـ ہند میں حنفی مذہب کا گہوارہ — مولانا عبدالرشید نعمانی
مولانا غلام اللہ خاں کے مختصر حالاتِ زندگی — قاری حبیب الرحمٰن

فکر و نظر، اسلام آباد - اکتوبر ۱۹۸۰

زکوٰۃ کی معاشرتی و اقتصادی اہمیت — پروفیسر اعجاز اسلم قریشی
اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ کا تصور — سلیم خاں طارق ایم - اے
الجزائر میں شادی اور طلاق کے قوانین — بول روسی اے، ترجمہ کرنل محمد نواز
محمد اعلیٰ تھانوی اور کشاف الاصطلاحات والفنون — محترمہ زاہدہ نسرین سلہری

معارف، اعظم گڑھ - اکتوبر ۱۹۸۰

فاتح علم — مولانا شبیر احمد خاں غوری
اقبال کا فکری ارتقا — مولانا عبدالسلام خاں رام پوری
خدا بخش لائبریری پٹنہ میں آزاد بلگرامی کی قلمی تصنیفات - جناب محمد عتیق الرحمٰن ایم - اے

نوائے ادب، بمبئی - اپریل ۱۹۸۰

میر شمس الدین فیض — پروفیسر لئیق صلاح
اقبال کا تصورِ اللہ — ڈاکٹر عصمت جاوید
کتب خانہ مدرسہ محمدیہ جامع مسجد بمبئی — پروفیسر نظام الدین امین گوریکر